مصنف کا انتساب

☆ میرے چھ بچوں

☆ مادیا اور مکا زیوی (میری پہلی بیٹی) کے نام جو اب انجہانی ہو چکے ہیں۔

اور

☆ ملگا تھو، مکا زیوی، زینانی، اور زندزی کے نام جن کا تعاون اور محبت میرے لئے سرمایہء حیات ہے۔

☆ میرے اکیس پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں، اور تین پڑ پوتے پڑ پوتیوں کے نام جو مجھے بے پناہ مسرت بخشتے ہیں۔

☆ اور میرے تمام ساتھیوں، دوستوں اور ہم سفر جنوبی افریقیوں کے نام، جن کی میں خدمت بجا لاتا ہوں، اور جن کے حوصلے، عزم، اور حب الوطنی سے میں زندگی کا ولولہ حاصل کرتا ہوں۔

☆☆☆

حرف امتنان

27برس مسلسل جیل میں رہنے والے عظیم افریقی سیاستدان نیلسن منڈیلا کی انقلابی شخصیت، ان کے بےلوث انداز سیاست اور گورے سامراج سے جنوبی افریقہ کو آزاد دلانے کی صبر آزما جد وجہد میں ان کے رہنما کردار سے میں ایک کاروباری شخصیت، علم دوست اور ادیب شہیر جناب محمد شکور کے ذریعے متعارف ہوا۔ جنہوں نے مجھےLong walk To Free dom پڑھنےکودی، اور ان ہی کی فرمائش اور اصرار پر میں صدر منڈیلا کی عہدآفریں سرگزشت کا رواں ترجمہ کرنے میں کام یاب ہوا، اس بلند پایہ کتاب کا یہ اردو مرقع پیش کرتے ہوئے میں اپنے عزیز دوست محمد شکور کا بےحد ممنون ہوں۔۔۔۔۔۔۔ محسن فارانی۔۔۔

☆☆☆

پیش لفظ

یہ ایک ایسے انسان کی ولولہ خیز آپ بیتی ہے۔جس نے اپنی جوانی سے لے کر اپنی عمر اپنے ملک اور اپنی قوم کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے میں صرف کر دی۔اسے اپنے بیوی بچوں اور خاندان سے الگ رہ کر بار بار قید و بند سے گزرنا پڑا۔اور اس کے آخری ستائیس برس تو مسلسل جیل میں گزرے۔وہ ایک قانون دان اور لاء گریجویٹ تھا۔مگر سفید فام سامراجیوں نے جزیرہ روبن میں اس سے عادی مجرموں کا سا سلوک کیا۔اور مزدوروں کی طرح بوجھ اٹھوایا۔اس کے باوجود اس کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہ آئی،وہ عزم و ہمت کا پہاڑ ثابت ہوا وہ بے پناہ سیاسی شعور اور عمرانی فراست سے بہرہ ور تھا۔جب گرم لوہے پر ضرب لگانے کا وقت آیا تو اس کی پرواہ کیے بغیر اس کے ساتھیوں کی طرف سے بک جانے کا الزام لگایا جا سکتا ہے ۔اس نے جیل میں رہ کر گورے حکمرانوں سے گفت وشنید کا ڈول ڈالا۔صبر و تحمل کے ساتھ تحریک آزادی کو ہلاکت خیز ٹکراؤ سے بچایا اور آخر کار سفید فام حکم رانوں کو قائل کرنے میں کام یاب رہا۔کہ سیاہ فام اکثریت کو اس کے جمہوری حقوق دینا ہی وقت کا تقاضا ہے اور اب وہ وقت کے دھارے کے خلاف چلتے ہوئے کالے جنوبی افریقیوں پر نسلی امتیاز کی پالیسی مزید مسلط نہیں رکھ سکتے۔بالاخر حکومت اسے رہا کرنے پر مجبور ہوگئی۔وہ دنیا میں جہاں کہیں بھی گیا،لوگوں نے اس کے راستے میں آنکھیں بچھائیں اور اس کا والہانہ استقبال ہوا ۔

اس عظیم افریقی سیاست دان نے اپنے ساتھیوں کو بھی قائل کیا کہ اب تشدد کے بجائے مفاہمت اور گفت وشنید کی پالیسی ہی ہماری کام یابی کا راستہ ہموار کرے گی ،مذاکرات کے کئی دور چلے اور پھر عبوری آئین اور آزادانہ انتخابات کے مرحلے طے پا گئے۔27 اپریل 1994ء کو سیاہ فام جنوبی افریقیوں نے زندگی میں پہلی بار ووٹ ڈالے اور اس کی جماعت افریقین نیشنل کانگرس نے 62.6 فی صد کی

اکثریت سے انتخاب جیت لیے۔ انہی دنوں اسے نوبل امن انعام سے نوازا گیا۔ 10 مئی 1994ء کی روشن صبح انتقال اقتدار کی شان دار تقریب منعقد ہوئی۔ جس میں اس نے جنوبی افریقہ کے پہلے سیاہ فام صدر مملکت کا منصب سنبھالا اور سابق سیاہ فام صدر رڈی کلارک نے اسے صدارت کا منصب تفویض کرکے خود نائب صدر دوئم کا منصب قبول کیا۔ اس روز اس عظیم سیاہ فام سیاست دان نے کہا:۔

''آئندہ کبھی نہیں کبھی نہیں اور کبھی نہیں یہ ہوگا کہ یہ خوب صورت سر زمین دوبارہ کسی طرح کے ظلم وستم سے دو چار ہو۔ اس قدر شان دار کامیابی پر سورج کبھی غروب نہیں ہوگا۔''

جب وہ جیل سے باہر آیا تو اس نے ظالم اور مظلوم دونوں کو آزادی دلانا اپنا مشن بنالیا تھا، اب اس کی سوچ یہ تھی کہ جس طرح مظلوم کو آزادی ملنا چاہیئے۔ اسی طرح ظالم کو بھی آزادی دلانا چاہیئے۔ کیونکہ وہ دوسروں کی آزادی چھین کر نفرت اور تعصب کا قیدی بن چکا ہوتا ہے۔ آزادی سے بہرہ ہونے اور برسر اقتدار آنے کے بعد اس کا کہنا ہے کہ:۔

ہم نے اپنے سفر کا آخری قدم نہیں بلکہ ایک طویل تر اور مشکل شاہراہ پر پہلا قدم اٹھایا ہے۔۔۔۔ ہماری آزادی سے وابستگی کا حقیقی امتحان اب شروع ہورہا ہے۔

وہ اس امتحان میں کامیاب ثابت ہوا۔ برسر اقتدار آکر اس نے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ اس نے ان گوروں کو معاف کردیا جو مدت مدید سے اس کے سیاہ فام ہم وطنوں پر ظلم وستم ڈھاتے رہے تھے۔ اس نے تالیف قلب سے کام لیا۔ گوروں سے ان کے عہدے نہیں چھینے، اور کالے اور گورے کی تمیز ختم کرکے ایک ہم آہنگ قوم کی تعمیر کی بنا ڈالی، جب ہم اس کے قابل رشک کردار اور نبی رحمتؐ کے ان الفاظ مبارک پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ ''عربی کو عجمی پر اور گورے کو کالے پر کوئی برتری حاصل نہیں سوائے تقویٰ کے'' اور ''مسلمان بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا

مظلوم"(ظالم کوظلم کرنے سے روک کر)بحوالہ بخاری مسلم)تو بے اختیار اس افریقی سیاست دان کے لئے داد وستائش کے الفاظ زبان پر آجاتے ہیں۔آزادی کی جدو جہد کے دوران اس کی جماعت افریقن نیشنل کانگریس کی اگلی صفوں میں جنوبی افریقہ کے مسلمان بھی شامل تھے،اور آزادی کے بعد جو پہلی کابینہ تشکیل پائی۔اس میں اس نے چار مسلمان وزراء بھی شامل کیے،اور پاکستان میں جنوبی افریقہ کے سفیر جناب اسمٰعیل بھی ماشاءاللہ مسلمان ہیں۔پھر اخلاقیات کے اعلیٰ معیار پر فائز اس بڑے سیاست دان کی زندگی کا یہ پہلو بھی قابل تحسین ہے کہ اس کی بیوی نے بھی جہد آزادی کے لئے بڑی قربانیاں دی تھیں۔اور وہ تحریک آزادی کی صف اول میں رہی۔چنانچہ آزادی پانے کے بعد اس خاتون کو بھی کابینہ میں شامل کیا گیا۔

مگر جب نو آزاد مملکت کے اس سیاہ فام صدر کو یہ یقین ہوگیا کہ اس کی اہلیہ اس کے طویل عرصہ اسارت کے دوران آبرو باختگی میں ملوث رہی تھی تو اس نے اسے طلاق دینے میں ایک لمحہ کی دیر نہیں لگائی۔پھر عدالت میں برملا کہا کہ میں اسے کسی صورت معاف نہیں کرسکتا،پھر تین سال بعد اس نے ہمسایہ ملک موزنبیق کے آنجہانی صدر سامورا مائیکل کی بیوہ سے نکاح کرلیا۔یہ بھی اس کی عظمت تھی۔کہاس نے اپنی آبرو باختہ بیوی کو صرف طلاق دینے پر اکتفا کیا۔اور اس سے سیاسی انتقام نہیں لیا۔یہ وہ کردار ہے جو ہمارے دین متین کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔اور جو ہم مسلمانوں میں اب خال خال نظر آتا ہے۔

سو آیئے اب تاریخ کی اس عظیم شخصیت سے ملئے جسے دنیا نیلسن منڈیلا کے نام سے جانتی ہے۔

محسن فارانی

لاہور 24 اکتوبر 1998ء

☆☆☆

مصنف کا حرف سپاس

جیسا کہ قارئین دیکھیں گے، یہ کتاب ایک طویل تاریخ ہے، میں نے 1974ء میں اپنی جزیرہ روبن کی اسیری کے دوران اسے خفیہ طور پر لکھنا شروع کیا تھا۔میرے پرانے ساتھی والٹر سوسولو اور احمد کاتھرادا نے میری یاداشتوں پر نظر ثانی کرنے میں جوان تھک محنت کی، اس کے بغیر اس مسودے کی تکمیل ممکن ہی نہیں تھی۔مسودے کی وہ نقل جو میں نے اپنے پاس رکھی تھی، حکام کے ہاتھ لگ گئی، اور انہوں نے اسے ضبط کرلیا، تاہم میرے قیدی ساتھیوں میک مہاراج اور عیسو چیبا نے اپنی بے مثال تحریری مہارت سے کام لے کر اس امر کو یقینی بنالیا تھا کہ مسودہ اپنی منزل تک پہنچ جائے گا۔1990ء میں جیل سے اپنی رہائی پانے کے بعد میں نے اس پر دوبارہ کام شروع کیا۔

میری رہائی کے بعد سے میرا شیڈول ان گنت فرائض اور ذمے داریوں سے مملو ہے، جو میرے لئے لکھنے کا بہت کم وقت چھوڑتی ہیں۔خوش قسمتی سے مجھے مخلص ساتھیوں، دوستوں، اور پیشہ وارانہ اہلیت کے حامل افراد کی رفاقت میسر رہی ہے، جنہوں نے مجھےاس کام کی تکمیل میں مدد دی ہے۔اور جن کے لئے میرے سل سپاس اور تشکر کی فراوانی ہے۔مجھے اپنے ساتھی احمد کاتھرادا کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرنا چاہیئے، جنہوں نے اس داستان پر نظر ثانی فرما کر اس کی اصلاح کرنے اور اس کی نوک پلک سنوارنے میں طویل اوقات صرف کیے۔

میں رچرڈ سٹینگل کا تہہ دل سے ممنون ہوں، جنہوں نے اس کتاب کی تخلیق میں مجھ سے تعاون کیا، اور اس کی ادارت اور پہلے حصوں پر نظر ثانی کی، اور آخری حصوں کی تحریر میں اپنی گراں قدر خدمات فراہم کیں۔مجھے ٹرانسکائی میں صبح کی سیر کے دوران اور جوہانسبرگ میں شیل ہاؤس اور باوٹن میں اپنے گھر میں ان کے ساتھ، پرشوق ملاقاتیں یاد آتی ہیں، خصوصی خراج تحسین میری فاف کے لئے ہے

جنہوں نے رچرڈ کے کام میں ان کی مدد کی، میں نے فاطمہ میر، پیٹر ماگو بین، نادین، گور ڈیمر، اور ایز کائیل فاہلی لے کے مشوروں اور تعاون سے بھی استفادہ کیا ہے۔

میں اپنے افریقن نیشنل کانگریس آفس سٹاف کا بے حد شکر گزار ہوں، جنہوں نے اس کتاب کی تیاری کا صبر آزما کام انجام دیا، اور باربرا ماسیکیلا کا خاص طور پر ممنون ہوں، جو بڑی سرگرمی سے ان متنوع کتابوں میں مطابقت پیدا کرتی رہیں۔ اس طرح اقبال میر نے اس کتاب کے کاروباری پہلوؤں کی نگرانی کرنے میں اپنے قیمتی اوقات صرف کیے، میں اپنے ایڈیٹر ولیم فلپس آف لٹل براؤن کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے 1990ء کی ابتداء سے اس منصوبے کی رہنمائی کی۔ اور متن کی ادارت کے فرائض سرانجام دیئے۔ جارڈن پاؤلن اور سٹیو شنائیڈر نے تن دہی سے ان کی مدد کی، میں پروفیسر گائیل جرہارٹ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، جنہوں نے مسودے کی نظر ثانی کا کام انجام دیا۔

☆☆☆

حصہ اول :: دیہات میں بچپن

مصیبت کھڑی کرنے والا

زندگی، مضبوط جسمانی ساخت اور تھیمبو شاہی خانوادے سے گہرے ربط سے قطع نظر میرے والد نے میری پیدائش کے وقت جو واحد چیز مجھے عطا کی وہ تھا ایک نام ....رولہلاہلا (ROLIHLAHLA).........ژہوسا (xhosa) زبان میں رولہلاہلا کے معنی ہیں ''کسی درخت کی شاخ کو کھینچنا'' لیکن صحیح طور پر اس کے معروف معنی ہوں گے۔ ''مصیبت کھڑی کرنے والا۔'' میں اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ نام قسمت سے وابستہ ہوتے ہیں یا یہ کہ میرے باپ نے اس طرح میرا مستقبل متوین کر دیا تھا لیکن بعد کے برسوں میں دوست اور رشتے داران بہت سے طوفان کو میرے پیدائشی نام سے وابستہ کرتے رہے جو میں نے اٹھائے یا جھیلے۔ میرا معروف تر انگریزی یا مسیحی نام مجھے اس روز دیا گیا جب میں پہلی بار سکول گیا۔

میں 18 جولائی 1918ء کو مویزو ضلع امتاتا میں پیدا ہوا جو دریائے امباشے کو کنارا یک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یاد رہے امتاتا، ٹرانسکائی کا دارالحکومت ہے۔ میری پیدائش کے سال جنگ عظیم اول ختم ہوئی۔ اسی برس کے آخر میں انفلوئنزا کی وبا پھیلی جس نے دنیا بھر میں کروڑوں انسان مار ڈالے اور اسی آخر میں افریقن نیشنل کانگریس کے ایک وفد نے ورسائی امن کانفرنس میں شرکت کرکے جنوبی افریقہ کے افریقی عوام کے آلام و مصائب کو آواز عطا کی۔ تاہم مویزو عالمی واقعات سے کٹا ہوا ایک الگ تھلگ مقام تھا جہاں زندگی سینکڑوں برسوں سے ایک ہی ڈگر پر چلی آ رہی تھی۔

ٹرانسکائی، کیپ ٹاؤن سے 800 میل مشرق میں اور جوہانسبرگ سے 550 میل جنوب میں دریائے کائی اور بٹال کی سرحد کے درمیان واقع ہے۔ ڈری کنزبرگ کے تہہ دار پہاڑ اس کے شمال میں ہیں اور مشرق میں بحر ہند کے نیلے پانی

موجیں مارتے ہیں۔ یہ سلسلہ وار پہاڑیوں، زرخیز وادیوں اور ایک ہزار دریاؤں اور ندیوں کا خوبصورت ''ملک'' ہے جو اس کی سرزمین کو سردیوں میں بھی سبز بنائے رکھتے ہیں (یادرہے سفید فارموں کے زیر حکومت عشرہ 1970ء میں یونین آف ساؤتھ افریقہ کے اندر ٹرانسکائی کو آزاد **ملک** کا درجہ دیا گیا تھا۔ مگر افریقن نیشنل کانگریس اور عالمی ادارے اسے تسلیم نہیں کرتے تھے .... مترجم۔) ٹرانسکائی جنوبی افریقہ کے اندر ایک بڑا علاقائی ڈویژن ہوا کرتا تھا جس کا رقبہ سوئٹزرلینڈ کے برابر تھا اور جہاں 35 لاکھ سفید فارم آباد تھے۔ یہ تھیبو لوگوں کا مسکن ہے جو ژھوسا قوم کا ایک حصہ ہیں اور میں اسی برادری کا رکن ہوں۔

میرے والد گادلا ہنری نیسوانسلی اور رسمی دونوں لحاظ سے ایک چیف یعنی ایک سردار تھے، تھیبو قبیلے کے بادشاہ نے انہیں مویزو گاؤں کا چیف بنایا تھا۔ لیکن برطانوی راج تحت اس انتخاب کی سرکاری طور پر تصدیق ہونی تھی .... چنانچہ مویزو میں تصدیق کا فریقہ لوکل مجسٹریٹ نے انجام دیا۔ سرکار کی طرف سے سند تقرر پائے والے چیف کی حیثیت سے وہ وظیفہ اور اس فیس کا ایک حصہ وصول کرنے کے حق دار تھے جو حکومت نے مویشیوں کو ٹیکے لگانے اور اجتماعی چراگاہ میں مویشی چرانے کے عوض اس برادری پر عائد کر رکھی تھی۔ اگر چہ چیف کا منصب خاصا معزز تھا مگر پچھتر سال پہلے ایک غیر ہمدرد سفید فام حکومت کے کنٹرول نے اس کا احترام خاصا کم کر دیا تھا۔

قبیلہ تھیمبو کا سلسلہ بیس نسلیں پیچھے شاہ زاوئد تک پہنچتا ہے روایت کے مطابق تھیمبو لوگ ڈری کنز برگ کے پہاڑوں کے دامن میں رہتے تھے اور سولہویں صدی عیسوی میں انہوں نے ساحل کی طرف ہجرت کی جہاں انہیں ژھوسا قوم میں شامل کر دیا لیا گیا ہے۔ ژھوسا لوگ انگونی قوم کا حصہ ہیں جو کم از کم گیارہویں صدی سے جنوبی افریقہ کے زرخیز اور معتدل جنوب مشرقی علاقے میں رہتے اور شکار اور ماہی گیری

کرتے آرہے ہیں۔ان کے شمال میں عظیم اندرونی سطح مرتفع تھی اور جنوب میں بحر ہند تھا۔انگونی دوگروہوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں............شمال گروپ جس میں زولواور سوازی لوگ شامل ہیں اور جنوبی گروپ جوایماباکا،ایمابوموانا،ایماکالیکا ،ایمافینگو،ایماپوڈومی ہے،ای بے سوتھیواورای بے تھیمبو پر مشتمل ہےاور یہ سارے جنوبی قبائل مل کرژہوساقوم کی تشکیل کرتے ہیں۔

ژہوسا ایک فخر مند اور پدرنسبی (patrilineal) قوم ہے جس کی زبان پر معافی اورسریلی ہےاور یہ قوانین کی اہمیت،تعلیم اور آداب پر ٹھوس یقین رکھتی ہے۔ ژہوسا معاشرہ ایک متوازن اور ہم آہنگ ساجی برادری تھا جس میں ہرفرد اپنے کردار سے آگاہ تھا۔ ہرژہوساایک جرگے سے تعلق رکھتا ہو جواپنارشتہ ایک خاص آبائی بزرگ سے ملاتا ہے۔ میں مادیباجرگے کاایک رکن ہوں جس کانام ایک تھیمبو چیف کے نام پر رکھا گیا جوٹرانسکائی میں اٹھارویں صدی میں حکومت کرتا تھا۔ مجھے اکثرمادیبا کہہ کرمخاطب کیا جاتا ہے جومیرے جرگے کانام اور احترام کی ایک علامت ہے۔

عظیم ترین بادشاہوں میں سے ایک انگوبن کوکا تھا جس نے تھیمبو قبیلے کومتحد کیا،وہ 1832ء میں فوت ہوگیا۔جیسا کہ رواج تھااس کی بیویاں بڑے شاہی خانوادوں میں دے تحت کاوارث چنا جاتا ہےابن یمین یادائیں ہاتھ خانوادہ کہلاتا ہےاور (اکسہی با) چھوٹا خانوادہ ہوتا ہے جسے بعض ابن یسار یعنی بائیں ہاتھ کا خانوادہ کہتے ہیں۔شاہی جھگڑے نمٹانا اکسہی باکے بیٹوں کا فریقہ تھا۔عظیم خانوادیکا بڑا بیٹا متھیکراکرا،شاہ انگوبن کوکا کاجانشین بنا۔شاہ میھیکراکرا کے دو بیٹے انگانگ لزوی اور ماتانزیما تھے۔شاہ ساہتاھس نے 1954ء سے تھیمبو پر حکومت کی،انگونگ لشوی کاپوتا تھااور ماتانزیما کی اولاد میں سےٹرانسکائی کا سابق وزیراعظیم ماتا نزیماجونیئر تھاجو قانونی اور رسمی لحاظ سے میرا بھتیجا تھا۔اکسہی باجانوادے کا سب

سے بڑا سا کدی تھا جس کا چھوٹا بھائی منڈیلا میرا باپ تھا۔

اگرچہ کئی روایتوں میں مجھے تھیمبو تخت کے وارثوں میں شامل کیا جاتا رہا ہے مگر میں نے جو شجرہ نسب تیار کیا ہے اس سے یہ روایتیں افسانوی درجے میں آتی ہیں اگرچہ میں شاہی خانوادے کا ایک رکن تھا میں ان چند مراعات یافتہ افراد میں شامل تھا جنہیں حکمرانی کی تربیت دی جاتی تھی۔ اس کے بجائے انہی با خانوادے کے فرد کی حثیت سے، اپنے والد کی طرح میری تربیت قبیلے کے حکمرانوں کے کے مشیر کی حیثیت سے کی گئی۔

تھیمبو لینڈ کا وزیر اعظم

میرے والد ایک لمبے اور گہرے نقوش والے آدمی تھے جن کی سوقامتی میرے خیال میں مجھے ورثے میں ملی ہے۔ ان کی پیشانی کے عین اوپر سدید بالوں کی ایک لٹ تھی اور میں اپنے لڑکپن میں ان کی نقل کرتے ہوئے اپنے بالوں میں سفید راکھ ملا کرتا تھا۔ والد سخت مزاج تھے اور اپنے بچوں کو نظم وضبط سکھاتے وقت ڈنڈے کا آزادانہ استعمال کرتے تھے۔ وہ خاصے اکھڑ تھے اور بدقسمتی سے یہ رنگ ہمارے ہاں باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔

میرے والد کو بعض اوقات تھیمبو لینڈ جا وزیر اعظم بھی کہا گیا ہے۔ یہ شاہ سابا تا کے والد شاہ جونگ لزوی اور اس کے جانشین جونگن تابا کے دور حکومت کی بات ہے جنہوں نے رواں صدی کے اوائل میں حکمرانی کی۔ اگرچہ اس نوع کا کوئی عہدہ موجود نہیں تھا، تاہم انہوں نے جو رول ادا کیا وہ عملاً ایک وزیر اعظم کے منصب نہ تھا۔ ان دنوں بادشاہوں کے مغرز مشیر کی حیثیت سے وہ ان کے سفر میں ان کے ہمراہ ہوتے اور سرکاری حکام کے ساتھ اہم ملاقاتوں میں بھی موجود رہتے۔ وہ ژہوسا تاریخ کے مسلمہ عالم تھے اور ان کے مشیر بنائے جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ تاریخ سے مجھے ہی سے دلچسپی تھی اور اس سلسلے میں میرے والد میری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

اگر چہ میرے والد پڑھ سکتے تھے لکھ سکتے تھے مگر ایک عمدہ مقرر کے طور پر ان کی شہرت تھی اور وہ سامعین کو محظوظ کرنے کے ساتھ ساتھ علم و ادب سکھانے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے۔

بعد کے سالوں میں مجھے معلوم ہوا کہ والد ایک بلکہ بادشاہ گر بھی ہیں۔عشرہ 1920ء میں شاہ جونگ لزوی کی بے وقت موت پر اس کا شیر خوار بیٹا جو ''عظیم بیوی'' کے بطن سے تھا، اتنا کم عمر تھا کی تخت پر نہیں بیٹھ سکتا تھا، چنانچہ جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا کہ آنجہانی بادشاہ کے تین بڑے بیٹوں میں سے کسے جانشین بنایا جائے۔میرے والد سے مشورہ کیا گیا تو انہوں نے اس بنا پر جونگن تابا کی شفارش کی کہ وہ بہترین تعلیم یافتہ ہے اور وہ نہ صرف تاج کا اچھا محافظ ثابت ہوگا بلکہ ایک نوخیز شہزادے کا مربی بھی بنے گا۔ یہ سفارش متنازع تھی کیونکہ جونگن تابا کی ماں کمتر قبیلے سے تھی لیکن میرے والد کے اس انتخاب کو آخر کار تھیمبو عوام اور برطانوی حکومت دونوں نے تسلیم کرلیا۔وقت گزرنے پر جونگن تابا نے اس حمایت کا جو گراں بہا صلہ دیا اس کا میرے والد تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

سب بتاتے تھے کہ میرے والد کی چار بیویاں تھیں جن میں سے تیسری میری ماں تھی۔۔نوسے کینی فینی۔۔۔وہ رہوسا کے ایماپیمووجر گے سے ان کے داماد کی بیٹی تھیں اور دائیں ہاتھ کے خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں۔یہ چاروں بیویاں یعنی عظیم بیوی میری ماں، ابن یسار بیوی اور اکادمی یعنی معاون خانوادے کی بیوی، اپنا اپنا کرال رکھتی تھیں۔کرال، ایک خانگی فارم تھا جس میں عموماً خانوادے کی بیوی اپنا اپنا کرال رکھتی تھیں۔کرال ایک خانگی فارم تھا جس میں عموماً جانوروں کیلیے سادہ باڑ والا احاطہ فصلیں اگانے کے لیے کھیت اور ایک دو پھونس کی جھونپڑیاں ہوتی تھیں۔ میرے باپ کی بیویوں کے کرال ایک دوسرے سے کئی کئی میل دور تھے اور وہ باری باری سب کے ہاں ٹھہرتے۔ ان کے کل تیرہ بچے تھے۔۔ چار لڑکے اور نو

لڑکیاں ۔۔ میں ابن یمین خانوادے کا سب سے بڑا بچہ اور اپنے باپ کا سب سے چھوٹا بیٹا ہوں۔میری تین بہنیں ہین ۔۔ بالوی جو سب سے بڑی لڑکی تھی، توتنکو اور ماکھوتسوانا، اگر چہ میرے باپ کا سب سے بڑا بیٹا املاہلوا تھا۔میرے والد کا وارث بطور چیف والی کیلی تھا۔عظیم خانوادے کا بیٹا جو عشرہ 1930ء کے اوائل میں فوت ہو گیا۔میرے تینوں بھائی جو عمر اور مرتبے میں مجھ سے بڑے تھے انتقال کر چکے ہیں۔

والد کا بیل گم ہو گیا

میں ابھی شیر خوارگی کے بالکل ابتدائی مرحلے میں تھا جب میرے والد ایک تنازع میں ملوث ہو گئے جس نے انہیں مویزو کی سرداری سے محروم کر دیا اور اس کا منفی اثر ان کے کردار میں رچ گیا اور جو میرے خیال میں مجھے بھی وراثت میں ملا۔میں سمجھتا ہوں کہ فطرت کے بجائے تربیت انسانی شخصیت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔میرے والد ایک پرغرور باغیانہ روش اور راستی کا ضد آمیز احساس رکھتے تھے اور یہی چیز میں اپنے اندر پاتا ہوں۔چیف یا ہیڈ مین کی حیثیت سے، جیسا کہ سفید فاموں میں میرے والد معروف تھے، اپنی ذمہ داریوں کے لیے وہ نہ صرف تھیمبو بادشاہ بلکہ لوکل مجسٹریٹ کے سامنے بھی جوابدہی پر مجبور تھے۔

ایک دن میرے والد کی رعایا میں سے ایک شخص نے ان کیخلاف درخواست دی جس میں اس کا بیل گم ہونے کی شکایت کی گئی تھی۔مجسٹریٹ نے میرے والد کو پیغام بھیجا کہ اس کی عدالت میں پیش ہوں۔میرے والد نے سمن وصول کیے اور درج ذیل جواب بھیج دیا۔

آندیزی اندسکا کولا (میں نہیں آؤں گا، میں ابھی تک لڑائی کی تیاری کر رہا ہوں)

ان دنوں کوئی مجسٹریٹوں کو اس طرح چیلنج نہیں کرتا تھا۔ایسا رویہ کمال درجے کی سرکشی خیال کیا جاتا تھا اور اس معاملے میں تو سرکشی تھی ہی۔میرے والد کا جواب ان

کے اس یقین کا مظہر تھا کہ مجسٹریٹ کو ان پر کوئی قانونی اختیار نہیں ۔قبائلی معاملات میں وہ شاہ انگلستان کے قوانین اور تھیمبو رواج دونوں سے رہنمائی لیتے تھے ۔ان کا یہ چیلنج غیظ وغضب کا اظہار نہیں بلکہ اصول کا معاملہ تھا۔وہ چیف کی حیثیت سے اپنے روایتی اختیار پر زور دے رہے تھے اور مجسٹریٹ کے اختیار کو چیلنج کر رہے تھے۔

جب مجسٹریٹ کو میرے والد کا جواب ملا اس نے فوراً ان پر عدم اطاعت کا الزام لگا دیا۔کوئی تحقیق و تفتیش نہ ہوئی کہ یہ صرف سفید فام سول ملازموں کے لیے مخصوص تھی۔مجسٹریٹ نے بیک قلم میرے والد کو معزول کر دیا۔اس طرح منڈیلا خاندان کی سرداری کا خاتمہ ہو گیا۔میں اس وقت ان واقعات سے آگاہ نہ تھا لیکن ان سے متاثر بھی ہوا۔میرے والد جو وقت کے معیار سے ایک مالدار آدمی تھے، ان کی قسمت اور عہدہ دونوں ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔وہ اپنے پیشتر گلے اور زمین اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے محروم ہو گئے۔ان تنگ حالات کے باعث میری والدہ قونو چلی گئیں جو مویزو کے شمال میں امتاتا کے نزدیک ایک قدرے بڑا گاؤں تھا اور جہاں انہیں اعزہ و اقارب کی مدد حاصل تھی۔قونو میں ہم نے کمتر سطح کی زندگی بسر کی لیکن یہی گاؤں تھا جہاں میرے لڑکپن کے سب سے مسرت سال گزرے اور وہیں سے میری ابتدائی یادوں کا آغاز ہوتا ہے۔

سونے کی پہاڑیوں میں

قونو گاؤں گھاس سے اٹی ایک تنگ وادی میں واقع تھا جس میں شفاف ندیاں بل کھاتی تھیں اور جو سرسبز پہاڑیوں سے گھری ہوئی تھی۔اس گاؤں میں چند سو افراد آباد تھے جو جھونپڑوں میں رہتے تھے۔یہ جھونپڑے مٹی کی دیواروں کے چھتہ نما ڈھانچے تھے جن کے مرکز میں ایک چوبی ستون گھاس کی مخروطی چھت کو سہارا دیتا۔ فرش چیونٹیوں کے بلوں سے نکلی مٹی سے بنایا جاتا جس پر گائے کے تازہ گوبر کا لیپ

کیا جاتا۔ چولہے کا دھواں چھت سے اوپر نکل جاتا۔ بند جھونپڑے میں صرف ایک دوراز ہ ہوتا جس میں سے جھک کر اندر داخل ہونا پڑتا۔ جھونپڑے عموما رہائشی علاقے میں قریب قریب مکئی کے کھیتوں سے ہٹ کر ہوتے۔

سڑکیں ناپید تھیں۔ گھاس میں سے برہنہ پا لڑکوں اور عورتوں کے گزرنے سے پگڈنڈیاں بن جاتیں۔ گاؤں کی عورتیں اور بچے درخت کی چھال سے رنگے ہوئے کمبل اوڑھے رکھتے۔ گاؤں کے چند مسیحی ہی مغربی لباس پہنتے تھے۔ مویشی، بھیڑیں، بکریاں اور گھوڑے مشترکہ چراگاہوں میں چرتے۔ قونو کے اردگرد کی زمین درختوں سے خالی تھی، سوائے پاپلر کے ایک جھنڈ کے جو قریبی پہاڑی پر ایستادہ تھا۔ زمین سرکار کی ملکیت تھی۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر ان دنوں افریقیوں کے پاس زمین کی نجی ملکیت نہیں تھی بلکہ وہ مزارع تھے جو حکومت کو سالانہ لگان ادا کرتے تھے۔ علاقے میں دو پرائمری سکول، ایک جنرل سٹور اور ایک غوطہ جوہڑ تھا جس کے اندر مویشیوں کو غوطہ دلا کر چچڑیوں اور بیماریوں سے نجات دلائی جاتی۔

مکئی، جسے ہم میلیس کہتے تھے اور مغرب والے کارن کا نام دیتے ہیں، سورگم پھلیاں اور حلوہ کدہ ہماری غذا کا سب سے بڑا جزو تھے...... اس وجہ سے نہیں کہ ہم لوگ ان غذاؤں کو پسند کرتے اور ترجیح دیتے تھے بلکہ صرف اس لیے کہ زیادہ مہنگی خوراک ہم لوگوں کی استطاعت سے باہر تھی۔ ہمارے گاؤں کے زیادہ مالدار خاندان اپنی خوراک میں چائے، کافی اور چینی بھی شامل کر لیتے لیکن قونو کے اکثر لوگوں کے لیے یہ چیزیں بیرونی تعیشات میں شامل تھیں جنہیں وہ خرید نہیں سکتے تھے۔ فصلیں سیراب کرنے، کھانا پکانے اور نہانے دھونے کے لیے پانی ڈولوں میں ندیوں اور چشموں سے لانا پڑتا۔ یہ کام عورتوں کا تھا اور قونو ایک طرح سے عورتوں اور بچوں کا گاؤں تھا۔ اکثر مرد سال کا بیشتر حصہ دور دراز فارموں میں یا ان کانوں میں گزارنے جو ریف یعنی سونے کی چٹانوں والی پہاڑیوں کیساتھ ساتھ

پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ پہاڑیاں جوہانسبرگ کی جنوبی حدود کا تعین کرتی ہیں۔ وہ لوگ شاید سال میں دو بار گھر لوٹتے، زیادہ تر اپنے کھیتوں میں ہل چلانے کے لیے۔ چھدرائی، نلائی، اور کٹائی کیکام عورتوں اور بچوں کے لیے چھوڑ دیے جاتے۔ گاؤں کے چند ہی لوگ پڑھنا لکھنا جانتے تھے اور بہت کے لیے تعلیم کا تصور ابھی ایک غیر ملکی عیاشی تھا۔

میری ماں قونو میں تینوں جھونپڑوں کی حکمران تھی جو میری یاداشت کے مطابق ہمیشہ میرے رشتے داروں کے بچوں سے بھرے رہتے۔ حقیقت ہے کہ مجھے اپنے بچپن کا کوئی ایسا لمحہ یاد نہیں جب میں تنہا تھا۔ افریقی ثقافت میں چچا اور پھوپھی اور ماموں اور خالہ کے بیٹے بیٹیاں، بھائی اور بہنیں سمجھے جاتے ہیں اور انہیں عم زاد یا کزن نہیں گردانا جاتا۔ سفید فام جن رشتوں پر عمل پیرا ہیں ہم ان امتیازات کے قائل نہیں۔ ہمارے کوئی ہاف برادرز، سسٹرز نہیں ہوتے۔ میری ماں کی بہن میری ماں ہے۔ میرے چچا کا بیٹا میرا بھائی ہے۔ میرے بھائی کا بچہ میرا بیٹا یا بیٹی ہے۔

میری ماں کے تین جھونپڑوں میں سے ایک میں کھانا پکایا جاتا، دوسرے میں ہم سوتے اور تیسرے میں سازو سامان پڑا ہوتا۔ جس جھونپڑے میں ہم سوتے اس میں مغربی طرز کا کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ ہم چٹائیوں پر سوتے اور زمین پر بیٹھتے۔ میں نے سرہانہ پہلی بار اس وقت دیکھا جب میں امہیکی زویني گیا۔ میری ماں جھونپڑے کے اندر یا باہر کھلی آگ پر تین ٹانگوں والے آہنی برتن میں کھانا پکاتیں۔ ہر چیز جو ہم کھاتے وہ ہمارے کھیت میں اگی اور ہمارے ہاتھوں بنی ہوتی۔ میلیس یا مکئی کھیت سے اس وقت کاٹی جاتی جب اس کے بھٹے سخت اور خشک ہو جاتے۔ مکئی کو بوریوں یا زمین میں کھدے گڑھوں کے اندر ذخیرہ کیا جاتا۔ مکئی تیار کرتے وقت عورتیں مختلف طریقے استعمال کرتیں۔ وہ روٹی تیار کرنے کیلیے دانے چکی میں پیس لیتیں یا انہیں پہلے ابال کر امپھوتھولو یا امنگ کوشو بنا لیتیں۔ امپھوتھولو مکئی کا آٹا تھا میں لوبیا ملا لیا جاتا

تھا۔مکئی کے برعکس، جس کی رس بعض اوقات کم پڑ جاتی ، ہماری اکائیوں اور بکریوں کا دودھ ہمیشہ وافر ہوتا تھا۔

فطرت سے عشق

اپنی ابتدائی کی عمر سے میں اپنا اکثر فارغ وقت میدان میں گاؤں کے دوسر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے یا دنگا کرنے میں گزارتا تھا۔ایک لڑکا جو گھر میں رہتا اور اپنی ماں کے ساتھ بندھا رہتا اسے ڈرپوک خیال کیا جاتا۔ رات کو انہی لڑکوں کے ساتھ میں کھانے اور کمبل میں شراکت کرتا۔ میں پانچ سال کا تھا جب مجھے کھیتوں میں بھیڑوں اور بچھڑوں کی دیکھ بھال پر لگا دیا گاے۔تب مجھے رہوسا لوگوں کی مویشیوں سے بے پناہ رغبت کا علم ہوا، وہ انہیں خوراک اور دولت کا ذریعہ ہی خیال نہیں کرتے بلکہ خدا کا عطیہ اور خوشی کا سرچشمہ بھی سمجھتے تھے۔

کھیتوں میں گھومتے پھرتے میں نے غلیل سے آسمان پر اڑتا پرندہ شکار کرنا، جنگلی شہد اور پھل اور قابل خوردنی جڑیں اکٹھی کرنا، گائے کے تھنوں سے براہ راست گرم میٹھا دودھ پینا، شفاف سرد ندیوں میں تیرنا اور ڈوری اور تار کے تیز ٹکڑوں سے مچھلی پکڑنا سیکھا۔میں نے سٹک فائیٹ بھی سیکھی جو ایک دیہی افریقی لڑکے کے لیے سیکھنا ضروری تھی اور میں اس کی مختلف تکنیکوں میں ماہر ہوگیا۔یعنی مکے چلانا، ایک سمت میں وار کرنے کا دھوکا دے کر دوسری طرف سے وار کرنا۔اپنے حریف کو تیزی سے کک لگا کر اپنے آپ کو اس کی ممکنہ گرفت سے چھڑانا۔ان دنوں سے مجھے میدانوں ،کھلی جگہوں فطرت کی سادہ رعنائیوں اور افق کے صاف مناظر سے پیار ہو گیا۔

لڑکوں کی حیثیت سے ہم اپنے ہی ہاتھوں بنائے ہوئے کھلونوں سے کھیلتے تھے۔ ہم چکنی مٹی سے جانور اور پرندے بناتے اور درخت کی شاخوں سے بیل گاڑی تیار کر لیتے تھے۔فطرت ہمارا کھیل کا میدان تھی۔قونو کے اوپر پہاڑیاں بڑی ہموار چٹانوں سے مرصع تھیں جنہیں ہم تراش کر اپنے گھوڑے بنا لیتے ، ہم ہموار پتھروں پر

بیٹھ کر نیچے بڑی چٹانوں کی طرف لڑھکتے چلے جاتے۔ہم یہ شغل کرتے رہتے حتیٰ کہ ہماری کمر دکھنے لگتی اور ہمارے لیے بیٹھنا دشوار ہو جاتا۔انہی دنوں میں نے دودھ چھٹے بچھڑوں کی پشت پر بیٹھ کر سواری کرنا سیکھا۔کئی بار بچھڑے کی پشت سے زمین پر گرنے کے بعد سوار آخر کار اس پر بیٹھنے میں کامیاب ہو جاتا۔

گدھے کا سبق

ایک دن ایک اکھڑ گدھے نے مجھے خوب سبق دیا۔ہم باری باری اس کی پشت پر چڑھ اتر رہے تھے اور جب میری باری آئی تو گدھا اچھلا اور سیدھا قریبی کانٹے دار جھاڑی میں جا گھسا۔اس نے مجھے اپنی پشت پر سے گرانے کے لیے اپنا سر جھکا لیا اور میں اتر بھی گیا مگر اس وقت جب کانٹے میرے چہرے میں کھب گئے اور ان سے خراشیں آ گئیں۔یوں مجھے اپنے دوستوں کے سامنے بڑی شرمندگی ہوئی، مشرقی قوموں کی طرح افریقیوں میں اپنی عظمت یا چینیوں کیا الفاظ میں ''چہرے'' کا اعلیٰ احساس پایا جاتا ہے۔اپنے دوستوں میں میرا چہرہ کھو گیا تھا۔اگرچہ یہاں ایک گدھے نے مجھے نیچے گرایا تھا۔تاہم اس سے مجھے یہ سبق مل گیا کہ کسی اور شخص کو رسوا کرنا اسے غیر ضروری طور پر برے حشر سے دوچار کر دینا ہے۔اپنے لڑکپن میں اس حادثے کے بعد، میں اپنے حریفوں کو رسوا کیے بغیر شکست دیتا تھا۔

عموماً لڑکے مل کر کھیلتے تھے، لیکن بعض اوقات ہم اپنی بہنوں کو بھی شامل کر لیتے۔ لڑکے اور لڑکیاں ملکر اندیزی یعنی آنکھ مچولی اور رنگ جیسے کھیل کھیلتے۔لیکن لڑکیوں کے ساتھ جو کھیل کھیلنا میں سب سے زیادہ پسند کرتا تھا وہ تھا ''کھیتھا'' یعنی اپنی پسند کا چناؤ۔یہ ایک منظم کھیل نہیں بلکہ لمحاتی چناؤ کا کھیل تھا جو اس وقت کھیلا جاتا جب ہماری عمر کی لڑکیاں شامل ہوتیں اور ہم ان سے کہتے کہ ہر ایک اپنی پسند کے لڑکے کا انتخاب کر لے۔ہم اپنے اصولوں کی بنا پر لڑکی کے چناؤ کا احترام کرتے اور ایک بار جب وہ اپنی پسند کا انتخاب کر لیتی تو اسے اس خوش قسمت لڑکے کے ہمراہ سفر جاری

رکھنے کی آزادی ہوتی۔ لیکن لڑکیاں بھی ایک ہی کائیاں اور ہم سادہ لوح لڑکوں سے کہیں زیادہ ہوشیار تھیں۔ وہ باہم طے کر کے بالعموم سب سے زیادہ سادہ لوح کا انتخاب کرتیں اور گھر لوٹتے ہوئے راستے بھر اسے چھیڑتیں۔

لڑکوں کا سب سے مقبول کھیل، تھنٹی تھا اور لڑکوں کے بیشتر کھیلوں کی طرح یہ جنگی نوعیت ہی کا تھا وہ چھڑیاں بطور ہدف ایک سو فٹ کے فاصلے پر زمین میں گاڑ دی جاتیں۔ ہر ٹیم کے لئے گول یہ تھا کہ وہ مخالف ہدف پر چھڑیاں پھینک پھینک کر اسے گرا دے، ہم اپنے ہدف کا دفاع کرتے اور حریفوں کو پھینکی ہوئی چھڑیاں دوبارہ حاصل کرنے سے روکتے، جب ہم اور بڑے ہوئے تو ہمسایہ دیہات کے لڑکوں سے میچ کھیلنے لگے اور ان برادرانہ لڑائیوں میں جو لڑکے امتیاز حاصل کرتے ان کی بہت تعریف کی جاتی جیسے وہ جرنیل جو جنگ میں عظیم کامیابیاں حاصل کریں انہیں بجا طور پر اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔

ایسی گیموں کے بعد میں اپنی ماں کے کرال میں واپس آتا جہاں وہ رات کا کھانا تیار کر رہی ہوتیں۔ جہاں میرے والد کبھی تاریخی لڑائیوں اور دلیر ژہوسا جنگجوؤں کی کہانیاں سناتے تھے، میری والدہ ژہوسا دیومالائی کہانیوں سے ہمیں مسحور کیے رکھتیں جو ان گنت نسلوں سے چلی آ رہی تھیں۔ یہ کہانیوں میرے طفلانہ تصور کو انگیخت کرتیں اور عموماً ان کوئی اخلاقی سبق پنہاں ہوتا۔ ایک کہانی جو ماں نو ہمیں سنائی اس مسافر کی ہے جسے ایک بوڑھی عورت ملی تھی جس کی آنکھوں مے ں خوفناک موتیا بند تھا۔ بڑھیا نے مسافر سے التجا کی کہ اس کی مدد کرے مگت اس نے آنکھیں پھیر لیں۔ پھر ایک اور آدمی آیا اد بڑھیا نے اس سے درخواست کی کہ اس کی آنکھیں صاف کر دے۔ اگر چہ یہ ناشگوار تھا، اس آدمی نے یہ کام انجام دیا۔ پھر معجزاتی طور پر بڑھیا کی جلد سے چھلکے اترنے لگے اور وہ جوان اور خوبصورت بن گئی۔ مگر اس کہانی میں یہ مستقبل پیغام پوشیدہ ہو۔ نیکی اور دریا دلی کا حوصلہ ایسے طریقوں سے ملتا ہے جو

انسان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں ہوتے۔

تمام ژہوسا بچوں کی طرح میں مشاہدے کے ذریعے خاصا علم حاصل کیا۔ ہم سے یہ توقع کی جاتی تھی کی ہم سوالات کے ذریعے نہیں بلکہ نقل اور دوسروں کی ریس کے ذریعے علم سیکھیں۔ جب میں پہلی بار سفید فاموں کے گھروں میں جانے لگا تو میں دیکھ کر اکثر ہکا بکا رہ جاتا کہ ان کے بچے کس طرح اپنے والدین سے بے تحاشا سوالات کرتے ہیں اور والدین ان کے جوابات دیتے ہوئے کبھی کبیدہ خاطر نہیں ہوتے ادھر میرے گھر میں سوالات کو ایک مصیبت خیال کیا جاتا تھا اور بالغ افراد چھوٹوں کو صرف وہیا طلاعات فراہم کرتے جو ان کے خیال میں غروری ہوتیں۔

میری اور اکثر ژہوسا لوگوں کی زندگی ان دنوں رسوم و رواج سے تشکیل پاتی تھی یہی ہماری زندگی کا محور تھے اور ان کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آدمی اپنے آباؤ اجداد کے طے کردہ راستے پر چلتے رہتے۔ عورتیں اس طرح کی زندگی تو بسر کرتیں جیسی ان سے پہلے ان کی مائیں بسر کرتی تھیں۔ کسی کے بتائے بغیر جلد ہی میں نے وہ ضابطے اپنا لیے جو مردوں اور عورتوں کے تعلقات پر حاوی تھے۔ میں نے جان لیا کہ ایک آدمی کو ایسے مکان میں داخل نہیں ہونا چاہیے جس میں کسی عورت نے حال ہی بچہ جنا ہو اور یہ کی نئی نئی شادی شدہ عورت کو اتک بڑی تقریب کے بغیر اپنے نئے گھر کے کرال میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے یہ بھی جان لیا کہ اپنے آباؤ اجداد کو نظر انداز کرنے سے بدقسمتی اور زندگی میں ناکامی جیسی لعنتیں آ گھیرتی ہیں۔

اگر تم کسی طرح اپنے آباؤ اجداد کی تحقیر کر بیٹھو تو اس فروگذاشت کا کفارہ یہ ہوگا کہ ایک روایتی معالج یا قبائلی بزرگ سے مشورے کیا جائے جو آنجہانی بزرگوں سے رابطہ کر کے تمہاری معافی ان تک پہنچا دے گا۔ یہ تمام اعتقادات میرے نزدیک مکمل طور پر قدرتی نوعیت کے تھے۔

سفید فاموں سے پہلا ٹاکرا

قونو میں اپنے لڑکپن کے دوران میری چند سفید فاموں سے ملاقات ہوئی۔ لوکل مجسٹریٹ بھی فام تھا اور قریب ترین دکاندار بھی سفید فام۔ وقتاً فوقتاً سیاح یا پولیس والے ہمارے علاقے سے گزرتے۔ یہ سفید فام مجھے دیوتاؤں کی طرح شاندار لگتے اور میں اس بات سے آگاہ تھا کہ ان سے خوف اور احترام کا ملا جلا سلوک کیا جانا چاہیے۔ لیکن میری زندگی میں ان کا رول دور کی بات تھی اور میں سفید فاموں یا اپنی قوم اور ان دور دراز سے آئے ہوئے عجیب و غریب لوگوں کے باہمی تعلقات کے بارے میں بہت کم سوچتا۔

قونو کی ہماری چھوٹی سی دنیا میں مختلف جرگوں یا قبیلوں کے درمیان واحد قابت ژہوسا اور ایمافینگو کی باہمی رقابت تھی۔ آخر الذکر تھوڑی تعداد میں ہمارے گاؤں میں رہتے تھے یہ لوگ امفی کین دور میں شاکا زولو کی فوجوں سے بھاگ کر مشرقی کیپ میں پہنچے تھے۔ امفی کین لڑائیوں اور ہجرتوں کی اس بڑی لہر کا نام ہے جو 1820ء اور 1840ء کے درمیان شاکا اور زولو ریاست کے عروج سے شروع ہوئی تھیں۔ ان لڑائیوں کے دوران زولو جنگجو حریفوں کے علاقے فتح کرنے اور پھر تمام قبیلوں کو فوجی حکومت میں متحد کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ایمافینگو جو اصلاً ژہوسا زبان بولنے والے نہیں تھے، وہ امفی کین کے مہاجر تھے اور ایسے جان جرنے پر مجبور تھے۔ جنہیں دوسرے افریقی انجام نہیں دیتے تھے۔ جبکہ ژہوسا قبایل ایسی خدمات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن ایمافینگو محنتی لوگ تھے اور وہ یورپیوں سے اپنے روابط کے باعث اکثر دوسرے افریقیوں کے مقابلے میں زیادہ تعلیم یافتہ اور مغربی تھے۔

جب میں لڑکا تھا، ایمافینگو ہمارے معاشرے کا سب سے ترقی یافتہ حصہ تھے اور وہ پادری، پولیس مین، استاد، کلرک اور ترجمان فراہم کرتے تھے۔ انہوں نے ہی

سب سے پہلے عیسائیت قبول کی، بہتر مکانات بنائے اور زراعت کے سائنسی طریقے اپنائے اور وہ اپنے ژھوسا ہم وطنوں کی نسبت زیادہ مالدار تھے۔ وہ مشنریوں کی اس کہاوت کی تصدیق کرتے تھے کہ مسیحی ہونا مہذب ہونا ہوا اور مہذب ہونا مسیحی ہونا ہے ایمافینگو کے لئے ہمارے ہاں ابھی تک عناد سا پایا جاتا تھا لیکن ماضی کے حوالے سے میں اسے قبائلی دشمنی سے زیادہ حسد سے منسوب کرتا ہوں۔ یہ مقامی کنوعیت کی قبائلیت جس کا میں نے لڑکپن میں مشاہدہ کیا نسبتا بے ضرر تھی، اس مرحلے پر میں نے ان پرتشدد قبائلی رقابتوں کا نہ تو مشاہدہ کیا اور نہ مجھے شک گزرا جن کو بعد جنوبی افریقہ کے سفید فام حکمران نے ہوا دی۔

میرے باپ نے عسائیت قبول نہ کی

میرے والد ایمافینگو کے لئے روا رکھے جانے والے تعصب سے بری تھے اور انہوں نے دو ایمافینگو بھائیوں جارج اور بینا میکیلا سے دوستی کر رکھی تھی۔ یہ دونوں بھائی جارج ایک ریٹائرڈ ٹیچر تھا اور بین پولیس کا سپاہی تھا۔ امیکیلا بھائیوں کے عسائیت قبول کر لینے کے باوجود میرے والد عیسائیت سے الگ تھلگ رہے اور اس کے بجائے انہوں نے عظیم ژھوسا روح یعنی اپنے آباؤ اجداد کے خدا پر ایمان برقرار رکھا۔ میرے والد ایک غیر سرکاری پروہت تھے اور وہ بکریوں اور بچھڑوں کع ذبح کرنے کی رسموں کی صدارت کرتے اور فصلوں کی بوائی، کٹائی، پیدائش، شادی، ابتدائیہ تقریبات اور تدفین جیسی مقامی روایتی رسوم انجام دینے کی رہبری کرتے تھے۔ انہیں اس مذہبی ذمہ داری پر باقاعدہ فائز کیے جانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ژھوسا کے روایتی مذہب کی خصوصیت ہے آفاقی وحدت اور اس میں دینی اور دنیاوی اور فطری روحانی زندگی کے مابین کوئی امتیاز نہیں ۔

جبکہ امیکیلا بھائیوں کے عقیدے نے میرے والد پر کوئی اثر ڈالا میری کو اس نے ضرور متاثر کیا اور عیسائی بن گئیں۔ فینی ان کا مسیحی نام تھا اور یہ گرجے میں انہیں دیا

گیا تھا۔ امیبکیلا بھائیوں سے متاثر ہو کر میں نے ازخود میتھوڈسٹ فرقے سے بپتسمہ لے لیا، جسے ان دنوں ویزلیان چرچ کہتے تھے بپتسمہ لے کر میں سکول جانے لگا۔ امیبکیلا بھائی اکثر مجھے کھیلتے ہوئے یا بھیڑیاں کی رکھوالی کرتے ہوئے دیکھتے تھے اور میرے قریب آکر مجھ سے باتیں کرتے تھے۔ ایک روز جارج امیبکیلا نے میری ماں سے ملاقات کی۔ تمہارا بیٹا ایک ہوشیار نوجوان ہے۔ اس نے کہا اسے سکول جانا چاہیے۔ میری ماں خاموش رہی۔ ہمارے خاندان میں کبھی کوئی سکول نہیں گیا تھا اور میری ماں امیبکیلا کے مشورے پر کان دھرنے کو تیار نہیں تھی لیکن انہوں نے بات میرے والد تک پہنچادی جنہوں نے اپنی تعلیم سے محرومی کے باوجود فوراً فیصلہ کرلیا کہ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے کو سکول جانا چاہیئے۔

سکول کے لئے تیاری

سکول کی عمارت ایک ہی کمرے پر مشتمل تھی اور اس کی چھت مغربی طرز کی تھی۔ سکول قونو گاؤں سے پہاڑی کے دوسری جانب تھا۔ میں اس وقت سات سال کا تھا جب ایک روز میرے والد نے مجھ سے علیحدگی میں کہا۔ تمہیں سکول جانے کے لئے ایک مناسب لباس پہننا چاہیے۔ اس وقت تک قونو کے لڑکوں کی طرح میں بھی صرف ایک کمبل پہنتا تھا جو ایک کندھے کے گرد لپٹا ہوتا اور کمر پر اسے پن لگی ہوتی۔ میرے باپ نے مجھے اپنا ایک پاجامہ لیا اور اسے کاٹ کر گھٹنوں تک چھوٹا کردیا۔ انہوں نے مجھ سے وہ پہننے کو کہا جو مجھے کم وبیش پورا آ گیا اگرچہ اس کی کمر بہت بڑی تھی۔ میرے والس نے پھر رسی کا ایک ٹکڑا لیا اور پاجامہ میری کمر پر باندھ دیا۔ اس وقت میں اس پاجامے پہن کر اتنا فخر محسوس نہیں کیا جتنا مجھے اپنے باپ کا کٹا ہوا پاجامہ پہن کر محسوس ہوا تھا۔

سکول میں پہلے دن میری استانی مس اڈنگین نے ہم سب کو ایک ایک انگریزی نام دیا اور کہا کہ سکول میں تمہارا یہی نام ہوگا۔ یہ ان دنوں افریقیوں میں رواج تھا اور

بلا شبہ ہماری تعلیم کے برطانوی تھی، جس میں خودبخود برطانوی تصورات، برطانوی ثقافت اداروں کی برتری اجاگر ہوتی تھی۔ اس میں افریقن دونوں نام رکھتے ہیں۔ سفید فام افریقی ناموں کا تلفظ کرنے کے قابل نہیں تھے یا اس پر آمادہ نہیں تھے اور وہ افریقی نام رکھنے کو غیر مہذب ہونا خیال کرتے تھے اس روز اڈنگین نے مجھے بتایا کہ تمہارا نیا نام نیلسن ہے۔ اس نے خاص نام ہی مجھے عطا کیوں کیا، یہ نہیں جانتا۔ شاید اس کا تعلق عظیم برطانوی بحری کپتان لارڈ نیلسن سے تھا لیکن یہ محض ایک قیاس ہوگا۔

تمباکو نوشی کی موت

ایک رات جب میں نو سال کا تھا، میں گھر میں ہلچل سے جاگ اٹھا میرے والد جو اپنی بیویوں کے ہاں باری باری آیا کرتے تھے اور ہمارے ہاں شاید مہینے میں ایک ہفتے کے لئے آتے تھے وہ آ پہنچے تھے۔ لیکن وہ بے وقت آئے تھے اور ہمیں چند مزید دنوں تک ان کے آنے کی توقع نہ تھی۔ وہ میری ماں کے جھونپڑے میں فرش پر پشت کے بل لیٹے تھے اور لگاتار کھانس رہے تھے۔ میری نوجوان آنکھوں نے بھانپ لیا کہ میرے والد اب دنیا میں زیادہ عرصہ رہنے والے نہیں۔ وہ کسی طرح کی پھیپھڑوں کی بیماری میں مبتلا تھے جس کی تشخیص نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں گئے تھے۔ وہ جھونپڑے میں کئی دن رہے اور اس دوران نہ اٹھے اور نہ بات کی اور ایک انہوں نے بہت بری کروٹ لی۔ میری امی اور میرے باپ کی جوان ترین بیوی نودیامانی جو ہمارے ہاں ٹھہرے آئی ہوئی تھی دونوں ان کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ رات گئے والد نے نودیامانی کو بلا کر کہا میرا تمباکو لاؤ۔ میری امی اور نودمامانی نے مشورہ کیا کہ ان کی موجودہ حالت میں انہیں تمباکو دینا دانشمندی نہیں ہوگی لیکن وہ لگاتار تمباکو مانگتے رہے اور آخرکار نوریامانی نے ان کا پائپ تمباکو سے بھر کر انہیں پکڑا دیا۔ میرے والد نے کش لگائے اور خاموش ہوگئے، وہ شاید ایک

گھنٹہ تمباکو نوشی کرتے رہے اور پھر انہوں نے جان دے دی جبکہ ان کا پائپ ابھی تک سلگ رہا تھا۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس کے سے زیادہ غم کبھی محسوس کیا ہو۔ اگر چہ میری ماں میری ہستی کا مرکز تھیں، میں اپنے والد کے آئینے میں اپنے وجود کا تعین کرتا تھا۔ میرے والد کی رحلت نے میری پوری زندگی اس طرح بدل دی جس کا اس وقت مجھے کوئی احساس نہ ہوا۔ ماتم کے مختصر عرصے کے بعد میری ماں نے مجھے اطلاع دی کی اب تن قونوستے چلے جاؤگے۔ میں نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ میں کیوں اور کہاں جارہا ہوں۔

روانگی اپنے گاؤں سے

میں نے اپنی چند چیزیں پیک کیں اور ایک صبح سویرے ہم مغرب کی طرف سفر پر روانہ ہو گئے جہاں مجھے ایک نئی جگہ رہنا تھا۔ میں نے اپنے باپ کی موت کا ماتم کم کیا اور اس دنیا سے محرومی کا سوگ زیادہ کیا جسے میں پیچھے چھوڑے جا رہا تھا۔ قونوکو میں پوری طرح جانتا تھا اور اس سے غیر مشروط محبت کرتا تھا جیسا کہ ہر بچہ اپنے پہلے گھر سے کرتا ہے۔ پہاڑیوں کے پیچھے غائب ہونے سے پہلے میں نے مڑ کر اپنے گاؤں کو آخری بار دیکھا۔ مجھے سادہ جھونپڑے اور ان میں روزمرہ کے کام انجام دیتے ہوئے لوگ نظر آئے، وہ ندی نظر آئی جہاں میں چھینٹے اڑاتے ہوئے دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ مکئی کے کھیت اور سرسبز چراگاہیں نظر آئیں جہاں بھیڑ بکریاں کے ریوڑ چر رہے تھے۔ میں نے اپنے دوستوں کا تصور کیا جو چھوٹے پرندوں کے شکار پر نکلتے، گائیوں کے تھنوں سے میٹھا دودھ پیتے اور ندی کے سرے پر جوہڑ میں غوطے لگاتے تھے۔ سب سے بڑھ کر میری آنکھیں ان تین سادہ جھونپڑوں پر جم گئیں جہاں میں اپنی ماں کی محبت اور حفاظت میں نزے لیتا ہے یہی تین جھونپڑے تھے جنکے ساتھ میری تمام خوشیاں اور میری زندگی وابستہ تھی اور مجھے

اس بات پر پشیمانی ہوئی کہ میں روانہ ہونے سے پہلے ان میں سے ہر ایک کو نہیں چوما تھا۔ میں یہ تصور نہ کر سکا تھا کہ میں جس مستقبل کی طرف جا رہا تھا وہ کس طرح اس ماضی کا مقابلہ کر سکتا ہے جسے میں پیچھے چھوڑے جا رہا تھا۔

ہم ماں بیٹا خاموشی سے پیدل چلتے رہے یہاں تک کہ سورج افق کی طرف آہستہ آہستہ ڈوبنے لگا۔ ماں اور بچے کے درمیان دل کی خاموشی میں تنہائی نہیں ہوتی۔ میری ماں اور میں نے کبھی زیادہ باتیں نہیں کیں لیکن ہمیں کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے کبھی اس کی محبت کے بارے میں شک نہیں کیا یا اس کی حکمتوں پر جرح نہیں کی۔ یہ پتھریلی، ٹیڑھی میڑھی، کچی سڑکوں پر اور پہاڑیوں کے اوپر نیچے تھکا دینے والا سفر تھا، ہم ان گنت دیہات کے پاس سے گزرے لیکن ہم انہیں نہ رکے۔ سہ پہر گئے درختوں سے گھری ایک اتھلی وادی آئی اور وہاں ہم ایک گاؤں میں پہنچے ،جس کے مرکز میں ایک بڑا اور شاندار گھر تھا اس طرح کا گھر میں نے پہلے کبھی دیکھا تھا اور مجھے اس پر تعجب ہو رہا تھا۔ عمارتیں دو اینگ ژیڈ یعنی مستطیلی مکانات اور سات رونڈ یولز یعنی بڑھیا جھونپڑیوں پر مشتمل تھیں سب پر سفید چونا پھیرا ہوا تھا، جو ڈوبتے سورج کی روشنی میں بھی چندھیا رہا تھا۔ سامنے ایک بڑا باغ تھا ایک مکئی کا کھیت جس کے گرد آڑو کے درخت لگے ہوئے تھے جن کی شاخیں گولائی میں تراشی گئی تھیں۔ گاؤں کے پیچھے ایک اور زیادہ کشادہ باغ پھیلا ہوا تھا جس میں سیب کے درخت، سبزیوں کے قطعات، پھولوں کی ایک پٹی اور جعفری کی ایک قطار تھی۔ قریب ہی سفید آرائشی پلستر والا گرجا تھا۔

جو پہاڑوں کے اوپر دیکھتا ہے

گوند کے دو درختوں کے سائے میں جو بڑے مکان کے اگلے دروازے کی زینت تھے تقریباً بیس قبائلی بزرگوں کا ایک گروہ بیٹھا تھا۔ احاطے کے ارد گرد کم از کم پچاس مویشیوں اور پانچ سو بھیڑوں کا ایک گلہ مزے مزے سے چر رہا تھا۔ ہر چیز

سے خوبصورتی آشکار تھی اور دولت اور حسن ترتیب کا یہ منظر میرے تصور سے ماورا تھا۔ یہ عظیم مقام اتحی کیزو ینی تھیمبو لینڈ کا عبوری دار الحکومت تھا یعنی چیف جونگن تا با ددا لند یبو، تھیمبو قوم کے قائم مقام ناظم کی شاہی رہائش گاہ۔ جب میں اس تمام شان و شوکت پر سوچ بچار رہا تھا، مغربی گیٹ سے ایک بڑی سی کار اندر داخل ہوئی اور سائے میں بیٹھے ہوئے آدمیوں نے فوراً ہی اپنے ہیٹ اتارے اور پھر اچھل اچھل کر نعرے لگانے لگے: بے تی..........آ..............آ، جونگن تابا، (جونگن تابا زندہ باد) یہ ژہوسا قوم کا اپنے چیف کو روایتی سلام تھا۔ کار میں جس کے بارے میں بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ شاہانہ گاڑی فورڈ وی 8 ہے، ایک پست قامت ناٹا سا آدمی باہر آیا جس نے ایک چست سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر اعتماد اور ایسے شخص کا وقار جونگن تابا کے لغوی معنی ہیں وہ جو پہاڑوں کے اوپر دیکھتا ہے اور وہ ایک ایسی شخصیت تھا جس کے ہٹے کٹے جسم پر تمام نظریں مرکوز تھیں اس کے نین نقش گہرے تھے اور چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی اور وہ درخت کے نیچے کھڑے آدمیوں میں سے ہر ایک سے ہاتھ ملاتا گیا جن کے بارے میں مجھے پتہ چلا کہ وہ اعلیٰ ترین تھیمبو ایوان انصاب کے ارکان ہیں۔ یہ ریجنٹ یعنی ناظم تھا جسے اگلے عشرے کے لئے میرا سرپرست اور مربی بننا تھا۔

جونگن تابا اور اس کے دربار کو دیکھتے ہوئے میں اپنے آپ کو ایک ایسے پودے کی طرح محسوس کر رہا تھا جسے جڑوں اور شاخوں سمیت زمین سے نکال کر کسی ندی کے وسط میں پھینک دیا گیا جس کی تند و تیز لہروں میں وہ بہا جا رہا ہو۔ مجھے خوف اور تحیت کا ملا جلا احساس ہوا۔ اس وقت تک مجھے اپنی خوشیوں کے سوا کسی چیز کی فکر نہ تھی۔ مجھے دولت، مرتبے، شہرت یا اختیار کا کوئی خیال نہ تھا۔ اب اچانک ایک نئی دنیا میرے سامنے وا ہوئی۔ غریب گھرانوں کے بچے اکثر بہت سی نئی ترغیبات کا شکار ہو جاتے ہیں جب اچانک زیادہ دولت سے طے شدہ عقائد اور وفاداریاں متزلزل ہونے لگی

ہیں۔میرے والدین نے جن کمزور بنیادوں پر میری پرورش کی تھی وہ ہلنے لگی تھیں۔ اس لمحے میں نے دیکھا کی زندگی میرے لئے ایک لڑاکا چمپین سے بڑھ کر بہت کچھ ہے۔

جونگن تابا کی سرپرستی میں

بعد میں مجھے چلا کہ میرے باپ کی موت کی بنا پر جونگن تابا میرا سرپرست بننے کی پیشکش کی تھی........یہ کہ وہ مجھ سے اپنے دوسرے بچوں جیسا برتاؤ کرے گا اور مجھے انہی کی طرح مراعات حاصل ہوں گی۔میری ماں کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا ناظم کی طرف سے ایسی پیشکش کو کوئی کر سکتا تھا۔وہ مطمئن تھیں کہ اگرچہ انہیں مجھ سے جدا ہونا پڑے گا، ناظم کی نگرانی میں میری تربیت زیادہ سودمند ہو گی۔ناظم نہیں بھولا تھا کہ یہ میرے والد کی مداخلت ہی تھی جس نے اسے قائم مقام چیف بنوایا تھا۔میری ماں اتحی کیزوینی میں ایک دو دن رہیں اور پھر قونو لوٹ گئیں۔ ہماری جدائی خاموشی سے ہوگئی۔نہ اس نے دعائیں دیں، نہ نصیحتیں کیں اور نہ میری پیشانی چومی۔میرا خیال ہے وہ مجھ سے جدا ہوتے وقت مجھے غم کا احساس نہیں دلانا چاہتی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ کیرے والد کی خواہش تھی کہ میں تعلیم حاصل کرکے ایک وسیع دنیا کے لئے آپ کو تیار کروں اور قونو میں رہ کر میں یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ماں کی شفقت بھری نظروں اور تعاون کی ضرورت تھی اور جب وہ روانہ ہونے لگیں تو مڑ کر مجھ سے کہنے لگیں: میرے بیٹے کمت ہمت کس لو بچے الثر بہت کم جذباتی ہوتے ہیں، بالخصوص اگر وہ کسی نئے گھر کی مسرتوں سے معمور تھا، میں کمر ہمت کیسے نہ کس لیتا؟ میں پہلے ہی ایک نیا خوبصورت لباس پہنے ہوئے تھا جو میرے سرپرست نے مجھے خرید کر دیا تھا۔

میں سکول جانے لگا

میں اتحی کیزوینیکی روزمرہ کی زندگی میں تیزی سے کھو گیا۔ایک بچی کیسے ماحول کو

تیزی سے اختیار کرتا ہے یا بالکل نہیں کرتا......اور میں عظیم مقام کا اس طرح عادی ہو گیا تھا جیسے میں وہیں پلا بڑھا تھا۔میرے نزدیک یہ ایک جادوئی بادشاہت تھی، ہر شے مسرت انگیز تھی۔جو کام قونو میں مشکل لگتے تھے، اچی کیزو ینی میں ایک دلچسپ مہم بن گئے تھے۔جب میں سکول میں نہ ہوتا تو ایک کھلنڈرا، ایک ویگن گائیڈ ایک چرواہا بن جاتا۔میں گھوڑوں پر سواری کرتا اور غلیل سے پرندے شکار کرتا اور مزے اڑانے کے لئے لڑکوں کے ساتھ ہو لیتا اور رشاخیں ناچتے ہوئے گزارتا جبکہ دائیں بائیں خوبصورت تھیمبو دوشیزائیں گیت گاتیں اور تالیاں بجاتیں۔اگرچہ مجھے قونو اور اپنی ماں یاد آتے مگر میں اپنی نئی دنیا میں مکمل طور پر محو تھا۔

میں ایک کمرے کے سکول میں جانے لگا جو محلے کے بالکل قریب تھا۔وہاں میں انگریزی ژھوسا زبان اور تاریخ پڑھتا۔میں چیمبرز انگلش ریڈر پڑھتا اور کالی سلیٹوں پر اپنے سبق لکھتا۔میرے اساتذہ، مسٹر فادانا اور بعد میں مسٹر گیکوا نے مجھ میں خاص دلچسپی لی۔میری اپنی خود نظمی کو میری خالہ پھاتوی سے بڑی تقویت ملی جو عظیم مقام میں رہتی تھیں اور ہر شام میرے ہوم ورک کی پڑتال کرتی تھیں۔

اچی کیزوینی میں میتھوڈسٹ چرچ ایک مشن اسٹیشن تھا اور یہ قصبہ قونو کی نسبت جدید تر اور زیادہ مغربی تھا لوگ جدید لباس میں ملبوس ہوتے۔مرد سوٹ پہنتے اور عورتیں مشنریوں کے سخت پروٹسٹنٹ سٹائل کی پیروی کرتیں یعنی کونا لمبا سکرٹ اور گردن تک اونچا بلاؤز جس کے ساتھ ایک موٹی چادر کندھے پر ڈالی ہوتی اور ایک سکارف جو نفاست سے سر کے گرد لپٹا ہوتا۔

جسٹس......میرا لنگوٹیا

اگر اچی کیزوینی کی دنیا ناظم کے گرد گھومتی تھی تو میری چھوٹی سی دنیا ان کے دو بچوں کے گرد گھومتی تھی۔بڑا لڑکا جسٹس ان کا واحد بیٹا اور عظیم مقام کا وارث تھا اور نومافو ناظم کی بیٹی تھی میں ان کے ساتھ رہتا اور مجھے بھی ان کا سا احترام ملتا۔ہم ایک

ہی طرح کی غذا کھاتے ایک ہی طرح کے کپڑے پہنتے اور ایک ہی طرح کے کام کرتے۔ بعد میں تخت کے وارث سباتا کا بڑا بھائی انگزیکو ہم آ شامل ہوا۔ ہم چاروں مل کر ایک شاہی چوکابن بارے میں خاصے فکر مند ہوتے، میری رہنمائی کرتے اور مجھے سزا دیتے اور یہ سب کچھ ایک پیار بھرے سلیقے سے کرتے۔ جونگن تا باسخت مزاج تھا لیکن مجھے اس کی محبت کے بارے میں کبھی شبہ نہ ہوا۔ وہ مجھے ٹاٹوم خولو کے گھریلو نام سے پکارتے جس کا مطلب ہیت دادا ابا......... کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ جب میں سنجیدہ ہوتا ہوں تو بوڑھے آدمی کی طرح لگتا ہوں۔

جسٹس مجھ سے چار سال بڑا تھا اور وہ میرے والد کے بعد میرا پہلا ہیرو ٹھہرا۔ میں ہر معاملے میں اس کی طرف دیکھتا۔ وہ پہلے ہی کلارک بری میں پڑھتا تھا جو تقریبا 60 میل دور ایک بورڈنگ سکول تھا۔ طویل قامت۔ خوبصورت اور مضبوط جسم کا جسٹس ایک عمدہ کھلاڑی تھا اور کرکٹ، رگبی اور سوکر میں شاندار کھیل کھیلتا۔ وہ خوش باش اور سیر وتفریح کا شوقین تھا اور ایک فطری فنکار تھا جو حاضرین کو اپنے گیتوں اور ناچ گھر کے رقص سے مسحور کیے رکھتا۔ خواتین میں اس کا تعریفی حلقہ خاصا وسیع تھا لیکن اس کے نکتہ چیں بھی تھے جو اسے ایک نٹ کھٹ اور کھلنڈرا سمجھتے تھے۔ جسٹس اور میں بہترین دوست بن گئے اگر چہ ہم کئی لحاظ سے متضاد تھے میں خود بین تھا اور وہ جہان بیں۔ میں سنجیدہ تھا اور وہ چلبلا، اسے ہر بات آسان لگتی مگر مجھے اپنے لئے راستہ بناتا۔ اگر چہ ہم دونوں سے ایک جیسا کلوک ہوتا، ہماری قسمتیں مختلف تھیں۔ جسٹس کو تھیمبو قبیلے کی سب سے طاقتور سرداری ورثے میں ملنی تھی جبکہ مجھے وہی کچھ ملنا تھا جو ناظم اپنی دریا سے مجھے دینے کا فیصلہ کرتا۔

شہد کے چسکے

ہر روز میں ناظم کے مکان میں چھوٹے موٹے کام کرنے کے لئے آتا جاتا۔ اس کے لئے جو کام کرنے میں، میں سب سے زیادہ لطف محسوس کرتا وہ تھا اس کے سوٹ

استری کرنا اور یہ کام میں بڑے فخر سے کرتا۔ اس کے پاس نصف درجن مغربی سوٹ تھے اور میں احتیاط سے اس کی پتلونوں کی کریزیں بنانے میں گھنٹہ گھنٹہ صرف کرتا تھا۔ اس میں محل دو مغربی انداز مے مکانوں پر مشتمل تھا جن کی چھتیں ٹین کی تھیں۔ ان دنوں بہت کم افریقیوں کے مکانات مغربی انداز کے تھے اور انہیں بہت زیادہ دولت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ بڑے مکان کے گرد نصف دائرے میں چھ رونڈیول یعنی جھونپڑے ایستادہ تھے۔ ان کے فرش لکڑی کے تھے اور یہ چیز میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ناظم اور ملکہ دائیں طرف کے جھونپڑا اسٹور کا کام دیتا۔ ملکہ کی بہن کے جھونپڑے کے فرش کے نیچے شہد کی مکھیوں کا چھتہ تھا۔ ہم بعض اوقات فرش کے ایک دو تختے نکال کر شہد کے چسکے لیتے۔ میری امخی کیزوینی آمد کے کچھ عرصہ بعد ناظم اور اُسکی بیوی اکساناڈے یعنی وسطی مکان میں منتقل ہو گئے جو خود بخود عظیم مکان بن گیا۔ اس کے نزدیک تین چھوٹے جھونپڑے تھے......ایک ناظم کی والدہ کے لئے ملاقاتیوں کے لئے اور ایک جسٹس اور میرے لئے مشترک تھا۔

پادری نے بھوت کو بھگا دیا؟

امخی کیزوینی میں میری زندگی پر جو دو اصول حاوی تھے وہ تھے سرداری اور کلیسا۔ ان دونوں کے نظریات میں ایک مشکل ہم آہنگی پائی جاتی تھی اگرچہ اس وقت میں انہیں ایکدوسرے کا حریف نہیں سمجھتا تھا۔ میرے نزدیک عیسائیت اتنا زیادہ عقائد کا نظام نہیں تھا جتنا فرد واحد عزت ماب میتا ئیولو کا طاقتور وقیدہ بنا ہوا تھا۔ میرے نزدیک عیسائیت کی تمام تر کشش ان کے طاقتور وجود میں مشکل ہو گئی تھی۔ وہ اتنا ہی مقبول اور محبوب تھے جتنا کہ ناظم......اور یہ حقیقت کہ روحانی معاملات میں وہ ناظم سے برتر ہیں مجھے بہت متاثر کرتی تھی۔ لیکن کلیسا اس دنیا سے اتنا ہی متعلق تھا جتنا اگلی دنیا سے۔ میں دیکھتا تھا کہ عملاً افریقیوں کی تمام کامیابیاں کلیسا کی تبلیغی مساعی سے جنم لیتی محسوس ہوتی ہیں۔ مشن سکولوں میں کلرکوں، ترجمانوں، اور پولیس

والوں کو تربیت دی جاتی تھی جو فی الوقت افریقی آرزوؤں کے عروج کی نمائندگی کررتے تھے۔

عزت مآب میتا ئیولو پچاس کے پیٹے میں مضبوط جثّے کا آدمی تھا۔اس کی آواز گہری اور توانا تھی جس میں تبلیغ کرتے اور گاتے وقت لوچ آجاتا تھا۔جب وہ اخمی کیزوینی کے مغربی سرے پر واقع ایک سادہ گرجے میں تبلیغ کرتا تو ہال لوگوں سے بھرا ہوتا۔ہال عقیدت مندوں کے دعائیہ کلمات سے گونج اٹھتا جبکہ عورتیں نجات کی درخواست کرنے کے لئے پادری کے پاؤں میں جھک جاتیں۔عظیم مقام پر آنے کے بعد میں نے اس مےء بارے میں جو پہلی کہانی سنی وہ یہ تھی کہ اس مے صرف ایک بائبل اور ایک لالٹین بطور ہتھیار اپنے پاس رکھتے ہوئے ایک خطرناک بھوت کا پیچھا کر کے اسے بھگا دیا تھا۔مجھے اس کہانی میں ناقابل یقین پہلو یا تضاد نظر نہیں آتا تھا۔عزت ماب میتا ئیولو جس میتھوڈسٹ عقیدے کا پرچار کرتا تھا وہ آتش نوعیت کا تھا اور اس میں افریقی ارواح پرستی کی آمیزش تھی۔اس کی خدا عقلمند اور قادر مطلق تھا لیکن وہ منتقم بھی تھا جو کسی برے کام پر سزا دیئے بغیر چھوڑتا تھا۔

قونومین پہلےاور آخری مرتبہ میں اس روز گرجے گیا مجھے بپتسمہ دیا گیا تھا۔وہاں مذہب میرے نزدیک ایک رسم تھی جسے میں نے اپنی ماں کی خاطر اپنا لیا اور جس میں مجھے کوئی معنویت نظر نہیں آتی تھی لیکن اخمی کیزوینی میں مذہب زندگی کے تانے بانے کا ایک حصہ تھا اور میں ہر اتوار کو ناظم اور اس کی بیوی کے ساتھ گرجے جاتا۔ناظم اپنے مذہب کو بڑی سنجیدگی سے لیتا تھا۔حقیقت میں ایک ہی بار ناظم نے مجھے اس وقت ڈانٹا جب میں نے دوسرے گاؤں کے لڑکوں سے لڑائی لڑنے کی خاطر اتوار کی عبادت سے منہ موڑا تھا اور یہ ایک ایسی لغزش تھی جس کا میں نے کبھی دوبارہ ارتکاب نہیں کیا۔یہ واحد ڈانٹ نہیں تھی جو مجھے پادری سے منہ موڑنے کی بنا پر سہنی پڑی۔ایک سہ پہر میں چپکے سے عزت ماب میتا ئیولو کے باغ میں گیا اور کچھ مکئی کے

بھٹے چرا لیے۔ میں انہیں وئیں بھون کر کھا گیا۔ ایک نوجوان لڑکی نے مجھے باغ میں مکئی کے بھٹے کھاتے ہوئے دیکھ لیا اور فوراً پادری کو واطلاع کر دی۔ یہ خبر تیزی سے پھیلی ہوئی ناظم کی بیوی تک پہنچی۔ اس شام اس نے عبادت کے وقت تک میرا انتظار کیا جو اس کے مکان میں روزانہ کی رسم تھی۔ اس نے مجھے اس غلط کام پر ڈانٹا اور خدا کے ایک عزت خادم سے روٹی چھننے اور خاندان کی بے عزتی کرانے پر ملامت کی۔ اس نے کہا کہ فرشتہ غضب اس گناہ پر یقیناً تمہارا محاسبہ کرے گا۔ مجھے خوف اور شرم لے ملے جلے ناخوشگوار احساس نے آلیا..... خوف اس بات کا کہ مجھے ربانی سزا ملے گی اور شرم اس بات کی کہ میں نے اپنے سرپرست خاندان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔

"عظیم مقام" کی جمہوریت

ناظم کو سیاہ فاموں اور سفید دونوں کی طرف سے جو احترام ملتا تھا اور وہ بلا روک ٹوک جو اختیارات استعمال کرتا تھا، ان کے باعث میں سرداری کو ایک ایسا مرکز سمجھتا تھا جس کے گرد زندگی گردش کرتی تھی۔ امجی کیزوینی میں سرداری کی طاقت اور اثر ورسوخ ہماری زندگیوں کے ہر پہلو پر حاوی تھا اور یہی پیشگی وسلیہ تھا جس کے ذریعے ایک شخص اثر ورسوخ اور اعلیٰ مقام حاصل کر سکتا تھا۔

قیادت کے بارے میں میرے بعد کے خیالات ناظم اور اس کے عدالت کے مشاہدے سے متاثر ہوئے۔ قبائلی اجلاسوں کے مشاہدے سے میں نے بہت کچھ جانا جو عظیم مقام پر باقاعدگی سے منعقد ہوتے تھے۔ ان اجلاسوں کا کوئی شیڈول نہیں تھا بلکہ جب ضرورت ہوتی اجلاس بلا لئے جاتے اور ان میں خشک سالی، مویشیوں کے انتخاب، مجسٹریٹ کی نافذ کردہ پالیسیوں یا حکومت کے جاری کردہ نئے قوانین پر بحث ہوتی۔ تمام تھیمبوؤں کو ان میں شرکت کی اجازت تھی اور وہ بہت بڑی تعداد میں گھوڑوں پر یا پیدل شرکت کرنے آتے۔

ان مواقع پر ناظم اپنے ایمافا کاتھی میں گھرا ہوتا یہ بلند مرتبہ مشیروں کا ایک گروہ تھا جو ناظم کی پارلیمنٹ اور عدلیہ کا کام کرتا تھا۔ یہ دانشمند آدمی تھے جو قبائلی تاریخ اور رواج کا علم اپنے حافظے میں رکھتے اور جن کی آرا میں بڑا وزن ہوتا تھا۔

ناظم کی طرف سے ان چیفس اور سرداروں کو اجلاس کے بارے میں خطوط ارسال کردیے جاتے اور جلد ہی ''عظیم مقام'' پورے تھیمبو لینڈ سے آنے والے اہم ملاواتیوں اور مسافروں سے پر رونق ہو جاتا۔ مہمان ناظم کے مکان کے سامنے صحن میں جمع ہو جاتے اور وہ ہر ایک کی آمد پر اس کا شکریہ ادا کرتا اور اس امر کی وضاحت کرتا کہ اس نے انہیں کیوں طلب کیا ہے۔ اس لمحے سے اجلاس کے اختتام پذیر ہونے کے وقت تک وہ منہ سے ایک لفظ نہ کہتا۔

اجلاس میں ہر کوئی اپنی بات کہہ سکتا تھا۔ یہ جمہوریت تھی اپنی خالص ترین شکل میں۔ مقررین کے مرتبے کو اہمیت ضرور حاصل تھی مگر بات ہر ایک کی سنی جاتی تھی۔ چیف اور رعایا، جنگجو اور طبیب، دکاندار اور کسان، زمیندار اور مزدور سب اپنی بات کہنے میں یکساں طور پر آزاد تھے۔ لوگ بغیر کسی مداخلت کے بولتے اور اجلاس کئی کئی گھنٹے جاری رہتے۔ خود حکومتی کی بنیاد یہ تھی کہ عام آدمی اپنی اپنی رائے پیش کرنے میں آزاد ہیں اور شہریوں کی حیثیت سے ان کا مرتبہ برابر ہے۔۔۔۔ البتہ عورتیں شاید دوسرے درجے کی شہری سمجھی جاتی تھیں۔

دن کے دوران ایک عظیم ضیافت دی جاتی جس میں میں اتنا زیادہ کھا لیتا کہ یکے بعد دیگرے آنے والے مقررین کی تقریریں سنتے ہوئے میرا پیٹ دکھتا رہتا تھا میں اس بات کو نوٹ کرتا کہ کس طرح بعض مقررین جوش تقریر میں دور نکل جاتے اور زیر بحث نکتے کی طرف لوٹنے کا نام نہ لیتے جبکہ دوسرے مقررین براہ راست معاملے کو زیر بحث لاتے اور مربوط کرتے اور اپنی فنکاری سے سامعین کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے جبکہ دوسرے سنجیدہ رہتے اور جذبات آفرینی سے احتیاز کرتے۔

لوگ کس شدت اور بے رحمی سے ناظم پر تنقید کرتے تھے پہلے پہل اس پر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ تنقید سے بالا نہیں تھا، اکثر سب سے زیادہ ہدف تنقید بنتا لیکن الزام خواہ کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہوتا، ناظم سکون سے سنتا، اپنے دفاع کی کوشش نہ کرتا اور نہ کسی قسم کے جذبات کا اظہار کرتا۔

یہ اجلاس جاری رہتے حتیٰ کی شرکاء کسی طرح کے اتفاق رائے تک پہنچ جاتے۔ ان کا اختتام اتفاق پر ہوتا یا بالکل نہیں، تاہم اتفاق بھی اکثر عدم اتفاق کے لئے ہوتا، کسی مناسب وقت تک انتظار کرنے کے لئے۔ جمہوریت کا مطلب تھا کہ سب لوگوں کی بات سنی جائے اور فیصلہ اجتماعی طور پر ایک قوم کی حیثیت سے کیا جائے۔ اکثریتی حکومت ایک غیر ملکی تصور تھا اقلیت کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اکثریت اسے کچل ڈالے۔

ناظم صرف اجلاس کے اختتام پر بولتا جب سورج غروب ہو رہا ہوتا۔ اس کا مقصد جو کچھ کہا جا چکا ہوتا، اس کے کو سمیٹنا اور مختلف آرا کی صورت میں کوئی اتفاق رائے پیدا کرنا ہوتا۔

لیکن جو لوگ اختلاف کرتے تھے ان پر کوئی فیصلہ ٹھونسا نہیں جاتا تھا۔ اگر کوئی سمجھوتہ نہ ہوتا تو ایک اور اجلاس منعقد ہوتا۔ اجلاس کے بالکل اختتام پر ایک تعریف کن مغنی یا شاعر پرانے سامعین، ناظم کی قیادت میں، ہنس ہنس کر دوہرے ہو جاتے۔

ایک رہنما کی حیثیت سے میں نے ہمیشہ ان اصولوں کی پیروی کی ہے جن کا میں نے پہلی بار "عظیم مقام" پر ناظم کے کردار و عمل میں مشاہدہ کیا۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے بحث کے دوران اپنی رائے پیش کرنے سے پہلے ہر شخص کی بات سنی جائے۔ اکثر اوقات میری رائے ہی اتفاق تائے بن جاتی ہے۔ میں ناظم کا یہ قبول ہمیشہ یاد رکھتا ہوں: ایک رہنما ایک چرواہے کی مانند ہوتا ہے وہ ریوڑ کے پیچھے رہتا ہے اور ان

میں سے سب سے زیادہ سمجھدار بھیڑ کو آگے جانے دیتا ہے جبکہ دوسری بھیڑیں اس کی پیروی کرتی ہیں اور انہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ انہیں پیچھے سے راہ دکھائی جارہی ہے۔

افریقی تاریخ کے ہیرو

اخی کیزوینی میں رہ کر میں افریقی تاریخ میں دلچسپی لینے لگا۔ اس وقت تک میں نے صرف ژہوسا ہیروؤں کے بارے میں سنا تھا لیکن ''عظیم محل'' میں میں نے دوسرے افریقی ہیروؤں کے بارے میں سنا جیسے سیکھوکھونی، شاہ باپیدی، شاہ باسوتھو موشوشو اور زولوؤں کے بادشاہ ڈنگانی اور بمباتھا، ہنتسا اور کگاماو غیرہ۔ میں شخصیتوں کے بارے میں چیفس اور سرداروں سے سنا جو جھگڑے چکاتے اور مقدمے لڑنے ''عظیم مقام'' آتے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ وکلا نہیں تھے وہ مقدمے پیش کرتے اور ان پر فیصلہ لیتے۔ بعض دنوں میں وہ اس کے کام کو جلد نپٹا لیتے، پھر منڈلی لگا کر بیٹھے ایک دوسرے کو کہانیاں سناتے۔

میں خاموشی سے ان کے اردگرد منڈلاتا اور کہانیاں سنتا۔ وہ ایسے محاورے بولتے جو میں نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ ان کی گفتگو رسمی اور شاندار ہوتی، ان کا انداز سست اور دھیما ہوتا اور ہماری زبان کے روایتی چٹخارے طویل اور ڈرامائی ہوتے۔

شروع میں وہ مجھے پش کہہ کر بھگا دیتے اور مجھ سے کہتے کہ تم اتنے نوخیز کہ یہ باتیں نہیں سن سکتے۔ بعد میں وہ مجھے آگ یا پانی لانے یا عورتوں کو یہ بتانے کے لئے بھیجنے لگے کہ انہیں چائے درکار ہے اور ان ابتدائی مہینوں میں، میں ان کی فرمائشیں پوری کرنے میں اس طرح مصروف رہتا کہ ان کی گفتگو نہ سن پاتا، لیکن آخرکار انہوں نے مجھے اپنی منڈلی میں بیٹھنے کی اجازت دے دی اور تب مجھے عظیم افریقی محب وطن انسانوں کے بارے میں پتہ چلا جنہوں نے مغربی استعمار کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ میرے تخیل کو ان افریقی جنگجوؤں کی عظمتوں سے جلا ملی۔

معمر ترین سردار جوان منڈلی بازبڑوں کا میر مجلس بنتا وہ زویلی بھنگائل جوئی تھا جو شاہ انگوبن کوکا کے عظیم خانوادے کا بیٹا تھا۔ چیف جوئی اتنا بوڑھا تھا کہ اس کی جھریوں زدہ کھال اس کے جسم پر یوں لٹکتی جیسے ڈھیلا ڈھالا کوٹ ہو۔ اس کی کہانیاں آہستہ آہستہ کھیلتیں اور ان میں وقفے وقفے سے کھنکتی کھانسی شامل ہوتی جو اسے کئی کئی منٹ کے لئے رکنے پر مجبور کر دیتی۔ چیف جوئی بڑے علاقے کے تھیمبوؤں کی تاریخ پر سند سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہ بہت عرصہ اس علاقے میں رہا تھا۔

لیکن چیف جوئی جس قدر سالخوردہ دکھائی دیتا تھا جب وہ اپنی یعنی شاہ انگا نگ لزوی کے جنگجوؤں کا ذکر چھیڑتا، تو اسی قدر کئی دہائیاں جوان ہو جاتا۔ ناٹک کے انداز میں وہ اپنا نیزہ پھینکتا اور فتوحات اور شکستیں بیان کرتے کرتے میدان میں کھسکتا چلا جاتا۔ عا نگا نگ لزوی کی بہادری، دریا دلی اور عاجزی کا بار بار ذکر کرتا۔

چیف جوئی کی تمام کہانیاں تھیمبوؤں کے گرد نہیں گھومتی تھیں۔ جب اس نے پہلی بار غیر ژہوسا جنگجوؤں کا ذکر چھیڑا تو مجھے اس کی علت سمجھ نہ آئی۔ میری حالت اس لڑکے کی سی تھی جو مقامی فٹ بال ہیرو کی پوجا کرتا ہے اور قومی فٹ بال سٹار میں اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کیونکہ اس سے اس کا کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ بہت بعد میں، میں افریقی تاریخ کے دوسرے ہیروؤں اور ان کے کارناموں سے متاثر ہوا۔

گوروں کا تاریخی دھوکا

چیف جوئی سفید آدمیوں کے بڑا خلاف تھا جنہوں نے اس کے خیال میں ژہوسا قبیلے ٹکڑیوں میں بانٹ دیا تھا اور بھائی کو بھائی سے جدا کر دیا تھا۔ سفید آدمی نے تھیمبوؤں کو بتایا تھا کہ ان کی حقیقی سربراہ سمندر پار رہنے والی عظیم سفید ملکہ ہے اور یہ وہ اس کہ رعایا ہیں لیکن سفید ملکہ سیاہ آدمیوں کے لئے بدحالہ اور اپنے عقیدے سے بیزاری کے سوا کچھ نہ لائی تھی۔ اگر وہ ان کی سربراہ تھی تو وہ ایک برہ سربراہ تھی۔ چیف جوئی کی جنگی کہانیوں اور برطانویوں پر اس کی تنقید سے میرے اندر ناراضگی

اور دھوکی کھاتے کا احساس ابھتا جبکہ میرا پیدائشی حق پہلے ہی مجھ سے چھین لیا گیا۔

چیف جوئی نے کہا کہ افریقی عوام نسبتاً امن میں تھے حتیٰ کہ ای بے لونگو یعنی سفید لوگ آ پہنچے جو آگ اگلتے ہتھیار کے ساتھ سمندر پار سے آتے تھے۔ اس نے بتایا: ''ایک وقت تھا تھیمبو، پونڈو ژہوسا اور زولو ایک ہی باپ کے بچے تھے اور بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ سفید آدمی نے ان مختلف قبیلوں کی آبنتو یعنی بھائی چارے کا خاتمہ کر دیا۔ سفید آدمی کو زمین کی بھوک اور حرص تھی اور سیاہ آدمی نے اس کے ساتھ زمین کی شراکت کر لی جیسا کہ وہ ہوا اور پانی کی شراکت کرتے تھے اور زمین کسی خاص آدمی کی ملکیت نہ تھی لیکن سفید آدمی نے اسی طرح زمین پر قبضہ جما لیا جس طرح تم کسی آدمی سے اس گھوڑا چھین لیتے ہو''۔

ابھی مجھے علم نہیں تھا کہ ہمارے ملک کی تاریخ برطانوی نصابی کتب میں نہیں ملتی جن میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ جنوبی افریقہ کا آغاز 1662ء میں جان فان رائیبک کے راس امید کے ساحل پر اترنے سے ہوا۔ چیف جوئی سے مجھے معلوم ہوا کہ بنٹو بولنے والے لوگوں کی تاریخ کہیں شمال میں جھیلوں، سبز میدانوں اور ہری بھری وادیوں کے علاقے سے شروع ہوئی تھی اور ہزاروں سالوں کے عمل میں ہم بتدریج نیچے کو سفر کرتے کرتے اس عظیم براعظیم کے سرے تک پہنچ گئے، تاہم بعد میں مجھے پتہ چلا کہ چیف جوئی کی بیان کردہ تاریخ خصوصاً 1662ء کے بعد کی تفصیلات ہمیشہ درست نہیں ہوتیں۔

اَمّی کیزوینی میں میری حالت اس دیہاتی لڑکے کی سی تھی جو اچانک بڑے شہر میں آ نکلتا ہے۔ اَمّی کیزوینی، قونو سے کہیں زیادہ تہذیب یافتہ تھا اور یہاں کے باسی قونو والوں کو پسماندہ قرار دیتے تھے ناظم میرے قونو جانے پر معترض ہوتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اپنے پرانے گاؤں واپس جا کر بری صحبت میں پڑ جاؤں گا۔ اور رجب میں وقتو گیا میں نے بھانپ لیا کہ میری ماں کو ناظم کی طرف سے ہدایات ملی تھیں

کیونکہ وہ رتجسس ہو کر مجھ سے پوچھتی تھیں کہ میں کن کن کے ساتھ کھیلتا رہا تھا۔ تاہم کئی بار ناظم نے اس امر کا اہتما، کیا کہ میری ماں اور بہنوں کو ''عظیم مقام'' پر لایا جائے تا کہ وہ مجھ سے مل سکیں۔

میرا پہلا عشق

جب میں پہلی بار اچی کیزوینی پہنچا تو میری عمر کے بعض گرو مجھے ''یوکیل'' کہتے تھے جو ''عظیم مقام'' کی مہذب فضا میں رہنے کے لائق نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو شائستہ اور مہذب ظاہر کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ ایک دن گرجے میں مجھے ایک خوبصورت جوان عورت دکھائی دی جو عزت ماب ماتا یولو کی بیٹی تھی۔ اس کا نام ونی تھا۔ میں نے اس سے باہر چلنے کو کہا اور وہ رضامند ہو گئی۔ اوہ مجھ میں دلچسپی لیتی تھی مگر اس کی بڑی بہن نوما امپونڈو مجھے گنوار سمجھتی تھی۔ وہ اپنی بہن پر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں کتنا گنوار تھا، اس نے مجھے اپنے پاس دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ میں ابھی اپنے ہاں گاؤں کے کھانے کا عادی تھا جہاں چھری کانٹا استعمال نہیں ہوتے تھے۔ اپنے دسترخوان پر اس شرارتی بڑی باجی نے مجھے ایک پلیٹ پکڑا دی جس میں ایک چوزے کا بازو تھا جو نرم ہونے کے بجائے اس قدر سخت تھا کہ گوشت ہڈی سے الگ ہوتا ہی نہیں تھا۔

میں نے دوسری کو دیکھا کہ کس طرح چھری کانٹا آسانی سے استعمال کر رہے ہیں اور آہستگی سے اپنا گوشت کا ٹکڑا اٹھا لیا۔ چند لمحوں کے لئے میں نے دوسروں کو دیکھا اور پھر چوزے کے اس بازو سے گوشت الگ کرنا چاہا۔ پہلے تو میں اس امید اسے پلیٹ میں ادھر ادھر گھماتا رہا کہ گوشت ہڈی سے چھٹر جائے گا، پھر میں نے اسے چھری سے کاٹنے کی کوشش کی مگر وہ پھسل پھسل جاتا اور چھری بار بار ٹکراتی۔ میں نے بار بار کوشش کی اور پھر دیکا کہ بڑی باجی میری طرف دیکھ کر مدکرا رہی ہے۔ اور دانستگی سے اپنی چھوٹی بہن کی طرف نظر ڈلتی ہے جیسے کہہ رہی ہو: ''میں نے کہہ دیا

تھا کہ یہ ایسا ہی ہے''چوزے کا گوشت کھانے کی کوشش میں پسینے سے تر ہو گیا لیکن میں شکست تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا اور چوزے کا بازو اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر چھوڑنے لگا۔اس روز ظہرانے پر میں زیاسہ گوشت نہ کھا سکا۔

ظہرانے کے بعد بڑی بہن نے چھوٹی سے کہا:''اگر تم ایسے گنوار لڑکے سے محبت کرو گی تو اپنی پوری زندگی تباہ کر لو گی۔''لیکن یہ کہتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے کہ نوجوان لڑکی نے اس بات پر توجہ نہ دی۔میں جیسا بھی گنوار تھا،اس نے مجھ سے پیار کیا اگرچہ آخر کار ہم نے مختلف راستے اپنائے اور ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔وہ ایک مختلف سکول میں پڑھتی رہی اور اس نے استانی کا پیشہ اپنایا۔ہم نے چند سال خط کتابت کیا اور پھر مجھے اس کا سراغ نہ ملا حالانکہ اس وقت تک میں دستر خوان کے آداب سے خاصا آشنا ہو چکا تھا۔

جب مجھے''مرد''بنایا گیا

میں سولہ سال کا ہوا تو ناظم نے فیصلہ کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ میں مرد بن جاؤں۔ژہوسا رواج کے مطابق یہ صرف ایک طریقے سے ہو سکتا ہے،یعنی ختنے سے۔رواج کے مطابق ایک غیر مختون مرد اپنے باپ کی دولت کا وارث نہیں بن سکتا،شادی نہیں کر سکتا یا قبائلی رسوم ادا جروا سکتا۔ایک غیر مختون ژہوسا آدمی اصطلاحی لحاظ سے ایک تضاد ہوتا ہے کیونکہ اسے ایک مرد نہیں بلکہ ایک لڑکا خیال کیا جاتا ہے یہ محض ایک جراجی کا عمل نہیں ہوتا بلکہ ایک لمبی چوڑی رسم ہے جو مردانگی کے لئے تیار کرتی ہے اتک ژہوسا کی حیثیت سے میں ایک مرد کے طور پر اپنے سال اپنے ختنے کی تاریخ سے شروع کرتا ہوں۔

ختنہ سکول کی روایتی تقریب بنیادی طور پر جسٹس کے لئے منعقد کی گئی۔ہم باقی چھبیس کی تعداد میں تھے،رسا اس کا ساتھ دینے کے لئے وہاں موجود تھے۔نئے سال کے آغاز میں ہم نے دریائے امباشی کے کنارے ایک الگ تھلگ وادی میں

واقع پھونس کے دو جھونپڑوں کی طرف سفر کیا۔ یہ جھونپڑے تاتی ہالا رہا کہلاتے تھے اور تھیمبو بادشاہوں کے لئے ختنے کا روایتی مقام تھے۔ ہمیں ان جھونپڑوں میں معاشرے سے الگ تھلگ رہنا تھا۔ یہ مقدس وقت تھا۔ مجھے خوشی کا احساس تھا اور میں قوم کی رسوم میں حصہ لے کر مطمئن ہوتا تھا اور لڑکپن سے مردانگی میں داخل ہونے کے لئے تیار تھا۔

ہم ختنے کی اصلی تقریب سے چند روز پہلے دریا کے کنارے تاتی ہالا رہا پہنچ گئے۔ میں نے لڑکپن کے آخری چند دن نوآغاز ساتھیوں کی صحبت میں گزارے اور یہ صحبت بڑے مزے کی رہی۔ جھونپڑے بانا باکھی بلائی کے گھر سے قریب تھے جو ختنہ سکول میں سب سے دولت مند اور مقبول ترین لڑکا تھا وہ ایک پرکشش ،لڑکا گلیمر بوائے تھا جس کی بہت سی گرل فرینڈز ہمیں مزیدار چیزیں فراہم کرتی رہتیں۔ اگرچہ وہ لکھ سکتا تھا نہ پڑھ سکتا تھا مگر وہ ہم سب سے زیادہ ذہین تھا۔ وہ اپنے جوہانسرگ کے دوران کی کہانیاں سنا کر ہمیں اپنا گرویدہ بنائے رکھتا کیونکہ ہم میں سے کوئی کبھی جوہانسرگ نہیں گیا تھا۔ اس نے ہمیں سونے کی کانوں کی کہانیاں سنا سنا کر اس قدر شوق دلایا کہ میں ایک مطلق العنان حکمران بننے کے بجائے ایک کان کن بننے کو زیادہ پرکشش خیال کرنے لگا۔ ہمارے لئے کان کنوں کی دنیا پراسرار تھی۔ ایک کان کن بننے کا مطلب تھا مضبوط اور جرات مند بننا........اور یہ مردانگی کی علامتیں تھیں۔ بہت بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ بانا باکھی جیسے لڑکوں کی مبالغہ آمیز کہانیاں تھیں جنہوں نے بہت سے نوجوانوں کو فرار ہو کر جوہانسرگ کی کانوں میں کام کرنے پر آمادہ کیا جہاں وہ کثر اپنی صحبت اور زندگی س محروم ہو جاتے تھے۔ ان دنوں کانوں میں کام کرنا ایک ختنہ سکول کے عمل سے گزرنے کے مترادف خیال کیا جاتا تھا.... اور یہ ایک ایسا فسانہ تھا جس نے میری قوم کے زیادہ کانوں کے مالکان کو فائدہ پہنچایا۔ ختنہ سکول کی ایک رسم یہ ہے کہ تقریب سے پہلے لڑکا ایک جرات مند کارکردگی

دکھائے۔ ہرانے زمانے میں یہ کارکردگی مویشیوں پر دھاوا بولنے یا لڑائی کی شکل میں ظاہر ہوتی۔لیکن ہمارے زمانے میں یہ شغل فوجی سے زیادہ شرارتی نوعیت کے ہوتے تھے۔تانی ہالا رہا جانے سے کئی راتیں پہلے ہم نے ایک سور چرانے کا فیصلہ کیا ۔اجی کیزوینی میں ایک قبائلی کے پاس ایک خاص بوڑھا سٶر پیدا ہونے اور کسان کو چونکانے بطنے کے لئے ہم نے سٶر کو تیار کیا کہ وہ ہمارا کام آسان کتدے۔ہم نے افریقی خانہ ساز بیئر کی کچھ گادلی جس کی تیز بو سٶروں کو بڑی پسند ہوتی ہے اسے ایسے رخ پر دکھ دیا جہاں سے اس کی بو ہوا کے ساتھ سٶر تک پہنچ جائے۔اس کی بو سے سٶر اتنا مست ہوا کہ وہ باڑے سے باہر آ گیا اور ہماری بچھائی ہوئی گاد کی قطار کو نگلتا اور چاٹتا ہوا ہمارے پاس چلا آیا۔ہم نے اسے پکڑا کر فورا ذبح کرلیا اور آگ جلا کر ستاروں کی چھاؤں میں اس کا گوشت بھونا اور مزے مزے سے کھایا۔ سٶر کے گوشت کا ایسا مزا اس سے پہلے یا بعد میں کبھی نہ آیا۔

ایک صبر آزما مرحلہ

ختنے سے پہلی رات ہمارے جھونپڑوں کے قریب گانے اور ناچنے کی تقریب برپا ہوئی۔قریبہ دیہات کی عورتیں آئیں اور ان گیت گانے اور تالیاں بجانے کی لے پر ہم نے رقص کیا۔جوں جوں موسیقی تیز تر اور بلند ہوتی گئی ہمارے رقص میں زیادہ جوش آتا گیا اور ہم کچھ لمحوں کے لئے آنے والے وقت کو بھول گئے۔فجر طلوع ہونے کے ساتھ جب ستارے ابھی آسمان پر ٹمٹمار ہے تھے۔ہم نے اپنی تیاری کی ۔ہمیں جلوس کی شکل میں دریا کے ٹھنڈے پانی میں نہانے کیلئے جایا گیا۔یہ رسم اصل تو ریب سے پہلے ہمارے پاک ہونے کی ولامت تھی۔تقریب دوپہر کو منعقد ہوئی اور ہمیں دریا سے کچھ فاصلےپر ایک خالی جگہ قطار میں کھڑے ہونے کا حکم ملا، جہاں ناظم سمیت والدین اور رشتے داروں اور مٹھی بھر سرداروں اور مشتروں کا ہجوم جمع تھا۔ ہم صرف اپنے کمبل اوڑھے ہوئے تھے اور جب تقریب ڈھول کی تھاپ کے ساتھ

شروع ہوئی، ہمیں حکم دیا کہ ہم زمین پر بچھے ایک کمبل پر اپنی ٹانگیں سامنے پھیلا کر بیٹھ جائیں۔ میں اس وقت تناؤ میں پتیشان تھا اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جب نازک لمحہ آئے گا تو میرا ردعمل کیا ہوگا۔ اینٹھنے اور چیخنے کو مزوری کی علامت اور مردانگی کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں اپنے آپ، اپنے گروہ اور اپنے سرپرست کو شرمندہ نہیں کروں گا۔ ختنہ بہادری اور سخت کوشی کا امتحان ہوتا ہے، اس میں کوئی بے خوشی کی دوا استعمال نہیں کی جاتی اور آدمی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

دائیں طرف اپنے آنکھ کے گوشے میں نے دبلے اور بڑے آدمی کو دیکھا جو ایک خیمے سے برآمد ہوا اور پہلے لڑکے کے سامنے آ کر جھک گیا۔ مجمع میں جوش وخروش پیدا ہوا اور مجھ پر یہ جان کر ہلکی سی کپکپی طاری ہوگئی کہ رسم شروع ہوا چاہتی ہے۔ بوڑھا آدمی ایک مشہور اینگسیبی یعنی ماہر ختنہ تھا۔ اس کا تعلق گالیکا لینڈ سے تھا اور اسے اپنے انتے کے ایک ہی وار سے ہمیں لڑکوں سے مرد بنانا تھا۔

اچانک میں نے پہلے لڑکے کو چیخ کر کہتے سنا: ''اندی یی اندودا'' (میں مرد بن گیا۔) یہ جملہ ختنے سے چند لمحے پہلے سکھایا گیا تھا۔ چند سیکنڈ میں نے جسٹس کو گھٹی گھٹی آواز میں یہی جملہ کہتے سنا۔ اب دو لڑکے رہ گئے تھے اور پھر استرا مجھ تک پہنچنے والا تھا۔ میرا دماغ غالبا خالی ہوگیا تھا اور پھر میں نے بڑھے آدمی کو اپنے سامنے جھکتے ہوئے دیکھا۔ اس کا رنگ پیلا تھا اور اگرچہ دن ٹھنڈا تھا، اس کا چہرہ پسینے میں چمک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اتنی تیزی سے حرکت میں آئے کہ یوں لگا جیسے دوسری دنیا کی قوت انہیں کنٹرول کر رہی ہو۔ ایک لفظ کہے بغیر اس نے میرے حشفہ کی اوپری کھال پکڑی۔ اسے آگے کی طرف کھینچا اور پھر اس کا استرا حرکت میں آ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری رگوں میں آگ بھر دی گئی ہو۔ درد اتنا شدید تھا کہ میں نے اپنی ٹھوڑی چھاتی سے لگا لی۔ کئی سیکنڈ گزر گئے تب مجھے چیخنا یاد آیا اور پھر میں ہوش میں آ کر پکارا اٹھا: ''اندی یی اندودا''

میں نے نیچے نگاہ ڈالی تو ایک مکمل کٹاؤ نظر آیا جو صاف اور ایک چھلے کی طرح گول تھا لیکن مجھے شرم محسوس ہوئی کہ دوسرے لڑکوں نے میری نسبت زیادہ مضبوط اور زیادہ سخت جان ہونے کا مظاہرہ کیا تھا۔ انہوں نے میری نسبت زیادہ صحبت کے ساتھ مخصوص جملہ ادا کیا اپنی اذیت کو چھپانے کی پوری پوری کوشش کی۔ ایک لڑکا چیخ سلتا ہے لیکن ایک مرد اپنے درد کو چھپاتا ہے۔

میں نے اب ژہوسا آدمی کی زندگی کا اہم اٹھالیا تھا۔ اب میں شادی کرسکتا تھا، اپنا گھر بنا سکتا تھا اور اپنے کھیت میں ہل چلا سکتا تھا۔ اب میں برادری کے مشیروں میں شامل ہو سکتا تھا اور میرے الفاظ سنجیدگی سے لئے جاتے۔ تقریب میں مجھے میرے ختنے والا نام دیا گیا۔

''دالی بھونگا'' جس کا مطلب ہے ''بھونگا'' کا بانی جوٹرانسکائی کا روایتی حکمران ادارہ تھا۔ ژہوسا روبیت پرستوں کے نزدیک میرے پہلے دونا موں رولہلہلا یا نیلسن کی نسبت یہ نام زیادہ قابل قبول ہے اور مجھے اپنے نئے نام دالی بھونگا کا تلفظ کرتے ہوئے فخر محسوس ہوا۔

تقریب کا پراسرار اختتام

اُسترے کی ضرب کے فوراً بعد ایک معاون نے جو ختینہ ماسٹر کے پیچھے پیچھے تھا، آگے بڑھ کر زمین سے حشفے کی اوپری کھال اٹھائی اور اسے ہمارے کمبلوں کے کونے سے باندھ دیا۔ پھر ہمارے زخموں کی ایک شفا بوٹی سے مرہم پٹی کی گئی جس کے پتے باہر کانٹے دار تھے لیکن اندر سے ہموار اور وہ زخم سے نکلنے والے خون وغیرہ کو جذب کر لیتے تھے۔

تقریب کے اختتام پر ہم اپنے جھونپڑوں میں واپس آئے جہاں گیلی لکڑیوں کی آگ جل رہی تھی، جن سے دھوئیں کا بادل اٹھتا تھا۔ دھوئیں کے بارے میں یہ خیال بیجا کہ اس سے زخم جلد اچھا ہوتا ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا کہ دھواں دار جھونپڑوں

میں پست کے بل اسی طرح لیٹ جائیں کہ ایک ٹانگ پھیلی ہوئی ہوا اور دوسری جھکی ہوئی ۔ اب ہم ابا کو۔تھا بن گئے تھے یعنی مردانگی کی دنیا میں داخل ہونے والے ب ۔ایک ایک سر پرست ہماری نگرانی کرتا جو وضاحت کرتا کہ ہمیں کون کون سے اصولوں پر عمل کرنا ہوگا اگر ہم مردانگی میں ٹھیک طور پر داخل ہونا چاہتے ہیں ۔ سر پرست کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ ننگے اور حجامت کئے ہوئے کی علامت تھی اور مجھے اب بھی یاد کہ کس طرح میرے جسم پر خشک مٹی چھٹی تھی ۔

پہلی رات بارہ بجے ایک کارکن ہمارے جھونپڑے میں داخل ہوا اور اس نے آہستگی سے ہم سب کو جگا دیا ۔ہم سے کہا گیا کہ ہم جھونپڑے سے باہر نکل کرتا ریکی میں چلیں اور حشفے کی اوپری کھال دفن کر آئیں ۔اس عمل کی روایتی وجہ یہ تھی کہ بریدہ کھال جادوگروں کی نگاہوں سے چھپی رہے گی جو اسے برے مقاصد کے لئے استعمال کر سکتے ہیں لیکن علامتی طور پر ایسا کر کے ہم اپنے لڑکپن کو بھی دفن کر رہے تھے ۔میں گرم جھونپڑے سے نکل کرتا ریکی میں جھاڑیوں کے اندر نہیں جانا چاہتا تھا، پھر بھی باہر نکل کر درختوں میں چلا گیا اور چند منٹ بعد اپنے حشفے کی اوپری کھال زمین میں دفن کر کے لوٹ آیا ۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اپنے بچپن کی آخری یادگار اُتار پھینکی تھی ۔

2 بچھڑوں، 4 بھیڑوں کا تحفہ

ہم دو جھونپڑوں میں رہتے تھے .... ہر ایک میں تیرہ .... اس دوران ہماری زخم مندمل ہوتے گئے ۔ جب ہم جھونپڑوں سے باہر ہوتے تو ہمیں کمبلوں سے ڈھانپ دیا جاتا کیونکہ عورتوں کو ہمیں دیکھنے کی اجازت نہیں تھی ۔ یہ خاموشی کا عرصہ تھا، یعنی مستقبل میں مردانگی کی آزمائشوں کے لئے ایک طرح کی روحانی تیاری ۔ اس عرصے کے خاتمے پر ہم صبح سویرے دریا پر گئے اور امباشے کے پانی میں سفید مٹی دھو ڈالی ۔ جب ہم صاف اور خشک ہو گئے تو ہمارے جسم پر سرخ مٹی مل دی گئی ۔ یہ

بھی ایک رسم کا حصہ تھا۔ بعد میں یہ مٹی میرے جسم سے چربی کے ساتھ اتاری گئی۔

ہماری تنہائی کے اختتام پر جھونپڑے اور ان کی اچیا سب جلا دی گئیں، اس طرح بچپن سے ہمارا آخری رشتہ بھی منقطع ہو گیا۔ پھر معاشرے میں ہمیں مردوں کی حیثیت سے خوش آمدید کہنے کیے لئے ایک بڑی تقریب برپا کی گئی۔ ہمارے اہل خانہ، دوست اور چیف تقریروں، گیتوں اور تحائف دینے کے لئے اکٹھے ہوئے۔ مجھے دو بچھڑے اور چار بھیڑیں ملیں اور میں اپنے آپ کو پہلے سے کہیں زیادہ امیر محسوس کرنے لگا۔ پہلے کبھی کوئی چیز میری ملکیت نہیں تھی اور اب اچانک میں صاحب ملکیت بن گیا تھا یہ احساس بے پایاں تھا اگرچہ میرے تحائف اپنی وقعت میں جسٹس کے بعد آتے تھے جسے پورا ریوڑ ملا تھا۔ جسٹس کے تحائف پر مجھے کوئی حسد نہیں تھا۔ وہ ایک بادشاہ کا بیٹا تھا جبکہ میں ایک بادشاہ کا صرف مشیر بن سکتا تھا اس روز مجھے بڑی مضبوطی اور فخر کا احساس ہوا۔ اس روز میرے چلنے کا انداز مختلف تھا، میں سیدھا اور تن کر قدم اٹھا رہا تھا۔

چیف کی انقلابی تقریر

اس روز کا نڑا مقرر چیف مئلگ کیلی، دالندیبو کا بیٹا تھا اور اس کی تقریر سن کر میرے شوخ رنگ خواب اچانک تاریکی کی نذر ہو گئے۔ اس نے رسمی باتیں کیں اور کہا کہ یہ کتنی اچھی بات ہے کہ ہم ایک رسم کو جاری رکھے ہوئے ہیں جو نا قابل بیان مدت سے چلی آ رہی ہے۔

پھر وہ ہماری طرف مڑا اور اس کا چہرہ یک لخت بدل گیا۔ اس نے کہا: ''یہ ہمارے بیٹے بیٹھے ہیں، جوان، صحت مند اور خوبصورت، ژھوسا قبیلے کے پھول اور ہماری قوم کے لئے باعث ناز۔ ہم نے ابھی ابھی ان کے اخیسے کی رسم انجام دی ہے جس نے ان میں مردانگی کا عزم پیدا کیا ہے لیکن میں تمہیں یہاں بتائے دیتا ہوں کہ ایک خالی خولی عزم ہے جو کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ژھوسا اور سارے

جنوبی افریقی ایک مفتوح قوم ہیں۔ ہم اپنے ہی ملک میں غلام ہیں۔ ہم اپنی ہی سر زمین پر مزارے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی قوت نہیں، ہوئی طاقت نہیں اور اپنی جنم بھومی میں ہمیں اپنی قسمت پر کوئی اختیار نہیں۔ یہ نوجوان شہروں میں جائیں گے جہاں وہ جھونپڑوں میں رہیں گے اور سستی چراب پیئں گے۔ یہ سب اس وجہ سے کہ ہمارے پاس انہیں دینے کے لئے زمین جہاں یہ خوشحالی کی زندگی بسر کرسکیں۔ وہ سفید آدمی کی کانوں میں بنی سرنگوں کے اندر کھانستے اپنی صحت تباہ کرلیں گے اور سورج کبھی نہیں دیکھ پائیں گے تاکہ سفید آدمی بے مثال خوشحالی کی زندگی بسر کرسکے۔ ان نوجوانوں میں ایسے چیفس ہیں جو کبھی حکومت نہیں کریں گے کیونکہ ہمارے پاس اپنے آپ پر حکومت کرنے کے لئے کوئی اقتدار نہیں، ایسے سپاہی ہیں جو کبھی نہیں لڑیں گے کیونکہ ہمارے پاس لڑنے کے لئے کوئی ہتھیار نہیں، ایسے عالم فاضل ہیں جو کبھی تعلیم نہیں دیں گے کیونکہ ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں جہاں وہ مطالعہ کرسکیں۔

"ان نوجوانوں کی صلاحیتیں، ان کی ذہانت اور ان کا عزم سفید آدمی کے لئے معمولی معمولی اور حقیر کام انجام دے کر زندگی بتانے کی کوشش میں رائیگاں جائیں گے۔ ان کی فطری صلاحیتیں اس لئے رائیگاں جاتی ہیں کہ ہم انہیں سب سے بڑا تحفہ نہیں دیتے اور وہ ہے آزادی اور حریت۔ میں خوب جانتا ہوں کہ قماطہ (خدا) حاضر وناظر ہے اور کبھی نہیں میں جاؤں بہتر ہے کیونکہ پھر میں اس سے مل سکتا ہوں اور اسے جھنجھوڑ کر بتا سکتا ہوں کہ انگوبنگ کوکا یعنی ژہوسا قوم کے پھول مر رہے ہیں"۔

آزادی کا پہلا شعلہ

میرا خیال ہے، جب چیف میلگ کیلی پر غضب ہو کر بول رہا تھا، سامعین خاموش سے خاموش تر ہو گئے تھے، کوئی ان الفاظ کو سننا نہیں چاہتا تھا جو اس نے اس روز کہے۔ خود میں بھی انہیں سننا نہیں چاہتا تھا۔ چیف کی باتوں پر جوش میں آنے

کے بجائے میں ناراض ہوا تھا اور اس کے الفاظ کو ایک ایسے بے خبر آدمی کی تنقید جان کر میں نے مسترد کر دیا تھا جو تعلیم اور اس فوئد کی قدر سے آگاہ نہیں تھا۔ جنہیں سفید آدمی ہمارے ملک میں لایا تھا۔ اس وقت میری نگاہ میں سفید آدمی ایک ظالم نہیں بلکہ مہربان آقا تھا اور میرے خیال میں چیف بہت ناشکرا تھا۔ یہ بڑبولا چیف میرے دن کو تباہ کر رہا تھا اور اپنی بر غلط باتوں سے میرے احساس فخر کا ستیاناس کئے جا رہا تھا۔

لیکن اس الفاظ کی علت سمجھ میں آئے بغیر وہ جلد ہی مجھ پر اثر انداز ہونے لگے۔ اس نے ایک بیج بو رہا تھا۔ اور اگرچہ میں نے اس بیج کو لمبے عرصے کے لئے ذہین کی زمین میں پڑا رہنے دیا تھا، آخر کار وہ اُگنے لگا تھا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ اس روز بے خبر آدمی چیف نہیں، میں تھا۔

تقریب کے بعد میں دریا کی طرف گیا اور اسے بل کھاتے ہوئے اس سمت میں جاتے دیکھتا رہا جہاں میلوں دور وہ بحر ہند میں گرتا تھا۔ یہ دریا میں نے کبھی پار نہیں کیا تھا اور اس کے پرے واقع دنیا کے بارے میں بہت کم یا کچھ نہیں جانتا تھا، ایک دنیا جو اُس روز مجھے بلاتی تھی سورج ڈوبنے والا تھا، لہذا میں نے تیزی سے اس طرف قدم بڑھائے جہاں ہمارے تنہائی کے جھونپڑے واقع تھے۔ اگرچہ جلتے ہوئے جھونپڑوں کو پلٹ کر دیکھنا ممنوع تھا، میں باز نہ رہ سکا۔ جب میں وہاں پہنچا تو جو کچھ بچا تھا وہ ایک بڑے کیکر کے درخت کے پاس راکھ کے دو ڈھیر تھے۔ راکھ کے ان ڈھیروں میں ایک گمشدہ اور پر مسرت دنیا تھی، میرے بچپن کی دنیا تو نوادر اچھی کیز وینی میں بڑی شیریں اور ذمے داریوں سے خالی دنیا۔ اب میں ایک آدمی تھا جو آئندہ کبھی "تھنٹی" نہیں کھیلے گا، مکئی نہیں چرائے گا یا گائے کے تھنوں سے دودھ نہیں پیئے گا اگرچہ اپنا لڑکپن چھن جانے پر میں غمزدہ تھا۔ اب پیچھے دیکھتے ہوئے میں جانتا ہوں کہ اس روز میں مرد نہیں بنا تھا اور کئی برسوں تک حقیقی معنوں

میں مرد نہیں بن پایا۔

کلارک بری کے ہائی سکول میں

جن لڑکوں کے ساتھ میں ختنہ سکول میں رہا تھا، ان میں بیشتر کے برعکس مجھے ریف کی سونے کی کانوں میں کام نہیں کرنا تھا۔ ناظم اکثر مجھ سے کہتا: ''تمہارے لئے یہ مناسب نہیں کہ تم اپنی زندگی سفید آدمی کے لئے سونا نکالتے گزار دو اور کبھی اپنا نام لکھنا بھی سیکھ نہ پاؤ۔'' میری قسمت میں سابا تا کا مشیر ہونا تھا اور اس کے لئے مجھے تعلیم حاصل کرنا تھی تقریب کے بعد میں امخی کیزوینی لوٹ آیا لیکن زیادہ عرصے کے لئے نہیں کیونکہ مجھے امباشے دریا پار کرکے پہلی بار ضلع اینگ کوبو میں کلارک بری بورڈنگ انسٹی ٹیوٹ کی راہ لینی تھی۔

میں پھر گھر سے رخصت ہو رہا تھا، اس کے باوجود میں یہ جاننے کے لئے بیتاب تھا کہ میں وسیع تر دنیا میں کیسا رہوں گا۔ ناظم خود مجھے اپنی شاندار فورڈ وی 8 میں اینگ کوبو لے گیا۔ لیکن روانگی سے پہلے اس نے ایک تقریب منعقد کی تھی کیونکہ مین نے پانچویں کا امتحان پاس کرلیا تھا اور اب مجھے کلارک بری میں داخل ہونا تھا۔ ایک بھیڑ ذبح لہ گئی اور ناچ گانا ہوا۔ یہ پہلی تقریب تھی جو میرے اعزاز میں منعقد ہوئی تھی اور میں نے اسے بہت پر لطف پایا۔ ناظم نے مجھے میرا بوٹوں کا پہلا جوڑا دیا جو مردانگی کی علامت تھا اور اس وقت میں نے انہیں ازسر نو پالش کیا۔ اگرچہ وہ پہلے ہی چمکیلے تھے۔

کلارک بری انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد 1825ء میں رکھی گئی اور یہ ٹرانسکائی میں ایک قدیم ویزلیان مشن کے احاطے میں واقع تھا۔ اس وقت کلارک بری تھیمبو لینڈ میں افریقیوں کے لئے تعلیم کا سب سے اعلیٰ اداری تھا۔ ناظم خود کلارک بری میں پڑھتا رہا تھا اور جسٹس بھی اس کی پیروی میں وہیں پڑھتا تھا۔ یہ ایک ثانوی سکول بھی تھا اور اساتذہ کے لئے ایک تربیتی کالج بھی، لیکن یہاں مزید عملی پیشوں مثلاً بڑھئی،

درزی اور قلعی گر کے کورس بھی کروائے جاتے تھے۔

کلارک بری جاتے ہوئے ناظم نے میرے رویے اور میرے مستقبل کے بارے میں مجھے نصیحتیں کیں۔ اس نے مجھ پر زور دیا کہ میں ایسا رویہ اپناؤں جس سے سابا تا اور خود اس کی عزت میں اضافہ ہو اور میں نے اسے یقین دلایا کہ میں ایسا ہی کروں گا ۔پھر اس نے مجھے سکول کے گورنر عزت ماب سی ہیرس کے بارے میں ہدایات دیں ۔اس کے سمجھایا کہ عزت ماب ہیرس بے مثال ہیں۔ وہ ایک سفید رتھیمبو تھے۔ ناظم نے بتایا کہ جب سابا تا زیادہ عمر کے ہو جائیں گے تو وہ مستقبل کے بادشاہ کو عزت ماب ہیرس کے سپرد کر دیں گے جو اس کی تربیت ایک مسیحا اور ایک روایتی حکمران کے طور پر کریں گے۔ اس نے کہا کہ تجھے عزت ماب ہیرس سے بہت کچھ سیکھنا چاہیے۔ کیونکہ مجھے اس لیڈر کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینا ہے جس کی تربیت عزت ماب ہیرس کریں گے۔

میں ں اتحی کیزوینی میں کئی سفید فام تاجروں اور سرکاری حکام سے مل چکا تھا جن میں مجسٹریٹ اور پولیس افسر شامل تھے۔ یہ اعلیٰ مرتبے کے لوگ تھے اور ناظم اس سے تپاک سے ملیا تھا۔ ان کے زیر بار ہو کر نہیں۔ وہ ان سے مساوی سطح پر برتاؤ کرتا تھا جیسا کہ وہ کو تے تھے۔ بعض اوقات تو میں نے دیکھا کہ وہ کہ گید ڈالتا تھا اگر چہ ایسا بہت کم ہوتا۔ مجھے سفید فاموں سے براہ راست برتاؤ کرنے کا بہت کم موقع ملا تھا۔ ناظم نے مجھے بتایا تھا کہ ان سے برتاؤ کیسے کرنا ہے اور میں فقط اسے دیکھ کر اس کی مثال کی پیروی کرنے کوشش کرتا۔ اب عزت ماب ہیرس کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے اس نے پہلی بار مجھے لیکچر دیا کہ میرا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔ اس نے کہا کہ مجھے عزت ماب کی ویسی ہی عزت اور اطاعت کرنی چاہیے جیسی اس کی کرتا ہوں۔

کلارک بری، اتحی کیزوینی سے بھی زیادہ عظیم الشان تھا۔ خود سکول استعماری

انداز کی دو درجن کے لگ بھگ شاندار عمارتوں کے جمگھٹے پر مشتمل تھا جس میں انفرادی گھر بھی تھے اور طلبہ کے کمرے، لائبریری اور پڑھائی کے مختلف ہال بھی۔ یہ میری زندگی کا پہلا مقام تھا، جو مغربی تھا، افریقی نہیں، اور مجھے احساس ہوا کہ میں ایک نئی دنیا میں داخل ہو رہا ہوں جس کے اصول ابھی مجھ واضح نہیں۔

سفید فام سے پہلا مصافحہ

مجھے عزت ماب ہیرس کی سٹڈی میں لے جایا گیا جہاں ناظم نے میرا تعارف کرایا اور میں نے ان سے ہاتھ ملایا اور یہ پہلا موقع تھا جب میں نے ایک آدمی سے مصحافحہ کیا۔عزت ماب ہیرس پرتپاک اور ملنسار تھے اور وہ ناظم سے بڑی عزت سے پیش آئے۔ناظم نے وضاحت کی کہ میری بادشاہ کا مشیر بننے کے لئے تربیت کی جارہی ہے اور اسے اُمید ہے کہ عزت ماب مجھ میں خصوصی لیں گے۔عزت ماب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا کہ کلارک بری کے طلبہ سے یہ واقع کی جاتی ہے کہ وہ سکول اوقات کے بعد دستی مزدوری بھی کریں گے اور میرے لئے وہ اپنے باغ میں کام کرنے کا اہتمام کریں گے۔

اس ملاقات کے آخر میں ناظم نے مجھے خدا حافظ کہا اور مجھے جیب خرچ کے لئے ایک پونڈ کا نوٹ دیا۔یہ اس وقت تک میری زندگی کی سب سے بڑی رقم تھی جو میری ملکیت بنی میں نے اسے الوداع کہا اور وعدہ کیا کہ میں اسے مایوس نہیں کروں گا۔

کلارک بر ایک تھمبو کالج تھا جس کی بنیا اس زمین پر رکھی گئی تھی جو عظیم تھیمبو بادشاہ انگو بنگ کو کا نے دی تھی۔میں نے فرض کرلیا تھا کہ انگو بنگ کو کالے ایک وارث کی حیثیت سے مجھے کلارک بری میں وہی احترام ملے گا جس کی اجی کیز یوینی میں توقع کرنے لگا تھا۔لیکن یہ میری فاش غلطی تھی کیونکہ مجھ سے ویسا ہی برتاؤ کیا گیا جیسا اداروں سے کیا جاتا تھا۔نہ کوئی جانتا تھا اور نہ کسی نے خیال کیا کہ میں عظیم المرتبت انگو بنگ کو کا کا ایک وارث تھا۔ہاؤس ماسٹر نے باجے گاجے کے بغیر میرا استقبال

کے اور میرے ساتھی طلبہ میرے سامنے جھکتے نہیں تھے۔ کلارک بری میں بہت سے طلبہ ممتاز حسب نسب کے تھے اور اب میں اس حوالے سے یکتا نہیں تھا۔ یہ ایک اہم سبق تھا کیونکہ مجھے شبہ ہے کہ ان دنوں میں قدرے مغرور تھا۔ مجھے جلد ہی احساس ہو گیا کہ مجھے وراثت کے بجائے قابلیت کی بنیاد پر اپنا راستہ بنانا ہو گا۔ میرے اکثر ساتھی طلبہ کھیل کے میدان میں مجھ سے آگے نکل سکتے تھے اور کلاس روم میں مجھ سے زیادہ ذہانت دکھا سکتے تھے اور مجھے ان سے مسابقت میں بہت کچھ کرنا تھا۔

کلاسیں اگلی صبح شروع ہوئیں اور اپنے ساتھی طلبہ کے ساتھ میں سیڑھیاں چڑھ کر پہلی منزل پر گیا جہاں کلاس روم واقع تھا۔ ہمارے کمرے کا چوبی فرش خوبصورتی سے پالش کیا ہوا تھا۔ کلاسوں کے اس پہلے دن میں نئے بوٹ پہن کر گیا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی قسم کے بوٹ نہیں پہنے تھے اور اس روز میں اس گھوڑے کی طرح قدم اٹھاتا تھا جسے نئے نئے نعل لگے ہوں۔ مجھے سیڑھیاں چڑھنے میں بڑی دقت ہوئی اور کئی بار گرتے گرتے بچا۔ جب میں کلاس روم میں داخل ہوا، میرے بوٹ چمکیلے چوبی فرش پر بجتے تھے اور پہلی قطار میں دو لڑکیوں کو میں نے دیکھا کہ وہ میرے لنگڑا کر چلنے سے بہت محظوظ ہو رہی تھیں۔ ان میں سے جو زیادہ خوبصورت تھی وہ دوسری طرف جھکی اور سب کو سنانے کے لیے کافی بلند آواز میں کہا: دیہاتی لڑکا بوٹ پہننے کا عادی نہیں۔ اس پر اس کی سہیلی ہنس پڑی۔ میں غصے اور گھبراہٹ سے کھول اٹھا۔

میری پہلی دوست

اس کا نام ماتھونا تھا اور وہ قدرے چست تھی۔ اس روز میں نے تہیہ کیا کہ اس سے کبھی بات نہ کروں گا۔ لیکن جب میری جھوٹی انا جاتی رہی اور میں بوٹ پہن کر چلنے کا عادی ہو گیا تو میں نے اس سے شناسائی پیدا کی اور پھر وہ کلارک بری میں میری بہترین دوست بن گئی۔ وہ میری پہلی سچی خاتون دوست تھی۔ ایک خاتون جس سے

میں مساوی سطح پر ملتا اور جس پر اعتماد کر سکتا اور راز بتا سکتا تھا۔ کی لحاظ سے وہ میرے آئندہ کے تمام نسوانی دوستانوں کے لیے ایک نمونہ ثابت ہوئی کیونکہ جو عورتیں مجھ سے ملیں ان میں سے اپنی وہ کمزوریاں اور خوف بھی بیان کر سکتا تھا جو میں کبھی کسی آدمی کے سامنے نہیں کھول سکتا تھا۔

جلد ہی میں کلارک بری کی زندگی سے مانوس ہو گیا۔ میں جہاں تک ممکن ہوتا کھیلوں میں حصہ لیتا مگر اس ضمن میں میری کارکردگی ایک سادہ لوح سے زیادہ نہیں تھی۔ میں کھیلوں میں محبت کے لیے کھیلتا تھا۔ اپنی شان بڑھانے کے لیے نہیں۔ کیونکہ وہ تو مجھے ملتی ہی نہیں تھی۔ ہم لان ٹینس خانہ ساز چوبی ریکٹوں سے اور فٹ بال گرد سے اٹے میدان میں ننگے پاؤں کھیلتے۔

یہاں پہلی بار مجھے وہ استاد پڑھاتے تھے جو خود بجا تعلیم یافتہ تھے۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ پڑھ رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے اس خوف سے آگاہ کیا کہ میں سال کے آخر میں انگریزی اور تاریخ میں پاس نہیں ہو سکوں گا۔ اس نے کہا کہ پریشان مت ہوں کیونکہ ہماری استانی گرٹروڈ انتلا باتھی پہلی افریقی خاتون ہیں جنہوں نے بی اے کیا ہے اور وہ اتنی ہوشیار ہیں کہ ہمیں فیل نہیں ہونے دیں گی۔ ابھی میں نے یہ نہیں سیکھا تھا کہ جو علم میں نہیں رکھتا اس پر اظہار فخر نہیں کرنا چاہیے۔ چونکہ بی اے کا تصور میری ذہن میں واضح نہیں تھا، اس لیے میں نے ماتھونا سے پوچھا۔ اس کا جواب تھا: ''او ہاں، بی اے ایک بہت لمبی اور مشکل کتاب ہے۔''

ایک اور افریقی استاد جن کے پاس بی اے کی ڈگری تھی، بن مہلا سیلا تھا۔ ہم نہ صرف ان کی نصابی کامیابیوں کے باعث ان کی تعریف کرتے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ وہ عزت ماب ہیرس سے ڈرتے نہیں تھے۔ سفید فام اساتذہ تو عزت ماب ہیرس سے غلاموں کی طرح پیش آتے تھے مگر مسٹر مہلا سیلا بے دھڑک عزت ماب کے دفتر میں چلے جاتے اور بعض اوقات تو اپنا ہیٹ بھی نہ اتارتے۔ وہ عزت ماب

کے دفتر میں چلے جاتے اور وہ ان مواقع پر بھی ان سے اختلاف کرتے جہاں دوسرے محض ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ اگرچہ میں عزت ماب ہیرس کا احترام کرتا تھا میں اس حقیقت کو سراہتا تھا کہ مسٹر مہلا سیلا ان کے دباؤ میں نہیں آئیں گے۔ ان دنوں بی اے کی ڈگری رکھنے والے ایک سیاہ فام سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ ایک پرائمری تعلیم یافتہ سفید فام کے سامنے جھک کر آداب بجالائے۔ ایک سیاہ آدمی خواہ کتنا ہی تہذیب تافتہ کیوں نہ ہو، اسے ایک نہایت کم درجے کے سفید آدمی سے بھی گھٹیا خیال کا جاتا تھا۔

عزت ماب کلارک بری کو آہنی ہاتھ اور بہتری کے بے پایاں احساس کے ساتھ چلاتے تھے۔ کلارک بری ایک ٹیچر ٹریننگ کالج سے زیادہ ایک فوجی سکول لگتا تھا۔ نہایت معمولی لغزشوں پر بھی فوری سزا ملتی تھی۔ اسمبلی میں عزت ماب کے چہرے پر ہمیشہ ایک نادر شاہی تاثر ہوتا اور وہ کسی قسم کی نرم کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ جب وہ کسی کمرے میں داخل ہوتے تو تربیتی اور ثانوی سکولوں کے سفید فام پرنسپلز اور انڈسٹریل سکول کے سیاہ فام پرنسپل سمیت عملے کے ارکان اٹھ کر کھڑے ہو جاتے۔

عزت مابہ ہیرس کا خوف

طلبہ پر عزت ماب ہیرس سے محبت سے زیادہ خوف مسلط تھا۔ لیکن باغ میں میں نے ایک مختلف عزت ماب ہیرس کو دیکھا۔ ان کے باغ میں کام کرتے ہوئے مجھے دوہرا فائدہ ہوا۔ اس نے مجھ میں عمر بھر کے لیے باغبانی اور سبزیاں اگانے کا شوق پیدا کر دیا اور مجھے عزت ماب اور ان کے خاندان کے بارے میں جاننے میں مدد دی۔ یہ پہلا سفید خاندان تھا جس سے مجھے گہرے میل جول کا موقع ملا تھا۔

عزت ماب ہیرس کے ظاہری سخت نقاب کے پیچھے ایک نرم اور کشادہ ذہن کا انسان تھا جو نوجوان افریقیوں کو تعلیم دینے کی اہمیت پر بے پناہ یقین رکھتا تھا۔ اکثر میں انہیں باغ کے اندر خیالات میں کھوئے دیکھتا۔ میں انہیں پریشان نہ کرتا اور

شاذونادرہی ان سے بات کرتا۔ ایک اچھے مقصد سے مخلص اور بے غرض انسان کی حیثیت سے وہ میرے لیے ایک اہم نمونہ تھے۔

جتنے وہ کم گو تھے، ان کی بیوی اتنی ہی باتونی تھیں۔ وہ ایک پیاری خاتون تھیں اور وہ اکثر مجھ سے گپ شپ لگانے باغ میں آجاتیں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہم کیا باتیں کرتے تھے، لیکن مجھے لذیذ گرم کیکوں کا مزہ آج بھی یاد ہے جو وہ سہ پہر کو میرے لیے لاتی تھیں۔

اپنے سست اور غیر نمایاں آغاز کے بعد آگے بڑھنے لگا اور میں نے جونیئر سرٹیفکیٹ معمول کے تین سال کے بجائے دو سال میں مکمل کر لیا۔ مجھے عمدہ حافظہ رکھنے کی شہرت ملی مگر حقیقت یہ تھی کہ میں صرف ایک محنتی طالبعلم تھا۔ جب میں نے کلارک بری چھوڑا تو ماتھونا اور میں جدا ہو گئے۔ وہ ڈے سکالر تھی یعنی دن کو کلاسوں میں آتی تھی اور اس کے پاس اتنے وسائل نہ تھے کہ اسے مزید تعلیم کے لیے آگے بھیج سکتے۔ وہ ایک غیر معمولی ہوشیار اور باصلاحیت خاتون تھی جس کے لیے مستقبل کے امکانات محدود تھے کیونکہ اس کے خاندان کے وسائل کم تھے۔ یہ جنوبی افریقہ کے تقریباً ہر گھرانے کی کہانی تھی۔ یہ قابلیت کی کمی نہیں بلکہ مواقع کی کمی تھی جس نے میری قوم کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔

میں نے کلارک بری میں جو وقت گزارا اس نے میرے افق وسیع کر دیے۔ پھر بھی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ جب کلارک بری سے نکلا تو ایک مکمل کشادہ ذہن اور غیر متعصب نوجوان تھا۔ میں پورے ٹرانسکائی کے طلبہ اور جوہانسبرگ اور بسوٹو لینڈ کے چند طلبہ سے مل چکا تھا۔ ان دنوں لیسوتھو کو بسوٹو لینڈ کہتے تھے جن میں سے بعض مہذب اور کوسموپولیٹین ہونے کا تاثر دیتے تھے اور میں بھی ان کی دیکھا دیکھی صوبائی سطح پر سوچنے لگا۔ اگرچہ میں ان سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا مگر میں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ ایک دیہاتی لڑکے کے لیے دنیاوی معاملات میں ان کا حریف بننا

ممکن ہے۔ میں ان سے حسد نہیں کرتا تھا۔ جب میں کلارک بری سے رخصت ہوا تو بھی دلی طور پر میں ایک تھیمبو تھا اور مجھے ایک تھیمبو کی طرح سوچنے اور عمل کرنے پر فخر تھا۔ میری جڑیں میری قسمت تھیں اور مجھے یقین تھا کہ میں اپنے سرپرست کے حسب خواہش تھیمبو بادشاہ کا مشیر بن جاؤں گا۔ میرے افق تھیمبو لینڈ سے آگے نہیں گئے تھے اور مجھے یقین تھا کہ ایک تھیمبو ہونا دنیا میں سب سے زیادہ قابل رشک بات ہے۔

ویزلیان کالج، ہیلڈ ٹاؤن

1937ء میں جب میری عمر 19 سال تھی میں فورٹ بیوفورٹ میں ویزلیان کالج ہیلڈ ٹاؤن میں جنٹس سے جا ملا جو امتاتا سے 175 میل جنوب مغرب میں تھا۔ انیسویں صدی میں فورٹ بیوفورٹ نام نہاد فرنٹیر وارز کے دوران بہت سی اگلی برطانوی چوکیوں میں سے ایک تھا۔ ان جنگوں میں سفید فام آبادکاروں نے بڑے طریقے سے تبدریج پیش قدمی کر کے مختلف ژہوسا قبائل سے ان کی زمینیں ہتھیا لیں۔ ایک صدی سے زیادہ عرصہ جاری رہنے والی اس کشاکش میں کئی ژہوسا جنگجوؤں نے اپنی بہادری کی بنا پر شہرت حاصل کی۔ انمیں سندائل، مخانداور صوقوما جیسے لوگ شامل تھے۔ آخرالذکر دونوں کو برطانوی حکام نے جزیرہ روبن میں قید کر دیا جہاں وہ انتقال کر گئے۔ ہیلڈ ٹاؤن میں میری آمد تک گزشتہ صدی کی جنگوں کی کوئی علامتیں نہیں رہ گئی تھیں سوائے فورٹ کے جو ایک سفید قصبہ تھا اور جہاں کبھی صرف ژہوسا رہتے اور کاشتکاری کرتے تھے۔

ہیلڈ ٹاؤن ایک سرسبز وادی میں بل کھاتی سڑک کے سرے پر واقع تھا۔ یہ کلارک بری سے کہیں زیادہ خوبصورت اور متاثر کن تھا۔ اس وقت استوا کے جنوب میں سب سے بڑا افریقی سکول تھا جس میں ایک سے زیادہ طلبہ اور طالبات تھیں۔ اس کی شاندار عشق پیچاں سے ڈھکی عمارتیں اور سایہ دار درختوں سے گھرے صحن اسے ایک

مراعات یافتہ تعلیمی نخلستان کا احساس دلاتے تھے۔ کلارک بری کی طرف ہیلڈ ٹاؤن بھی میتھوڈسٹ چرچ کا ایک مشن سکول تھا اور یہاں انگریزی پر ایک مسیحی اور آزاد خیال ادبیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔

ڈیوک آف ولنگٹن کا وارث

ہیلڈ ٹاؤن کے پرنسپل ڈاکٹر آرتھر ولنگٹن تھے۔ وہ ایک مضبوط اور بھرے بھرے جسم کے انگریز تھے، جو اپنا تعلق ڈیوک آف ولنگٹن سے جوڑتے تھے۔ اسمبلی کے آغاز پر ڈاکٹر ولنگٹن چل کر اسٹیج پر آتے اور اپنی گہری آواز میں کہتے، میں عظیم ڈیوک آف ولنگٹن کا وارث ہوں جو ایک ارسٹوکریٹ، ایک سیاستدان اور ایک جرنیل تھے اور جنھوں نے واٹرلو میں فرانسیسی شہنشاہ نپولین کو کچل کر یورپ کے لیے تہذیب کو بچا لیا اور تم مقامی لوگوں کے لیے بھی۔ اس پر ہم سب جوش وخروش سے تالیاں بجاتے اور ہم میں سے ہر ایک شکر گزار ہوتا کہ عظیم ڈیوک آف ولنگٹن کا ایک وارث ہم جیسے مقامیوں کو تعلیم یافتہ بنانے کی زحمت گوارا کر رہا ہے۔ تعلیم یافتہ انگریز ہمارے لیے نمونہ تھا اور ہم سیاہ انگریز بننے کی تمنا کرتے تھے جیسا کہ بعض اوقات ہمیں طنزیہ طور پر پکارا جاتا تھا۔ ہمیں سکھایا جاتا تھا اور ہم اس پر یقین رکھتے تھے کہ بہترین نظریات انگریزی نظریات ہیں، بہترین حکومت انگریزی حکومت ہے اور بہترین انسان انگریز ہیں۔

ہیلڈ ٹاؤن کی زندگی بڑی سخت تھی۔ پہلی گھنٹی چھ بجے بجتی۔ ہم 6-40 پر ناشتے کے لیے ڈائنگ ہال میں پہنچ جاتے جو خشک ڈبل روٹی اور چینی کے گرم شربت پر مشتمل ہوتا۔ اس وقت شہنشاہ انگلستان جارج ہشتم کی ایک سنجیدہ تصویر ہمیں دیکھ رہی ہوتی۔ جو طلبہ ڈبل روٹی کے ساتھ مکھن کا خرچ برداشت کر سکتے تھے وہ اسے خرید کر کچن میں رکھوا دیتے۔ میں خشک توس کھاتا۔ □ 8 بجے ہم معائنے کے لیے اپنے رہائشی کمروں سے باہر صحن میں جمع ہو جاتے اور متوجہ ہو کر کھڑے ہوتے

جب لڑکیاں مختلف رہائشی کمروں سے نکل آتیں۔ ہم کلاس میں 12-45 تک رہتے اور پھر مکئی کے دلیے، کھٹے دودھ اور پھلیوں اور بعض اوقات گوشت پر مشتمل دوپہر کا کھانے کے لیے ایک گھنٹے کا وقفہ ہوتا۔ سات سے نو بجے تک ہم پھر پڑھائی کرتے۔ 9-30 پر بتیاں بجھ جاتیں۔

ہیلڈ ٹاؤن میں ملک بھر اور بسوتو لینڈ اور بیچوانا لینڈ کے محفوظ علاقوں سے طلبہ آتے تھے۔ اگرچہ زیادہ تر ایک ژہوسا ادارہ تھا۔ مختلف قبائل کے طلبہ بھی یہاں پڑھتے تھے۔ سکول کے بعد اور ہفتے کے آخر میں ایک قبیلے کے طلبہ اکٹھے رکھے جاتے۔ مختلف ژہوسا قبائل کے ارکان بھی اکٹھے ہو جاتے جیسے آما امپونڈو، آما امپونڈو ہی کے ساتھ ملتے۔ میں بھی اسی طرح مل جاتا لیکن ہیلڈ ٹاؤن ہی میں میں نے اپنا پہلا سوتھو بولنے والا دوست بھی بنایا جس کا نام زکریا مولیٹے تھا۔ مجھے ایک دوست بنا کر، جو ژہوسا نہیں تھا، بڑی جرات کا احساس ہوتا تھا۔

میری قبائلیت ڈھیلی پڑنے لگی

ہمارے حیاتیات کے استاد فرینک لی بنٹ بیلے سوتھو بولنے والے تھے اور وہ طلبہ میں بڑے مقبول تھے۔ ملنسار اور آسانی سے مل جانے والے فرینک ہم سے کچھ زیادہ عمر کے نہیں تھے اور طلبہ کے ساتھ گھل مل جاتے تھے۔ وہ کالج کی پہلی سوکر ٹیم میں بھی کھیلتے تھے جہاں ان کی کارکردگی شاندار ہوتی تھی۔ لیکن ان کی جس بات نے ہمیں حیران کر دیا وہ یہ تھی کہ انہوں نے امتاتا کی ایک ژہوسا لڑکی سے شادی کر رکھی تھی۔ اس وقت تک میں کسی ایسے شخص سے آگاہ نہیں تھا جس نے اپنے قبیلے سے باہر شادی کی ہو۔ ہمیں سکھایا گیا تھا کہ آپس میں رشتے ناتے قبائلی رواج ہے۔ لیکن فرینک اور اس کی بیوی کو دیکھ کر میری عصبیت کو ٹھیس پہنچی اور وہ قبائلیت ڈھیلی پڑنے لگی جو اب تک مجھے جکڑے ہوئے تھی۔ میں ایک افریقی کی حیثیت سے اپنی شناخت محسوس کرنے لگا، ایک تھیمبو ایک ژہوسا کی حیثیت سے نہیں لیکن یہ احساس

ابھی نوزائیدہ تھا۔

ہمارے بورڈنگ ہاؤس میں چالیس بستر تھے۔ درمیانی راہداری کے دونوں طرف بیس بیس۔ ہاؤس ماسٹر زندہ دل عزت ماب ایس ایس موکی ٹیمی تھے جو بعد میں جنوبی افریقہ کے میتھوڈسٹ چرچ کے پہلے صدر بنے۔ وہ سوتھو زبان بولتے تھے اور طلبہل میں ان کی ایک ایسے جدید اور روشن خیال ساتھی کی حیثیت سے بڑی تعریف کی جاتی تھی جو ہماری شکایات کو سمجھتے تھے۔

عزت ماب موکی ٹیمی نے ایک اور وجہ سے بھی ہمیں متاثر کیا۔ وہ ڈاکٹر ولنگٹن کے مقابل اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک شام کی بڑی روش پر دو پری فیکٹوں میں جھگڑا ہو گیا۔ ٹیمی کو صلح صفائی کے لیے بلایا گیا۔ ڈاکٹر ولنگٹن وجو قصبے سے لوٹ رہے تھے اچانک اس ہنگامے میں آ ٹپکے اور ان کی آمد پر ہم سب ٹھنک گئے۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے خدا خود ایک معمولی سا مسئلہ کرنے کے لیے آیا ہو۔

ڈاکٹر ولنگٹن ایک بلند جگہ پر جا کھڑے ہوئے اور انہوں نے حقیقت حال جاننا چاہی۔ عزت ماب موکی ٹیمی نے، جن کا سر ڈاکٹر ولنگٹن کے کندھوں تک بھی نہیں پہنچتا تھا بڑے احترام سے کہا: ڈاکٹر ولنگٹن ہر چیز قابو میں ہے اور میں کل آپ کو رپورٹ دونگا۔''

''نہیں، میں ابھی جاننا چاہتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے، ڈاکٹر ولنگٹن نے قدرے ترش روئی سے کہا۔

عزت ماب موکی ٹیمی ثابت قدم رہے۔ ڈاکٹر ولنگٹن میں ہاؤس ماسٹر ہوں اور میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں کل آپ کو رپورٹ دوں گا اور میں بس یہی کروں گا۔''

ہم ہکا بکا رہ گئے۔ ہم نے کسی شخص خصوصا ایک سیاہ فام کو کبھی ڈاکٹر ولنگٹن کے مقابل آتے نہیں دیکھا تھا، چنانچہ ہم ایک دھماکے کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن ڈاکٹر ولنگٹن نے فقط یہ کہا: بہت اچھا اور پھر چلے گئے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ڈاکٹر ولنگٹن

کوئی خدائی فوجدار نہیں اور عزت ماب موکی ٹیمی کسی کے بندہ بے دام نہیں اور یہ کہ ایک سیاہ آدمی کو ایک سفید فام کے سامنے از خود مشینی انداز میں آداب بجالانے کی ضرورت نہیں خواہ وہ سینئر ہی کیوں نہ ہو۔

چھری کانٹے نے مجھے بھوکا رکھا

جلد ہی مجھے ذمے داری کے دوسری درجے میں ترقی مل گئی اور یہ رات کی ڈیوٹی تھی۔ رات بھر کھڑے رہ کر ڈیوٹی دینے میں مجھے کبھی کوئی مشکل پیش نہ آئی لیکن ایک رات میں اخلاقی الجھن سے دوچار ہوا جو اب تک میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ ہمارے بورڈنگ ہاؤس میں ٹائلٹ نہیں تھے بلکہ عمارت کے پیچھے تقریباً سو فٹ پر ایک آؤٹ ہاؤس تھا۔ برسات کی راتوں میں جب طلبہ کو پیشاب کی حاجت ہوتی اور وہ گھاس، کیچڑ میں چل کر نہ جانا چاہتے تو وہ برآمدے میں کھڑے ہو کر جھاڑیوں میں پیشاب کی دھار مارتے۔ یہ فعل قواعد کے سراسر خلاف تھا اور پری فیکٹ کا کام تھا کہ ان طلبہ کے نام نوٹ کرے جو ایسا کرتے تھے۔

ایک رات جب میں ڈیوٹی پر تھا اور بارش ہو رہی تھی، میں نے پندرہ کے قریب لڑکے برآمدے میں پیشاب سے فارغ ہوتے پکڑے۔ پو پھٹنے والی تھی جب ایک لڑکا باہر آیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر برآمدے کے ایک سرے پر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ میں نے اس کے نزدیک جا کر اعلان کا کہ وہ پکڑا گیا ہے۔ جب وہ مڑا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک پری فیکٹ تھا۔ میں الجھن میں پڑ گیا۔ قانون اور فلسفے کی اسطلاح ہے نگرانوں کی نگرانی کون کرے گا۔ اگر پری فیکٹ ضابطے کی پابندی نہیں کرتا تو طلبہ سے پابندی کرنے کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے عملاً پری فیکٹ قانون سے ماورا تھا کیونکہ وہ قانون کا نافذ کنندہ تھا اور ایک پری فیکٹ سے یہ توقع نہیں کی جاتی تھی کہ وہ دوسرے پری فیکٹ کی رپورٹ کرے گا۔ لیکن میں نے انصاف کے خلاف جانا کہ ایک پری فیکٹ کی تو رپورٹ نہ کروں اور

دوسرے پندرہ طلبہ کے نام دے دوں، چنانچہ میں نے فہرست پھاڑ دی ار کسی کا نام نہ دیا۔

افریقی آسمان کا دمدار ستارہ

ہیلڈ ٹاؤن کے میرے آخری سال ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو میرے نزدیک آسمان پر دمدار ستارہ چھوٹنے کے مترادف تھا۔ سال کے آخر میں ہمیں اطلاع ملی کے عظیم ژہوسا شاعر کرونی امخائی سکول کا دورہ کرنے آرہے ہیں۔ امخائی دراصل ایک امبونگی یعنی قصیدہ گو موسیقار تھے یا یوں کہہ لیجئے کہ ایک داستان گو مورخ جو ہم عصر واقعات اور تاریخ کو شاعری سے آمیز کرتا ہے جو عوام کے لیے مخصوص معنویت رکھتی ہے۔

اس کی آمد کے روز سکول حکام نے چھٹی کا اعلان کر دیا۔ مقررہ صبح کو پورا سکول عملے کے سفید اور سیاہ ارکان سمیت ڈائنگ ہال میں جمع ہو گیا جہاں سکول اسمبلی بھی منعقد ہوتی تھی۔ ہال کے ایک سرے پر اسٹیج تھا جہاں سے ایک دروازہ ڈاکٹر ولنگٹن کے مکان کی طرف کھلتا تھا۔ اس دروازے میں کوئی خاص بات نہ تھی مگر اسے ہم ڈاکٹر ولنگٹن کا دروازہ سمجھتے تھے کیونکہ انکے سوا کبھی کوئی اس دروازے سے نہیں آتا تھا۔

اچانک دروازہ کھلا ور اس میں سے ڈاکٹر ولنگٹن کے بجائے چیتے کی کھال کی واسکٹ اور اسی طرح کا ہیٹ پہنے ایک آدمی برآمد ہوا جس کے ہر ہاتھ میں ایک نیزہ تھا۔

ڈاکٹر ولنگٹن چند لمحے بعد اس کے پیچھے آئے لیکن اس دروازے سے قبائلی لباس میں ایک سیاہ آدمی کو برآمد ہوتے دیکھنا ہمارے لے برق آسا منظر تھا۔ ہم پر اس کا جو تاثر ہوا وہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یوں لگا جیسے دنیا زیر و زبر ہو گئی ہے۔ جب امخائی ،ڈاکٹر ولنگٹن کے ساتھ اسٹیج پر فروکش ہوئے، ہمارا جوش و خروش دیدنی تھا۔

انقلابی شاعر کا خطاب

لیکن جب امخائی خطاب کرنے کھڑے ہوئے تو اامر کا اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے مایوسی ہوئی ۔ میں نے ذہن میں ان کی ایک تصویر بنا رکھی تھی اور میرا جوانی کا تصور امخائی جیسے ہیرو کے بارے میں یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ ایک بلند قامت، بارعب اور ذہین دکھائی دینے والے ہوں گے ۔لیکن وہ زیادہ نمایاں نظر نہ آئے اور اپنے لباس کے سوا بالکل عام آدمی لگتے تھے ۔ جب انہوں نے ژھوسا میں تقریر شروع کی تو وہ اس قدر آہستہ اور رک رک کر بولتے تھے کہ انہیں صحیح الفاظ تلاش کرنے کے لیے بار بار ٹھہرنا پڑتا اور جب صحیح لفظ مل جاتا تو ان کی زبان لڑکھڑا جاتی ۔

ایک موقع پر انہوں نے اپنا نیزہ ہوا میں بلند کیا تو وہ حادثاً انکے اوپر پردے کے تار سے جا ٹکرایا۔ اس کے ٹکرانے کی تیز آواز ابھری اور پردہ جھولنے لگا، شاعر نے اپنے نیزے کی نوک اور پھر پردے کے تار کو دیکھا اور فکر میں ڈوب کر اسٹیج پر آگے اور پیچھے چلنے لگا ۔ایک منٹ بعد وہ چلتے چلتے رکے، ہماری طرف رخ کیا اور نئی توانائی پا کر کہہ اٹھے کہ یہ حادثہ، تار سے نیزے کا ٹکرانا افریقہ اور یورپ کی ثقافتوں میں ٹکراؤ کی علامت ہے ۔ان کی آواز بلند ہوئی اور انہوں نے کہا: افریقی تاریخ کی علامت ہے۔ یہ دھاتی تار، انہوں نے اوپر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔مغربی صنعتکاری کی ایک مثال ہے جو ہنر مند تو ہے مگر سرد، چالاک اور بے روح ہے ۔

”میں جس بات کا ذکر کر رہا ہوں۔ انہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔وہ ایک ہڈی کے ٹکڑے کی دھاتی ٹکڑے سے ٹکرانے کی بات نہیں اور نہ ایک ثقافت کے دوسری ثقافت کو لپیٹ میں لینے کی بات ہے ۔ میں جو بات تم سے کہہ رہا ہوں وہ اس وحشیانہ تصادم کے بارے میں ہے جو مقامی اور اچھی اور غیر ملکی اور بری ثقافتوں کے درمیان برپا ہے ۔ہم ان غیر ملکیوں کو جو ہماری ثقافت کی پروا نہیں کرتے وہ اپنی قوم کو مغلوب بنا لینے کی اجازت نہیں دے سکتے ۔ میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ ایک روز

افریقی معاشرے کی قوتیں دست اندازی کرنے والے غیر ملکیوں پر عظیم فتح پائیں گی۔ بڑا عرصہ ہم نے سفید آدمی کے جھوٹے خداؤں کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ لیکن ہم ابھریں گے اور غیر ملکی خیالات کا جوا تار پھینکیں گے۔''

مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر ونگٹن اور دوسرے سفید فاموں کی موجودگی میں ایسے نازک مسائل پر گفتگو کرنے میں امخانی کی دلیری ہمارے نزدیک یکسر حیرت انگیز تھی۔ تاہم اس نے ہمیں جوش دلایا اور ذہنوں کو تحریک دی جس سے ڈاکٹر ونگٹن جیسے لوگوں کے بارے میں میرا تصور تبدیل ہونے لگا جنہیں میں از خود اپنا آقائے مہربان خیال کرتا تھا۔

پھر امخانی اپنی معروف نظم پڑھنے لگے جس میں وہ آسمان کے ستاروں کو مختلف قوموں سے منسوب کرتے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے یہ کبھی نہیں سنی تھی۔ اسٹیج پر ٹہلتے ہوئے اور اپنے نیزے سے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں یورپ کے لوگوں، فرانسیسیوں، جرمنوں، انگریزوں کو کہکشاں دیتا ہوں جو سب سے بڑا ستاروں کا جمگھٹا ہے کیونکہ ''تم اجنبی لوگ ہو، لالچ اور حسد سے بھرے ہوئے ہو اور بہت سی چیزوں پر جھگڑتے ہو، انہوں نے بعض ستاروں کو ایشائی اقوام اور شمالی، جنوبی امریکہ سے منسوب کیا۔ پھر انہوں نے بعض ستاروں کو ایشائی اقوام اور شمالی، جنوبی امریکہ سے منسوب کیا۔ پھر انہوں نے افریقہ کا زکر کیا، اس براعظم کو مختلف قوموں میں تقسیم کیا اور مختلف قبائل کو مخصوص برج دیئے۔ وہ اسٹیج پر رقص کر رہے تھے۔ اپنا نیزہ لہراتے اور اپنی آواز میں زیر و بم پیدا کرتے ہوئے اور اب اچانک وہ ساکن ہو گئے اور انکی آواز دھیمی ہو گئی۔

اب اے ژہوسا کے خانوادے، تمہاری باری ہے ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ جھکنے لگے حتی کہ ایک گھٹنے کے بل بیٹھ گئے۔ میں تمہیں سب سے اہم اور روشن ستارہ دیتا ہوں۔ صبح کا ستارہ، کیونکہ تم ایک پر فخر اور طاقتور قوم ہو۔ یہ ستارہ سال

گننے کے لیے ہے، آدمیت کے سال، جب انہوں نے آخری لفظ کہا ان کا سر چھاتی پر جھک گیا۔ ہم تالیاں بجاتے اور آفرین کہتے ہوئے اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ تحسین وہ آفرین کہتے ہوئے کبھی رک جاؤں۔ اس لمحے مجھے اتنا فخر محسوس ہوا، ایک افریقی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ژہوسا کی حیثیت سے کہ میں اپنے آپکو چنے ہوئے لوگوں میں سے ایک محسوس کر رہا تھا۔

میرے وجود میں جوش کی لہر دوڑ گئی تھی لیکن میں امخائی کے خطاب پر پریشان بھی ہوا۔ وہ افریقی اتحاد کے قوم پرستانہ اور وسیع تر نظریئے سے ہٹ کر ژہوسا لوگوں تک محدود قبائلی تصور پر آ گئے تھے جن کا وہ جزو تھے۔

جیسے جیسے ہیلڈ ٹاؤن میں میرا وقت اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ میرے ذہن میں نئے نئے اور بعض اوقات متصادم نظریات جگہ پانے لگے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ تمام قبائل کے افریقیوں میں بہت کچھ مشترک ہے مگر عظیم امخائی، ژہوسا قبیلے کی سب سے بڑھ کر تعریف کر رہے تھے۔ اس روز میں نے دیکھا کہ ایک افریقی ایک سفید آدمی کے پہلو بہ پہلو کھڑا ہو سکتا ہے اگر چہ میں ہنوز سفید فاموں سے وہ فوائد سمیٹ رہا تھا جن کے لیے اکثر ان کی اطاعت درکار تھی۔ ایک لحاظ سے افریقی تناظر میں امخائی کے نقطہ نظر کی لمحہ بہ لمحہ تبدیلی میرے اپنے ذہن کا عکس تھا کیونکہ میں خود اپنے ژہوسا اور دوسرے افریقیوں کے ساتھ رشتے داری کے احساس کے مابین ادھر ادھر جھولتا رہتا تھا۔ لیکن سال کے آخر میں جب میں نے ہیلڈ ٹاؤن چھوڑا تو میں اپنے آپ کو پہلے ایک ژہوسا اور پھر ایک افریقی خیال کرنے لگا۔

فورٹ ہیئر کے شب وروز

1960ء تک بلدیہ ایلس میں یونیورسٹی کالج آف فورٹ ہیئر جو ہیلڈ ٹاؤن سے بیس میل عین مشرق میں تھا، جنوبی افریقہ میں سیاہ فاموں کے لیے اعلیٰ تعلیم کا واحد اقامتی مرکز تھا۔ فورٹ ہیئر ہیلڈ ٹاؤن سے کہیں بڑھ کر تھا۔ یہ جنوبی، وسطی اور

مشرقی افریقہ سے آنیوالے افریقی طالب علموں کے لیے روشنی کا مینار تھا۔ میرے جیسے نوجوان سیاہ فام جنوبی افریقیوں کے لیے یہ آکسفورڈ اور کیمبرج، ہاورڈ اور ییل کی طرح تھا، جس میں سب سمائے ہوئے تھے۔

ناظم بڑا فکرمند تھا کہ مجھے فورٹ ہیئر میں داخلہ مل جائے، چنانچہ مجھے وہاں داخلہ پاکر بڑی خوشی ہوئی۔ یونیورسٹی کالج جانے سے پہلے ناظم نے مجھے میرا سوٹ خرید کر دیا۔ اس ڈبل برسٹ خاکستری سوٹ نے مجھے بڑا مہذب ہونے کا احساس دلایا۔ میں اب اکیس برس کا تھا اور فورٹ ہیر میں خود سے بڑھ کر کسی کو سمارٹ خیال نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ دنیا میں کامیابی کے لیے میری ساخت پرداخت کی جارہی ہے۔ میں خوش تھا کہ ناظم کے خیل کا ایک رکن اب یونیورسٹی ڈگری کا حامل ہوگا۔ جسٹس اپنے جونیئر سرٹیفکیٹ کے لیے ہیلڈ ٹاؤن میں رہ گیا تھا۔ وہ مطالعے سے زیادہ کھیل میں لطف اٹھاتا تھا اور مختلف قسم کا طالب علم تھا۔

فورٹ ہیئر کی بنیاد 1916ء میں اسکاٹش مشنریوں نے اس جگہ رکھی تھی جو مشرقی کیپ میں انیسویں صدی کا سب سے بڑا سرحدی قلعہ تھی۔ ایک چٹانی چبوترے پر تعمیر شدہ اور دریائے ٹایومی کی بل کھاتی قوس سے گھرے فورٹ ہیئر نے برطانویوں کو بہادر ژہوسا جنگجو ساندیلی، آخری رارہابی بادشاہ سے جنگ لڑنے کے قابل بنادیا تھا جسے انہوں نے 1800ء کے عشرے میں ایک آخری سرحدی جنگ میں شکست دی۔

فورٹ ہیئر میں صرف 150 طلبہ تھے اور میں پہلے ہی جانتا تھا کہ ایک درجن کے لگ بھگ کلارک بری اور ہیلڈ ٹاؤن سے آئے تھے۔ ان میں سے ایک، جسے میں پہلی بار مل رہا تھا، کے ڈی ماتانزیما تھا۔ اگرچہ قبائلی نسب کی بنا پر کے ڈی میرا بھتیجا تھا۔ میں اس سے چھوٹا اور زیادہ سینئر نہیں تھا۔ لمبا، دبلا اور انتہائی پراعتماد کے ڈی

تیسرے سال کا طالب علم تھا اور اس نے مجھے اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا۔ میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جیسا کہ جسٹس کو دیکھا تھا۔

ہم دونوں میتھوڈسٹ تھے اور مجھے اس کے ہوسٹل میں جگہ ملی تھی۔ جو ویزلے ہاؤس کہلاتا تھا۔ یہ کیمپس کے سرے پر ایک دلربا دومنزلہ عمارت تھی۔ اس کی شاگردی میں، میں قریب ہی لوٹے میں گرجے کی عبادت میں شرکت کرتا، فٹ بال میں حصہ لیتا جس کا وہ شاندار کھلاڑی تھا اور عموماً اس کے مشورے پر عمل کرتا، ناظم اسکول میں اپنے بچوں کو رقم بھیجنے پر یقین نہیں رکھتا تھا اور اگر کے ڈی اپنے جیب خرچ سے مجھے نہ دیتا تو میری جیبیں خالی رہتیں۔ ناظم کی طرح وہ دیکھ رہا تھا کہ میرا مستقبل کا کردار سابا تا کے مشیر کا ہوگا۔ اس لیے وہ قانون پڑھنے کے لیے میری حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

کلارک بری اور ہیلڈ ٹاؤن کی طرح فورٹ ہیر ایک مشنری کالج تھا۔ ہمیں خدا کی اطاعت کرنے، سیاسی احکام کا احترام کرنے اور تعلیمی مواقع فراہم کرنے پر کلیسا کے شکر گزار ہونے کی تلقین کی جاتی۔ ان اسکولوں کالجوں پر اکثر تنقید کی جاتی کہ یہ اپنے رویوں اور عمل میں استعماری ادارے ہیں۔ ایسے رویوں کے باوجود میرا خیال ہے ان کے فوائد ان کے نقصانات سے زیادہ تھے۔ مشنریوں نے اس وقت اسکول تعمیر کر کے چلائے جب حکومت ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی یا اس کے قابل نہیں تھی۔ مشنری اسکولوں کا علمی ماحول، اگرچہ وہ اکثر سخت ہوتا، سرکاری اسکولوں میں رائج نسل پرستانہ ضابطوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ کھلا تھا۔

فورٹ ہیئر نے براعظیم کے بعض عظیم ترین افریقی سکالروں کے لئے گھر اور انکو بیٹر دونوں کا کام دیا۔ پروفیسر زیڈ کے میتھیویں ذہانت وفطانت کا عمدہ نمونہ تھے۔ وہ ایک کان کن کے بیٹے تھے۔ اور بکر واشنگٹن کی تصنیف ''اپ فرام سلیوری'' (غلامی سے اٹھ کر) سے متاثر ہوئے تھے جس میں محنت اور اعدال کے ذریعے کامیابی

حاصل کرنے کی تلقین کی گئی تھی ۔وہ سماجی بشریات اور افریقی قانون پڑھاتے تھے اور حکومت کی سماجی پالیسیوں پر جارحانہ تنقید کرتے تھے۔

پروفیسر جاباوو،ایک انسائیکلوپیڈیا

فورٹ ہیئر اور پروفیسر ڈی ڈی ٹی جاباوو بالفعل باہم مترادف تھے ۔1916ء میں جب یونیورسٹی کا افتتاح ہوا،وہ عملے کے پہلے رکن تھے۔ پروفیسر جاباوو کو لندن یونیورسٹی نے انگریزی میں ڈگری عطا کی تھی جس کا حصول ان دنوں ناممکن لگتا تھا ۔پروفیسر جاباوو ژہوسا اور لاطینی ،تاریخ اور بشریات پڑھاتے تھے۔ جب ژہوسا شجروں کی بات آتی تو ایک انسائیکلوپیڈیا بن جاتے اور میرے والد کے بارے میں وہ حقائق بتاتے جن سے میں کبھی آگاہ نہیں ہوا تھا۔وہ افریقی حقوق کے ترغیت دہ ترجمان بھی تھے اور 1936ء میں آل افریقن کنونشن کے بانی صدر بنے تھے۔اس کنونشن نے پارلیمنٹ اس قانون سازی کی مخالفت کی تھی جس کا مقصد کیپ میں عام ووٹروں ں کا رول ختم کرنا تھا۔

مجھے تا دہے کہ ایک بار میں نے فورٹ ہیئر سے متاتا تک ریل گاڑی میں سفر کیا تھا افریقن کمپارٹمنٹ میں سوار ہوا تھا اور صرف اس ایک ڈبے میں سیاہ فاموں کے لئے نشستیں تھیں ۔سفید فام ٹرین انسپکٹر ہمارے ٹکٹ چیک کرنے آیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں ایلس اسٹیشن سے سوار ہوا ہوں تو اس نے کہا: ''کیا تم جاباوو کے اسکول سے ہو؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا ۔اس پر کنڈکٹر نے مسکرا کر میرا ٹکٹ پنچ کر دیا اور زیر لب ''جاباوو کا ایک عمدہ آدمی'' ہونے کے ریمارکس دیئے۔

اپنے پہلے سال میں نے انگریزی، بشریات، سیاسیات، مقامی انتظامیہ اور رومن ڈچ لاکے مضامین پڑھے۔''مقامی انتظامیہ'' میں افریقیوں سے متعلق قوانین پڑھائے جاتے تھے اور اسے اختیار کرنے کا ہر اس فرد کو مشورہ دیا جاتا جو شعبہ مقامی امور میں کام کرنا اہتا تھا اگرچہ کے ڈی مجھے قانون پڑھنے کا مشورہ دے رہا تھا میں

دل میں شعبہ مقامی امور میں ایک ترجمان یا ایک کلرک بننے کی ٹھانے ہوئے تھا ق۔ ان دنوں ں سول سرونٹ کا پیشہ ایک افریقی کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھا اور یہ اعلیٰ ترین مقام تھا جس کی ایک سیاہ فام خواہش کر سکتا تھا۔

دیہاتی علاقوں میں مجسٹریٹ آفس کے ترجمان کو اہمیت کے لحاظ سے مجسٹریٹ کے بعد نمبر 2 خیال کیا جاتا۔ جب میرے دوسرے سال میں فورٹ ہیئر میں ترجمان کورس متعارف کرایا گیا، جسے ایک سرکردہ ریٹائرڈ عدالتی ترجمان تام زاشی پڑھاتے تھے، تو اس کورس کے اولین شرکاء میں شامل تھا۔

فورٹ ہیئر مقابلتاً اونچے طبقے کا تعلیمی ادارہ تھا اور اعلیٰ تعلیم کے بہت سے تعلیمی اداروں کی طرح یہ ان جیسے مسائل سے دوچار تھا۔ سینئر طلبہ جونیئر طلبہ سے احساس تفاخر اور حقارت کے ساتھ ملتے۔ جب میں پہلی بار کیمپس پہنچا مرکزی صحن میں مجھے جمالیل واباز نظر آیا۔ وہ مجھ سے کئی سال بڑا تھا اور کلارک بری میں میرے ساتھ رہ چکا تھا۔ میں نے اسے اشتیاق سے سلام کیا مگر اس کا رویہ سرد اور تفاخر آمیز تھا۔ اس نے تسخر آمیز ریمارکس دیتے ہوئے کہا مجھے نووارد طلبہ کے بورڈنگ ہاؤس میں رہنا ہوگا۔ واباز نے مجھے مطلع کیا کہ وہ میرے بورڈنگ ہاؤس کمیٹی میں شامل ہے اگرچہ سینئر ہونے کی بنا پر وہ اس ہاؤس میں نہیں رہتا۔ میں نے اس رویئے کو نامانوس اور غیر جمہوری پایا، مگر یہ وہاں کا مسلمہ رواج تھا۔

گنوار دیہاتی کی پہلی کامیابی

کچھ عرصہ بعد ایک رات ہمارے ایک گروہ نے اس حیثیت پر غور و خوض کیا کہ رہائشی یا نووارد طلبہ کی ہاؤس کمیٹی میں کوئی نمائیدگی نہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں رویت سے روگردانی کر کے ان دو گروہوں پر مشتمل ایک ہاؤس کمیٹی چن لینی چاہیے۔ ہم نے بحث و تمحیص کی اور ہاؤس کے تمام مکینوں کو اپنا ہم نوا بنانے کی سعی کی اور پھر چند ہفتے میں ہم نے سینئر طلبہ کو شکست دے کر اپنی ہاؤس کمیٹی چن لی۔ میں

آرگنائزروں میں شامل تھا اور اس نئی منتخب کمیٹی کا رکن بنا۔

لیکن سینئر اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والے نہیں تھے۔انہوں نے اایک اجلاس منعقد کیا جس میں ریکس ٹاٹانی جو انگریزی کا ایک رواں مقرر تھا کہا: ''نوواروں کی طرف ایسا رویہ ناقابل قبول ہے۔ہم سینئر لوگوں کو منڈیلا جیسا پسماندہ دیہاتی کیسے الگ تھلگ کرسکتا ہے جو اچھی طرح انگریزی بھی بول سکتا؟''پھر وہ میرے لہجے کی نقل اتارنے لگا جو اس کے خیال میں لگالیکا بولی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس پر اس کے حاشیہ برداروں کھول کر ہنسے۔ٹاٹانی کی طعن آمیز تقریر نے ہم سب کو اور پختہ کر دیا۔ہم نوواردوں نے سرکاری ہاؤس کمیٹی تشکیل دی اور اس میں سینئر کو سب سے زیادہ ناخوشگوار کام تفویض کیے جو ان کے لئے بڑی اہانت کی بات تھی۔

کالج کے عزت مآب اے جے کک کو اس تنازع کا علم ہوا تو انہوں نے ہمیں اپنے دفتر میں بلایا۔ہم محسوس کرتے تھے کہ ہم اپنی طرف سے حق پر ہیں لہذا ہم ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہ تھے۔ٹاٹانی نے وارن سے اپیل کی کہ وہ ہماری کارروائی کو مسترد کردیں اور اپنی تقریر کے دوران وہ رہ پڑا۔وارڈن نے ہم سے کہا کہ اپنے موقف پر نظر ثانی کریں مگر ہم نہ جھکے۔بیشتر اکڑ بازوں کی طرح ٹاٹانی باہر سے اکھڑ مگر بودا تھا۔ہم نے وارڈن سے کہہ دیا اور اس نے ہماری کارروائی کو مسترد کیا تو ہم سب ہاؤس کمیٹی سے مستعفی ہوجائیں گے اور یوں کمیٹی ہر جواز اور اختیار سے محروم ہوجائے گی۔آخر کار وارڈن نے مداخلت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہم ثابت قدم رہے تھے اور جیت گئے تھے۔یہ حکام کے ساتھ میری پہلی جنگوں میں سے ایک تھی اور میں نے اپنے اندر وہ طاقت محسوس کی جو انسان کے حق اور انصاب پر ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ایک احساس یہ تھا کہ مالج میں حکام کے خلاف لڑنے میں مستقبل میں، میں اتنا خوش قسمت ثابت نہ ہوسکوں گا۔

فورٹ ہیئر میں میری تعلیم جتنی کلاس روم کے اندر تھی اتنی ہی باہر تھی۔ میں ہیلڈ ٹاؤن کے مقابلے میں یہاں زیادہ مستعد کھلاڑی بن گیا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں ۔ میں زیادہ لمبا اور زیادہ مضبوط ہو گیا تھا لیکن اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ فورٹ ہیئر ٹاؤن کی نسبت اتنا چھوٹا تھا کہ زیادہ مقابلہ درپیش نہیں تھا۔ میں فٹ بال اور کراس کنٹری دوڑ دونوں میں اوروں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ دوڑوں نے مجھے ایک گرانقدر سبق سکھایا۔ کراس کنٹری مقابلوں میں حقیقی اہلیت کے بجائے تربیت زیادہ اہمیت رکھتی تھی اور میں قدرتی رجحان کی کمی کی تلافی محنت اور نظم وضبط سے کر سکتا تھا۔ میں نے یہ کلیہ ہر اس معاملے پر لاگو کیا جسے میں نے ہاتھ میں لیا اور کامیاب رہا۔ وہ طالبعلمی میں، میں نے کئی نوجوان دیکھے جن میں بہت قدرتی اہلیت تھی مگر ان میں اتنا ضبط نفس اور برداشت کا مادہ نہیں تھا کہ وہ اس نعمت سے کام لے کر اپنی زندگی بنا سکتے۔

میں نے ڈراما سوسائٹی میں شرکت کی اور ایک کھیل میں کام کیا جس میں ابراہام لنکن کا کردار میرے ہم جماعت لنکن امکلخانی نے ادا کیا۔ امکلخانی، ٹرانسکائی کے ایک سرکردہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور یہ دوسرا ساتھی تھا جس کی طرف میں عملی رہنمائی کے لئے دیکھتا تھا۔ یہ بات بالفعل درست تھی کیونکہ وہ فورٹ ہیئر میں واحد طالب علم تھا جو مجھ سے زیادہ لمبا تھا امکلخانی نے اپنے ہم نام کردار ادا کیا جبکہ میں لنکن کا قاتل جان ولکس بوتھ بنا امکلخانی کا کردار شاہانہ اور رسمی تھا اور جب وہ لنکن کی عظیم ترین تقریر، خطاب گیٹس برگ کر رہا تھا تو حاضرین نے کھڑے ہو کر داد دی۔ میرا کردار نسبتاً چھوٹا تھا اگرچہ میں کھیل کے اخلاقی سبق کا محور تھا جو لوگ بڑے خطرات مول لیتے ہیں انہیں اکثر بڑے نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

میں دیہات میں بائبل کا درس دیتا

میں سٹوڈنٹس کرسچین ایسوسی ایشن کا رکن بن گیا اور اتوار کو قریبی دیہات میں

جا کر بائبل کے درس دیتا۔ میری ان مہمات کے دوران میرا ساتھی ایک سنجیدہ نوجوان سائنس کا طالبعلم تھا جس سے میری ملاقات فٹبال کے میدان میں ہوئی تھی ۔اس کا تعلق پونڈو لینڈ، ٹرانسکائی سے تھا اور اس کا نام آلیور ٹیمبو تھا۔شروع ہی میں نے بھانپ لیا کہ آلیور کی ذہانت ہیرے کی دھار تھی۔ وہ ایک منجھا ہوا مباحث تھا اور وہ عام اور فرسودہ باتیں قبول نہ کرتا جنہیں ہم از خود مان لیتے تھے۔ وہ پیدا ہال میں تھا اور جو ہینگلی کن کوٹل تھا اور اگرچہ فورٹ ہیئر میں میرا اس سے زیادہ رابطہ نہیں تھا، مجھے یہ جاننے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ وہ بڑے کاموں کے لئے پیدا ہوا ہے۔

اتوار کو ہمارا ایک گروہ بعض اوقات قصبہ ایلس چلا جاتا اور وہاں ایک ریستوران میں ہم کھانا کھاتے۔ ریستوران کا مالک سفید فام تھا اور ان دنوں یہ امر ناقابل تصور تھا کہ ایک سیاہ فام اگلے دروازے سے اندر جائے اور ڈائننگ روم میں بیٹھ کر کھانا کھائے،تاہم ہم ہمت کر کے کچن تک چلے جاتے اور جو چاہتے آرڈر دیتے۔

فورٹ ہیئر میں، میں نے نہ صرف فزکس پڑھی بلکہ ایک اور فزیکل سائنس....... بال روم ڈانسنگ بھی سیکھی۔ ڈائنگ ہال میں ایک پرانے فونوگراف کی دھن پر ہم گھنٹوں فاکس ٹروٹس اور والٹس کی مشق کرتے رہتے۔ ہر ایک اپنی باری پر رہنمائی اور پیروی کرتا۔ ہمارے لئے قابل تقلید وکٹر سلوسٹر، بال روم ڈانسنگ کا عالمی چیمپئن تھا اور تھا اور ایک طالب علم ساتھی سمالی سیونڈ لا ہمارا تالیق تھا جو اس بڑے جنکار کا نوجوان سانچا لگتا تھا۔

ندامت کا پسینہ

قریبہ گاؤں میں ایک افریقن ڈانس پال تھا جو انسٹی لا مازی کے نام سے معروف تھا وہاں مقامی سیاہ فام سوسائٹی کی کریم جمع ہوتی مگر انڈر گریجوایٹ طلبہ کے لئے وہ شجر ممنوعہ تھا لیکن ایک رات صنف نازک کے ساتھ ہم قدم ہونے کی مشق کرنے کے شوق مین ہم نے سوٹ پہنے، چوری چوری ہوسٹل سے نکلے اور ڈانسنگ

ہال میں جا پہنچے ۔ وہاں مجھے ایک خوبصورت نوجوان عورت نظر آئی ۔ میں نے ملائمت سے اسے رقص کرنے کو کہا۔ ایک لمحہ بعد وہ میرے بازوؤں میں تھی ۔ ہم دونوں نے خوب رقص کیا اور میں نے خیال کیا کہ فرش رقص پر میری کارکردگی خاصی نمایاں ہے ۔ چند منٹ بعد میں ننے اس کا نام پوچھا۔ اس نے ملائمت سے جواب دیا: ''مسز بوکوی۔'' میں نے فوراً اسے پرے دھکیلا اور فرش کے پار نگاہ دوڑائی تو مجھے ڈاکٹر روز بیری بوکوی دکھائی دیئے جو مغرز ترین افریقی اور وقت کے اسکالر تھے وہ اپنے برادرِ نسبتی اور میرے پروفیسر زیڈ کیو میتھیوں سے گپ شپ کر رہے تھے ۔ میں نے مسز بوکوی سے معذرت کی اور پھر با ندامت سے پیشوائی کرکے اسے فرش رقص سے باہر پہنچایا جبکہ ڈاکٹر بوکوی اور پروفیسر میتھیوں کی تیز نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں ۔ میں چاہتا تھا فرش پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ میں نے یونیورسٹی کے کئی ضابطوں کی خلاف ورزی کی تھی ۔ لیکن پروفیسر میتھیوں نے جو فورٹ ہیسر میں نظم وضبط کے انچارج تھے کبھی مجھ سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ وہ طلبہ کی ایسی خوش فعلیاں برداشت کرتے نظر آتے جنھیں پڑھائی میں محنت متوازن کر دیتی تھی ۔ انسٹی لامانزی کی شام کے بعد آنے والے ہفتوں میں، میں نے اس قدر محنت سے پڑھا کہ اتنا پہلے کبھی نہیں پڑھا تھا۔

فکری اور معاشرتی دونوں لحاظ سے ایک طرح کی جدیدیت فورٹ ہیسر کی خصوصیت تھی جو میرے لئے نئی اور اجنبی تھی ۔ مرنی معیاروں سے فورٹ ہیسر کی دنیا داری بظاہر زیادہ نہیں تھی لیکن میرے جیسے دیہاتی لڑکے کے لئے یہ ایک انکشاف تھی ۔ میں نے پہلی بار یہاں پتلون پہنی ۔ شروع میں وہ مجھے غیر آرام دہ لگی مگر بتدریج میں اس کا عادی ہو گیا۔ اس سے پہلے میں نے ٹوتھ برش اور ٹوتھ پیسٹ کبھی استعمال نہیں کیے تھے ۔ گھر میں ہم دانت چمکانے کے لئے راکھ اور انہیں صاف کرنے کے لئے خلال استعمال کرتے تھے ۔ بہتے پانی والے ٹائلٹ اور گرم پانی کے شاور بھی

میرے لئے عجوبہ تھے۔ میں نے یہیں پہلی بار لکس سوپ استعمال کیا۔ اس سے پہلے گھر میں برسوں میں نیلا صابن نہانے کے لئے استعمال کرتا رہا تھا۔

شاید ان آشنائیوں کا نتیجہ تھا کہ میں ان سادہ خوشبوؤں کی تمنا کرتا جو لڑکپن میں میسر تھیں۔ یہ صرف میرا احساس نہیں تھا۔ نوجوانوں کا ایک گروہ میرے ساتھ مل گیا۔ ہم شام مہم جوئی کے لئے یونیورسٹی سکتے کھیتوں میں نکل جاتے جہاں آگ جلاتے اور مکئی کے بھٹے بھونتے۔ ہم آگ کے گرد بیٹھ کر بھنے ہوئے بھٹے کھاتے اور کہانیاں سنتے سناتے۔ ہم یہ اس لئے نہیں کرتے تھے کہ ہم بھوکے ہوتے تھے بلکہ گھریلو ماحول کی یاد تازہ کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے۔ ہم اپنی فتوحات اور کھیلوں میں کامیابیوں پر فخر کرتے اور ان رقوم کا تصور کرتے جو گریجوایٹ ہونے کے بعد ہم کمانے والے تھے۔ اگر چہ میں اپنے آپ کو ایک جدید نوجوان خیال کرتا تھا۔ مگر ابھی تک ایک دیہاتی لڑکا ہی تھا جسے دیہی خوشیاں بہت یاد آتی تھیں۔

یورپ کی آزادی کی جنگ

اگر چہ فورٹ ہیئر دنیا سے الگ تھلگ جائے امن تھا، ہم دوسری جنگ عظیم کی پیشرفت میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ اپنے ہم جماعتوں کی طرح برطانیہ عظمیٰ کا پر جوش حامی تھا اور مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ میرے پہلے سال کے اختتام پر یونیورسٹی کی گریجوایشن تقریب میں مہمان مقرر جنوبی افریقہ میں انگلستان کے عظیم حامی، سابق وزیر اعظم جان سمٹس ہوں گے۔ فورٹ ہیئر کے لیے یہ ایک بڑا اعزاز تھا کہ وہ ایسے شخص کی میزبانی کرے جو عالمی سیاستدان کے طور پر معروف ہو۔ سمٹس اس وقت نائب وزیر اعظم تھا اور ملک میں اس مہم پر نکلا ہوا تھا کہ جنوبی افریقہ جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کرے جبکہ وزیر اعظم جے بی ہرزوگ غیر جانبداری کا حامی تھا۔ میں سمٹس جیسے عالمی لیڈر کو قریب سے دیکھنے کا بے حد متمنی تھا۔

ہرزوگ نے تین سال پہلے کیپ میں رائے دہندگان کی مشترک فہرست سے

آخری افریقی رائے دہندگان کے نام خارج کرنے کی مہم چلائی تھی جبکہ سمٹس کو میں نے نسبتاً ہمدرد پایا تھا۔ میں اس امر کو بڑی اہمیت دیتا تھا کہ اس نے لیگ آف نیشنز کے قیام میں مدد دے کر دنیا میں آزادی کو فروغ دیا تھا حالانکہ اپنے ملک میں سیاہ فاموں کی آزادی کچلنے میں کوئی کمی نہ چھوڑی تھی۔

سمٹس نے جرمنی کے خلاف برطانیہ عظمیٰ کی حمایت کرنے کی اہمیت اور اس تصور پر گفتگو کی کہ انگلستان انہی مغربی قدروں کا امین ہے جس کے امین ہم جنوبی افریقی ہیں۔ میں نے اس کی تقریر سن کر یہ خیال کیا کہ اس انگریزی لہجہ اتنا کمزور ہے جتنا کہ میرا۔ اپنے ہم جماعتوں کیساتھ میں نے اسے دل کھول کر داد دی اور جب اس نے یورپ کی آزادی کے لیے جنگ لڑنے کی دعوت دی تو ہم نے تالیاں بجائیں اور ایسا کرتے ہوئے ہم بھول گئے کہ ہمیں یہاں اپنے ملک میں تو آزادی حاصل نہیں۔

سمٹس، فورٹ ہیئر میں نو مسیحی سیاہ فاموں میں اپنے نظریے کی تبلیغ کر رہا تھا۔ ہر شام ویزلے ہاؤس کا وارڈن یورپ میں فوجی صورت حال کا جائزہ پیش کرتا اور رات گئے ہم ایک پرانے ریڈیو سیٹ کے گرد بیٹھ کر بی بی سی نشریات میں ونسٹن چرچل کی پرجوش تقریریں سنتے۔ اگرچہ ہم نے سمٹس کے موقف کی حمایت کی تھی، اس کے دورے پر بڑی لے دے ہوتی رہی۔ ایک اجلاس میں میرے ایک ہم عصر نیا تھی کھونگی سا نے سمٹس کو نسل پرست کہہ کر اس جارحانہ تنقید کی۔ اس نے کہا کہ ہمیں اپنے آپ کو بلیک انگلش میں سمجھنا چاہیے لیکن انگریزوں نے ہمیں مہذب بنانے کی کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں ظلم کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ بوئروں اور برطانویوں میں باہمی عناد کیسا ہی کیوں نہ ہو، دونوں سفید فام گروہ سیاہ خطرے کا سامنا کرنے کے لیے متحد ہو جاتے ہیں۔ کھونگی سا کے نظریات نے ہمیں ہکا بکا کر دیا اور وہ ہمیں خطرناک حد تک ریڈیکل لگا۔ ایک ساتھی نے میرے کان میں سرگوشی کی کہ

نیا تھی افریقن نیشنل کانگرس کا رکن ہے۔ اس تنظیم کے بارے میں، میں نے سنا تھا مگر اس کے متعلق بہت کم جانتا تھا۔ جنوبی افریقہ کے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کے بعد ہرزوگ نے استعفا دے دیا اور سمٹس وزیر اعظم بن گیا۔

مجسٹریٹ کا گوراپن

فورٹ ہیئر میں اپنے دوسرے سال کے دوران میں نے اپنے دوست پال مہابانی کو دعوت دی کہ وہ سرمائی چھٹیاں میرے وطن ٹرانسکائی میں گزارے۔ پال کا تعلق بلوم فونٹائن سے تھا اور وہ کیمپس میں معروف تھا کیونکہ اس کا باپ عزت ماب زاکیوس مہابنی افریقن نیشنل کانگرس کا دوبارہ پریزیڈنٹ جنرل رہ چکا تھا۔ اس کے اس تنظیم سے تعلق نے، جس کے متعلق میں ہنوز بہت کم جانتا تھا، اسے ایک باغی کی شہرت دی تھی۔

چھٹیوں کے دوران ایک روز پال اور میں اتماتا گئے جو ٹرانسکائی کا صدر مقام تھا اور جو چند پختہ سڑکوں اور بعض سرکاری عمارتوں پر مشتمل تھا۔ ہم پوسٹ آفس کے باہر کھڑے تھے جب مقامی مجسٹریٹ، جو ساٹھ کے پیٹے میں ایک سفید فام تھا۔ پال کے پاس آیا اور اسے اندر جا کر کچھ ڈاک ٹکٹ خرید لانے کو کہا۔ سفید فاموں کا یہ عام وتیرہ تھا کہ وہ کسی بھی سیاہ فام کو کسی بھی کام کے لیے کہہ سکتے تھے۔ مجسٹریٹ نے پال کو کچھ نقدی تھمانے کی کوشش کی مگر اس نے وہ نہ لی۔ مجسٹریٹ غضبناک ہو کر بولا، تم جانتے ہو میں کون ہوں۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''یہ جاننا ضروری نہیں کہ تم کون ہو۔ مہابانی نے کہا۔ میں جانتا ہوں جو کچھ تم ہو۔''

مجسٹریٹ نے کہا: ٹھیک ٹھیک بتاؤ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے۔'

''میرا مطلب ہے تم ایک بدمعاش ہو۔ پال نے گرمی کھا کر کہا۔''

مجسٹریٹ اس پر ابل پڑا اور چلایا۔ یہ بات تمہیں مہنگی پڑے گی۔ پھر وہ بڑبڑایا ہوا چلا گیا۔

پال کے رویے سے میں بہت پریشان ہوا۔ جہاں میں اسکے حوصلے کی قدر کرتا تھا، وہیں اس پر پریشانی بھی تھی۔ مجسٹریٹ جانتا تھا کہ میں کون ہوں اور میں جانتا تھا کہ اگر وہ پال کے بجائے مجھ سے کام کرنے کو کہتا تو میں فوراً انجام دیتا اور پھر بھول جاتا۔ لیکن پال نے جو کچھ کیا تھا۔ اس پر میں نے اس کی تعریف کی اگرچہ میں خود ایسی حرکت کرنے کے لیے ابھی تیار نہیں تھا۔ مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ ایک کالا آدمی ہر روز چھوٹی چھوٹی درجنوں، اہانتیں کیونکر گوارا کرسکتا ہے۔

چھٹیوں کے بعد میں نئے سال کے شروع میں قوت اور تازگی کا احساس لیے اسکول لوٹ آیا۔ میں نے اپنی تمام تر توجہ مطالعے پر مرکوز کردی کیونکہ اکتوبر میں امتحانات ہونے والے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ ایک سال کے عرصے میں، میں گرٹروڈ انت لاباتھی کی طرح بی اے کی ڈگری حاصل کرلوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک یونیورسٹی ڈگری نہ صرف سماجی قیادت بلکہ معاشی کامیابی کا بھی پاسپورٹ ہے۔ پرنسپل ڈاکٹر الگزینڈر رکیر، پروفیسر جاجاوو اور میتھیوس نے بار بار ہمیں بتایا تھا کہ کس طرح فورٹ ہیئر کے گریجوایٹوں کی حیثیت سے ہم افریقی شرفا بن گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ دنیا میرے قدموں میں ہوگی۔ ایک بی اے کی حیثیت سے میں اپنی ماں کی دولت اور مرتبہ لوٹا سکوں گا جو میرے باپ کی وفات کے بعد ان سے چھن گئے تھے۔ میں انہیں قونو میں ایک مناسب گھر لے دوں گا جس میں ایک باغیچہ، جدید فرنیچر اور دیگر لوازمات ہوں گے۔ میں اپنی ماں بہنوں کی کفالت کروں گا تاکہ انہیں وہ سہولتیں حاصل ہوسکیں جو ایک عرصے سے انہیں نہیں مل رہی تھیں۔ یہ میرا خواب تھا اور لگتا تھا کہ یہ میری رسائی میں ہے۔

طلبہ سیاست کے رنگ

اس برس مجھے ایس آر سی یعنی طلبہ نمائندہ کونسل کی رکنیت کے لیے نامزد کیا گیا جو فورٹ ہیئر میں طلبہ کی سب سے بڑی تنظیم تھی۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ ایک

سٹوڈنٹس الیکشن کے ارد گرد ہونے والے واقعات ایسی مشکلات کو جنم دیں گے جو میری زندگی کا رخ بدل دیں گی۔ ایس آر سی انتخابات سال کی آخری ٹرم کے دوران منعقد ہوئے جب ہم امتحانی تیاریوں میں مصروف تھے۔ فورٹ ہیئر کے دستور کے مطابق تمام طلبہ ایس آر سی کے چھ ارکان کا انتخاب کرتے تھے۔ انتخاب سے پہلے تمام طلبہ ایک اجلاس ہو جس میں مسائل زیر بحث آئے اور مشکلات حل کیے جانے کا مطالبہ کیا گیا۔ طلبہ کا متفقہ احساس تھا کہ فورٹ ہیئر میں خوراک ناقص ملتی ہے۔ اس کی اصلاح کی جائے اور یہ کہ ایس آر سی کے اختیارات بڑھائے جانے چاہییں تا کہ وہ محض انتظامیہ کی آلہ کار نہ بنی رہے۔ مجھے ان دونوں مطالبات سے اتفاق تھا اور جب طلبہ کی اکثریت نے اس وقت تک انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کے حق میں رائے دی جب تک حکام ہمارے مطالبات مان نہیں لیتے تو میں نے بھی اس کی حمایت کی۔

اس اجلاس کے فوراً بعد مجوزہ ووٹنگ ہوئی۔ طلبہ کی اکثریت نے الیکشن کا بائیکاٹ کیا لیکن پچیس لڑکوں نے جو کل تعداد کا چھٹا حصہ تھے۔ ووٹ ڈالے اور چھ نمائندے چنے لیے جن میں ایک خود میں تھا۔ اسی روز چھ افراد جنہیں ان کی غیر موجودگی میں چن لیا گیا تھا، ان معاملات پر غور وفکر کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ ہم سب نے متفقہ طور پر اس بنا پر استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا کہ ہم نے بائیکاٹ کی حمایت کی تھی اور ہمیں طلبہ کی اکثریت کی حمایت حاصل نہیں۔ پھر ہم نے ایک خط لکھا اور ڈاکٹر کیر کے حوالے کر دیا۔

لیکن ڈاکٹر کیر بھی کائیاں تھے۔ انہوں نے ہمارے استعفے منظور کر لیے اور پھر اعلان کیا کہ نئے انتخابات اگلے روز عشائیے کے وقت ڈائننگ ہال میں منعقد ہوں گے۔ اس طرح یہ بات یقینی ہو گی کہ تمام طلبہ حاضر ہوں گے اور پھر یہ عذر برقرار نہیں رہے گا کہ ایس آر سی کو تمام طلبہ کی حمایت حاصل نہیں۔ اس شام انتخابات

منعقد ہوئے جیسا کہ پرنسپل نے حکم دیا تھا لیکن ان میں بھی انہی 25 نے ووٹ دیے اور پھر انہی 6 افراد کو ایس آر سی کارکن چن لیا۔

اس مرتبہ ہم چھ اپنی پوزیشن پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئے تو اختلاف رائے ہو گیا۔ میرے پانچ ساتھیوں کی رائے تھی کہ فنی نقطۂ نظر سے ہمیں ایک ایسے اجلاس میں منتخب کیا گیا ہے جس میں تمام طلبہ شریک تھے۔ لہذا اب ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم طلبہ کی نمائندگی نہیں کرتے۔ اس بنا پر ہمیں اپنے عہدے قبول کر لینے چاہییں۔ میرا موقف یہ تھا کہ درحقیقت کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا۔ اگرچہ تمام طلبہ موجود تھے مگر ان کی اکثریت نے ووٹ نہیں دیے لہذا اخلاقی لحاظ سے یہ کہنا درست نہیں کہ ہمیں ان کا اعتماد حاصل ہے۔ چونکہ ہمارا اولین مقصد انتخابات کا بائیکاٹ تھا اور ہمارے اس عمل کو طلبہ کی حمایت حاصل تھی لہذا ہمارا فرض ہے کہ ہم اس قرارداد کی پابندی کریں اور پرنسپل کی کسی چالبازی میں نہ آئیں۔ میرے ساتھیوں نے میرے اس موقف کی تائید نہ کی تو میں دوسری مرتبہ استعفا دے دیا۔ چھ ارکان میں سے میں واحد شخص تھا جس نے یہ کیا۔

میرے ضمیر نے اجازت دی

اگلے روز پرنسپل کے حضور میری طلبی ہوئی۔ ڈاکٹر کیر، ایڈنبرا یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے اور بالفعل فورٹ ہیئر کے بانی اور بڑے احترام کے حامل تھے۔ انہوں نے گزشتہ چند روز کے واقعات کا بڑے سکون سے جائزہ پیش کیا اور پھر مجھ سے کہا کہ میں استعفا دینے کے فیصلے پر نظر ثانی کروں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کہا کہ میں اس پر تنہائی میں غور کروں اور اگلے روز اپنے آخری فیصلے سے مطلع کروں۔ ساتھ یہ انتباہ بھی کیا کہ وہ اپنے طلبہ کو غیر ذمے داری کا رویہ اپنانے کی اجازت نہیں دے سکتے اور اگر میں استعفا دینے پر مصر رہا تو وہ مجھے فورٹ ہیئر سے خارج کر دیں گے۔ میں ان کی اس بات پر ہل کر رہ گیا اور تمام

رات بے آرامی میں گزاری، ۔اس سے پہلے کبھی ایسا بوجھل فیصلہ نہیں کرنا پڑا۔اس شام میں نے دوست اور ناصح کے ڈی سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ اصولی طور پر میں استعفا دینے میں حق بجانب ہوں اور مجھے ہتھیار نہیں ڈالنے چاہییں ۔میرا خیال ہے کہ اس وقت میں ڈاکٹر کیر سے زیادہ کے ڈی سے ڈرتا تھا۔ میں نے کے ڈی کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

اگر چہ میں سمجھتا تھا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں اخلاقی طور پر درست ہے ۔مگر ابھی تک مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ درست راستہ ہے بھی یا نہیں۔ کیا میں ایک ایسے مجرد اخلاقی اصول پر اپنے مستقبل کو تباہ کر رہا تھا جس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی؟ یہ تصور میرے لیے ہضم کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ جسے میں طلبہ کی طرف سے عائد ہونے والا فرض سمجھتا تھا اسے اپنے خودغرضی کے مفادات پر قربان کر دوں ۔میں نے ایک موقف اپنایا تھا اور اب میں اپنے ساتھی طلبہ کی نظروں میں دغا باز بننا نہیں چاہتا تھا۔ اس کیساتھ ہی میں فورٹ ہیئر میں اپنا مستقبل بھی تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اگلی صبح جب میں ڈاکٹر کیر کے دفتر پہنچا تو عدم فیصلہ کی کیفیت میں تھا اور فیصلہ عین اس وقت کیا جب انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم کسی فیصلے تک پہنچ گئے ہو۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں فیصلہ کر چکا ہوں اور یہ کہ میں اپنے ضمیر کی روشنی میں ایس آر سی میں خدمات انجام نہیں دے سکتا۔ڈاکٹر کیر میرے اس جواب پر قدرے چکرا گئے ۔انہوں نے ایک دو لمحوں کے لیے سوچا اور پھر کہا: ٹھیک ہے یہ تمہارا فیصلہ ہے ۔ میں نے بھی معاملے پر کچھ غور کیا ہے ۔تم اگلے سال فورٹ ہیئر آ سکتے ہو بشرطیکہ ایس آر سی میں شرکت کر لو۔تمہارے پاس غور کرنے کے لیے پوری گرمیاں ہیں، مسٹر منڈیلا:

اس طرح سے میں بھی اپنے جواب پر اتنا ہی حیران تھا جتنے ڈاکٹر کیر، میں جانتا تھا فورٹ ہیر سے رخصت ہونا پرلے درجے کی حماقت ہے لیکن اس لمحے جب مجھے

مفاہمت کی ضرورت تھی ، میں ایسا نہ کر سکا۔ میرے ضمیر نے مجھے اجازت نہ دی۔ جہاں میں ڈاکٹر کیر کی پوزیشن اور مجھے ایک اور موقع دینے پر رضامندی کی تعریف کرتا تھا وہیں مجھے اپنی قسمت پر ان کا اختیار مطلق برا لگتا تھا۔ مجھے ہر حق حاصل ہونا چاہیے تھا کہ اگر میں چاہوں تو ایس آر سی سے استعفا دے دوں۔ یہ ناانصافی تکلیف دہ تھی اور اس لمحے مجھے ڈاکٹر کیر آقائے مہربان سے زیادہ ایک ظالم ڈکٹیٹر نظر آیا۔ سال کے آخر میں جب میں فورٹ ہیئر سے رخصت ہوا تو میں اعراف کی ناخوشگوار حالت میں تھا۔

امحی کیزوینی میں واپسی

عموماً جب میں امحی کیزوینی لوٹتا تھا تو تسکین و تکمیل کا احساس لیے آتا تھا لیکن اس مرتبہ ایسا نہیں تھا۔ امتحان پاس کرنے کے بعد گھر واپس آ کر میں نے ناظم کو تمام صورتحال بتائی۔ وہ غضبناک ہوا اور میرے اقدام کی وجوہات سمجھنے سے قاصر رہا۔ اس نے اسے یکسر احمقانہ قرار دیا۔ مجھ سے پوری وضاحت سنے بغیر ہی اس نے نادر شاہی حکم صادر کر دیا کہ مجھے پرنسپل کی ہدایات ماننا ہوں گی اور خزاں میں فورٹ ہیئر واپس جانا ہوگا۔ ان کے لہجے میں بحث و تمحیص کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اپنے آقائے مہربان کیساتھ تکرار بے فائدہ بھی ہوتی اور بدتمیزی بھی، اس لیے میں نے معاملے کو کچھ عرصے کے لیے التواء میں ڈال دیا۔

جسٹس بھی امحی کیزوینی لوٹ آیا تھا اور ہم ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے خواہ کتنا بھی عرصہ جدا رہے تھے، وہ برادرانہ رشتہ جس نے ہمیں متحد کیا تھا، از سر نو استوار ہو گیا تھا۔ جسٹس ایک سال پہلے سکول سے فارغ ہو گیا تھا اور اب کیپ ٹاؤن میں رہتا تھا۔

چند روز کے اندر میں اپنے گھر میں پرانی زندگی کی طرف لوٹ آیا۔ میں ناظم کے معاملات کی نگرانی کرتا جن میں اسکا گلہ اور دوسرے سرداروں کے ساتھ اس کے

روابط شامل تھے۔ میں فورٹ ہیئر کی صورت حال پر تکیہ نہیں کیے ہوئے تھا لیکن زندگی ان لوگوں پر اپنے فیصلے مسلط کرتی ہے جو غیر یقینی کی فضا میں معلق ہوں۔ یہ ایک بالکل مختلف اور میری پڑھائی سے غیر متعلق معاملہ تھا جس نے مجھے پکڑ کر ایک راہ پر ڈال دیا۔

2 شادیوں کا نادر شاہی حکم

میں گھر آنے کے چند ہفتے بعد ناظم نے جسٹس کو اور مجھے ایک ملاقات کے لیے بلایا "میرے بچوں" انہوں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ مجھے خدشہ ہے کہ میں زیادہ عرصہ اس دنیا میں نہیں رہوں گا اور اس سے پہلے کہ میں بزرگوں کی سرزمین کی طرف سفر اختیار کروں، میرا فرض ہے کہ میں تم دونوں کو باقاعدہ شادی شدہ دیکھ لوں۔ اس لیے میں نے تم دونوں کی شادیوں کا انتظام کر لیا ہے۔

اس اعلان نے ہم دونوں کو حیرت زدہ کر دیا۔ جسٹس اور میں نے ملے جلے صدمے اور بے بسی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم اچانک پکڑے گئے تھے۔ ناظم نے بتایا کہ دونوں لڑکیاں اچھے خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ جسٹس کو خلپا کی بیٹی سے شادی کرنا تھی جو ایک سرکردہ اور معزز تھیمبو تھا۔ اور رولہلاہلا کو، جیسا کہ ناظم مجھے پکارا کرتا تھا۔ مقامی تھیمبو پادری کی بیٹی سے بیاہا جا رہا تھا۔ شادیاں فوراً منعقد ہونا تھیں۔ لوبولا یعنی دلہن کی قیمت دولہا کے والد کی طرف سے عموماً مویشیوں کی شکل میں ادا ہوتی تھیں۔ جسٹس کے معاملے میں لوبولا برادری کو ادا کرنا تھا اور میری طرف سے ناظم اس کی ادائیگی کا ذمے دار تھا۔

جسٹس اور میں نے کوئی حیل و حجت نہ کی۔ ہماری یہ حیثیت نہیں تھی کہ ہم ناظم سے تکرار کرتے اور جہاں تک اس کا تعلق تھا اس نے معاملہ طے کر دیا تھا۔ اس نے بحث کی گنجائش ہی نہ چھوڑی تھی۔ دلہن پہلے ہی چن لی گئی تھی اور لوبولا ادا کیا جا چکا تھا۔ گویا معاملہ قطعی شکل اختیار کر گیا تھا۔

جسٹس اور میں سر نیچے کیے افسردہ حالت میں وہاں سے اٹھ آئے۔ ناظم تھیمبو قانون اور رواج کے مطابق یہ کام سر انجام دے رہا تھا اور اس کا منشا رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم اس کی زندگی ہی میں گھر بار والے بن جائیں۔ ہم یہ جانتے تھے کہ اسے ہماری شادیاں کرنے کا حق حاصل ہے لیکن اب یہ بات محض امکان نہیں حقیقت بن چکی تھی۔ اب ہماری دلہنیں خیالی نہیں بلکہ گوشت پوست کی عورتیں تھیں جنہیں ہم بالفعل جانتے تھے۔

وہ مجھے نہیں چاہتی تھی

دلہن کے خاندان کے تمام تر احترام کے باوجود یہ بد دیانتی ہوگی اگر میں کہوں کہ ناظم نے جو لڑکی میرے لیے چنی تھی وہ میرے خوابوں کی دلہن تھی۔ اس کا خاندان سر کردہ اور معزز تھا اور وہ قدرے پروقار انداز لیے پرکشش بھی تھی لیکن مجھے شبہ ہے کہ وہ عرصے سے جسٹس سے محبت کرتی تھی۔ ناظم کو یہ معلوم نہیں ہوگا جیسا کہ والدین شاذو نادر ہی اپنے بچوں کی زندگی کے رومانوی پہلو سے واقف ہوتے ہیں۔ میرے مجوزہ شریک حیات بلاشبہ میرے عقد میں بندھنے کی اس سے زیادہ خواہاں نہیں تھی جتنا میں چاہتا تھا۔

اس وقت میں سیاسی سے زیادہ معاشرتی لحاظ سے ترقی یافتہ تھا۔ اگرچہ میں نے سفید آدمی کے سیاسی نظام کے خلاف لڑنے کا نہیں سوچا تھا، مگر میں اپنی قوم کے سماجی نظام کے خلاف بغاوت کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ بالواسطہ طور پر میری اس بغاوت کا ذمے دار ناظم تھا کیونکہ اس نے مجھے تعلیم پانے کے جو مواقع فراہم کیے تھے انہی کے باعث میں روایتی رسوم و قیود کو مسترد کرنے کے قابل ہوا تھا۔ میں نے لڑکیوں کیساتھ کالج اور یونیورسٹی میں برسوں تعلیم پائی تھی اور چھوٹے موٹے معاملات بھی چل رہے تھے۔ میں رومانوی طبیعت کا مالک تھا اور میں کسی کو، خواہ ناظم ہی ہو، یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ میرے لیے دلہن

کا انتخاب کرے۔

میں نے ملکہ یعنی ناظم کی بیوی سے ملاقات کی اور اپنا معاملہ پیش کیا۔ میں اسے یہ بتا نہ سکا کہ میں کسی صورت یہ نہیں چاہتا کہ ناظم میرے لیے دلہن کا انتظام کرے کیونکہ ایسی دلہن کو قدرتی طور پر مجھ سے کوئی خاص ہمدردی نہ ہوگی۔ اس کے بجائے میں نے متبادل منصوبہ پیش کرتے ہوئے اسے بتایا کہ میں ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنے کو ترجیح دیتا ہوں جو اس کی رشتے دار ہے اور جسے میں نے اپنی ممکنہ زوجہ کی حیثیت سے حسب خواہش پایا ہے۔ یہ نوجوان خاتون دراصل بہت پرکشش تھی لیکن مجھے کوئی اندازہ نہ تھا کہ وہ بھی مجھے چاہتی ہے یا نہیں۔ میں نے کہا کہ میں جونہی اپنی تعلیم مکمل کرلوں گا اس سے شادی کرلوں گا۔ یہ نصف عذر تھا یہ ناظم کے منصوبے کی نسبت بہتر چناؤ تھا۔ ملکہ نے اس معاملے میں میری حمایت کی لیکن ناظم کو ترغیب نہ دی جا سکی۔ وہ اپنا فیصلہ کر چکا تھا اور اب اسے بدلنے کو تیار نہ تھا۔

فرار کا مشکل فیصلہ

مجھے احساس ہو گیا جیسے اس نے میرے لیے کوئی متبادل نہیں چھوڑا۔ میں اس شادی کو نباہ نہیں سکتا تھا جسے میں غیر منصفانہ اور ناروا سمجھتا تھا۔ اس کیساتھ ساتھ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ اگر میں نے ناظم کا منصوبہ مسترد کر دیا تو مزید اس کی سرپرستی میں نہیں رہ سکوں گا۔

جسٹس بھی مجھ سے متفق تھا۔ چنانچہ ہم دونوں نے فیصلہ کرلیا کہ ہمارے لیے فرار ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور واحد جائے فرار جوہانسبرگ تھا۔

ہم نے اپنا منصوبہ خفیہ رکھا جبکہ اس کی تفصیلات پر کام کرتے رہے۔ اول تو مناسب موقع درکار تھا۔ ناظم سمجھتا تھا کہ جسٹس اور میں دونوں ایک دوسرے کے بڑے ہم جولی ہیں یا کم از کم جسٹس کی مہم جوئیوں اور کھلنڈرے پن نے میرے معتدل مزاج کو متاثر کیا ہے۔ لہذا وہ جتنا ممکن ہوتا ہم دونوں کو ایک دوسرے سے

الگ رکھنے کی سعی کرتا۔ جب وہ سفر میں ہوتا تو دونوں میں سے ایک کو ساتھ لے جاتا تاکہ اس کی غیر موجودگی میں ہم اکھٹے نہ ہوسکیں۔ زیادہ تر وہ جسٹس کو ہمراہ لے جاتا کیونکہ اس کی خواہش ہوتی کہ میں اخی کیزوینی میں رہ کر اس کے معاملات کی دیکھ بھال کروں۔ لیکن پھر ہمیں معلوم ہوا کہ ناظم، ٹرانسکائی کی قانون ساز اسمبلی بنگھا کے اجلاس میں شرکت کے لیے روانگی کی تیاری کر رہا ہے اور پورا ایک ہفتہ وہاں رہے گا اور ہم میں سے کسی کو ساتھ نہیں لے جائے گا۔ یہ ہمارے لیے نکل بھاگنے کا موزوں ترین وقت تھا، چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ ناظم کی بنگھا کے لیے روانگی کے بعد ہم جوہانسبرگ روانہ ہوجائیں گے۔

میرے پاس چند ہی کپڑے تھے اور جو کچھ ہمارے پاس تھا وہ ہم نے ایک ہی سوٹ کیس میں ٹھونس لیا، ناظم سوموار کو صبح سویرے روانہ ہوگیا اور اجالا ہونے پر ہم بھی جانے کی ٹھان چکے تھے۔ لیکن عین اس وقت جب ہم جانے کی تیاری کر چکے تھے وہ غیر متوقع طور پر واپس آ گیا۔ جیسے ہی اس کی کار اندر آتے دیکھی تو ہم دوڑ کر باغ میں مکئی کے گٹھوں میں چھپ گئے۔ ناظم مکان میں داخل ہوا تو اس کا پہلا سوال تھا، وہ لڑکے کہاں ہیں؟ کسی نے جواب دیا اوہ وہ یہیں کہیں ہیں۔ لیکن ناظم کو شبہ ہو گیا تھا اور وہ اس جواب سے مطمئن نہ ہوا۔ اس کے بقول وہ اس لیے لوٹ کر آیا تھا کہ وہ اپنا جلاب آور ایپسم سالٹ ساتھ لے جانا بھول گیا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر بظاہر مطمئن ہوگیا۔ میرا خیال ہے اسے کسی طرح کی پیش بینی کا ملکہ حاصل تھا اور نہ ایپسم سالٹ تو وہ قصبے سے بھی خرید سکتا تھا۔ پھر جب اس کی کار پہاڑیوں کے پیچھے غائب ہوئی ہم اپنی راہ چل دیئے۔

بیل کے عوض ٹیکسی ملی

ہم دونوں کے پاس کوئی رقم نہیں تھی۔ لہذا اس صبح ہم مقامی سوداگر کے پاس گئے اور اس سے ناظم کے دو پسندیدہ بیل بیچنے کا سودا کیا۔ سوداگر کا خیال تھا کہ ہم ناظم کی

خواہش پر بیل بیچ رہے ہیں اور ہم نے اسے اس غلط فہمی میں رہنے دیا۔ اس نے ہمیں اچھی خاصی رقم دی اور اس رقم سے ہم نے ایک کار کرائے پر لی تا کہ وہ ہمیں مقامی اسٹیشن لے جائے جہاں سے ہم جاہانسبرگ کی ریل گاڑی پکڑ لیتے۔

سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا لیکن ہمیں پتا نہیں تھا کہ ناظم اسٹیشن کی طرف گیا تھا اور اس نے اسٹیشن مینجر کو ہدایت کی تھی کہ اگر ہماری وضع کے دولڑکے جوہانسبرگ کے ٹکٹ خریدنے آئیں تو انہیں لوٹا دیا جائے کیونکہ انہیں ٹرانسکائی نہیں جانا۔ اور جب ہم اسٹیشن پہنچے تو منیجر نے ہمیں ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا۔ ہم نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ تمہارا والد اسٹیشن آیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ تم فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہ سنکر ہم ہکا بکا رہ گئے اور فوراً پلٹ کر کار ڈرائیور سے کہا کہ اگلے اسٹیشن چلے جو پچاس میل دور تھا۔ وہاں پہنچنے میں ہمیں ایک گھنٹہ لگا۔

ہم ایک ریل گاڑی پر سوار ہونے میں کامیاب تو ہو گئے مگر وہ صرف کوئنز ٹاؤن تک گئی۔ 1940ء کے عشرے میں افریقیوں کے لیے تمام سفر ایک دشوار کام تھا۔ سولہ سے زیادہ عمر کے تمام افریقیوں کو شعبہ مقامی امور کے جاری کردہ مقامی پاس ساتھ رکھنے پڑتے تھے جو کسی بھی سفید پولیس مین، سول ملازم یا آجر کو دکھانے پڑتے تھے۔ پاس دکھانے میں ناکامی کا مطلب تھا گرفتاری، مقدمہ جیل کی سزا یا جرمانہ۔ پاس میں درج ہوتا تھا کہ حامل ہذا کہاں رہتا ہے۔ اس کا چیف کون ہے اور اس نے سالانہ پول ٹیکس ادا کیا ہے یا نہیں۔ یہ ٹیکس صرف افریقیوں پر لاگو ہوتا تھا۔ بعد میں پاس کی جگہ ایک کتابچے یا ریفرنس بک نے لے لی جس میں تفصیلی معلومات ہوتیں اور جس پر ہر ماہ اپنے آجر کے دستخط کروانے پڑتے تھے۔

ہم دونوں کے مقامی پاس تو ٹھیک تھے لیکن ایک افریقی کو اپنے مجسٹریٹی ضلع سے کام کرنے یا رہائش اختیار کرنے کے لیے دوسرے ضلع میں داخل ہونے کی خاطر سفری کاغذات درکار ہوتے تھے یعنی ایک اجازت نامہ اور اس کے آجر یا سرپرست

کی طرف سے ایک خط، اور ہمارے پاس یہ دونوں چیزیں نہیں تھیں۔ اچھے دنوں میں جب ایک شخص کے پاس یہ تمام کاغذات ہوتے تو بھی ایک پولیس افسر اسے ہراساں کرسکتا تھا کیونکہ کسی کاغذ پر دستخط نہ ہوتے یا اس پر تاریخ صحیح نہ ہوتی۔ اور کوئی کاغذ سرے سے موجود نہ ہونا نہایت خطرناک بات تھی۔ ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ کوئنز ٹاؤن میں اتر کر اپنے ایک رشتہ دار کے مکان پر چلے جائیں اور پھر ضروری کاغذات تیار کروالیں۔ یہ منصوبہ اگرچہ غلط سوچ پر مبنی تھا تاہم ہمیں چیف امپونڈومینی مل گئے جو جسٹس کو اور مجھے بہت چاہتے تھے۔

آسمان سے گرے کھجور میں اٹکے

چیف امپونڈومینی بڑے، پرجوش ہو کر ملے اور ہم نے ان ہیں بتایا کہ ہمیں مقامی مجسٹریٹ کی طرف سے مطلوبہ سفری کاغذات درکار ہیں۔ ہمیں کاغذات کیوں درکار تھے۔ اس جواب میں ہم نے جھوٹ بولتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ ہم ناظم کی طرف سے ایک کام پر جارہے ہیں۔ چیف امپونڈومینی شعبہ مقامی امور کا ایک ریٹائرڈ ترجمان تھا اور وہ مجسٹریٹ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ہماری کہانی پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی لہذا وہ ہمیں مجسٹریٹ کے پاس لے گیا اور ہماری سفارش کرتے ہوئے ہماری مشکل بیان کی۔ چیف کی بات سن کر مجسٹریٹ نے ضروری سفری کاغذات بنادیئے اور سرکاری مہر لگادی۔ جسٹس اور میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرادیئے۔ عین اس وقت جب مجسٹریٹ کاغذات ہمارے حوالے کرنے والا تھا اسے کوئی بات یاد آگئی اور اس نے کہا کہ رسمی طور پر اسے چاہیے کہ امتاتا کے چیف مجسٹریٹ کو اطلاع دے جس کے دائرہ کار میں ہم پڑتے تھے۔ اس سے ہمیں بڑی پریشانی ہوئی لیکن ہم اس کے دفتر میں سہمے بیٹھے رہے۔ مجسٹریٹ نے ٹیلیفون پر امتاتا کے چیف مجسٹریٹ سے بات کی۔ قسمت کی بات دیکھیے کہ اس وقت ناظم چیف مجسٹریٹ سے ملنے آئے ہوئے تھے اور اس کے دفتر ہی میں موجود تھے۔

جب مقامی مجسٹریٹ امتاتا کہ چیف مجسٹریٹ سے ہمارے بارے میں محو گفتگو تھا اس نے کچھ اس طرح بات کی اوانکا والد اس وقت یہیں موجود ہے اس پر چیف مجسٹریٹ نے لائن ناظم کو دے دی۔ جب مجسٹریٹ نے فون پر ناظم کو اطلاع دی کہ ہم دونوں کیا چاہتے ہیں تو ہو پھٹ پڑا: انہیں گرفتار کرلو اور فورا یہاں بھیج دو۔ چیف مجسٹریٹ نے ٹیلیفون رکھ دیا اور غصے میں ہم سے کہا: ''لڑکو تم چور اور جھوٹے ہو۔ تم نے میرے اعتماد سے فائدہ اٹھایا اور مجھے دھوکہ دیا ہے۔ اب میں تمہیں گرفتار کررہا ہوں

میں فورا اپنے دفاع میں کھڑا ہوگیا۔ فورٹ ہیئر کی پڑھائی کے باعث میں قدرے قانون کا علم رکھتا تھا اور اس سے میں نے کام لیا۔ میں نے کہا: ''یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے جھوٹ بولا ہے۔ لیکن ہم نے کوئی جرم نہیں کیا اور کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی اور محض ایک چیف کی سفارش پر ہمیں گرفتار نہیں کیا جاسکتا خواہ وہ ہمارا باپ ہی کیوں نہ ہو۔ مجسٹریٹ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس نے ہمیں گرفتار نہ کیا لیکن اس نے حکم دیا کہ ہم دفتر سے نکل جائیں اور دوبارہ کبھی اپنا کالا سایہ اس کے دروازے پر نہ ڈالیں۔ چیف امپونڈ و میٹنی بھی ناراض ہوا اور وہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر چلا گیا۔

کوئنز ٹاؤن سے جوہانسبرگ

اب جسٹس کو یاد آیا تھا کہ کوئنز ٹاؤن میں اس کا ایک دوست سڈنی انگزو رہتا ہے جو ایک سفید فام وکیل کے دفتر میں کام کرتا ہے۔ ہم اس آدمی سے ملنے گئے اور اپنا قصہ بیان کیا۔ سڈنی نے ہم سے کہا میں جس وکیل کے ساتھ کام کرتا ہوں اس کی ماں موٹر گاڑی پر جوہانسبرگ جارہی ہے اور وہ اسے کہے گا کہ وہ ہمیں ساتھ لے جائے۔ بات کر کے اس نے بتایا کہ وکیل کی ماں ہمیں اس شرط پر ساتھ لے جائے گی اگر ہم پندرہ پونڈ فیس ادا کریں گے۔ یہ ایک بہت بڑی رقم تھی اور یہ ایک

ریلوے ٹکٹ کی قیمت سے بھی زیادہ تھی۔اس فیس کی ادائیگی میں ہماری جمع پونجی بمشکل پوری ہوتی تھی۔لیکن ہمارے پاس اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ہم نے فیصلہ کیا کہ جوہانسبرگ جاکر اپنے پاسوں پر مہر لگوالیں گےاور سفری کاغذات درست کروا لینگے۔

ہم اگلی صبح سویرے روانہ ہو گئے۔ان دنوں یہ رواج تھا کہ اگر ایک سفید فام گاڑی چلا رہا ہوتو سیاہ فام پچھلی نشست پر بیٹھتے تھے۔ہم دونوں پیچھے ہی بیٹھے۔جسٹس براہ راست عورت کے پیچھے براجمان تھا،وہ ایک بارباش آدمی تھا اور جلد ہی وہ مجھ سے گپ شپ لڑانے لگا۔اس سے بوڑھی عورت کو بہت کوفت ہوئی۔ظاہر ہے اسے ایک ایسے سیاہ فام کی صحبت میں سفر کا موقع کبھی نہیں ملا تھا جو سفید فاموں کے بارے میں بے دھڑک بولتا تھا۔صرف چند میل کے بعد عورت نے جسٹس سے کہا وہ میرے ساتھ نشست بدل لے تاکہ وہ اس پر نگاہ رکھ سکے اور باقی سفر کے دوران وہ اس پر عقابی نظریں ڈالتی رہی۔لیکن کچھ دیر بعد جسٹس جادو اس پر چل گیا اور پھر وہ اسکے بیان کردہ چٹکلوں پر وقتاً فوقتاً ہنس دیتی۔

روشنیوں کے شہر میں

اس شام تقریباً دس بجے ہمیں اپنے سامنے فاصلے پر روشنیوں کی ایک کہکشاں دکھائی دی جو تمام سمتوں میں پھیلتی نظر آتی تھیں۔میرے لیے بجلی ہمیشہ سے ایک عجوبہ اور عیاشی تھی اور یہاں بجلی کا ایک وسیع منظر،روشنیوں کا ایک شہر تھا،میں اس شہر کو دیکھ کر بے پناہ خوش ہوا جس کے بارے میں بچپن سے سنتا آرہا تھا۔جوہانسبرگ کو ہمیشہ خوابوں کا شہر قرار دیا گیا تھا،وہ جگہ جہاں ایک غریب کسان اپنے آپ کو ایک دولت مند متمدن شخص میں ڈھال سکتا تھا خطرات اور مواقع کا شہر۔مجھے وہ کہانیاں یاد آئیں جو ختنہ سکول میں بابا ناباکھی نے سنائی تھیں،فلک بوس عمارتوں کی کہانیاں جن کی چوٹیاں نظر نہیں آتی تھیں،ان لوگوں کی کہانیاں جو ایسی زبانیں

بولتے تھے جو کبھی سننے میں نہیں آئی تھیں، چمکتی دمکتی کاروں اور خوبصورت عورتوں اور شیخ باز لفنگوں کی کہانیاں۔ یہ ایگولی تھا سونے کا شہر جہاں جلد ہی مجھے اپنا گھر بنانا تھا۔

شہر کے مضافات میں ٹریفک پرہجوم تھا سونے کا شہر جہاں وقت سڑک پر اتنی زیادہ کاریں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ امتاتا میں بھی گنتی کی چند کاریں تھیں اور یہاں وہ ہزاروں کی تعداد میں تھیں۔ ہم شہر کے اندر سے گزرنے کے بجائے باہر سے گھوم کر آئے اور مجھے بلند عمارتوں کے بلاک دیو قامت سایوں کی طرح نظر آئے جو رات کے تاریک آسمان سے بھی زیادہ تاریک تھے۔ میں نے سڑک کے کنارے سگریٹوں، مٹھائیوں اور شرابوں کے بڑے بڑے اشتہاری بورڈ دیکھے۔ یہ سب کچھ مجھے بڑا شاندار لگا۔

جلد ہی ہم سرکاری عمارات کے علاقے میں داخل ہوئے جن میں چھوٹی سے چھوٹی بھی ناظم کے محل سے بڑی تھی اور ان کے شاندار بیرونی لان تھے اور اونچے اونچے آہنی گیٹ۔ یہ مضافاتی علاقہ تھا جہاں بوڑھی عورت کی بیٹی رہتی تھی۔ ہم ایک خوبصورت کوٹھی کے طویل صحن میں سے گزر کے گیراج کے پاس جارکے۔ جسٹس کو اور مجھے ملازمین کے کوارٹروں میں بھیج دیا گیا جہاں ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے میں رات بھر خوبصورت پروں کے بستر پر سویا ہوں۔ میرے سامنے امکانات لامحدود لگتے تھے۔ بظاہر ایک طویل سفر تھا جس کے سرے پر میں آ پہنچا تھا لیکن دراصل یہ کہیں زیادہ طویل اور پر آزمائش سفر کا آغاز تھا جو مجھے ایسے ایسے طریقوں سے آزمانے والا تھا جن کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا

حصہ دوم :: جوہانسبرگ

سونے کی سب سے بڑی کان

صبح سویرے ہم کراؤن مائنز کے دفتر پہنچے جو ایک بڑی پہاڑی سطح پر واقع تھا۔ یہ پہاڑی خاموش تاریک شہر کے اوپر سایہ کیے ہوئے تھی جو ہانسبرگ 1886ء میں وٹوائرسرانڈ کی سطح مرتفع پر سونے کی دریافت کے آس پاس تعمیر کیا گیا تھا اور کراؤن مائنز سونے کے شہر میں سب سے بڑی سونے کی کان تھی۔ مجھے امید تھ کہ اتماتا کے سرکاری دفاتر کی طرح یہ ایک شاندار عمارت ہوگی جو دیکھا وہ اس کے برعکس تھا۔ کراؤن مائنز کے دفاتر کان کے سامنے زنگ خوردہ ٹین کے کوارٹروں پر مشتمل تھے۔

سونے کی کان کے بارے میں کوئی جادوئی بات نہیں۔ بنجر اور چیچک زدہ زمین، ہر طرف غلاظت اور درخت کہیں نہیں، چاروں طرف باڑ لگی ہوئی۔ گویا سونے کی کان ایک میدان جنگ کا منظر پیش کرتی ہے جہاں بے حد تباہی ہوئی ہو۔ شور بے پناہ اور ہر طرف تھا۔ شافت لفٹ اور پاور ڈرل کا بے ہنگم شور، کچھ دوری پر ڈائنا مائٹ کے دھماکے اور مزدوروں کو دیے جانے والے بلند آہنگ احکامات۔ جدھر بھی میری نظر اٹھی میں نے کالے آدمیوں کو گرد سے اٹے، تھکاوٹ سے چور اور جھکے ہوئے پایا۔ وہ تاریک بیرکوں میں زمین پر رہتے تھے جن میں کنکریٹ کے سیکڑوں حجرے تھے جن کی دیواریں چند انچ موٹی تھیں۔

وٹوائرسرانڈ پر سونے کی کان کنی مہنگی تھی کیونکہ دھات گھٹیا درجے کی اور زمین کے اندر گہرائی میں تھی۔ چونکہ ہزاروں افریقی مزدور سستے مل جاتے تھے جو معمولی تنخواہ پر طویل گھنٹوں کام کرتے تھے، اس لیے سفید فاموں کی کمپنیوں کے لیے سونے کی کانکنی نفع بخش تھی۔ یہ کمپنیاں افریقی عوام کے خون پسینے سے بے پناہ ہوگئی تھیں۔ میں نے اس سے پہلے کہیں اتنا بڑا منصوبہ، اتنی بڑی مشینیں، ایسا منظم ادارہ اور ایسا کمر توڑ کام نہیں دیکھا تھا۔ میرے لیے یہ جنوبی افریقہ میں سرمایادارانہ نظام کو برسر

عمل دیکھنے کا پہلا موقع تھا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں یہاں نئی طرح کی تعلیم پانے کے لیے داخل ہوا ہوں۔

ہم سیدھے انڈونا یعنی چودھری کے پاس گئے۔ پلیسو نامی یہ چودھری بڑی عمر کا تھا جس نے زندگی میں بے رحمیوں کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ جسٹس کے بارے میں جانتا تھا کیونکہ ناظم نے کئی ماہ پہلے اسے خط بھیجا تھا کہ جسٹس کے کلرکی کا انتظام کرے۔ ان دونوں کان کے احاطے میں کلرکی کا کام بڑا پرکشش اور عزت والا تھا، تاہم میں پلیسو کے لیے اجنبی تھا۔ جسٹس نے اسے بتایا کہ میں اس کا بھائی ہوں۔

مائن پولیس مین کے طور پر

پلیسو کہنے لگا۔ میں صرف جسٹس کے آنے کی توقع کر رہا تھا۔ تمہارے باپ کے خط میں بھائی کے بارے میں کچھ نہیں تھا۔ اس نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا۔ لیکن جسٹس نے یہ کہہ کر میری سفارش کی کہ اس کا نام غلطی سے رہ گیا تھا اور ناظم نے اس بارے میں ایک اور خط پوسٹ کر دیا تھا۔ پلیسو باہر سے سخت لیکن اندر سے ہمدرد تھا اور اس نے مجھے یہ کہہ کر مائن پولیس مین لگا دیا کہ اگر میں نے اچھا کام کیا تو وہ مجھے تین ماہ کے اندر کلرک بنا دے گا۔

کراؤن مائنز میں ناظم کی بات وزن رکھتی تھی۔ جنوبی افریقہ کے تمام چیف کا یہی معاملہ تھا۔ مائننگ افسران کو دیہات سے مزدور بھرتی کرنے کی ضرورت رہتی تھی جن پر چیفس کو اختیار و اقتدار حاصل تھا۔ افسران چاہتے تھے کہ چیفس اپنی رعایا کی حوصلہ افزائی کریں کہ وہ ریف یعنی سونے کی ان پہاڑیوں میں آ کر کام کریں، اس لیے چیفس کو وہاں بڑا عزت اور احترام حاصل تھا جب وہ دورے پر آتے تو انہیں مائننگ ہاؤسز میں خصوصی قیام گاہیں فراہم کی جاتیں اور ناظم کا ایک خط تو ایک شخص کو بڑی اچھی ملازمت دلا سکتا تھا اور اسی رابطے کے باعث جسٹس اور مجھ سے وہاں خصوصی برتاؤ ہوا۔ ہمیں مفت راشن، سونے کے لیے کوارٹر اور کچھ تنخواہ دی جانے

لگی۔ پہلی رات ہم بیرکوں میں نہیں ٹھہرے بلکہ پلیسو نے ریجنٹ کے آدمی خیال کر کے پہلے چند روز ہمیں اپنے ہاں ٹھہرایا تھا۔

کئی کان کن، خصوصاً وہ جو تھیمبو لینڈ سے تعلق رکھتے تھے۔ جسٹس کو چیف کا سا احترام دیتے اور نقد تحفوں کے ساتھ سلام کرنے آتے جیسا کہ کسی چیف کی وہاں آمد پر رواج تھا۔ یہ لوگ ایک ہی ہوسٹل میں رہتے تھے کیونکہ کان کنی کو عموماً قبیلے کے مطابق ٹھہرایا جاتا تھا۔ مائننگ کمپیٹیاں اس علیحدگی کو ترجیح دیتی تھیں کیونکہ اس طرح مختلف قبائلی گروہوں کو کسی مشترک شکایت کی بنا پر متحد ہونے کا موقع نہیں ملتا تھا اور چیف کا اقتدار بھی مضبوط ہوتا تھا۔ اس علیحدگی کے باعث مختلف قبائلی گروہوں او زحیلاوں کے درمیان اکثر گروہی لڑائیاں ہوتیں اور کمپنیاں اپنے مفاد کی خاطر ان لڑائیوں کی حوصلہ شکنی نہیں کرتی تھیں۔

جسٹس حاصل شدہ تحائف میں سے مجھے بھی حصہ دیتا اور بونس کے طور پر چند زائد پونڈ دیتا۔ پہلے چند دنوں میں میری جیبیں جو یافت دولت سے بھری رہتیں اور میں اپنے آپ کو ایک لکھ پتی خیال کرتا۔ میں سوچنے لگا تھا کہ میں قسمت کا بیٹا ہوں اور خوش قسمتی مجھ پر سایہ کیے ہوئے ہے اور یہ کہ اگر کالج میں پڑھنے میں قیمتی وقت ضائع نہ ہوتا میں اس وقت تک ایک دولت مند آدمی بن چکا ہوتا۔ ایک بار پھر یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ قسمت نے میرے اردگرد پھندے لگا رکھے ہیں۔

میں جلد بطور نائٹ واچ میں کام کرنے لگا۔ مجھے نئی وردی نئے بوٹ، ایک ہیلمٹ، ایک فلیش لائٹ، ایک سیٹی اور ایک نوب کیری دی گئی جو ایک لمبی چوبی چھڑی ہوتی ہے جس کے ایک سرے پر لکڑی کا ایک بھاری گولہ ہوتا ہے۔ میرا کام سادہ تھا۔ میں احاطے کے صدر دروازے پر ڈیوٹی دیتا جس کیساتھ ایک بورڈ پر لکھا تھا۔

Beware: Native Crossing Here.

خبردار: مقامی باشندے یہاں اندر داخل ہو رہے ہیں

میں ان سب کے کاغذات چیک کرتا تھا جو احاطے میں داخل ہوتے یا باہر ہوتے۔ پہلی چند راتیں میں نے بغیر کسی واقعے کے احاطے کی زمین پر گشت کیا۔ ایک شام میں نے ایک شرابی کان کن کو ضرور روکا مگر اسنے بڑی عاجزی سے اپنا پاس پیش کر دیا اور پھر اپنے ہوسٹل میں چلا گیا۔

بھید کھل گیا

اپنی کامیابی پر مسرور ہو کر جسٹس اور میں نے اپنی چالاکی کا اپنے ایک دوست سے فخر یہ اظہار کیا جسے ہم گھر سے جانتے تھے اور جو کان میں کام کرتا تھا۔ ہم نے اسے بتایا کہ کس طرح ہم گھر سے بھاگے تھے اور ناظم کو دھوکا دیا تھا۔ اگرچہ ہم نے اپنے ساتھی سے راز افشاء نہ کرنے کی قسم لی تھی وہ سیدھا انڈونا یعنی ہیڈ مین کے پاس گیا او رہمارا راز فاش کر دیا۔ ایک دن بعد انڈونا پلیسو نے ہمیں بلا بھیجا اور جسٹس سے اس کا پہلا سوال جو کیا وہ یہ تھا: ناظم کی طرف سے تمہارے بھائی کا اجازت نامہ کہاں ہے؟'' جسٹس نے کہا کہ وہ پہلے ہی بتا چکا ہے کہ ناظم نے اجازت نامہ ڈاک میں ڈال دیا تھا۔ پلیسو اس سے مطمئن نہ ہوا اور ہمیں احساس ہوا کہ معاملہ خراب ہے۔ پھر اس نے میز کی دراز سے ایک ٹیلی گرام نکالا۔ میں نے ناظم سے رابطہ کیا تھا۔ اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور پھر ٹیلی گرام ہمیں تھما دیا۔ اس میں ایک ہی جملہ درج تھا: لڑکوں کو واپس بھیج دو۔''

پلیسو اب ہم پر اپنا غصہ جھاڑنے لگا۔ اس نے ہمیں الزام دیا کہ ہم نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے کہا کہ ہم نے اس کی مہمان نوازی اور ناظم کی نیک نامی سے غلط فائدہ اٹھایا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ چند کان کنوں کو ساتھ بھیج رہا ہے جو ہمیں ٹرانسکائی جانے والی گاڑی پر بٹھا دیں گے۔ جسٹس نے گھر بھجوانے پر احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ ہم بس کان میں کام کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہ ہم اپنے فیصلے خود کر

سکتے ہیں۔ہمیں شرمندگی اور رسوائی کا احساس ہو رہا تھا لیکن ہم اس کے دفتر سے یہ عزم لیکر نکلے کہ ہم ٹرانسکائی واپس نہیں جائیں گے۔

ہمارا نیا منصوبہ

ہم نے جلدی سے ایک منصوبہ تیار کیا۔ہم ناظم کے ایک پرانے دوست ڈاکٹر اے بی ژوما سے ملنے گئے جو افریقن نیشنل کانگرس کے پریذیڈنٹ جنرل تھے۔ ڈاکٹر ژوما کا تعلق ٹرانسکائی سے تھا اور وہ ایک انتہائی محترم معالج تھا۔

ڈاکٹر ژوما ہم سے مل کر خوش ہوئے اور انہوں نے بڑی ملائمت سے اگلی سے کیزوینی میں خاندانی معاملات کے بارے میں سوالات کیے۔ہم نے ان کے سامنے سچ اور جھوٹ کی آمیزش کرتے ہوئے بتایا کہ ہم جوہانسبرگ کیوں آئے اور یہ کہ ہمیں کان میں کام کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ڈاکٹر ژوما نے کہا کہ انہیں ہماری مدد کر کے خوشی ہوگی۔چنانچہ انہوں نے فوراً چیمبر آف مائنز کے مسٹر ویل بی لوڈ کو فون کیا۔چیمبر آف مائنز ایک طاقتور ادارہ تھا جو کان کنی خانوادوں کی نمائندگی کرتا اور کانون کے لیے مزدور بھرتی کرنے پر اس کی اجارہ داری تھی۔ڈاکٹر ژوما نے مسٹر بوڈ کو بتایا کہ ہم آن بان والے ہیں اور یہ کہ ہمارے لیے اسے جگہ بنانی چاہیے۔ہم نے ڈاکٹر ژوما کا شکریہ ادا کیا اور مسٹر ویل بی لوڈ سے ملنے چلے گئے۔

مسٹر ویل بی لوڈ ایک سفید فام تھے اور ان کے دفتر جیسا شاندار دفتر میں نے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔انکی میز فٹ بال گراؤنڈ کی طرح چوڑی لگتی تھی۔ہم فیسٹائل نامی ایک مائن باس کی سعیت میں ان سے ملے اور انہیں بھی وہی فرضی کہانی سنائی جو ڈاکٹر ژوما کو سنا چکے تھے۔مسٹر ویل بی لوڈ میری اس نیم راست توضیح سے بڑے متاثر ہوئے کہ میں یونیورسٹی اف وواٹرسرانڈ میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے جوہانسبرگ آیا تھا۔انہوں نے کہا۔''اچھا لڑکو، میں تمہیں کراؤن مائنز کے مسٹر پلیسو کے ساتھ تیس برس کام کر چکے ہیں اور اس پورے عرصے کے دوران پلیسو نے کبھی

ان سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اس پر جسٹس اور میں پیچ وتاب کھا کر رہ گئے مگر خاموش رہے۔ اس غیر متوقع صورتحال کے باوجود ہم سادہ لوحی سے یہ سمجھتے رہے کہ اب ہمیں مسٹر پلیسو پر بالا دستی حاصل ہو گی کیونکہ اس کے باس مسٹر ویل بی لوڈ اب ہمارے طرفدار ہیں۔

جھاڑیں اسی بت کافر کی

ہم کراؤن مائنز کے دفتر لوٹ آئے جہاں سفید فام کمپاؤنڈ منیجر نے ہماری بات توجہ سے سنی کیونکہ ہم نے مسٹر ویل بی لوڈ کا خط پیش کیا تھا۔ عین اسوقت پلیسو ادھر سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھ لیا اور پھر پھٹ پڑے۔ تم لڑکو تم واپس آ گئے ہو انہوں نے درشتی سے کہا تم یہاں کیا کر رہے ہو۔"

جسٹس پرسکون رہا۔ ہمیں یہاں مسٹر ویل بی لوڈ نے بھیجا ہے۔ اس نے مسٹر پلیسو ہی کے لہجے میں جواب دیا۔ مسٹر پلیسو نے کچھ سوچا اور پھر پوچھا: کیا تم نے انہیں بتا دیا تھا کہ تم اپنے باپ کے بھگوڑے ہو؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

تمہیں کسی کان میں جسے میں چلاتا ہوں، نوکری نہیں ملے گی۔ مسٹر پلیسو دہاڑے۔ اب میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاؤ۔ جسٹس نے ان کے سامنے مسٹر ویل بی لوڈ کا خط لہرایا۔ میں خط کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا۔ پلیسو نے چیخ کر کہا۔ میں نے اس امید میں سفید فام منیجر کی طرف دیکھا کہ وہ ہماری طرفداری کرے گا مگر وہ تو مجسمے کی طرح ساکت تھا اور اتنا ہی خوفزدہ لگتا تھا جتنے ہم تھے۔ ہمارے پاس پلیسو کا کوئی جواب نہیں تھا اور پہلے سے بھی زیادہ بے توقیری کا احساس لیے وہاں سے کھسک آئے۔

اب ہماری قسمت معکوس تھی۔ ہم کام سے محروم تھے۔ ہمارے لیے کوئی روشن آثار نہ تھے اور نہ ہمارے پاس رہنے کی جگہ تھی۔ جسٹس، جو جوہانسبرگ میں مختلف لوگوں کو جانتا تھا، چنانچہ وہ ہمارے رہنے کے لیے جگہ ڈھونڈنے شہر میں گیا۔ اس

دوران مجھے اپنا سوٹ کیس لانا تھا جو ابھی پلیسو کی رہائش گاہ پر پڑا تھا۔اس کے بعد مجھے جوہانسبرگ میں جارج گوچ نامی چھوٹی سی بستی میں جسٹس سے جاملنا تھا۔

میں بلنتشا نامی ایک ساتھی کو گھر سے جانتا تھا۔ چنانچہ اسے آمادہ کیا کہ سوٹ کیس فرنٹ گیٹ تک لے جانے میں میری مدد کرے۔ دروازے پر چوکیدار نے ہم دونوں کو روک لیا۔ اسنے کہا کہ وہ بیگ کی تلاشی لے گا۔بلنتشا نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ سوٹ کیس میں کوئی ممنوشہ شے نہیں ہے۔چوکیدار نے جواب دیا کہ تلاشی لینا معمول ہے اور پھر اس نے کپڑے درہم برہم کیے بغیر سرسری تلاشی لی۔ جب چوکیدار اسے بند کررہا تھا بڑبولا،بلنتشا چپ نہ رہ سکا، اسنے کہا،تم مصیبت کیوں کھڑی کرتے ہو،میں نے تم سے کہہ دیا تھا اس میں کچھ نہیں۔اس پر چوکیدار بھنا اٹھا اور سوٹ کیس کی دوبارہ تلاشی لینے لگا۔اب کے وہ ایک ایک جیب اور خانے کو بغور دیکھ رہا تھا۔آخر کار وہ پیندے تک پہنچ گیا اور وہاں وہ شے اس نے ڈھونڈ لی جس کے متعلق میں دعا کر رہا تھا کہ اسے نہ ملے۔یہ ایک لوڈڈ ریوالور تھا جو میرے کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا۔

وہ میرے ساتھی کی طرف مڑا اور اسنے کہا،تم زیر حراست ہو۔پھر اس نے سیٹی بجائی اور سپاہیوں کی ایک ٹیم نے ہمیں گھیرا۔سراسیمگی اور پریشانی کے عالم میں میرے ساتھی نے میری طرف دیکھا اور پھر چپ چاپ سپاہیوں ک ساتھ مقامی پولیس اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔میں ان کے پڑا۔میں ان کے پیچھے کچھ فاصلے پر سوچتا جا رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔پرانا ریوالور میرے والد کا تھا اور اپنے انتقال کے وقت وہ میرے لیے چھوڑ گئے تھے۔میں نے اسے کبھی استعمال نہیں کیا تھا،تاہم احتیاط کے طور پر اسے اپنے ساتھ شہر لے آیا تھا۔

تھانیدار سے عجب ملاقات

میں نہیں سوچتا تھا کہ میرا ساتھی میری جگہ اپنے سر الزام لے۔اس نے تھانے میں

داخل ہونے کے تھوڑی دیر بعد میں اندر گیا اور آفیسر انچارج سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ایک سپاہی مجھے آفیسر کے پاس لے گیا۔ میں نے اس سے کھری کھری او ربراہ راست بات کی:

"جناب! یہ میرا ریوالور ہے جو سوٹ کیس سے برآمد ہوا۔ مجھے یہ ٹرانسکائی میں اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ میں اسے یہاں لے آیا کیونکہ مجھے بدمعاشوں کا خطرہ تھا۔ میں نے وضاحت کی کہ میں فورٹ ہیئر کا طالب علم ہوں اور عارضی طور پر جوہانسبرگ میں ہوں۔ میری بات سن کر پولیس آفیسر قدرے نرم پڑا اور اس نے کہا کہ وہ میرے ساتھی کو فوراً چھوڑ رہا ہے۔ اس نے مزید کہا کہ وہ مجھ پر ریوالور رکھنے کا الزام لگانے کے باوجود مجھے گرفتار نہیں کرے گا اور یہ کہ میں اس الزام کا جواب دینے کے لیے سوموار کی صبح بذات خود عدالت میں پیش ہوں۔ میں بڑا ممنون تھا لہٰذا اس سے کہا کہ میں پیر کو عدالت میں یقیناً پیش ہو جاؤں گا۔ اس پیر کو میں عدالت میں گیا اور وہاں مجھے معمولی سا جرمانہ ہوا۔

اس دوران میں نے جارج گوچ ٹاؤن شپ میں اپنے عم زاد گارلک امبی کینی کے ساتھ رہنے کا بندوبست کر لیا تھا۔ گارلک ایک ہاکر تھا اور کپڑے بیچتا تھا۔ اسکا ایک چھوٹا صندوق نما گھر تھا۔ وہ ایک ملنسار اور مستعد آدمی تھا اور اس کے پاس کچھ عرصہ رہ کر میں نے اسے بتایا کہ میں وکیل بننا چاہتا ہوں۔ اسنے میری خواہش کو سراہا اور کہا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کے بارے میں سوچے گا۔

چند روز بعد گارلک نے بتایا کہ وہ مجھے جوہانسبرگ کے بہترین لوگوں میں سے ایک سے ملانے لے جا رہا ہے۔ ہم نے مارکیٹ اسٹریٹ میں ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے دفتر جانے کے لیے گاڑی پکڑی۔ مارکیٹ سٹریٹ ایک گنجان آباد شاہراہ تھی جس پر مسافروں سے لدی ٹرامیں آ جا رہی تھیں۔ ہر بازار کی روشوں پر اشیاء بیچنے والے براجمان تھے۔ اس سے یوں احساس ہوتا تھا کہ دولت اور امارت ہر اگلے موڑ

پر سراپا انتظار ہے۔

جوہانسبرگ ان دنوں ایک سرحدی قصبے اور جدید شہر کے بین بین تھا۔ آفس بلڈنگز کے ساتھ ہی بازار میں قصاب گوشت کاٹتے تھے۔ پر رونق دکانوں کے پہلو میں خیمے لگے تھے اور فلک بوس عمارتوں کیساتھ عورتوں نے کپڑے خشک ہونے کے لیے پھیلا رکھے تھے۔ جنگی کوششوں کے لیے صنعتی عمل تیز کر دیا گیا تھا۔ 1939ء میں جنوبی افریقہ نے دولت مشترکہ کے رکن کی حیثیت سے نازی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ مزدوروں کی طلب بڑھ گئی تھی اور کام کے متلاشی دیہاتی افریقیوں کے لیے جوہانسبرگ ایک مقناطیس بن گیا تھا۔ میری آمد کے سال 1941ء اور 1946ء کے دوران شہر میں افریقیوں کی تعداد دگنی ہوگئی۔ ہر صبح قصبہ ایک دن پہلے دن بڑا محسوس ہوتا۔ آدمیوں کو کارخانوں میں کام مل جاتا اور رینوکلئیر، مارٹنڈیل، جارج گوچ، الیگزینڈرا، صوفیا ٹاؤن اور ویسٹرن نیٹو ٹاؤن شپ کی غیر یورپی آبادیوں میں رہائش کی جگہ مل جاتی۔ ویسٹرن نیٹو ٹاؤن شپ بے شجر زمین پر چند ہزار ماچس کی ڈبیوں جیسے مکانوں کا جیل نما احاطہ تھا۔

اسٹیٹ ایجنٹ کے دفتر میں

جسٹس اور میں سٹیٹ ایجنٹ کی انتظار گاہ میں بیٹھے تھے جب دلکش افریقی استقبالیہ خاتون نے اپنے اندرونی دفتر میں اپنے باس کو ہماری موجودگی کا بتایا۔ پیغام دینے کے بعد اس کی انگلیاں کی بورڈ پر رقص کرنے لگیں جبکہ وہ ایک خط ٹائپ کر رہی تھیں۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی کوئی افریقی خاتون ٹائپسٹ تو کجا، کوئی مرد ٹائپسٹ بھی نہیں دیکھا تھا۔ امتاتا اور فورٹ ہیئر میں، میں جن دفاتر میں گیا تھا، وہاں ٹائپسٹ ہمیشہ ایک سفید فام اور مرد ہوتا تھا۔ اس نوجوان خاتون سے میں خاص طور پر متاثر ہوا کیونکہ وہ سفید فام مرد ٹائپسٹ اپنی انگلیاں سستی سے چلاتے اور خط ٹائپ کرتے تھے۔

جلد ہی وہ ہمیں اندرونی دفتر میں لے گئی جہاں میرا ایک شخص سے تعارف کرایا گیا جس کی عمر اٹھائیس انتیس سال تھی، چہرہ پر ذہانت اور مہربان تھا، خدوخال ہلکے تھے اور وہ ڈبل بریسٹ سوٹ میں ملبوس تھا۔ اپنی جوانی کے باوجود مجھے دنیا کا ایک تجربہ کار آدمی لگا۔ اس کا تعلق ٹرانسکائی سے تھا مگر وہ شہریوں کی طرح روانی سے انگریزی بولتا تھا۔ اسکی پرہجوم انتظار گاہ اور اس کی میز پر کاغذات کے ڈھیر سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک مصروف اور کامیاب آدمی ہے۔ لیکن اس نے ہمیں بھگتانے کی جلدی نہ کی اور بظاہر ہمارے معاملے میں حقیقی دلچسپی لی۔ اس کا نام والٹر میسولو تھا۔

میسولو کا دفتر افریقیوں کی جائیدادوں کی خرید وفروخت میں خصوصی دسترس رکھتا تھا۔ 1940ء کے عشرے میں ابھی چند علاقے ایسے تھے جہاں افریقی آزادانہ جائیداد خرید سکتے تھے۔ یہ الیگزینڈرا اور صوفیا ٹاؤن جیسے مقامات تھے جہاں ان کی چھوٹی چھوٹی ملکیتیں تھیں۔

ان میں سے بعض علاقوں میں افریقی کئی نسلوں سے گھروں کے مالک چلے آرہے تھے۔ باقی افریقی علاقے بلدیاتی بستیاں تھیں جہاں ماچس کی ڈبیوں جیسے مکانات تھے جن میں رہنے والے جوہانسبرگ سٹی کونسل کو کرایہ ادا کرتے تھے۔

میسولو کا نام ایک تاجر اور ایک مقامی رہنما دونوں حیثیتوں سے نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ علاقے میں ایک طاقت بن چکا تھا۔ اس نے میری باتیں توجہ سے سنیں۔ جب میں نے اسے فورٹ ہیئر میں اپنی مشکلات اور وکیل بننے کی خواہش کے بارے میں بتلایا اور یہ کہ کس طرح میں خط وکتابت کے ذریعے اپنی ڈگری مکمل کرنے کے لیے یونیورسٹی آف ساؤتھ افریقہ کی رجسٹریشن لینا چاہتا تھا۔ میں نے جوہانسبرگ میں اپنی آمد کے حالات کا ذکر کرنا مناسب نہ جانا۔ جب میں اپنی بات کہہ چکا تو وہ اپنی کرسی پر پیچھے کی جانب جھکا اور سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے میرے چہرے کا

جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ وہ لازاسائڈل سکائی نامی ایک سفید فام وکیل کے ساتھ کام کرتا رہا جو اس کے خیال میں نفیس اور ترقی پسند شخص ہے۔ اس نے کہا کہ سائڈل سکائی افریقیوں کی تعلیم میں دلچسپی رکھتا ہے اور وہ اس سے بات کرے گا کہ مجھے ایک کلرک کے طور پر رکھ لیا جائے۔

ان دنوں میرا خیال تھا کہ انگریزی میں قابلیت اور کاروبار میں کامیابی اعلیٰ تعلیمی کامرانیوں کا براہ راست نتیجہ ہے اور ان آثار سے میں نے اندازہ لگایا کہ میسولو ایک یونیورسٹی گریجوایٹ ہو گا مگر دفتر سے رخصت ہونے کے بعد میں اپنے عم زادہ سے یہ جان کر حیران رہ گیا کہ والٹر میسولو چھٹی جماعت سے آگے کبھی سکول نہیں گیا۔ فورٹ ہیئر کا یہ ایک اور سبق تھا جو مجھے جوہانسبرگ میں بھلا دینا پڑا۔ مجھے پڑھایا گیا تھا کہ بی اے کر لینے کا مطلب ہے لیڈر بن جانا اور لیڈر بننے کے لیے بی اے کی ضرورت ہے لیکن جوہانسبرگ میں مجھے پتہ چلا کہ بہت سے نمایاں لیڈر کبھی یونیورسٹی نہیں گئے تھے۔ اگرچہ میں نے انگریزی میں وہ تمام کورسز کر لیے تھے جو بی اے کے لیے ضروری تھے مگر میری انگریزی ان بہت سے لوگوں جیسی نہ تو رواں تھی اور نہ فصیح، جن سے میں جوجوہانسبرگ میں ملا تھا اور جنہوں نے سکول سرٹیفکیٹ بھی حاصل نہیں کیا تھا۔

آدھے سچ کی سزا

کچھ عرصہ اپنے عم زادہ کے ہاں ٹھہرنے کے بعد میں نے الیگزینڈرا ٹاؤن شپ میں آٹھویں ایونیو میں اینگلی کن چرچ کے ریورنڈ جے مابوتھو کے گھر منتقل ہونے کا انتظام کر لیا۔ عزت ماب مابوتھو ایک تھیمبو فیلو، میرے خاندان کے دوست، فیاض اور خداترس آدمی تھے۔ ان کی بیوی جسے ہم گوگو کہتے تھے، گرم جوش، مہربان اور ایک بہت اچھی باورچن تھی جو آزادانہ دوسروں سے مدد لیتی تھی۔ اک تھیمبو کی حیثیت سے جو میرے خاندان کو جانتا تھا عزت مآب مابوتھو مجھے اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ ایک

بار انہوں نے مجھ سے کہا:

"ہمارے آباء اجداد نے ہمیں سکھایا ہے کہ ہم قرابت داری کا لحاظ رکھیں۔"

لیکن میں نے کراؤن مائنز کے تجربے سے کچھ نہیں سیکھا تھا، چنانچہ عزت ماب مابوتھو کو میں نے ان حالات کے بارے میں نہ بتایا جو ژاسکائی سے میرے بھاگ نکلنے کا باعث بنے تھے۔ میری اس فرو گذاشت کے نتائج بڑے ناخوشگوار نکلے۔ مابوتھو فیملی کے ہاں منتقل ہونے کے چند روز بعد میں ان کے ساتھ چائے پی رہا تھا جب ایک ملاقاتی آ ٹپکا۔ بدقسمتی سے نووارد مسٹر فیسٹائل چیمبر آف مائنز میں انڈونا تھے اور جب میں اور جسٹس مسٹر ویل بی لوڈ سے ملے تھے، اس وقت وہ بھی وہاں موجود تھے۔ مسٹر فیسٹائل اور میں نے ایک دوسرے کو اس طرح سلام کیا جیسے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اگر چہ ہماری گزشتہ ملاقات کے بارے میں کوئی بات نہ ہوئی مگر اگلے روز عزت ماب مابوتھو مجھے ایک طرف لے گئے اور مجھ پر واضح کر دیا کہ میں ان کے گھر میں مزید نہیں رہ سکتا۔

میں نے خود کو لعنت ملامت کی کہ پورا سچ کیوں بولا تھا۔ میں غلط بیانیوں کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ میں نے اس وقت بھی جھوٹ بولا جب ایسا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ مجھے یقین ہے کہ عزت ماب مابوتھو ہرگز برا نہ مانتے لیکن جب انہیں مسٹر فیسائل سے میرے حالات کا علم ہوا تو انہیں فریب دیئے جانے کا احساس ہوا۔ جوہانسبرگ میں اپنے مختصر قیام کے دوران میں نے بے اعتمادیوں کا ایک سلسلہ چھوڑا تھا اور ہر بار میری غلط بیانی میرے لیے ہوا بن گئی تھی۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ میرے پاس کوئی متبادل نہیں۔ میں خوفزدہ اور ناتجربہ کار تھا اور جانتا تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں کوئی صحیح قدم نہیں اٹھایا۔ اس مرتبہ ایسا ہوا کہ عزت ماب مابوتھو نے مجھ پر ترس کھا کر اپنے اگلے ہمسایوں، ژوما فیملی کے ہاں میری رہائش کا بندوبست کر دیا۔

مسٹر ژوما، الیگزینڈرا میں مقیم مٹھی بھر افریقی زمیندار شرفا کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انکا گھر 46 سیونتھ ایونیو میں تھا جو چھ بچوں کے اس گھرانے کے لیے چھوٹا تھا لیکن یہ صاف ستھرا تھا جس میں ایک برآمدہ اور ایک باغیچہ بھی تھا۔ گزربسر کے لیے مسٹر ژوما، الیگزینڈرا کے دوسرے مکینوں کی طرح، رہائش رکھنے والوں کو کمرے کرائے پر دیتے تھے۔ انہوں نے مکان کی پچھلی طرف ٹین کی چھت کا ایک کمرہ تعمیر کر رکھا تھا جو کمرے کے بجائے ایک معمولی جھونپڑی لگتا تھا۔ اس کا فرش کچا تھا اور وہ اس میں بجلی اور بہتے پانی کا اہتمام تھا۔ لیکن یہ میرا ٹھکانہ تھا اور میں اس میں رہ کر خوش تھا۔

قانونی فرم میں کلرکی

اس دوران والٹر کی سفارش پر لازار سائڈل سکائی مجھے بطور کلرک لینے پر آمادہ ہو گیا تھا جبکہ اسی عرصے میں مجھے بی اے کی ڈگری لینی تھی۔ وٹکن، سائڈل سکائی اور آئڈل مین کی فرم شہر کی ایک سب سے بڑی قانونی فرم تھی جو کالوں اور گوروں دونوں کے معاملات نپٹاتی تھی۔ جنوبی افریقہ میں ایک وکیل بننے کے لیے قانون پڑھنے اور بعض امتحانات پاس کرنے کے علاوہ ایک پیشہ ور وکیل کے ہاں کئی سال کی شاگردی اختیار کرنا پڑتا تھی جسے سرونگ آرٹیکلز کہا جاتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے مجھے اپنا بی اے مکمل کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں یونیسا یعنی یونیورسٹی آف ساؤتھ افریقہ میں رات کی کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ یہ ایک دقیق تعلیمی ادارہ تھا جو خط کتابت کے ذریعے قرض اور ڈگریاں پیش کرتا تھا۔

رسمی قانونی مقدمات لینے کے علاوہ وٹکن سائڈل سکائی او آئڈل مین افریقی موکلوں کے جائیدادوں کے مقدمات کی بھی وکالت کرتی تھی۔ والٹر فرم کے لیے موکل لاتا جنہیں رہن پر قرض کی ضرورت ہوتی۔ فرم ان کی قرضے کی درخواستیں آگے بڑھانے کے عوض کمیشن لیتی جسے اسٹیٹ ایجنٹ کے ساتھ بانٹ لیتی۔

دراصل یہ لا فرم رقم کا بڑا حصہ خود رکھ لیتی تھی۔ اور افریقی اسٹیٹ ایجنٹ کے حصے میں صرف جھونگا ہی آتا تھا۔ المیہ یہ تھا کہ سیاہ فاموں کو دستر خوان کے ریزے دے دیئے جاتے تھے اور انہیں قبول کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔

بایں ہمہ لا فرم بہتیروں سے زیادہ نرم خو تھی۔ یہ ایک یہودی فرم تھی اور میں نے اپنے تجربے میں یہودیوں کو نسل اور سیاست کے معاملات میں اکثر سفید فاموں سے زیادہ روشن خیال پایا تھا۔ شاید اسی وجہ سے کہ وہ خود بھی تاریخی طور پر تعصب کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ یہ امر کہ فرم کے ایک پارٹنر لازار سائڈل سکائی نے ایک نوجوان افریقی کو شاگرد پیشہ کلرک رکھ لیا تھا، ایک ایسی بات تھی جو ان دنوں کبھی سننے میں نہیں آئی تھی اور یہ ان لوگوں کی نرم خوئی کی زندہ مثال تھی۔

مسٹر سائڈل سکائی جن کی میں بڑی عزت کرتا تھا اور جو مجھ سے بڑی مشفقت برتتے تھے، وہ یونیورسٹی آف وِٹ واٹرس رانڈ کے ایک گریجوایٹ تھے۔ جب میں ان کی فرم میں شامل ہوا، اس وقت ان کی عمر تیس کے عشرے کے درمیان تھی۔ وہ افریقی تعلیم میں دلچسپی رکھتے تھے اور افریقی سکولوں کو روپیہ اور وقت دیتے۔ وہ ایک دبلے پتلے باریک مونچھوں والے شائستہ آدمی تھے۔ وہ میری بہبود اور مستقبل میں حقیقی دلچسپی لیتے اور میرے لیے خصوصاً اور افریقیوں کے لیے عموماً تعلیم کی قدر و قیمت اور اہمیت کا پرچار کرتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ صرف عوام الناس کی تعلیم ہی قوم کو آزادی دلا سکتی ہے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ایک تعلیم یافتہ شخص کو دبایا نہیں جا سکتا کیونکہ وہ اپنے لیے خود سوچ سکتا ہے۔ وہ مجھ سے بار بار کہتے تھے کہ ایک کامیاب وکیل بن کر اپنی قوم کے لیے مجسم کامیابی بننا سب سے گرانقدر راستہ ہے جس پر میں چل سکتا ہوں۔

میں دفتر میں اپنے پہلے دن فرم کے بیشتر عملے سے ملا۔ ایک اور افریقی ملازم گاؤر ادی بے تھا جس کے ساتھ میرا دفتر مشترک تھا۔ وہ مجھ سے دس برس سینئر تھا اور ایک

کلرک، ترجمان اور پیغام رساں تھا۔ پست قد گٹھا ہوا جسم، مضبوط پٹھے۔ وہ انگریزی، سوتھو اور زولو روانی سے بولتا تھا اور ان تینوں زبانوں میں صحت، مزاح اور اعتماد کے ساتھ اپنا مافی الضمیر بیان کرتا۔ اس کی آرا مضبوط اور ان کے حق میں دلائل مضبوط تر ہوتے اور وہ سیاہ جوہانسبرگ میں ایک معروف شخصیت تھا۔

فرم کے دفتر میں پہلی صبح ایک خوش اطوار نوجوان سفید فام سیکرٹری مس لائبر مین نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔ نیلسن! اس فرم میں یہاں کوئی کلر بار نہیں۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ گیارہ بجے اگلے پارلر میں چائے والا آتا ہے۔ اس کی ٹرے میں چائے اور بہت سے کپ ہوتے ہیں۔ تمہاری آمد کے اعزاز میں ہم نے تمہارے اور گاؤر کے لیے دو نئے کپ خریدے ہیں۔ سیکرٹری چائے کے کپ اٹھا کر اپنے باس کے پاس لے جاتی ہیں لیکن تم اور گاؤر خود اپنے ہی کپ اٹھاؤ گے جیسے کہ ہم کرتی ہیں۔ جب چائے آئے گی تو میں تمہارا نام پکاروں گی اور پھر تم اپنی چائے نئی پیالیوں میں لے سکتے ہو۔ اس نے مزید کہا کہ میں یہ پیغام گاؤر تک پہنچا دوں۔ میں نے اس تعاون پر اس کا شکریہ ادا کیا لیکن میں یہ جان گیا کہ اس نے جن دو نئی پیالیوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، وہ اس کلر بار کی شہادت دیتی ہیں جس کے متعلق اس نے کہا تھا کہ موجود نہیں۔ سیکرٹری دونوں افریقیوں کیساتھ مل کر چائے پی سکتی تھیں۔ لیکن کالے وہ کپ استعمال نہیں کر سکتے تھے جو گوروں کے لیے مخصوص تھے۔

جب میں نے گاؤر کو بتایا کہ مس لائبر مین نے کیا کہا ہے تو اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے جو میری بات کے ساتھ ساتھ بدلتے گئے جیسے ایک بچے کے ذہن میں کوئی شرارتی خیال آ جائے۔ اس نے کہا: "نیلسن چائے کے وقت پریشان نہ ہونا۔ بس وہی کرنا جو میں کروں۔ گیارہ بجے مس لائبر مین نے ہمیں اطلاع دی کہ چائے آ گئی ہے۔ سیکرٹریوں اور بعض دوسرے ارکان عملہ کی موجودگی

میں گاؤر چائے کی ٹرے کے پاس گیا اور ظاہری طور پر اس نے دونوں نئے کپ نظر انداز کر کے ایک پرانی پیالی اٹھالی اور پھر اس میں چینی، دودھ اور چائے ڈالنے لگا۔ اس نے آہستہ آہستہ چائے میں چینی گھولی اور پھر وہیں کھڑا خود اطمینانی کے انداز میں چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ سیکرٹری گاؤر کی طرف دیکھتی رہ گئیں اور گاؤر نے پھر مجھے اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''نیلسن! اب تمہاری باری ہے۔''

ایک لمحے کے لیے میں الجھن میں پڑ گیا۔ میں سیکرٹریوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ اپنے نئے ساتھی سے الگ تھلگ ہونا چاہتا تھا، چنانچہ میں نے وہ راستہ اختیار کر جو مجھے صورتحال کے مطابق سب سے زیادہ موزوں لگا۔ میں نے چائے پینے سے یکسر انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ مجھے پیاس لگی ہے۔ میں اس وقت فقط تیئس برس کا تھا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا...... ایک آدمی کی حیثیت سے، جوہانسبرگ کے ایک مکین کی حیثیت سے اور ایک سفید فرم کے ملازم کی حیثیت سے ...... اور میں نے درمیانی راستے کو بہترین اور مناسب ترین پایا۔ اس کے بعد چائے کے وقفے میں، میں دفتر کے چھوٹے سے کچن میں چلا جاتا اور وہاں تنہائی میں چائے پی لیتا۔

سیکرٹری ہمیشہ اتنی با مروت نہیں ہوتی تھیں۔ کچھ عرصہ بعد جب میں فرم کے کام میں زیادہ تجربہ کار ہو گیا تھا، میں ایک گوری سیکرٹری کو ڈکٹیشن دے رہا تھا کہ ایک گورا موکل جو اسے جانتا تھا، دفتر میں آیا۔ وہ پریشان ہو گئی اور یہ ظاہر کرنے کے لیے وہ ایک کالے سے ڈکٹیشن نہیں لے رہی تھی۔ اس نے اپنے پرس میں سے چھ پنس کا سکہ نکالا اور سخت لہجے میں کہا۔ نیلسن، براہ کرم جا کر کیمسٹ سے میرے لیے شیمپو لے آؤ۔ میں کمرے سے چلا گیا اور اس شیمپو لا دیا۔ شروع میں فرم میں میرا کام ابتدائی نوعیت کا تھا۔ میں ایک کلرک اور ایک سراغرساں کے ملے جلے فرائض انجام دیتا تھا۔ میں کاغذات ڈھونڈتا، ترتیب دیتا اور انہیں فائل کرتا اور جوہانسبرگ میں جہاں

جہاں پہنچانے ہوتے وہاں پہنچا کر آتا۔ بعد میں، میں فرم کے بعض افریقی موکلان کے کاغذات تیار کرنے لگا، کام خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہوتا، مسٹر سائڈل سکائی وضاحت کرتے کہ یہ کس لیے ہے اور میں کیوں اسے کر رہا ہوں۔ وہ ایک صابر اور فراخ دل استاد تھے اور نہ صرف قانون کی تفصیلات سمجھاتے بلکہ اس کے پیچھے کارفرما فلسفہ بھی بیان کرتے۔ ان کا قانون کا نقطہ نظر کشادہ تھا۔ تنگ نہیں کیونکہ ان کو یقین تھا کہ یہ ایک اوزار ہے۔ جس سے معاشرے کو تبدیل کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔

جب مسٹر سائڈل سکائی اپنے قانون کے نقاط نظر بیان کرتے، وہ سیاست کے خلاف مجھے انتباہ کرتے۔ انکا کہنا تھا کہ سیاست انسان میں بدترین پہلو ابھارتی ہے۔ یہ مصیبت اور بدعنوانی کا منبع ہے اور اس سے ہر قیمت پر احتراز کرنا چاہیے۔ وہ ایک خوفناک تصویر کھینچتے کہ اگر میں سیاست میں بہنے لگا تو مجھ پر کیا بیتے گی اور وہ مجھے مشورہ دیتے کہ میں ان لوگوں کی صحبت سے بچوں جنہیں وہ فسادی اور ہجوم کو اکسانے والے قرار دیتے تھے، خصوصا گاؤر رادیبے اور والٹر سیسولو۔ اگرچہ مسٹر سائڈل سکائی ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے تھے مگر ان کی سیاست کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

گاؤر ان پہلوؤں سے واقعی ایک فسادی اور افریقی برادری میں ایک بارسوخ آدمی تھا جن پر مسٹر سائڈل سکائی کی نگاہ نہیں تھی یا جن کا انہیں علم نہیں تھا۔ گاؤ ویسٹرن نیٹو ٹاؤن شپ میں مشاورتی بورڈ کا رکن تھا جو چار مقامی افراد کا ایک منتخب ادارہ تھا اور جو ٹاؤن شپس کے متعلق معاملات پر حکام سے بات چیت کرتا تھا۔ اگرچہ اس کے پاس اختیارات نہ ہونے کے برابر تھے، مگر عوام میں اس کا بڑا وقار تھا۔ جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ گاؤ افریقن نیشنل کانگرس اور کمیونسٹ پارٹی دونوں کا سرکردہ رکن ہے۔

گاؤ کی دھمکی

گاؤ اپنی ہی دھن کا آدمی تھا۔ وہ گورے آجروں سے غیر معمولی احترام کا برتاؤ نہیں کرتا تھا اور افریقیوں کے متعلق ان کے رویے پر انہیں اکثر چڑاتا تھا۔ تم لوگوں نے ہماری زمین ہم سے ہتھیا لی ہے۔ وہ کہتا۔ اور ہمیں غلام بنالیا ہے۔ اب تم ہمیں مجبور کررہے ہو کہ اس کے بدترین قطعات واپس لینے کے لیے مہنگی قیمت ادا کریں۔ ایک روز جب میں کسی کام سے واپس آیا اور مسٹر سائڈل سکائی کے دفتر میں داخل ہوا تو گاؤر نے انکی طرف مڑتے ہوئے کہا، دیکھو تم ایک لارڈ کی طرح یہاں بیٹھے ہو جبکہ میرا چیف تمہارے کام نپٹانے کے لیے ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرتا ہے۔ یہ صورتحال اب الٹ جانی چاہیے اور ایک روز یہ ضرور الٹے گی اور ہم تم سب کو سمندر میں ڈال دیں گے۔ یہ کہہ کر گاؤر کمرے میں چلا گیا اور مسٹر سائڈل سکائی محض حالت غیظ میں سر ہلا کر رہ گئے۔

گاؤر بی اے کی ڈگری کے بغیر ایک ایسا شخص تھا جو بظاہر ان لوگوں سے بہتر تعلیم یافتہ لگتا تھا جو فورٹ ہیر سے شاندار ڈگریاں لے کر نکلے تھے۔ نہ صرف وہ زیادہ صاحب علم تھا بلکہ زیادہ جرات مند اور زیادہ پراعتماد بھی تھا۔ اگرچہ میں اپنی ڈگری مکمل کرکے لاسکول میں داخلہ لینا چاہتا تھا، میں نے گاؤر سے سیکھا کہ ایک ڈگری بذات خود قیامت کی سند نہیں ہے اور یہ بے معنی ہے جب تک آدمی اپنے آپ کو ثابت کرنے کے لیے معاشرے میں نہ جائے۔

کمیونسٹوں سے پہلا تعارف

میں وٹکن سائڈل سکائی اور آئڈل مین میں واحد شاگرد پیشہ کلرک نہیں تھا۔ میری عمر کے نیٹ بریگمن نامی ایک نوجوان نے میری آمد سے کچھ ہی پہلے کام شروع کیا تھا۔ نیٹ روشن فکر، خوش اطوار اور شائستہ تھا۔ وہ مکمل طور پر کلر بلائنڈ یعنی رنگ و نسل کے امتیاز سے بے بہرہ لگتا تھا اور وہ میرا پہلا سفید فام دوست بن گیا۔ وہ ایک ہوشیار نقال تھا اور جان سمٹس، فرینکلن اور ونسٹن چرچل کی آوازوں کی ہو بہو نقل

اتار سکتا تھا۔ میں اکثر قانون اور آفس پروسیجر جیسے معاملات پر اس کی رائے لیتا اور وہ ہمیشہ مددگار ثابت ہوتا۔

ایک دن لنچ کے وقت ہم دفتر میں بیٹھے تھے کہ نیٹ نے سینڈوچ کا ایک پیکٹ نکالا۔ اس نے ایک سینڈوچ کھول کر کہا، نیلس، سینڈوچ کا دوسرا سرا پکڑو۔ مجھ پر واضح نہیں تھا کہ اس نے مجھے ایسا کرنے کو کیوں کہا تھا لیکن میں چونکہ بھوکا تھا، میں نے سینڈوچ پکڑ لیا۔ اب کھینچو۔ اس نے کہا اور جب میں نے کھینچا تو وہ دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔

اب کھاؤ۔ اس نے کہا۔ جب میں اسے تناول کر رہا تھا، نیٹ نے کہا۔ نیلسن ہم نے ابھی جو کچھ کیا ہے یہ کمیونسٹ پارٹی کے فلسفے کا علامتی اظہار ہے۔ یہ کہ ہمارے پاس جو کچھ ہو، بانٹ کر استعمال کریں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کا رکن ہے، پھر اس نے وضاحت کی کہ یہ جماعت کن مقاصد کے لیے کام کرتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ گاؤ کمیونسٹ پارٹی کا رکن ہے مگر اس نے کبھی اس کے لیے کنویسنگ نہیں کی تھی۔ نیٹ نے اس روز اور بعد میں کئی مواقع پر کمیونزم کی برکات کا پرچار کیا اور مجھے پارٹی میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ میں اس کی باتیں سنتا، سوالات کرتا مگر میں پارٹی میں شامل نہ ہوا۔ میں کسی بھی سیاسی تنظیم میں شامل ہونے پر آمادہ نہ تھا کیونکہ مسٹر سائڈل سکائی کی نصیحت ہنوز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ میں خاصا مذہبی بھی تھا اور کمیونسٹ پارٹی کی مذہب دشمنی نے مجھے اس سے دور رکھا۔ لیکن میں نے اس نصف سینڈوچ کی تعریف ضرور کی۔

میں نیٹ کی صحبت سے لطف اندوز ہوتا اور اکثر ہم کئی لیکچروں اور کمیونسٹ پارٹی کے اجلاسوں وغیرہ میں اکٹھے آتے جاتے۔ میں زیادہ تر دانشورانہ تجسس کی بنا پر جاتا تھا۔ میں اپنے ملک میں نسلی تشدد کی تاریخ سے آگاہ ہو رہا تھا اور جنوبی افریقہ میں آزادی کی جدوجہد کے عدسے سے دیکھتی تھی۔ ان کے نزدیک یہ محروموں کے

مراعات یافتگان کے ہاتھوں استحصال کا معاملہ تھا۔ یہ بات میرے دل میں اتری تھی مگر جنوبی افریقہ کی موجودہ صورتحال سے بظاہر کوئی خاص تعلق نہیں رکھتی تھی۔ یہ جرمنی، انگلینڈ یا روس پر تو لاگو ہو سکتی تھی مگر اس ملک کے لیے موزوں نہیں لگتی تھی جسے میں جانتا تھا۔ اس کے باوجود میں ان کی باتیں سنتا اور سیکھتا تھا۔

نیٹ مجھے کئی تقریبات میں دعوت دیتا جہاں گوروں، افریقیوں، ہندوستانیوں اور رنگ داروں کا مخلوط اجتماع ہوتا۔ یہ اجتماعات پارٹی کے زیر اہتمام ہوتے اور اکثر مہمان پارٹی کے ارکان ہوتے۔ مجھے یاد ہے کہ پہلی بار جب میں ایک اجتماع میں گیا تو زیادہ تر اس بنا پر پریشان ہوا کہ میرے خیال میں، میں نے مناسب لباس نہیں پہنا ہوا تھا۔ ہمیں فورٹ ہیر میں سکھایا گیا تھا کہ کسی بھی قسم کی سماجی تقریب میں ٹائی اور جیکٹ پہننی چاہیے۔ اگرچہ میری کپڑوں کی الماری بہت محدود تھی، مجھے پارٹی میں پہن کر جانے کے لیے ایک ٹائی مل گئی۔

اجتماع میں زندہ دل اور ملنسار لوگوں کا ایک گروہ تھا جو بظاہر رنگ و نسل پر کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔ یہ اولیں مخلوط اجتماعات میں سے ایک تھا جن میں، میں نے شرکت کی تھی اور میں اس میں شریک محفل سے زیادہ ایک خاموش سامع تھا۔ میں نے بہت شرمندگی محسوس کی اس خیال سے کہ یہاں آ کر غلطی کی ہے اور میں اعلیٰ خیالات کی حامل انقلابی گفتگوؤں میں حصہ لینے کا اہل نہیں۔ اپنے اردگرد ہونے والے ترقی پسندانہ مباحث کے مقابلے میں میرے خیالات غیر ترقی یافتہ لگتے تھے۔

شام کو ایک موقع پر میرا تعارف مائیکل ہارمل سے کرایا گیا جس کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ رہوڈز یونیورسٹی جسے ایم اے انگریزی کی ڈگری رکھتا ہے۔ میں اس کی ڈگری سے متاثر ہوا لیکن جب میں اس سے ملا تو میں نے اپنے آپ سے کہا: اس چھوکرے نے ایم اے کر رکھا ہے اور اس نے ٹائی بھی نہیں پہنی ہوئی۔ میں اسکی اس خامی کو ہضم نہ کر سکا۔ بعد میں مائیکل اور میں دوست بن گیا اور میں اس کی بڑی تعریب

کرنے لگا کیونکہ اس نے میرے بہت سے احمقانہ خیالات کو مسترد کر دیا جن سے میں چمٹا ہوا تھا۔ وہ نہ صرف ایک شاندار ادیب تھا بلکہ کمیونزم سے اس قدر مخلص تھا کہ وہ عام افریقیوں کی طرح رہتا تھا اگر چہ وہ چاہتا تو بڑی شان سے رہ سکتا تھا۔

تاریک شہر کی جنت:

الیگزینڈرا میں زندگی بڑی لطیف اور نازک تھی۔ اس کی فضا زندہ دلون کی تھی، اس کی روح مہم جویانہ تھی، اس کے لوگ خوش تدبیر تھے۔ اگر چہ اس ٹاؤن شپ میں بعض خوبصورت عمارتیں تھیں، اسے بخوبی ایک گندی بستی قرار دیا جا سکتا تھا جو حکام کی طرف سے نظر انداز کیے جانے کا زندہ ثبوت تھی۔ سڑکیں کچی اور گندی تھیں جہاں بھوکے غذائی قلت کے شکار نیم برہنہ ادھر ادھر دوڑتے بھاگتے نظر آتے۔ ہوا ٹین کے کیبروں کی بھٹیوں میں جلنے والی کوئلوں کی آگ کے دھوئیں سے کثیف اور بوجھل رہتی۔ ایک نل کئی مکانوں کے لیے کفالت کرتا۔ سڑک کے ساتھ ساتھ کھڑے سڑے پانی کی چھپڑیاں آبی کیڑوں سے بھری ہوتیں۔ الیگزینڈرا کو تاریک شہر کہا جاتا تھا کیونکہ یہاں بجلی نہیں تھی۔ رات کو چل کر گھر جانا خطرناک تھا کیونکہ گلیوں میں روشنیاں نہیں تھیں۔ رات کو خاموشی کسی کے پکارنے، ہنسنے یا اکادکا فائر سے ٹوٹ جاتی۔ ٹرانسکائی کی تاریکی سے مختلف یہاں کی تاریکی آدمی کو اپنی لپیٹ میں لیتی محسوس ہوتی تھی۔

بستی خطرناک حد تک گنجان آباد تھی۔ ہر مربع فٹ میں ایک جھونپڑی نما مکان تھا یا ٹین کی چھت والی جھونپڑی۔ جیسا کہ خطرناک حد تک غریب بستیوں میں ہوتا ہے۔ اس کا بدترین پہلو سامنے آ گیا۔ زندگی بڑی سستی تھی۔ رات کو بندوق اور چاقو کی حکمرانی ہوتی تھی۔ کھٹ سے کھلنے والے چاقو اور خنجر لیے لفنگے نمایاں اور بکثرت تھے۔ ان دنوں وہ امریکی فلمی اداکاروں کی ہمسری کرنے کے جنون میں مبتلا تھے اور انہی جیسے ہیٹ، ڈبل بریسٹ سوٹ، اور چوڑی رنگ دار ٹائیاں پہنتے۔ الیگز

ینڈرا میں پولیس کے چھاپے زندگی کا لازمہ تھے۔ پولیس روٹین میں پاس کی خلاف ورزی، شراب رکھنے اور پول ٹیکس ادانہ کرنے کے جرم میں بڑی تعداد میں لوگوں کو گرفتار کر کے لے جاتی۔ تقریباً ہر ٹکڑ پر غیر قانونی سیلون، شی بینز تھے جہاں غیر قانونی خانہ ساز شراب مل جاتی تھی۔

الیگزینڈرا میں زندگی کے جہنم آسا پہلوؤں کے باوجود یہ بستی ایک طرح کی جنت بھی تھی۔ ملک کے ایک ایسے علاقے کی حیثیت سے جہاں افریقیوں کو جائیداد حاصل کرنے اور اپنے معاملات خود چلانے کی آزادی تھی اور جہاں لوگوں کو سفید میونسپل حکام کی دہشت گردی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ الیگزینڈرا ایک شہری ارض موعود تھا اور امر کی شہادت تھا کہ ہماری قوم کے ایک طبقے نے دیہی علاقوں سے تعلقات منقطع کر کے مستقل شہری زندگی اختیار کر لی ہے۔ حکومت افریقیوں کو دیہات میں یا کانوں میں کام کرتے رکھنے کے لیے یہ کہتی تھی کہ افریقی فطری طور پر دیہی لوگ ہیں اور شہری زندگی کے لیے موزوں نہیں۔ الیگزینڈرا نے اپنے مسائل اور خرابیوں کے باوجود اس جھوٹ کا پول کھول دیا تھا۔ اس کی آبادی جو تمام افریقی لسانی گروہوں پر مشتمل تھی، شہری زندگی سے سازگار اور سیاسی شعور سے بہرہ ور تھی۔ شہری زندگی قبائلی اور نسلی امتیازات کو زائل کرتی تھی اور ہم لوگ رہوسا، سوتھو، زولو اور شنگاان کے بجائے الیگزنڈرن بن گئے تھے۔ اسے ایک سالیت کا احساس پیدا ہوتا تھا جس نے سفید فام حکام میں بڑی تشویش پیدا کردی تھی۔ حکومت افریقیوں سے برتاؤ کرتے وقت ہمیشہ تقسیم کرو اور حکومت کرو، کے ہتھکنڈے استعمال کرتی اور لوگوں کے باہمی نسل اختلافات کی شدت پر انحصار کرتی تھی۔ لیکن الیگزینڈرا جیسے مقامات پر یہ اختلافات زائل ہو رہے تھے۔

الیگزینڈرا کو میرے دل میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے یہ پہلی جگہ تھی جہاں میں اپنے گھر سے باہر مقیم رہا۔ اگرچہ بعد میں مجھے سوویٹر کے ایک چھوٹے سے محلے

آرلینڈو میں الیگزینڈرا کی نسبت کہیں زیادہ مدت کے لیے رہتا تھا مگر میں ہمیشہ الیگزینڈرا ٹاؤن شپ کو اپنا گھر قرار دیتا تھا جہاں میرا کوئی مکان نہیں تھا اور آرلینڈو کو ایسی جگہ سمجھتا تھا جہاں میرا مکان تو تھا مگر گھر نہیں تھا۔

الیگزینڈرا میں پہلے مجھے غربت کے بارے میں اتنی زیادہ معلومات حاصل ہوئیں جتنی قونو میں بچپن کے تمام دنوں میں حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ میرے پاس شاذونادر ہی پیسے ہوتے اور میں کم سے کم مالی وسائل پر گزارا کر رہا تھا۔ لا فرم مجھے دو پونڈ فی ہفتہ ادا کرتی تھی اور اس پر یمیم کی ادائیگی بھی مجھ پر سے ساقط کر دی تھی جو باضابطہ کلرک فرم کو ادا کرتے تھے۔ دو پونڈ میں سے 13 شانگ 4 پنس ماہانہ رد خاندان کو کمرے کے کرائے میں ادا کر دیتا تھا۔ الیگزینڈرا آنے جانے کا ارزاں ترین ذریعہ مقامی بس تھی جو افریقیوں کے لیے مخصوص تھی اور میری آمدنی میں سے ایک پونڈ دس شانگ ماہانہ لے جاتی تھی۔ میں خط کتابت کے ذریعے اپنی ڈگری مکمل کرنے کے لیے یونیورسٹی آف ساؤتھ افریقہ کو بھی فیس ادا کر رہا تھا۔ ایک اور پونڈ میں خوراک وغیرہ پر خرچ کرتا تھا۔ میں ایک پیرافین لیمپ خریدنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ یوں موم بتیاں مجھے رات گئے تک پڑھنے میں مدد دیتی تھیں۔

گورے کا سوٹ میرے جسم پر

ہر ماہ چند پنس لازمی طور پر کم پڑ جاتے تھے۔ کئی دنوں بس کا کرایہ بچانے کے لیے میں صبح شام چھ میل پیدل چل کر آتا جاتا۔ کئی کئی دن میں چند لقمے خوراک کے سوا کچھ نہ کھاتا اور نہ کپڑے بدلتا۔ مسٹر سائڈل سکائی نے جو میرے ہم قامت تھے۔ اپنا ایک پرانا سوٹ مجھے دیا اور اسے رفو کروا کے میں تقریباً پانچ سال روزانہ پہنتا رہا۔ آخر وہ سوٹ کم اور پیوند زیادہ رہ گئے تھے۔

ایک سہ پہر بس کے ذریعے میں الیگزینڈرا واپس آ رہا تھا اور اپنے ہم عمر ایک آدمی کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ وہ ان نوجوانوں میں سے تھا جو امریکی فلموں

کے لفنگوں کی نقل کرتے اور ان جیسا لباس پہنتے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ میرا بوسیدہ سوٹ اس کی جیکٹ کے حاشیہ سے چھو رہا تھا۔ اس نے بھی یہ دیکھ لیا اور احتیاط سے پرے ہٹ گیا تا کہ میری جیکٹ اس کے کوٹ کو داغدار نہ کر سکے۔ یہ معمولی سی حرکت تھی، جو اس تناظر میں مزاحیہ لگتی تھی مگر میرے لیے تکلیف دہ تھی۔

غربت کے حق میں کچھ زیادہ نہیں کہا جا سکتا لیکن اکثر یہ سچی دوستی کا انکوبیٹر ثابت ہوتی ہے۔ جب آپ دولت مند ہوں تو کئی لوگ آپ سے دوستی کا دعویٰ کریں گے لیکن جب آپ غریب ہوں تو بہت ہی کم ایسا کریں گے۔ اگر دولت ایک مقناطیس ہے تو غربت ایک طرح کی دور ہٹاؤ ہے۔ اس کے باوجود غربت اداروں میں سچی دریا دلی کو جنم دیتی ہے۔ ایک شام میں نے پیسے بچانے کے لیے قصبے تک پیدل چلنے کا فیصلہ کیا۔ راستے میں ایک نوجوان خاتون دکھائی دیں جو فورٹ ہیئر میں میرے ساتھ پڑھتی تھیں۔ ان کا نام فائلکس ماسیکو تھا۔ وہ سڑک کے اسی جانب میری طرف آ رہی تھیں۔ میں اپنے بوسیدہ کپڑوں کے پیشِ نظر پریشان ہو گیا اور اس خیال سے سڑک پار کر کے دوسری طرف چلنے لگ کہ وہ مجھے پہچان نہ پائے گی۔ لیکن میں نے اسے پکارتے ہوئے سنا: نیلسن، نیلسن میں رکا اور سڑک پار کر کے اس کی طرف گیا اور یوں ظاہر کیا جیسے اس لمحے تک میری نگاہ نہیں پڑتی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی لیکن میں نے اسے جتا دیا کہ تم مجھے کسی قدر بوسیدہ کپڑوں میں دیکھ رہی ہو۔ وہ بولی، نیلسن یہ ہے میرا پتہ۔۔ 234 آرلینڈو ایسٹ۔۔ یہاں آ کر مجھ سے ملنا۔ میں نے طے کر لیا کہ دوبارہ اپنی رسوائی کا سامان نہیں کروں گا۔ لیکن ایک دن جب مجھے اچھا کھانے کی بھوک تھی میں اس کے ہاں پہنچ گیا۔ اس نے میری غربت کی طرف کوئی اشارہ کیے بغیر میری خوب خاطر تواضع کی اور اس کے بعد سے میں اکثر اس سے ملاقات کے لیے جانے لگا۔

میری بے خبری کا مذاق اڑا

میرے مالک مکان ڑوما دولت مند نہیں تھے۔ لیکن وہ مہربان اور انسان دوست تھے۔ ہر اتوار میں سارا وقت انکے ہاں گزارتا۔ وہ اور ان کی بیوی مجھے دوپہر کا کھانا کھلاتے اور سور کے گوشت اور سبزیوں کی بھاپ اڑاتی پلیٹیں مجھے ہفتے بھر کا واحد گرم کھانا فراہم کرتیں۔ میں خواہ کہیں بھی ہوتا اور کچھ بھی کر رہا ہوتا مجھے اتوار کو روما خاندان کے ہاں جانا ہرگز نہ بھولتا۔ ہفتے کے باقی دنوں میں میرا گزر نا ڈبل روٹی پر ہوتا اور کبھی کبھار فرم سیکرٹری مجھے کچھ کھانے کے لیے پیش کر دیتیں۔

ان دنوں میں بہت پسماندہ تھا اور غربت اور علاقہ پرستی کی آمیزش نے بعض دلچسپ واقعات کو جنم دیا۔ ایک روز جب کہ روما کے ہاں منتقل ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، میں جوہانسبرگ سے واپس گھر آ رہا تھا اور بہت بھوکا تھا۔ میرے پاس کچھ رقم تھی جو میں نے اس لیے بچا رکھی تھی کہ کسی روز تازہ گوشت کھاؤں گا جو بڑے عرصے سے مجھے نصیب نہیں ہوا تھا۔ مجھے اردگرد کوئی مناسب قصاب دکھائی نہ دیا چنانچہ میں ایک ایسی بڑی دکان میں داخل ہوا جیسی جوہانسبرگ میں، میں نے اب تک نہیں دیکھی تھی۔ شیشے میں سے مجھے ایک بڑا اور اشتہا انگیز گوشت کا ٹکڑا دکھائی دیا۔ میں نے کاؤنٹر والے سے کہا کہ گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ دے۔ اس نے گوشت پیک کر دیا اور میں نے اسے بغل میں دبا کر گھر کی راہ لی۔ راستے میں سوچتا جا رہا تھا کہ آج تو خوب مزہ آئے گا۔

جب الیگزینڈرا میں اپنے کمرے میں پہنچا، میں نے صاحب خانہ کی ایک نوخیز بیٹی کو آواز دی۔ وہ صرف سات برس کی تھی لیکن تھی بڑی ہوشیار، میں نے اس سے کہا، کیا تم گوشت کا یہ ٹکڑا اپنی بڑی بہنوں کے پاس لے جا کر ان سے کہو گی کہ اسے میرے لیے پکا دیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنی مسکراہٹ دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بڑوں کا اتنا احترام کرتی تھی کہ اسے ہنسنے میں عار تھی۔ میں نے کچھ ناراض ہو کر کہا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے بڑی صفائی سے کہا، یہ گوشت پکا ہوا ہے۔ میں

نے اس سے کہا تم کیسی بات کر رہی ہو۔ اس نے وضاحت کی کہ آپ نے سور کا سمو کڈ گوشت خریدا ہے اور اسے اسی حالت میں کھایا جاتا ہے۔ یہ بات میرے لیے بالکل نئی تھی اور اپنی مکمل بے خبری کا اعتراف کرنیکے بجائے میں نے کہا، میں جانتا ہوں کہ یہ سموکڈ ہے مگر اسے گرم کروانا چاہتا ہوں۔ وہ جانتی تھی کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں مگر وہ مزید کچھ کہنے کے بجائے وہاں سے کھسک گئی۔

استانی سے میرا رومان

الیگزینڈرا میں زندہ دل اور خوش باش ایلن انکابنڈی سے میری دوستی ہوگئی جسے میں ہیلڈ ٹاؤن کے دنوں سے جانتا تھا اور جو اس وقت ٹاؤن شپ سکول میں پڑھا رہی تھی۔ دراصل ایلن اور میں باہم محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ ہیلڈ ٹاؤن میں میری بس سے معمولی شناسائی تھی اور الیگزینڈرا میں ہماری ملاقات کے بعد ہی ہماری ملاقات کے بعد ہی ہمارے باہمی روابط استوار ہوئے۔ ان مہینوں میں میرے پاس جو فالتو وقت ہوتا وہ میں اس کے ساتھ گزارتا۔ اظہار محبت ذرا مشکل تھا۔ ہم ہمیشہ لوگوں سے گھرے ہوتے اور علیحدگی میں ملنے کی بہت جگہیں تھیں۔ ہمیں صرف سورج یا ستاروں میں گھومتے پھرتے۔ اکثر ہم بس چلتے رہتے اور جب ہم دونوں کے پاس وقت ہوتا، پکنک منالیتے

ایلن نسلا سوازی تھی اور اگرچہ ٹاؤن شپ میں قبائلیت کمزور پڑ رہی تھی۔ میرے ایک قریبی دوست نے خالص قبائلی بنیادوں پر ہمارے باہمی تعلق کا نامناسب قرار دیا۔ میں نے اس کا موقف یکسر مسترد کر دیا۔ لیکن ہمارے مختلف پس منظر نے بعض مسائل پیدا کیے۔ پادری کی بیوی مسز مابوتھو ایلن کی پروا نہیں کرتی تھی۔ زیادہ تر اس بنا پر کہ وہ ایک سوازی تھی۔ ایک روز جب میں مابوتھو فیملی کے ہاں تھا مسز مابوتھو نے اسے بتایا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ بعد میں انہوں نے مجھے بتایا۔ نیلسن کوئی لڑکی تم سے ملنے آئی تھی۔ کیا وہ لڑکی شانگان ہے۔ اگرچہ شانگان ایک پرفخر اور معزز قبیلہ

ہے مگر ان دنوں شانگان ایک حقارت آمیز اصطلاح تھی۔ مجھے ان کی بات بہت بری محسوس ہوئی چنانچہ میں نے کہا،نہیں وہ شانگان نہیں۔ وہ سوازی ہے۔ مسز مابوتھو شدت سے محسوس کرتی تھیں کہ مجھے صرف رہوسا لڑکیوں کے ساتھ روابط رکھنے چاہییں۔

ان کی یہ نصیحت مجھے باز نہ رکھ سکیں۔ میں ایلین سے محبت اور اس کا احترام کرتا تھا ارا سے ناپسند کرنیوالوں کا مشورہ مسترد کرنے میں مجھے کوئی عار نہ تھی۔ ایک ایسی عورت سے دوستی رکھنا جو رہوسا نہ تھی۔ میرے نزدیک ایک جدت پسندانہ اور جرات مندانہ اقدام تھا۔ میں نوجوان اور شہر میں ایک اجنبی تھا اور ایلین نے نہ صرف میری رومانی ساتھی بلکہ ایک ماں کا کردار بھی ادا کیا جو میری مدد کرتی، مجھے اعتماد، بخشتی اور قوت اور امید فراہم کرتی تھی۔ لیکن چند ماہ کے اندر ایلین مجھ سے پرے ہٹ گئی اور افسوسناک طور پر ہمارا رابطہ منقطع ہو گیا۔

روما خاندان کی پانچ بیٹیاں تھیں، ایک سے بڑھ کر پیاری، مگر سب سے زیادہ پیاری کا نام دیدی تھا۔ دیدی میری ہم عمر تھی۔ وہ بیشتر ہفتہ جوہانسبرگ کی ایک سفید مضافاتی بستی میں کسی گھر میں کام کرتے گزارتی۔ جب میں نیا نیا ان کے گھر آیا تھا۔ میں اسے کبھی کبھار ہی دیکھتا تھا۔ لیکن بعد میں جب میری اس سے مناسب شناسائی ہو گئی تو میں اس کی محبت کا اسیر ہو گیا۔ لیکن دیدی کم ہی میری پروا کرتی تھی اور میری جس بات کا وہ خاص طور پر نوٹس لیتی وہ یہ تھی کہ میرے پاس ایک ہی پیوند زدہ سوٹ اور ایک ہی قمیض تھے اور یہ کہ میں ایک آوارہ گرد سے کچھ مختلف شخصیت نظر نہیں آتا تھا۔

محبوبہ کا المناک انجام

ہر ہفتے کے اواخر میں دیدی الیگزینڈرا لوٹتی۔ ایک بار ایک نوجوان آدمی اس کے ساتھ گھر آیا جس کے بارے میں میں نے خیال کیا کہ اس کا بوائے فرینڈ ہے۔ وہ

ہٹا کٹا کھاتا پیتا شخص تھا جس کے پاس ایک کار تھی جو ان دنوں ایک غیر معمولی چیز تھی۔ وہ مہنگا ڈبل بریسٹ امریکی سوٹ اور چوڑے حاشیہ کا ہیٹ پہنتا اور ظاہری ٹیپ ٹاپ پر بہت توجہ دیتا۔ وہ کسی طرح کا جتھے باز رہا ہوگا مگر مجھے اس کا یقین نہیں تھا۔ وہ باہر صحن میں کھڑا ہو جاتا اور اپنے ہاتھ ویسٹ کوٹ کی جیبوں میں ڈالے رکھتا اور سراسر برتر نظر آتا۔ وہ نرمی سے مجھے سلام کرتا لیکن مجھے اس کی حرکات سے پتہ چل جاتا کہ وہ مجھے اپنے مقابلے میں کچھ اہمیت نہیں دیتا۔

میری خواہش تھی کہ میں ویدی کو بتاؤں کہ میں اسے چاہتا ہوں لیکن مجھے ڈر تھا کہ میری پیش قدمی کا مناسب جواب نہیں ملے گا۔ میں ایک ڈان جوآن نہیں تھا۔ میں لڑکیوں کے معاملے میں بے ڈھب اور متامل تھا اور وہ رومانی داؤ کھیلنا نہیں جانتا تھا جنہیں دوسری معمولی کاوش سے کھیلتے نظر آتے تھے۔ ویک اینڈ پر ویدی کی ماں بعض اوقات اس سے کہتی کہ کھانے کی ایک پلیٹ مجھے دے آئے۔ ویدی پلیٹ لیے میرے کمرے کے دروازے پر آتی اور یہ کام اتنا جلد نپٹانے کی کوشش کرتی جتنا ممکن ہوتا لیکن میں پوری پوری کوشش کرتا کہ اس میں ذرا تاخیر ہو جائے۔ میں مختلف معاملات میں اس کی رائے طلب کرتا اور ہر طرح کے سوالات پوچھتا۔ اب تم نے سکول میں کونسا سٹینڈرڈ حاصل کیا ہے۔ میں کہتا۔ سٹینڈرڈ پانچ، وہ جوب دیتی۔ تم نے سکول چھوڑا کیوں؟ میں پوچھتا۔ وہ جواب دیتی؛ میں بور ہو گئی تھی۔ میں کہتا۔ اچھا تو تمہیں واپس سکول جانا چاہیے۔ تم میری ہی عمر کی ہو اور اس عمر سکول واپس جانے میں کوئی قباحت نہیں۔۔ ورنہ جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو پچھتاؤ گی۔ تمہیں اپنے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ اب تمہارے لیے اچھا موقع ہے کیونکہ جوان اور خوبصورت ہو اور تمہارے کئی تعریف کرنے والے ہیں۔ لیکن تمہیں ایک آزادانہ پیشہ اپنانے کی ضرورت ہے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ ایسے رومانی الفاظ کسی نوجوان آدمی نے کسی نوجوان عورت

سے نہیں کہے ہوں گے جس سے اسے محبت تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس سے اور کیا باتیں کروں۔ وہ سنجیدگی سے سنتی رہی مگر اسے ان میں دلچسپی نہیں تھی۔ دراصل اسے مجھ پر قدرے برتری احساس تھا۔

میں چاہتا تھا کہ اسے منگنی کی تجویز پیش کروں لیکن میں یہ اس وقت تک نہیں کرنا چاہتا تھا جب تک مجھے یہ یقین نہ ہو جاتا کہ وہ ہاں کہہ دے گی۔ اگرچہ میں اس سے محبت کرتا تھا مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھے مسترد کر کے اسے اطمینان کا احساس ہو۔ میں نے اپنی کوشش جاری رکھی مگر میں شرمیلا اور متامل تھا۔ سیاست کے برعکس محبت میں توقف بالعموم خوبی نہیں ہوتا۔ میں اتنا پر اعتماد نہیں تھا کہ یہ خیال کرتا کہ کامیاب ہو جاؤں گا اور نہ اتنی دلجمعی رکھتا تھا کہ ناکام رہنے کی صورت میں احساس ناکامی کو برداشت کر لیتا۔

میں اس گھر میں تقریبا ایک سال قیام پزیر رہا اور آخر تک میں نے انہیں اپنے احساسات سے آگاہ نہ کیا۔ دیدی کی اپنے بوائے فرینڈ میں دلچسپی کم ہوئی نہ اس نے مجھ میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ آخر کار میں نے انہیں خدا حافظ کہا۔ پھر کئی سال تک میں نے دیدی کو نہ دیکھا۔ بہت بعد میں ایک روز میں جوہانسبرگ میں قانون کی پریکٹس کر رہا تھا۔ ایک نوجوان عورت اور اس کی ماں میرے دفتر میں داخل ہوئیں۔ عورت کی گود میں بچہ تھا اور اس کا بوائے فرینڈ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے خلاف قانونی کاروائی کرنا چاہتی تھی۔ یہ نوجوان عورت دیدی تھی مگر اب وہ بدحال نظر آتی تھی۔ میں اس کی حالت دیکھ کر آزردہ ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کس طرح معاملات مختلف صورت میں سامنے آتے ہیں۔ آخر میں اس نے اپنے بوائے فرینڈ کے خلاف مقدمہ دائر نہ کیا اور میں نے اسے دوبارہ کبھی نہ دیکھا۔

اپنی رومانوی خامیوں کے باوجود میں بتدریج شہری زندگی میں ڈھل گیا اور میرے اندر ایک اندرونی قوت کا احساس اور ایک یقین اجاگر ہونے لگا جسے میں

اس دنیا سے باہر رہ کر ہی حاصل کر سکتا تھا جس میں میں نے پرورش پائی تھی۔ جلد ہی مجھ پر واضح ہو گیا کہ ترقی کرنے کے لیے مجھے شاہی رابطوں یا خاندانی امداد پر انحصار ترک کرنا ہو گا، چنانچہ میں نے ان لوگوں کے ساتھ تعلقات استوار کر لیے جو میرے تھیمبو شاہی خانوادے سے آگاہ نہیں تھے یا اس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ میرا اپنا گھر تھا اگرچہ بڑا سادا سا ہی اور میں اپنے اندر خود اعتمادی اجاگر کر رہا تھا جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے ضروری تھی۔

ناظم کی جوہانسبرگ آمد

1941ء کے آخر میں مجھے یہ اطلاع ملی کہ ناظم جوہانسبرگ آ رہا ہے اور وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں پریشان ہو گیا مگر جانتا تھا کہ میں اس سے ملنے پر مجبور ہوں۔ وہ ڈبلیو این ایل اے یعنی ووائرسرانڈ نیٹو لیبر ایسوی ایشن کے کمپاؤنڈ میں ٹھہرا ہوا تھا جو گریٹ بیریر ریف ملکیں کان کن بھرتی کرنیوالی ایجنسی تھی۔

ناظم بہت بدل گیا تھا یا شاید میں ہی بدل گیا تھا۔ اس نے ایک بار بھی اس امر کی طرف اشارہ نہ کیا کہ میں گھر سے بھاگ آیا تھا۔ اس نے فورٹ ہیر یا یا مجوزہ شادی کا ذکر کیا جو عمل میں نہ آ سکی۔ اس کا رویہ محبت آمیز اور خیر خواہانہ تھا اور اس نے پدرانہ انداز میں میری پڑھائی اور مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں سوالات کیے۔ اس نے تسلیم کیا کہ میری زندگی پیشگی شروع ہو رہی ہے اور اس راہ عمل سے مختلف ہو گی جو اس نے میرے لیے تجویز کی تھی۔ اس نے مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش نہ کی اور میں اس کے اس اعتراف حقیقت پر اس کا ممنون تھا کہ میں اس کی سرپرستی سے باہر آ چکا تھا۔

ناظم سے میری ملاقات کا دوہرا اثر ہوا۔ میں نے اپنے آپ کو بحال کر لیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے اور تھیمبو خانوادے کے لیے میرے دل میں احترام از سر نو بحال ہو گیا۔ میں اپنے پرانے روابط سے لاتعلق ہو گیا تھا اور یہ رویہ میں نے اپنے

گھر سے فرار کو جواز بخشنے اور اس دنیا سے اپنی علیحدگی کی تکلیف کم کرنے کے لیے اختیار کیا تھا جسے میں محبت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ناظم کا پرتپاک انداز سے مجھ سے بغل گیر ہونا میرے لیے یقین افروز تھا۔

ناظم جہاں مجھ سے مطمئن لگتا تھا وہاں جسٹس کے بارے میں آزردہ تھا جس کے متعلق اس کا خیال تھا کہ اسے اب کیزوینی واپس جانا چاہیے۔ جسٹس نے ایک نوجوان عورت سے تعلقات استوار کر لیے تھے اور میں جانتا تھا کہ وہ واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ ناظم کے چلے جانے کے بعد اس کے ایک ہیڈ مین بینگن داود نے جسٹس کے خلاف کاروائی شروع کر دی اور جب سے مقامی کمشنر کے سامنے پیش ہونے کو کہا گیا تو میں نے اس کی مدد کرنے کی ہامی بھر لی۔ سماعت کے دوران میں نے یہ نکتہ اٹھایا کہ جسٹس بالغ ہے اور وہ صرف اس بنا پر اب کیزوینی واپس جانے کا پابند نہیں کہ اس کے باپ نے یہ حکم دیا تھا۔ جب بینگن داود کے بات کرنے کی باری آئی تو اس نے میری اس دلیل کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ میری نسلی وفاداریوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس نے مجھے میرے خیلی نام مادیبا سے مخاطب کیا جس کا مقصد مجھے میرا تھیمبو ورثہ یاد دلانا تھا۔ اس نے کہا، مادیبا ناظم نے تمہاری پرورش کی، تمہیں تعلیم دلائی اور تم سے اپنے بیٹے کا سا برتاؤ کیا۔ اب تم اس کے حقیقی بیٹے کو اس سے دور رکھنا چاہتے ہو۔ یہ اس شخص کی خواہشات کے برعکس ہے جو تمہارا وفادار سرپرست رہ ہے اور اس راہ عمل کے برعکس ہے جو اس نے جسٹس کے لیے تجویز کر رکھی ہے۔

بینگن داود کی تقریر میرے دل کو لگی۔ جسٹس کی تقدیر میری تقدیر سے مختلف تھی۔ وہ ایک چیف کا بیٹا تھا اور اپنے استحقاق سے مستقبل کا چیف تھا۔ سماعت کے بعد میں نے جسٹس کو بتایا کہ میں نے اپنا ذہن بدل لیا ہے اور میرا خیال ہے کہ تمہیں واپس جانا چاہیے۔ میرے اسے ردعمل کو ناقابل فہم گردانتے ہوئے اس نے میری بات سننے سے انکار کر دیا۔ اس نے جوہانسبرگ میں ٹھہرنے کا تہیہ کر لیا اور اپنی

دوست کو بھی میرے مشورے سے آگاہ کر دیا کیونکہ اسکے بعد سے اس کی گرل فرینڈ نے مجھ سے کبھی بات نہ کی۔

لیسوتھو کی ملکہ سے ملاقات۔

1942ء کا آغاز ہوا تو میں رقم بچانے اور ڈاؤن ٹاؤن جوہانسبرگ سے قریب تر ہونے کے لیے روما خاندان کے کمرے سے ڈبلیو این ایل اے کمپاؤنڈ میں منتقل ہو گیا۔ مسٹر فیسٹائل، چیمبر آف مائنز کے اندونا، نے اس سلسلے میں میری مدد کی جو ایک بار پھر میری زندگی میں فیصلہ کن کردار ادا کر رہے تھے۔ اس نے اپنی صوابدید سے مجھے مائننگ کمپاؤنڈ میں مفت رہائش کی پیش کش کرنیکا فیصلہ کیا تھا۔

ڈبلیو این ایل اے کمپاؤنڈ جدید شہری جنوبی افریقہ کا ایک کثیر نسلی اور کثیر لسانی معاشرہ تھا۔ وہاں سوتھو، تسوانا، وینڈا، زولو پیڈی شانگان، نمبین، موزمبیقن، سوازی اور رہو سا سبھی قبیلوں کے افراد تھے۔ بہت کم انگریزی بولتے تھے اور ان کی مشترکہ زبان کئی زبانوں اور بولیوں کا آمیختہ تھی جسے فینا گالو کہتے تھے۔ وہاں نہ صرف میں نے نسلی عصبیت کے مظاہرے دیکھے بلکہ ہم آہنگی کا بھی مشاہدہ کیا جو مختلف پس منظر کے لوگوں کے درمیان ممکن تھی۔ اس کے باوجود میں پانی سے باہر آئی ہوئی مچھلی کی مانند تھی۔ زیر زمین اپنے دن گزارنے کے بجائے میں پڑھائی کر رہا تھا یا ایک لاء فرم میں کام کر رہا تھا جہاں واحد جسمانی سرگرمی ادھر ادھر کے کام یا ایک کیبنٹ میں فائلیں رکھنا تھی۔

چونکہ ڈبلیو این ایل اے شہر آنے والے چیفس کے لیے رہائشی مقام تھا۔ مجھے تمام جنوبی افریقہ سے آنے والے قبائلی رہنماؤں سے ملاقات کا موقع مل جاتا تھا۔ مجھے ایک ایسے ہی موقع پر بسوتو لینڈ یا موجودہ لیسوتھو کی ملکہ ناظمہ مانٹسیبو موشویشوی سے ایک ملاقات یاد آتی ہے۔ اس کے ہمراہ دو چیفس تھے اور دونوں سابا تا کے باپ جو نگل زوی کو جانتے تھے۔ میں نے ان سے جونگل زوی پوچھا اور جب انہوں نے

اسکے ابتدائی برسوں کی رنگین داستانیں سنانی شروع کیں تو گھنٹے تک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں واپس تھیمبو لینڈ میں پہنچ گیا ہوں۔

ملکہ نے مجھ پر خصوصی توجہ دی اور ایک مرحلے پر براہ راست مجھ سے مخاطب ہوئیں مگرانہوں نے سیسوتھو میں بات کی جس کے چند الفاظ ہی میں جانتا تھا۔سیسوتھو ،سوتھو اور تسوانا لوگوں کی زبان ہے جن کی بڑی تعداد ٹرانسوال اور اورنج فری سٹیٹ میں رہتی ہے۔ملکہ نے بے یقینی کی کیفیت میں میری طرف دیکھا اور پھر انگریزی میں کہا:تم کس طرح کے قانون دان اور رہنما بنو گے جو اپنی قوم کی زبان نہیں بول سکتے۔مجھ سےکوئی جواب نہ بن پڑا۔اس سوال نے مجھے اضطراب اور سنجیدگی سے دوچار کر دیا۔اس نے مجھے قبائلی عصبیت کا احساس دلایا نیز اس فکر سے بہرہ ور کیا کہ میں نے اپنی قوم کی خدمت کرنے کے فریضے کے لیےکوئی تیاری نہیں کی ہے۔میں غیر شعوری طور پر سفید حکومت کی پیدا کردہ نسلی تقسیم کا اسیر ہو گیا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اپنے اعزہ و اقارب سے کس طرح بات کرنی چاہیے۔زبان کے بغیر ایک شخص قوم سے بات کر سکتا ہے نہ ان کی بات سمجھ سکتا ہے۔وہ ان امیدوں اور آرزوں میں حصہ نہیں لے سکتا،ان کی تاریخ کا شعور حاصل نہیں کر سکتا،ان کی شاعری کی ستائش نہیں کر سکتا اور ان کے گیتوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔مجھے دوبارہ احساس ہوا کہ ہم مختلف زبانوں والے مختلف لوگ نہیں بلکہ مختلف بولیوں والی ایک قوم ہیں۔

میرے سرپرست کی رحلت

ناظم کی جوہانسبرگ آمد کے چھ ماہ بعد جسٹس کو اور مجھے اطلاع ملی کہ اس کا باپ 1942ء کی سردیوں میں فوت ہو گیا ہے۔جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تو وہ خستہ دکھائی دیتا تھا،چنانچہ اس کی موت کسی بڑی حیرت کا باعث نہ تھی۔ہم نے اس کی موت کا اخبار میں پڑھا کیونکہ جسٹس کو جو تار بھیجا گیا تھا وہ غلط پہنچ گیا تھا۔ہم فوراً ٹرانسکائی روانہ ہو گئے اور ناظم کی تدفین کے اگلے دن وہاں پہنچے۔

اگرچہ ناظم کی تدفین میں شرکت کا موقع نہ ملنے پر میں دل شکستہ تھا، اندر سے میں خوش تھا کہ اس کی موت سے پہلے میرے بارے میں اس کی کدورت دور ہو گئی تھی۔ پھر بھی احساس جرم مجھے کچوکے دیتا تھا۔ مجھے ہمیشہ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب میرے اور اسکے درمیان مغائرت حائل ہو گئی تھی۔ یہ احساس دامنگیر تھا کہ میرے تمام دوست میرا ساتھ چھوڑ سکتے ہیں۔ میرے تمام منصوبے ناکام ہو سکتے ہیں، میری تمام امیدیں نقش بر آب ثابت ہو سکتی ہیں مگر ناظم کبھی میرا ساتھ نہیں چھوڑے گا، تاہم میں نے اسے ٹھکرا دیا تھا اور مجھے شبہ ہوا کہیں میری بے وفائی نے اسے جلد موت کی طرف تو نہیں دھکیل دیا۔

ناظم کی رحلت نے ایسے روشن خیال اور متحمل مزاج انسان کو منظر عام سے ہٹا دیا جس نے وہ مقصد حاصل کیا جو تمام بڑے رہنماؤں کی زندگیوں کا خاصہ ہے۔ اس نے اپنی قوم کو متحد رکھا تھا۔ آزاد خیال اور قدامت پسند، روایت پرست اور اصلاح پسند، سفید پوش افسران اور زیلی پوش کان کن سب اس کے وفادار تھے۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ ہمیشہ اس سے متفق تھے بلکہ اس وجہ سے کہ ناظم مخالف آراء کو سنتا اور ان کا احترام کرتا تھا۔

ایک بار پھر گاؤں میں

ناظم کی تدفین کے بعد میں نے تقریباً ایک ہفتہ اتحی کیزوینی میں گزارا اور یہ دن میرے لیے یاد ماضی اور دریافت نو کے تھے۔ ایک ایسے مقام کی طرف مراجعت جو غیر متغیر رہا ہو، اور وہاں وہی اور وہاں وہی طور طریقے دیکھنا جو آپ کی زندگی سے خارج ہو چکے ہوں، چیزے دگر ہے۔ گریٹ پلیس یعنی عظیم مقام وہی آن بان رکھتا تھا اور اس دورے کسی طرح مختلف نہ تھا جب میں نے وہاں پرورش پائی تھی۔ لیکن وہاں چند روز رہ کر میں نے محسوس کیا کہ میرا اپنا نقطۂ نظر اور عالمی نقطہ ہائے نظر ارتقا پزیر ہو گئے ہیں۔ اب مجھے سول سروس کا پیشہ اپنانے پر شعبہ مقامی امور میں ترجمان

بننے میں کوئی کوشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اب مجھے اپنا مستقبل تھیمبو لینڈ اورٹرانسکائی سے بندھا نظر نہیں آتا تھا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ میری رہوسا زبان خالص نہیں رہی اور اب وہ زولو سے متاثر ہے جو ریف کی غالب زبانوں میں سے ایک تھی۔ جوہانسبرگ میں میری زندگی، گاؤر راڈیے جیسے آدمیوں سے شناسائی اور لافرم میں میرے تجربات نے اعتقادات کو شدید متاثر کیا تھا۔ میں نے مڑکر اس نوجوان کو دیکھا جو ایک سادہ لوح دیہاتی کی حیثیت سے انجی کیزوینی سے نکل آیا تھا اور جس نے دنیا کو بہت کم دیکھا تھا۔ اب مجھے یقین تھا کہ میں چیزوں کو اسی طرح دیکھنے لگا ہوں جس طرح کہ وہ ہیں، تاہم یہ بھی ایک سراب تھا۔

میں ابھی تک اپنے دماغ اور اپنے دل کی داخلی کشاکش کو محسوس کرتا تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ میں ایک تھیمبو ہوں اور اسی حیثیت سے میری پرورش ہوئی اور مجھے اسکول بھیجا گیا تاکہ میں تھیمبو بادشاہت کے تسلسل میں ایک خاص کردار ادا کرسکوں۔ کیا میرے بزرگوں کی طرف سے مجھ پر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا؟ میرے والد کی طرف سے جنہوں نے مجھے ناظم کی سرپرستی میں دیا تھا؟ خود ناظم کی طرف سے جنہوں نے ایک باپ کی طرح میرا خیال رکھا تھا؟ لیکن میرا دماغ کہتا تھا کہ یہ ہر آدمی کا حق ہے کہ وہ جیسے اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کرے اور زندگی میں رول منتخب کرے۔ کیا مجھے اپنے چناؤ کرنے کی اجازت نہیں تھی؟

جسٹس کے حالات میرے حالات سے مختلف تھے اور ناظم کی وفات کے بعد اس پر اہم نئی ذمے داریاں آن پڑی تھیں۔ اسے چیف کی حیثیت سے ناظم کا وارث بننا تھا اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ انجی کیزوینی میں رہ کر اپنا پیدائشی حق حاصل کرے گا۔ مجھے جوہانسبرگ لوٹنا تھا اور میں رسم جانشینی میں شرکت کے لیے بھی نہ ٹھہر سکا۔ میری زبان میں ایک کہاوت ہے۔

میں نے بہت سے مشورہ دریا پار کیے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کہنے والے

نے بڑا فاصلہ طے کیا ہے، یہ کہ اسے بڑا تجربہ ہوا ہے اور اس نے سفر سے بہت سوجھ بوجھ حاصل کی ہے۔

جب میں اکیلا جوہانسبرگ لوٹا تو مجھے اس کہاوت کا خیال آیا۔ 1934ء سے میں نے اپنی سرزمین میں بہت سے اہم دریا پار کیے تھے۔ ہیلڈ ٹاؤن کے راستے میں دریائے امباشے اور دریائے گریٹ کائی اور جوہانسبرگ کے راستے میں دریائے اورنج اور دریائے وا آل۔ لیکن ابھی مجھے بہت سے دریا عبور کرنے تھے۔

میں گریجوایٹ بن گیا

1942ء کے آخر میں، میں نے بی اے کی ڈگری کا آخری امتحان پاس کرلیا۔ اب میں نے وہ رینک حاصل کرلیا تھا جو کبھی میرے نزدیک بہت اعزاز کی بات تھی۔ میں بی اے پاس کرلینے پر پھولا نہ سماتا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ ڈگری آسان کامیابی کے لیے کوئی طلسم ہے نہ کوئی پاسپورٹ۔

فرم میں، میں گاؤر کے نزدیک تر ہوگیا تھا اور یہ مسٹر سائڈل سکائی کے لیے بڑے اشتعال کی بات تھی۔ گاؤر بحث کرتا کہ تعلیم ہماری ترقی کے لیے ضروری ہے لیکن وہ اس نکتے پر زور دیتا کہ کسی قوم نے صرف تعلیم کے ذریعے اپنے آپ کو آزاد نہیں کرایا۔ تعلیم بہت اچھی چیز ہے۔ گاؤر کہتا۔ لیکن اگر ہم تعلیم پر انحصار کرتے رہے تو ہمیں اپنی آزادی کے لیے ایک ایک ہزار برس انتظار کرنا ہوگا۔ ہم غریب ہیں، ہمارے پاس استاد تھوڑے ہیں اور اسکول تو بہت کم ہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو تعلیم دینے کا بھی اختیار نہیں۔

گاؤر نظریات گھڑنے کی بجائے حل تلاش کرنے پر یقین رکھتا تھا۔ وہ زور دے کر کہتا کہ افریقیوں کے لیے تبدیلی کا انجن افریقن نیشنل کانگرس ہے اور اس کی پالیسیاں جنوبی افریقہ اس اقتدار حاصل کرنے کا بہترین راستہ ہیں۔ وہ تبدیلی کی حمایت کرتے ہوئے اے این سی کی طویل تاریخ پر زور دیتا اور توجہ دلاتا کہ اے این

سی اس ملک میں قدیم ترین قومی افریقی تنظیم ہے جس کی بنیاد 1912ء میں رکھی گئی۔ اس کا دستور نسل پرستی کی مذمت کرتا تھا، اس کے صدر مختلف قبائلی گروہوں سے رہے تھے اور یہ افریقیوں کے جنوبی افریقہ کے مکمل شہری ہونے کا پرچار کرتی تھی۔

گاؤر کی رسمی تعلیم سے محرومی کے باوجود وہ علم کے تقریباً ہر دائرے میں مجھ سے برتر تھا۔ لنچ کے دوران وہ اکثر بے ساختہ لیکچر دیتا۔ وہ مجھے پڑھنے کے لیے کتابیں دیتا، لوگوں سے گفتگو کرنے کے لیے نام تجویز کرتا اور مجھے میٹنگز میں شرکت پر آمادہ کرتا۔ فورٹ ہیر میں، میں نے جدید تاریخ کے دو کورس لیے تھے اور اگرچہ میں کئی حقائق جانتا تھا مگر گاؤر مخصوص واقعات کے اسباب کی توضیح کرسکتا تھا اور وہ وجوہات بیان کرسکتا تھا جو افراد اور اقوام کے عروج و زوال میں کارفرما رہی تھیں۔ میں محسوس کرتا تھا جیسے میں تاریخ کو از سرِ نو سیکھ رہا تھا۔

جس چیز نے مجھ پر سب سے گہرا اثر کیا وہ گاؤر کا آزادی کی جدوجہد سے اخلاص تھا۔ وہ آزادی کی طلب میں جیتا اور سانس لیتا تھا۔ وہ بعض اوقات ایک دن میں کئی اجلاسوں میں شرکت کرتا جہاں وہ ایک نمایاں مقرر ہوتا۔ یوں لگتا تھا وہ انقلاب کے سوا کسی چیز کا نہیں سوچتا۔

افریقن نیشنل کانگریس کے جلسوں میں

میں گاؤر کے ساتھ ٹاؤن شپ ایڈوائزری بورڈ اور اے این سی دونوں کے اجلاسوں میں گیا۔ میں ایک شریک اجلاس کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مشاہدہ کرنے والے کے طور پر گیا تھا کیونکہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں کبھی تقریر بھی کروں گا۔ میں زیر بحث معاملات کو سمجھنا چاہتا تھا۔ دلائل کا جائزہ لینا چاہتا تھا اور سرگرم افراد کا معیار دیکھنا چاہتا تھا۔ مشاورتی بورڈ کے اجلاس بے پروائی لیے ہوئے اور افسر شاہانہ تھے لیکن اے این سی کے اجلاس پارلیمنٹ، پاس قوانین، محاصل، بسوں

کے کرائے گویا سورج کے نیچے ہر اس موضوع پر بحث مباحثے سے بھرپور ہوتے تھے جو افریقیوں کو متاثر کرتا تھا۔

اگست 1943ء میں، میں نے گاؤر اور دس ہزار دیگر افراد کے ساتھ الیگزینڈرا بس بائیکاٹ کی حمایت میں مارچ کیا۔ یہ کرائے چار پنس سے پانچ پنس تک بڑھا دینے کے خلاف احتجاج تھا۔ گاؤر اس مہم کے لیڈروں میں شامل تھا اور میں نے پہلی بار اس کو برسرعمل دیکھا۔ اس مہم کا مجھ پر بے حد اثر ہوا۔ ایک طرح سے میں آبزرور کا رول چھوڑ کر اب شریک تحریک بن گیا تھا۔ مجھے اب پتہ چلا کہ اپنی قوم کے ساتھ مارچ کرنا بڑے اعزاز اور جذبے کی بات ہے۔ لیکن میں بائیکاٹ کے موثر ہونے سے بھی بڑا متاثر ہوا۔ یہ بائیکاٹ نو دن جاری رہا تھا اور اس دوران بسیں خالی دوڑتیں پھرتی تھیں، چنانچہ کمپنی نے کرایہ دوبارہ چار پنس کر دیا۔

فرم میں صرف گاؤر ہی نہیں تھا جس کے خیالات پر میں توجہ دیتا تھا۔ ایک گورا اسٹیٹ ایجنٹ ہانس ملر جو مسٹر سائڈل سکائی کے ساتھ مل کر کاروبار کرتا تھا، وہ مجھے بحث و تمحیص میں مشغول کر لیتا تھا۔ وہ ایک خالص کاروباری آدمی تھا، جو دنیا کو طلب اور رسد کے آئینے میں دیکھتا تھا۔ ایک روز مسٹر ملر نے کھڑکی کے باہر اشارہ کرتے ہوئے کہا، دیکھو نیلسن، کیا تمہیں وہ مرد اور عورتیں نظر آتے ہیں جو بازار میں تیز تیز آ جا رہے ہیں، وہ کس چیز کا تعاقب میں ہیں؟ وہ کس لیے اس جنونی انداز میں کام کر رہے ہیں؟ میں تمہیں بتاتا ہوں، وہ سب استثنا کے بغیر، دولت اور پیسے کے پیچھے ہیں کیونکہ دولت اور پیسہ خوشی کے مترادف ہیں۔ تمہیں بھی اسی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ پیسے اور صرف پیسے کے لیے۔ جب تمہارے پاس کافی پیسہ ہوگا تو تمہیں زندگی میں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہے گی۔

ولیم سمتھ ایک رنگ دار آدمی تھا جو افریقی جائیداد کی خرید و فروخت وغیرہ کا کام کرتا تھا۔ وہ اکثر ہمارے دفتر کے آس پاس ملتا۔ وہ آئی سی یو یعنی انڈسٹریل اینڈ

کمرشل ورکرز یونین کا عہدیدار تھا جو جنوبی افریقہ کی پہلی سیاہ فام یونین تھی جس کی بنیاد کلیمنٹس کادالی نے رکھی تھی مگر اس کے بعد سے اس کے نظریات ڈرامائی طور پر تبدیل ہو گئے تھے، نیلسن وہ کہتا، میں طویل عرصہ سیاست میں ملوث رہا ہوں اور مجھے اس پر بہت افسوس ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے بہترین سال مغرور اور خود غرض لوگوں کی خدمت کرتے ہوئے بے مقصد کوششوں میں گزار دیئے۔ وہ اپنے مفادات کو ان لوگوں کے مفادات پر ترجیح دیتے تھے جنکی خدمت کا وہ دعویٰ کرتے تھے۔ میرا تجربہ ہے کہ سیاست غریبوں سے پیسے بٹورنے کے ہتھکنڈے کے سوا کچھ نہیں۔

مسٹر سائیڈل سکائی ان بحثوں میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ وہ سیاست پر بحث کرنے کو اسی طرح تضیع اوقات سمجھتے تھے جس طرح سیاست میں حصہ لینے کو۔ بار بار وہ مجھے سیاست سے احتراز کرنے کا مشورہ دیتے۔ وہ مجھے گاؤر اور والٹر سیسولو کے متعلق متنبہ کرتے۔ یہ لوگ تمہارا دماغ خراب کر دیں گے، نیلسن، وہ پوچھتے۔ کیا تم ایک قانون دان نہیں بننا چاہتے، میں کہتا، ہاں بننا چاہتا ہوں۔ وہ کہتے، اور اگر تم ایک قانون دن بننا چاہتے ہو تو کیا ایک کامیاب قانون دان نہیں بننا چاہتے۔ میں پھر کہتا ،ہاں، وہ کہتے اچھا اگر تم سیاست میں پڑ گئے تو تمہاری پریکٹس متاثر ہوگی۔ تمہیں ان احکام کی طرف سے مشکلات درپیش ہوں گی جو اکثر تمہارے کام میں تمہارے معاون ہو سکتے ہیں۔ تم اپنے تمام موکل کھو بیٹھو گے۔ تم دیوالیہ ہو جاؤ گے، تمہارا خاندان ٹوٹ پھوٹ جائیگا اور تمہارا خاتمہ جیل میں ہوگا۔ یہ حشر ہوگا اگر تم سیاست میں پڑ گئے۔

میں ان لوگوں کی باتیں سنتا اور ان کے خیالات کا احتیاط سے جائزہ لیتا۔ ان تمام دلائل میں کچھ نہ کچھ وزن ہوتا تھا۔ میں پہلے ہی دن سے کسی نہ کسی طرح سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگا تھا لیکن میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ چنانچہ میں

حاشیہ پر منڈلاتا رہتا، مجھ پر ایک طرح کی بے یقینی طاری تھی۔

جہاں تک میرے پیشے کا تعلق تھا۔ وہ گاؤر جو مجھے مشورہ دینے سے آگے بڑھ کر عملی کام بھی کرتا تھا۔ 1943ء کے اوائل میں ایک روز، جب مجھے فرم میں کام کرتے دو سال سے کچھ کم عرصہ ہوا تھا، اس نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔ میرے ساتھی جب تک مے یہاں ہوں، وہ تمہیں کبھی قانون کی سند نہیں دیں گے خواہ تمہارے پاس ڈگری ہو یا نہ ہو۔

میں چکرا گیا اور میں نے گاؤر سے کہا کہ اس کی یہ بات درست نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ تو ایک قانون دان کی تربیت نہیں لے رہا تھا۔ اس سے فرق نہیں پڑتا، نیلسن، اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس گاؤر جو ہے، وہ لوگوں کو قانون کی بات سمجھا سکتا ہے۔ پھر ہمیں کسی اور کی کیا ضرورت ہے؟ گاؤر جو ہے، وہ لوگوں کو قانون کی بات سمجھا سکتا ہے۔ پھر ہمیں کسی اور کی کیا ضرورت ہے؟ گاؤر پہلے ہی فرم کے پاس موکل لا رہا ہے۔

لیکن وہ یہ بات تمہارے روبرو نہیں کہیں گے۔ وہ تمہارے معاملے میں بس تاخیر کرتے رہیں گے۔ اس ملک میں ہماری جدوجہد کے مستقبل کے لیے ضروری ہے کہ تم ایک قانون دان بن جاؤ۔ اس لیے میں فرم کو چھوڑ رہا ہوں اور اپنی ایک اسٹیٹ ایجنسی قائم کرنے لگا ہوں۔ جب میں چلا جاؤں گا تو وہ تمہیں قانون کی سند دینے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں پائیں گے۔

میں نے اس سے درخواست کی کہ استعفا نہ دے لیکن وہ اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا۔ چند روز بعد اس نے اپنا استعفا مسٹر سائڈل سکائی کے حوالے کر دیا۔ اور پھر مسٹر سائڈل سکائی نے مجھے سند دے دی جیسا کہ انہوں نے وعدہ کر رکھا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا گاؤر کے استعفا سے کوئی تعلق تھا یا نہیں، تاہم اس کا استعفا اس کی دریا دلی کی ایک اور مثال تھی۔

ادھار کا سوٹ

1943ء کے اوائل میں یو این آئی ایس کے ذریعے امتحان پاس کرنے کے بعد میں اپنی گریجویشن تقریب کے لیے فورٹ ہیئر واپس گیا۔ یونیورسٹی جانے سے پہلے میں نے ایک مناسب سوٹ سلوانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے لیے مجھے والٹر میسولو سے رقم ادھار لینی پڑی۔ جب میں فورٹ ہیئر میں داخل ہوا تھا تو ناظم نے مجھے نیا سوٹ لے کر دیا تھا اور اب جب میں دوبارہ وہاں جا رہا تھا تو پھر میرے پاس نیا سوٹ تھا۔ میں نے یونیورسٹی کا مخصوص لباس اپنے دوست اور یونیورسٹی کے ساتھی رینڈال پٹینی سے مستعار لے لیا۔

میرا بھتیجا کے ڈی ماتنزیما، جو مجھ سے کئی سال پہلے گریجوایشن کر چکا تھا، میری ماں اور نیو انگلینڈ یعنی ناظم کی اہلیہ دونوں کو اس تقریب میں لایا۔ میں اپنی والدہ کو وہاں دیکھ کر بڑا ممنون ہوا لیکن نیو انگلینڈ کی آمد سے مجھے یوں لگا جیسے خود ناظم اس موقع پر مجھے عزت بخشنے آ گیا ہو۔

گریجوایشن تقریب کے بعد چند روز میں نے والی دونگا کے ساتھ قماطہ میں اس کے گھر میں گزارے، والی وونگا کے ڈی کا خیلی نام تھا۔ اور میں اسے اسی نام سے پکارتا تھا۔ اسنے پہلے ہی روایتی قیادت کا راستہ چن لیا تھا۔ وہ ایمیگر ینٹ تھیمبو لینڈ کا سربراہ بننے کے لیے وراثتی قطار میں تھا جو ٹرانسکائی کے انتہائی مغربی حصے میں واقع ہے۔ اور جب میں والی وونگا کے ہاں مقیم تھا۔ تو اس نے مجھ پر زور دیا کہ میں وکالت پاس کرنے کے بعد اتماتا واپس آ جاؤں۔ تم جوہانسبرگ میں کیوں ٹھہرے ہوئے ہو اس نے کہا، یہاں تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔

یہ اچھا خیال تھا، ٹرانسکائی کے مقابلے میں ٹرانسوال میں پیشہ ور افریقی یقیناً زیادہ تھے۔ میں نے والی وونگا کو بتایا کہ اس کا مشورہ نیم پختہ ہے۔ لیکن اپنے دل میں، میں جانتا تھا کہ میرا مرکز وفاداری کہیں اور منتقل ہو رہا ہے۔ گاؤر اور والٹر کی دوستی

کے ذریعے میں اب یہ سمجھنے لگا تھا بلکہ مجھ پر پوری قوم کی طرف سے فرض عائد ہوتا ہے،صرف ایک مخصوص طبقے یا شاخ کی طرف سے نہیں۔ میں محسوس کرتا تھا کہ میری زندگی میں تمام لہریں مجھے ٹرانسکائی سے اٹھا کر اس مرکز کی طرف لیے جارہی ہیں جہاں علاقائی اور نسلی وفاداریاں ایک مشترک مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

فورٹ ہیئر کی گریجوایشن تقریب نے مجھے خود غور و فکر کے لمحات فراہم کر دیے تھے۔ میں اپنے پرانے مفروضات اور اپنے حقیقی تجربات کے درمیان خلا میں معلق تھا۔ میں نے اپنا پہلا مفروضہ مسترد کر دیا تھا کہ گریجوایٹ خود بخود لیڈر بن جاتے ہیں اور یہ کہ تھیمبو شاہی خانوادے سے تعلق میرے لیے اعزاز و احترام کی سند ہے۔ایک کامیاب کیریئر اور ایک آرام دہ تنخواہ اب میرے حتمی مقاصد نہیں تھے۔ میں نے اپنے آپ کو سیاست کی دنیا میں کھنچے جاتے محسوس کیا کیونکہ میں اپنے پرانے نظریات سے مطمئن نہیں تھا۔

لافیکلٹی میں واحد کالا

جوہانسبرگ میں، میں ان حلقوں میں آتا جاتا تھا جو اعلیٰ تعلیمی اعزازات کے بجائے عقل سلیم اور عملی تجربات کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ جب میں اپنی ڈگری کے حصول تک و دو میں تھا، اس وقت بھی مجھے احساس تھا کہ یونیورسٹی میں، میں نے جو کچھ سیکھا ہے اس کا میرے نئے ماحول سے بمشکل ہی کوئی تعلق بنتا ہے۔ یونیورسٹی میں اساتذہ نسلی تشدد افریقیوں کے لیے مواقع کی کمی اور سیاہ فاموں کو مطیع بنانے کے لیے وضع کیے گئے قوانین وضوابط جیسے موضوعات سے کنی کترا جاتے تھے لیکن جوہانسبرگ کی زندگی میں میرا ان باتوں سے روزانہ واسطہ پڑتا تھا۔کبھی کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ نسلی تعصب کی برائیاں دور کرنے کے لیے کیا کیا جائے اور اس سلسلے میں عملی تجربہ ہی میرا رہنما تھا۔

جب 1943ء کے شروع میں، میں جوہانسبرگ واپس آیا میں نے بےچلر آف

لا ڈگری کے لیے یونیورسٹی آف دوواٹرسرانڈ میں داخلہ لے لیا جوایک قانون دان کے لیے ابتدائی اکیڈمک تربیت تھی۔یہ یونیورسٹی جومختصراوٹس کہلاتی ہے شمال وسطی جاہانسبرگ میں برامفونٹائن میں واقع ہے اور بہت سے لوگ اسے جنوبی افریقہ میں پریمیر انگلش سپیکنگ یونیورسٹی سمجھتے ہیں۔

لافرم میں کام کرتے ہوئے مجھے پہلی بار سفید فاموں سے باقاعدہ رابطے کا موقع ملا تھا۔اب یونیورسٹی نے میری عمر کے گوروں کے ایک گروہ سے مجھے متعارف کرایا۔فورٹ ہیئر میں رہوڈز یونیورسٹی گراہمز ٹاؤن کے گورے طلبہ سے کبھی کبھار رابطہ ہوجاتا تھالیکن وٹس میں، میں گورے طلبہ کے ساتھ کلاسوں میں پڑھتا تھا۔یہ ان کے لیے بھی اتنی ہی نئی بات تھی جتنی میرے لیے کیونکہ لافیکلٹی میں، میں واحد افریقی طالب علم تھا۔

جنوبی افریقہ کی انگلش سپیکنگ یونیورسٹیاں آزاد قدروں کی سب سے بڑی تربیت گاہ تھیں۔ان کا یہ پہلو باعث تحسین تھا کہ وہ کالے طالب علموں کو داخلہ دیتی تھیں۔افریکان یعنی گوروں کے لیے مخصوص یونیورسٹیوں میں یہ بات ناقابل تصور تھی۔

گورے ہمیں ''کافر'' سمجھتے تھے

یونیورسٹی کی آزاد قدروں کے باوجود مجھے وہاں کبھی مکمل آرام وسکون کا احساس نہ ہوا۔ہمیشہ میراوہاں ایک ہی افریقی ہونا۔خدمتگاری کے کاموں سے قطع نظر ایک عجیب مخلوق کے طور پر بہترین اور مداخلت کار کالے کے طور پر بدترین قرار پانا کوئی خوشگوار تجربہ نہیں تھا۔میرے طور اطوار کی ہمیشہ نگرانی کی جاتی تھی اور مجھے دریا دلی اور رعنا دونوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔اگرچہ چند ہمدرد سفید فاموں کا گروہ بھی تھا جو میرے دوست اور بعد میں شریک کار بن گئے۔وٹس کے اکثر گورے لبرل یا نسلی امتیاز سے میرا نہ تھے۔مجھے یاد ہے کہ ایک روز میں لیکچر میں چند منٹ دیر سے گیا اور

سارل نکھی کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ میرا یہ کلاس میٹ بعد میں یونائیٹڈ پارٹی کے ٹکٹ پر رکن پارلیمنٹ بنا۔ اگر چہ لیکچر پہلے ہی شروع ہو چکا تھا اور صرف چند ہی نشستیں خالی تھیں۔ اس نے برملا اپنی چیزیں سمیٹیں اور مجھ سے پرے جا کر ایک نشست پر بیٹھ گیا۔ گوروں کی طرف سے اس طرح کا رویہ معمول کی بات تھی۔ کوئی اپنے منہ سے لفظ ''کافر'' ادا نہیں کرتا تھا۔ ان کا عناد پوشیدہ تھا مگر مجھے اس کا فوری احساس ہو جاتا۔ یاد رہے یورپ کے مسیحی آباد کار جنوبی افریقہ کے سیاہ فاموں کو ''کافر'' یعنی بے دین کہتے تھے، حالانکہ ان میں بہتیرے دیندار یعنی مسلمان بھی تھے۔ ظاہر ہے انہوں نے یہ اصطلاح عرب مسلمانوں سے لی تھی جو خود ان پر ٹھیک بیٹھتی تھی مگر نفرت کے اظہار کے لیے وہ اسے سیاہ فاموں پر چسپاں کرنے لگے تھے۔ مترجم)

ہمارے لا پروفیسر مسٹر ہابلوسخت اور جنونی قسم کے تھے جو اپنے طلبہ کی طرف سے زیادہ آزادی برداشت نہیں کرتے تھے۔ قانون کے حوالے سے عورتوں اور افریقیوں کے بارے میں ان کا نقطہ نظر عجیب وغریب تھا۔ وہ کہتے تھے کہ عورتیں اور افریقی قانون دان بننے کے لیے پیدا نہیں ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ قانون ایک سوشل سائنس ہے اور عورتیں اور افریقی نظم وضبط کے اتنے پابند نہیں ہوتے کہ قانون کی باریکیوں پر حاوی ہو سکیں۔ ایک بار انہوں نے مجھ سے کہا کہ تمہیں وٹس میں نہیں ہونا چاہیے بلکہ یو این آئی ایس اے میں ڈگری کے لیے تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ اگر چہ مجھے ان کے خیالات سے اتفاق نہیں تھا مگر میں نے ان کو غلط ثابت کرنے کے لیے بھی کچھ نہ کیا۔ قانون کے طالب علم کی حیثیت سے میری کارکردگی نہایت بری رہی۔

ہندوستانیوں سے دوستیاں

وٹس میں میری کئی افراد سے ملاقاتیں ہوئیں جو آزادی کی جدوجہد کے نشیب و

فراز میں میرے ساتھ رہے اور ان کے بغیر اس میدان میں کوئی خاص معرکہ انجام نہیں دے سکتا تھا۔ کئی سفید طلبہ نے معمول سے ہٹ کر مجھے احساس دلایا کہ وہ مجھے خوش آمدید کہتے ہیں۔ وٹس میں پہلی ٹرم کے دوران میں سلاوو اور اس کی مستقبل کی بیوی روتھ فرسٹ سے ملا۔ جن لوگوں سے ملا ہوں، جو سلاوو ان میں سب سے تیز دماغ اور ذہن رسا رکھتا تھا۔ وہ ایک پکا کمیونسٹ تھا اور اونچے عزائم رکھنے کے لیے معروف تھا۔ روتھ سماجی سرگرمیوں کی رسیا اور ایک اچھی قلمکار تھی۔ دونوں جنوبی افریقہ آ بسنے والے یہودی والدین کے بچے تھے۔ وہیں جارج بازوس اور برام فشر سے میری عمر کی دوستی استوار ہوئی۔ جارج یونانی والدین کا بیٹا تھا جو ہمدرد طبیعت اور ذہن رسا رکھتا تھا۔ برام فشر ایک جز وقتی لیکچرار تھا اور وہ ایک اس کا باپ اورنج فری سٹیٹ کا جج پریذیڈنٹ تھا۔ اگرچہ وہ جنوبی افریقہ کا وزیر اعظم بن سکتا تھا مگر وہ جدوجہد آزادی کا سب سے دلیر اور گہرا دوست بن گیا۔ میں نے ٹونی او ڈوڈ ہیرلڈ وولپ، جولس براڈی اور ان کی بیوی سلمہ سے دوستی کرلی اور یہ سب سیاسی ترقی پسند اور کمیونسٹ پارٹی کے رکن تھے۔

میں نے بہت سے ہندوستانی طلبہ سے بھی قریبی دوستی استوار کرلی۔ اگرچہ فورٹ ہیئر میں مٹھی بھر ہندوستانی طلبہ تھے، وہ ایک الگ ہوسٹل میں رہتے تھے اور میرا ان سے شاذو نادر ہی رابطہ ہوتا تھا۔ وٹس میں، میں اسماعیل میر، جے این سنگھ، احمد بھولا اور رام لعل سے ملا اور انکا دوست بن گیا۔ اس باہم قریبی ربط رکھنے والی برادری کا مرکز اسماعیل کا اپارٹمنٹ کھولو ہاؤس کا فلیٹ نمبر 13 تھا، یہ شہر کے وسط میں ایک رہائشی عمارت کے چار کمرے تھے وہاں ہم مطالعہ کرتے، باتیں کرتے حتیٰ کہ طلوع فجر تک ناچتے اور یہ فلیٹ آزادی کے نوجوان مجاہدوں کا ایک طرح کا ہیڈکوارٹر تھا۔ بعض اوقات جب اس قدر دیر ہو جاتی کہ آرلینڈو جانے والی آخری گاڑی پکڑنا بھی ممکن نہ رہتا تو میں وہیں پڑ کر سو جاتا۔

اسماعیل میر اور ''کافر دوست''

روشن دماغ اور سنجیدہ اسماعیل میر، نٹال میں پیدا ہوا تھا اور وٹس کے لا اسکول میں آ کر وہ ٹرانسوال انڈین کانگرس کا ایک کلیدی رکن بن گیا تھا۔ جے این سنگھ ایک ہر دلعزیز، خوبصورت نوجوان تھا جو ہر رنگ و نسل کے لوگوں سے میل جول رکھتا تھا، وہ بھی کمیونسٹ پارٹی کا رکن تھا۔ ایک روز اسماعیل، جے این اور میں کھولو ہاؤس پہنچنے کی جلدی میں تھے اور ہم یہ حقیقت جانتے ہوئے بھی ٹرام میں سوار ہو گئے کہ اگر چہ ہندوستانی اس میں سوار ہو سکتے تھے مگر افریقیوں کے لیے ایسا کرنا ممنوع تھا۔ ٹرام زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ کنڈکٹر جے این اور اسماعیل کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ ان سے کہا ان کے کافر دوست کو ٹرام پر سفر کرنے کی اجازت نہیں۔ جے این اور اسماعیل کنڈکٹر پر برس پڑے اور اسے بتایا کہ تم لفظ کافر کو سمجھتے ہی نہیں اور مجھے اس نام سے پکارنا مجرمانہ فعل ہے۔ کنڈکٹر نے فوراً گاڑی رکوا کر پولیس کا سپاہی طلب کر لیا جس نے ہمیں حراست میں لے لیا۔ وہ ہمیں پولیس اسٹیشن لے گیا اور ہم قانون کی خلاف ورزی کے مجرم ٹھہرے۔ ہمیں اگلے روز عدالت میں پیش ہونے کا حکم ملا۔ اس روز اسماعیل اور جے این نے برام فشر کو تیار کیا کہ وہ ہماری صفائی دے۔ اگلے روز عدالت میں مجسٹریٹ برام فشر کے خاندانی روابط سے مرعوب لگتا تھا۔ ہمیں فوراً رہا کر دیا گیا اور میں نے پہلی بار دیکھا کہ انصاف ہرگز اندھا نہیں تھا۔

وٹس نے مجھ پر ایک نئی دنیا کا انکشاف کیا۔ یہ نظریات، سیاسی عقائد اور مباحثوں کی دنیا تھی۔ ایسی دنیا جہاں لوگ سیاست کے بارے میں بہت جذباتی تھے۔ میں اپنی نسل کے سفید فام اور انڈین دانشوروں میں شامل تھا، یہ نوجوان تھے جنہیں اگلے چند سال کی اہم ترین سیاسی تحریکوں کے پیشرو بننا تھا۔ مجھے پہلی بار میرے ہم عمر ایسے لوگ ملے جو آزادی کی جدوجہد سے پختہ وابستگی رکھتے تھے۔ جو اپنے اضافی استحقاق کے باوجود مظلوموں کی حمایت میں ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔

حصہ سوم :: ایک مجاہد آزادی جنم لیتا ہے

سیاست کے جراثیم

میں حتمی طور پر اس لمحے کا تعین نہیں کر سکتا جب میں سیاست کے کوچے میں داخل ہوا، جب میں جان گیا کہ مجھے اپنی زندگی کی جدوجہد میں گزارنی ہوگی۔ جنوبی افریقہ میں ایک افریقی ہونے کا مطلب ہے کہ وہ اپنی پیدائش کے لمحے سے سیاست زدہ ہے، خواہ وہ اسے تسلیم کرے یا نہ کرے۔ ایک افریقی بچہ جس ہسپتال میں پیدا ہوتا ہے اس کے گیٹ پر لکھا ہوتا ہے۔ افریقن اونلی، اور وہ جس بس میں گھر جاتا ہے، جس علاقے میں رہتا ہے اور جس اسکول میں پڑھتا ہے اگر اسے اسکول میں داخل کرایا جاتا ہے تو ان سب پر افریقینز اونلی کا لیبل چسپاں ہوتا ہے۔

جب وہ بڑا ہوتا ہے تو افریقنز اونلی کام اختیار کر سکتا ہے۔ افریقنز اونلی ٹاؤن شپ میں مکان کرائے پر لے سکتا ہے۔ افریقینز اونلی ریل گاڑی میں سوار ہو سکتا ہے اور اسے دن یا رات کے کسی وقت بھی روکا جا سکتا ہے اور پاس دکھانے کا حکم دیا جا سکتا ہے جس کے بغیر اسے گرفتار کر کے جیل میں ڈالا جا سکتا ہے۔ نسل پرستانہ قوانین و ضوابط اس کی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں جو اس کی افزائش کو روک دیتے ہیں، اس کی صلاحیتوں کو زنگ لگا دیتے ہیں اور اس کی زندگی کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ یہ تھی حقیقت جو ہزاروں طریقوں سے اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتی تھی۔

مجھے کوئی اشارہ غیبی نہیں ہوا تھا، کوئی الہام نہیں ہوا تھا، مجھ پر کوئی حقیقت، آشکار لمحہ وارد نہیں ہوا تھا بلکہ ہزار سسکیوں، ہزار اہانتوں اور ہزار یاد نہ رہنے والے لمحات نے مل جل کر میرے اندر ایک غصہ، ایک بغاوت اور اس نظام کے خلاف لڑنے کی خواہش پیدا کر دی تھی جس نے میری قوم کو غلام بنا رکھا تھا۔ کوئی خاص دن ایسا نہیں آیا تھا جب میں نے کہا ہو کہ آپ سے میں اپنے آپ کو اپنی قوم کی آزادی کے لیے وقف کر رہا ہوں۔ اس کے بجائے میں نے اپنے آپ کو ایسا کرتے ہوئے پایا

اور اس کے برعکس میں کر ہی نہیں سکتا تھا۔

میں نے کئی لوگوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے مجھے متاثر کیا مگر سب سے زیادہ میں والٹر میسولو کے زیر اثر تھا۔ وہ اکثر خاموش رہتا جبکہ دوسرے چلا رہے ہوتے۔ اسے یقین تھا کہ جنوبی افریقہ میں افریقن نیشنل کانگرس ہی کے ذریعے تبدیلی لائی جا سکتی ہے جو سیاہ فاموں کی امیدوں اور آرزووں کا مرکز ہے۔ بعض اوقات ایک شخص ایک تنظیم کا جائزہ ان لوگوں سے لے سکتا ہے جو اس سے تعلق رکھتے ہوں اور میں جانتا تھا کہ مجھے کسی بھی ایسی تنظیم سے وابستہ ہو کر فخر ہوگا جس کا والٹر ایک رکن ہو۔ اس وقت آپشنز منفقود تھے۔ اے این سی واحد تنظیم تھی جو ہر کسی کو خوش آمدید کہتی تھی اور جو ایسے چھتر کے مانند تھے جس کے نیچے تمام افریقی پناہ لے سکتے تھے۔

اتحادیوں کے وعدے

1940ء کے عشرے میں تبدیلی کو ہوائیں چلنے لگیں۔ 1941ء کے اٹلانٹک چارٹر نے، جس پر روزویلٹ اور چرچل نے دستخط کیے تھے، انسانی عظمت پر یقین کی توثیق کر دی اور بہت سے جمہوری اصولوں کا پرچار کیا۔ مغرب میں بعض لوگوں کو اس چارٹر میں خالی وعدے نظر آئے لیکن ہم افریقیوں کے نزدیک یہ امید کی روشنی تھا۔ اٹلانٹک چارٹر اور نازیوں کی دہشت اور مظالم کے خلاف اتحادیوں کی جنگ سے تحریک پا کر اے این سی نے اپنا ایک چارٹر تشکیل دیا جسے افریقن کلیمز کہا گیا اور جو تمام افریقیوں کے لیے مکمل شہریت، زمین خریدنے کے حقوق اور تمام امتیازی قوانین کی واپسی کا مطالبہ کرتا تھا۔ ہمیں امید تھی کہ حکومت اور عام جنوبی افریقی جان لیں گے کہ جن اصولوں کے لیے وہ یورپ میں جنگ لڑ رہے تھے، وہی اصول تھے جن کی حمایت ہم اپنے ملک میں کر رہے تھے۔

آرلینڈو میں والٹر کا مکان تحریکی افراد اور اے این سی کے ارکان کے لیے جائے رجوع تھا۔ یہ ایک پرتپاک اور خوش آمدید کہتا مقام تھا اور میں اکثر یا تو سیاسی بحث

مباحثے یا مادام سیسولو کے پکے ہوئے کھانے چکھنے کے لیے وہاں موجود ہوتا۔ 1943ء میں ایک رات میں انتون لمبیڈی کو تقریر کرتے سنا تو مجھے وہ ایک مقناطیسی شخصیت نظر آیا جو اصلی اور اکثر چونکا دینے والے انداز سے سوچتا تھا وہ اس وقت پورے جنوبی افریقہ میں مٹھی بھر افریقی وکلا میں سے ایک تھا اور اے این سی کے ایک بانی، قابل احترام ڈاکٹر پکسلے کا میمے کا قانونی شریک کار تھا۔

مادر افریقہ کے زندہ بیٹے

لمبیڈی کا کہنا تھا کہ افریقہ سیاہ آدمی کا براعظم ہے اور یہ افریقیوں کا کام ہے کہ اپنے آپ کو منوائیں اور اس کی واپسی کا دعویٰ کریں جو بجا طور پر انہی کا ہے۔ اسے سیاہ فاموں کے احساس کمتری سے نفرت تھی اور وہ اس غلامانہ ذہنیت کو ٹھکراتا تھا جسے وہ مغرب اور اس کے نظریات کی عبادت اور پوجا کہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ احساس کمتری آزادی کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ مارکس گاروے، ڈوبوائس اور ہیل سلاسی جیسے افریقی ہیروؤں کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا کہ جہاں کہیں کسی افریقی کو موقع دیا گیا وہ سفید آدمی کی طرح کرنے کا اہل ثابت ہوا ہے۔ میری جلد کا رنگ خوبصورت ہے۔ وہ کہتا۔ مادر افریقہ کی سیاہ مٹی کی طرح اسے یقین تھا کہ سیاہ فاموں کو کامیاب عوامی اقدام کا آغاز کرنے کے لیے اپنا امیج بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ وہ خود اعتمادی اور خودعزمی کا پرچار کرتا تھا اور اپنے فلسفے کو افریقنزم کہتا تھا۔

لمبیڈی نے اعلان کیا کہ لوگوں میں ایک نئی روح بیدار ہو رہی ہے، نسلی اختلاف زائل ہو رہے ہیں، نوجوان مرد اور عورتیں اپنے آپ کو اب ژھوسا، اندی بیلی یا تسوانا کے بجائے اول و آخر افریقی خیال کرنے لگے ہیں لمبیڈی نے، جس کا باپ نٹال کا ایک ان پڑھ زولو کسان تھا۔ ایڈمز کالج سے استادی کی تربیت پائی تھی جو امریکن بورڈ آف مشنز کا ایک ادارہ تھا۔ اس نے برسوں اورنج فری سٹیٹ میں پڑھایا تھا۔

افریکان سیکھ لی تھی اور وہ افریکنز نیشنلزم کو افریقی نیشنلزم کا ایک اصلی نمونہ قرار دینے لگا جیسا کہ اس نے بعد میں نٹال کے ایک افریقی اخبار ان کنڈ لایا بنتو میں لکھا:

''جدید دور کی تاریخ نیشنلزم قوم پرستی کی تاریخ ہے۔ قوموں کی جدوجہد اور لڑائیوں کی آگوں میں نیشنلزم کی آزمائش ہو چکی ہے اور غیر ملکی حکمرانی اور جدید استعمار کے خلاف یہ واحد تریاق ثابت ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی استعماری طاقتیں پوری قوت سے اپنی غیر ملکی رعایا میں قوم پرستانہ رجحانات کی حوصلہ شکنی یا ان کا صفایا کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی ہیں۔ اس مقصد کے لیے نیشنلزم کے خلاف پروپگنڈے پر بھاری رقوم دل کھول کر خرچ کی جا رہی ہیں اور نیشنلزم کو تنگ نظر، وحشیانہ، غیر مہذب اور شیطانی قرار دیا جا رہا ہے۔ غیر ملکی رعایا کے بعض لوگ اس گھناؤنے پروپگنڈے سے مسحور ہو جاتے ہیں اور یوں استعمار کے آلہ کار بنتے ہیں اور اس عظیم خدمت کے باعث استعماری طاقت ان کی بڑی تعریف و توصیف کرتی ہے اور ان پر مہذب، لبرل، ترقی پسند اور روشن دماغ جیسی اصطلاحات کی بارش کرتی ہے۔''

یوتھ لیگ کا قیام

لمیڈی کے خیالات نے میرے اندر ایک لہر پیدا کر دی۔ میں نے بھی مربیانہ برطانوی استعمار اور سفید فاموں کے مہذب، ترقی پسند اور متمدن ہونے کا تصور کا اثر قبول کیا تھا۔ میں پہلے ہی سیاہ فام طبقہ اشرافیہ میں کشش محسوس کرنے لگا تھا جو انگریزوں نے افریقہ میں تخلیق کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہی کچھ ناظم سے لے کر مسٹر سائڈل سکائی تک سب مجھ سے چاہتے تھے۔ لیکن یہ سراب تھا۔ لمیڈی کی طرح میں نے عسکریت پسند افریقی نیشنلزم کی شکل میں تریاق ڈھونڈ لیا تھا۔

لمیڈی کا دوست اور حصے دار پیٹر اڈا تھا جو ''اے پی'' کے طور پر معروف تھا۔ لمیڈی بسیار گوئی اور عموماً راستی سے ہٹ جانے کا رجحان رکھتا تھا جبکہ اڈا ضبط رکھنے والا اور

راست گو تھا۔ لمیڈی ابہام پسند اور روحانی ذہن رکھتا تھا جبکہ اے پی اٹلا اکل کھرا اور سائنسی ذہن کا مالک تھا۔ اٹلا کی عملیت پسندی لمیڈی کی تصوریت کا توڑ تھی۔

دوسرے نوجوان بھی انہی خطوط پر سوچ رہے تھے اور ہم سب ان نظریات پر بحث کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ لمیڈی اور اٹلا کے علاوہ ان لوگوں میں والٹر میسولو، آلیور ٹیمبو، ڈاکٹر لائنل ماجم بوزی، وکٹر امبوبو ہیلڈ ٹاؤن میں میرے سابق استاد، ولیم انکومو ایک میڈیکل سٹوڈنٹ جو کمیونسٹ پارٹی کا رکن تھا، جارڈن انگوبین نٹال کا ایک صحافی جوان کنڈلا اور سب سے زیادہ بکنے والے افریقی اخبار بنٹو ورلڈ کے لیے کام کرتا تھا ڈیوڈ بوپاپے، ٹرانسوال میں اے این سی کا سیکرٹری اور کمیونسٹ پارٹی کارکن، اور کئی دوسرے شامل تھے۔ بہت سے شاید غلط پر محسوس کرتے تھے کہ اے این سی مجموعی حیثیت سے تھکے ماندے، غیر عسکریت پسند، استحقاق یافتہ افریقی اشرافیہ کا ایک ٹھکانا ہے جو عوام کے مفادات کے بجائے اپنے حقوق کے تحفظ کی زیادہ فکر کرتے ہیں۔ عام اتفاق اس بات پر تھا کہ کوئی قدم اٹھایا جانا چاہیے اور ڈاکٹر ماجم بوزی نے یوتھ لیگ قائم کرنے کی تجویز دی جو اس کے خیال میں افریقن نیشنل کانگرس کی قیادت کے تحت آگ جلانے کا ایک طریقہ تھا۔

''سب جنٹل مین ہیں''

1943ء میں لمیڈی اٹلا، ٹیمبو نکومو اور میں ایک وفد کی شکل میں ڈاکٹر روما سے ملنے گئے جو اے این سی کے سربراہ تھے۔ ہم صوفیا نہ ٹاؤن میں ان کے نسبتاً شاندار مکان میں ان سے ملے۔ ڈاکٹر روما نے اپنے گھر میں ایک سرجری کھول رکھی تھی اور انکا ایک فارم بھی تھا۔ انہوں نے اے این سی کی بڑی خدمت کی تھی۔ یہ تنظیم جو ڈاکٹر سیمے کی قیادت سائز اور اہمیت میں سکڑ کر رہ گئی تھی، اب ڈاکٹر روما نے اس میں جان ڈال دی تھی۔ جب انہوں نے صدارت سنبھالی، اے این سی کے خزانے میں صرف سترہ شلنگ چھ پنس تھے اور ان کی سعی سے اب رقم چار ہزار پاونڈ پہنچ گئے تھی۔ روایتی

سیاستدان ان کی تعریف کرتے تھے، کابینہ کے وزرا سے ان کے روابط تھے اور انہوں نے پارٹی کے ارکان میں ایک تحفظ اور اعتماد کا ایک احساس پیدا کر دیا تھا۔ لیکن ان میں ایک طرح کا غرور بھی در آیا تھا جو ایک عوامی تنظیم کے رہنما کے شایان شان نہیں تھا۔ وہ اے این سی سے مخلص تھے مگر اپنی میڈیکل پریکٹس کو ترجیح دیتے تھے۔ انکا عہد صدارت وفود، خطوط اور ٹیلی گراموں کا دور تھا۔ ہر کام انگریزی طریقے سے ہوتا تھا جس کا بنیادی تصور یہ تھا کہ تمام اختلافات کے باوجود ہم سے جنٹل مین ہیں۔ انہوں نے سفید فام انتظامیہ سے بھی تعلقات استوار کر رکھے تھے اور سیاسی سرگرمیوں سے وہ انہیں نقصان پہچانا نہیں چاہتے تھے۔

ملاقات کے دوران ہم نے انہیں بتایا کہ ہم ایک یوتھ لیگ قائم کرنا اور عوامی حمایت کو متحرک کرنے کے لیے ایک مہم چلانا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے ساتھ ایک دستوری خاکے اور منشور کی نقل لائے تھے۔ ہم نے ان سے کہا کہ جب تک اے این سی متحرک نہ ہوئی اور اس نے نئے طریقے نہ اپنائے، یہ عضو معطل بن جانے کے خطرے سے دوچار رہے گی۔ ڈاکٹر روما کو ہمارے وفد سے کسی خطرے کا احساس ہوا اور انہوں نے یوتھ لیگ کے دستور پر شدید اعتراض کیا۔ ان کا خیال تھا کہ لیگ کو ایک زیادہ ڈھیلی تنظیم ہونا چاہیے اور اسے زیادہ تر اے این سی کے لیے ایک ریکروٹنگ ادارے کا کام کرنا چاہیے۔ اپنے مخصوص مربیانہ انداز سے ڈاکٹر روما ہمیں بتاتے رہے کہ افریقی مجموعی حیثیت سے اتنے غیر منظم ہیں کہ وہ ایک عوامی مہم میں حصہ نہیں لے سکتے اور یہ کہ ایسی مہم قبل از وقت اور خطرناک ہوگی۔

ڈاکٹر روما سے ملاقات کے کچھ عرصہ بعد ولیم نکوموکی قیادت میں یوتھ لیگ کی ایک عبوری کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی کے ارکان دسمبر 1943ء میں بلوم فونٹائن میں اے این سی کی سالانہ کانفرنس میں گئے جہاں انہوں نے تنظیم میں نئے ارکان کی بھرتی میں مدد دینے کے لیے ایک یوتھ لیگ قائم کرنیکی تجویز پیش کی۔ یہ تجویز منظور

کر لی گئی۔

یوتھ ونگ کا قیام

یوتھ لیگ کی اصلی تشکیل سنڈے 1944ء کو ایلوف سٹریٹ کے بنتو مینز سوشل سینٹر میں عمل میں آئی۔ وہاں تقریباً سو افراد جمع ہوئے، بعض پریٹوریا تک سے آئے تھے۔ یہ ایک منتخب گروہ تھا۔ ایک اشرافی گروہ۔ ہم زیادہ تر فورٹ ہیئر کے گریجوایٹ تھے۔تب ہم ایک عوامی تحریک سے بہت دور تھے۔لمبیڈی نے قوموں کی تاریخ پر لیکچر دیا۔وہ قدیم یونان کے افق سے ہوکر ازمنہ وسطیٰ کے یورپ اور پھر دور استعماریت میں آئے۔انہوں نے افریقہ اور افریقیوں کی تاریخی کامیابیوں پر زور دیتے ہوئے کہا کہ سفید فاموں کی طرف سے یہ کس قدر احمقانہ حرکت ہے کہ وہ اپنے آپ کو منتخب اور ایک حقیقی برتر نسل خیال کرتے ہیں۔

جارڈن انگو بین، اے پی اُڈا سب نے تقریریں کیں اور افریقی قومیت کے ابھرتے ہوئے جذبے کی اہمیت اجاگر کی۔لمبیڈی کو صدر چنا گیا، آلیور ٹیمبو سیکرٹری اور والٹر سیسولو خزانچی بنے۔اے پی اُڈا، جارڈن انگو بین، لائنل ماجم بوزی، کانگرس امباٹا، ڈیوڈ بوپاپے اور میں ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن چنے گئے۔بعد میں گاڈفرے پیٹجی، ایک طالب علم بعد میں استاد اور پھر وکیل، آرتھر لٹیلی، ولسن کونکو، دلیز امجی اور انتھا تھو، موٹلانا سب میڈیکل ڈاکٹر، ڈان ٹلومی یونین لیڈر اور جو میتھیوس، ڈوما نوکوی اور رابرٹ سوبکوی طالب علم جیسے نوجوان ہمارے ساتھ شامل ہوئے۔

لیگ کی بنیادی پالیسی اے این سی کے 1912ء کے پہلے دستور سے مختلف نہ تھی۔لیکن ہم ان اصلی افکار کی ازسر نو توثیق کررہے تھے جن میں کئی نظر انداز کر دیئے گئے تھے۔افریقی قومیت ہماری جنگی پکار تھی اور ہمارا نظریہ کئی قبائل سے ایک قوم کی تشکیل، گوروں کی برتری کا خاتمہ اور ایک حقیقی جمہوری قسم کی حکومت کا قیام تھا۔۔

ہمارا منشور کہتا تھا: ہم اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ افریقیوں کی قومی آزادی خود

افریقی ہی حاصل کر سکتے ہیں۔۔۔کانگرس یوتھ لیگ کو افریقی قومیت کے جذبے کا برین ٹرسٹ اور پاور اسٹیشن ہونا چاہیے۔

ہمارا منشور تولیت کے نظریے کو یکسر مسترد کرتا تھا۔۔یہ نظریہ کہ سفید حکومت دل میں کسی نہ کسی طرح افریقی مفادات سے ہمدردی رکھتی تھی۔ہم گزشتہ چوبیس برس سے کی گئی لولی لنگڑی افریقہ دشمن قانون سازی کا حوالہ دیتے جس کا آغاز 1913ء کے لینڈ ایکٹ سے ہوا تھا جس نے آخر کار سیاہ فاموں کا ان کی جنم بھومی کے ستاسی فیصد علاقے سے محروم کر دیا۔پھر 1923ء کا اربن ایکٹ آیا تھا جس نے گنجان افریقی آبادیوں Slums کو جنم دیا جنہیں نرم الفاظ میں نیٹو لوکیشنز کہا جاتا تھا۔ ان مقامی غلیظ آبادیوں کا مقصد سفید فاموں کی صنعتوں کے لیے سستی لیبر فراہم کرنا تھا۔اس کے بعد 1926ء کا کلر بار ایکٹ، وجود میں آیا جس نے افریقیوں کیلیے ہنر مندانہ پیشے اختیار کرنا ممنوع قرار دیا۔پھر 1927ء کے نیٹو ایڈمنسٹریشن ایکٹ نے سرداران اعلیٰ پیراماؤنٹ چیفس، کے بجائے تاج برطانیہ کو تمام افریقی علاقوں کا اقتدار اعلیٰ دے دیا اور آخر میں 1936ء کا ریپریزنٹیشن آف نیٹو ایکٹ آیا جس نے صوبہ راس The Caps میں مشترکہ ووٹر لسٹ میں سے افریقیوں کو خارج کر دیا۔اس طرح یہ غلط فہمی یکسر دور ہوگئی کہ سفید فام حکمران کبھی افریقیوں کو اپنی قسمت کے خود مالک بننے دیں گے۔

ہم نے کمیونزم کو مسترد کر دیا

ہم کمیونزم سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ہمارا منشور کہتا تھا: ہم غیر ملکی نظریات سے کچھ مستعار تو لے سکتے ہیں لیکن ہم افریقہ میں غیر ملکی نظریات کی ہول سیل درآمد کو مسترد کرتے ہیں۔یہ بات کمیونسٹ پارٹی کے لیے ناپسندیدہ تھی جو لمیڈی اور مجھ سمیت کئی دوسروں کے خیال میں ایک غیر ملکی نظریے کی علمبردار تھی جو افریقی صورتحال میں ناموزوں تھا۔لمیڈی کو یہ بھی احساس تھا کہ کمیونسٹ پارٹی پر گورے

حاوی ہیں جنہوں نے افریقیوں کی خود اعتمادی اور جذبہ عمل کو نقصان پہنچایا ہے۔

اس روز بہت سی کمیٹیاں بنائی گئیں لیکن یوتھ لیگ کا بنیادی مقصد اے این سی کو سیاسی آزادی کی جدوجہد میں سمت فراہم کرنا تھا۔ اگرچہ مجھے اس سے اتفاق تھا مگر میں لیگ میں شامل ہونے سے گھبراتا تھا اور اپنی سیاسی وفاداریوں کی حد تک شکوک و شبہات میں مبتلا تھا۔ ان دنوں میں کل وقتی کام کر رہا تھا اور جز وقتی مطالعہ کرتا اور ان دونوں سرگرمیوں کے علاوہ میرے پاس وقت نہ ہونے کے برابر تھا۔ مجھے کچھ عدم تحفظ کا بھی احساس تھا اور میں والٹر، لمبیڈی اور اانڈا کے مقابلے میں خود کو سیاسی طور پر پسماندہ محسوس کرتا تھا۔ ان لوگوں نے اپنا ذہن بنالیا تھا اور میری ذہنی تشکیل ابھی ہو رہی تھی۔ ایک مقرر کے طور پر بھی مجھ میں اعتماد کی کمی تھی اور میں لیگ میں شامل اتنے زیادہ فصیح البیانوں سے خوفزدہ تھا۔

لمبیڈی کی افریقیت کو عالمی سطح پر حمایت حاصل نہیں تھی کیونکہ اس کے خیالات خالص نسلی بنیاد پر استوار تھے جنہیں بعض دوسرے یوتھ لیگی پسند نہیں کرتے تھے۔ بعض ارکان محسوس کرتے تھے کہ وہ قومیت زیادہ پسندیدہ ہوگی جس میں ہمدرد گورے بھی شامل ہوں۔ مجھ سمیت اوروں کا خیال تھا کہ اگر سیاہ فاموں نے کثیر نسلی قسم کی جدوجہد اپنالی تو وہ گورا کلچر کے گرویدہ اور مسلسل احساس کمتری کا شکار رہیں گے۔ اس وقت میں لیگ میں کمیونسٹوں اور سفید فاموں کو شامل ہونے کی اجازت دینے کا سخت مخالف تھا۔

والٹر سیسولو کا گھر میرا اپنا ہی گھر تھا۔ عشرہ 1940ء کے اوائل میں، میں کئی ماہ انہی کے ہاں مقیم رہا تھا جب میرے پاس رہنے کو کوئی اور جگہ نہ تھی۔ ان کا مکان ہمیشہ بھرا رہتا اور یوں لگتا تھا کہ وہاں سیاست کے بارے میں ایک مستقل بحث چلتی رہتی تھی۔ والٹر کی بیوی البرٹینا ایک ذی فہم اور حیرت انگیز شخصیت تھی اور والٹر کے سیاسی کام کی سرگرم حامی۔ ان کی شادی کے موقع پر انٹون لمبیڈی نے کہا تھا، البرٹینا تم نے

ایک شادی شدہ شخص سے شادی کی ہے۔والٹر نے تم سے ملاقات ہونے سے بہت پہلے سیاست سے شادی کر لی تھی۔'

قصہ میری شادی کا

سیسولو کے گھر لاؤنج میں اپنی پہلی بیوی ایولین میز سے ملاقات ہوئی۔وہ ایک خاموش طبع خوبصورت دیہاتی لڑکی تھی جو اس گھر میں آنے جانے والوں کے ازدحام سے کبھی نہ گھبراتی۔تب ہو جوہانسبرگ نان یورپین ہسپتال میں البر ٹینا اور پیٹرا مڈکی بیوی روز کے ساتھ نرسنگ کی تربیت لے رہی تھی۔

ایولین کا تعلق اینگ کوبو سے تھا جو ٹرانسکائی میں امتاتا سے کچھ فاصلے پر تھا۔اس کا باپ ایک کانکن تھا اور اس کی شیر خوارگی کے دوران وفات پا گیا تھا اور اس کی ماں اس وقت انتقال کر گئی جب وہ بارہ برس کی تھی۔پرائمری پاس کرنے کے بعد ایولین جو اس وقت میسولو کے مکان میں رہ رہا تھا۔والٹر کی ماں مادام میسولو، ایولین کی ماں کی بہن تھی۔میسولو میں بیوی ایولین سے یوں برتاؤ کرتے جیسے وہ ان کی پیاری بیٹی ہو۔دونوں اس سے بہت محبت کرتے تھے۔

اپنی پہلی ملاقات کے فوراً بعد میں نے ایولین سے باہر ساتھ چلنے کو کہا۔بہت جلد ہم گرفتار محبت ہو گئے۔چند ماہ بعد میں نے اس سے شادی کے لیے کہا اور وہ مان گئی۔ہم نے ایک سول تقریب میں شادی کر لی جس کے لیے صرف دستخط اور جوہانسبرگ میں نیٹو کمشنر کی عدالت میں ایک گواہی درکار تھی کیونکہ ہم ایک روایتی شادی یا ضیافت کا اہتمام کرنے کی آرلینڈ وایسٹ میں اس کے بھائی کے پاس رہے اور بعد میں سٹی ڈیپ مائنز میں ایولین کی بہن کے ہاں منتقل ہو گئے جہاں اس کا بہنوئی امسونگولی امگدلو بطور کلرک کام کرتا تھا۔

کان کنوں کی ہڑتال

1946ء میں بہت واقعات پیش آئے جنہوں نے میرے سیاسی ارتقاء اور

آزادی جدوجہد میں اہم کردار ادا کیا۔ کان کنوں کی ہڑتال میں ستر ہزار افریقی کان کن ریف کے علاقے میں ہڑتال پر رہے۔ اس ہڑتال نے مجھے بہت متاثر کیا۔ جے بی مارکس، ڈان ٹلومے، گاؤر رادیبے اور بہت سے اے این سی لیبر لیڈروں کے ایما پر 1940ء کی دہائی کے شروع میں اے ایم ڈبلیو یو یعنی افریقی مائن ورکرز یونین کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ ریف میں چار لاکھ تک افریقی کارکن کام کر رہے تھے اور ان میں سے اکثر دو شلنگ روزانہ سے زیادہ مزدوری حاصل نہیں کر پاتے تھے۔ یونین کی قیادت نے چیمبر آف مائنز پر بار بار زور دیا تھا کہ کم سے کم اجرت دس شلنگ روزانہ مقرر کی جائے نیز خاندان کے لیے رہائش اور دو ہفتے کی با اجرت رخصت دی جائے۔ چیمبر نے یونین کے یہ مطالبے نظر انداز کر دیئے تھے۔

یہ جنوبی افریقہ کی تاریخ کا ایک بہت واقعہ تھا کہ ستر ہزار کان کن ایک ہفتے تک ہڑتال پر رہے اور اس دوران انہوں نے باہمی اتفاق برقرار رکھا۔ حکومت کی انتظامی کاروائی بے رحم تھی۔ لیڈر گرفتار کر لیے گئے، احاطے پولیس نے گھیر لیے اور اے ایم ڈبلیو یو کے دفاتر غارت گری کا نشانہ بنے۔ ایک احتجاجی مارچ پولیس نے وحشیانہ تشدد سے ناکام بنا دیا۔ دس کان کن مارے گئے۔ دی نیٹو زری پریزنٹیشن کونسل نے اپنا اجلاس بطور احتجاج ملتوی کر دیا۔ میرے بہت سے رشتے دار کان کن تھے۔ ہفتے بھر کی ہڑتال کے دوران میں ان سے ملا، معاملات پر گفتگو کی اور انہیں اپنی حمایت کا یقین دلایا۔

جے بی مارکس جو عرصے سے اے این سی اور کمیونسٹ پارٹی کا رکن تھا۔ اس وقت افریقن مائن ورکرز یونین کا صدر تھا۔ وہ مخلوط والدین کے ہاں ٹرانسوال میں پیدا ہوا تھا اور مزاح کی امتیازی حس کیساتھ ایک کرشماتی شخصیت تھا۔ اسکا قد اونچا اور رنگ روپ ہلکا تھا۔ ہڑتال کے دوران بعض اوقات میں اس کے ساتھ ایک کان سے دوسری کان جاتا اور ہم کارکنوں سے گفتگو اور اگلے مرحلے کی منصوبہ بندی کرتے۔

صبح سے رات تک وہ پرسکون اور معقول قیادت کا مظاہرہ کرتا اور اس کے چٹکلے سنگین ترین بحران میں بھی مزاحیہ رنگ بھر دیتے۔ میں اسکی حکومت کے وحشیانہ تشدد کے باوجود یونین کی تنظیم اور اپنے ارکان کو کنٹرول کرنے کی اہلیت سے بڑا متاثر ہوا۔

آخر کار حکومت جیت گئی۔ بہیمانہ تشدد سے ہڑتال ناکام بنا دی گئی اور یونین کچل دی گئی۔ ہڑتال سے مارکس کے ساتھ میرے قریبی تعلقات کا آغاز ہوا۔ میں اکثر اس کے مکان پر جا کر اس سے ملتا اور دیر تک اس سے میری کمیونزم کی مخالفت پر بحث چلتی رہتی۔ مارکس کمیونسٹ پارٹی کا زبردست رکن تھا لیکن وہ کبھی میرے اعتراضات کا برا نہ مانتا اور اسے احساس تھا کہ ایک نوجوان کے لیے قوم پرستی سے ہم آغوش ہونا فطری بات ہے۔ میرے خیالات میں وسعت آتی گئی۔ ایسی ہی بحث و تمحیص میں موسز کوتانی اور یوسف دادو سے کیا کرتا تھا۔ وہ دونوں بھی مارکس کی طرح، اس امر پر یقین رکھتے تھے کہ کمیونزم کو افریقی حالات کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ اے این سی کے دوسرے کمیونسٹ ارکان مجھے اور دوسرے یوتھ لیگیوں کو ہدف تنقید بناتے تھے۔ مگر مارکس، کوتانی اور دادو کبھی ایسا نہ کرتے۔

ہندستانیوں کی سول نافرمانی

ہڑتال کے بعد کوتانی مارکس اور کئی دوسرے کمیونسٹوں سمیت باون آدمی گرفتار کیے گئے اور ان پر پہلے تو ہڑتال پر اکسانے اور پھر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا۔ یہ ایک سیاسی مقدمہ تھا اور حکومت کی طرف سے یہ ثابت کرنے کی کوشش تھی کہ وہ کمیونزم کے سرخ خطرے کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتی۔

اسی برس پیش آنے والے ایک اور واقعے نے مجھے سیاسی نقطہ نظر تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ 1946ء میں سمٹس حکومت نے ایشیاٹک لینڈ ٹینیور ایکٹ منظور کیا جس نے ہندوستانیوں کی آزادانہ نقل و حرکت پر بندش عائد کر دی اور وہ علاقے محدود کر دیے جہاں ہندوستانی رہ سکتے اور تجارت کر سکتے تھے اور ان کا جائیداد

خریدنے کا حق بھی بہت محدود کر دیا گیا۔ اس کے عوض انہیں پارلیمنٹ میں علامتی طور پر گورے ارکان کے ذریعے نمائندگی دی گئی۔ ٹرنسوال انڈین کانگرس ٹی آئی سی کے صدر ڈاکٹر دادو نے ان پابندیوں کو ہدف تنقید بنایا اور پارلیمانی نمائندگی کی پیشکش کو نمائشی نمائندگی کی پرفریب پیشکش قرار دے کر مسترد کر دیا۔ یہودیوں کی طرح الگ تھلگ پرنفرت بستیاں بسانے کا یہ قانون ہندوستانی آبادی کے لیے توہین آمیز تھا جو آخر کار تمام رنگ دار جنوبی افریقیوں کی آزادی محدود کیے دیتا تھا۔

ہندوستانی آبادی میں اس قانون کے خلاف اشتعال پھیل گیا اور انہوں نے اس کی مخالفت میں خاموش مزاحمت کی دو سالہ مہم چلائی۔ ڈاکٹر دادو اور نٹال انڈین کانگرس این آئی سی کے صدر ڈاکٹر جی ایم نائیکر کی قیادت میں ہندوستانی آبادی نے ایک ایسی عوامی مہم کا آغاز کیا جس کی تنظیم اور عزم نے ہمیں بے حد متاثر کیا۔ گھریلو خواتین، پادری، ڈاکٹر، وکلاء، تاجر، طلبہ اور کارکن اس احتجاج میں پیش پیش رہے۔ یہ جنگ لڑنے کیلیے لوگوں نے دو سال تک اپنے معمولات ملتوی کیے رکھے۔ عوامی ریلیاں منعقد ہوئیں۔ سفید فاموں کے لیے مخصوص زمینوں پر قبضہ کیا گیا اور پکٹنگ کی گئی۔ کم از کم دو ہزار رضا کار جیل گئے اور ڈاکٹر دادو اور ڈاکٹر نائیکر کو چھ ماہ قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔

یہ مہم ہندوستانی آبادی تک محدود تھی اور اس میں دوسرے گروہوں کی شرکت کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ پھر بھی ڈاکٹر ژوما اور دوسرے افریقی لیڈروں نے ان کے کئی جلسوں میں تقریریں کیں اور یوتھ لیگ کی معیت میں ہندوستانی لوگوں کی جدوجہد میں ان کی پوری پوری اخلاقی حمایت کی۔ حکومت نے سخت قوانین اور ترغیب وتہدید کے ذریعے بغاوت کے کس بل نکال دیئے۔ تاہم اس تحریک کے دوران ہم یوتھ لیگ اور اے این سی والوں نے ہندوستانی لوگوں کیطرف سے نسلی امتیاز کے خلاف احتجاج کا ایسا غیر معمولی مظاہرہ دیکھا جو افریقیوں اور اے این سی

کی طرف دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

اسماعیل میرا اور جے این سنگھ نے اپنی پڑھائی ملتوی کردی، اپنے اپنے خاندان کو خدا حافظ کہا اور جیل چلے گئے۔ احمد کاتھرادا جو ابھی ہائی سکول کا طالبعلم تھا۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ میں اکثر امینہ پہاد کے ہاں لنچ کے لیے جاتا تھا۔ اس پرکشش خاتون نے ایک روز اچانک اپنا ایپرن بالائے طاق رکھا اور اپنے نظریئے کی خاطر جیل چلی گئی۔ اگر میں نے کبھی ہندوستانی آبادی پر حرف گیری کی تھی کہ وہ ظلم و تشدد کے خلاف احتجاج کرنے کی سکت نہیں رکھتے تو اب میں ایسا نہیں کرسکتا تھا۔

ہندوستانی مہم اس نوع کے احتجاج کا ایک نمونہ بن گئی جس کی ہم یوتھ لیگ والے مدت سے تمنا کررہے تھے۔ اس نے لوگوں میں چیلنج کرنے اور انقلابیت کا جوش پیدا کیا۔ جیل کا خوف دور کردیا اور این آئی سی کی مقبولیت اور اثر و رسوخ دوچند کردیا۔ انہوں نے ہمیں یاد دلایا کہ آزادی کی جدوجہد صرف تقریریں کرنے، جلسے منعقد کرنے، قراردادیں منظور کرنے اور وفو بھیجنے سے عبارت نہیں بلکہ یہ تو صبر آزما تنظیم، جنگجویانہ عوامی عمل اور سب سے بڑھ کر ابتلاء اور قربانی کے لیے تیار ہونے کا نام ہے۔ ہندوستانیوں کی مہم 1913ء کی مجہول مزاحمتی مہم کی یاد دلا گئی جس میں مہاتما گاندھی نے ہندوستانیوں کے ایک پرجوش جلوس کی قیادت کرتے ہوئے نٹال سے غیر قانونی طور پر ٹرانسوال میں داخل ہونے کی جسارت کی تھی۔ وہ تو تاریخ تھی، مگر یہ مہم میری آنکھوں کے سامنے عمل تھی۔

میرا پہلا اپنا گھر

1946ء کے اوائل میں ایولین اور میں آرلینڈو ایسٹ میں اپنے دو کمروں پر مشتمل میونسپل مکان میں منتقل ہوگئے اور وہاں سے ہم نے نمبر 8115 آرلینڈو ویسٹ کے ایک نسبتاً بڑے مکان میں جا بسیرا کیا۔ آرلینڈو ویسٹ ایک گرد آلودہ پسماندہ علاقہ تھا جہاں ڈبہ نما مکانات تھے۔ یہ علاقہ بعد میں عظیم تر سویٹو کا حصہ بنا

جبکہ لفظ سوویٹو جنوب مغربی ٹاؤن شپس کا مخفف تھا۔ ہمارا مکان ایسے علاقے میں واقع تھا جس کے رہائشی اسے شمال میں گوروں کی مضافاتی بستی کے حوالے سے ویسٹ کلف کا نام دیتے تھے۔

ہمارے نئے گھر کا کرایہ 17 شلنگ 6 پنس تھا۔ یہ مکان ہزاروں دوسرے مکانوں جیسا ہی تھا جو غلاظت سے اٹی سڑکوں پر ڈاک ٹکٹ سائز کے پلاٹوں پر تعمیر کئے گئے تھے۔ اس کی ویسی ہی تین کی چھت تھی۔ ویسا ہی سیمنٹ کا فرش، ایک تنگ باورچی خانہ اور عقب میں ایک مشکیزے جتنا طہارت خانہ۔ اگرچہ باہر سٹریٹ لیمپ تھے مگر ہم گھر میں پیرافین لیمپ استعمال کرتے تھے کیونکہ گھروں میں ابھی بجلی کی سہولت نہیں تھی۔ بیڈ روم اتنا چھوٹا تھا کہ ایک ڈبل بیڈ تقریباً پورے فرش کو گھر لیتا تھا۔ یہ مکانات میونسپل حکام نے ان کارکنوں کے لیے بنائے تھے جن کا ٹاؤن سے قریب رہنا ضروری تھا۔ یہ مکانات میونسپل حکام نے ان کارکنوں کے لیے بنائے تھے جن کا ٹاؤن سے قریب رہنا ضروری تھا۔ یک رنگی کم کرنے کے لیے بعض لوگوں نے چھوٹے چھوٹے باغیچے لگا لیے تھے یا اپنے دروازوں کو شوخ رنگوں سے آراستہ کر لیا تھا۔ یہ گھر شاندار کا متضاد تھا لیکن یہ میرا پہلا اپنا گھر تھا اور مجھے اس پر بے حد فخر تھا۔ ایک آدمی اس وقت تک آدمی نہیں جب تک اس کا اپنا ایک گھر نہ ہو۔ اس وقت تک میں یہ نہیں جانتا تھا کہ آئندہ سالہا سال کے لیے یہ میرا واحد مسکن ٹھہرے گا۔

حکومت نے یہ مکان مجھے اور ایولین کو دے دیا تھا کیونکہ اب ہم دو نہیں بلکہ تین تھے۔ اس سال ہمارا پہلا بیٹا مادیبا تھیمبی کیلی پیدا ہوا تھا۔ اسے خیلی نام مادیبا دیا گیا مگر اس کا گھریلو نام تھیمبی سے پکارا اور جانا جاتا تھا۔ وہ ایک بھرے جثے کا ہنس مکھ ننھا لڑکا تھا جسکے بارے میں لوگ کہتے تھے کہ وہ باپ سے زیادہ ماں سے مشابہ ہے۔ اب میں نے اپنا ایک وارث پیدا کر لیا تھا اگرچہ اسے ورثے میں دینے کیلیے میرے پاس ابھی کچھ نہ تھا۔ لیکن میں نے منڈیلا کا نام اور مادیبا خیل دونوں کے

تسلسل کا اہتمام کر لیا تھا جو ایک ژہوسا مرد کی بنیادی ذمے داری ہے۔

آخر کار میرا ایک مستقل ٹھکانہ بن گیا تھا اور اب میں دوسرے لوگوں کے گھروں میں مہمان بن کر جانے کے بجائے دوسروں کا اپنے ہاں مہمان بنانے کے قابل ہو گیا تھا۔ میری بہن لیبابائی ہمارے پاس آ گئی اور میں اسے ریلوے لائن کے پار آرلینڈو ہائی سکول میں داخل کرانے لے گیا۔ میری ثقافت میں خاندان کے تمام ارکان ایک دوسرے کی میز بانی سے مستفید ہونے کا حق رکھتے ہیں اور میرے وسیع خاندان کے پس منظر میں میرے نئے مکان کا مطلب یہ تھا کہ اب بہت سے مہمان ہمارے ہاں آیا کریں گے۔

میں گھریلو قرب سے لطف اٹھاتا تھا اگرچہ اس کے لیے میرے پاس وقت نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں تھیمبی کے ساتھ کھیلنا، اسے نہلانا، اسے کھانا کھلانا اور اسے سلاتے وقت کہانی سنانا پسند کرتا تھا۔ دراصل مجھے بچوں کیساتھ کھیلنا اور گپ شپ لگانا بہت بھاتا ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جو مجھے ہمیشہ سے سکون دیتی آئی ہے۔ میں گھر میں آرام اور خاموشی سے مطالعہ کرتے ہوئے باورچی خانے میں ابلتے ہوئے برتنوں کی اشتہار انگیز اور بھینی بھینی خوشبو سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ لیکن گھر میں ان چیزوں سے لطف اٹھانے کے لیے میرے پاس شاذونادر ہی وقت ہوتا تھا۔

پادری سکاٹ ہمارے گھر میں

اس سال کے آخری حصے میں عزت ماب مائیکل سکاٹ ہمارے ہاں رہنے کے لیے آئے۔ سکاٹ ایک اینگلی کن پادری اور افریقیوں کے حقوق کے ایک عظیم مجاہد تھے۔ کوموتامی ایک آدمی ان سے ملا جو جوہانسبرگ کے باہر ایک منتشر کیمپ کی نمائندگی کرتا تھا جسے حکومت وہاں سے کہیں اور منتقل کرنا چاہتی تھی۔ کومو چاہتا تھا کہ سکاٹ صاحب اس منتقلی کے خلاف احتجاج کریں۔ سکاٹ نے اس سے کہا، اگر میں تمہاری مدد کروں گا تو میں تمہارے درمیان ہی رہوں گا۔ چنانچہ وہ اس منتشر کیمپ

میں منتقل ہو گئے اور وہاں ایک مذہبی اجتماع قائم کر لیا۔ سکاٹ کا مسکن، بے گھروں کی یہ کچی بستی ایک چٹانی پہاڑی کے قریب تعمیر کی گئی تھی اور اس کے مکین اسے طبروق کا نام دیتے تھے، جنگ عظیم میں شمالی افریقہ کی ایک لڑائی کے نام پر۔ کبھی کبھی اتوار کی صبح میں تھیمبی کو وہاں لے جاتا کیونکہ وہ چٹانوں میں آنکھ مچولی کھیلنا پسند کرتا تھا۔ وہاں اپنا اجتماع قائم کرنے کے بعد سکاٹ کو پتہ چلا کہ کومو لوگوں کی رقوم میں گھپلا کر رہا ہے جو اسے کیمپ کی منتقلی کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے بطور چندہ دیتے تھے۔ جب سکاٹ نے اس سے جواب طلبی کی تو کومو نے انہیں کیمپ سے نکال باہر کیا اور ان کی جان لینے کے درپے ہو گیا۔

سکاٹ نے ہمارے پاس آرلینڈو میں پناہ لی اور دلامینی نامی ایک افریقی پادری کو بھی ساتھ لے آئے جس کی ایک بیوی اور بچے بھی تھے۔ ہمارا مکان چھوٹا سا تھا۔ سکاٹ سٹنگ روم میں سوتے، دلامینی اور اس کی بیوی ایک اور کمرے میں سوتے اور ہم سب بچوں کو باورچی خانے میں سلاتے۔ مائیکل سکاٹ ایک منکسر المزاج اور سادہ آدمی تھے مگر دلامینی سے نپٹنا مشکل تھا۔ دستر خوان پر وہ کھانوں کی شکایت ضرور کرتا۔ وہ کہتا، دیکھو ذرا اپنا یہ گوشت، یہ بہت روکھا اور سخت ہے، ہرگز ٹھیک پکا ہوا نہیں۔ میں اس طرح کا کھانا کھانے کا عادی نہیں۔ سکاٹ اس پر بھڑک اٹھتا اور دلامینی کو ملامت کرتا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اگلی رات وہ کہتا: اچھا یہ کل والے سے قدرے بہتر ہے مگر ٹھیک پکا ہوا یہ بھی نہیں۔ منڈیلا تم جانتے ہو تمہاری بیوی پکانے کے فن سے آگاہی نہیں۔

یوں دلامینی نے بالواسطہ طور پر صورتحال کو سازگار بنانے میں مدد دی۔ میں اسے گھر سے نکال باہر کرنے کا اس قدر متمنی تھا کہ میں نے از خود منتشر کیمپ میں جا کر لوگوں کو سمجھایا کہ کومو کے برعکس سکاٹ تمہارا سچا دوست اور خیر خواہ ہے اور تمہیں ان دونوں میں سے انتخاب کر لینا چاہیے۔ تب انہوں نے چناؤ کا اہتمام کیا جس میں

سکاٹ جیت گئے، چنانچہ وہ منتشر کیمپ میں منتقل ہو گئے اور وفادر دلا مینی کو بھی ساتھ لے گئے۔

میکازیوی کی دلخراش وفات

1947ء کے آغاز میں، میں نے آرٹیکلز کے لیے درکار تین سالہ مدت پوری کر لی اور وٹکن سائیڈل اینڈ آئیڈل مین، میں میرا وقت اختتام پذیر ہوا۔ میں نے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے فل ٹائم سٹوڈنٹ بننے کا فیصلہ کیا تاکہ میں اپنے طور پر ایک اٹارنی کی حیثیت سے پریکٹس کر سکوں۔ میں سائیڈل سکائی میں 8 پونڈ 10 شلنگ 1 پنی ماہانہ کما تا تھا اور اس سے محرومی میرے لیے تباہ کن تھی، چنانچہ میں نے جوہانسبرگ میں ساؤتھ افریقن انسٹی ٹیوٹ آف ریس ریلیشنز کے بنٹو ویلفیئر ٹرسٹ سے اڑھائی سو پونڈ قرض کی درخواست کی تاکہ میں قانون کی تعلیم جاری رکھ سکوں۔ اس میں یونیورسٹی فیس، کتابیں اور ماہانہ الاؤنس شامل تھا۔ ٹرسٹ نے مجھے ڈیڑھ سو پونڈ قرض دیا۔

تین ماہ بعد میں نے ٹرسٹ کو پھر لکھا کہ میری بیوی زچگی کی چھٹی لینے والی ہے اور یوں ہم اس کی سترہ پونڈ ماہانہ کی تنخواہ سے محروم ہو جائیں گے جو ہماری گزر بسر کے لیے اشد ضروری ہے۔ مجھے اضافی رقم مل گئی جس کے لیے میں ان کا ممنون تھا۔ لیکن حالات خوش قسمتی کے حامل ثابت نہ ہوئے۔ ہماری بیٹی میکازیوی کی پیدائش مشکل تو نہ تھی مگر وہ کمزور اور بیمار رہتی تھی۔ اسکے بارے میں شروع ہی سے ہمیں بدترین خدشے نے آ لیا تھا۔ بیشتر راتیں میں اور ایولین نے باری باری اس کی نگہداشت میں گزاریں۔ اس ننھی بچی کو جو عارضہ لاحق تھا ہم اس کا نام نہیں جانتے تھے اور ڈاکٹر بھی اس کی نوعیت بتانے سے قاصر تھے۔ ایولین ایک ماں کی طرح انتھک اور ایک نرس کی طرح پیشہ وارانہ مستعدی سے اس کی دیکھ بھال کرتی۔ افسوس میکازیوی نو ماہ کی تھی جب وہ انتقال کر گئی۔ ایولین کو اس صدمے نے نیم جان کر دیا اور مجھے چیز

نے اپنا غم بھلانے میں مدد دی وہ میری طرف سے ایولین کا غم غلط کرنے کی کوشش تھی۔

جواں مرگ کا المیہ

سیاست میں کوئی خواہ کتنی ہی منصوبہ بندی کرے، حالات اکثر واقعات کا رخ متعین کرتے ہیں۔ جولائی 1947ء میں لمیڈی کے ساتھ یوتھ لیگ کی سرگرمیوں کے بارے میں ایک غیر رسمی گفتگو ہورہی تھی کہ اس نے اپنے معدے میں اچانک درد کی شکایت کی اور اس کے ساتھ ہی اسے کپکپی محسوس ہوئی۔ جب درد نے شدت اختیار کی تو ہم اسے کورونیشن ہسپتال لے گئے اور وہاں اسی رات اس نے 33 برس کی عمر میں دم توڑ دیا۔ بہت سوں کو اس کی وفات کا گہرا صدمہ ہوا۔ والٹر میسولو کو تو غم نے نڈھال کردیا۔ لمیڈی کا انتقال تحریک آزادی کے لیے ناقابل تلافی نقصان تھا کیونکہ وہ افکار کا سرچشمہ تھا اور اس کی وجہ سے لوگ تنظیم کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔

لمیڈی کی جگہ اب پیٹر اڈا نے لی جس کے تجزیاتی نقطہ نظر، اپنی بات صاف اور سادہ الفاظ میں کہنے کی صلاحیت اور مدبرانہ تجربے نے اسے ایک عظیم الشان سیاستدان اور یوتھ لیگ کا نمایاں رہنما بنا دیا تھا۔ اڈا ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ وہ اسی طرح فالتو وزن سے مبرا تھا جیسے اس کی گفتگو فالتو الفاظ سے مبرا ہوتی تھی۔ مخالفانہ خیالات برداشت کرنے اور وسعت نظر سے اس کی اپنی سوچ لمیڈی سے زیادہ بالغ اور ترقی یافتہ ہوگئی تھی۔ اس وصف نے اڈا کی قیادت سے لمیڈی کے کاز کو آگے بڑھانے کا کام لیا۔

اڈا کا خیال تھا کہ یوتھ لیگ کو ایک اندرونی پریشر گروپ کے طور پر کام کرنا چاہیے۔ یعنی اے این سی کے اندر ایک جنگجو قوم پرست بازو کے طور پر جو تنظیم کو نئے دور میں لے جائے۔ اس وقت اے این سی کا کوئی ہمہ وقت ملازم نہیں تھا اور یہ خستہ

حال تنظیم لشٹم پشٹم کام کررہی تھی۔ بعد میں والٹر انتہائی معمولی مشاہرے پر اے این سی کا پہلا اور واحد سٹاف ممبر بن گیا۔

اڈا نے جلد ہی زیڈ کے میتھیوس اور علم بشریات کے لیکچرر گاوفرے پیچی کی رہنمائی میں فورٹ ہیئر میں یوتھ لیگ کی شاخ قائم کردی۔ انہوں نے نمایاں طلبہ کو تنظیم کا رکن بنایا اور اس میں تازہ خون اور نئے خیالات داخل کیے۔ ان میں نمایاں ترین پروفیسر میتھیوس کا ہونہار بیٹا جو اور ایک شعلہ بیان مقرر اور کاٹ دار مفکر رابرٹ سوبکوی تھے۔

اڈا، لمبیڈی کی نسبت اپنی قوم پرستی میں زیادہ معتدل تھا اور اس کی سوچ اس نسلی رنگ سے عاری تھی جو لمبیڈی کا خاصہ تھا۔ وہ گورا تشدد اور گورا غلبے سے نفرت کرتا تھا مگر گورے انسانوں سے نہیں۔ وہ میری یا لمبیڈی کی نسبت کمیونسٹ پارٹی کی مخالفت میں بھی کم انتہا پسند تھا۔ میں ان یوتھ لیگیوں میں شامل تھا جو بائیں بازو کے گوروں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اگرچہ کئی سفید فام کمیونسٹ میرے دوست بن گئے تھے۔ میں اے این سی میں گوروں کے اثر و رسوخ کو مشکوک جانتا تھا اور میں نے کمیونسٹ پارٹی کیساتھ مشترکہ مہموں کی مخالفت کی تھی۔ مجھے تشویش تھی کہ کمیونسٹ جائنٹ ایکشن کے پردے میں ہماری تحریک پر غلبہ پانے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ مارکسزم یا کثیر نسلیت نہیں بلکہ خالص افریقی قوم پرستی ہی ہمیں آزادی دلا سکتی ہے۔ یوتھ لیگ میں اپنے بعض ساتھیوں کے ہمراہ میں یہاں تک گیا کہ ہم نے کمیونسٹ پارٹی کے جلسوں میں گھس کر اسٹیج پر دھاوا بول دیا، بینر پھاڑ دیئے اور مائیکروفون قبضے میں لے لیا اور یوں جلسہ درہم برہم کر دیا۔ دسمبر میں اے این سی کی قومی کانفرنس میں یوتھ لیگ نے ایک تحریک پیش کی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کے تمام ارکان تنظیم سے نکال باہر کیے جائیں لیکن ہماری یہ تحریک منظور نہ ہوسکی۔ اپنے اوپر ہندوستانیوں کی 1946ء کی مجہول مزاحمتی

مہم کے اثرات کے باوجود میں ہندوستانیوں کے بارے میں بھی اسی طرح محسوس کرتا تھا جس طرح کمیونسٹوں کے بارے میں۔۔یہ کہ وہ خواہ جزوی طور پر ہی سہی اپنی اعلیٰ تعلیم، تجربے اور تربیت کی بنا پر اے این سی پر غلبہ پانے کی کوشش کریں گے۔

افریقن نیشنل کانگرس میں

1947ء میں مجھے ٹرانسوال اے این سی کی ایگزیکٹو کمیٹی میں چن لیا گیا اور میں نے علاقہ ٹرانسوال کے صدر سی ایس رامو ہانو کے ماتحت خدمات انجام دیں۔ یہ خاص اے این سی میں میری پہلی پوزیشن تھی اور تنظیم سے میری وابستگی میں ایک اہم موڑ کی نمائندگی کرتی تھی۔ اس وقت تک میں نے تحریک آزادی کے لیے جو قربانیاں دی تھیں وہ زیادہ سے زیادہ یہی تھیں کہ میں ویک اینڈز کے دوران اپنی بیوی اور خاندان سے دور رہتا تھا اور شام کو دیر سے گھر لوٹتا تھا۔ میں کسی بڑی مہم میں براہ راست شامل نہیں ہوا تھا اور ایک مجاہد آزادی کی زندگی میں پیش آنے والے خطرات اور نہ ختم ہونے والی مشکلات سے ابھی تک آگاہ نہیں تھا۔ میں تنظیم سے اپنی وابستگی کی قیمت ادا کیے بغیر اس کے آس پاس منڈلاتا رہا تھا۔ جب مجھے ٹرانسوال کی ایگزیکٹو کمیٹی کا رکن چن لیا گیا، اس کے بعد سے میں پوری افریقن نیشنل کانگرس اور اس کی امیدوں اور نا امیدوں اور کامیابیوں اور ناکامیوں سے اپنے آپ کو وابستہ خیال کرنے لگا۔

رامو ہانو اور ایک ہستی تھی جس سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ وہ ایک ثابت قدم قوم پرست اور ایک ماہر تنظیم ساز تھا جو مختلف خیالات کو متوازن کرنے اور انہیں ایک موزوں مفاہمت تک لے آنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اگرچہ وہ کمیونسٹوں سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتا تھا مگر وہ ان کے ساتھ بخوبی نباہ کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اے این سی ایک قومی تنظیم ہے جسے ان سب کو خوش آمدید کہنا چاہیے جو ہمارے مقصد کی

حمایت کرتے ہوں۔

1947ء میں ہندوستانی مجہول مزاحمتی مہم کے سامنے رکھتے ہوئے اے این سی کے ڈاکٹر ژوما، ٹرانسوال انڈین کانگرس کے ڈاکٹر دادو اور نٹال انڈین کانگرس کے ڈاکٹر نائیکر نے ڈاکٹرز پیکٹ پر دستخط کیے جس کے تحت ایک مشترکہ دشمن کے خلاف قوتیں مجتمع کرنے پر اتفاق کیا گیا۔ یہ افریقی اور ہندوستانی تحریکوں کے اتحاد کی طرف ایک نمایاں قدم تھا۔ مختلف تحریکوں کو ہدایات دینے کے لیے ایک مرکزی سیاسی ادارہ قائم کرنے کے بجائے انہوں نے مشترکہ مفاد کے امور پر تعاون کرنے سے اتفاق کیا تھا۔ بعد میں افریقن پیپلز آرگنائزیشن اے پی او، رنگ دار تنظیم بھی ان کے ساتھ آملی۔

لیکن اس طرح کا معاہدہ بہر حال، آزمائشی نوعیت کا تھا کیونکہ ہر قومی گروہ اپنے مخصوص قومی مسائل سے دو چار تھا۔ مثلاً پاس سسٹم ہندوستانیوں یا رنگ داروں کو متاثر نہیں کرتا تھا۔ نیٹوا ایکٹ، جس نے ہندوستانیوں کو احتجاج کرنے پر مجبور کر دیا تھا، افریقیوں کو متاثر نہیں کرتا تھا۔ رنگ دار گروپ اس وقت نسلی تقسیم اور کام کی تحدید جیسے مسائل کے متعلق زیادہ تشویش میں مبتلا تھا اور یہ وہ مسائل تھے جو افریقیوں اور ہندوستانیوں کو اتنا متاثر نہیں کرتے تھے۔

ڈاکٹروں کا معاہدہ

ڈاکٹرز پیکٹ نے مستقبل میں افریقیوں، ہندوستانیوں اور رنگ داروں کے تعاون کی بنیاد رکھ دی کیونکہ اس میں ہر جداگانہ گروہ کی آزادی کی ضمانت دی گئی تھی بلکہ اس میں ان کامیابیوں کا بھی اہتمام تھا جو مل کر عمل کرنے سے ہی حاصل کی جا سکتی تھیں۔ ڈاکٹرز پیکٹ نے ملک بھر میں غیر نسلی، حکومت مخالف مہمات کے ایک سلسلے کی بنیاد رکھی جس نے آزادی کی جدوجہد میں افریقیوں اور ہندوستانیوں کو اکٹھے کر دیا۔ ان میں سے پہلی مہم فرسٹ ٹرانسوال اینڈ اورنج فری سٹیٹ پیپلز اسمبلی

فار ووٹس فار آل تھی۔ اس مہم کا مقصد رائے دہندگی کو تمام سیاہ فام جنوبی افریقیوں تک وسعت دینا تھا۔ ڈاکٹر ژوما نے ایک پریس کانفرنس کے ذریعے اس مہم میں اے این سی کی شرکت کا اعلان کیا۔ یہ پریس کانفرنس میری صدارت میں ہوئی۔ اس وقت ہمارا خیال تھا کہ یہ مہم اے این سی کی قیادت میں چلے گی لیکن جب ہمیں پتہ چلا کہ اے این سی اس مہم کی قیادت نہیں کر رہی تو ہماری ٹرانسوال ایگزیکٹو کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ اے این سی کو اس مہم سے الگ ہو جانا چاہیے۔ اس وقت میری رائے یہ تھی کہ اے این سی کو صرف ان مہمات میں شامل ہونا چاہیے جنکی قیادت خود اے این سی کرے۔ مجھے اس بات کی زیادہ فکر تھی کہ کریڈٹ کون حاصل کرتا ہے بہ نسبت اس کے کہ مہم کامیاب ہو گی یا نہیں۔

ہماری علیحدگی کے بعد بھی اے این سی کے علاقہ ٹرانسوال کے صدر موہانو نے ایک اخباری بیان میں صوبے کے افریقیوں پر زور دیا کہ وہ ٹس فار آل مہم میں شرکت کریں اور یہ ہماری ٹرانسوال ایگزیکٹو کمیٹی کے فیصلے کی صریح خلاف ورزی تھی۔ ایگزیکٹو کی نافرمانی کا یہ فعل برداشت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ جھگڑا چکانے کے لیے بلائی گئی ایک کانفرس میں مجھ سے کہا گیا کہ راموہانو کی نافرمانی کی بنا پر اسکے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کروں۔ میں فرض اور ذاتی تعلق کے مابین، اپنی تنظیم کے ساتھ اخلاص اور دوستی کے مابین ایک کشمکش سے دوچار ہو گیا۔ میں خوب جانتا تھا کہ مجھے اس شخص کے فعل کی مذمت کرنی ہے جس کی راست بازی اور خلوص پر مجھے کبھی شبہ نہیں ہوا تھا، وہ شخص جس کی جدوجہد آزادی میں قربانی میری اپنی قربانی سے کہیں زیادہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس نے جس عمل کی دعوت دی تھی وہ حقیقتاً اعلیٰ نوعیت کا تھا۔۔۔ اسے یقین تھا کہ افریقیوں کو اپنے ہندوستانی بھائیوں کی مدد کرنی چاہیے۔

لیکن راموہانو کی نافرمانی کی سنجیدگی بہت شدید تھی۔ اے این سی جیسی تنظیم افراد

سے مل کر بنتی ہے مگر یہ اپنے افراد سے کہیں زیادہ برتر ہوتی ہے۔ لہذا تنظیم سے وفاداری کو فرد سے وفاداری پر ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ میں نے بیشتر دنت کی اور اس کی مذمت میں تحریک پیش کر دی جس کی تائید آلیور ٹیمبو نے کی۔ اس پر ہال میں ایک شور اٹھا اور علاقہ ٹرانسوال کے وہ لوگ جو اپنے صدر کے حامی تھے اور وہ لوگ جو ایگزیکٹو کے حامی تھے، لفظی جنگ میں الجھ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اجلاس ہلڑ بازی کا شکار ہو کر ختم ہو گیا۔

''کالوں کو ان کے مقام پر رکھو''

افریقی ووٹ نہیں دے سکتے تھے مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہمیں پروا نہیں تھی کون الیکشن جیتا ہے۔ 1948ء کے گوروں کے عام انتخابات میں حکمران یونائیٹڈ پارٹی نے جنرل سمٹس کی قیادت میں جو اس وقت اپنے بین الاقوامی وقار کے عروج پر تھے، نئی زندگی پانے والی نیشنل پارٹی کا مقابلہ کیا۔ سمٹس نے دوسری جنگ عظیم میں جنوبی افریقہ کو اتحادیوں کے پلڑے میں ڈال دیا تھا جبکہ نیشنل پارٹی نے برطانیہ عظمیٰ کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ علانیہ طور پر نازی جرمنی سے ہمدردی رکھتی تھی۔ نیشنل پارٹی کی مہم سوارٹ گیورا یعنی کالے خطرے پر مرتکز تھی اور انہوں نے دو نعروں ڈائی کافر اوپ سائی پلیک، کافروں یعنی حبشیوں کو انکے مقام پر رکھو، اور ڈائی قولیز اوٹ ڈائی لانڈ قلیوں کو ملک سے نکال دو کی بنیاد پر الیکشن لڑا۔ یورپی آباد کار، افریکنرز حقارت سے ہندوستانیوں کو قلی کہتے تھے۔

نیشنلسٹوں کا لیڈر ڈاکٹر ڈینیل میلان ڈچ ریفارمڈ چرچ یعنی ولندیزی اصلاح شدہ کلیسا کا ایک سابق پادری اور ایک اخبار کا مدیر تھا۔ یہ جماعت تلخی اور نفرت کی پیداوار تھی۔ انہیں انگریزوں سے نفرت تھی جنہوں نے عشروں ان سے گھٹیا سلوک کیا تھا۔ انہیں افریقیوں سے نفرت تھی جو ان کے خیال میں افریکنر کلچر کی خوش حالی اور کھرے پن کے لیے خطرہ بن رہے تھے۔ افریقی جنرل سمٹس سے کوئی وفاداری

نہیں رکھتے تھے لیکن نیشنل پارٹی سے ہماری وفاداری اور بھی کم تھی۔

میلان کا پلیٹ فارم ایپارٹ ہائڈ یعنی نسلی امتیاز کے لیے معروف تھا۔ ایپارٹ ہائڈ ایک نئی اصلاح تھی مگر یہ تصور پرانا تھا۔ اس اصلاح کے لغوی معنی ہیں علیحدگی لیکن عملاً یہ ان تمام قوانین اور ضابطوں پر مشتمل جابرانہ نظام کی نمائندگی کرتی تھی جو صدیوں سے افریقیوں کو گوروں کے مقابلے میں گھٹیا پوزیشن میں رکھے ہوئے تھا۔ جو نظام اب تک ڈی فیکٹو یعنی بالفعل چلا آ رہا تھا اب اسے سختی سے ڈی جور یعنی قانونی شکل دینے کا منصوبہ پیش نظر تھا۔ پچھلے تین سو برسوں کے اکثر حادثاتی اور انفرادی نسلی امتیاز کو اب ایسے ہم آہنگ نظام میں ڈھالا جانے والا تھا جو اپنی تفصیلات میں شیطانی اپنے اثرات میں ناقابل گریز اور اپنی قوت واختیار میں بے پناہ تھا۔ ایپارٹ ہائڈ کا فلسفہ یہ تھا کہ سفید فام افریقیوں، رنگ داروں اور ہندوستانیوں سے برتر ہیں اور اس کا عملی پہلو یہ تھا کہ گوروں کی برتری ہمیشہ کے لیے قائم رکھی جائے جیسا کہ نیشنلسٹ کہتے تھے

"Die wit man moet altyd baas wees"

(سفید آدمی کو ہمیشہ باس یعنی آقا رہنا چاہیے)

ان کا پلیٹ فارم Baasskap کی اصطلاح پر استوار تھا جس کے لغوی معنی ہیں آقائی۔۔۔ یہ لفظ اپنی معنویت میں تمام تر سختی کیساتھ گورا برتری کے مترادف تھا۔ ڈچ ریفارمڈ چرچ اس پالیسی کا حامی تھا جو یہ کہہ کر ایپارٹ ہائڈ کو مذہبی جواز فراہم کرتا تھا کہ افریکنز خدا کی منتخب قوم ہیں اور یہ کہ سیاہ فام خدمت گزار نسل ہیں۔ افریکنز، عالمی تناظر میں نسلی امتیاز اور چرچ باہم شیر وشکر تھے۔

نیشنلسٹوں کی جیت

اینگلو بوئر جنگ میں نیشنلسٹوں کی فتح انگریزوں کے ذریعے افریکنزوں کے غلبے کے اختتام کا آغاز تھا۔ انگریزی کو افریکان کے پہلو بہ پہلو دوسری سرکاری زبان کی

حیثیت مل گئی تھی۔ ادھر نیشنلسٹوں کے نعرے میں ان کا مشن پوشیدہ تھا۔

"Eie volk, eie tall, eie land"

(ہماری اپنی قوم، ہماری اپنی زبان، ہماری اپنی سرزمین)

افریکنروں کی مسخ کردہ اصطلاح میں نیشنلسٹوں کی فتح اسرائیلیوں کے ارض موعود پہنچنے کے مترادف تھی۔ گویا یہ خدا کے وعدے کی تکمیل اور ان لوگوں کے اس نقطہ نظر کا جواز تھی کہ جنوبی افریقہ کو ہمیشہ سفید فاموں کا ملک رہنا چاہیے۔

ان کی یہ فتح ہمارے لیے صدمے سے کم نہ تھی۔ یونائیٹڈ پارٹی اور جنرل سمٹس نے نازیوں کو شکست دی تھی اور خیال تھا کہ وہ یقیناً نیشنل پارٹی کو دہرا دیں گے۔ انتخابات کے دن میں نے آلیور ٹیمبو اور بعض دیگر کے ہمراہ جوہانسبرگ میں ایک اجلاس میں شرکت کی۔ اس میں ہم نے شاید ہی نیشنلسٹ حکومت بننے کے امکان پر بات کی ہو کیونکہ ہمیں اس کی توقع نہیں تھی۔ رات بھر اجلاس جاری رہا اور سورج طلوع ہو رہا تھا جب ہم وہاں سے اٹھے۔ ایک بک سٹال پر رانڈ ڈیلی میل پر نگاہ پڑی تو سرخی لگی تھی: نیشنلسٹ جیت گئے۔'

میں ہکا بکا اور بدمزہ ہوا مگر آلیور نے کچھ سوچ کر بات کی۔ میں خوش ہوں۔۔ میں خوش ہوں۔ اس نے کہا۔ میں اس خوشی کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ میری سہولت کے لیے اس نے وضاحت کی۔ اب ہم ٹھیک جان لیں گے کہ ہمارے دشمن کون ہیں اور ہم کہاں کھڑے ہیں۔

جنرل سمٹس بھی اس تشدد نظریئے کے خطرات سے آگاہ تھا، چنانچہ اس نے نسلی امتیاز کو تعصب اور خوف سے جنم لینے والا ایک جنونی نظریہ قرار دیا۔ نیشنلسٹوں کے اس انتخاب سے ہم جان گئے کہ ہماری سرزمین اب کشمکش اور جدوجہد کا میدان بنے گی۔۔ جنوبی افریقہ کی تاریخ میں ایک خالص افریکنر پارٹی برسراقتدار آ گئی تھی۔ میلان نے اپنی فتح کی تقریر میں کہا تھا: افریقہ ایک بار پھر ہماری مملکت ہے۔''

اسی سال یوتھ لیگ نے ایک دستاویز کی شکل میں اپنی پالیسی وضع کی جسے اڈا نے لکھا اور لیگ کی ایگزیکٹو کمیٹی نے جاری کی۔ یہ گویا تمام محبّ وطن نوجوانوں کے لیے صلائے عام تھی کہ وہ سفید استعمار کا تختہ الٹ دیں۔ہم نے کمیونسٹوں کا یہ تصور مسترد کر دیا کہ افریقی بنیادی طور پر ایک نسل کے بجائے اقتصادی کلاس کی حیثیت سے استحصال اور ظلم کا شکار ہیں۔ہم نے کہا کہ ہمیں افریقی نیشنلزم کے پرچم تلے قومی آزادی کی ایک طاقتور تحریک اٹھانے کی ضرورت ہے جس کی قیادت خود افریقیوں کے پاس ہو۔

ہم نے اس میں مساوی بنیادوں پر زمین کی تقسیم نو، رنگ و نسل کی ان بندشوں کے خاتمے جو افریقیوں کو ہنر مندانہ کام کرنے سے روکتی تھیں اور آزدانہ اور لازمی تعلیم کی ضرورت پر زور دیا۔ اس دستاویز سے افریقی قوم پرستی کے دو حریف نظریوں میں جاری کشاکش بھی سامنے آ گئی۔ ایک نظریہ مارکس گاروے کا دیا ہوا، زیادہ انتہا پسندانہ تھا۔۔۔ ''افریقہ'' افریقیوں کے لیے۔ اور دوسرا نظریہ یوتھ لیگ کے افریقنزم پر مبنی تھا جو جنوبی افریقہ کو ایک کثیر نسلی ملک تسلیم کرتا تھا۔

میں افریقن نیشنلزم کی انتہائی انقلابی رو کا حامی تھا۔ مجھے سفید آدمی پر غصہ تھا، نسل پرستی پر نہیں۔ جہاں میں سفید آدمی کو سمندر میں پھینکنے کے لیے تیار نہیں تھا وہاں یہ بات میرے لیے نہایت خوش کن تھی کہ وہ بحری جہازوں میں بیٹھ کر اپنی مرضی سے براعظم افریقہ سے چلا جائے۔ رنگ دار بھی ظلم کا شکار تھے لیکن ہندوستانیوں کے برعکس افریقہ کے سوا ان کے لیے کوئی مادر وطن نہ تھا۔ میں ہندوستانیوں اور رنگ داروں کو اپنے ملک میں قبول کرنے کے لیے تیار تھا بشرطیکہ وہ ہماری پالیسیاں قبول کرلیں۔لیکن ان کے مفادات ہمارے ایسے نہ تھے اور مجھے شک تھا کہ وہ ہمارے کاز کو سچے دل سے قبول کر سکتے ہیں یا نہیں۔

گوری نسل پرستی کا بھوت

جلد ہی مالان نے اپنے گھناؤنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ اقتدار میں آنے کے ایک ہفتے کے اندر اندر نیشنلسٹ حکومت نے دوران جنگ کے مجرم رفو بے لائبرانٹ کو معافی دے دی جس نے نازی جرمنی کی حمایت میں سرکشی اختیار کی تھی۔ حکومت نے اپنے اس ارادے کا اعلان کیا کہ وہ ٹریڈ یونین تحریک کو دبا دیگی اور ہندوستانیوں، رنگ داروں اور افریقی قوم کی محدود رائے دہندگی ختم کر دیگی۔ ووٹر بل برائے جداگانہ نمائندگی، نے آخر کار پارلیمنٹ میں رنگ داروں کی نمائندگی کا خاتمہ کر دیا۔ 1949ء میں مخلوط شادیوں کے امتناع کا قانون نافذ کیا گیا اور اس کے تھوڑے عرصے بعد بد اخلاقی ایکٹ سامنے آیا جس نے سفید فاموں اور غیر سفید فاموں کے باہمی جنسی روابط کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ دی پاپولیشن اینڈ رجسٹریشن ایکٹ نے تمام جنوبی افریقیوں پر نسلی ٹھپہ لگا دیا اور اس طرح رنگ کو ایک فرد کی واحد اور اہم ترین شناخت بنا دیا۔ مالان نے گروپ ایریا ایکٹ بھی نافذ کیا جسے وہ نسلی امتیاز کی روح قرار دیتا تھا۔ اس کی رو سے ہر نسلی گروہ کے لیے جداگانہ شہری علاقے مخصوص ٹھہرے۔ ماضی میں گورے جبراً زمینیں ہتھیا لیتے تھے۔ اب یہ کام وہ قانون سازی کے ذریعے کرنے لگے۔

مملکت کی طرف سے اس نئے اور انتہائی طاقتور خطرے کے ردعمل میں اے این سی نے ایک غیر رسمی اور تاریخی راہ اختیار کی۔ 1949ء میں اس نے خود کو ایک خالص عوامی تنظیم میں ڈھالنے کی نمایاں کوشش کا آغاز کیا۔ یوتھ لیگ نے پروگرام آف ایکشن وضع کیا جس کا اہم نکتہ عوامی بیداری کی مہم تھا۔

بلوم فونٹائن کے اے این سی کانفرنس میں اس تنظیم نے لیگ کے پروگرام آف ایکشن کو اپنا پروگرام بنا لیا۔ اس کے تحت بائیکاٹ، ہڑتالوں، کام پر نہ جانے، مجہول مزاحمت، احتجاجی مظاہروں اور عوامی ایکشن کی دیگر صورتوں پر عمل پیرا ہونے کی اپیل کی گئی۔ یہ ایک انقلابی تبدیلی تھی کیونکہ اس سے پہلے اے این سی ہمیشہ اپنی

سرگرمیاں قانون کے تابع رکھتی تھی۔ہم نے یوتھ لیگ میں نسلی تشدد کے خلاف قانونی اور آئینی ذرائع کی ناکامی دیکھ لی تھی۔۔۔اور اب پوری تنظیم ایک زیادہ سرگرم مرحلے میں داخل ہورہی تھی۔

یہ تبدیلیاں داخلی انقلاب کے بغیر نہیں آئیں۔سالانہ کانفرنس سے چند ہفتے پہلے والٹر سے میسولو، آلیور ٹیمبو، اے پی ایڈا اور میں نجی طور پر صوفیہ ٹاؤن میں ڈاکٹر ژوما سے ان کے گھر پر ملے۔ہم نے وضاحت کی کہ ہمارے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ ہندوستانیوں میں گاندھی کی تحریک عدم تشدد اور 1946ء کو مجہول مزاحمتی مہم کی طرز پر ہم بھی عوامی تحریک شروع کردیں۔ہم نے اس امر پہ زور دیا کہ اے این سی اب تک تشدد کے مقابلے میں بہت اطاعت گزار رہی ہے۔ہم نے کہا کہ اے این سی کے رہنماؤں کو اب قانون کی خلاف ورزی پر آمادہ ہونا ہوگا اور اگر ضروری ہوتو اپنے نظریات کے لیے جیل جانا ہوگا جیسا کہ گاندھی نے کہا تھا چونکہ موہن داس کرم چند گاندھی بیسویں صدی کے اوائل میں جنوبی افریقہ جا کر نٹال میں آباد ہندوستانیوں کی احتجاجی تحریک میں سرگرم رہے تھے اور عالمی سطح پر اس کا بہت پروپگنڈہ کیا گیا تھا اس لیے سیاہ فام افریقی جن کے سامنے گوری استعماری حکومت کے خلاف تحریک اور احتجاج کا اور کوئی نمونہ نہیں تھا، بار بار گاندھی کے تحریکی امیج کی طرف دیکھنے اور اس سے رہنمائی لینے پر مجبور تھے۔۔۔مترجم)

ہم نے ڈاکٹر ژوما کو ایک الٹی میٹم دیا۔۔ہم اے این سی کی صدارت کے لیے انکے دوبارہ انتخاب کی حمایت اسی صورت میں کریں گے اگرانہوں نے ہمارے پروگرام کی حمایت کی۔اگرانہوں نے ہمارے پروگرام کی حمایت نہ کی تو ہم ہرگز انکی حمایت نہیں کریں گے۔اس پر ڈاکٹر ژوما تیخ پا ہو کر ہمیں الزام دینے لگے کہ تم مجھے بلیک میل کررہے ہو اور وہ شرائط عائد کررہے ہو جن پر تم مجھے ووٹ دوگے۔۔انہوں نے ہم سے کہا کہ تم نوجوان اور مغرور ہو اور میرا احترام ملحوظ خاطر نہیں رکھ

رہے۔۔ہم نے ان سے بحث وتمحیص کی مگر وہ بے سود رہی۔انہوں نے ہماری تجویز مسترد کردی۔

پارٹی صدر نے ہمیں گھر سے نکال دیا

انہوں نے بڑی رکھائی سے ہمیں اپنے مکان سے باہر کا راستہ دکھایا اور ہمارے پیچھے دروازہ بند کرلیا۔صوفیہ ٹاؤن میں ان دنوں سٹریٹ لائٹس نہیں تھیں اور اس رات چاندنی بھی نہیں تھی ۔ہرنوع کی پبلک ٹرانسپورٹ خاصی دیر پہلے بند ہوچکی تھی جبکہ ہم وہاں سے میلوں دور آئرلینڈو میں رہتے تھے۔آلیور نے حسرت سے کہا کہ ژوما کم ازکم ہمیں کسی ٹرانسپورٹ کی پیشکش ہی کردیتا۔والٹر کے ایک خاندان سے دوستانہ روابط تھے جوقریب ہی رہتا تھا،چنانچہ ہم ان کے ہاں جادھمکے کہ ہمیں اپنے گھر میں رات گزارلینے دیں۔

اس دسمبر کی کانفرنس میں ہم یوتھ لیگ والے جانتے تھے کہ ہم ڈاکٹر ژوما کو برطرف کرنے کے ووٹ رکھتے ہیں۔ان کے متبادل کے طور پر ہم نے صدارت کے لیے ڈاکٹر جےایس موروکا کو کھڑا کردیا۔پروفیسر زیڈ کے میتھیوس وہ شخص تھے جن کے بارے میں ہم چاہتے تھے کہ پارٹی کی قیادت کریں لیکن وہ ہمیں بہت انتہا پسند اور ہمارے پلان آف ایکشن کو انتہائی ناقابل عمل خیال کرتے تھے۔انہوں نے ہمیں سادہ لوح اور جوشیلے قرار دیا اور مزید یہ کہا کہ تم عمر کے ساتھ ساتھ نرم پڑ جاؤگے۔

ڈاکٹرموروکا ہمارا پسندیدہ انتخاب نہیں تھے۔وہ آل افریقن کنونشن اے اے سی کے رکن تھے۔جس پراس وقت روسی کمیونسٹ انقلابی ٹراٹسکائی کے پیروکاروں کا غلبہ تھا۔جب وہ ڈاکٹر ژوما کے مقابلے میں کھڑے ہونے پرآمادہ ہو گئے تو یوتھ لیگ نے انہیں اے این سی کی رکنیت دیدی۔جب ہم نے پہلی بار ان سے رابطہ کیاتو وہ بار بار اے این سی کو افریقن نیشنل کونسل کہتے رہے۔انہیں اے این سی کے متعلق

زیادہ معلومات نہ تھیں اور نہ وہ تجربہ کار تحریکی آدمی تھے۔ بس وہ معززاور ہمارے پروگرام کے لیے قابل قبول تھے۔ ڈاکٹر ژوما کی طرح وہ بھی ڈاکٹر تھے اور جنوبی افریقہ کے ایک امیر ترین سیاہ فام تھے۔ وہ ایڈنبرا اور ویانا میں پڑھتے رہے تھے۔ انکے پر دادا اورنج فری سٹیٹ میں ایک چیف تھے اور انہوں نے انیسویں صدی کے افریکنز رفورٹریک زرکا کھلے ہاتھوں اور زمین کے تحائف کے ساتھ استقبال کیا تھا اور پھر ان سفید فاموں نے انہیں دھوکا دیا تھا۔ ہماری کاوشوں سے ڈاکٹر ژوما نے شکست کھائی اور ڈاکٹر مورو کا افریقن نیشنل کانگرس کے پریزیڈنٹ جنرل بن گئے۔ والٹر میسولو نئے سیکرٹری جنرل چن لیے گئے اور آلیور ٹیمبو نیشنل ایگزیکٹو کے لیے منتخب ہوئے۔

پروگرام آف ایکشن سالانہ کانفرنس میں منظور کر لیا گیا جو بائیکاٹ، ہڑتالوں، سول نافرمانی اور عدم تعاون کے استعمال کے ذریعے سیاسی حقوق کے حصول کے لیے بلائی گئی تھی۔ مزید برآں اس نے حکومت کی نسلی اور رجعت پسندانہ پالیسیوں کے خلاف احتجاج کے طور پر ایک کام چھوڑ قومی دن کی کال دی۔ یہ شائستہ احتجاج کے دنوں کی رخصتی کا اعلان تھا اور اے این سی کے کئی پرانے ستون فزوں تر جنگجوئی کے اس دور میں منظر عام سے غائب ہو جانے والے تھے۔ یوتھ لیگ کے ارکان اب اپنی سینئر تنظیم میں جانے کے قابل ہو گئے تھے۔ اب ہم نے اے این سی کو زیادہ ترقی پسندی اور انقلابی عمل کی راہ دکھادی تھی۔

میں یوتھ لیگ کی کامیابی کا جشن ایک فاصلے پر رہ کر ہی منا سکتا تھا کیونکہ میں کانفرنس میں شرکت کرنیکے قابل نہیں تھا۔ میں ایک نئی لاءفرم کے لیے کام کر رہا تھا اور انہوں نے مجھے بلوم فونٹائن میں کانفرنس میں شریک ہونے کی اجازت نہ دی۔ یہ فرم آزاد روتھی لیکن یہ چاہتی تھی کہ میں اپنے کام پر توجہ دوں اور سیاست کو بھول جاؤں۔ اگر میں کانفرنس میں شرکت کر لیتا تو میری ملازمت چھن جاتی۔

عوامی ایکشن کی لہر تیزی سے اٹھی لیکن میں کمیونسٹوں اور ہندوستانیوں کے ساتھ مل کر ایکشن کرنے کے بارے میں شکوک میں مبتلا تھا۔ ٹرانسوال اے این سی، ٹرانسوال انڈین کانگرس، افریقن پیپلز آرگنائزیشن اور کمیونسٹ پارٹی کی ڈسٹرکٹ کمیٹی کے زیر اہتمام مارچ 1950ء میں منعقدہ آزادی تقریر بچاؤ کنونشن ، میں جوہانسبرگ کے مارکیٹ سکوائر میں دس ہزار افراد جمع ہوئے۔ ڈاکٹر موروکا نے ایگزیکٹو کمیٹی سے مشورہ کیے بغیر کنونشن کی صدارت کرنے کی حامی بھر لی۔ یہ کنونشن کامیاب رہا تاہم میں اس سے دور رہا کیونکہ اس کے پیچھے بنیادی تحریک کمیونسٹ پارٹی کی تھی۔

پاس قوانین کے خلاف ہڑتال

کمیونسٹ پارٹی اور انڈین کانگرس کے ایما پر کنونشن نے یکم مئی کو ایک روز کی عام ہڑتال کی قرارداد منظور کر لی۔ اس دن کو یوم آزادی قرار دیا گیا۔ قرارداد میں پاس قوانین اور نسلی امتیاز پر مبنی تمام قانون سازی کالعدم قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اگرچہ میں ان مقاصد کا حامی تھا لیکن میں سمجھتا تھا کہ کمیونسٹ اے این سی کے قومی دن کے احتجاج سے اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے اس بناء پر یوم مئی کی ہڑتال کی مخالفت کی کہ اے این سی نے اس مہم کا آغاز نہیں کیا۔ میری رائے یہ تھی کہ ہمیں خود اپنی مہم پر توجہ مبذول کرنی چاہیے۔

احمد کاتھراڈا کی عمر اس وقت بمشکل اکیس سال تھی۔ اور وہ دیگر نوجوانوں کی طرح اپنی طاقت آزمانے کے لیے بے قرار تھا۔ وہ ٹرنسوال انڈین یوتھ کانگرس کا ایک اہم رکن تھا اور اسنے سن رکھا تھا کہ میں نے یوم مئی کی ہڑتال کی مخالفت کی ہے۔ ایک روز جب میں کمشنر سٹریٹ میں پیدل جا رہا تھا، کاتھراڈ سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے مجھے آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے مجھ پر الزام لگایا کہ میں اور یوتھ لیگ والے ہندوستانیوں یا رنگ داروں کے ساتھ کام کرنا نہیں چاہتے۔ اس نے چیلنج کے سے انداز میں کہا: تم

ایک افریقی رہنما ہو اور میں ایک ہندوستانی نوجوان ہوں۔ لیکن مجھے سٹرائیک کے لیے افریکی عوام کی حمایت کا یقین ہے۔ میں تمہیں چیلنج دیتا ہوں کہ تم جلسے کے لیے کسی بھی افریقی بستی کا نام لو اور میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں کہ وہاں کے لوگ میری حمایت کریں گے۔"

یہ ایک خالی خولی دھمکی تھی مگر میں اس پر خاصا کبیدہ خاطر ہوا۔ میں نے اے این سی، ساؤتھ افریقن انڈین کانگرس اور کمیونسٹ پارٹی کی ایگزیکٹو کمیٹیوں کے مشترکہ اجلاس میں اس کی تند و تیز شکایت بھی کی۔ لیکن اسماعیل میر نے یہ کہہ کر مجھے ٹھنڈا کیا: نیلسن! وہ نوجوان اور گرم دماغ ہے۔ تم تو وہ رویہ نہ اپناؤ۔ میں اپنے فعل پر قدرے جھینپ گیا اور شکایت واپس لے لی۔ اگرچہ میں کاتھراڈا سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ میں نے اس کی پرجوشی کی تعریف کی اور اس لمحے ہم سب مل کر ہنسنے لگے۔

گھڑسوار پولیس کا حملہ

یوم آزادی کی ہڑتال اے این سی کی رسمی شرکت کے بغیر آگے بڑھی۔ حکومت نے پیش بندی کے طور پر تمام جلسوں اور اجتماعات پر بندش عائد کر دی۔ اس ایک روزہ ہڑتال میں دو تہائی افریقی کارکن اپنے گھروں پر رہے۔ اس رات والٹر اور میں آرلینڈو ویسٹ میں یوم آزادی کے ایک ہجوم کے حاشیہ میں موجود تھے جو حکومتی پابندیوں کے باوجود جمع ہو گیا تھا۔ چاند روشن تھا اور جب ہم منتظم احتجاجی جلوس کو دیکھ رہے تھے۔ ہمیں تقریباً پانچ سو گز دور ندی کے اس پار پولیس کا ایک جتھا نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا ہو گا، تبھی وہ اچانک ہماری سمت میں فائرنگ کرنے لگے۔ ہم زمین پر لیٹ گئے اور وہیں رہے حتیٰ کہ گھڑسوار پولیس نے ہجوم پر دھاوا بول دیا۔ وہ لوگوں کو ڈنڈوں سے پیٹ رہے تھے۔ ہم نے قریب ہی نرسوں کے ہوسٹل میں پناہ لی جہاں ہمیں اس عمارت کی دیواروں کو چھیدتی گولیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ غیر مشتعل ہجوم کے خلاف اس ظالمانہ کاروائی میں اٹھارہ افریقی

ہلاک اور بہت سے زخمی ہوئے۔

احتجاج اور تنقید کے باوجود نیشنلسٹ حکومت نے ظلم وتشدد کا شکنجہ اور کس دیا۔ چند ہفتے بعد حکومت نے بدنام زمانہ کمیونزم کو دبانے کا قانون نافذ کیا اور اس پر اے این سی نے جوہانسبرگ میں ایک ہنگامی کانفرنس بلالی۔ اس قانون نے جنوبی افریقہ کی کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا اور اس کے مطابق کمیونسٹ پارٹی کا رکن بننا کمیونزم کے مقاصد کو آگے بڑھانا جرم قرار پایا جس کی زیادہ سے زیادہ دس برس قید تھی۔ لیکن اس قانون کا مسودہ اس طرح تیار کیا گیا کہ حکومت کے خلاف معمولی سا احتجاج بھی غیر قانونی ٹھہرا اور اس نے ہر اس نظریے کی وکالت کو جرم بنا دیا جو یونین آف ساؤتھ افریقہ کے اندر گڑ بڑ یا بدنظمی پیدا کر کے سیاسی، صنعتی، سماجی یا اقتصادی تبدیلی کا علمبردار تھا۔ غرضیکہ یہ قانون حکومت کی کسی بھی تنظیم کو غیر قانونی قرار دینے اور اپنی پالیسیوں کے مخالف کسی بھی شخص کی شہری آزادیاں سلب کر لینے کا اختیار دیتا تھا۔

اے این سی، ایس اے آئی سی اور اے پی او نئے اقدامات پر بحث کرنے کے لیے پھر جمع ہوئیں۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر دادو نے کہا کہ ماضی کے اختلافات کو برقرار رکھ کر حکومت کے خلاف متحدہ محاذ کو معرض خطر میں ڈالنا احمقانہ حرکت ہوگی۔ میں نے ان کے جذبات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ کسی بھی آزادی پسند گروہ کے خلاف تشدد تمام آزادی پسند گروہوں کے خلاف تشدد شمار کیا جائے۔ آج کمیونسٹ پارٹی پر تشدد ہوا ہے۔ کل ہماری مزدور یونینوں، انڈین کانگرس، ہماری اے پی او، ہماری افریقن نیشنل کانگرس کی باری ہوگی۔

ایس اے آئی اور اے پی او کی حمایت سے اے این سی نے یکم مئی کو اٹھارہ افریقیوں کے سرکاری قتل اور کمیونزم کو دبانے کا قانون کی منظوری کے خلاف 26 جون 1950ء کو احتجاج کا قومی دن منانے کا فیصلہ کیا۔ اس تجویز کی توثیق ہوگئی اور

یوم احتجاج کی تیاری کے لیے ہم نے ایس اے آئی سی، اے پی او اور کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ مشترکہ اجلاس کیے۔ میں سمجھتا تھا کہ اب ہم ایسے خطرے سے دوچار ہیں جس نے ہمیں اپنے ہندوستانی اور کمیونسٹ ساتھیوں کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا ہے۔

اے این سی ایگزیکٹو میں

اس سال کے شروع میں اے این سی کی نیشنل کمیٹی میں چلا گیا تھا اور میں نے ڈاکٹر ژوما کی جگہ لے لی تھی جو دوبارہ پریذیڈنٹ جنرل منتخب ہونے میں ناکام رہے تھے۔ میں نے یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی تھی کہ یہ ڈاکٹر ژوما ہی تھے جنہوں نے اس وقت مجھے میری پہلی ملازمت دلانے میں مدد کی تھی جب میں دس برس پہلے جوہانسبرگ آیا تھا، جب سیاست میں حصہ لینا میرے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا۔ اب نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے میں اے این سی میں سینئر ترین لوگوں کیساتھ بڑھ کروہ ذمہ داری حاصل کر لی تھی جس سے اب تک میں کنی کترا تا رہا تھ۔ میری سوچ پر ملے جلے جذبات حاوی تھے۔ ایک شخص کے لیے مخالف رائے رکھنا آسان ہے کہ اس صورت میں اس پر ذمے داری نہیں ہوتی۔ لیکن اب ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے مجھے اپنی بات تول کر کہنا تھی۔ فیصلے کرنے تھے اور میرے جیسے باغیوں کیطرف سے مجھ پر نکتہ چینی متوقع تھی۔

جنوبی افریقہ میں عوامی ایکشن خطرناک تھا جہاں ایک افریقی کے لیے ہڑتال کرنا سنگین جرم تھا اور جہاں آزادانہ تقریر اور نقل و حرکت کے حقوق ظالمانہ طور پر کچل دیئے گئے تھے۔ ہڑتال کر کے ایک افریقی کارکن نہ صرف ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے خطرے سے دوچار ہوتا بلکہ روزی کے تمام ذرائع اور اس علاقے میں قیام کرنیکا حق بھی چھن جاتا جہاں وہ رہ رہا ہوتا۔ میرا تجربہ ہے کہ ایک سیاسی ہڑتال ایک معاشی ہڑتال کی نسبت ہمیشہ زیادہ پرخطر ہوتی ہے۔ ایک ہڑتال جو تنخواہوں

میں اضافے اور اوقات کار میں کمی جیسے متعین مسائل کے بجائے سیاسی محرومیوں سے جنم لے وہ احتجاج کی نازک صورت لیے ہوتی ہے اور خاص طور پر ایک لائق وفائق تنظیم کا تقاضا کرتی ہے۔ یوم احتجاج بھی ایک معاشی ہڑتال کے بجائے سیاسی نوعیت کا تھا۔

26 جون کی تیاری میں والٹر نے مقامی لیڈروں سے مشاورت کرتے ہوئے ملک بھر کا دورہ کیا۔ ان کی غیر موجودگی میں، میں نے اے این سی آفس کی ذمے داری سنبھالی جو ایک ہمہ گیر قومی تحریک کا مرکز تھا۔ ہر روز مختلف لیڈر یہ دیکھنے چلے آتے کہ کیا معاملات منصوبے کے مطابق چل رہے ہیں۔ موزکوتانی، ڈاکٹر واد و، ڈیلیزا امجی، جے بی مارکس، ٹرانسوال اے این سی کے صدر، یوسف کاچھالیا اور ان کے بھائی مولوی گاورراد ہے کونسل آف ایکشن کے سیکرٹری، مائیکل ہارمل پیٹر رابوروکوکو، انتھاتھوموٹلانا، میں ملک کے مختلف حصوں کی تحریکی سرگرمیوں میں رابطے کا کام کرتا اور علاقائی لیڈروں سے فون پر گفتگو رہتی۔ ہمارے پاس وقت کم رہ گیا تھا اور منصوبہ بندی جلدی میں کی گئی تھی۔

یوم احتجاج اے این سی کی طرف سے قومی سطح پر ایک سیاسی ہڑتال کرنے کی پہلی کوشش تھی اور اسے معتدل کامیابی حاصل ہوئی۔ شہروں میں اکثر کارکن گھروں پہ رہے اور سیاہ فاموں نے اپنے کاروبار بند رکھے۔ بیتھل میں گرٹ سباندے نے، جو بعد میں ٹرانسوال اے این سی کا صدر بنا، پانچ ہزار کے جلوس کی قیادت کی جسے ملک بھر میں بڑے اخبارات کی شہ سرخیوں میں جگہ ملی۔ یوم احتجاج نے ہمارا مورال بلند کردیا، ہمیں ہماری طاقت کا احساس دلایا اور ملان حکومت کو انتباہ کیا کہ ہم نسلی امتیاز کے مقابلے میں غیر متحرک نہیں رہیں گے۔ اس وقت 26 جون آزادی کی جدوجہد کا ایک سنگ میل بن چکا ہے اور تحریک آزادی کے اندر اسے یوم آزادی کے طور پر منایا جاتا ہے۔

یہ پہلا موقع تھا جب میں نے ایک قومی مہم میں اہم حصہ لیا۔ اس سے مجھے ایک ایسی خوش کا احساس ہوا جو دشمن کے خلاف اچھی منصوبہ بندی کامیابی سے ابھرتی ہے اور اس رفاقت کا احساس ہوا جو اس کے خوفناک اہداف کے خلاف لڑنے سے جنم لیتی ہے۔

ڈیڈی کہاں رہتے ہیں

یہ جدوجہد جو میں سیکھ رہا تھا، بے حد توجہ طلب اور وقت طلب تھی۔ اس جدوجہد میں شریک ہوکر میری حیثیت اس شخص کی سی تھی جس کی اپنی کوئی گھریلو زندگی نہ ہو۔ یوم احتجاج کے موقع پر ہی میرا دوسرا بیٹا میک گاتھو لیوانیکا پیدا ہوا تھا۔ اگرچہ میں ایولین کے پاس اس وقت ہسپتال میں تھا جب وہ دنیا میں آیا لیکن میری سرگرمیوں میں یہ انقطاع نہایت مختصر تھا۔ اس کا نام میفا کو ماپو گو میک گاتھو کے نام پر جو 1917ء سے 1924ء تک اے این سی کے دوسرے صدر رہے تھے اور لیوانیکا کے نام پر رکھا گیا جو زیمبیا کے ایک سرکردہ چیف تھے۔ میک گاتھو، ایک پیڈی چیف کے بیٹے۔ نے رنگ ونسل کے اس امتیاز کو چیلنج کرنے کے لیے رضا کاروں کی قیادت کی تھی جو افریقیوں کو پریٹوریا کی سڑکوں پر چلنے سے روکتا تھا اور اس شخص کا نام میرے ناقابل تسخیر ہونے اور جرات کی علامت تھا۔

اسی زمانے میں ایک روز میری بیوی نے مجھے بتایا کہ ہماری بڑے بیٹے تھیمبی نے جو پانچ سال کا تھا اس سے پوچھا تھا: ڈیڈی کہاں رہتے ہیں میں عرصے سے رات کو دیر سے گھر لوٹتا تھا او وہ اس سے کہیں پہلے سو چکا ہوتا تھا اور میں اس کے جاگنے سے پہلے صبح سویرے ہی گھر سے نکل جاتا تھا۔ میں اپنے بچوں کی صحبت سے محروم ہونا پسند نہیں کرتا تھا مگر مجبور تھا۔ ان دنوں وہ مجھے گھر سے باہر بہت یاد آتے۔ تب میرے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ مجھے کئی عشرے ان سے جدائی میں گزارے ہوں گے۔

ان دنوں مجھے اس بات کا کہیں زیادہ یقین تھا کہ میں کس کے خلاف لڑ رہا ہوں بہ نسبت اس کے کہ کس کے حق میں لڑ رہا ہوں۔ کمیونزم کے خلاف میری برسوں کی مخالفت دم توڑ رہی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری اور اے این سی کی ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن موسز کوٹانی اکثر میرے گھر رات آتے اور ہم صبح تک بحث و مباحثہ کرتے۔ واضح سوچ رکھنے والا اور خود تعلیم یافتہ کوٹانی، ٹرانسوال کے ایک کسان کا بیٹا تھا۔ وہ کہتا: نیلسن، تم کس لیے ہمارے خلاف ہو، ہم سب ایک ہی دشمن کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ہم اے این سی پر حاوی ہونا نہیں چاہتے۔ ہم افریقن قوم پرستی کے دائرے میں کام کر رہے ہیں۔ آخرکار اس کے دلائل کا میرے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔

کمیونسٹوں سے میری مفاہمت

کوٹانی، اسماعیل میر اور روتھ فرسٹ سے میری دوستی اور ان کی قربانیوں کے ذاتی مشاہدے کے باعث میرے لیے کمیونسٹ پارٹی کے خلاف اپنے تعصب کا جواز پیش کرنا زیادہ سے زیادہ مشکل ہو رہا تھا۔ اے این سی کے اندر جے بی مارکس، ایڈون موفتسنیانا، ڈان ٹلومے اور ڈیوڈ موپاپے اور دیگر کمیونسٹ ارکان مخلص اور محنتی تھے اور مجاہدین آزادی کے طور پر ان پر حرف گیری نہیں کی جا سکتی تھی۔ 1946ء کی مزاحمت کے ایک لیڈر ڈاکٹر دادو ایک معروف کمیونسٹ تھے جن کے انسانی حقوق کے لیے لڑنے والے کردار نے انہیں تمام گروہوں کا ہیرو بنا دیا تھا۔ میں ایسے خواتین و حضرات کے کردار و خیالات پر اب کوئی اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔

اگر میں ان کے خلوص کو چیلنج نہیں کر سکتا تھا تو مارکسزم کے فلسفیانہ اور عملی اطلاق پر سوال تو اٹھا سکتا تھا۔ لیکن میرا مارکسزم کا علم نہ ہونے کے برابر تھا اور اپنے کمیونسٹ دوستوں کیساتھ سیاسی بحث مباحثہ میں ان کے فلسفے سے بے خبری کے باعث میں اپنے آپ کو بیچارگی کی حالت میں پاتا۔ میں نے اس کا حل ڈھونڈنے کا فیصلہ کر

لیا۔

میں نے مارکس انیجلز، لینن، سٹالن، ماوزے تنگ اور دوسروں کی تمام تصانیف حاصل کیں اور جدلیاتی اور تاریخی مادیت کے فلسفے کو کھنگالنے لگا۔ ان کتابوں کا ٹھیک ٹھیک مطالعہ کرنے کے لیے میرے پاس وقت نہ ہونے کے برابر تھا۔ جہاں میں کمیونسٹ منشور سے متاثر ہوا وہاں داس کیپٹال سے کبیدہ خاطر ہوا۔ لیکن غیر طبقاتی معاشرے کے تصور نے مجھے اپنی طرف خاصا کھینچا جو میری نظر میں روایتی ثقافت سے مشابہ تھا جہاں زندگی مشترکہ اور اجتماعی تھی۔ میں نے مارکس کے بنیادی دعوے کی طرف جھکاؤ محسوس کیا جس سے سنہری حکومت کی سادگی اور نوازشات کا اظہار ہوتا ہے۔۔ ہر ایک سے اس کی اہلیت کے مطابق کام لیا جائے، ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق دیا جائے۔

جدلیاتی مادیت بظاہر ایک سرچ لائٹ بھی پیش کرتی تھی جو نسلی تشدد کی تاریک رات کو روشن کیے دیتی تھی اور ایک اوزار بھی جو اس رات کو ختم کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اسنے مجھے سیاہ، سفید تعلقات کے منشور سے دیکھنے کے بجائے صورت حال کا وسیع تر اوراک دیا کیونکہ اگر ہماری جدوجہد کو کامیاب ہونا تھا تو ہمیں سیاہ، سفید کے تصور سے اوپر اٹھنے کی ضرورت تھی۔ مجھے جدلیاتی مادیت کے سائنٹفک پہلوؤں میں کشش محسوس ہوئی کیونکہ میں ہمیشہ اس پر اعتماد کرتا ہوں جس کی میں تصدیق کرسکوں۔ اسکا معاشیات کا مادی تجزیہ مجھے درست لگتا تھا۔ یہ تصور کہ چیزوں کی قدر محنت کی مقدار پر مبنی ہے جو ان پر صرف ہوئی ہو۔ جنوبی افریقہ پر خاص طور پر صادق آتا تھا۔ حکمران طبقہ افریقی مزدوروں کو کم سے کم اجرت ادا کرتا تھا اور پھر اشیاء کی لاگت میں قدر کا اضافہ کردیتا تھا اور یہ قدر یا قیمت وہ اپنے لیے مخصوص رکھتا تھا۔

مارکسزم کی انقلابی عمل کی کال ایک مجاہد آزادی کے لیے خوش آہنگ تھی۔ یہ تصور

بھی کہ تاریخ جدوجہد سے ترقی کرتی ہے اور یہ کہ تبدیلی انقلابی اقدامات سے عمل میں آتی ہے، ذہن کو اپیل کرتا تھا۔ مارکسسٹ تصانیف کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے بہت سی معلومات ملیں جو ان متنوع مسائل سے متعلق تھیں جو ایک عملی سیاستدان کو پیش آتے ہیں۔ مارکسسٹ قومی آزادی کی تحریکوں پر سنجیدہ توجہ دیتے تھے او رسوویت یونین خاص طور پر کئی استعمار زدہ قوموں کی آزادی کی جدوجہد کی حمایت کرتا تھا۔ یہ ایک درجہ اور وجہ تھی جس کی بنا پر میں نے کمیونسٹوں کے بارے میں اپنا نظریہ تبدیل کر لیا تھا اور اے این سی کی مارکسٹوں کو اپنی صفوں میں خوش آمدید کہنے کی پوزیشن قبول کر لی تھی۔

ایک مرتبہ ایک دوست نے مجھ سے پوچھا کہ تم اپنے نظریہ افریقی قوم پرستی اور جدلیاتی مادیت کے عقیدے کے مابین کیسے مطابقت پیدا کر سکتے ہو۔ میرے نزدیک اس میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ میں سب سے پہلے ایک افریقی قوم پرست تھا جو اقلیتی حکومت سے اپنی آزادی اور اپنی قسمت کا خود مالک بننے کے حق کے لیے لڑ رہا تھا۔لیکن اس کے ساتھ ہی جنوبی افریقہ اور افریقی براعظم ایک وسیع تر دنیا کا جزو بھی تھا۔ ہمارے مسائل کو ممتاز اور مخصوص ہوتے ہوئے بھی کوئی واحد مثال نہیں تھے اور ایک فلسفہ جو ان مسائل کو وسیع تر دنیا کے ایک بین الاقوامی اور تاریخی تناظر میں رکھتا تھا۔ قابل قدر تھا۔ کمیونسٹوں کے ساتھ کام کرنے کے لیے مجھے کمیونسٹ بننے کی ضرورت تھی۔ میں نے جان لیا تھا کہ افریقی قوم پرستوں اور افریقی کمیونسٹوں کے پاس تقسیم ہونے کی نسبت متحد ہونے کے لیے کہیں زیادہ وجوہات تھیں۔

روکھے اور سگ خو ہمیشہ یہ کہتے آئے تھے کہ کمیونسٹ ہمیں استعمال کر رہے تھے لیکن کون کہہ سکتا تھا کہ ہم انہیں نہیں کر رہے تھے۔

کافر کو اوقات میں رکھو

اگر نیشنل پارٹی کے برسر اقتدار آنے سے پہلے اس کے بارے میں ہمیں موہوم

امیدیں تھیں بھی تو اب کے رویے نے ہماری آنکھیں کھول دی تھیں۔ کافر کو اس کی اوقات میں رکھنے کی اس کی دھمکی یونہی نہیں تھی۔ کمیونزم کو دبانے کے قانون سے قطع نظر 1950ء میں پاس ہونے والے دو قوانین نسلی امتیاز کی پالیسی کے سنگ میل ثابت ہوئے۔ یہ تھے پاپولیشن اینڈ رجسٹریشن ایکٹ اور گروپ ایریاز ایکٹ، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، پاپولیشن اینڈ رجسٹریشن ایکٹ نے حکومت کو سرکاری طور پر نسل کی بنیاد پر جنوبی افریقیوں کی درجہ بندی کرنے کا اختیار دے دیا۔ اگر پہلے ایسا نہیں تھا تو اب نسل جنوبی افریقی معاشرے کی ناگزیر شرط بن گئی۔ کالے کو رنگ دار یا رنگ دار کو سفید سے الگ کرنے کے من مانے اور بے معنی ٹیسٹوں کا اکثر المناک نتیجہ نکلتا جب ایک ہی خاندان کے ارکان مختلف درجوں میں رکھ دیے جاتے محض اس امر پر اعتبار کر کے کہ ایک بچے کے نین نقش ہلکے ہیں یا گاڑھے۔ ایک شخص کو کہاں کام کرنا ہے یا کہاں رہنا ہے اس کا فیصلہ اس نوع کے فضول امتیازات سے کیا جاتا کہ اس کے بالوں کے گھونگر کیسے ہیں یا اس کے ہونٹوں کا سائز کیا ہے۔

گروپ ایریاز ایکٹ رہائشی نسلی امتیاز کی بنیاد تھا۔ اس کے ضابطوں کے تحت ہر نسلی گروہ اپنے لیے مخصوص علاقے ہی میں زمین خرید سکتا تھا۔ رہائش اختیار کر سکتا تھا اور تجارت کر سکتا تھا۔ یوں ہندوستانی صرف ہندوستانی علاقوں میں رہ سکتے تھے۔ افریقی نژاد افریقی علاقوں میں اور رنگ دار باشندے رنگ دار علاقوں میں۔ اگر سفید فام کسی دوسرے گروہ کی زمین یا مکانات حاصل کرنا چاہتے تو وہ بس اس علاقے کو سفید قرار دے کر ان پر قابض ہو سکتے تھے۔ گروپ ایریاز ایکٹ نے جبری ہٹاؤ کے دور کا آغاز کیا۔۔ جب نئے قرار پائے سفید شہری علاقوں سے افریقی آبادیاں، قصبے اور گاؤں پورے تشدد سے اٹھوا دیئے جاتے کیونکہ سفید مالکان زمین افریقیوں کو اپنے قریب بستے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے یا وہ ان کی زمین پر قبضہ جمانا چاہتے تھے۔

اس ہٹاؤ میں سرفہرست صوفیہ ٹاؤن تھا جو پچاس ہزار سے زائد لوگوں کو متحرک پذیر آبادی تھی اور جوہانسبرگ میں قدیم ترین سیاہ آبادیوں میں سے ایک تھی۔ اپنی غربت کے باوجود صوفیہ ٹاؤن نسبتاً امیرانہ زندگی سے بھرپور ایک ایسی پرورش گاہ تھا جہاں افریقی زندگی و ثقافت اپنے جدید رنگوں کے ساتھ نظر آتی تھی۔ صوفیہ ٹاؤن کو ہٹانے کی سرکاری کوششوں سے پہلے ہی اس نے اپنی مختصر آبادی سے کہیں بڑھ کر افریقیوں کے لیے علامتی اہمیت اختیار کر لی تھی۔

گوری حکومت کے نئے پھندے

اگلے سال حکومت نے دو مزید قوانین پاس کیے جنہوں نے رنگ داروں اور افریقیوں کے حقوق پر براہ راست ڈاکہ ڈالا۔ ووٹروں کی جداگانہ نمائندگی کے قانون نے صوبہ کیپ میں رنگ داروں کا حق انتخاب محدود کر دیا جو انہیں ایک صدی سے زیادہ عرصے سے حاصل تھا۔ بنٹو اتھارٹیز ایکٹ نے مقامی نمائندہ کونسل کالعدم قرار دے دی جو افریقیوں کے لیے قومی نمائندگی کا ایک بالواسطہ فورم تھی۔ اس کے بجائے حکومت کے مقرر کردہ قبائلی چیفس کا ایک موروثی نظام متعارف کرایا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ روایتی اور زیادہ تر قدامت پسند نسلی رہنماؤں کے اختیارات بحال ہو جائیں تاکہ نسلی اختلافات کا تسلسل جاری رہے جو بتدریج مٹنے لگے تھے۔ یہ دونوں قوانین نیشنلسٹ حکومت کی، اخلاقیات کا عملی نمونہ تھے اور تحفظ دینے کے نام پر تباہ کرنے کے قانون بن گئے۔ کیا ستم ظریفی تھی کہ لوگوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے والے قوانین گوروں کی لغت میں حقوق بحال کرنے والے قوانین قرار پائے تھے۔

رنگ دار لوگوں نے جداگانہ نمائندگی کے ووٹر ایکٹ کے خلاف ریلیاں منعقد کیں، مارچ 1951ء میں کیپ ٹاؤن میں ایک زبردست مظاہرہ کیا اور اپریل میں ایک ہڑتال کی جس میں دکانیں بند اور سکولوں کے بچے گھروں پر رہے۔

ہندوستانیوں، رنگ داروں اور افریقیوں کے اس تحریکی جذبے کے پس منظر میں ہی والٹر میسولو نے ہمارے مختصر اجتماع کے سامنے ایک قومی سول نافرمانی کی مہم کا تصور پیش کیا۔ اس نے ایک منصوبہ وضع کیا جس کے تحت تمام گروہوں کے منتخب رضا کار بعض قوانین کو چیلنج کرتے ہوئے از خود گرفتاریاں پیش کرتے۔

ہندوستانیوں سے الرجی

اس تصور نے فوراً میرے ذہن کو اپیل کیا جیسا کہ دوسروں کو بھی کیا، مگر مجھے والٹر سے اس سوال پر اختلاف تھا کہ اس میں کون کون حصہ لیں گے۔ میں حال ہی میں یوتھ لیگ کا نیشنل پریذیڈنٹ بن گیا تھا اور ایک عام افریقی ابھی تک ہندوستانیوں اور رنگ داروں کے ساتھ مل کر مشترکہ مہم چلانے میں ذہنی تحفظ رکھتا ہے۔ اگرچہ میں نے کمیونزم کی مخالفت کم کرنے کی طرف پیش رفت کی تھی۔ میں ابھی تک ہندوستانیوں کے اثر و رسوخ کے خوف میں مبتلا تھا۔ مزید براں ہمارے بہت سے ابتدائی سطح پر افریقی حامی ہندوستانیوں کو سیاہ لیبر کا استحصال کرنے والے خیال کرتے تھے جیسا کہ انہوں نے دکانداروں اور تاجروں کی حیثیت سے یہ کردار اپنا رکھا تھا۔

والٹر کو اس سے شدید اختلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ افریقی، ہندوستانی اور رنگ دار سب ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ یہ معاملہ نیشنل ایکزیکٹو کمیٹی کے ایک اجلاس میں اٹھایا گیا اور اس میں میرا نقطہ نظر مسترد کر دیا گیا حتیٰ کہ ان لوگوں نے بھی اس کے خلاف رائے دی جو پکے افریقی قوم پرست خیال کیے جاتے تھے۔ تاہم میں صدر تھا اور میں نے ایک بار پھر یہ مقصد دسمبر 1951ء کی نیشنل کانفرنس میں اٹھایا جہاں شرکاء نے میرا نقطۂ نظر اسی طرح مسترد کر دیا جس طرح نیشنل ایگزیکٹو نے کیا تھا۔ اب جبکہ میرا موقف اے این سی میں اعلیٰ ترین سطح پر مسترد ہو گیا تھا، میں نے متفقہ پوزیشن قبول کر لی۔ الگ تھلگ چلنے کی سٹراٹیجی پر میں نے جو

تقریر کی تھی اس پر سامعین نے نیم دلانہ تاثرات ظاہر کیے تھے مگر اب یوتھ لیگ کے تعاون کی نئی پالیسی اپنانے کے بعد یوتھ لیگ کے صدر کی حیثیت سے میں نے جو تقریر کی اس پر داد تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے۔

ڈاکٹر موروکا، والٹر جے بی مارکس، یوسف دادو اور یوسف کا چھالیا پر **مشتمل** جوائنٹ پلاننگ کونسل کی درخواست پر اے این سی کانفرنس نے ایک قرارداد منظور کی جس میں حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ کمیونزم کو دبانے کا قانون گروپ ایریاز ایکٹ، جداگانہ نمائندگی کا ووٹرز ایکٹ، بنٹو اتھارٹیز ایکٹ، پاس قوانین مویشیوں کو بے تحاشہ چرانے سے روکنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ لیکن اس کے نتیجے میں افریقیوں کی زمینیں مزید محدود کر دی گئیں۔ مشترکہ پلاننگ کونسل نے طے کیا کہ اے این سی 6 اپریل 1952ء کو مظاہرے کرے گی جو غیر منصفانہ قوانین کو چیلنج کرنے کی مہم کا پیش خیمہ ہوں گے۔

اسی روز سفید فام جنوبی افریقی 1652ء میں کیپ راس امید پر جان فان رائی بیک کی آمد کی تین سویں برس منا رہے تھے۔ 6 اپریل وہ دن ہے جب سفید فام جنوبی افریقی اپنے **ملک** کے قیام کی سالانہ یاد مناتے ہیں اور افریقی باشندے اسے اپنی تین سو سالہ غلامی کا نقطہ آغاز سمجھتے ہیں۔

اے این سی نے وزیراعظم کے نام ایک خط تیار کیا جس میں انہیں پارٹی کی قرار دادوں پر توجہ دینے کا مشورہ دیا اور قوانین واپس لینے کے لیے ایک ڈیڈ لائن دی گئی۔ چونکہ یہ خط ڈاکٹر موروکا کے نام سے جانا تھا اور ڈاکٹر موروکا نے اس کی تیاری میں حصہ نہیں لیا تھا اس لیے مجھے یہ ذمہ داری تفویض ہوئی کہ موٹر گاڑی میں یہ خط انکے گھر بانچو پہنچا آؤں جو اورنج فری سٹیٹ میں بلوم فونٹائن کے نزدیک ایک قصبہ تھا اور یہ **ملک** کا ایک بہت قدامت پرست علاقہ تھا۔ میں ان سے ملنے شاید ہی کبھی وہاں گیا تھا۔

ڈرائیونگ ٹیسٹ کا عجب مرحلہ

چند ہفتے پہلے ہی میں نے ڈرائیونگ ٹیسٹ دیا تھا۔ان دنوں ڈرائیونگ لائسنس ایک افریقی کے لیے غیر معمولی چیز تھا کیونکہ بہت ہی کم سیاہ فاموں کے پاس کاریں تھیں۔مقررہ دن ٹیسٹ دینے کے لیے میں نے ایک کار ادھار لی تھی۔میں پھولا نہ سمارہا تھا اور میں نے خود کار چلا کر وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔مجھے دیر ہو رہی تھی اور میں نسبتاً تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا۔جب میں نے مین ڈور سے ہٹ کر کار ایک ذیلی سڑک پر موڑی تو میں دونوں طرف دیکھنے میں ناکام رہا اور دوسری سمت سے آنے والی ایک کار سے ٹکرا گیا۔نقصان تو معمولی رہا لیکن اب میرا دیر سے پہنچنا یقینی ہو گیا تھا۔دوسرا ڈرائیور ایک معقول آدمی تھا اور ہم نے یہی طے کیا کہ اپنا اپنا نقصان خود پورا کریں۔

جب میں ٹیسٹنگ اسٹیشن پہنچا تو مجھے اپنے سامنے ایک سفید عورت دکھائی دی جو آدھا ٹیسٹ دے چکی تھی۔وہ اچھی اور احتیاط سے گاڑی چلا رہی تھی۔جب اس کا ٹیسٹ ختم ہوا تو ڈرائیونگ انسپکٹر نے کہا: آپ کا شکریہ کیا آپ مہربانی سے اپنی گاڑی وہاں پارک کریں گی؟ یہ کہتے ہوئے اس نے قریب ہی ایک خالی جگہ کی طرف اشارہ کیا۔اس عورت نے پاس کرنے کے لیے کافی اچھا ٹیسٹ دیا تھا لیکن جب وہ گاڑی پارکنگ کی جگہ تک لے جا رہی انسپکٹر تیزی سے اس کی طرف گیا اور اس سے کہا: مادام مجھے افسوس ہے آپ ٹیسٹ میں ناکام ہو گئی ہیں۔براہ کرم ایک روز پھر آیئے گا۔یہ سن کر میرا اعتماد گرداب کا شکار ہو گیا۔میں نے سوچا اگر یہ گورا ایک گوری عورت کو ڈرائیونگ ٹیسٹ میں ناکام کر سکتا ہے تو میں کس کھیت کی مولی ہوں؟ لیکن میں نے ڈرائیونگ ٹیسٹ بہت اچھا دیا اور جب انسپکٹر نے ٹیسٹ کے آخر میں مجھ سے کہا کہ کار وہاں پارک کروں تو میں نے اس قدر احتیاط سے گاڑی چلائی کہ مجھے خدشہ ہوا اتنا آہستہ چلانے پر وہ مجھے جرمانہ کر دے گا۔

ایک بار جب میں قانونی طور پر گاڑی کا اہل ہو گیا تو میں نے دن میں ٹیکسی سروس شروع کر دی۔ یہ ہر کار چلانے والے کا فرض تھا کہ وہ ساتھیوں اور دوستوں کو لفٹ دے۔ اسی لیے مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ میں مشترکہ پلاننگ کونسل کا خط ڈاکٹر موروکا کو پہنچا آؤں۔ یہ کوئی مشکل کام نہ تھا کیونکہ مجھے گاڑی چلاتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھانکنا ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ میرے ذہن میں اس وقت بہترین خیالات آتے تھے جب میں دیہی علاقے میں گاڑی چلا رہا تھا اور کھڑکی سے تازہ ہوا اندر آ رہی ہوتی۔

گورے سائیکل سوار سے ٹکر

تھابا انچو کی طرف جاتے ہوئے میں کرون سناڈ سے گزرا جو جوہانسبرگ سے تقریباً 120 میل جنوب میں اورنج فری سٹیٹ کا ایک قدامت پرست قصبہ ہے۔ میں جس سڑک پر کار چلا رہا تھا وہ پہاڑی کے اوپر چڑھ رہی تھی۔ مجھے اپنے سامنے دو سفید فام لڑکے بائیسائیکلوں پر جاتے نظر آئے۔ میری ڈرائیونگ قدرے غیر مستقل تھی اور میں ان کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا جب ان میں سے ایک نے اشارہ دیئے بغیر اچانک موڑ کاٹا اور ہم ٹکرا گئے۔ وہ اپنی سائیکل سے گر پڑا اور جب میں اس کی مدد کے لیے کار سے باہر نکلا وہ کراہ رہا تھا۔ اس نے بازو پھیلا رکھے تھے جو اس بات کا اشارہ تھا کہ میں آگے بڑھ کر اسے اٹھاؤں مگر عین اس وقت جب میں ایسا کرنے والا تھا ایک سفید فام ٹرک ڈرائیور دور سے چلایا کہ میں بچے کو نہ چھوؤں۔ ٹرک ڈرائیور نے بچے کو ڈرا دیا۔ چنانچہ اس نے اپنے بازو گرا لیے جیسے اب وہ یہ نہ چاہتا ہو کہ میں اسے اٹھاؤں۔ لڑکا زیادہ زخمی نہ ہوا تھا۔ ٹرک ڈرائیور اسے پولیس اسٹیشن لے گیا جو قریب ہی تھا۔

کچھ دیر بعد مقامی پولیس آ گئی۔ سفید سارجنٹ نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور بولا، کافر، جائی سال کاک فان ڈاگ۔ کافر آج تم پاخانہ کرو گے، میرا دماغ اس

حادثے اور اس کے الفاظ کی شدت پر جھنجھنا اٹھا مگر میں نے واضح الفاظ میں اس سے کہا، میں جب چاہوں گا پاخانہ کروں گا مگر ایک پولیس والے کے کہنے پر نہیں۔ اس پر سارجنٹ نے میرے کوائف درج کرنے کے لیے اپنی نوٹ بک نکالی۔ افریکان پولیس والے حیران رہ گئے کہ ایک کالا آدمی بھی انگریزی بول سکتا ہے بلکہ پلٹ کر جواب بھی دے سکتا ہے۔

میرے شناخت کروانے کے بعد وہ کار کی طرف مڑا اور دروازہ کھول کر نشستیں درہم برہم کر دیں۔ پھر فرشی چٹائی کے نیچے سے اس نے بائیں بازو کے ہفتہ وار اخبار، دی گارڈین، کی ایک کاپی نکالی جو میں نے حادثے کے فوراً بعد چھپا دی تھی جبکہ ڈاکٹر موروکا کے نام خط میں نے قمیض کے اندر چھپا لیا تھا۔ اس نے اخبار کے ٹائٹل کی طرف دیکھا اور پھر اسے ہوا میں یوں لہرایا جیسے ڈاکو کے ہاتھ مال غنیمت آ گیا ہو۔ ساتھ ہی وہ چلایا، ریک ٹک اونس ہیٹ انکومونس گیوان، ہم نے ایک کمیونسٹ پکڑ لیا ہے۔ پھر وہ اخبار کو لہراتے ہوئے تیزی سے چلا گیا۔

تقریباً چار گھنٹے بعد سارجنٹ لوٹا تو ایک اور افسر اس کے ہمراہ تھا۔ یہ سارجنٹ بھی افریکنز تھا اور وہ اپنی ڈیوٹی ٹھیک ٹھاک انجام دینے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ اسے پولیس ریکارڈ کے لیے مقام حادثہ کی پیائش درکار ہیں۔ میں نے سارجنٹ سے کہا کہ رات کے وقت پیائشیں لینا مناسب نہیں جبکہ حادثہ دن کی روشنی میں ہوا تھا۔ میں نے مزید کہا کہ میں رات تھابانچو میں گزارنا چاہتا ہوں اور یہ کہ میں کرون سٹاڈ میں ٹھہرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ سارجنٹ نے عدم تحمل سے اپنی نگاہیں مجھ پر گاڑتے ہوئے کہا: تمہارا نام کیا ہے؟''

''منڈیلا نے کہا۔

''نہیں شروع والا، اس نے کہا۔ میں نے بتایا۔

''نیلسن!'' سارجنٹ نے یوں کہا جیسے وہ ایک بچے سے بات کر رہا ہو۔ ''میں

تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں تا کہ تم اپنا سفر جاری رکھ سکو۔لیکن اگر تم میرے لیے مشکل پیدا کرو گے تو میرے لیے کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ میں تمہارے لیے مشکل پیدا کروں اور رات کے لیے تمہیں حوالات میں بند کر دوں۔اس پر میرے غبارے سے ہوا نکل گئی اور میں نے پیمائشوں پر رضامندی ظاہر کر دی۔

اس رات کے پچھلے پہر میں نے اپنا سفر پھر شروع کیا اور اگلی صبح میں ضلع ایکسیل شیئر میں سے گزر رہا تھا جب میری کار اچانک رک گئی۔میرے پاس پٹرول ختم ہو گیا تھا۔میں چل کر ایک قریبی فارم ہاؤس تک گیا اور ایک سفید فام بڑی بی سے انگریزی میں کہا کہ میں کچھ پٹرول خریدنا چاہتا ہوں۔اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا: تمہارے لیے میرے پاس کوئی پٹرول نہیں۔میں لشتم پشتم دو میل چل کر اگلے فارم ہاؤس پہنچا اور اپنی پہلی ناکام کوشش سے سبق حاصل کرتے ہوئے ایک مختلف ترکیب آزمائی۔میں نے کاشتکار سے ملنے کی گاڑی میں پٹرول ختم ہو گیا ہے دوستی اور تعاون کے جذبے سے سرشار وہ کاشتکار وزیراعظم مالان سٹرائیدم کا ایک رشتے دار تھا۔پھر بھی مجھے یقین ہے کہ اگر میں اسے حقیقت بتا دیتا اور قابل نفرت لفظ آقا منہ سے نہ نکالتا تو بھی وہ مجھے پٹرول دے دیتا۔

وزیراعظم کی دھمکی

ڈاکٹر موروکا سے میری ملاقات میرے سفر سے کہیں کم پر واقعہ رہی۔اس نے خط کی منظوری دے دی اور میں نے جوہانسبرگ واپسی کی راہ لی اور کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا۔وزیراعظم کے نام خط میں کہا گیا تھا کہ اے این سی اپنے قانونی حقوق حاصل کرنے کے لیے ہر دستیاب آئینی ذریعہ استعمال کر چکی ہے اور یہ کہ ہم چھ غیر منصفانہ قوانین 29 فروری 1952ء تک واپس لینے کا مطالبہ کرتے ہیں۔بصورت دیگر ہم آئین سے ہٹ کر قدم اٹھائیں گے۔مالان کے جواب میں، جس پر اس کے سیکرٹری کے دستخط تھے، اس پر زور دیا گیا تھا کہ سفید فاموں کو موروثی حق

حاصل ہے کہ وہ ایک جداگانہ کمیونٹی کے طور پر اپنے تشخص کا تحفظ کریں۔ اس کے آخر میں دھمکی دی گئی تھی کہ اگر ہم اپنے عملی اقدامات پر اڑے رہے تو حکومت کسی بھی قسم کی گڑبڑ ختم کرنے کے لیے اپنی مشینری کے پورے پورے استعمال میں تامل نہیں کرے گی۔

ہم نے مالان کی طرف ہمارے مطالبات سرد مہری سے مسترد کر دینے کا اعلان جنگ خیال کیا۔ اب ہمارے پاس سول نافرمانی کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ چنانچہ ہم عوامی ایکشن کی ابتدائی تیاریوں میں جت گئے۔ رضا کاروں کی بھرتی اور تربیت اس مہم کے ضروری فریضے تھے اور بڑی حد تک انہی پر اس کامیابی یا ناکامی کا انحصار تھا۔ 6۔ اپریل کو جوہانسبرگ، پریٹوریا، پورٹ ایلزبتھ، کیپ ٹاؤن اور ڈربن میں ابتدائی مظاہرے ہوئے۔ ڈاکٹر موروکا نے جوہانسبرگ میں فریڈم سکوائر میں خطاب کیا جبکہ میں نے گارمنٹ ورکرز یونین کے احاطے میں پوشیدہ رضا کارون کے ایک گروہ کے سامنے تقریر کی۔ میں نے کئی سو افریقیوں، ہندوستانیوں اور رنگ داروں کے اس اجتماع کو تفصیل سے بتایا کہ رضا کار کے فرائض انجام دینا ایک مشکل نیز خطرناک ذمے داری ہے کیونکہ حکام رضا کاروں کو ڈرانے، قید کرنے اور شاید ان پر حملہ کرنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ حکام خواہ کچھ ہی کریں۔ رضا کاراس کا ہرگز جواب نہیں دیں گے۔ بصورت دیگروہ اس پوری مہم کاستیاناس ہی کریں۔ رضا کاراس کا ہرگز جواب نہیں دیں گے، بصورت دیگروہ اس پوری مہم کاستیاناس کر بیٹھیں گے۔ انہیں تشدد کا جواب عدم تشدد سے دینا ہوگا۔ نیز نظم وضبط ہر صورت میں برقرار رکھنا ہوگا۔

31 مئی کو اے این سی اور ایس اے سی کی ایگزیکٹو کمیٹیوں کا مشترکہ اجلاس پورٹ ایلزبتھ میں ہوا اور انہوں نے اعلان کیا کہ ڈیفائنس کمپین قانون کی خلاف ورزی کرنے کی مہم 26 جون کو شروع ہوگی جو پہلے نیشنل ڈے آف پروٹیسٹ، کی سالگرہ

ہے۔انہوں نے مہم کو ہدایات دینے کے لیے ایک نیشنل ایکشن کمیٹی اور رضا کاروں کی بھرتی اور تربیت کے لیے ایک نیشنل والنٹیر بورڈ قائم کیا۔ مجھے مہم کا نیشنل والنٹیر چیف اور ایکشن کمیٹی اور والنٹیر بورڈ دونوں کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ مہم کو منظم کرنا، علاقائی شاخوں کو مربوط کرنا اور رضا کار بننے کے لیے لوگوں کو آمادہ کرنا اور فنڈ اکھٹے کرنا میرے فرائض میں شامل تھے۔

گاندھی کا جادو نہ چل سکا

ہم نے اس پر بھی بحث کی کہ کیا مہم عدم تشدد کے گاندھوی اصولوں پر چلائی جائے جسے مہاتما نے ستیہ گرہ دیا تھا جس کا مقصد قلب و ذہن کی تبدیلی کے ذریعے فتح کا حصول ہے۔ کچھ ساتھی خالص اخلاقی بنیادوں پر عدم تشدد کے حامی تھے اور ان کا کہنا تھا کہ یہ کسی بھی اور طریقے سے اخلاقی طور پر برتر ہے۔ اس نظریئے کی بھرپور تائید منی لال گاندھی کیطرف سے ہوئی جو مہاتما گاندھی کے بیٹے اخبار انڈین اوپینن کے مدیر اور ایس اے آئی سی کے ایک سرکردہ رکن تھے۔ اپنی شریفانہ وضع سے منی لال گاندھی عدم تشدد کا مجسمہ ہی لگتے تھے، چنانچہ انہوں نے زور دے کر کہا کہ ہندوستان میں ان کے باپ کی مہم کے خطوط پر ہی یہ مہم چلائی جائے۔

اوروں نے کہا کہ ہمیں اس مسئلے کو اصولوں کے نقطہ نظر سے نہیں بلکہ داؤ پیچ کے نقطہ نظر سے لینا چاہیے اور ہمارا طریق کار صورت حال کے تقاضے کے مطابق ہونا چاہیے۔ اگر ایک خاص طریقہ یا داؤ ہمیں دشمن کو شکست دینے کے قابل بنا دے تو اسے استعمال کرنا چاہیے۔ ریاست ہم سے زیادہ طاقتور ہے اور ہماری طرف سے تشدد کی ہر کوشش بری طرح کچل دی جائیگی۔ اس طرح عدم تشدد ایک آپشن کے بجائے ایک عملی ضرورت ہوگا۔ یہ میرا نظریہ تھا اور میں گاندھی طرز کے عدم تشدد کو ایک ناقابل خلاف ورزی اصول نہیں بلکہ ایک داؤ سمجھتا تھا جسے صورتحال کے تقاضے کے مطابق استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یہ اصول اتنا اہم نہیں تھا کہ اس میں کارفرما

اسٹراٹیجی اس وقت بھی استعمال کی جاتی جب وہ خود ہی اپنے اندر شکست کے اسباب رکھتی ہو جیسا کہ خود گاندھی کا عقیدہ تھا۔ میں نے کہا کہ عدم تشدد والا احتجاج اسی وقت تک کارآمد ہے جب تک وہ موثر ہو۔ منی لال گاندھ کے شدید اعتراضات کے باوجود یہ نقطہ نظر تسلیم کرلیا گیا۔

احتجاجی مہم کا آغاز

مشترکہ پلاننگ کونسل عدم تعاون اور عدم تشدد کے ایک قابل تغیر کھلے پروگرام پر متفق ہوگئی۔ حکومت کو چیلنج کرنے کے دو مرحلے تجویز کیے گئے۔ پہلے مرحلے میں خوب تربیت یافتہ رضا کاروں کی تھوڑی تعداد کو چند شہری علاقوں میں چیدہ چیدہ قوانین کی خلاف ورزی کرنی تھی۔ انہیں اجازت ناموں کے بغیر ان علاقوں میں داخل ہونا تھا جہاں کالوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ انہیں ٹائلٹس جیسی گوروں کے لیے مخصوص سہولتیں اور گوروں کے لیے مخصوص ریل کے ڈبے انتظار گاہیں اور پوسٹ آفس میں داخلے کے دروازے استعمال کرنے تھے۔ انہیں کرفیو کے بعد دانستہ قصبے یا شہر میں رہنا تھا۔ قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کی ہر ایک لیڈر تھا جسے سول نافرمانی کے اقدام کی پیشگی اطلاع پولیس کو دینی تھی تاکہ گرفتاریاں کم سے کم ہلچل کے ساتھ عمل میں آئیں۔ دوسرے مرحلے میں ملک بھر میں قوانین کی اجتماعی خلاففورزی اور اس کے ساتھ ہڑتالیں اور صنعتی تالہ بندیاں شامل تھیں۔

خلاف ورزی مہم کے آغاز سے پہلے 22 جون کو ڈربن میں ''یوم رضا کاراں'' کے نام سے ایک ریلی منعقد کی گئی۔ نٹال اے این سی کے صدر چیف لوتھولی اور نٹال انڈین کانگریس کے صدر ڈاکٹر نائیکر دونوں نے اس میں تقریریں کی اور مہم پر جمے رہنے کا عزم کیا۔ ایک دن پہلے مین بھی موٹر کار میں ڈربن پہنچ گیا تھا۔ میں اس ریلی کا مہمان مقرر تھا۔ میں نے دس ہزار افراد کے اجتماع سے اس خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''خلاف ورزی مہم'' جنوبی افریقہ میں ستم رسیدہ عوام کے بڑے اب تک کا

سب سے جاندار اقدام ہوگی۔ میں نے اتنے بڑے ہجوم سے پہلے کبھی خطاب نہیں کر سکتا جس طرح دو درجن سامعین کے سامنے تقریر کی جاتی ہے۔تاہم میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ بڑے اجتماع کے سامنے بھی معاملات اسی طرح واضح کروں جس طرح چھوٹی محفل میں کرتا ہوں۔ میں نے لوگوں سے کہا کہ وہ اس مہم میں شریک ہو کر تاریخ بنا رہے ہیں اور جنوبی افریقہ کی نسل پرستانہ پالیسیوں کی طرف دنیا کو متوجہ کریں گے۔ میں نے اس نکتے پر زور دیا کہ جنوبی افریقہ میں کالے لوگوں ......افریقیوں، رنگ داروں اور ہندوستانیوں....کا اتحاد آخر کار ایک حقیقت بن چکا ہے۔

جن لوگوں نے ملک بھر میں 26 جون کو نسل پرستانہ قوانین کو چیلنج کیا انہوں نے یہ کام جرات، جوش کاور تاریخی شعور کے ساتھ کیا۔خلاف ورزی مہم پورٹ ایلز بتھ میں طلوع فجر کے ساتھ شروع ہوگئی جہاں تینتیس رضا کار ریمنڈ امہلابا کی قیادت میں ''وائٹس اونلی'' دروازے سے ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوئے اور گرفتار کر لئے گئے۔ وہ آزادی کے گیت گاتے اور دوستوں اور اہل خانہ کی تالیوں کی گونج میں آگے بڑھے تھے یہ ''خلاف ورز'' اور ہجوم ہم آواز ہو کر پکار رہے تھے: ''مائی بوئے افریقہ'' (افریقہ واپس آجائے)

پادری دغا دے گیا

چھبیس کی صبح میں اے این سی کے دفتر میں دن بھر مظاہروں کی نگرانی کر رہا تھا۔ ٹرانسوال کے رضا کار گروہ کو جوہانسبرگ کے مشرق میں بوکس برگ کے قریب ایک افریقی بستی میں دوپہر کو حرکت میں آنا تھا۔عزت مآب ٹانشی کی قیادت میں ان انہیں حکام کی اجازت کے بغیر بستی میں داخل ہو کر گرفتاریاں پیش کرنی تھیں۔عزت مآب ٹانشی عمر رسیدہ اور افریقن میتھوڈسٹ ایپی سکوپل چرچ میں پادری اور ٹرانسوال اے این سی کے قائم مقام صدر تھے۔

کب کی صبح ہو نچی تھی اور جب میں عزت ماب ٹانٹسی کی پریٹوریا سے آمد کا انتظار کر رہا تھا، مجھے دفتر میں ان فون موصول ہوا۔ انہوں نے فسوناک لہجے میں مجھے بتایا کہ ان کے ڈاکٹر نے انہیں خلاف ورزی میں حصہ لینے اور جیل جانے سے منع کیا ہے۔ مین نے انہیں گزاریں گے..... مگر نے سود۔ یہ بڑی مایوس کن صورتحال تھی کیونکہ ریورنڈ ٹانٹسی ایک سرکردہ شخصیت تھے اور ان کا انتخاب حکام پر یہ ثاہر کرنے کے لئے کیا گیا تھا کہ ہم صرف ہنگامہ خیز لونڈوں کا گروہ نہیں ہیں۔

سہ پہر کے وقت جب ہم بوکسبرگ جانے کی تیاری کر رہے تھے، مجھے پتہ چلا کہ اے این سی کی ٹرانسواک برانچ کے سیکرٹری کہیں نظر نہیں آ رہے۔ انہیں نانا سیتا کے ہمراہ بوکسبگ جانا تھا۔ یہ ایک اور بحران آ پڑا تھا۔ اس میں نے ڈاکٹر سے مخالف ہو کر کہا: ''ان کی جگہ آپ کو جانا چاہیے''۔ یہ ٹرانسوال میں ہماری پہلی کارروائی تھی، لہذا اس میں ضروری تھا کہ نمایاں افراد خلاف ورزی کرنے والوں کی قیادت یں، بصورت دیگر لیڈر اس تحریک سے الگ تھلگ نظر آئیں گے اور حکومت کا سارا نزلہ عوام پر گرے گا۔ اگر چہ والٹر منتظمین میں سے ایک تھا اور اسے آخر میں خلاف ورزی کرنا تھی مگر وہ شروع ہی میں اس کام کے لئے راضی ہو گیا۔ مجھے زیادہ تشویش یہ تھی کہ اس نے سوٹ پہن رکھا تھا جو جیل کے لئے موزوں لباس نہیں تھا، ہم ہم نے جیسے تیسے اس کے لئے کچھ پرانے کپڑے منگوانے کا بندوبست کر لیا۔

مجسٹریٹ سے مکالمہ

یوں تیار ہو کر ہم بوکس برگ کی طرف چل پڑے جہاں یوسف کا چھالیا کو اور مجھے ایک خط بوکس برگ مجسٹریٹ کے سُرد کرنا تھا جس میں اسے آگاہ کیا گیا تھا کہ ہمارے پچاس رضا کار اس روز پرمٹوں کے بغیر افریقن ٹاؤن شپ میں اُس کے علاقے میں داخل ہوں گے۔ جب ہم مجسٹریٹ کے دفتر پہنچے تو وہاں تعداد میں اخباری نمائندے اور فوٹوگرافر جمع تھے۔ جیسے ہی میں نے لفافہ مجساٹریٹ کے

حوالے کیا فوٹو گرافر حرکت آ گئے۔مجسٹریٹ نے کیمروں کے فلیش سے بچنے کے لئے اپنا چہرہ چھپا لیا اور پھر یوسف کو اور مجھے اپنے چیمبر میں بلایا تا کہ معاملے پر علیحدگی میں گفتگو کی جائے۔وہ ایک معقول آدمی تھا۔اس نے کہا کہ اس کا دفتر ہمارے لئے ہمیشہ کھلا رہے گا مگر اس طرح کی غیرضروری پبلسٹی معاملات کو بگاڑ دے گی۔

مجسٹریٹ کے دفتر سے ہم سیدھے ٹاؤن شپ پہنچے جہاں مظاہرہ ہو رہا تھا۔نصف میل دور ہی سے ہمیں اپنے رضا کاروں اور حامیوں کے اس عظیم الشان ہجوم کے پر جوش نعرے دنائی دیئےجو ان کی حوصلہ افزائی کے لئے چلا آیا تھا۔ہم نے دیکھا کہ ٹاؤن شپ کے اونچے دھاتی گیٹ بند تھے اور ہمارے رضا کار باہر تحمل سے انتظار کرتے ہوئے اندر جانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔کل باون رضا کار تھے، افریقی بھی اور ہندوستانی بھی، اور ان کے علاوہ کئی سو پر جوش تماشائیوں اور صحافیوں کا ہجوم تھا۔ والٹر خلاف ورزی کرنے والے رضا کاروں کی قیادت کر رہا تھا۔اس کی موجودگی اس امر کی علامت تھی کہ ہم واقعی کچھ کر کے دکھانا چاہتے ہیں۔لیکن مظاہرین کے لئیر ہنما کردار نانا سیتا کا تھا جو اپنے جوڑوں کے درد کے باوجود پورے جذبے کے ساتھ مظاہرین کی اگلی صف میں موجود تھا........کسی کی پشت پر تھپکی دیتا اور کسی کے ساتھ ہم آواز ہو کر اس کا حوصلہ بڑھاتا۔

پہلے ایک گھنٹے تک صورت حال جوں کی توں رہی۔پولیس غیر روایتی طور پر رکی اور ان کے رویئے نے ہمیں چکرا دیا۔کیا ان کی یہ خاموشی رضا کاروں کو تھکا دینے کے لئے ہے؟ کیا وہ صحافیوں کے چلے جانے اور پھر منصوبہ بندی کے تحت رات کے اندھیرے میں قتل حال بر پا کرنے کا انتظار کر رہے ہیں؟ یا وہ اس الجھن کا شکار ہیں کہ ہمیں گرفتار کر کے وہ ہماری ہی خواہش پوری کیوں کریں؟ حالانکہ وہ ہم کو آرام سے گرفتار کر سکتے تھے۔لیکن جب ہم اس الجھاوے پر حیران ہو رہے تھے، صورتحال

اچانک بدل گئی۔ پولیس نے گیٹ کھولنے کا حکم دیا۔ رضا کار فوراً ہی گیٹ میں سے طوفان کی طرح لپکے اور یوں قانون شکنی کر ڈالی۔ ایک پولیس لیفٹیننٹ نے سیٹی بجائی اور چند سکنڈ میں پولیس نے رضا کاروں کو گھیرے میں لے لیا انہیں گرفتار کرنے لگے۔ یوں مہم کام کر گئی۔ مظاہرین کو گاڑی میں بٹھا کر مقامی پولیس اسٹیشن لے جایا گیا اور فرد جرم عائد کر دی گئی۔

انکوسی سےکے لیل ایا فریقہ

اسی شام ایکشن کمیٹی لیڈر، جن میں آلیور ٹیمبو، یوسف کا چھالیا اور خود میں شامل تھے، شہر میں ایک اجلاس میں اکٹھے ہوئے تا کہ دن بھر کے واقعات کا جائزہ لے کر اگلے ہفتے کی منصوبہ بندی کریں۔ یہ جگہ اس علاقے کے قریب تھی جہاں خلاف ورزوں (defiers) کی دوسری ٹولی، اے این سی کی مرکزی شاخ کے چیئر مین فلیگ بوشیلو کی قیادت میں، گرفتاریاں دے رہی تھی۔ گیارہ بجے سے کرفیو کے ضابطے بافذ ہو چکے تھے اور افریقیوں کو باہر جانے کے لئے پرمٹ درکار تھے۔

ہم آدھی رات اپنے اجلاس سے اُٹھے۔ میں تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا اور ''خلاف ورزی'' انہیں بلکہ گرما گرم کھانے اور رات کی نیند کا سوچ رہا تھا۔ اس لمحے ایک پولیس مین یوسف اور مجھ تک پہنچا۔ اگرچہ اس پر یہ ظاہر تھا کہ ہم گھر جا رہے تھے اور کسی طرح کا احتجاج نہیں کر رہے تھے مگر اس کا موڈ جارحانہ تھا۔ ''نہیں منڈیلا تم بچ کر نہیں جاسکتے۔'' پولیس والے نے کہا اور پھر وہ اپنی چھڑی سے قریب ہی کھڑی پولیس ویگن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پکارا: ''انہیں وین میں ڈالو'' میں نے اس پر واضح کرنا چاہا کہ میں روز بروز احتجاجی مہم چلانے کا انچاج ہوں اور شیڈول کے مطابق میں بہت بعد میں قانون شکنی کر کے گرفتاری دوں گا لیکن یہ بھینس کے آگے بین بجانے والی بات تھی۔ جب انہوں نے یوسف ہمیں لے جانے لگی، یوسف کے مسکرانے کا منظر بڑا پیارا لگ رہا تھا۔

چند لمحے بعد یوسف اور میں اپنے پچاس سے زیادہ ان رضا کاروں میں شامل ہو گئے جن کی قیادت فلیگ بوشیلو کر رہا تھا اور جنہیں ٹرکوں میں سرخ اینٹوں والے مارشل سکوائر نامی پولیس اسٹیشن لے جایا جا رہا تھا۔ ایکشن کمیٹی کے لیڈروں کی حیثیت سے ہم فکر مند تھے کہ دوسرے ساتھی ہمارے غائب ہو جانے پر پریشان ہوں گے۔ مجھے زیادہ تشویش یہ تھی کہ اب مہم کو کون چلا رہا ہو گا۔ لیکن پر جلوش مظاہرین کے جذبے بلند تھے۔ جیل کے راستے میں بھی وین میں ہمیں مظاہرین کے بلند آہنگ نعرے سنائی دے رہے تھے........ ''انکوسی سکے لیل ایا فریقہ'' (خدا افریقہ کو شادماں رکھے)........ خوبصورت افریقی قومی ترانے کا یہ بول ہمیں بار بار سنائی دیتا رہا۔

قید کے شب و روز

اس پہلی رات ڈرل یارڈ میں ایک سفید فام وارڈر نے ہمارے ایک ساتھی جو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ چند سیڑھیوں سے لڑھک گیا اور اس کا ٹخنہ ٹوٹ گیا۔ میں نے وارڈر کے رویئے پر احتجاج کیا تو اس نے ایک مجھے بھی رسید کر دی۔ میں نے مطالبہ کیا کہ زخمی کو طبی امداد دی جائے۔ اس پر ہم نے ایک چھوٹا مگر زبانی مظاہرہ بھی کر ڈالا۔ ہمیں بڑی مہربانی سے بتایا گیا کہ زخمی آدمی اگر چاہے تو اگلے روز ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی درخواست کر سکتا ہے۔ رات بھر اُس کے ٹخنے کے شدید درد نے ہمیں جگائے رکھا۔

اس وقت تک میں نے قید چند گھڑیاں ہی گزاری تھیں لیکن یہ میرا پہلا جذب آفریں تجربہ تھا۔ مارشل سکوائر پولیس اسٹیشن تاریک اور گندا تھا لیکن ہم سب اتنے اور اس قدر جذباتی اور پر جوش تھے کہ میں نے شاید ہی اپنے اردگرد کا نوٹس لیا ہو گا۔ ہمارے ساتھی مظاہرین کے پیدا کردہ ستانہ ماحول نے ہمیں دو دن گزرنے کا احساس تک نہ ہونے دیا۔

خلاف ورزی مہم کے اس پہلے روز ملک بھر میں □250 سے زیادہ رضا کاروں

نے مختلف غیر منصفانہ قوانین کی خلاف ورزی کی اور قید میں ڈالے گئے ۔ یہ ایک شاندار آغاز تھا۔ہمارے دستے باترتیب، منظم اور پر اعتماد تھے۔

اگلے پانچ دنوں میں 8500 افراد نے اجتماعی مہم میں حصہ لیا۔ڈاکٹروں ،فیکٹری ورکروں، وکلاء، اساتذہ طلبہ اور مذہبی رہنماؤں نے قوانین کو توڑا اور جیل گئے ۔وہ خوسی سے گاتے اور نعرے لگاتے تھے:

''ہائے نالان جیل کے دروازے کھولو، ہم اندر داخلک ہونا چاہیے ہیں''۔

قانون سکنی کی مہم وٹس واٹرسرانڈ سے ڈربن اور پورٹ ایلزبتھ، ایسٹ لندن، کیپ ٹاؤن اور مشرقی اور مغربی کیپ میں چھوٹے چھوٹے قصبوں تک پھیل گئی ۔مزاحمت دیہی علاقوں میں بھی سرایت کرنے لگی تھی۔زیادہ تر قانون شکنی اقدامات معمولی تھے جن کی سزائیں چند راتوں سے لے کر چند ہفتوں تک کی جیل کی قید پر محیط تھیں اور اس میں بھی یہ چھوٹ تھی کہ جرمانہ دے کر گھر سکتے تھے جو دس پونڈ فی کس سے شاید ہی بڑھا ہوگا۔مہم کو بے پناہ پبلسٹی ملی اور اے این سی کی رکنیت تقریبا بیس ہزار ایک لاکھ تک پہنچ گئی اور اس میں سب سے نمایاں اضافہ مشرقی کیپ میں ہوا جس نے تنام نئے ارکان کی نصف تو تعداد فراہم کی۔

مہم کے چھ ماہ کے دوران میں نے ملک بھرمیطویل سفر کیے۔زیادہ تر میں بذریعہ کار گیا اور رات ہی کو یا صبح سویرے چل پڑتا تھا۔ میں نے صوبہ کیپ، نٹال اور ٹرانسوال کے دورے کیے اور چھوٹے چھوٹے اجتماعات میں اجتماعی مہم کی اہمیت واضح کی ۔بعض اوقات افریقی بستوں میں مجھے گھر گھر جانا پڑتا تھا۔اکثر میر افریقہ ان علاقوں میں اختلاف دور کرنا ہوتا جہنیں اجتماعی ایکشن شروع کرنا ہوتا یا حال ہی حال ہی میں وہاں ایکشن ہو چکا ہوتا۔ان دنوں جب افریقیوں کے لئے عوامی رابطہ ایک ابتدائی یا بالکل نئی چیز تھی، ان میں سیاست کا شعور بہت محدود تھا۔ہمیں لوگوں کو ایک ایک کر کے قائل کرنا پڑتا تھا۔

مشکل دکاندار کا سخت کردار

ایک موقع پر میں مشرقی کیپ گیا تا کہ ایلکاٹ گوینشی کا جھگڑا نپٹا آؤں جو ایسٹ لندن نامی شہر میں مہم چلانے کا ذمے دار تھا۔ گوینشی ایک کامیاب دکاندار تھا اور دو سال پہلے اس نے ایسٹ لندن میں 26 جون کی گھر پہ رہو، مہم منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور خلاف ورزی مہم کے شروع ہی میں وہ تھوڑی مدت کے لیے جیل بھی گیا تھا۔ وہ ایک تنومند اور لائق آدمی تھا مگر ایک ایسا انفرادیت پسند بھی تھا جو ایگزیکٹو کمیٹی کی ہدایات نظر انداز کر کے اپنے طور پر فیصلے کرتا تھا۔ اب وہ اپنی ہی ایگزیکٹو قیادت کے خلاف تھا جس میں بیشتر دانشور تھے۔

گوینشی جانتا تھا کہ اپنے مخالفوں کا وقار کم کرنے کے لیے مخصوص معاملات سے کس طرح فائدہ اٹھایا جائے۔ مقامی ارکان جو دانشور نہیں بلکہ محنت کش ہوتے تھے، وہ ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہتا: ساتھیوں میرا خیال ہے تم جانتے ہو میں آزادی کی جدوجہد میں بڑی مشکلات برداشت کریں۔ میرا اچھا بھلا کاروبار تھا۔ میں قانون شکنی مہم کے شروع ہی میں جیل چلا گیا اور میرا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ اب جبکہ میں جیل سے باہر ہوں۔ یہ دانشور آ کر مجھ سے کہتے ہیں، گوینشی ہم تم سے بہتر تعلیم یافتہ ہیں۔ ہم تم سے زیادہ قابل ہیں۔ آؤ ہم مل کر یہ مہم چلائیں۔ وہ یہ ساری باتیں ژہوسا زبان میں کہتا تھا۔ انگریزی میں نہیں جو دانشور کی زبان تھی۔

جب میں نے صورتحال کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ گوینشی نے واقعی ایگزیکٹو کمیٹی کی ہدایات نظر انداز کر دی تھیں۔ لیکن لوگ اس کے پیچھے تھے اور اس نے رضا کاروں کا ایک منظم گروہ تیار کر لیا تھا جنہوں نے اس وقت بھی منظم طور پر قانون شکنی مہم میں حصہ لیا تھا جب گ ینشی جیل میں تھا۔ اگرچہ میں سمجھتا تھا گوینشی نے ایگزیکٹو کی ہدایات نظر انداز کر کے غلطی کی ہے مگر اسکے عوامی رابطے اس قدر مضبوط تھے کہ اسے آسانی سے ہٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ جب میں ایگزیکٹو کمیٹی کے ارکان سے

ملا، میں نے اس پر واضح کیا کہ اب وہاں کی صورتحال کے بارے میں کوئی اقدام قابل عمل نہیں، لیکن اگر وہ اس کا کوئی مداوا چاہتے ہیں تو انہیں گوپنشی کو اگلے الیکشن میں شکست دینا ہوگی۔ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یہ احساس ہوا کہ عوام کے خلاف جانا احمقانہ فعل ہے۔ ایسا اقدام بے سود ہوتا ہے جس کے عوام مخالف ہوں کیونکہ اس صورت میں اس کا نفاذ ناممکن ہوگا۔

ارکان حکومت نے خلاف ورزی مہم کو اپنی بقا اور اپنی نسلی امتیاز کی پالیسی کے لیے خطرہ جانا۔ انہوں نے سول نافرنی کو احتجاج کی ایک شکل نہیں بلکہ ایک جرم خیال کیا اور انہیں افریقیوں اور ہندوستانیوں کے درمیان بڑھتے ہوئے تعلقات پر بڑی پریشانی ہوئی۔ نسلی امتیاز کی پالیسی نسلی گروہوں کو تقسیم کرنے کے لیے وضع کی گئی تھی جبکہ ہم نے ثابت کر دیا تھا کہ مختلف گروہ اکٹھے کام کر سکتے ہیں۔ افریقیوں اور ہندوستانیوں کے مابین اور اعتدال پسندوں و انتہا پسندوں کے مابین ایک متحدہ محاذ کے امکانات نے حکومت کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ نیشنلسٹ کہتے تھے کہ احتجاجی مہم کمیونسٹ شورش پسندوں کی اختراع ہے اور وہی اس کی قیادت کر رہے ہیں۔ وزیر انصاف نے اعلان کیا کہ وہ جلد ہی ہماری مہم سے نپٹنے کے لیے قانون منظور کروائے گا۔ اس دھمکی کو اس نے 1953ء کے پارلیمانی سیشن کے دوران اس وقت عملی جامہ پہنایا جب پبلک سیفٹی ایکٹ منظور ہوا جس نے حکومت کو مارشل لاء لگانے اور مقدمے چلائے بغیر لوگوں کو نظر بند کرنے کے اختیارات دے دیئے اور اسی سیشن میں کریمنل لاز ترمیمی ایکٹ منظور ہوا جس کے تحت اسے خلاف ورزوں کو جسمانی سزا دینے کے اختیارات مل گئے۔

حکومت کے خفیہ ہتھکنڈے

حکومت نے مہم میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے بہت سے خفیہ ہتھکنڈے آزمائے۔ سرکاری ڈھنڈورچیوں نے بار بار دعویٰ کیا کہ مہم کے رہنما آرام سے رہ رہے ہیں

جبکہ عوام جیلوں میں سڑ رہے ہیں۔اس الزام میں کوئی صداقت نہ تھی لیکن اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوا۔حکومت نے ہماری تنظیم میں جاسوس اور ایجنٹ بھی داخل کر دیئے۔ اے این سی ہر کسی کو خوش آمدید کہتی تھی جو جیل جانا چاہتا۔ اگر چہ ہمارے رضا کاروں کی احتیاط سے چھان پھٹک کی جاتی تھی اور اس کے بعد انہیں قانون شکنی کے لیے چنا جاتا تھا، پولیس نے ہماری مقامی شاخوں ہی میں نہیں بلکہ خلاف ورزی کرنے والے بعض گروہوں میں بھی سرنگیں لگالیں۔ جب مجھے گرفتار کر کے مارشل سکوائر بھیجا گیا، میں نے خلاف ورزی میں دو آدمی دیکھے جن میں سے مجھے پہلے کبھی نظر نہیں آیا تھا۔ اسنے غیر معمولی لباس پہنا ہوا تھا۔ سوٹ اور ٹائی اور اسکے ساتھ اوورکوٹ اور ریشمی رومال۔ کیا ایسا لباس پہن کر بھی کوئی شخص جیل جاتا ہے؟ اس کا نام رمائلہ تھا اور تیسرے دن جب ہم رہا ہونے والے تھے وہ یکسر غائب ہو گیا۔

دوسرا آدمی جس کا نام مکھندہ تھا، اپنے فوجی خدوخال کے باعث نمایاں تھا۔ ہم باہر صحن میں تھے اور جذبوں کی فراوانی تھی۔ خلاف ورز مارچ کرتے ہوئے یوسف کے اور میرے سامنے سے گزرتے اور ہمیں سلیوٹ کرتے۔ مکھندہ جو بلند قامت اور دبلا تھا۔ سپاہیانہ طریقے سے مارچ کرتا گزرا اور اس نے پروقار سلیوٹ کیا۔ اس کے کئی ساتھی اسے چھیڑنے لگے کہ وہ ضرور پولیس مین رہا ہوگا جو اتنا اچھا سلیوٹ مارتا ہے۔

مکھندہ پہلے اے این سی ہیڈ کوارٹر میں دربانی کرتا رہا تھا۔ وہ بڑا محنتی اور ہر دلعزیز تھا کیونکہ ہوا کہ مکھندہ اور رمائلہ دونوں پولیس کے جاسوس ہیں۔ رمائلہ نے تصدیق کی کہ وہ خلاف ورزوں کی صفوں میں آ گھسا تھا اور قابل اعتبار مکھندہ دراصل ڈی ٹیکٹو سارجنٹ موٹلا ونگ تھا۔ وہ افریقی جنہوں نے اپنے بھائیوں کے خلاف جاسوسوں کے طور پر کام کیا، رقم کے لیے ایسا کرتے تھے۔ جنوبی افریقہ میں کئی سیاہ فام یہ سمجھتے تھے کہ سیاہ فاموں کا سفید فاموں کو چیلنج کرنا احمقانہ حرکت ہے جو سراسر ناکام

رہے گی کیونکہ سفید آدمی بہت مستعد اور بہت طاقتور ہے۔ یہ جاسوس ہمیں نہ صرف گورا اقتدار کے لیے بلکہ کالوں کے مفادات کے لیے بھی ایک خطرہ خیال کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں گورے چند شورش پسندوں کے رویّے کی بنا پر تمام کالوں سے برا سلوک کرتے تھے۔

تاہم کئی سیاہ فام پولیس مین ایسے بھی تھے جو خفیہ طور پر ہمارا ساتھ دیتے تھے۔ وہ اچھے لوگ تھے اور اپنے آپ کو ایک اخلاقی بحران میں پاتے تھے۔ وہ اپنے آجروں کے وفادار تھے اور اپنے خاندانوں کی کفالت کے لیے اپنے عہدے اور مناصب برقرار رکھنا چاہتے تھے لیکن ہمارے کاز سے ہمدردی تھی۔ چند ایک ان افریقی افسروں سے بھی ہماری خفیہ مفاہمت تھی جو سکیورٹی پولیس کے ارکان تھے اور جب پولیس ریڈ ہونے والی ہوتی وہ ہمیں اطلاع کر دیتے تھے۔ یہ لوگ محبّ وطن تھے جو آزادی کی جدوجہد کے لیے اپنی جانیں خطرے میں ڈالتے تھے۔

صرف حکومت ہی ہمارے لیے دردسر نہ تھی، کچھ دوسرے عناصر بھی تھے جو ہماری مدد کرنے کے بجائے ہماری راہ میں رکاوٹیں ڈالتے تھے۔ خلاف ورزی مہم کے عروج پر یونائیٹڈ پارٹی نے اپنے دو ارکان پارلیمنٹ ہمارے پاس بھیجے کہ ہمیں اپنی مہم روک دینے پر آمادہ کریں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم یونیٹڈ پارٹی کے لیڈر جے جی این شٹراوس کی کال کے جواب میں اپنی مہم ترک کر دیں تو اس سے ان کی پارٹی اگلے الیکشن میں نیشنلسٹوں کو شکست دینے کے قابل ہو جائے گی۔ ہم نے ان کی کال مسترد کر دی تو شٹراوس اسی لب و لہجے میں ہم پر تنقید کرنے لگے جو نیشنلسٹوں کا خاصہ تھا۔

کمیونزم ایکٹ کی چلتی پھرتی قید

اے این سی سے الگ ہونے والے ایک گروہ نیشنل مائنڈڈ بلاک نے بھی ہم پر یلغار کر دی۔ سیلوپ تھیما کی قیادت میں، جو نیشنل ایگزیکٹو کے سابق رکن تھے، اس

گروہ نے اس وقت اے این سی سے علیحدگی اختیار کر لی جب جے مارکس ٹرانسوال اے این سی کے صدر چنے گئے، تھیما تھوورلڈ نامی اخبار کا ایڈیٹر تھا، اس نے اپنے اخبار میں احتجاجی مہم پر شدید تنقید کی اور دعویٰ کیا کہ کمیونسٹ اے این سی پر چھا گئے ہیں اور یہ کہ ہندوستانی، افریقیوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ کمیونسٹ اب زیادہ خطرناک ہیں کیونکہ وہ زیر زمین کام کر رہے ہیں اور یہ کہ ہندوستانیوں کے اقتصادی مفادات افریقیوں کے مفادات سے ٹکراتے ہیں۔ اگرچہ وہ اے این سی میں اقلیتی گروہ کا نمائندہ تھا۔ اس کے خیالات بعض انتہاپسند یوتھ لیگیوں کے ذہنوں کو متاثر کرتے تھے۔

مئی میں خلاف ورزی مہم کے وسط میں جے بی مارکس کو سپریشن آف کمیونزم ایکٹ 1950ء کے تحت، کمیونزم کے مقاصد کو آگے بڑھانے سے روک دیا تھا۔ یہ پابندی حکومت کا ایک قانونی آرڈر تھا اور بالعموم اس کے تحت علانیہ تنظیموں سے جبری استعفا دینے کی پابندی اور ہر قسم کے اجتماع میں شرکت کی ممانعت آتے تھے۔ یہ ایک طرح کی چلتی پھرتی قید تھی۔ ایک شخص پر پابندی عائد کرنے کے لیے حکومت کو کوئی ثبوت درکار نہ تھا اور نہ وہ الزامات پیش کرتی تھی، وزیر انصاف بس اس طرح کا اعلان کر دیتا۔ اس پالیسی کا مقصد ایک شخص کو آزادی کی جدوجہد سے روکنا اور سیاست سے باہر رہ کر ایک محدود زندگی گزارنے پر مجبور کرنا تھا۔ پابندی کے حکم کی خلاف ورزی یا اسے نظر انداز کرنا قید کو دعوت دینا تھا۔

اس برس اکتوبر میں ٹرانسوال کانفرس میں میرا نام پابند جے بی مارکس کی جگہ صدارت کے لیے پیش کیا گیا جنہوں نے سفارش کی تھی کہ میں ان کا جانشین بنوں۔ میں یوتھ لیگ کا نیشنل پریذیڈنٹ تھا اور مارکس کے خالی کردہ عہدے کے لیے موزوں تھا لیکن میری امیدواری کی مخالفت ٹرانسوال اے این سی کے اندر ایک ایسے گروہ کی طرف سے کی گئی جو اپنے آپ کو بافابیگیا کہتا تھا وہ جو رقص کرتے جان

دیتے ہیں، یہ گروہ زیادہ تر سابق کمیونسٹوں پر مشتمل تھا جو انتہا پسند افریقی نیشنلسٹ بن گئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی مساعی پسندوں سے تمام روابط ختم کر لیے جائیں اور اے این سی کو زیادہ مزاحمتی پالیسی کی جانب لے جایا جائے۔ ان لوگوں کا رہنما میکڈانلڈ مایسکو ایک سابق کمیونسٹ تھا جو خلاف ورزی مہم کے دوران اے این سی کی آرلینڈو برانچ کا چیئرمین رہا تھا اور دوسرا شخص سپی ریپر مارو پینگ تھا جو وٹسواٹرسرانڈ میں خلاف ورزی مہم کا چیف والنٹیئر رہا تھا۔ مایسکو اور مارو پینگ دونوں نے ٹرانسوال کی صدارت کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔

''میں ابھی آزادی چاہتا ہوں۔''

مارو پینگ مجمع باز قسم کا لیڈر تھا، وہ فوجی طرز کا خاکی سوٹ پہنتا جس پر فیتے اور سنہری بٹن لگے ہوتے اور ہاتھ میں اس قسم کی چھڑی ہوتی جو فیلڈ مارشل منٹگمری سے مخصوص تھی۔ وہ مجمع کے سامنے کھڑا ہو جاتا، اس کی چھڑی بازوؤں کے نیچے دبی ہوتی اور کہتا: ''میں آزادی کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ میں آزادی اسی وقت چاہتا ہوں۔ مالان سے میری سر راہ ملاقات ہوگی اور میں اسے دکھاؤں گا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ پھر وہ اپنی چھڑی پوڈیم پر مارتے ہوئے چلا کر کہتا: ''میں اسی وقت آزادی چاہتا ہوں۔''

اس نوع کی تقریروں سے مارو پینگ خلاف ورزی مہم کے دوران خاصا مقبول ہو گیا لیکن مقبولیت انتخاب میں صرف ایک عنصر ہوتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اپنی نو ساختہ اہمیت کے باعث وہ یقیناً صدارت جیت لے گا۔ الیکشن سے پہلے جب یہ طے ہو چکا تھا کہ میں امیدوار ہوں گا، میں نے اس سے ملاقات کی اور کہا: میں چاہتا ہوں کہ تم ایگزیکٹو کے الیکشن کے لیے کھڑے ہو جاؤ تاکہ تم میرے ساتھ کام کر سکو جبکہ میں صدر ہوں گا۔ اس نے اسے اپنی تحقیر خیال کرتے ہوئے انکار کر دیا اور صدارت کا الیکشن لڑنا ہی پسند کیا۔ لیکن اس کا اندازہ غلط نکلا کیونکہ میں نے بھاری

اکثریت سے الیکشن جیت لیا۔

30 جولائی 1952ء کو خلاف ورزی مہم عروج پر میں اپنی لا فرم ایچ ایم باسٹر کیساتھ کام کر رہا تھا جب پولیس میری گرفتاری کے وارنٹ لے کر آ گئی۔ الزام یہ تھا کہ میں نے سپریشن آف کمیونزم ایکٹ کی خلاف ورزی کی ہے۔ حکومت نے جوہانسبرگ، پورٹ ایلزبتھ اور کمبرلے میں احتجاجی مہم کے رہنماؤں کی بیک وقت گرفتاریاں کیں۔ مہینے کے شروع میں پولیس نے ملک بھر میں اے این سی اور ایس اے آئی سی کے رہنماؤں کے گھروں اور دفاتر پر یلغار کی تھی اور کاغذات اور دستاویزات ضبط کر لی تھیں۔ اس طرح کی یلغار نئی چیز تھی۔ اس سے روز افزوں غیر قانونی تلاشیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جو بعد میں حکومت کے رویئے کا ایک مستقل روپ ٹھہرا۔

میری اور دوسرے رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد ستمبر میں جوہانسبرگ میں اکیس ملزموں پر مقدمے کا آغاز ہوا جن میں اے این سی، ایس اے آئی سی، اے این سی یوتھ لیگ اور ٹرانسوال انڈین کانگرس کے صدر اور جنرل سیکریٹری شامل تھے۔ ان زیر مقدمہ اکیس افراد میں ڈاکٹر موروکا، والٹر میسولو اور جے بی مارکس بھی شامل تھے۔ بہت سے ہندوستانی لیڈر گرفتار کیے گئے تھے جن میں ڈاکٹر دادو، یوسف کا چھالیا اور احمد کاتھرادا بھی شامل تھے۔

ہمارا صدر اعلیٰ بزدل نکلا

یہ مقدمہ عزم اور اتحاد کا ثبوت پیش کرتا، مگر ڈاکٹر موورکا نے اس میں کمزوری دکھائی۔ مورکا اے این سی کے پریذیڈنٹ جنرل اور مہم کی رہنما شخصیت تھے لیکن انہوں نے اپنا وکیل کر کے ہمیں صدمے سے دوچار کیا۔ ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ ہم سب پر اکٹھا مقدمہ چلے۔ میرے ساتھی ملزموں نے مجھے مامور کیا کہ میں ڈاکٹر مورو کا سے بات کر کے انہیں آمادہ کروں کہ وہ مقدمے میں ہم سے الگ نہ ہوں۔ مقدمے

سے ایک دن پہلے میں ولیج ڈیپ، جوہانسبرگ میں ڈاکٹر مورکا سے ملنے گیا۔

ملاقات کے شروع ہی میں، میں نے انہیں راستے پیش کیے مگرانہوں نے عدم دلچسپی ظاہر کی اوراپنی ذاتی شکایات کا پٹارا کھول بیٹھے۔ انہیں یہ احساس تھا کہ مہم کی منصوبہ بندی سے ان کوالگ رکھا گیا تھا، حالانکہ وہ اکثر اے این سی کے معاملات سے لاتعلق رہے تھےاوراس پر مطمئن تھے۔ اب انہوں نے یہ کہا کہ باقی سب کے ساتھ مقدمے کا سامنا کرنے سے انہیں ان آدمیوں سے ملایا جائے گا جوکمیونسٹ ہیں۔ دراصل وہ کمیونزم کی مخالفت میں حکومت کے ہم نوا تھے۔ میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا کہ یہ اے این سی کی روایت ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ کام کرتی ہے جونسلی تشدد کے خلاف ہوں۔ لیکن موروکا اپنے موقف پر اڑے رہے۔

سب سے بڑا جھٹکا اس وقت لگا جب موروکا نے جج رمف کورام کرنے کے لیے ایک رسوا کن بیان دیا اور گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہوکر ان اصولوں کی مخالفت کی جن پر اے این سی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ کیا ان کے خیال میں جنوبی افریقہ میں کالوں اور گوروں میں مساوات ہونی چاہیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ ہم اپنی نشستوں پر خودکو مایوسی کے سمندر میں ڈوبتے محسوس کرر ہے تھے۔ جب خود ان کے وکیل نے پوچھا کہ کیامدعاعلیہان میں کچھ کمیونسٹ بھی ہیں تو انہوں نے ڈاکٹر دادواور والٹر سیسولوسمیت مختلف لوگوں کی نشاندہی شروع کردی۔ جج نے اس سے کہا کہ ایسا کرنا ضروری نہیں۔

ڈاکٹر موروکا کا یہ رویہ تنظیم کے لیے ایک شدید ضرب تھا اور ہم سب نے فوراً محسوس کیا کہ اے این سی کے صدر کی حیثیت سے موروکا کے دن گنے جا چکے ہیں۔ اس نے اپنے مفادات کو پارٹی اورعوام کے مفادات پرترجیح دیکر گناہ عظیم کاارتکاب کیا تھا۔ وہ اپنے سیاسی نظریات کے لیے اپنے میڈیکل کیریئر اور مستقبل کو داؤ پر لگانے کے لیے تیارنہیں تھااوراس طرح اس نے اپناوہ امیج تباہ کرلیا تھا جو تین سال

کے دوران اے این سی کے لیے خلاف ورزی مہم میں جرات مندانہ کردار ادا کرتے ہوئے بنایا تھا۔ میرے نزدیک یہ ایک سانحہ تھا کیونکہ عدالت میں ڈاکٹر موروکا کے بزدلی کے مظاہرے سے خلاف ورزی مہم کی آن بان ختم ہوگئی تھی۔ جو شخص ملک بھر میں مہم کی اہمیت کا پرچار کرتا پھرتا تھا، اب خود وہ اس کا منکر ہوگیا تھا۔

معقول گورے جج کا فیصلہ

2 دسمبر کو جج رمف نے ہم سب کو ''قانونی کمیونزم کے ملزم قرار دیا۔ سپریشن آف کمیونزم ایکٹ کی رو سے عملاً ہر وہ شخص جو کسی بھی طرح سے حکومت کا مخالفت ہو، اسے قانونی کمیونزم کا ملزم گردانا جا سکتا تھا خواہ وہ کبھی کمیونسٹ پارٹی کا رکن نہ رہا ہو۔ جج نے جو منصف مزاج، اور معقل آدمی تھا، یہ کہا کہ اگرچہ ہم نے جو منصوبہ بندی کی تھی وہ قانون کی پابندی نہ کرنے سے لے کر ملک سے غداری تک پھیلی ہوئی تھی، مگر ہم نے مسلسل اپنے ارکان کو یہ تاکید کی تھی کہ وہ پرامن راہ عمل اختیار کریں اور ہر قسم کے تشدد سے احتزار کریں۔ چنانچہ اس نے ہمیں 9 ماہ قید بامشقت کی سزا سنائی جو دو سال کے لیے ملتوی کردی گئی۔

ہم نے کئی غلطیاں کیں لیکن خلاف ورزی مہم نے جدوجہد کا ایک نیا باب وا کیا۔ ہم نے جن چھ قوانین کی نشاندہی کی تھی وہ واپس نہ لیے گئے مگر ہمیں یہ غلط فہمی بھی نہ تھی کہ وہ واپس لیے جائیں گے۔ ہم نے انہیں اس لیے چنا تھا کہ وہ عوام کی زندگی کو اجیرن کیے ہوئے تھے اور یہ لوگوں کی بڑی تعداد کو آزادی کی جدوجہد میں شریک کرنے کا بہترین طریقہ تھا۔

ہماری کامیابیاں اور ناکامیاں

خلاف ورزی مہم سے پہلے اے این سی عمل کی نہیں بحث مباحثے جماعت تھی ہمارے کوئی تنخواہ دار آرگنائزر نہ تھے، کوئی عملہ نہ تھا اور رکنیت بھی اتنی ہی تھی جو ہمارے کاز کی زبانی حمایت کے سوا کچھ فراہم نہ تھی۔ اب خلاف ورزی مہم کے نتیجے

میں رکنیت ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ اے این سی ایک حقیقی عوامی تنظیم بن کر ابھری تھی جس میں تجربہ کار مساعی پسندوں کی ایک متاثر کن فوج تھی جنہوں نے پولیس، عدالتوں اور جیلوں کا سامنا کیا تھا۔ قید کے ساتھ نام کو بٹہ لگنے کا جو تصور وابستہ تھا وہ ختم ہو گیا تھا۔ یہ ایک نمایاں کامیابی تھی کیونکہ قید کا خوف جدوجہد آزادی میں ایک بڑی رکاوٹ ہوتا ہے۔ خلاف ورزی مہم سے افریقیوں میں جیل جانا ایک اعزاز کی بات ٹھہرا۔

ہمیں اس حقیقت پر بڑا فخر تھا کہ چھ ماہ کی مہم کے دوران ہماری طرف سے تشدد کا ایک بھی واقعہ نہ ہوا۔ ہمارے مزاحمین کا نظم وضبط مثالی تھا۔ مہم کے آخری دنوں میں پورٹ ایلزبتھ اور ایسٹ لندن میں فسادات پھوٹ پڑے جن میں چالیس سے زیادہ افراد مارے گئے۔ اگرچہ ان فسادات کا ہماری مہم سے کوئی تعلق نہ تھا، حکومت نے ہمیں ان میں ملوث کرنے کی کوشش کی۔ اس میں حکومت کامیاب رہی کیونکہ ان سے کچھ گوروں کے خیالات زہر آمیز ہوئے جو بصورت دیگر ہمارے ہمدرد ہو سکتے تھے۔

اے این سی کے اندر بعض لوگوں کی توقعات غیر حقیقی تھیں اور انہیں یقین تھا کہ اس مہم سے حکومت کا تختہ الٹ جائے گا۔ ہم نے انہیں یقین تھا کہ اس مہم سے حکومت کا تختہ الٹ جائے گا۔ ہم نے انہیں یاد دلایا کہ مہم کا مقصد اپنی مشکلات اور محرومیوں پر متوجہ کرنا تھا، ان کا استحصال نہیں۔ انکا موقف یہ تھا کہ ہم حکومت کو وہاں لے آئے ہیں جہاں ہم چاہتے تھے اور یہ کہ ہمیں مہم غیر معینہ مدت کے لیے جاری رکھنی چاہیے۔ میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ یہ حکومت اتنی مضبوط اور اتنی بے رحم ہے کہ اس طریقے سے اس کا تختہ نہیں الٹا جا سکتا۔ ہم اسے پریشان کر سکتے ہیں مگر خلاف ورزی مہم سے اسے ختم کرنا ناممکن ہے۔

ہم نے مہم بہت زیادہ عرصہ جاری رکھی تھی۔ ہمیں ڈاکٹر ژوما کی بات پر توجہ دینی چاہیے تھی۔ جب مہم کے آخری حصے کے دوران پلاننگ کمیٹی ڈاکٹر ژوما سے ملی، اس

نے ہم سے کہا تھا کہ مہم جلد اپنا مومینٹم کھو بیٹھے گی اور اس کے یکسر ماند پڑنے سے پہلے اسے ختم کر دینا عقلمندی کی بات ہوگی۔ مہم کو اس کے جارحانہ مرحلے ہی میں ختم کر دینا دانشمندانہ اقدام ہوگا جو شہ سرخیوں میں جگہ پائے گی۔ ڈاکٹر زوما ٹھیک کہتے تھے۔ مہم جلد ہی دھیمی پڑ گئی مگر ہم نے اپنے جوش وخروش اور قدرے غرور میں ان کا مشورہ بالائے طاق رکھ دیا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ یہ جاری رہے مگر دماغ نے کہا کہ اب اسے رک جانا چاہیے۔ میں نے مہم کی بندش کے حق میں رائے دہی دی مگر اکثریت کو مخالف پاکر ان کا ساتھ دیا۔ سال کے آخر تک مہم بتدریج دم توڑ گئی۔

خلاف ورزی مہم ابتدائی مرحلے کے زیادہ تر شہری خلاف ورزی کی ٹولیوں سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ عام خلاف ورزی، خصوصاً دیہی علاقوں میں کبھی نہ ہوئی۔ شرقی کیپ واحد علاقہ تھا جہاں مہم دوسرے مرحلے میں پہنچی اور جہاں دیہی علاقوں میں ایک طاقتور مزاحمتی مہم چلی۔ وسیع پیمانے پر ہم دیہات میں سرایت نہ کر سکے۔ اور یہ اے این سی کی تاریخی کمزوری تھی۔ مہم میں ایک رکاوٹ یہ رہی کہ ہمارے پاس کوئی ہمہ وقتی آرگنائزر نہ تھا۔ میں اسے آرگنائز کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وکالت کا پیشہ بھی اپنائے ہوئے تھا اور یہ عوامی مہم چلانے کا کوئی طریقہ نہیں۔

اس کے باوجود مجھے کامیابی اور اطمینان کا خاصا احساس تھا۔ میں ایک منصفانہ کاز کے لیے کام کر رہا تھا اور اسکے لیے لڑنے اور جیتنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس مہم نے مجھے شبہات اور احساس کمتری کی اس دھند سے باہر نکالا جس میں، میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے مجھے طاقت سے مغلوب ہونے اور سفید آدمی اور اس کے اداروں کے بظاہر ناقبل تسخیر ہونے کے احساس سے نجات دلائی۔ لیکن اب سفید آدمی نے میرے مکوں کی طاقت محسوس کر لی تھی اور میں ایک انسان کے طور پر سیدھا ہو کر چل سکتا تھا اور اس شان کے ساتھ ہر ایک سے آنکھیں ملا سکتا تھا، جو ظلم اور خوف کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے نہیں ملتی۔ میں ایک مجاہد آزادی کی حیثیت سے بالغ ہو گیا تھا۔

چیف لوتھولی کی دستک

1952ء کے آخر میں اے این سی کی سالانہ کانفرس میں گارڈ کی تبدیلی عمل میں آئی۔ اے این سی نے ایک نئے، زیادہ سرگرم دور کے لیے ایک نیا، زیادہ توانا صدر مقرر کیا۔ یہ تھا چیف البرٹ لوتھولی۔ اے این سی کے دستور کے مطابق ٹرنسوال کے صوبائی صدر کی حیثیت سے میں چار نائب صدروں میں سے ایک بن گیا۔ مزید براں نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی نے مجھے اول نائب صدر مقرر کیا۔ لوتھولی ان چند حکمران چیفس میں سے ایک تھا جو اے این سی میں سرگرم تھے اور جنہوں نے حکومت کی پالیسیوں کی پامردی سے مزاحمت کی تھی۔

لوتھولی ایک سیونتھ ڈے ایڈوینٹسٹ مشنری کا بیٹا تھا۔ وہ جنوبی ایشیا روڈ ایشیا موجود زمبابوے، میں پیدا ہوا تھا اور نٹال میں اس نے تعلیم پائی تھی۔ ڈربن کے قریب ایڈمز کالج میں اس نے بطور استاد تربیت پائی تھی۔ وہ ایک لمبا تڑنگا، بھاری بھرکم اور گہری رنگت والا شخص تھا جس کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ اس میں عاجزی اور گہرے اعتماد کا امتزاج تھا۔ وہ صبر و تحمل اور استقلال کا حامل تھا جو آہستگی اور صاف گفتگو کرتا جیسے ہر لفظ یکساں اہمیت کا حامل ہو۔

میں پہلی بار اس سے عشرہ 1940ء کے اواخر میں ملا تھا جب وہ مقامی نمائندگان کی کونسل کا رکن تھا۔ ستمبر 52ء میں سالانہ کانفرس سے چند ماہ پہلے، لوتھولی کو پریٹوریا بلا کر الٹی میٹم دیا گیا تھا: وہ اے این سی کی رکنیت اور خلاف ورزی مہم کی حمایت چھوڑ دے ورنہ اسے ایک منتخب اور حکومت کے تنخواہ دار قبائلی چیف کے عہدے سے برطرف کر دیا جائے گا۔ لوتھولی ایک استاد، ایک مخلص مسیحی اور ایک پر فخر زولو چیف تھا لیکن وہ نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد سے زیادہ گہری وابستگی رکھتا تھا۔ لوتھولی نے اے این سی سے مستعفی ہونے سے انکار کر دیا اور حکومت نے اسے اس

کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ اس کے ردعمل میں اس نے ان اصولوں پر مبنی ایک بیان جاری کیا جس کا عنوان تھا:

The Road to freedom is via the cross

(آزادی کی سڑک صلیب کے راستے سے گزرتی ہے)

اس بیان میں اپنے عدم تشدد پر مبنی غیر متحرک مزاحمت کی حمایت کی توثیق کی اور اپنے منتخب راستے کو ان الفاظ کے ساتھ جائز قرار دیا جو آج افسردگی سے گونج رہے ہیں۔ اس کی کون تردید کر سکے گا کہ میری زندگی کے تیس برس ایک بند اور ممنوع دروازے پر صبر و تحمل اور اعتدال و انکسار سے بے فائدہ دستک دینے میں گزرے ہیں۔"

چھ ماہ کی سیاسی پابندی

میں نے چیف لوتھولی کی حمایت کی مگر میں نیشنل کانفرنس میں شرکت نہ کر سکا۔ کانفرنس کے آغاز سے چند روز پہلے ملک بھر کے باون رہنماؤں پر پابندی لگا دی گئی کہ وہ چھ ماہ تک کسی قسم کے اجلاس یا اجتماع میں شرکت نہیں کر سکتے۔ میں بھی ان میں شامل تھا، چنانچہ مذکورہ مدت کے لیے میری سرگرمیاں جوہانسبرگ کے ضلع تک محدود کر دی گئیں۔

میری پابندی صرف سیاسی ہی نہیں، ہر قسم کے اجلاسوں پر محیط تھی۔ مثلاً میں اپنے بیٹے کی سالگرہ کی تقریب میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے بیک وقت ایک سے زیادہ افراد سے گفتگو کرنے سے بھی روک دیا گیا تھا۔ یہ نسلی امتیاز کے خلاف لڑنے والے رہنماؤں کو خاموش کرنے اور اذیت دینے کی منظم سرکاری کوششوں کا ایک حصہ اور پابندیوں کے اس سلسلے کا پیش خیمہ تھا جو آزادی کے مختصر وقفوں کے ساتھ اس وقت تک جاری رہا جب چند سال بعد مجھے تمام آزادیوں سے محروم کر دیا تھا۔ پابندی ایک شخص کو صرف جسمانی طور پر ہی پابند نہیں کر دیتی، یہ اس کی روح کو بھی مقید کر

دیتی ہے۔ یہ ایک طرح کا نفسیاتی خوف انتہائی پیدا کرتی ہے جس سے نہ صرف نقل و حرکت بلکہ روحانی رہائی کی بھی شدید خواہش جنم لیتی ہے۔ پابندی ایک خطرناک کھیل تھا کیونکہ پابند شخص زنجیروں میں جکڑا ہوا یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند نہیں تھا۔ یہ سلاخیں وہ قوانین اور ضابطے تھے جن کی آسانی سے خلاف ورزی ہو سکتی تھی اور اکثر کی جاتی تھی۔ پابند شخص مختصر وقفوں کے لیے خاموشی سے ادھر ادھر ہو سکتا تھا اور آزادی کا عارضی لطف لے سکتا تھا، تاہم پابندیوں کا مخفی اثر یہ ہوتا تھا کہ ایک خاص موقع پر وہ یہ سوچنے لگتا کہ ظالم کہیں اس سے الگ نہیں بلکہ اس کے اندر موجود ہے۔

اگرچہ مجھے 1952ء کی سالانہ کانفرس میں شرکت سے روک دیا گیا تھا، مجھے فوراً ہی اطلاع مل گئی تھی کہ کانفرس میں کیا کچھ ہوا ہے۔ ایک اہم ترین فیصلہ وہ تھا جو خفیہ رکھا گیا تھا اور اس کی پبلسٹی نہیں کی گئی تھی۔

خفیہ ''منڈیلا پلان''

اوروں کی طرح مجھے بھی یقین ہو گیا تھا کہ حکومت اے این سی اور ایس اے آئی سی ساؤتھ افریقن کانگرس) کو غیر قانونی تنظیمیں قرار دینا چاہتی ہے جیسا کہ اس نے کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ناگزیر نظر آ رہا تھا کہ حکومت ہمیں جلد از جلد غیر قانونی تنظیم قرار دے کر کام کرنے سے روکنے کی کوشش کرے گی۔ اس کے پیش نظر میں نے نیشنل ایگزیکٹو سے رابطہ کر کے یہ رائے دی کہ ہمیں ایسے انجام کار کے لیے ایک ہنگامی منصوبہ وضع کر لینا چاہیے۔ میں نے کہا کہ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو یہ عوام کے قائدین کی حیثیت سے اپنے اوپر عائد شدہ ذمے داری سے دست بردار ہونے کے مترادف ہوگا۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں ایک منصوبے کا خاکہ تیار کروں جو ہماری تنظیم کو زیر زمین کام کرنے کے قابل بنا سکے۔ یہ اسٹراٹیجی منڈیلا پلان یا صرف ایم پلان کے نام سے معروف ہوئی۔

تصور یہ تھا کہ ایک تنظیمی مشینری قائم کی جائے جو اے این سی کو اعلیٰ ترین سطح پر ایسے فیصلے کرنے کا موقع فراہم کرے جو اجلاس بلائے بغیر پوری تنظیم تک تیزی سے پہنچائے جا سکیں۔ دوسرے لفظوں میں ایک غیر قانونی تنظیم مصروف عمل رہتی تھی۔ ایم پلان کی رو سے تنظیم نئے ارکان بھرتی کر سکتی تھی، مقامی اور قومی مسائل پر رائے دے سکتی تھی اور ارکان اور زیر زمین قیادت کے مابین باقاعدہ رابطہ برقرار رکھ سکتی تھی۔

میں نے اے این سی اور ایس اے آئی سی کے رہنماؤں کے ساتھ کئی خفیہ اجلاس کیے جن میں پابند اور غیر پابند دونوں قسم کے لیڈر شامل تھے اور منصوبے کے حدود پر گفتگو کی۔ میں نے کئی ماہ اس پر کام کر کے ایک ایسا سسٹم وضع کیا جس میں اتنی کشادگی تھی کہ اسے مقامی حالات کے مطابق ڈھالا جا سکتا تھا اور وہ انفرادی اقدام پر بندش نہیں لگاتا تھا مگر وہ اس قدر تفصیلی تھا کہ نظم وضبط برقرار رکھ سکتا تھا۔ سب سے چھوٹا یونٹ سیل تھا جو شہری بستیوں میں ایک بازار کے کم وبیش دس مکانوں پر مشتمل تھا۔ ایک سیل سٹیورڈ ایسے ہر یونٹ کا انچارج قرار پایا۔ اگر ایک بازار میں دس سے زائد مکان ہوں تو ایک سٹریٹ سٹیورڈ انچارج ہوگا اور سیل سٹیورڈ اسے رپورٹ کرے گا۔ سٹریٹوں کا ایک گروپ مل کر زون بنتا تھا جس کا ذمہ دار فرد چیف سٹیورڈ ہوگا جو آگے اے این سی کی مقامی شاخ کے سیکرٹریٹ کو جوابدہ ہوگا۔ سیکرٹریٹ برانچ ایگزیکٹو کی ایک سب کمیٹی تھا جو صوبائی سیکرٹری کو رپورٹ کرتا تھا۔ میرا پیش کردہ تصور یہ تھا کہ ہر سیل سٹیورڈ اور سٹریٹ سٹیورڈ کو اپنے علاقے کے ہر شخص اور ہر خاندان ک جاننا چاہیے تاکہ لوگ اس پر اعتبار کر سکیں اور اسے یہ علم ہو کہ کن پر اعتبار کرنا ہے۔ سیل سٹیورڈ اجلاسوں کا اہتمام کرتا، سیاسی کلاسیں منظم کرتا اور چندہ اکٹھا کرتا۔ وہ منصوبے کا محوری کیل تھا۔ اگرچہ یہ اسٹراٹیجی زیادہ تر شہری علاقوں کے لیے اختیار کی گئی تھی مگر یہ دیہی کے لیے بھی موزوں تھی۔

ایم پلان پر عمل درآمد

اعلی سطح پر منصوبہ قبول کر لیا گیا اور اسے فوراً زیرِ عمل لانے کا فیصلہ ہوا۔ شاخوں تک ہدایات پہنچ گئیں کہ اس کے مطابق خفیہ تنظیم سازی شروع کر دی جائے۔ اگرچہ بیشتر شاخوں نے اسے قبول کر لیا کچھ دور دراز شاخوں نے محسوس کیا کہ یہ منصوبہ جوہانسبرگ کی طرف سے مختلف علاقوں کو مرکزی کنٹرول میں لانے کی ایک کوشش ہے۔

ایم پلان کے تحت اے این سی نے ملک بھر میں اپنے ارکان کے لیے سیاسی لیکچروں کا ایک بنیادی کورس متعارف کرایا۔ ان لیکچروں کا مقصد تعلیم دینا ہی نہیں تھا بلکہ تنظیم کی وحدت برقرار رکھنا بھی تھا۔ یہ لیکچر خفیہ طور پر برانچ لیڈروں نے دیے۔ وہ ارکان جو ان میں شرکت کرتے یہی لیکچر بعد میں اپنے گھروں اور آبادی میں دیتے۔ شروع میں لیکچر ایک سسٹم کے تحت نہیں تھے مگر چند مہینوں کے اندر ایک طے شدہ نصاب پھیلا دیا گیا۔

نصاب میں تین کورس تھے، دنیا جس میں ہم رہتے ہیں۔ ہم پر کیسے حکومت کی جاتی ہے اور تبدیلی کی ضرورت۔ پہلے کورس میں ہم نے دنیا بھر اور جنوبی افریقہ میں مختلف قسم کی سیاسی و اقتصادی نظاموں پر بحث کی۔ یہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کا ایک اجمالی جائزہ تھا۔ مثلاً ہم نے بحث کی کہ کس طرح جنوبی افریقہ میں ہمیں ایک نسل اور ایک اقتصادی طبقے کی حیثیت سے ظلم کا شکار بنایا جاتا ہے۔ لیکچر دینے والے زیادہ تر پابند کیے گئے ارکان تھے۔ میں خود بھی شام کو لیکچر دیتا تھا۔ اس انتظام میں یہ خوبی تھی کہ ایک تو پابند ارکان مستعد رہتے۔ دوسرے ان رہنماؤں کا ارکان سے رابطہ رہتا۔

اس دور میں پابند قیادت اکثر خفیہ طور پر مل بیٹھتی تھی اور پھر موجود رہنماؤں کی ملاقات کا بندوبست کرتی تھی۔ پرانی اور نئی قیادت ایک دوسری سے ہم آہنگ تھی اور

فیصلہ سازی کا عمل اجتماعی تھا جیسا کہ پہلے تھا۔ بعض اوقات یہ احساس ہوتا کہ کوئی تبدیلی عمل میں نہیں آئی سوائے اس کے کہ ہمیں خفیہ ملاقاتیں کرنی پڑتی ہیں۔

ایم پلان بہترین ارادوں کے ساتھ پیش کیا گیا تھا لیکن اسے محض درمیانی کامیابی ملی اور اسے وسیع پیمانے پر کبھی اختیار نہ کیا گیا۔ سب سے موثر نتائج ایک بار پھر ایسٹرن کیپ اور پورٹ ایلزبتھ میں ظاہر ہوئے۔ مشرقی کیپ میں خلاف ورزی مہم کی روح ایک عرصے تک جاری رہی تھی۔ حالانکہ دوسرے علاقوں میں وہ ختم ہو چکی تھی، چنانچہ مشرقی کیپ میں اے این سی ارکان نے ایم پلان کو فوراہی اپنا لیا تاکہ حکومت سے پنجہ آزمائی کا سلسلہ جاری رہے۔

منصوبہ کئی مسائل سے دو چار ہوا۔ ارکان کے سامنے اس کی کافی وضاحت نہ کی جا سکی۔ اس پر عمل درآمد میں مدد دینے کے لیے تنخواہ دار آرگنائزر نہیں تھے اور شاخوں کے مابین اکثر اختلافات پیدا ہوتے رہے جس سے منصوبے پر اتفاق رائے پیدا ہونے میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ بعض صوبائی رہنماؤں نے اس کی مزاحمت کی کیونکہ ان کے خیال میں یہ نہیں لگتا تھا، چنانچہ انہوں نے کریک ڈاؤن کے اثرات کم کرنے کے لیے احتیاطی اقدامات نہ کیے اور جب حکومت کا آہنی ہاتھ ان پر پڑا تو وہ تیار نہیں تھے۔

گورے پائلٹ نے افریقی رہنماؤں کو نکالا

خلاف ورزی مہم کے دوران میری زندگی دو الگ راہوں پر چل رہی تھی۔ جدوجہد آزادی میں میری شرکت اور ایک وکیل کی حیثیت سے میرا روزگار۔۔۔۔ میں کبھی اے این سی کے لیے ہمہ وقتی آرگنائزر نہیں بنا تھا۔ اس کا آرگنائزر صرف ایک تھا اور وہ تھا تھامس ٹائٹس انکوبے۔ میں پارٹی کے لیے جو بھی کام کرتا تھا وہ مجھے اپنے وکالت کے شیڈول کے مطابق انجام دینا پڑتا تھا۔ 1951ء میں جب میں نے وٹکن، سائڈل سکائی اور آئڈل مین کے ہاں اپنے آرٹیکلز مکمل کر لیے تھے، میں ٹربلا

نکے اینڈ بریگش نامی لاءفرم کے ساتھ کام کرنے لگا۔ جب میں نے وہاں اپنے آرٹیکلز پورے کر لیے تو اگر چہ میں مکمل اٹارنی نہیں بنا تھا مگر اس پوزیشن میں تھا کہ عدالتی کاروائی کے لیے مقدمہ تیار کر سکوں، سمن بھیج سکوں اور گواہوں سے ملاقات کر سکوں۔۔۔ مقدمہ عدالت میں جانے سے پہلے ایک وکیل کو یہ سارے کام کرنے چاہییں۔

سائڈل سکائی سے فارغ ہو کر میں نے بہت سی سفید فرموں کے بارے میں معلومات حاصل کیں، تاہم کوئی افریقی لاءفرم موجود نہ تھی۔ مجھے ان فرموں کی وصولی کردہ فیسوں کے بارے میں خاصا تجسس ہوا اور یہ جان کر دکھ ہوا کہ بڑے اعتبار والی لاءفرموں میں سول اور فوجداری مقدمات میں اپنے امیر تر سفید موکلان کی نسبت افریقیوں سے زیادہ فیسیں وصول کرتی ہیں۔

ٹر بلا نکے اور بریگش کے لیے ایک سال کام کرنے کے بعد میں نے ہلمین اینڈ مل نامی فرم میں شرکت کر لی۔ یہ ایک لبرل فرم تھی اور ان چند فرموں میں سے ایک تھی جو افریقیوں سے معقول فیس وصول کرتی تھی۔ مزید براں یہ افریقیوں کی تعلیم میں خاص دلچسپی لیتی تھی اور اس کے لیے اچھے خاصے عطیات دیتی تھی۔ فرم کے سینئر پارٹنر مسٹر ہیلمین افریقی کاز کے لیے بہت پہلے سے کام کر رہے تھے اور یہ شغل کہیں بعد میں مقبول یا فیشن میں داخل ہوا۔ فرم کے دوسرے حصہ دار روڈنی مچل دوسری جنگ عظیم میں حصہ لے چکے تھے اور وہ بھی نہایت لبرل تھے۔ وہ ایک پائلٹ تھے اور بعد میں انہوں نے ظلم و تشدد کے بدترین دور میں اے این سی کے لوگوں کو بذریعہ طیارہ جنوبی افریقہ سے نکالا۔ مچل میں ایک ہی خرابی تھی کہ وہ بے تحاشا سگریٹ پیتے تھے اور دفتر میں سارا دن سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے رہتے۔

میں ایک مکمل وکیل بن گیا

ہلمین اینڈ مچل کے ساتھ میں کئی ماہ رہا جبکہ میں اپنے کوالیفکیشن امتحان کی تیاری

بھی کرتا رہا جسے پاس کر کے میں ایک مکمل اور مسلمہ وکیل بن سکتا تھا۔ میں نے واٹواٹرسرانڈ یونیورسٹی میں ایل ایل بی کے امتحان میں کئی بار ناکام رہنے کے بعد اسے چھوڑ دیا تھا۔ اب میں نے کوالیفکیشن امتحان دینا اس لیے پسند کیا تھا کہ قانونی پریکٹس کے ذریعے کافی رقم کی کہ اپنا خاندان پال سکوں۔ ان دنوں میری بہن ہمارے پاس مقیم تھی اور والدہ بھی آئی ہوئی تھیں اور زیرتربیت نرس کی حیثیت سے ایولین کا مشاہرہ اور میری قلیل آمدنی مل کر اتنی کافی رقم نہیں بنتی تھی کہ گھر والوں کی کپڑوں اور خوراک کی ضروریات بخوبی پوری ہوسکیں۔

جب میں نے کوالیفکیشن امتحان پاس کرلیا تو ایچ ایم باسز نامی فرم کے ساتھ ایک مکمل اٹارنی کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ مسٹر باسز، سینیٹ میں افریقیوں کے نمائندے اور کمیونسٹ پارٹی کے ابتدائی رکن رہ چکے تھے اور افریقیوں کے حقوق کے ایک پرجوش حامی تھے۔ ایک وکیل کی حیثیت سے وہ افریقی رہنماؤں اور مزدور لیڈروں کی طرف سے عدالتوں میں پیش ہوتے تھے۔ جن مہینوں میں، میں نے وہاں کام کیا۔ اکثر میں فرم کے کئی موکلوں کی وکالت کرنے عدالت میں جاتا تھا۔ مسٹر باسز ایک اچھے باس تھے اور جب تک میں نے فرم کے ساتھ کام کیا وہ میری سیاسی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ وہاں سے تجربہ حاصل کر کے اب میں اپنے آپ کو تیار پاتا تھا کہ اپنی الگ پریکٹس کروں۔

اگست 1952ء میں، میں نے خود اپنا لاء آفس کھول لیا۔ میری اولین کامیابی میری سیکرٹری زبیدہ پٹیل کے مرہون منت تھے۔ میں اس سے اس وقت ملا تھا جب وہ ایچ ایم باسز کے ہاں افریکان زبان بولنے والی سیکرٹری مس کوچ کی جگہ آئی تھی جس نے میری ڈکٹیشن لینے سے انکار کر دیا تھا۔ زبیدہ میرے دوست قاسم پٹیل کی بیوی تھی جو انڈین کانگرس کے رکن تھے اور وہ رنگ وغیرہ کے امتیاز سے ماورا تھی۔ اس کے ملنے والوں کا وسیع حلقہ تھا، وہ قانونی دنیا کے کئی لوگوں کو جانتی تھی اور جب

میں اپنے طور پر باہر جاتا وہ میرے لیے کام کرنے پر آمادہ ہوتی تھی ۔وہ براہ راست کئی مقدمات لاتی تھی ۔

''منڈیلا اینڈ ٹیمبو''

آلیور ٹیمبو اس وقت کوولسکائی اینڈ پچ نامی فرم کے ساتھ کام کر رہے تھے ۔ میں اکثر انکے لنچ آور کے دوران ان سے ملتا تھا اور روانٹس اوتلی ویٹنگ روم میں وانٹس اوتلی کرسی پر بیٹھنا نہ بھولتا۔ آلیور اور میں بہت اچھے دوست تھے اور لنچ کے اوقات کے دوران زیادہ تر اے این سی کے معاملات پر غور کرتے۔ انہوں نے پہلے مجھے فورٹ ہیئر میں متاثر کیا تھا جہاں میں نے ان کی فکر انگیز ذہانت اور تیز مباحثاتی مہارت کا مشاہدہ کیا تھا۔ اپنے دھیمے منطقی انداز سے وہ اپنے مخالف کے دلائل کا تیا پانچا کر سکتے تھے ۔ایسی ذہانت جو کمرہ عدالت میں بڑی مفید رہتی ہے ۔فورٹ ہیئر سے پہلے وہ جوہانسبرگ میں سینٹ پیٹرز کے ذہین طالب علم رہے تھے۔ انکی یکساں معروضیت معاملات کے متعلق میرے زیادہ جذباتی ردعمل کا تریاق تھی ۔ آلیور گہرے مذہبی آدمی تھے اور عرصے سے اپنے پادری بننے کو موزوں خیال کرتے تھے ۔ وہ میرے ہمسائے بھی تھے کیونکہ وہ پونڈ لینڈ کی بستی بیزانا سے آئے تھے جو ٹرانسکائی کا حصہ تھی اور ان کے چہرے پر ان کے قبیلے کے امتیازی نشانات نقش تھے۔ ہمارے لیے اکٹھے کام کرنا بظاہر قدرتی بات تھی اور میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ میرے ساتھ کام کریں ۔ چند ماہ جب آلیور اپنی فرم سے الگ ہونے کے قابل ہوئے تو ہم نے جوہانسبرگ کے وسط میں اپنا دفتر کھول لیا ۔

چانسلر ہاؤس میں ہمارے دفتر کے دروازے پر پیتل کی پلیٹ پر منڈیلا اینڈ ٹیمبو لکھا ہوا تھا۔ چانسلر ہاؤس وسطی جوہانسبرگ میں مجسٹریٹ کی عدالت کے سامنے نصب مرمر کے مجسمہ انصاف کے بالمقابل ایک چھوٹی عمارت تھی ۔ یہ ہندوستانیوں کی ملکیت تھی اور شہر کی ان چند عمارات میں سے ایک تھی جہاں افریقی کرائے پر دفاتر

لے سکتے تھے۔شروع ہی سے فرم منڈیلا اینڈ ٹیمبو موکلوں کے گھیرے میں رہنے لگی۔ ہم جنوبی افریقہ میں نہ صرف واحد افریقی وکیل تھے بلکہ ہماری فرم افریقی وکلاء کی واحد فرم تھی۔افریقیوں کے لیے ہم پہلا اور آخری انتخاب تھے۔ ہر صبح اپنے دفاتر میں پہنچنے سے پہلے ہمیں راہداریوں میں، سیڑھیوں پر اور اپنے چھوٹے ویٹنگ روم میں لوگوں کے ہجوم میں سے گزرنا پڑتا۔

سرکاری عمارت میں افریقیوں کو قانونی امداد کی شدید طلب تھی۔ان دنوں وائٹس اونلی دروازے میں سے گزرنا جرم تھا، وائٹس اونلی بس میں سوار ہونا جرم تھا۔وائٹس اونلی ٹونٹی سے پانی پینا جرم تھا۔وائٹس اونلی ساحل پر چلنا جرم تھا، گیارہ بجے رات کے بعد بازار میں ہونا جرم تھا، پاس بک نہ رکھنا جرم تھا اور اس بک میں غلط دستخط کرنا جرم تھا، بے روزگار رہنا جرم تھا اور غلط مقام پر روزگار حاصل کرنا جرم تھا، مخصوص مقامات پر رہنا جرم تھا اور کوئی رہائش کی جگہ نہ رکھنا جرم تھا۔

ہر ہفتے ہم دیہی علاقے سے آنے والے بوڑھے آدمیوں سے ملتے جو بتاتے کہ ان کا خاندان نسل درنسل ایک قطعہ زمین کا مالک چلا آرہا ہے مگر اب انہیں وہاں سے نکالا جارہا ہے، ہر ہفتے ہمیں بوڑھی عورتیں ملتی جو بتاتیں کہ وہ اپنی قلیل آمدنی میں اضافے کے لیے افریقی بیئر تیار کرتی رہی ہیں لیکن اب انہیں جیل کے خوف اور جرمانوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو وہ ادا کر ہی نہیں سکتیں۔ ہر ہفتے ہمیں ایسے لوگ ملتے جو کئی دہائیوں سے اپنے گھروں میں رہتے آرہے تھے مگر اب انہیں یہ علم ہوا کہ ان کا علاقہ تو سفید قرار دیا جا چکا ہے اور انہیں کسی معاوضے کے بغیر یہ علاقہ چھوڑنا ہوگا۔ہر روز ہم ہزاروں افریقیوں سے توہین آمیز سلوک ہوتے دیکھتے یا اس کے متعلق سنتے جس کا سامنا انہیں آئے دن کرنا پڑتا تھا۔

آلیور کام کرنے کے لحاظ سے انتھک تھا۔وہ ہر موکل کے ساتھ خاصا وقت صرف کرتا، محض پیشہ ورانہ ضرورت سے نہیں اپنی بے پناہ رحم دلی اور تحمل کے باعث

ایسا کرتا تھا۔ وہ اپنے موکلوں کے مقدمات اور ان کی زندگی میں اس طرح شرکت کرتا کہ ان سے گھل مل جاتا۔ اسے اجتماعی طور پر عوام اور ایک ایک فرد کے مصائب پر دلی دکھ محسوس ہوتا تھا۔

''کافر وکیل'' عدالتوں میں

میں نے جلد محسوس کرلیا کہ عام افریقیوں کے نزدیک منڈیلا اینڈ ٹیمبو کا مفہوم کیا ہے۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں آ کر ان کی بات ہمدردی سے سنی جاتی تھی اور انہیں لائق دوست ملتے تھے، جہاں آ کر ان کی ہمدردی سے سنی جاتی تھی اور انہیں لائق دوست ملتے تھے، جہاں نہ انہیں دھتکارا جاتا تھا نہ دھوکا دیا جاتا تھا اور جہاں انہیں محسوس ہوتا تھا کہ انہی کی جلد کی رنگت والے آدمی ان کی نمائندگی کررہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں اول درجے کا وکیل بن گیا تھا اور اپنے کام کی نوعیت سے مجھے اکثر یہ احساس ہوتا کہ میں نے اس پیشے کا انتخاب کرکے درست فیصلہ کیا ہے۔

ہر صبح ہم نصف درجن مقدمات بھگتانے اور دن بھر عدالت آتے جاتے رہتے۔ بعض عدالتوں میں ہم سے احترام کا برتاؤ ہوتا جبکہ دوسری عدالتوں میں نفرت و حقارت کا سامنا کرنا پڑتا۔ ہم جب یہ قانونی پریکٹس کرتے تھے اور مقدمے لڑتے اور جیتتے تو ہمیشہ یہ احساس ہوتا کہ ہم وکلاء کی حیثیت سے خواہ کتنی ہی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کریں، ہم کبھی سرکاری وکیل، جج یا مجسٹریٹ نہیں بن سکتے۔ اگرچہ ہمیں ایسے افسروں سے رابطہ پڑتا تھا جن کی اہلیت ہم سے زیادہ نہیں تھی مگر ان کی اتھارٹی ان کی جلد کی رنگت کی بنیاد پر استوار تھی۔

عدالت کے اندر بھی ہمیں اکثر تعصب کا سامنا کرنا پڑتا۔ سفید گواہ اکثر ایک کالے اٹارنی کے سوالوں کا جواب دینے سے انکار کردیتے۔ انہیں توہین عدالت سے باز رکھنے کے بجائے مجسٹریٹ خود ان سے وہ سوال کرتا جن کا مجھے جواب دینے سے وہ انکار کرچکے ہوتے تھے۔ میں اکثر کٹہرے میں گورے پولیس والوں پر جرح

کرتا۔ اگرچہ میں ان کے بیانات میں تفاوت اور جھوٹ کو پکڑ لیتا مگر وہ میری ذرا پروا نہ کرتے اور مجھے فقط ایک کافر وکیل گردانتے۔

نسلی امتیاز کے بدترین تجربات

مجھے یاد ہے کہ ایک بار ایک مقدمے کے شروع ہی میں مجھے اپنی شناخت کرانے کو کہا گیا۔ یہ ایک روایتی بات تھی۔ میں نے کہا: میں نیلسن منڈیلا ہوں اور ملزم کی طرف سے پیش ہوا ہوں۔ مجسٹریٹ نے کہا: میں تمہیں نہیں جانتا۔ تمہارا سٹرٹیفکیٹ کہاں ہے۔ اب ایک سٹرٹیفکیٹ تو ایک نفیس ڈپلومہ ہوتا ہے جسے اس کا حامل فریم میں لگا کر دیوار پر سجاتا ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہوتا جسے وکیل ہمیشہ اپنے ساتھ لیے پھرے۔ یہ ایسی ہی بات تھی جیسے ایک شخص سے سرراہ اس کی یونیورسٹی ڈگری طلب کی جائے۔ میں نے درخواست کی کہ مجسٹریٹ صاحب کیس شروع کریں اور اپنا سٹرٹیفکیٹ اگلے مرحلے میں پیش کروں گا لیکن مجسٹریٹ نے کیس سننے سے انکار کر دیا اور اس قدر عناد ظاہر کیا کہ کورٹ آفیسر سے کہا کہ مجھے باہر نکال دے۔

یہ عدالتی پریکٹس کی صریح خلاف ورزی تھی۔ معاملہ آخر کار سپریم کورٹ میں پہنچا اور میرے دوست ایڈووکیٹ جارج بازوس میری طرف سے پیش ہوئے۔ سماعت کے دوران پریذائڈنگ جج نے مجسٹریٹ کے رویئے پر تنقید کی اور حکم دیا کہ ایک مختلف جج مقدمے کو سنے۔

ایک وکیل ہونا عدالت سے باہر بھی احترام کی ضمانت نہیں تھا۔ ایک روز اپنے دفتر کے نزدیک میں نے بڑی عمر کی ایک گوری عورت کو دیکھا جس کی کار دو کاروں کے درمیان سینڈوچ بنی ہوئی تھی۔ میں فوراً وہاں پہنچا اور اسکی کار کو دھکا دیکر باہر نکالنے میں اس کی مدد کی۔ انگریزی بولنے والی عورت میری طرف مڑی اور بولی: شکریہ آپ کا جن۔۔ یہ جان وہ نام تھے جو گورے اس وقت استعمال کرتے تھے جب وہ کسی افریقی سے مخاطب ہوتے اور اس کا نام انہیں معلوم نہ ہوتا۔ پھر اس نے چھ پنس کا

سکہ مجھے پکڑانا چاہا مگر میں نے لینے سے انکار کر دیا۔اس نے پھر سکہ میری طرف بڑھایا لیکن میں نے شکریہ کہہ کر انکار کر دیا۔اس پر وہ کہنے لگی: تم چھ پنس لینے سے انکار کرتے ہو۔اس کا مطلب ہے تمہیں ایک شلنگ چاہیے مگر وہ تمہیں نہیں ملے گا۔ پھر اس نے سکہ میری طرف پھینکا اور گاڑی بھگا کر چلی گئی۔

ایک سال کے اندر اندر آلیور کو اور مجھے معلوم ہو گیا کہ اربن ایریاز ایکٹ کے تحت وزارتی منظوری کے بغیر شہر میں کوئی کاروباری دفتر نہیں مل سکتا۔ ہماری درخواست مسترد کر دی گئی اور اس کے بجائے ہمیں گروپ ایریاز ایکٹ کے تحت ایک عارضی پرمٹ دیا گیا جس کی مدت جلد ہی ختم ہو گئی۔ حکام نے اس کی تجدید سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم اپنا دفتر کئی میل دور کسی افریقی آبادی میں لے جائیں جہاں ہمارے موکلوں کے لیے پہنچنا ممکن نہ تھا۔ہم نے اس کی یہ توجیہہ کی کہ حکام ہمیں قانونی کاروبار سے باہر رکھنا چاہتے ہیں چنانچہ ہم نے غیر قانونی طور پر ایک دفتر لے لیا اگرچہ انخلاء کا خطرہ مستقل طور پر ہمارے سر پر سوار تھا۔جنوبی افریقہ میں ایک وکیل کی حیثیت سے کام کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ایک بے قدر نظام عدل کے تحت کام کیا جائے ۔یہ ایک ایسا قانونی نظام تھا جو مساوات پر استوار نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس تھا۔اس کی ایک انتہائی مگروہ شکل پاپولیشن رجسٹریشن ایکٹ تھا جو اس عدم مساوات کا تعین کرتا تھا۔

خمیدہ کندھوں کا فیصلہ

ایک بار میں، میں نے ایک رنگ دار آدمی کا کیس لیا جسے غفلت سے افریقی قرار دے دیا گیا تھا۔دوسری جنگ عظیم کے دوران اس نے شمالی افریقہ اور اٹلی میں جنوبی افریقہ کے لیے جنگ لڑی تھی مگر اس کی واپسی کے بعد ایک گورے بیوروکریٹ نے اسے افریقی خانے میں رکھ دیا تھا۔اس قسم کے کیس جنوبی افریقہ میں غیر معمولی بات نہ تھی اور یہ ایک اخلاقی معمہ بن جاتے تھے۔ میں پاپولیشن

رجسٹریشن ایکٹ کے ضابطوں کو تسلیم نہیں کرتا تھا اور نہ ان کا حامی تھا لیکن میرے موکل کی رائے دہندگی کی ضروریات تھی جبکہ اسے ایک ایسے خانے میں رکھ دیا گیا جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ عملاً ایک افریقی کے بجائے رنگ دار قرار پانے میں کئی فائدے تھے جیسا کہ رنگ داروں کے لیے اپنے پاس ساتھ لیے پھرنا ضروری نہیں تھا۔

اپنے موکل کی طرف سے میں نے کلاسیفیکشن بورڈ میں اپیل کر دی جو پاپولیشن رجسٹریشن ایکٹ کے تحت آنے والے مقدمات نپٹا تا تھا۔ بورڈ ایک مجسٹریٹ اور دوسرے افسروں پر مشتمل تھا جو سب سفید فام تھے ۔ اپنے موکل کا مقدمہ پیش کرنے کے لیے میرے پاس موثق دستاویزی شہادت تھی اور پراسیکیوٹر نے رسمی طور پر اشارہ دیا کہ وہ ہماری اپیل کی مخالفت نہیں کریگا۔ لیکن لگتا تھا کہ مجسٹریٹ کو میری شہادت اور سرکاری وکیل کے تامل میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اس مے میرے موکل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر درشتگی سے کہا کہ وہ اپنی پشت ان کی طرف کر دے۔ اس نے اپنا رخ پھیر لیا تو مجسٹریٹ نے اس کے خمیدہ کندھوں کا جائزہ لینے کے بعد دوسرے افسروں سے اشارتاً کچھ کہا اور پھر اپیل مسترد کر دی۔ ان دنوں گورے حکام کے خیال میں جھکے ہوئے کندھے رنگ دار ساخت کی پکی علامت تھے۔ یوں اس شخص کی راہ حیات کا فیصلہ کندھوں کی ساخت کے متعلق مجسٹریٹ کے تصور کی بنا پر ہو گیا۔

ہم نے پولیس تشدد کے حامل کئی مقدمات بھگتائے اگر چہ ہماری کامیابی کی شرح بہت نیچے رہی۔ پولیس کی وارداتوں کو ثابت کرنا ہمیشہ مشکل ہوتا۔ پولیس والے اتنے ہوشیار اور چالاک تھے کہ وہ ایک قیدی کو اتنا عرصہ محبوس رکھتے کہ اس کے زخم مندمل ہو جاتے۔ فطری طور پر مجسٹریٹ پولیس کی طرفداری کرتے۔ پولیس کی حراست میں کسی شخص کی موت پر میڈیکل افسر اکثر لگی بندھی رائے دیتا، کثیر اسباب

کے باعث موت یا وہ ایسی مبہم وضاحت کرتا کہ پولیس والے صاف بری ہو جاتے۔

جب کبھی میں جوہانسبرگ کے باہر مقدمہ بھگتانے جاتا تو میں عارضی طور پر پابندی اٹھائے جانے کی درخواست کرتا جو اکثر منظور کر لی جاتی۔ مثلاً ایک بار میں نے مشرقی ٹرانسوال کا سفر کیا اور کیرولینا کے قصبے میں ایک موکل کا مقدمہ لڑا۔ میری وہاں آمد پر ایک سنسنی پھیل گئی کیونکہ بہت سے لوگوں نے پہلے کبھی کوئی افریقی وکیل نہیں دیکھا تھا۔ مجسٹریٹ اور پراسیکیوٹر نے میرا گرمجوشی سے استقبال کیا اور خاصی دیر تک مقدمے کی کاروائی شروع نہ ہو سکی کیونکہ وہ میرے پیشے کے متعلق اور اس بارے میں سوالات پوچھتے رہے کہ میں وکیل کیسے بن گیا۔ نیز متجسس مقامی لوگوں کا ایک ہجوم عدالت میں اکٹھا ہو گیا تھا۔

میں نے جادوگر کی وکالت کی

میں ایک قریبی گاؤں سے تعلق رکھنے والے ایک مقامی طبیب کی طرف سے پیش ہوا جس پر جادوگری کا الزام تھا۔ اس مقدمے نے بھی بڑی مقدار میں ہجوم اکٹھا کر لیا۔ وہ مجھے دیکھنے نہیں بلکہ یہ معلوم کرنے آئے تھے کہ کیا سفید فاموں کے قوانین ایک سانگوما پر لاگو ہوتے ہیں۔ مقامی طبیب علاقے میں خاصا اثر رسوخ رکھتا تھا اور بہت سے لوگ اس سے ڈرتے اور اس کی پوجا بھی کرتے تھے۔ ایک موقع پر میرے موکل نے زور سے چھینک ماری جس پر کمرہ عدالت میں ہلچل مچ گئی اور اکثر حاضرین نے خیال کیا کہ جادو پھینک رہا ہے۔ اسے مجرم نہ گردانا گیا لیکن مجھے شبہ ہے کہ مقامی لوگوں نے اسے میری وکیلانہ مہارت کا صلہ نہیں بلکہ مقامی طبیب کی جڑی بوٹیوں کا معجزانہ اثر خیال کیا تھا۔

ایک وکیل کی حیثیت سے میں عدالت میں تندوترش ہو سکتا تھا۔ لیکن میں ایسا رویہ نہیں اپناتا تھا جیسے میں ایک سفید فام کی عدالت میں پیش ہونے والا سیاہ فام ہوں بلکہ میرا رویہ ایسا ہوتا تھا جیسے میں ایک سفید فام کی عدالت میں پیش ہونے والا سیاہ

فام ہوں بلکہ میرا رویہ ایسا ہوتا جیسے ہر کئی ۔ کالا ہو یا گورا ۔ میری عدالت میں ایک مہمان ہے ۔ مقدمہ پیش کرتے ہوئے میں اکثر تاثر خیز اشارے کرتا اور اعلیٰ درجے کی زبان استعمال کرتا ۔ میں تمام عدالتی ضابطوں کا پابند تھا مگر کبھی کبھی گواہوں کے معاملے میں غیر ثقہ ہتھکنڈے استعمال کرتا ۔ میں جرح سے لطف اندوز ہوتا اور اکثر نسلی کشمکش پر خطابت کے جوہر دکھاتا ۔ تماشائیوں کی گیلری عموماً بھر جاتی کیونکہ بستی کے لوگ ایک طرح کی تفریح کے طور پر عدالت میں حاضری دیتے ۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں ایک افریقی خاتون کے دفاع میں پیش ہوا جو قصبے میں ایک گھریلو کارکن کا کام کرتی تھی ۔ اس پر الزام لگایا گیا تھا کہ اس نے اپنی، مادام کے کپڑے چوری کیے ہیں ۔ کپڑے جو مبینہ طور پر چرائے گئے تھے، عدالت میں ایک میز پر رکھے ہوئے تھے، جب مادام اپنا بیان دے چکی تو میں نے اس پر جرح شروع کی اور چل کر شہادت کی میز تک گیا ۔ میں نے ان کپڑوں کا جائزہ لیا اور پھر اپنی پنسل کی نوک سے ایک لیڈیز انڈرویئر اٹھایا ۔ میں آہستہ آہستہ کٹہرے کی طرف آیا اور انڈرویئر مادام کی طرف لہراتے ہوئے پوچھا:

''مادام کیا یہ آپ کا ہے؟

''نہیں ۔'' اس نے تیزی سے جواب دیا وہ اس قدر گھبرا گئی تھی کہ تسلیم نہ کرسکی کہ انڈرویئر اس کا ہے ۔ اس جواب اور شہادت کے دیگر نقائص کی بنا پر مجسٹریٹ نے مقدمہ خارج کردیا ۔

تین بستیاں اٹھانے کا شیطانی فیصلہ

جوہانسبرگ کے چار میل مغرب میں صوفیہ ٹاؤن کی افریقی بستی ایک چٹانی بڑھاوے پر واقع تھی ۔ فادر ٹریور ہڈل سن نے ایک بار اسے کسی اطالوی ہل ٹاؤن کے مشابہ قرار دیا تھا اور فاصلے سے مقام میں واقعی ایک کشش تھی ۔ قریب قریب واقع سرخ چھتوں کے مکانات، گلابی آسمان میں تحلیل ہوتا ہوا دھواں، لمبے اور پتلے

گوند کے درخت جو بستی کو گھیرے ہوئے تھے۔ قریب پہنچ کر ہی وہ غربت اور بدحالی دکھائی دیتی تھی جس میں صوفیہ ٹاؤن کے مکین رہ رہے تھے۔ گلیاں اور کچی تھیں اور ہر قطعہ زمین میں درجنوں جھونپڑے تھے جو ایک دوسرے کے بالکل ساتھ ساتھ واقع تھے۔

صوفیہ ٹاؤن، مارٹن ڈیل اور نیو کلائر کو مجموعی طور پر ویسٹرن ایریاز ٹاؤن شپس کہتے تھے۔ یہ علاقہ پہلے گوروں کے لیے مخصوص کیا گیا تھا اور ایک پراپرٹی ڈویلپر نے ان کے لیے وہاں کئی مکانات بنائے بھی تھے۔ لیکن اس کے نزدیک ہی کوڑے کا ڈمپ ہونے کے باعث گوروں نے کہیں اور رہنا پسند کیا۔ بادل نخواستہ ڈویلپر نے اپنے تعمیر کردہ مکانات افریقیوں کے ہاتھ بیچ دیئے۔ یوں صوفیہ ٹاؤن ٹرانسوال کے ان چند مقامات میں سے ایک تھا جہاں افریقی 1923ء کے اربن ایریاز ایکٹ سے پہلے کوئی اڈا یا پلاٹ خرید سکتے تھے۔ وہ پرانے اینٹ اور پتھر کے مکانات جن کے ساتھ ٹین کی چھت کے برآمدے بھی تھے، جو پرانی رہائش گاہوں کے آگے اور پیچھے کھڑے کیے گئے تھے۔ کئی خاندان ایک ہی کٹیا میں سما جاتے مخصوص کردار تھا۔ افریقیوں کے لیے یہ پیرس کا لیفٹ بنک اور نیو یارک کا گرین وچ ویلج تھا جہاں ادیب، فنکار اور وکلاء رہتے تھے۔ یہ نٹ کھٹ بھی تھا اور قدامت پرست بھی، زندہ دل بھی تھا اور پرسکون بھی۔ یہاں ڈاکٹر ژوما بھی اپنا کلینک چلاتے تھے اور برلن والوں اور امریکیوں کی پیروی کرنے والے ٹسوٹی بھی تھے جو جون وائن اور ہم فرے بوگارٹ جیسے امریکی فلمی ستاروں کے نام اپنا لیتے تھے اور صوفیہ ٹاؤن کو جوہانسبرگ میں افریقی بچوں کے لیے واحد تیراکی کے تالاب پر فخر تھا۔

اب جوہانسبرگ میں ویسٹرن ایریاز ریموول سکیم کے نفاذ کا مطلب تھا صوفیہ ٹاؤن، مارٹن ڈیل اور نیو کلائر تینوں سے آبادی کا انخلاء۔ جن کی مجموعی آبادی ساٹھ ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان تھی۔ 1953ء میں نیشنلسٹ حکومت نے

میڈولینڈز کے نام سے ایک قطعہ زمین خرید اتھا جو شہر سے 13 میل کے فاصلے پر تھا۔لوگوں کو وہاں سات مختلف نسلی گروہوں میں آباد کیا جانا تھا۔حکومت کا عذر گندی بستیوں کی صفائی تھا مگر دراصل وہ اس کے پردے میں ان تمام شہری علاقوں کو سفید فام رکھنا چاہتی تھی جہاں افریقی عارضی طور پر مقیم تھے۔

حکومت پر قریبی علاقوں ویسٹ ڈین اور نیو لینڈز کے اپنے حامیوں کا دباؤ جو نسبتا غریب گورے علاقے تھے۔یہ مزور پیشہ گورے صوفیہ ٹاؤن میں بعض کالوں کی ملکیت شاندار مکانوں پر بڑا حسد کرتے تھے۔حکومت افریقیوں کی تمام تحریکوں کو کنٹرول کرنا چاہتی تھی اور فری ہولڈ اربن ٹاؤن شپس میں ایسا کنٹرول کہیں زیادہ مشکل تھا جہاں کالے جائیداد خرید سکتے تھے اور حسب خواہش آجا سکتے تھے۔اگرچہ پاس سسٹم ہنوز مسلط تھا، ایک فری ہولڈ ٹاؤن شپ میں داخل ہونے کے لیے کسی خصوصی پرمٹ کی ضرورت نہ تھی جیسا کہ میونسپل حدود لازمی تھی۔افریقی پچھلے پچاس برسوں سے صوفیہ ٹاؤن میں رہتے اور جائیدادوں کے مالک تھے اور اب حکومت بے رحمی سے یہ منصوبہ بنا رہی تھی کہ صوفیہ ٹاؤن کے تمام افریقی باشندوں ب کو ایک اور بلیک ٹاؤن شپ میں منتقل کر دیا جائے۔حکومت اس منصوبے میں اتنی شدت پسند تھی کہ انخلا کی زد میں آنے والے لوگوں کے لیے وہاں مکانات تعمیر ہونے سے پہلے ہی انخلاء پر عملدرآمد کا فیصلہ کرلیا گیا۔خلاف ورزی مہم کے بعد صوفیہ ٹاؤکن کا انخلاء اے این سی اور اسکے اتحادیوں کے لیے قوت کا پہلا بڑا امتحان تھا۔

یوسف کاچھالیا کی گرفتاری

اگرچہ صوفیہ ٹاؤن کے انخلا کی سرکاری مہم 1950ء ہی میں شروع ہو چکی تھی، اسے رکوانے کے لیے اے این سی کی کوششوں کا آغاز کہیں 1953ء میں ہوا۔سال کے وسط تک اے این سی اور ٹی آئی سی کی مقامی شاخیں اور مقامی ریٹ پیئرز ایسوسی ایشن لوگوں کو مزاحمت کے لیے متحرک کررہی تھیں۔جون 1953ء میں اے این سی

اور ٹی آئی سی کی صوبائی ایگزیکٹو کا ایک کھلا اجلاس صوفیہ ٹاؤن کے اوڈین سینما میں منعقد ہوا تا کہ انخلا کی مخالفت کا لائحہ عمل طے کیا جائے۔ یہ ایک جاندار اور بارونق اجلاس تھا جس میں بارہ سو افراد نے شرکت کی اور ان میں سے کوئی ایک بھی درجنوں مسلح پولیس والوں کی موجودگی سے خوفزدہ نہ تھا۔

اس اجلاس میں چند روز پہلے ہی میرے اور والٹر سیسولو کی پابندی کے احکام کی مدت ختم ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ہمیں کسی اجتماع میں شرکت یا تقریر کرنے سے روکا نہیں جائے گا۔ چنانچہ سینما کے اجلاس سے میرے خطاب کی تیزی سے تیاریاں کی جا رہی تھیں۔

اجلاس شروع ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے ایک پولیس افسر نے والٹر کو اور مجھے سینما کے باہر فادر ہڈل سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا جو ''انخلا کی مخالفت'' کے ایک رہنما تھے۔ افسر نے ہم دونوں کے پاس آ کر کہا کہ پابند افراد کی حیثیت سے ہم اس اجلاس میں شرکت کا حق نہیں رکھتے اور پھر اس نے اپنے ماتحت افسروں کو حکم دیا کہ ہم دونوں کو گرفتار کر لیں۔ فادر ہڈل سٹن پولیس والوں کو ہماری طرف بڑھتے دیکھ کر چلائے ''نہیں، ان کے بجائے تم مجھے گرفتار کر لو، میرے پیارو!'' اعلیٰ افسر نے فادر ہڈل سٹن کو پرے ہٹ جانے کا حکم دیا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ جب پولیس والوں نے انہیں راستے سے ہٹا دیا تو میں نے افسر سے کہا: ''تمہیں یہ یقین کر لینا چاہیے کہ ہم پابندی کے حکم کے تحت آتے ہیں یا نہیں۔ یاد رکھو اگر ہماری پابندیاں ختم ہو چکی ہیں تو تمہارا یہ اقدام غیر قانونی ہوگا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر ہماری پابندیاں ختم ہو چکی ہیں تو تمہارا یہ اقدام غیر قانونی ہوگا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر ہماری پابندیاں ختم نہ ہو چکی ہوتیں تو آج رات ہم یہاں کھڑے تم سے باتیں کر رہے ہوتے؟''

پولیس بہت خراب ریکارڈ رکھنے کے لیے بدنام تھی اور اکثر اسے خبر نہ ہوتی تھی کہ پابندیاں کب ختم ہوئیں۔ وہ افسر اس بات کو میری طرح بخوبی جانتا تھا اس نے کچھ

دیر میرے الفاظ پر غور کیا، پھر اپنے آدمیوں کو پیچھے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ اور وہ لوگ ایک طرف ہٹ کر کھڑے تھے جب ہم ہال میں داخل ہو رہے تھے۔

اندر موجود پولیس کا رویہ اشتعال انگیز اور نفرت آمیز تھا۔ وہ ہال کے اندر لوگوں کو ادھر ادھر دھکیلتے ہوئے توہین آمیز ریمارکس دے رہے تھے۔ میں کئی دوسرے لیڈروں کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھا تھا اور جب اجلاس شروع ہونے والا تھا، میں نے میجر پرنسلو کو دیکھا جو اسٹیج ڈور سے اندر چلے آ رہے تھے اور ان کے ہمراہ بہت سے مسلح افسر تھے۔ میں نے ان سے آنکھیں ملاتے ہوئے اپنی طرف یوں اشارہ کیا جیسے کہا ہو ''مجھے؟'' مگر انہوں نے اپنا سر ہلا دیا وہ سیدھا پوڈیم کی طرف گیا جہاں یوسف کا چھالیا اپنی تقریر شروع کر چکا تھا۔ میجر نے دوسرے افسر کو حکم دیا کہ یوسف کو گرفتار کر لیں۔ اس پر وہ لوگ اسے بازوؤں سے پکڑ کر باہر کھینچنے لگے۔ ہال کے باہر پولیس نے رابرٹ ریشا اور احمد کاتھرادا کو پہلے ہی گرفتار کر لیا تھا۔

اس دوران ہجوم چیخنے چلانے لگا تھا اور میں نے دیکھا کہ اگر اسے کنٹرول نہ کیا گیا تو صورت حال دگرگوں ہو سکتی ہے۔ میں اچھل کر پوڈیم تک گیا اور ایک معروف احتجاجی گیت گانے لگا اور جیسے ہی میں نے پہلے چند الفاظ ادا کیے، ہجوم میرا ہمنوا بن گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اگر ہجوم زیادہ ہی بے قابو ہو جاتا تو پولیس فائر کھول دیتی۔

اے این سی ہر اتوار کی شام صوفیہ ٹاؤن کے وسط میں فریڈم سکوائر میں جلسہ منعقد کر رہی تھی تاکہ انخلا کی مخالفت میں عوام کو متحرک کیا جا سکے۔ ان جوشیلے جلسوں میں ''آسی ہا می!'' (ہم انخلا نہیں کر رہے) اور ''صوفیہ ٹاؤن لکھایا لام'' (صوفیہ ٹاؤن ہمارا گھر ہے) کے نعرے بار بار گونجتے۔ ان جلسوں سے اے این سی کے سرکردہ ارکان، سٹینڈ ہولڈرز، کرائے دار، سٹی کونسلر اور اکثر فدر ہڈل سٹن خطاب کرتے جو پولیس کے اس انتباہ کو نظر انداز کر دیتے کہ وہ فقط چرچ کے معاملات سے سروکار رکھیں۔

جلسہ عام میں پولیس کو میرا چیلنج:

اوڈین سینما والے واقعے کے کچھ عرصے بعد ایک اتوار کی شام مجھے فریڈم سکوائر میں تقریر کرنا تھی۔ اس رات ہجوم خاصا جذباتی ہو رہا تھا اور ان کے جذبات نے بلا شبہ مجھے بھی متاثر کیا تھا۔ وہاں بہت سے نوجوان موجود تھے اور وہ غصیلے اور عملی اقدام پر آمادہ ہو رہے تھے۔ حسب معمول گردونواح میں پولیس موجود تھی جو رائفلوں اور پنسلوں سے مسلح تھی۔ پنسلوں سے نوٹس لیے جا رہے تھے کہ کون خطاب کر رہا تھا اور کیا کہہ رہا تھا۔ ہم نے کھل کر اظہار خیال کیا تا کہ پولیس والے جان لیں کہ ہم کچھ نہیں چھپا رہے حتیٰ کہ ان سے اپنی نفرت کو بھی نہیں۔

میں نے خلاف ورزی مہم کے پیش نظر حکومت کی بڑھتی ہوئی تشدد پسندی کے ذکر سے تقریر کا آغاز کیا۔ میں نے کہا کہ حکومت اب افریقی عوام کی طاقت سے خوفزدہ ہے۔ تقریر کرتے ہوئے میرا رویہ زیادہ سے زیادہ جارحانہ ہوتا گیا۔ ان دنوں میں عوام کو اپنے ساتھ بہا لے جانے والا مقرر تھا۔ میں سامعین کو اشتعال دلانا پسند کرتا تھا اور اس رات میں یہی کچھ کر رہا تھا۔

حکومت کے ظالمانہ اور غیر قانونی اقدامات پر تنقید کرتے ہوئے میں تمام حدیں پار کر گیا۔ میں نے کہا: ''غیر متحرک مزاحمت کا دور ختم ہو گیا ہے۔ عدم تشدد اب بیکار شے ہے اور اس سے گوری اقلیت کا تختہ نہیں الٹا جا سکتا جو ہر قیمت پر اقتدار اپنے پاس رکھنے پر تلی ہوئی ہے۔ آخر میں تشدد ہی واحد ہتھیار ہے جو نسلی امتیاز کا خاتمہ کرے گا اور مستقبل قریب میں یہ ہتھیار استعمال کرنے کے لیے ہمیں تیار رہنا چاہیے۔''

ہجوم جوش میں آ گیا، خاص طور پر نوجوان تالیاں بجا اور داد و تحسین کے ڈونگرے برسا رہے تھے۔ میں نے جو کچھ کہا تھا وہ اس پر فوراً اور وہیں عمل کرنے کو تیار تھے۔ اس لمحے میں آزادی کا گیت گانے لگا، جس کے غزلیہ اشعار کہتے ہیں ''دشمن موجود

ہیں، آؤ ہم اپنے ہتھیار سنبھالیں اور ان پر حملہ کر دیں'' میں گاتا گیا اور ہجوم میرا ہم آواز تھا اور جب گیت ختم ہوا، میں نے پولیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''وہ ہیں ہمارے دشمن!'' ہجوم پھر نعرے لگانے اور پولیس کی طرف جارحانہ اشارے کرنے لگا۔ پولیس پریشان دکھائی دیتی تھی اور ان میں سے بعض نے میری طرف جوابی اشارے کیے جیسے کہہ رہے ہوں ''منڈیلا! ہم تمہیں اس کا مزہ چکھائیں گے'' میں نے پروانہ کی اس لمحے کی گرما گرمی میں، میں نے نتائج کا کچھ خیال نہ کیا۔

لیکن اس رات میرے الفاظ اچانک ہی نہیں ٹپک پڑے تھے۔ میں کچھ مدت سے مستقبل کے بارے میں سوچتا آرہا تھا حکومت ''خلاف ورزی مہم'' جیسی تحریک کے دوبارہ اٹھنے کا سدباب کرنے کے لئے پے بہ پے اقدامات کر رہی تھی، چنانچہ میں جدوجہد آزادی کا تجزیہ مختلف پہلوؤں سے کرنے لگا تھا۔ اے این سی کی خواہش تھی کہ ایک ایسی عوامی جدوجہد کا آغاز کیا جائے جس میں جنوبی افریقہ کے کارکن اور کسان بھاری تعداد میں شامل ہوں اور یہ مہم اتنی بڑی اور طاقتور ہو کہ یہ گوروں کے ظلم وستم کے تسلسل کا خاتمہ کر دے۔ لیکن نیشنلسٹ حکومت اختلاف یا احتجاج کے ہر قانونی اظہار کو ناممکن بنائے ہوئے تھی اور میں خوب سمجھتا تھا کہ وہ افریقی اکثریت کی طرف سے ہر قانونی احتجاج کو بے رحمی سے کچل دے گی۔

میں نے ہار مان لی

مجھے خیال آتا تھا کہ قانونی اور غیر آئینہ دونوں قسم کے احتجاج جلد ہی ناممکن ہو جائیں گے۔ ہندوستان میں گاندھی اس غیر ملکی اقتدار سے نبرد آزما رہا تھا جو زیادہ حقیقت پسند اور دوراندیش تھا۔ جنوبی افریقہ میں افریکنروں کا یہ معاملہ یہ تھا۔ عدم تشدد پر مبنی غیر متحرک مزاحمت اس وقت تک موثر ہوتی ہے جب تک آپ کا حریف انہی اصولوں کی پابندی کرے جن پر آپ کاربند ہوں۔ لیکن اگر پرامن احتجاج کا جواب تشدد سے ملے تو اس کی تاثیری قوت ختم ہو جاتی ہے میری نزدیک عدم تشدد ایک

اخلاقی اصول نہیں بلکہ ایک اسٹراٹیجی تھا۔ ایک غیر موثر ہتھیار استعمال کرنے میں کوئی اخلاق اچھائی نہیں ہوتی۔ لیکن اس معاملے میں میرے خیالات ابھی مشکل نہیں ہوئے تھے اور میں نے کچھ زیادہ ہی قبل از وقت ایک گرم تقریر کر ڈالی تھی۔

یقیناً نیشنل ایگزیکٹو کا نقطہ نظر یہ نہیں تھا۔ جب انہیں میری تقریر کا پتہ چلا تو مسلمہ پالیسی سے ہٹ کر انتہاپسندی کا پرچار کرنے پر میری سرزنش کی گئی۔ اگرچہ ایگزیکٹو کے بعض ارکان نے میرے ریمارکس کی طرفداری کی مگر کوئی میرے غیر معتدل رویئے کی حمایت نہ کر سکا۔ انہوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے اس امر کا نوٹس لیا کہ میں نے جس اشتعال انگیز پالیسی پر عمل پیرا ہونے کی صلائے عام دی تھی وہ نہ صرف قبل از وقت بلکہ خطرناک بھی تھی۔ ایسی تقریروں سے اشتعال میں آ کر دشمن پوری تنظیم کو کچل سکتا تھا جبکہ وہ مضبوط تھا اور ہم ابھی تک کمزور تھے۔ میں نے اپنا محاسبہ قبول کر لیا اور اس کے بعد پبلک میں دلجمعی سے عدم تشدد کی پالیسی کا دفاع کرنے لگا، لیکن اپنے دل میں یہ جانتا تھا کہ عدم تشدد ہمارے مسئلے کا جواب نہیں۔

ان دنوں ایگزیکٹو کے ساتھ میرا معاملہ اکثر تلاطم خیز ہوتا تھا اوائل 1953ء میں چیف لوتھولی، زیڈ کے میتھیوس اور چند اور اعلیٰ مرتبت اے این سی لیڈروں کو سفید فاموں کے ایک گروہ کے ساتھ ایک اجلاس میں شرکت کا موقع ملا تھا جو لبرل پارٹی بنانے کے چکر میں تھے۔ اس کے فوراً بعد اے این سی ایگزیکٹو کا ایک اجلاس ہوا جس میں ہم چند ارکان نے مطالبہ کیا کہ گورے لبرلز کے ساتھ اس میٹنگ کی رپورٹ پیش کی جائے۔ اس کے شرکاء نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ انہیں اے این سی ممبرز کی حیثیت سے نہیں بلکہ ان کی ذاتی حیثیت میں بلایا گیا تھا۔ ہم اپنے مطالبے پر اڑے رہے اور آخر کار پروفیسروں میتھیوس نے جو ایک وکیل تھے، کہا کہ یہ استحقاقی گفتگو تھی۔ اس پر مجھے غصہ آ گیا اور میں بولا "تم کس پروہ معلومات اپنے اے این سی کے ساتھیوں کو دینے کے روادار نہیں ہو؟ تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم گوروں سے کچھ زیادہ ہی

خوفزدہ ہو۔تم اپنے افریقی ساتھیوں کے بجائے گوروں کی صحبت کو زیادہ اہمیت دیتے ہو!''

میری اس ہیجانی گفتگو سے پروفیسر میتھیوس اور چیف لوتھولی دونوں کا پارہ چڑھ گیا۔ پہلے پروفیسر میتھیوس نے جواب دیا ''منڈیلا تم گوروں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ میں نے تمہیں گوروں کے متعلق سکھایا پڑھایا مگر تم ابھی تک جاہل ہو۔تم اپنی طالب علم کی وردی سے ابھی تک باہر نہیں آ سکے۔''لوتھولی تو آتش زیر پا تھا اس نے کہا ''ٹھیک ہے، اگر تم مجھے گوروں سے ڈرنے کا الزام دیتے ہو تو میرے پاس استعفا دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔اگر تم اپنی بات پر قائم ہو تو میں بھی اپنے اس ارادے پر قائم ہوں'' مجھے علم نہ تھا آیا یہ لوتھولی کی گیدڑ بھبکی ہے،لیکن اس کی دھمکی سے میں ڈر گیا۔میں نے زیادہ غور کیے اور احساس ذمہ داری کے بغیر ایک بات کہہ دی تھی اور اب مجھے اس پر بڑا افسوس تھا۔میں نے فوراً ہی اپنا الزام واپس لے لیا اور معافی مانگ لی۔میں ایک ایسا نوجوان تھا جس نے جنگجوئی سے اپنی جہالت کی تلافی کرنا چاہی تھی۔

چینیوں کا اسلحہ دینے سے انکار

صوفیہ ٹاؤن والی تقریر کے دنوں میں والٹر سیسولو نے مجھے اطلاع دی کہ اسے بخارسٹ میں ورلڈ فیسٹیول آف یوتھ اور سٹوڈنٹس فار پیس اینڈ فرینڈ شپ میں بطور معزز مہمان شرکت کرنے کی دعوت ملی ہے۔اس دعوت کے اوقات ایسے تھے کہ اس کے پاس نیشنل ایگزیکٹو سے مشورہ کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔میری خواہش تھی کہ وہ چلا جائے اور اس سلسلے میں اس کی حوصلہ افزائی کی کہ اگر ایگزیکٹو سے مشورہ نہیں ہو سکا تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔یوں والٹر نے جانے کا فیصلہ کر لیا اور میں نے اسے ایک متبادل پاسپورٹ کا انتظام کرنے میں مدد دی، اس کے لیے اس کی شناخت اور شہریت کی تصدیق کا ایک بیان حلفی داخل کرنا پڑا۔(حکومت اسے با

ضابطہ پاسپورٹ کبھی جاری نہ کرتی) بخارسٹ جانے والے گروہ نے جس کی قیادت والٹر سیسولو اور ڈوما نوکوی کر رہے تھے، اس واحد ائیر لائن پر سفر کیا جو ایسا بیان حلفی قبول کر لیتی تھی اور یہ تھی (اسرائیلی) ایل آل!

ایگزیکٹو کی طرف سے سرزنش کے باوجود مجھے یقین تھا کہ نیشنلسٹوں کی پالیسیاں جلد ہی عدم تشدد کو ایک محدود تر اور غیر موثر پالیسی بنا کے رکھ دیں گی۔ والٹر میرا ہم خیال تھا اور اس کی روانگی سے پہلے میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ عوامی جمہوریہ چین کے دورے کا اہتمام کرے اور ان کے ساتھ اس امکان پر گفتگو کرے کہ کیا مسلح جدوجہد کے لیے ہمیں اسلحہ فراہم کیا جا سکتا ہے۔ والٹر نے یہ تجویز پسند کی اور کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔

یہ اقدام میں نے فقط اپنی صوابدید پر کیا تھا اور میرے طریقے انتہائی غیر روایتی تھے۔ ایک حد تک یہ ایک گرم جوش انقلابی کے افعال تھے جس نے زیادہ غور و فکر نہیں کیا تھا اور جس نے نظم و ضبط کے بغیر کام کیے تھے۔ یہ ایک ایسے آدمی کے افعال تھے جو نسلی امتیاز کے غیر اخلاقی پہلوؤں اور ان کی حفاظت کرنے میں مملکت کی بے رحمی پر مایوس تھا۔

والٹر کے اس دورے نے ایگزیکٹو کے اندر ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ میں نے اپنی خفیہ درخواست کا ذکر کیے بغیر اس کی طرف سے معذرت کرنے کا کام اپنے ذمے لیا۔ لوتھولی نے اعتراض کیا کہ یہ تو اے این سی کے ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی ہے اور پروفیسر میتھیوس نے والٹر کے اشتراکی ممالک کے دورے پر اظہار ناراضی کیا۔ ایگزیکٹو والٹر کے مقاصد کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا تھی اور انہوں نے مجھ سے ان حالات کی وضاحت مانگی جن میں یہ دورہ عمل میں آیا تھا۔ بعض تو والٹر کا اور میرا باقاعدہ محاسبہ کرنا چاہتے تھے مگر آخرکار ایسا نہ ہوا۔

والٹر نے چین پہنچنے کا بندوبست کر لیا جہاں چینی قیادت نے اس کا پر جوش

استقبال کیا۔ انہوں نے ہماری جدوجہد کی حمایت کا تو ادعا کیا مگر جب اس نے مسلح جدوجہد کا خیال پیش کیا تو وہ متامل اور محتاط نظر آئے۔ انہوں نے انتباہ کیا کہ یہ بہت سنگین اقدام ہوگا اور یہ سوال بھی اٹھایا کہ کیا تحریک آزادی اتنی بلوغت کو پہنچ گئی ہے کہ ایسی کاوش کا جواز بن سکے۔ یوں والٹر حوصلہ افزائی کے ساتھ واپس آیا مگر کسی توپ و تفنگ کے بغیر۔

جنرل ڈی وٹ میرا ہیرو ہوتا

میں جوہانسبرگ میں شہر کا آدمی بن چکا تھا۔ میں چست سوٹ پہنتا تھا، ایک بڑی سی اولڈز موبائل چلاتا تھا اور شہر کی عقبی گلیوں میں آنے جانے کا راستہ مجھے خوب معلوم تھا میں اپنے مضافاتی گھر سے روانہ سیزن ٹکٹ پر اپنے دفتر آتا تھا۔ لیکن در حقیقت میں دل میں ایک دیہاتی لڑکا ہی تھا اور شہر کی کوئی چیز مجھے اتنا رفعت آشنا نہیں کرتی تھی جتنا کہ نیلا آسمان، کھلا میدان اور سبز گھاس، ستمبر میں جب میری پابندی کے احکام ختم ہوئے تو میں نے اپنی آزادی سے فائدہ اٹھانے اور شہر کی کلفتوں سے کچھ عرصے کے لیے چھٹکارا پانے کا فیصلہ کیا۔ میں اورنج فری سٹیٹ میں ولییر نامی چھوٹے قصبے میں ایک مقدمہ بھگتانے چلا گیا۔

جوہانسبرگ سے اورنج فری سٹیٹ تک موٹر کے سفر میں کئی گھنٹے لگتے تھے، چنانچہ میں علی الصبح تین بجے آرلینڈو سے چل پڑا اور ہمیشہ سے روانگی کا یہ میرا پسندیدہ وقت ہے۔ میں ایک سحر خیز ہوں اور تین بجے صبح سڑکیں خالی اور خاموش ہوتی ہیں اور آدمی غور و فکر کے لیے آزاد ہوتا ہے۔ میں صبح کی آمد یعنی رات کی دن میں تبدیلی کا عمل دیکھنا پسند کرتا ہوں جو ہمیشہ شاندار ہوتا ہے یہ روانگی کا اس لیے بھی موزوں وقت تھا کہ پولیس عام طور پر کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اورنج فری سٹیٹ کا صوبہ ہمیشہ سے مجھے جادوئی طور پر متاثر کرتا رہا ہے اگرچہ گوری آبادی کے بعض بدترین نسل پرست عناصر فری سٹیٹ کو اپنا گھر خیال کرتے

ہیں۔ حدِ نظر تک اس کی ہموار ڈھیالی زمین، اوپر کشادہ نیلی چھت، زرد مکئی کے کھیتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ، سرسبز بیلیں اور جھاڑیاں سب مل کر مجھے مسرت سے ہمکنار کر دیتی ہیں خواہ میرا موڈ کیسا ہی کیوں نہ ہو، جب میں فری سٹیٹ میں ہوتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز مجھے کہیں بند نہیں کر سکتی اور یہ کہ میرے خیالات اتنے دور دراز تک مٹر گشت کر سکتے ہیں جتنا کہ افق۔

فری سٹیٹ کے میدانوں میں باصلاحیت بوئر کمانڈر جنرل چارلس آرڈی ویٹ کے ذہن پر گہرا نقش ثبت کیا تھا جس نے اینگلو بوئر وار کے آخری مہینوں میں درجنوں لڑائیوں میں انگریزی کو مات دی تھی۔ وہ نڈر، فخر مند اور زیرک شخص تھا اور اگر وہ افرینکروں ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام جنوبی افریقیوں کے لیے جنگ لڑتا تو میرا ایک ہیرو ہوتا۔ اس نے ایک افلاس زدہ جنگجو کی جرات اور طباعی اور ایک منجھی ہوئی جنگی مشین کے خلاف کم جدید مگر محبِ وطن فوج کی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ جب میں گاڑی چلا رہا تھا تو جنرل ڈی ویٹ کی فوج کے چھپنے کی جگہیں میرے ذہن میں آ رہی تھیں اور مجھے حیرت تھی کہ کیا یہ جگہیں کسی روز افریقی باغیوں کو پناہ دیں گی۔

ولیئر تک اس ڈرائیو نے مجھے خاصا مسرور کیا اور اس وقت میں تحفظ کے ایک جھوٹے احساس تلے دب گیا تھا جب میں 3 ستمبر کی صبح چھوٹی سی کچہری میں داخل ہوا۔ پولیس والوں کا ایک گروہ وہاں میرا انتظار کر رہا تھا۔ انہوں نے ایک لفظ کہے بغیر مجھے وہ احکام دکھائے جن میں کمیونزم کو دبانے کے قانون کے تحت مجھے حکم دیا گیا تھا کہ میں اے این سی سے مستعفی ہو جاؤں، ضلع جوہانسبرگ میں پابند رہوں اور دو سال تک کسی اجلاس یا اجتماع میں شرکت نہ کروں۔ میں جانتا تھا کہ ایسا ہو گا مگر مجھے یہ توقع نہ تھی کہ پابندی کے احکام ولیئر کے دور دراز گاؤں میں موصول ہوں گے۔

میری نئی نظر بندی کا آغاز

میں پینتیس برس کا تھا اور اب اس نئی اور شدید تر پابندی نے اے این سی میں میری شرکت کے ایک عشرے کا تقریباً خاتمہ کر دیا۔ یہ سال میری سیاسی بیداری اور نشوونما اور اس جدوجہد آزادی سے میرے روز افزوں اخلاص کے سال تھے جو اب میری زندگی بن چکی تھی۔ اب سے اے این سی اور تحریک آزادی کے حوالے سے میرے تمام افعال اور منصوبے خفیہ اور غیر قانونی بن گئے تھے۔ نظر بندی کے احکام وصول کر کے میں فوراً جوہانسبرگ کی طرف واپس چل پڑا۔

میری نظر بندی نے مجھے جدوجہد کے وسط سے ایک طرف دھکیل دیا اور اب میرا کردار بنیادی کے بجائے اطرافی ہو گیا۔ اگرچہ مجھ سے اکثر مشورہ کیا جاتا تھا اور میں واقعات کی سمت پر اثر انداز ہونے کے قابل تھا، میں یہ کام ایک فاصلے سے کرتا تھا اور وہ بھی اس وقت جب واضح طور پر مجھ سے کہا جاتا۔ اب میں اپنے آپ کو تنظیم کے جسم ک اایک عضو رئیس نہیں سمجھتا تھا، بلکہ محض ایک بریدہ بازو خیال کرتا تھا۔ کم از کم اس وقت ایک مجاہد آزادی کو بھی قوانین کی پابندی کرنی پڑتی تھی اور اس مرحلے میں اپنی نظر بندی کی خلاف ورزی کرنے پر ملنے والی سزا کے سوا اے این سی کو اور خود مجھے بھی کچھ حاصل نہ ہوتا۔ ہم ابھی اس مرحلے میں داخل نہیں ہوئے تھے جہاں ہم کھلے انقلابی بن جاتے اور اس نظام سے ہر قیمت پر ٹکرا جاتے۔ اس وقت ہم سمجھتے تھے کہ جیل جانے کے بجائے زیر زمین رہ کر اپنے آپ کو منظم کرنا بہتر ہو گا۔ جب مجھے اے این سی سے استعفا دینے پر مجبور کر دیا گیا تو پارٹی کو اب کوئی اور میری جگہ لانا تھا اور اس سلسلے میں میری پسند خواہ کچھ بھی ہوتی، میں وہ اختیار بروئے کار نہیں لا سکتا تھا جو کبھی مجھے حاصل تھا۔ جوہانسبرگ کی طرف گاڑی چلاتے ہوئے فری سٹیٹ کے مناظر میرے قلب و روح کو وہ سرشاری عطا نہیں کر رہے تھے جو پہلے عطا ہوئی تھی۔

پنڈت نہرو کی تقریر کا عنوان

جب مجھے نظر بندی کے احکام موصول ہوئے، اگلے ماہ اے این سی کی ٹرانسوال کانفرنس ہونے والی تھی اور میں نے اپنے صدارتی خطبے کا مسودہ تقریباً مکمل کر لیا تھا۔ یہ خطبہ ایگزیکٹو کے ایک رکن اینڈریو کو میں نے پڑھ کر سنایا۔ یہ تقریر بعد میں ''دی نو ایزی واک ٹو فریڈم'' کے عنوان سے معروف ہوئی جو پنڈت جواہر لعل نہرو کی ایک تقریر سے لیا گیا تھا۔ اس تقریر میں میں نے کہا تھا کہ عوام اب نئی قسم کی سیاسی جدوجہد کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔ حکومت کے نئے قوانین اور ہتھکنڈوں نے عوامی احتجاج کی پرانی قسموں مثلاً عوامی اجتماعات، اخباری بیانات، کام پر حاضر نہ ہونا کو انتہائی خطرناک اور خودزیاں کار بنا دیا ہے۔ اخبارات ہمارے بیانات شائع نہیں کرتے اور چھاپے خانے ہمارے پمفلٹ نہیں چھاپتے کیونکہ ان پر سپریشن آف کمیونزم ایکٹ کے خوف کی تلوار لٹکی ہوئی ہے۔ میں نے کہا تھا ''یہ تبدیلیاں نئی قسم کی سیاسی جدوجہد کے ارتقا کا تقاضا کرتی ہیں اور پرانے طریقے اب سراسر خودکشی ہیں'' تقریر میں کہا گیا تھا:

''مظلوم عوام اور ظالم باہم برسرپیکار ہیں آزادی کی قوتوں اور ان کے مخالفین کے مابین روزحساب اب زیادہ دور نہیں۔ مجھے اس میں معمولی سا شبہ بھی نہیں کہ جب یہ دن آئے گا، سچائی اور انصاف کا بول بالا ہو گا مظلوم لوگوں کے احساسات کبھی اتنے تلخ نہیں ہوئے جتنے کہ ہمارے عوام کے شدید مصائب انہیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنے ملک پر حکمران مجرموں کے گروہ کی ہلاکت خیز پالیسیوں کی اپنی جان پر کھیل کر مزاحمت کریں انسانیت ظلم کا تختہ الٹنے کی اجازت دیتی ہے اور یہ ہر آزاد آدمی کی ارفع ترین تمنا ہے۔''

اپریل 1954ء میں ٹرانسوال کی لا سوسائٹی نے سپریم کورٹ میں درخواست دی کہ میرا نام تسلیم شدہ وکلاء کی فہرست سے اس بنا پر خارج کر دیا جائے کہ میری سیاسی سرگرمیاں جن کے باعث ڈیفائنس کیس میں مجھے مجرم ٹھہرایا گیا تھا، غیر پیشہ ورانہ

اور ناروا رویئے کی حامل ہیں۔ یہ اس وقت ہوا جب منڈیلا اینڈ ٹیمبو کی فرم نشوونما پا رہی تھی اور میں ہر ہفتے میں درجنوں بار عدالتوں میں پیش ہوتا تھا۔

جسٹس ریمس بوٹم کا جرأت مندانہ فیصلہ

میرے خلاف درخواست کی اطلاع نقل مجھے میرے دفتر میں ملی اور جیسے ہی اس درخواست کا چرچا ہوا، مجھے اس سلسلے میں مدد اور تعاون کی پیشکشیں ہونے لگیں حتیٰ کہ بہت سے معروف افریکنر وکلاء کی طرف سے بھی ایسی پیشکشیں ہوئیں۔ ان میں سے کئی نیشنلسٹ پارٹی کے حامی تھے لیکن وہ سمجھتے تھے کہ یہ درخواست تعصب اور بے انصافی پر مبنی ہے۔ ان کے اس ردعمل سے احساس ہوا کہ نسل پرست جنوبی افریقہ میں بھی پیشہ ورانہ اتحاد بعض اوقات رنگ پر غالب آ سکتا ہے اور یہ کہ ایسے وکلاء اور جج بھی ہیں جو ایک غیر اخلاقی حکومت کی ربڑ سٹیمپ بننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

میرا مقدمہ جوہانسبرگ بار کونسل کے چیئرمین والٹر پولاک نے اچھی طرح لڑا۔ جب میں نے پولاک کو وکیل کیا مجھے یہ مشورہ دیا گیا کہ میں کسی اور کو بھی وکیل کر لوں جو جدوجہد آزادی سے ربط نہ رکھتا ہو کیونکہ یہ امر ٹرانسوال بار کو مثبت طور پر متاثر کرے گا۔ اس کے پیش نظر ہم نے ولیم آرون سن کی خدمات انسٹرکٹنگ اٹارنی کے طور پر حاصل کیوں جو جوہانسبرگ کی ایک قدیم ترین لا فرم کے سربراہ تھے۔ دونوں وکلاء نے بلا فیس میری وکالت کی۔ ہمارا موقف یہ تھا کہ یہ درخواست نظریہ انصاف کے خلاف ہے اور یہ کہ مجھے اپنے سیاسی نظریات کے لیے لڑنے کا پیدائشی حق حاصل ہے جو ایک مملکت کے تمام انسانوں کا حق ہے جہاں قانون کی حکمرانی لاگو ہو۔

پولاک کی وزنی دلیل سٹریجڈورن کیس کے حوالے سے تھی۔ مسٹر سٹریجڈورن کو بی جے وورسٹر کے ہمراہ دوسری جنگ عظیم کے دوران نظر بند کیا گیا تھا (وورسٹر بعد میں وزیر اعظم بنے) دونوں نازیوں کے ہمدرد ہونے کے باعث نظر بند کیے گئے

تھے۔فرار ہونے کی ناکام کوشش کے بعد سٹریجڈورن کو کارچوری کرنے کا مجرم پایا گیا تھا۔اپنی رہائی کے بعد اس نے وکیل کی حیثیت سے بار کی رکنیت کے لیے درخواست دی تھی۔ پولاک نے عدالت میں کہا: ''سٹریجڈورن کے جرائم کے باوجود اس میں اور منڈیلا میں فرق ضرور ہے۔منڈیلا ایک نیشنلسٹ نہیں اور منڈیلا ایک گورا نہیں۔''

جج ریمس بوٹم جس نے کیس سنا، ایک ایسا جج تھا جس نے نیشنلسٹوں کا بھونپو بننے سے انکار کر دیا اور عدلیہ کی آزادی برقرار رکھی۔میرے مقدمے میں اس نے ہمارے اس دعوے کو درست قرار دیا کہ مجھے اپنے سیاسی نظریات کے لیے مہم چلانے کا حق حاصل ہے اگرچہ وہ حکومت کی مخالفت میں ہوں، چنانچہ اس نے لا ءسوسائٹی کی درخواست مسترد کر دی اور خلاف معمول اسے حکم دیا کہ وہ مقدمے کا خرچ خود اٹھائے۔

''دشمن نے مویشی پکڑ لیے ہیں''

صوفیہ ٹاؤن میں انخلا ءمخالف مہم عرصے سے چل رہی تھی۔ہم اپنے موقف پر ڈٹ گئے اور حکومت اپنے موقف پر 1954 ءاور 1955 ءمیں ہفتے میں دوبار، بدھ اور اتوار کی شاموں کو، ریلیاں منعقد ہوتی رہیں۔مقررین سرکاری منصوبوں کے بخیے ادھیڑتے رہے۔ڈاکٹر ژوما کے زیرہدایت اے این سی اور ریٹ پیئرز ایسوسی ایشن نے خطوط اور درخواستوں میں حکومت سے احتجاج کیا۔ہم نے انخلا ءمخالف مہم اس نعرے پر چلائی:

Over Our Dead Bodiest

(یعنی انخلا ءہماری لاشوں ہی پر ممکن ہے!)

یہ نعرہ جلسوں کے پلیٹ فارم سے لگایا جاتا اور سامعین اسے دہراتے۔ایک رات تو اس نعرے نے محتاط رہنے والے ڈاکٹر ژوما کو اس قدر جوش دلایا کہ انہوں نے وہ

سحر انگیز نعرہ بھی لگا دیا جو پچھلی صدی میں افریقی جنگجوؤں کو میدان جنگ میں بھیجتے وقت لگایا جاتا تھا زیمک انکوموسیگو اانڈینی (بزدلو! دشمن نے مویشی پکڑ لیے ہیں)

حکومت کا پروگرام یہ تھا کہ انخلاء 9 فروری 1955ء تک عمل میں آ جائے۔ جوں جوں یہ تاریخ قریب آ رہی تھی، میں اور ٹیمبو ٹاؤن شپ میں روزانہ جاتے اور مقامی لیڈروں سے مل کر منصوبہ سازی کرتے کہ کس طرح ان لوگوں کی قانونی مدد کی جائے جنہیں بستی سے اکھاڑا گیا ہو یا وہ قید و بند سے گزر رہے ہوں۔ ہم عدالت میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے کہ حکومت کی دستاویزی کارروائی اکثر غلط ہوتی ہے، لہٰذا انخلاء کے احکام غیر قانونی ہیں۔ لیکن یہ محض عارضی اقدام ثابت ہوتا۔ حکومت چند کمزور قانونی پہلوؤں کو اپنی راہ میں حائل نہیں ہونے دیتی تھی۔

مجوزہ انخلاء سے کچھ پہلے فریڈم سکوائر میں ایک خصوصی عوامی اجتماع کا پروگرام رکھا گیا۔ جلسے میں چیف لوتھولی کو سننے دس ہزار لوگ آئے تھے لیکن جوہانسبرگ میں ان کی آمد پر انہیں پابندی کے احکام موصول ہوئے، چنانچہ مجبوراً وہ نٹال واپس چلے گئے۔

انخلا سے ایک رات پہلے جو موڈائس نے، جو مقامی اے این سی رہنماؤں میں سے سب سے زیادہ سرگرم سے اور مخلص تھے، پانچ ہزار سے زیادہ پرجوش نوجوانوں کے ہجوم سے خطاب کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اے این سی انہیں پولیس اور فوج کو چیلنج کرنے کا حکم دے گی وہ راتوں رات رکاوٹ کھڑی کرنے اور اگلے روز ہتھیاروں اور ہر اس شے کے ساتھ پولیس سے ٹکرا جانے کو تیار تھے جو ان کے ہاتھ لگتی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے نعرے کے الفاظ جو کچھ کہتے ہیں وہی ان کا مطلب ہے یہ کہ صوفیہ ٹاؤن کا انخلا ہماری لاشوں پر ہی عمل میں آ سکے گا۔

لیکن اے این سی لیڈرشپ اور مجھ سے بحث و تمحیص کے بعد ''جو'' نے نوجوانوں سے کہا کہ وہ کسی قسم کی کارروائی سے گریز کریں۔ اس پر وہ تیغ پا ہوئے اور انہیں

محسوس ہوا کہ ان سے دغا ہوا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے تھے کہ تشدد کا نتیجہ تباہی کی شکل میں نکلنا تھا۔ ہم نے انہیں جتایا کہ بغاوت محتاط منصوبہ بندی کا تقاضا کرتی ہے اور یہ خود کشی کا عمل بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ ہم دشمن سے اس کی شرائط پر ٹکرا جانے کو ابھی تیار نہیں تھے۔

9 فروری کی دھندلی صبح پولیس اور فوج کے چار ہزار سپاہیوں نے ٹاؤن شپ کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ان کی آڑ میں سرکاری کارندے خالی مکانات کو گرانے لگے اور سرکاری ٹرک ان کے مکینوں کو صوفیہ ٹاؤن سے میڈو لینڈز پہنچانے لگے۔ پچھلی رات اے این سی نے بہت سے خاندانوں کو گھروں سے نکال کر صوفیہ ٹاؤن کے وسط میں اے این سی کے حامی خاندانوں کے ہاں لا ٹھہرایا تھا۔ لیکن ہماری یہ کوششیں بہت محدود اور بہت دیر سے عمل میں آئی تھیں اور یہ ایک طرح سے فقط شگاف روک اقدام تھا۔ فوج اور پولیس والے سنگدلی کی حد تک فعال تھے۔ چند ہفتوں میں ہماری مزاحمت دم توڑ گئی۔ صوفیہ ٹاؤن توپ و تفنگ کی گونج میں نہیں بلکہ ٹرکوں اور ہتھوڑوں کے شور میں حرف غلط کی طرح مٹ گیا۔

ایک شخص کسی سیاسی اقدام کے متعلق جب اگلے روز کے اخبار میں پڑھتا ہے تو وہ اس پر ہمیشہ درست رائے دیتا ہے لیکن جب آپ ایک گرم گرم سیاسی جنگ کے مرکز میں ہوں تو آپ کے پاس سوچ بچار کا وقت نہیں ہوتا۔ ہم نے ویسٹرن ایریاز کی انخلا مخالف مہم میں مختلف غلطیاں کیں اور بہت سے سبق سیکھے ''اوور آور ڈیڈ باڈیز!'' ایک تحریک خیز نعرہ تھا لیکن یہ مددگار ہونے سے زیادہ ایک رکاوٹ ثابت ہوا۔ نعرہ ایک تنظیم اور اس کے پیروکار عوام کے درمیان ایک بنیادی رابطہ ہوتا ہے۔ اسے ایک مخصوص دکھ کو ایک جامع اور پر مغز جملے میں سمو لینا چاہیے اور عوام میں لڑنے کی تحریک پیدا کرنی چاہیے۔ ہم نے نعرہ عوام کے تخیل کو انگیز کرنے کے لیے دیا تھا مگر اس نے انہیں یقین دلا دیا کہ ہم انخلا کی مزاحمت میں جانیں لڑا دیں گے۔ دراصل

اے این سی یہ سب کچھ کرنے کو تیار ہی نہیں تھی۔

ہم نے لوگوں کے سامنے میڈ ولینڈ زمیں منتقل ہونے کا کوئی متبادل پیش نہیں کیا تھا۔ جب صوفیہ ٹاؤن کے لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ ہم حکومت کو روک سکتے ہیں نہ کرائے داروں کو کہیں اور رہائش فراہم کر سکتے ہیں، ان کی اپنی مزاحمت دم توڑ گئی اور میڈ ولینڈ زمیں انہیں زیادہ کھلے اور زیادہ صاف مکان ملیں گے۔ ہم نے مالکان اور کرائے داروں کی مختلف صورت حال پیش نگاہ نہیں رکھی تھی۔ جہاں مالکان اپنے گھروں میں ٹھہرنا چاہتے تھے کرائے داروں میں منتقلی کا رجحان تھا۔ اے این سی پر بہت سے افریقہ پرست ارکان نے تنقید کی اور قیادت پر الزام لگایا کہ انہوں نے کرائے داروں کی قیمت پر مالکان کے مفادات کا تحفظ کیا ہے۔

اس مہم سے میں نے جو سبق اخذ کیا وہ یہ تھا کہ آخر کار مسلح اور متشدد مزاحمت کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں بار بار ہم نے اپنے اسلحہ خانے کے تمام غیر متشدد ہتھیار استعمال کیے تھے تقریریں، وفود، دھمکیاں، لانگ مارچ، ل ہڑتالیں، کام چھوڑ ہڑتال، رضا کارانہ گرفتاریاں لیکن سب بے سود رہے کیونکہ ہم نے جو کچھ بھی کیا اس کے جواب میں حکومت نے آہنی ہاتھ سے کام لیا۔ ایک مجاہد آزادی یہ سبق مشکل سے سیکھتا ہے کہ یہ ظالم ہی ہے جو جدوجہد کی نوعیت متعین کرتا ہے اور مظلوم کے پاس اکثر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ طریقے استعمال کرے جو ظالم کے اقدامات کا منہ توڑ جواب ہوں۔ ایک خاص مقام پر پہنچ کر مظلوم کے پاس یہی چارہ کار رہ جاتا ہے کہ فائر کا جواب فائر سے دے۔

بنٹو تعلیمی ایکٹ کا ہتھوڑا

تعلیم شخصی ارتقاء کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ تعلیم ہی کے ذریعے ایک کسان کی بیٹی ڈاکٹر بن سکتی ہے، ایک کان کن کا بیٹا کان کا سربراہ بن سکتا ہے اور ایک کھیت مزدور کا بیٹا ایک عظیم قوم کا سربراہ بن سکتا ہے۔ ایک شخص کی دوسرے سے وجہ امتیاز

یہ نہیں کہ اسے ورثے میں کیا ملتا ہے بلکہ وجہ امتیاز یہ ہے کہ جو کچھ وہ رکھتا ہے، اسے وہ کس طرح کام میں لاتا ہے۔

موجودہ صدی کے آغاز سے افریقیوں کے لیے تعلیمی سہولتیں صرف غیر ملکہ مشنوں اور گرجوں میں میسر تھیں جو سکول قائم کرتے تھے اور انہیں چلاتے تھے۔ یونائیٹڈ پارٹی کے تحت افریقی ثانوی سکولوں اور گورے ثانوی سکولوں کا نصاب بنیادی طور پر ایک ہی تھا۔ مشن سکول، افریقیوں کو مغربی طرز کی انگریزی تعلیم دیتے تھے جو میں نے بھی حاصل کی۔ ہمیں کمتر سہولتوں تک محدود رکھا جاتا تھا مگر ہم پڑھنے، سوچنے یا خواب دیکھنے میں محدود نہیں رہ سکتے تھے۔

نیشنلسٹوں کے برسر اقتدار آنے سے پہلے بھی تعلیمی اداروں کے اخراجات اک فرق نسل پرست تعلیم کو نمایاں کرتا تھا۔ حکومت ایک گورے طالب علم کے مقابلے میں ایک افریقی طالب علم پر چھ گنا زیادہ رقم خرچ کرتی تھی۔ افریقیوں کے لیے تعلیم لازمی نہ تھی اور صرف پرائمری درجوں میں مفت تھی۔ سکول جانے کی عمر کے نصف سے بھی کم افریقی بچے سکول جاتے تھے اور بہت تھوڑی تعداد میں افریقی ہائی سکول سرٹیفکیٹ حاصل کر پاتے تھے۔

افریقیوں کی یہ بری بھلی تعلیم بھی نیشنلسٹوں کو پسند نہ تھی۔ افریکنروں نے افریقیوں کی تعلیم کے متعلق کبھی جوش وخروش کا اظہار نہیں کیا۔ ان کے نزدیک افریقیوں کی تعلیم پر رقوم خرچ کرنا سرمائے کا ضیاع تھا کیونکہ ان کے خیال میں افریقی پیدائشی طور پر جاہل اور سست تھے اور کسی نوع کی تعلیم انہیں سدھار نہیں سکتی۔ افریکنر روایتی طور پر یہ نہیں چاہتے تھے کہ افریقی، انگریزی زبان سیکھیں کیونکہ انگریزی، افریکنروں کے لیے ایک اجنبی زبان تھی اور ہمارے لیے یہ نجات کا ذریعہ بن سکتی تھی۔

1953ء میں نیشنلسٹوں کے غلبے والی پارلیمنٹ نے بنتو ایجوکیشن ایکٹ پاس کیا

جس نے افریقی تعلیم پر نسلی امتیاز کی مہر لگانے کا اہتمام کیا۔ اس ایکٹ نے افریقی تعلیم ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن سے نیٹو افیئر ڈیپارٹمنٹ (شعبہ امور مقامی باشندگان) کو منتقل کر دی جسے بہت نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس ایکٹ کے تحت افریقی پرائمری اور ثانوی اسکولوں کی انتظامیہ کو جنہیں مشنری ادارے چلا رہے تھے، یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے اسکول حکومت کی تحویل میں دے دیں یا بتدریج کم ہوتی ہوئی سبسڈی لیتے رہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت افریقیوں کی تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لے لے ورنہ ان کو تعلیم نہیں ملے گی۔ افریقی اساتذہ کو حکومت یا کسی اسکول کی انتظامیہ پر تنقید کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

وزیر برائے بنتو ایجوکیشن ڈاکٹر ہینڈ ریک ورورڈ نے کہا تھا کہ تعلیم کو ''لوگوں کی زندگی میں میسر سہولتوں کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا چاہیے'' اس کا مطلب یہ تھا کہ افریقیوں کو سہولتیں حاصل ہیں نہ سہولتیں ملیں گی، اس لیے انہیں تعلیم کیوں دی جائے؟ ان صاحب کا کہنا تھا ''یورپی برادری میں بنتوؤں کے لیے مخصوص نوعیتوں کی محنت مشقت کے سوا کوئی جگہ نہیں'' غرضیکہ افریقیوں کو گھٹیا کام کرنے والے کارکنوں کے طور پر تربیت دی جائے تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے گوروں کے مطیع رہیں۔

اے این سی کے نزدیک یہ ایکٹ مجموعی طور پر افریقی قوم کی ترقی کو روکنے کا گھناؤنا اقدام تھا اور اگر یہ قانونی شکل اختیار کر لیتا تو یہ افریقی قوم کی جہد آزادی کے لیے ایک حادثہ ہوتا۔ افریقیوں کی آنے والی تمام نسلوں کی عقل و فکر اور شعور خطرے میں تھے۔ پروفیسر میتھیوس نے ان دنوں لکھا تھا ''ورورڈ کے اسکولوں میں تعلیم برائے جہالت یا تعلیم برائے تحقیر دینے سے کہیں بہتر ہے کہ بالکل تعلیم نہ دی جائے۔''

اس ایکٹ اور ورورڈ کی طرف سے اس کی بے ڈھب توضیح نے کالوں اور گوروں دونوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑا دی۔ ڈچ ریفارمڈ چرچ، جو نسلی امتیاز کی

حمایت کرتا تھا، اورلوتھرن مشن کے سوا تمام مسیحی مشنوں نے نئے اقدام کی مخالفت کی۔لیکن اپوزیشن کا اتحاد اس کی صرف مذمت کرنے تک محدود تھا، اس کی مزاحمت کرنے پر اتفاق نہ تھا۔اینگلیکن جو نئی تعلیمی پالیسی پر نہایت بے خوفی اور تسلسل سے تنقید کرتے تھے، اس معاملے میں ایک رائے نہیں رکھتے تھے۔جوہانسبرگ کے بشپ ایمبروس ریوس نے تو اپنے اسکول بند کرنے کا انتہائی قدم اٹھایا جن میں مجموعی طور پر دس ہزار طلبہ تعلیم پاتے تھے لیکن جنوبی افریقہ میں چرچ کے آرچ بشپ نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ بچے گلیوں میں آوارہ نہ پھریں، بقیہ اسکول حکومت کے حوالے کر دیئے، اپنے احتجاجات کے باوجود باقی تمام چرچوں نے بھی یہی کیا سوائے رومن کیتھولکس، دی سیونتھ ڈے یڈوینٹسٹس، اوردی یونائیٹڈ جیوش ریفارمڈ کانگری گیشن کے جو سرکاری امداد لیے بغیر اپنے موقف پر ڈٹے رہے، حتیٰ کہ میرے اپنے چرچ ویزلیان (Wesleyan) نے اپنے دو لاکھ افریقی طلبہ حکومت کے سپرد کر دیئے۔اگر دوسرے تمام چرچوں نے مزاحمت کرنے والوں کی پیروی کی ہوتی تو حکومت ایسے بحران سے دوچار ہوتی جو اسے مفاہمت پر مجبور کر دیتا۔اس کے بجائے مملکت نے ہم پر چڑھائی کر دی۔

اسکولوں کا کنٹرول ''شعبہ امور مقامی باشندگان'' کو منتقل ہونے کی تاریخ یکم اپریل 1955ء قرار پائی تھی۔ چنانچہ اے این سی نے اسکولوں کے بائیکاٹ کے منصوبوں پر غور وخوض شروع کیا جو اسی تاریخ سے شروع ہونا تھا۔ ایگزیکٹو کمیٹی میں ہمارے خفیہ مذاکرات اس مسئلے پر ہوئے کہ لوگوں کو محدود عرصے کے لیے احتجاج کرنے کی کال دی جائے یا ہمیں مستقل اسکول بائیکاٹ کا اعلان کر دینا چاہیے جو بنٹو ایجوکیشن ایکٹ کے جڑ پکڑنے سے پہلے ہی اس کا خاتمہ کر دے۔بڑی تند و تیز بحث ہوئی اور دونوں اطراف کے لوگ اپنے اپنے مضبوط دلائل رکھتے تھے۔غیر معینہ بائیکاٹ کے لیے دلیل یہ تھی کہ بنٹو ایجوکیشن ایک زہر ہے جسے پیاسے مرنے کے

خوف سے بھی نہیں پیا جا سکتا۔ کسی بھی شکل میں اسے قبول کرنا نا قابل تلافی نقصان ہو گا۔ ان کی رائے میں ملک ایک دھماکے کے موڈ میں تھا اور لوگ محض احتجاج سے آگے بڑھ کر کچھ کر گزرنے کے حق میں تھے۔

اگر چہ میری شہرت ایک انتہا پسند کی تھی مگر مجھے ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ پارٹی کو ایسا وعدہ نہیں کرنا چاہیے جسے وہ عملی جامہ پہنچانے کی سکت نہ رکھتی ہو کیونکہ اس صورت میں عوام کا اس پر اسے اعتماد اٹھ جائے گا۔ ایک غیر معینہ بائیکاٹ کے لیے بڑی مشینری اور وسیع وسائل درکار ہوتے جو ہمارے پاس موجود نہیں تھے اور ہماری گزشتہ مہمات سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ ہم کسی ایسے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے اہل ہیں۔ ہمارے لیے یہ ناممکن تھا کہ ہم اتنی تیزی سے اپنے سکول قائم کر لیتے جن میں لاکھوں طلبہ کو داخل مل سکتا۔ اگر ہم اپنی قوم کے سامنے کوئی متبادل پیش نہیں کر رہے تھے تو پھر غیر معینہ تعلیمی بائیکاٹ سراسر تباہی تھا، چنانچہ دوسرو ں کے ساتھ میں نے بھی ایک ہفتے کے بائیکاٹ کی حمایت کی۔

نیشنل ایگزیکٹو نے فیصلہ کیا تھا کہ ایک ہفتے کا سکول بائیکاٹ یکم اپریل سے شروع کیا جائے دسمبر 1954ء میں ڈربن میں سالانہ کانفرنس میں یہ مسئلہ پیش ہوا تو مندوبین نے اگزیکٹو کی سفارشات مسترد کر دیں اور غیر معینہ بائیکاٹ کے حق میں رائے دی۔ اب کانفرنس سپریم اتھارٹی تھی حتیٰ کہ ایگزیکٹو سے بھی برتر تھی، لہذا ہم ایک ایسا بائیکاٹ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے جس پر عملدرآمد تقریباً ناممکن تھا۔ ڈاکٹر ورووڈ نے اعلان کیا کہ حکومت ان تمام سکولوں کو مستقل طور پر بند کر دے گی جن کا بائیکاٹ کیا جائے گا اور جو طلبہ اس میں حصہ لیں گے انہیں دوبارہ داخل نہیں کیا جائے گا۔

اس بائیکاٹ کو قابل عمل بنانے کے لیے والدین اور معاشرے کو آگے بڑھ کر اسکولوں کی جگہ لینی تھی۔ میں نے والدین اور اے این سی کے ارکان سے گفتگوئیں

کیں اور انہیں بتایا کہ رہ گھر، ہر کٹیا اور ہر کمیونٹی کو ہمارے بچوں کے لیے مرکز تعلیم بن جانا چاہیے۔

بائیکاٹ یکم اپریل کو شروع ہوا اور اس کے ملے جلے نتائج سامنے آئے۔ یہ اکثر خال خال، غیر منظم اور غیر موثر رہا۔ مشرقی رانڈ میں اس سے تقریباً سات ہزار اسکول جانے والے بچے متاثر ہوئے۔ دن نکلنے سے پہلے مارچ کرنے والوں نے والدین سے کہا کہ وہ اپنے بچوں کو گھروں میں رکھیں۔ عورتوں نے اسکولوں کے سامنے مظاہرے کیے اور ان بچوں کو نکال لے گئیں جو اسکول میں چلے آئے تھے۔

شہر کی جنوب مشرقی بستی جرمٹن میں ہماری مقامی شاخ کے چیئرمین جوشوا ما کو آٹھ سو بچوں کا ایک سکول چلاتے تھے۔ ان تمام بچوں نے بائیکاٹ میں حصہ لیا اور ان کا بائیکاٹ تین سال جاری رہا۔ پورٹ ایلزبتھ میں بیرٹ ٹائیسی نے ایک سرکاری سکول کی معلمی چھوڑ دی اور بائیکاٹ کرنے والے بچوں کا ایک اسکول چلانے لگے 1956ء میں انہوں نے ان میں سے ستر بچوں کو چھٹی کا امتحان دلایا اور تین کے سوا سب پاس ہو گئے۔ اکثر مقامات پر ''برمحل اسکول'' بائیکاٹ کرنے والے بچوں کو تعلیم دینے لگے۔ ایسے اسکولوں کو ''کلچرل کلب'' کہا جاتا تھا تا کہ وہ حکام کی نگاہوں میں آنے سے بچے رہیں۔ بعد میں حکومت نے ایک قانون بنا دیا جس کی رو سے اختیار کے بغیر تعلیم دینا جرمانے یا قید کا مستوجب جرم قرار پایا۔ پولیس ان تعلیمی کلبوں کو ہراساں کرنے لگی لیکن کئی ایک نے زیر زمین یہ کام جاری رکھا۔ آخر میں اس قسم کے کمیونٹی سکول منتشر ہو گئے اور والدین جن کے سامنے ''گھٹیا تعلیم'' اور ''بے تعلیمی'' میں سے کسی ایک کے چناؤ کا مسئلہ درپیش تھا، انہوں نے اول الذکر کو چن لیا اور یوں ان کے بچے سرکاری اسکولوں میں ''گھٹیا تعلیم'' پانے لگے۔ میرے اپنے بچے سیونتھ ڈے ایڈوینٹسٹ سکول میں پڑھتے تھے جو ایک نجی ادارہ تھا اور اس کا انحصار سرکاری سب سڈی پر نہیں تھا۔

اس مہم کا جائزہ دو سطحوں پر لیا جانا چاہیے۔ کیا فوری مقصد حاصل ہو گیا؟ اور کیا اس نے مزید لوگوں کو سیاسی شعور دیا اور انہیں آزادی کی جدوجہد کی طرف راغب کیا؟ پہلی سطح پر مہم یکسر ناکام رہی۔ ہم ملک بھر میں افریقی اسکول بند نہ کرا سکے اور نہ ہمیں بنتو ایجوکیشن ایکٹ سے نجات ملی۔ لیکن حکومت اس ایکٹ میں ترمیم کے لیے ہمارے احتجاج پر خاصی پریشان ہوئی اور ایک موقع پر تو مسٹر وورڈ یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے کہ تعلیم سب کے لئے یکساں ہونی چاہیے۔ نیز حکومت کا نومبر 54ء کا ڈرافٹ سلیبس ہسکول سسٹم کو قبائلی بنیادوں پر استوار کرنے کے اصلی تصور سے ایک طرح کی واپسی تھی۔

آخر کار ہمارے پاس دو برائیوں میں سے کمتر کو چن لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور یوں ہمیں کمتر تعلیم پر رضا مند ہونا پڑا۔ لیکن یہ بنتو ایجوکیشن ہی تھی جس نے 1970ء کے عشرے میں ناراض ترین اور باغی ترین سیاہ فام نوجوانوں کی نسل پیدا کی جو اس ملک نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ جب بنتو ایجوکیشن کی پیداوار یہ بچے سترہ اٹھارہ اور بیس بائیس برس کی عمروں کو پہنچے، وہ بے پناہ شدت کے ساتھ حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

چیف لوتھولی کے اے این سی کا صدر منتخب ہونے کے کئی ماہ بعد زیڈ کے میتھیوس جنوبی افریقہ واپس آ گئے۔ وہ امریکہ میں ایک سال بطور روزیٹنگ پروفیسر گزار کر ایک نظریئے سے مسلح ہو کر آئے تھے جو آزادی کی جدوجہد کی تشکیل نو کر سکتا تھا۔ کیپ میں اے این سی کی سالانہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا ”مجھے حیرت ہے کہ افریقن نیشنل کانگریس کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ وہ ایک نیشنل کنونشن منعقد کرنے کے سوال پر غور کرے یہ عوام کی ایک کانگریس ہو جس میں نسل یا رنگ سے قطع نظر اس ملک کے تمام عوام کو نمائندگی دی جائے اور یہ کانگریس مستقبل کے جمہوری جنوبی افریقہ کے لیے آزادی کا منشور تیار کرے۔“

چند ماہ کے اندر اے این سی نیشنل کانفرنس نے یہ تجویز منظور کر لی اور ایک کونسل آف دی کانگریس آف دی پیپل تشکیل پائی جس کے چیئر مین چیف لوتھولی تھے اور والٹر سیسولو سیکرٹری اور یوسف کاچھالیا جوائنٹ سیکرٹری تھی۔ دی کانگریس آف دی پیپل کو نئے جنوبی افریقہ کی بنیاد رکھنے کے لیے اصولوں کا ایک سیٹ وضع کرنا تھا۔ ایک نئے آئین کے لیے تجاویز خود عوام کی طرف سے آنی تھیں اور ملک بھر میں اے این سی لیڈروں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے علاقے میں ہر کسی سے تحریری آراء حاصل کریں۔ یوں یہ منشور عوام سے جنم لینے والی ایک دستاویز ہونا تھا۔

دی کانگریس آف دی پیپل پارٹی میں زیر عمل دو بڑی روؤں میں سے ایک کی نمائندگی کرتی تھی۔ یہ ناگزیر لگتا تھا کہ حکومت اے این سی پر پابندی لگا دے گی اور کئی یہ کہتے تھے کہ تنظیم کو زیر زمین اور غیر قانونی طور پر برسر عمل رہنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم عوامی پالیسیوں اور سرگرمیوں کو ترک نہیں کرنا چاہتے تھے جن سے اے این سی کو اہمیت اور عوامی حمایت حاصل ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ دی کانگریس آف دی پیپل طاقت کا ایک عوامی مظاہرہ ہوتی۔

دی کانگریس آف دی پیپل کے لیے ہمارا خواب یہ تھا کہ آزادی کی جدوجہد میں ایک سنگ میل ثابت ہوگی ایک ایسا کنونشن جو جنوبی افریقہ کی تمام مظلوم اور ترقی پسند قوتوں کو متحد کر دے گا اور تبدیلی کے لیے نقارے کی چوٹ ثابت ہوگا۔ ہمیں امید تھی کہ ایک روز اسے اسی احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا جو 1912ء میں اے این سی کے بنیادی کنونشن کو میسر آیا تھا۔

ہم نے کنونشن کو وسعت کا رنگ دینے کے لیے تقریباً دو سو تنظیموں کو دعوت دی تھی۔ ان میں سفید، سیاہ، ہندوستانی اور رنگ دار سب شامل تھیں۔ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ مارچ 1954ء میں ڈربن کے نزدیک ٹونگاٹ کے مقام پر ایک پلاننگ کانفرنس کے لیے نمائندے بھیجیں۔ وہاں جو نیشنل ایکشن کونسل تشکیل دی گئی وہ آٹھ

ارکان پر مشتمل تھی جو چار سپانسرنگ تنظیموں سے لیے گئے تھے۔ چیئر مین چیف لوتھولی تھے اور سیکرٹریٹ والٹر سیسولو، ایس اے آئی سی کے یوسف کا چھالیا، ساؤتھ افریقن کلرڈ پیپلز آرگنائزیشن (ایس اے سی پی او) کے سٹینلے لولان اور کانگریس آف ڈیموکریٹس (سی او ڈی) کے لائنل برنشائن پر مشتمل تھا۔ بعد میں جب والٹر کی نظر بندی نے اسے استعفا دینے پر مجبور کر دیا تو اس کی جگہ آلیور نے لے لی۔

ایس اے سی پی او کی بنیاد 1953ء میں رکھی گئی تھی اور اس کی اولین کانفرنس سے آلیور ٹیمبو اور یوسف کا چھالیا نے خطاب کیا تھا۔ یہ تنظیم رنگ دار لوگوں کے مفادات کی ترجمان تھی۔ سی او ڈی 1952ء میں قائم ہوئی تھی اور یہ ترقی پسند، بائیں بازو کے حکومت مخالف گوروں کی جماعت تھی۔ یہ جماعت اگرچہ جوہانس برگ اور کیپ ٹاؤن تک محدود تھی لیکن یہ اپنی عددی حیثیت سے کہیں زیادہ اثر و رسوخ رکھتی تھی۔ اس کے مائیکل ہارمل، برام فشر اور رسٹی برنشائن جیسے ارکان ہمارے کاز کے پرجوش حامی تھے۔ اس کے مائیکل ہارمل، برام فشر اور رسٹی برنشائن جیسے ارکان ہمارے کاز کے پرجوش حامی تھے۔ سی او ڈی کالوں اور گوروں کے درمیان مکمل مساوات اور تمام طبقوں اور گروہوں کی یکساں نمائندگی کی علمبردار تھی۔ ہم سی او ڈی کو ایک ایسا وسیلہ گردانتے تھے جس کے ذریعے ہمارے نظریات سفید فام عوام تک براہ راست پہنچائے جا سکتے تھے۔ سیاہ فام جوانیٹی وائٹ یعنی ''گورا دشمن'' ہونے کے باعث آزادی کی جدوجہد میں شامل ہوئے تھے، ان پر یہ انکشاف ہوا کہ ایسے نیک نہاد گورے بھی ہیں جو افریقیوں سے مساوی سلوک کرتے ہیں۔

نیشنل ایکشن کونسل نے تمام شریک تنظیموں اور ان کے پیروکاروں کو دعوت دی کہ وہ آزادی کے منشور کے لیے تجاویز ارسال کریں ملک بھر میں بستیوں اور دیہات تک ان عنوانات کے سرکلر بھیج دیئے گئے

''اگر آپ کو قانون سازی کا موقع دیا جائے تو آپ کیا کریں گے؟''

”آپ جنوبی افریقہ کو اس کے تمام باشندوں کے لیے ایک پر مسرت جگہ بنانے کا کام کیسے سر انجام دیں گے؟“

بعض پمفلٹوں اور دو ورقوں پر شاعرانہ مثالیت سے بھرپور عبارات تھیں جو نیشنل ایکشن کونسل کی پلاننگ کی آئینہ دار تھیں ”ہم ساؤتھ افریقہ کے سیاہ اور سفید لوگوں سے کہتے ہیں کہ آیئے مل کر آزادی کی بات کریں! آیئے سب لوگوں کی آوازیں سنی جائیں آیئے سب لوگوں کے ایسے مطالبات جو ہمیں آزاد ہونے میں مدد دیں، ریکارڈ کر لیے جائیں آیئے ان مطالبات کو جمع کر کے آزادی کے ایک عظیم منشور کی شکل دیں۔“

اس کال نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ سپورٹس و کلچرل کلبوں، چرچ گروپوں، ریٹ پیئر ز ایسوسی ایشن، خواتین کی تنظیموں، اسکولوں اور مزدور یونینوں کی طرف سے تجاویز آئیں۔ یہ تجاویز دستر خوانی نیپکنوں، کاپیوں سے پھاڑے ہوئے اوراق، فل سکیپ کاغذی پرزوں اور ہمارے اپنے پمفلٹوں کے پشت پر لکھی تحریروں کی شکل میں آئیں۔ یہ امر خاص عجز آفرین تھا کہ عام لوگوں کی تجاویز اکثر رہنماؤں سے بہت آگے تھیں۔ سب سے زیادہ جو مطالبہ کیا گیا تھا وہ ”ون مین ون ووٹ“ کا تھا اور مسلمہ امر یہ تھا کہ یہ ملک ان سب لوگوں کی ملکیت ہے جنھوں نے اسے اپنا گھر بنالیا ہے۔

اے این سی کی شاخوں نے منشور تحریر کرنے کے عمل میں بڑی مدد کی اور در حقیقت دو بہترین ڈرافٹ ڈربن اور پیٹر میریز برگ سے آئے تھے۔ ان ڈرافٹوں سے تیار کردہ ایک خاکہ نقد و جرح اور سوالات کے لیے مختلف علاقوں اور کمیٹیوں کے پاس بھیجا گیا۔ خود منشور کا مسودہ نیشنل ایکشن کونسل کی ایک چھوٹی کمیٹی نے تیار کیا اور اے این سی کی نیشنل ایگزیکٹو نے اس پر نظر ثانی کی۔

کلپ ٹاؤن کانگریس

یہ منشور کانگریس آف دی پیپل کے سامنے پیش کیا جانا تھا لہٰذا اس کے تمام اجزاء منظوری کے لیے مندوبین تک پہنچائے گئے۔ کانگریس کے مجوزہ انعقاد سے چند روز پہلے جون میں ہم چند افراد کے گروہ نے مسودے پر نظر ثانی کی۔ ہم نے بہت کم تبدیلیاں کیں کیونکہ وقت بہت کم تھا اور مسودہ پہلے ہی مناسب شکل میں تھا۔

کانگریس آف دی پیپل کلپ ٹاؤن میں منعقد ہوئی جو جوہانس برگ کے چند میل مشرق میں میدانی پٹی میں ایک کثیر نسلی گاؤں ہے۔ کانگریس 25 اور 26 جون کے دو روشن دنوں میں جاری رہی۔ تین ہزار سے زیادہ مندوبین پولیس کی دھمکیوں اور ڈراووں کے باوجود جمع ہوئے اور انہوں نے آخری مسودے کی منظوری دی۔ وہ کاروں، بسوں، ٹرکوں اور پیدل آئے تھے۔ اگرچہ مندوبین کی غالب تعداد سیاہ فام تھی، تین سو سے زیادہ ہندوستانی، دو سو کلرڈ اور ایک سو سفید فام بھی تھے۔

میں والٹر کے ہمراہ کار میں کلپ ٹاؤن پہنچا۔ ہم دونوں پر نظر بندی کے احکام لاگو تھے لہٰذا ہم اجتماع کے حاشیہ پر ایک جگہ موجود رہے جہاں سے ہم ہجوم میں گھلے ملے یا نگاہوں میں آئے بغیر مشاہدہ کر سکتے تھے۔ اجتماع شرکاء کی تعداد اور نظم و ضبط دونوں کے لحاظ سے متاثر کن تھا۔ فریڈم والنٹیئر زبازوؤں پر سیاہ، سبز اور زرد پٹیاں باندھے مندوبین کا استقبال کرتے اور انہیں ان کی نشستوں پر بٹھاتے تھے۔ بوڑھی اور جوان عورتیں تھیں جنہوں نے کانگریس سکرٹس، کانگریس بلاؤزر اور کانگریس اسکارٹ پہن رکھے تھے۔ معمر اور جوان مردوں نے کانگریس آرم بینڈ اور کانگریس ہیٹ سجا رکھے تھے۔ ہر طرف بینر آویزاں تھے جن پر درج نعرے یہ تھے

"آزادی ہماری زندگی ہی میں"

"جدوجہد زندہ باد!"

اسٹیج پر رنگوں کی بہار آئی ہوئی تھی سی او ڈی کے گورے مندوبین، اے اے آئی سی کے ہندوستانی ایس اے سی پی او کے رنگ دار نمائندے سب چار پہیوں والے

علامتی پہیئے کے سامنے براجمان تھے جو کانگریس اتحاد کی چار تنظیموں کی نمائندگی کرتا تھا۔ گوروں اور کالوں پر مشتمل پولیس اور سپیشل برانچ کے ارکان ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ وہ تصویریں اور نوٹس لیتے اور مندوبین کو دھمکانے کی ناکام کوشش کرتے۔

درجنوں ترانے گائے گئے اور تقریریں کی گئیں۔ کھانوں کے دور بھی چلے۔ ماحول سنجیدہ بھی تھا اور جشن کی کیفیت بھی تھی۔ پہلے روز کی سہ پہر منشور بلند آواز سے ایک ایک سیکشن کر کے انگریزی، سیسوتھو اور ژہوسا میں شرکاء کے سامنے پڑھا گیا ہر سیکشن کے بعد ہجوم ''افریقہ'' اور ''مائی بوائے'' کے نعروں سے اس کی منظوری دیتا۔ کانگریس کے پہلے دن کامیابی ہی کامیابی تھی۔

پولیس نے اسٹیج پر ہلہ بول دیا

دوسرا دن بھی خاصا پہلے جیسا تھا۔ منشور کا ہر سیکشن نعروں کے ساتھ منظور کر لیا گیا اور ساڑھے تین بجے آخری منظوری کے لئے ووٹ ڈالے جانے تھے جب پولیس اور سپیشل برانچ کے سراغرسانوں کا ایک جتھا سٹین گنیں لہراتے ہوئے اسٹیج پر چڑھ دوڑا ایک پولیس والے نے مائیکروفون چھینا اور کھردرے افریکان لہجے میں اعلان کیا کہ سازش کا شبہ ہوا ہے اور پولیس کی اجازت کے بغیر کوئی اجتماع سے باہر نہ جائے اس کے ساتھ ہی پولیس لوگوں کو اسٹیج سے دھکیلنے اور دستاویزات اور تصاویر ضبط کرنے لگی۔ حتیٰ کہ Soup With Meat اور Soup Without Meat جیسے کتبے بھی ضبط کر لیے گئے۔ رائفلوں سے مسلح سپاہیوں کے ایک اور گروہ نے اجتماع کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ لوگ جواب میں ''انکوسی سکیلیلے ایا فریقہ!'' کے پرجوش نعرے لگانے لگے۔ پھر مندوبین کو ایک ایک کر کے جانے کی اجازت دی گئی۔ پولیس نے ہر مرد اور عورت سے پوچھ تاچھ کی اور ان کے ناموں کا اندراج کیا۔ جب پولیس نے ہلہ بولا، میں اجتماع کے نواح میں تھا۔ میرا جوش مجھے وہاں ٹھہر کر لوگوں کی مدد کرنے پر اکساتا تھا جبکہ ہوش کا تقاضا تھا کہ میں محفوظ تر راستہ

اپناؤں کیونکہ نگاہوں میں آنے کی صورت میں مجھے فوراً گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دیا جاتا۔ جوہانس برگ میں ایک ہنگامی اجلاس بلایا گیا تھا اور اس میں شریک کے لیے میں نے واپسی کی راہ اختیار کی۔ جوہانس برگ آ کر معلوم ہوا یہ پولیس دھاوا حکومت کی طرف سے ایک نئی سخت پالیسی کا سگنل ہے۔

مستقبل کے لیے بلیو پرنٹ

اگرچہ کانگریس آف دی پیپل منتشر کر دی گئی تھی، اس کا منشور جہد آزادی کے لیے مینارہ نور بن گیا۔ امریکہ کے اعلان آزادی، فرانسیسی اعلان حقوق انسانی اور کمیونسٹ مینی فیسٹو جیسی دیگر دیرپا دستاویزات کی طرح ہمارا منشور آزادی، عملی اہداف اور شاعرانہ زبان کا آمیختہ ہے۔ یہ نسلی امتیاز کے خاتمے اور سب کے لیے مساوی حقوق کے حصول کا علمبردار ہے۔ یہ آزادی سے محبت کرنے والے تمام لوگوں کو ایک جمہوری، غیر نسلی جنوبی افریقہ کی تشکیل میں حصہ لینے کی دعوت دیتا ہے۔ اس نے لوگوں کی آرزوؤں اور خوابوں کو اپنے اندر سمو لیا اور جہد آزادی اور قوم کے مستقبل کے لیے بلیو پرنٹ کا کام دیا۔ اس کے افتتاحیہ میں درج ہے:

ہم جنوبی افریقہ کے لوگ، اپنے پورے ملک اور دنیا کے سامنے اعلان کرتے ہیں کہ وہ جان لیں:

جنوبی افریقہ ان سب کی ملکیت ہے جو اس میں بستے ہیں، خواہ وہ سیاہ ہوں یا سفید اور یہ کہ کوئی حکومت اقتدار کی جائز دعویدار نہیں ہو سکتی جب تک اس کی بنیاد عوام کی مرضی پر نہ رکھی جائے۔

☆ یہ کہ ناانصافی اور غیر مساوات پر مبنی ایک قسم کی حکومت نے ہماری قوم کو ملکیت زمین، آزادی اور امن کے پیدائشی حقوق سے محروم کر رکھا ہے۔

☆ یہ کہ جب تک ہماری ساری قوم مساوی حقوق اور مساوی مواقع سے بہرہ ور ہو کر بھائی چارے کے ساتھ نہیں رہتی، ہمارا ملک کبھی خوشحال نہیں ہو سکتا۔

☆ یہ کہ عوام کی مرضی پر مبنی ایک جمہوری مملکت ہی رنگ، نسل، جنس یا عقیدے کے امتیاز کے بغیر ان کے تمام پیدائشی حقوق کی ضمانت دے سکتی ہے۔

☆ اور اس لیے ہم جنوبی افریقہ کے لوگ، کالے اور گورے، مساوی ہم وطن اور بھائی، مل کر اس منشور آزادی کو اختیار کرتے ہیں اور ہم اپنے آپ سے یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم مل کر جدو جہد کریں گے اور جب تک اس ''منشور'' میں طے شدہ جمہوری تبدیلیوں کی منزل حاصل نہیں ہو جاتی، ہم اپنی قوت اور جرات کو بروئے کار لانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے۔

پھر اس منشور میں ایک آزاد اور جمہوری جنوبی افریقہ کی ضروریات پیش کی گئی ہیں۔

The People Shall Govern!(عوام ہی حکومت کریں گے!)

☆ ہر مرد اور عورت کو ان تمام اداروں کے لیے جو قانون سازی کرتے ہیں، ووٹ دینے اور امیدوار بننے کا حق ہوگا۔

☆ سب لوگوں کو ملک کی انتظامیہ میں شرکت کرنے کا حق ہوگا

☆ لوگوں کے حقوق نسل، رنگ یا جنس سے قطع نظر یکساں ہوں گے

☆ اقلیتی حکومت کے تمام اداروں، مشاورتی بورڈوں، کونسلوں اور اتھارٹیز کی جگہ حکومت خود اختیاری کے جمہوری ادارے لے لیں گے۔

(تمام All National groups Shall have equal rights قومی گروہوں کے حقوق یکساں ہی ہوں گے)

☆ حکومت کے اداروں میں، عدالتوں میں اور اسکولوں میں تمام قومی گروہوں اور نسلوں کا مرتبہ مساوی ہوگا۔

☆ تمام قومی گروہوں کے نسلی اور قومی فخر و امتیاز کی ذہانت کے خلاف قانون سازی کر کے انہیں تحفظ دیا جائے گا۔

☆ تمام لوگوں کو اپنی زبان استعمال کرنے اور اپنی عوامی ثقافت اور رسوم کو ترقی دینے کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔

☆ قوم، نسل یا رنگ کے امتیاز اور عصبیت کا پرچار اور اس پر عمل قابل سزا جرم ہوگا۔

☆ نسلی امتیاز کے تمام قوانین اور ضابطے بالائے طاق رکھ دیئے جائیں گے۔

عوام ملک کی دولت میں حصے دار ہوں گے

☆ ہمارے ملک کی قومی دولت، تمام جنوبی افریقیوں کا ورثہ ہے جو عوام کو لوٹا دیا جائے گا۔

☆ زیر زمین معدنی دولت، بینک اور اجارہ دارانہ صنعتیں عوام کی اجتماعی ملکیت شمار ہوں گی۔

☆ تمام دوسری صنعتیں اور تجارت عوام کی بہبود میں مدد دینے کے لیے سرکاری کنٹرول میں ہوں گی۔

☆ تمام لوگوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے کہ وہ جہاں چاہیں تجارت کریں، صنعت لگائیں اور ہر نوع کا کاروبار، حرفت اور پیشہ اپنائیں۔

زمین میں حصے دار وہ ہوں گے جو اس پر کام کرتے ہیں

نسلی بنیاد پر زمینی ملکیت کی تحدید ختم کر دی جائے گی اور ساری زمین از سر نو ان لوگوں میں تقسیم کر دی جائے گی جو اس پر کام کرتے ہیں تاکہ قحط اور بھوک کا مداوا ہو سکے اور لوگوں میں زمینی بھوک نہ رہے۔

منشور سرمایہ دارانہ اشتراکی

اے این سی میں بعض لوگوں، خصوصاً افریقہ پرست عناصر نے جو کمیونسٹ دشمن اور گورا دشمن تھے، اعتراض کیا کہ یہ منشور اس جنوبی افریقہ سے ایک یکسر مختلف جنوبی افریقہ کا خاکہ پیش کرتا ہے جس کا پرچار اے این سی اپنے قیام سے لے کر اب

تک کرتی آ رہی ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ منشور ایک سوشلسٹ آرڈر کی عکاسی کرتا ہے اور ان کے خیال میں سی او ڈی اور گورے کمیونسٹوں نے اس کی آئیڈیالوجی کو غیر متناسب طور پر متاثر کیا ہے۔ جون 56ء میں، میں نے ماہنامہ ''لبریشن'' میں یہ واضح کیا کہ منشور نجی کاروبار کی توثیق کرتا ہے اور یہ پہلی مرتبہ افریقیوں میں سرمایہ داروں کو فروغ پانے کا موقع فراہم کرے گا۔ منشور یہ ضمانت دیتا تھا کہ جب آزادی آئے گی تو افریقیوں کو اپنے ناموں سے اپنے کاروبار کرنے، مکانات اور جائیداد اپنی ملکیت میں رکھنے غرضیکہ سرمایہ داروں اور صنعتکاروں کی حیثیت سے خوشحال ہونے کے مواقع ملیں گے۔ منشور طبقات اور نجی جائیداد یا ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کے خاتمے کی بات یا سائنٹیفک سوشلزم کے اصولوں کا اعلان نہیں کرتا تھا۔ کانوں، بینکوں اور اجارہ دارانہ صنعتوں کو ممکنہ طور پر قومیانے کی بات کرنے والی شق ایک ایسا اقدام تھا جس کی ضرورت اس صورت میں پیش آنی تھی اگر معیشت کلی طور پر گوروں کی تحویل میں نہیں رہنی تھی۔

منشور دراصل اجمالی طور پر ایک انقلابی دستاویز تھا کیونکہ جن تبدیلیوں کا اس نے تصور دیا تھا وہ جنوبی افریقہ کے اقتصادی اور سیاسی ڈھانچے کو یکسر بدلے بغیر عمل میں نہیں لائی جاسکتی تھیں۔ اس دستاویز کا مقصد ملک کو سرمایہ داریا اشترا کی بنانا نہیں تھا بلکہ یہ ظلم ختم کرنے کے لیے عوام کے مطالبات کا اکٹھا اعلان تھا۔ جنوبی افریقہ میں فقط انصاف حاصل کرنے کے لیے ہمیں نسلی امتیاز کو تباہ کرنا تھا کیونکہ یہی مجسم ناانصافی تھا۔

آٹھ سال بعد ایک چھٹی

ستمبر 1955ء کے اوائل میں میری نظر بندی ختم ہوگئی۔ اس سے پہلے میں نے آخری بار 1948ء میں تعطیل منائی تھی جب میں اے این سی میں ایک ایسا لائٹ ویٹ تھا جس کی ابھی آزمائش نہیں ہوئی تھی، جس پر ذمے داریاں نہ ہونے کے برابر

تھیں اور جسے ٹرانسوال ایگزیکٹو کے اجلاسوں میں شرکت کرنا پڑتی تھی نہ ادھر ادھر عوامی اجتماعات سے خطاب کرنا پڑتا تھا۔ اب اڑتیس سال کی عمر میں، میں لائٹ ہیوی ویٹ کے درجے کو پہنچ گیا تھا اور میرے پاس زیادہ پاؤنڈ اور زیادہ ذمے داریاں تھیں۔ میں دو سال جوہانس برگ تک محدود اور اپنے قانونی اور سیاسی کام سے بندھا رہا تھا اور ٹرانسکائی میں منڈیلا خاندان کے معاملات نظر انداز کر دیئے تھے۔ میں پھر دیہات میں جانے اور کھلے میدانوں اور بل کھاتی وادیوں میں پہنچ کر اپنے بچپن کو آواز دینے کا مشتاق تھا۔ میں اپنے خاندان سے ملنے اور ٹرانسکائی سے متعلق سابا تا اور والی دونگا سے مشورہ کرنے کو بے چین تھا جبکہ اے این سی چاہتی تھی کہ میں ان سے سیاسی امور پر بات چیت کروں۔ مجھے ایک کام کے لیے تعطیل کرنی تھی اور یہ واحد قسم کی تعطیل تھی جو مجھے لینی آتی تھی۔

میری روانگی سے پچھلی رات بہت سے دوست الوداع کہنے کے لیے میرے گھر جمع ہو گئے۔ ڈوما! انوکوی بھی ان میں شامل تھا۔ وہ ایک نوجوان اور نیک دل بیرسٹر تھا اور یوتھ لیگ کا نیشنل سیکرٹری تھا۔ ڈوما، بخارسٹ میں یوتھ فیسٹیول میں شرکت کے لیے والٹر کے ہمراہ گیا تھا اور اس رات اس نے ہمیں روسی اور چینی گانے سنا کر محظوظ کیا جو اس دورے میں اس نے سیکھے تھے۔ آدھی رات جب میرے مہمان جانے کی تیاری کر رہے تھے، میری بیٹی مکازیوی جاگ اٹھی اور پوچھنے لگی کہ کیا وہ بھی میرے ساتھ جا سکتی تھی۔ میں اپنے گھر والوں کو نا کافی وقت دے رہا تھا۔ مکازیوی کی التجا سے میرے وجود میں احساس جرم کی ٹیسیں ابھریں۔ اور اچانک میرا گاؤں جانے کا جوش غائب ہو گیا۔ لیکن میں نے اسے واپس بستر پر لٹا دیا اور اس کا ماتھا چوم کر شب بخیر کہا اور اپنے سفر کی آخری تیاریاں کرنے لگا۔

میں ایک حقائق تلاش کرنے والے مشن پر جا رہا تھا جس کے ساتھ دیہات دیکھنے اور پرانے دوستوں اور ساتھیوں سے ملنے کی خوشی بھی وابستہ تھی۔ میں ایک کے

دوسرے حصوں میں ہونے والی تبدیلیوں میں الگ تھلگ رہا تھا اور بذات خود دیکھنے کا اشتیاق رکھتا تھا کہ اندرون ملک کیا تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ اگر چہ میں ملک بھر سے نکلنے والے مختلف اخبارات پڑھتا ہوں، مگر اخبارات حقیقت کا ایک مبہم عکس ہی پیش کرتے ہیں۔ ان کی اطاعات ایک مجاہد آزادی کے لیے صرف اس لیے اہم نہیں ہوتیں کہ وہ حقیقت کا انکشاف کرتی ہیں بلکہ وہ اخبار مرتب کرنے والوں اور پڑھنے والوں دونوں کے تعصّبات اور تصورات کو بھی افشا کرتی ہیں۔ اس دورے کے دوران میں کھیتوں میں کام کرنے والے لوگوں سے فرسٹ ہینڈ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

جوبا کی تاریخی پہاڑیوں میں

میں آدھی رات کے کچھ دیر بعد روانہ ہوا اور ایک گھنٹے کے اندر اندر میں ڈربن کی شاہراہ پر جا رہا تھا۔ سڑکیں خالی تھیں اور صرف ستارے اور ٹرانسوال کی خوشگوار ہوا میرا ساتھ دے رہے تھے۔ اگر چہ میں سو نہیں سکا تھا، میں ہلکا پھلکا اور تر و تازہ تھا۔ سورج نکلنے کے ساتھ میں فوکس رسٹ میں نٹال کی طرف مڑا جو زولوؤں کے آخری خودمختار بادشاہ سیٹی وایو کا ملک تھا جس کے دستوں نے 1879ء میں اساند ہلوانا کے مقام پر برطانوی فوج کو شکست دی تھی۔ لیکن بادشاہ برطانوی توپوں کے آگے نہ ٹھہر سکا اور آخر اس نے اپنی بادشاہت انگریزوں کو پیش کر دی۔ نٹال کی سرحد پر دریا پار کرتے ہی مجھے ماجوبا پہاڑیاں نظر آئیں جہاں ایک چھوٹے بوئر کمانڈر نے سیٹی وایو کی شکست کے تقریباً دو سال بعد گھات لگا کر برطانوی ریڈ کوٹ دستے کو شکست دی تھی۔ ماجوبا کی پہاڑیوں سے افریکنروں پر ضرب لگائی تھی۔ اب انہی ''مجاہدین آزادی'' کے وارث میری قوم پر مظالم ڈھا رہے تھے جو اسی چیز کے لیے جدوجہد کر رہی تھی جس کے لیے افریکنر کبھی لڑے تھے اور انہوں نے جانیں دی تھیں ان تاریخی پہاڑیوں میں گاڑی چلاتے ہوئے میں تاریخ کی اس ستم ظریفی کے بارے میں کم

سوچ رہا تھا جس سے مظلوم ظالم بن جاتے ہیں اور اس امر پر زیادہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح ظالم افریکنروں کو میری قوم کے ہاتھوں ماجوبا پہاڑیوں کی سی شکست ملنی چاہیے۔

تلخ و ترش خیالات کی رو میرے کار ریڈیو پر گونجنے والی ریڈیو بنٹو کی مسرت انگیز موسیقی سے منتشر ہوگئی۔ اگرچہ میں سرکاری انتظام میں ساؤتھ افریقن براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کی طرف سے پیش کی جانے والی ریڈیو بنٹو کی قدامت پسند سیاست سے نفرت کرتا تھا، مگر اس کی موسیقی میرے دل کو بھاتی تھی (جنوبی افریقہ میں افریقی فنکار موسیقی ترتیب دیتے تھے مگر گوری ریکارڈ کمپنیاں دولت کماتی تھیں) میں ''ری ڈیفیوژن سروس'' نامی مقبول پروگرام سن رہا تھا جس میں ملک کے بیشتر سرکردہ افریقی موسیقار حصہ لیتے تھے۔ مریام ماکیبا ڈولی راتھی بے ڈوروتھی ماسوکو، تھوکوشوکوما اور مین ہیٹن برادرز کی ہمو آواز۔ میں ہر طرح کی موسیقی سے لطف اندوز ہوتا ہوں لیکن میرے اپنے گوشت اور لہو کی موسیقی سیدھی دل میں اترتی ہے۔ افریقی موسیقی کا عجب حسن یہ ہے کہ وہ ایک المناک کہانی سنائے تو بھی روح کو سرشار کرتی ہے۔ آپ غریب ہو سکتے ہیں، آپ ایک جھونپڑے میں رہتے ہیں، آپ بے روزگار ہیں، لیکن وہ گیت آپ کو امید دلاتا ہے۔ افریقی موسیقی اکثر افریقی عوام کی آرزوؤں کے متعلق ہوتی ہے اور یہ ان لوگوں میں بھی سیاسی عزم کی جوت جگا سکتی ہے جو بصورت دیگر سیاست سے کوئی شغف نہیں رکھتے۔ افریقی ریلیوں میں افریقی موسیقی کی اثر انگیزی کا مشاہدہ ہر کوئی کر سکتا ہے۔ سیاست کو موسیقی سے تقویت مل سکتی ہے مگر موسیقی میں ایسی توانائی بھی ہے جو سیاست کو للکارتی ہے۔

میں نٹال میں کئی جگہ رکا اور اے این سی لیڈروں سے خفیہ ملاقاتیں کیں۔ ڈربن کے قریب میں پیٹر مارزبرگ میں رکا جہاں پوری رات ڈاکٹر چھوٹا موٹالا، موسز مابھیدا اور دوسرے لوگوں سے ملاقاتوں میں گزری اور ملک کی سیاسی صورت حال زیر

بحث آئی ۔ پھر میں نے گروٹ ویل کی راہ لی جہاں چیف لوتھولی کے ساتھ دن گزارا۔اگر چہ ان کی نظر بندی کوایک سال سے زیادہ عرصہ ہو رہا تھا،وہ اے این سی کی سرگرمیوں سے خوب باخبر تھے ۔انہیں پریشانی یہ تھی کہ ان کے خیال میں اے این سی کی سرگرمیاں زیادہ تر جوہانس برگ میں مرتکز رہتی تھی اور علاقوں کی طاقت کمزور پڑ رہی تھی ۔میں نے انہیں یقین دلایا کہ ہم چاہتے ہیں علاقے بھی مضبوط رہیں ۔

بحر ہند کے ساحل پر

میری اگلی منزل ڈربن میں ڈاکٹر نائیکر اور نٹال انڈین کانگریس کی ایگزیکٹو کمیٹی سے ملاقات تھی جہاں میں نے ایک حساس مسئلہ اٹھایا۔نیشنل ایگزیکٹو کا خیال تھا کہ انڈین کانگریس عرصے سے بے عمل ہو گئی ہے۔میں یہ سوال اٹھانے میں متامل تھا کیونکہ ڈاکٹر نائیکر میرے سینئر اور وہ آدمی تھے جنہوں نے مجھ سے زیادہ مصائب جھیلے تھے لیکن پھر ہم نے اس موضوع پر گفتگو کی اور سرکاری پابندیوں پر قابو پانے کے طریقے سوچتے رہے ۔

ڈربن سے میں جنوب کو ساحل کے ساتھ ساتھ ہو لیا اور پورٹ شیپ سٹون اور پورٹ سینٹ جونز سے گزرا جو بحر ہند کے بالمقابل چمکتے ساحل پر چھوٹے اور خوبصورت استعماری قصبے ہیں۔ میں اس علاقے کے حسن سے مسحور تو ہوا لیکن عمارتوں پر اور بازاروں میں گورے سامراجیوں کے نام لکھے دیکھ کر کبیدہ خاطر بھی ہوا جنہوں نے ان لوگوں کو کچل ڈالا تھا جن کے نام یہاں چپے چپے پر موجود تھے ۔ تب میں ساحل سے ہٹ کر امزملولو کی طرف مڑ گیا جہاں مجھے ڈاکٹر کونکو،اے این سی کے ٹریژرر جنرل سے مل کر مزید مذاکرات اور مشورے کرنے تھے ۔

اب میں وفور مسرت میں امتاتا کی طرف بڑھ رہا تھا۔جب میں پارک روڈ پر مڑا، جو امتاتا کی مین سٹریٹ تھی،تو مجھے تیزی سے شناسائی کا احساس ہوا اور وہ یادیں لوٹ آئیں جو کسی کی طویل جلاوطنی کے بعد گھر واپس آنے پر تازہ ہوتی ہیں میں تیرہ

برس تک باہر رہا تھا اور اب جبکہ اس سرزمین کے ایک شاہ خرچ بیٹے کی واپسی پر اس کو خوش آمدید کہنے کے لیے بینر لگے تھے نہ موٹے تازے بچھڑے پیش کیے گئے تھے، میں اپنی ماں، اپنے سادہ سے گھر اور اپنی جوانی کے دوستوں سے ملنے کو بے حد بے قرار تھا۔ لیکن ٹرانسکائی میں میری آمد کا ایک اور مقصد بھی تھا۔ انہیں دنوں ٹرانسکائی بھنگا سسٹم کو بنتو حکام کے سپرد کرنے کی نگرانی کے لیے مقرر کردہ سپیشل کمیٹی کا اجلاس بھی وہیں ہو رہا تھا۔

بھنگا 108 ارکان پر مشتمل تھا جن میں سے ایک چوتھائی گورے تھے اور تین چوتھائی کالے یہ ایک مشاورتی ادارہ تھا جو حکومت کو علاقے میں افریقیوں سے متعلق قانون سازی میں مدد دیتا اور ٹیکسوں اور سڑکوں جیسے مسائل کو منضبط کرتا تھا۔ بھنگا اگرچہ ٹرانسکائی کا سب سے زیادہ بارسوخ سیاسی ادارہ تھا مگر اس کی قراردادیں مشاورتی تھیں اور اس کے فیصلے گورے مجسٹریٹوں کی نظر ثانی کے محتاج تھے۔ بھنگا اتنا ہی با اختیار تھا جتنی گورے اسے اجازت دیتے تھے اور اب اس کی جگہ بنتو اتھارٹیز ایکٹ کے نام سے کہیں زیادہ متشدد نظام نافذ کیا جا رہا تھا۔ یہ نیا نظام جس کا فیصلہ حکومت نے کر لیا تھا، وراثتی اور قبائلی امتیازات پر مبنی جاگیردارانہ نظام تھا۔ اس کے پردے میں حکومت نے جمہوریت کا راستہ روکنے اور قبائلی رقابتوں کو فروغ دینے کا اہتمام کیا تھا۔ اے این سی بنتو اتھارٹیز ایکٹ قبول کرنے کو حکومت کے آگے سر جھکانے کے مترادف قرار دیتی تھی۔

اپنی آمد کی رات میں بہت سے ٹرانسکائی کونسلروں اور اپنے بھتیجے کے ڈی ماتن زیما سے ملا جسے میں والیو ونگا کہا کرتا تھا۔ دالیو ونگا، بھنگا کو بنتو اتھارٹیز ایکٹ منظور کرنے کی ترغیب دینے میں پیش پیش تھا کیونکہ نیا نظام ایمیگرنٹ تھیمبو لینڈ کے چیف کی حیثیت سے اس کے اختیارات میں اضافہ کرتا تھا۔ اس مشکل مسئلے پر دالیو ونگا اور میں متضاد موقف رکھتے تھے۔ ہمارے راستے جدا جدا تھے۔ اس نے روایتی

سر دار کا کردار اختیار کیا تھا اور گوروں کے رائج کردہ نظام سے تعاون کر رہا تھا۔ ہماری ملاقات چونکہ رات گئے ہوئی تھی، اس میں طویل مذاکرات کی گنجائش نہ تھی، چنانچہ ہم اگلے روز ملاقات کا طے کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

گورے سارجنٹ سے عجب ملاقات

وہ رات میں نے قصبے کے ایک بورڈنگ ہاؤس میں گزاری۔ صبح اٹھا اور اپنے کمرے میں کافی کی میز پر دو مقامی چیفس سے ملا جو نئے نتوا اتھارٹیز ایکٹ کے تحت اپنے کردار پر گفتگو کرنے آئے تھے۔ ہماری گفتگو کے بیچ میں بورڈنگ ہاؤس کا مالک پریشانی کے عالم میں ایک گورے کو کمرے کے اندر لے آیا "کیا آپ نیلسن منڈیلا ہیں؟" اس نے پوچھا

"اور آپ کون ہیں پوچھنے والے؟" میں نے کہا

وہ سیکیورٹی پولیس میں ایک ڈی ٹیکٹو سارجنٹ تھا۔ اس نے اپنا نام اور رینک بتایا۔

"کیا میں آپ کا وارنٹ دیکھ سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا

یہ ظاہر تھا کہ سارجنٹ کو میری کھری کھری باتوں پر غصہ آیا تھا، تاہم اس نے بڑبڑاتے ہوئے ایک سرکاری کاغذ پیش کیا "ہاں، میں نیلسن منڈیلا ہوں" میں نے اسے بتایا اس نے کہا کہ کمانڈنگ افسر مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اگر وہ ملنا چاہتا ہے تو اسے علم تو ہے کہ میں کہاں ہوں اس پر اس نے مجھے حکم دیا کہ اس کے ساتھ پولیس اسٹیشن چلوں میں نے پوچھا کیا میں زیر حراست ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ ایسی بات نہیں میں نے کہا "اگر یہ صورت ہے تو پھر میں ساتھ نہیں جاؤں گا"

وہ میرے انکار پر چکرا گیا مگر وہ یہ جانتا تھا کہ میرا موقف مضبوط قانونی بنیاد رکھتا ہے۔ اس نے یکے بعد دیگرے مجھ پر کئی سوال داغنے میں جوہانس برگ سے کب

روانہ ہوا؟ میں کہاں کہاں گیا تھا؟ میں نے کس سے گفتگو کی تھی؟ کیا میرے پاس ٹرانسکائی میں داخل ہونے کا اجازت نامہ تھا اور میں کتنا عرصہ ٹھہروں گا؟ میں نے اسے بتایا کہ ٹرانسکائی میرا گھر ہے اور مجھے یہاں آنے کے لیے کسی اجازت نامے کی ضرورت نہیں یہ سن کر سارجنٹ کمرے سے باہر چلا گیا۔

دونوں چیفس میرے رویئے پر ہکا بکا رہ گئے اور انہوں نے میری گستاخی پر میری تحسین نہ کی میں نے ان سے کہا کہ میں نے اس سے وہ سلوک کیا ہے جو اس نے مجھ سے روا رکھا تھا۔ چیفس قائل نہ ہوئے اور ان کی واضح سوچ یہ تھی کہ میں ایک گرم خون نوجوان ہوں جو اپنے آپ کو مصیبت میں پھنسا لے گا یہ وہ لوگ تھے جنہیں میں ترغیب دے رہا تھا کہ وہ ٹرانسکائی اتھارٹیز ایکٹ کو مسترد کر دیں اور یہ ظاہر تھا کہ میرا ان پر کوئی بہت اچھا اثر نہیں پڑا تھا اس واقعے نے مجھے یاد دلایا کہ میں اس شخص سے مختلف ہو کر اپنے مادر وطن لوٹا ہوں جو تیرہ سال پہلے یہاں سے گیا تھا۔

ٹرانسکائی میں پولیس اکھڑی تھی اور جب سے میں بورڈنگ ہاؤس سے چلا آیا تھا، میں جہاں کہیں بھی جاتا وہ میرا پیچھا کر رہی تھی۔ جب میں کسی سے بات چیت کر چکتا تو پولیس والے اس کے پاس جا کر کہتے "اگر تم منڈیلا سے گفتگو کرو گے تو ہم آ کر تمہیں گرفتار کر لیں گے۔"

والدہ نے مجھے بھوت سمجھا

میں نے ایک مقامی اے این سی لیڈر سے مختصر سی ملاقات کی اور تنظیم کے پاس فنڈز کی کمی کا جان کر مجھے افسوس ہوا لیکن اس وقت میں تنظیم کے بارے میں کم اور اپنے اگلے سٹاپ کے بارے میں زیادہ سوچ رہا تھا اور میرا اگلا سٹاپ قونو تھا، یعنی وہ گاؤں جہاں میں پلا بڑھا تھا اور میری والدہ جہاں اب بھی رہتی تھی۔

میں نے اپنی والدہ کو نیند سے اٹھایا جس نے پہلے تو مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں کوئی بھوت ہوں۔ لیکن پھر پہچان کر وہ خوشی سے پھولی نہ سمائی میں کچھ کھانے کی

چیزیں لایا تھا۔ پھل، گوشت، چینی، نمک اور ایک چوزہ میری ماں نے چائے بنانے کے لیے چولہا جلایا۔ ہم ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوئے نہ ایک دوسرے کا ماتھا چوما کہ یہ ہماری روایت نہ تھی۔ اگرچہ میں واپس آکر خوش تھا مگر یہ دیکھ کر مجھے ایک طرح کا احساس جرم ہوا کہ وہ اس قدر غریبی کے حالات میں تن تنہا رہ رہی ہے۔ میں نے اسے اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ میرے پاس آکر جوہانس برگ میں رہے مگر اس نے قسم کھا کر کہا وہ گاؤں سے محبت کرتی ہے اور اسے چھوڑ کر نہیں جائے گی۔ مجھے حیرت تھی اور یہ پہلی بار نہیں تھی، کہ ایک شخص اپنے خاندان کی بہبود کو نظر انداز کر کے دوسروں کی بہبود کے لیے لڑنے میں کس طرح حق بجانب ہوسکتا ہے کیا اپنی بوڑھی ماں کی دیکھ بھال سے ہٹ کر کوئی اور زیادہ اہم بات ہوسکتی ہے؟ کیا سیاست محض اپنی ذمے داریوں سے جی چرانے کا ایک بہانہ ہے یا حسب خواہش متاع زندگی فراہم کرنے کے قابل نہ ہونے کا ایک عذر ہے؟

اپنی ماں کے ساتھ ایک آدھ گھنٹہ گزارنے کے بعد میں امخی کیزوینی میں رات گزارنے چلا گیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو رات بھیگ چکی تھی اور میں پرجوش انداز سے اپنی کار کا ہارن بجانے لگا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ لوگ اس شور کو کیسے لیں گے وہ خوف کے عالم میں اپنے جھونپڑوں سے نکل آئے یہ سوچتے ہوئے کہ پولیس آ پہنچی ہے۔ لیکن جب ان دیہاتیوں نے مجھے پہچان لیا تو ان میں حیرت اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

اپنے پرانے بستر میں ایک بچے کی طرح سو جانے کے بجائے میں اس رات کروٹیں لیتا اور حیرت میں ڈوبا رہا کہ کیا میں نے صحیح راستہ اختیار کیا ہے۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ میں نے صحیح راستے کا انتخاب کیا ہے۔ میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ آزادی کی جدوجہد اپنے اہل خانہ کی دیکھ بھال کے مقابلے میں برتر اخلاقی درجہ رکھتی ہے۔ یہ بات نہیں یہ دونوں مختلف ذمے داریاں ہیں۔

میری بہن فرار ہو گئی

اگلی صبح تو نولوٹ کر میں نے لوگوں سے ملنے ملانے اور گاؤں کے گرد کھیتوں میں گھومنے پھرنے میں دن گزارا۔ میں اپنی بہن مابل سے بھی ملنے گیا جو میری بہنوں میں سب سے زیادہ عملی اور خوش اطوار تھی اور جسے میں بہت چاہتا تھا۔ وہ شادی شدہ تھی لیکن اس کے اس بندھن کے پیچھے ایک دلچسپ کہانی ہے۔ میری بہن بالیوی جو مابل سے بڑی تھی، اس کی شادی طے پائی تھی اور لوبولا یعنی بری ادا ہو چکی تھی لیکن شادی سے دو ہفتے پہلے بالیوی جو ایک تخیل پسند لڑکی تھی، گھر سے فرار ہو گئی۔ اب ہم بری کے مویشی، جو پہلے ہی قبول کر لیے گئے تھے، واپس نہیں کر سکتے تھے، اس لیے خاندان والوں نے فیصلہ کیا کہ اس کی جگہ مابل کو بیاہ دیا جائے اور یوں وہ بیاہ کر چلی گئی۔

اس شام پھر میں گاڑی میں اتحی کیزوینی کے لیے روانہ ہوا۔ اس بار بھی رات کو پہنچا اور زور سے ہارن بجا کر اپنی آمد کا اعلان کیا۔ اب کے لوگ یہ سوچ کر گھروں سے نکلے کہ ان کا چیف یعنی جسٹس لوٹ آیا ہے۔ جسٹس کو حکومت نے چیف کے عہدے سے معزول کر دیا تھا اور تب سے وہ ڈربن میں رہ رہا تھا۔ اگرچہ حکومت نے اس کی جگہ کسی اور کو تعینات کر دیا تھا مگر چیف تو اپنی پیدائش کی بنا پر چیف ہی ہوتا ہے اور اپنے خون کی بنا پر اختیار و اقتدار رکھتا ہے۔ لوگ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے لیکن انہیں جسٹس کی گھر واپسی پر اس سے زیادہ خوشی ہوتی۔

میری دوسری ماں نو انگلینڈ، ناظم کی بیوہ، گہری نیند میں تھی جب میں ان کے ہاں پہنچا لیکن جب وہ شب خوابی کے لباس میں اٹھی اور اس نے مجھے دیکھا تو وہ اس قدر مسرور ہوئی کہ اصرار کرنے لگی کہ اسے گاڑی میں ایک قریبی رشتے دار کے ہاں لے چلوں تاکہ وہ بھی جشن میں شامل ہو سکے۔ وہ اچک کر گاڑی میں بیٹھی اور ہم غیر ہموار میدان سے ہوتے ہوئے دور دراز جھونپڑے تک پہنچے۔ وہاں ہم نے ایک اور

خاندان جگایا اور پھر کہیں فجر کے وقت میں تھکا ماندہ مگر خوش وخرم نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اگلے پندرھواڑے میں، میں قونو اور انچی کیزوینی کے درمیان ادھر سے ادھر آتا جاتا رہا۔ میں باری باری اپنی والدہ اور نوانگلینڈ کے ہاں ٹھہرتا تھا اور اس دوران اپنے دوستوں اور رشتے داروں سے ملنے جاتا رہا یا وہ مجھے ملنے آتے رہے۔ ان دنوں میں نے وہی غذائیں کھائیں جو میں اپنے لڑکپن میں کھایا کرتا تھا۔ میں دن کے وقت انہی کھیتوں میں گھومتا پھرتا اور اسی آسمان کو دیکھتا تھا اور رات کو انہی ستاروں کو۔ ایک مجاہد آزادی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی جڑوں سے وابستگی برقرار رکھے جبکہ شہر کی ہنگامہ خیز زندگی ماضی کو مٹا دیتی ہے اس پھیرے نے مجھے بحال کر دیا اور اس مقام کے بارے میں میرے احساسات تازہ کر دیئے جہاں میں پلا بڑھا تھا۔ میں ایک بار پھر اپنی ماں کے گھر میں اس کا بیٹا تھا میں ایک بار پھر ''عظیم مقام'' میں ناظم کی ذمے داری (Charge) تھا۔

یہ پھیرا اس طویل سفر کی پیائش کا ایک ذریعہ بھی تھا جو میں نے طے کیا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ میرے اپنے قبیلے کے لوگ ایک ہی مقام پہ مقیم رہے تھے۔ جبکہ میں نے باہر نکل کر نئی دنیائیں دیکھی تھیں اور نئے خیالات اپنائے تھے۔ اگر پہلے مجھے یہ احساس نہیں تھا تو اب میں نے ضرور جان لیا تھا کہ میں فورٹ ہیئر سے ٹرانسکائی واپس نہ آنے میں حق بجانب تھا۔ اگر میں واپس آجاتا تو میرے سیاسی ارتقا کا پودا مرجھا کر رہ جاتا۔

ٹنتو اتھارٹیز ایکٹ کے نفاذ پر غور کرنے والی سپیشل کمیٹی ملتوی ہوگئی تھی، چنانچہ والیو وزنگا اور میں ساباتا سے ملنے امتاتا ہسپتال گئے۔ مجھے امید تھی کہ میں سابا تا سے ٹنتو اتھارٹیز ایکٹ کے بارے میں گفتگو کرسکوں گا مگر اس کی صحت نے اسے ناممکن بنا دیا۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ جیسے ہی سابا تا تندرست ہو جائے وہ اور

اس کا بھائی والیو ونگا اس مسئلے پر باہمی گفت وشنید کا آغاز کر دیں۔ میں فخر محسوس کر رہا تھا کہ میں انگو بنگ کوکا کے وارثوں کے مابین ایک ملاقات کا اہتمام کر رہا تھا اور ایک لمحے کے لیے میں نے اس ستم ظریفی کو بھی اپنے ذہن میں جگہ دی کہ آخر کار میں سابا تا کے مشیر کا رول ادا کر رہا تھا جس کے لیے بہت سال پہلے مجھے تیار کیا گیا تھا۔

امتاتا سے والیو ونگا اور میں قماطہ پہنچے جہاں اس کے چھوٹے بھائی سے ہماری ملاقات ہوئی جو اس وقت ایک پیشہ ور وکیل تھا۔ اس کے دو آرٹیکل کلرک میرے وقت تھے اور ان دونوں کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوا اے پی اے اور سیپو لیٹ گیا۔ دونوں پارٹی کے حامی تھے اور انہوں نے معلمی چھوڑ کر وکیل بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ قماطہ میں ہم سب مل بیٹھے اور مجوزہ بنتو اتھارٹیز ایکٹ کا جائزہ لیا۔

میرا مشن یہ تھا کہ میں والیو ونگا کو ترغیب دوں کہ وہ بنتو اتھارٹیز ایکٹ کے نفاذ کی مخالفت کرے کیونکہ وہی شخص تھا جسے ٹرانسکائی کی سیاست میں ایک نمایاں کردار ادا کرنا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری یہ ملاقات محض نمائشی یا بے مقصد مباحثہ ثابت ہو۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اپنے آپ کو برتر ثابت کر دوں یا اوروں پر حرف گیری کروں بلکہ میں تو ان افراد کے مابین سنجیدہ مذاکرات کا خواہاں تھا جو دل سے اپنے عوام اور اپنی قوم کے بہترین مفادات کی پاسبانی کرنا چاہتے تھے۔

الیوونگا ابھی تک مجھے اپنا جونیئر خیال کرتا تھا تھیمبو موروثی خانوادے میں میرے مرتبے اور میرے اپنے سیاسی ارتقا دونوں کے لحاظ سے۔ جب میں سابق شاہی میں اس سے جونیئر تھا تو میں سمجھتا تھا کہ میں اس شخص سے آگے بڑھ آیا ہوں جو کبھی میرے سیاسی خیالات میں میرا اتالیق تھا۔ جہاں اس کے تردداات نے اس کی توجہ اپنے قبیلے پر مرکوز کر دی تھی، میں ان لوگوں کا ہم سفر بن گیا تھا جو پوری قوم کے معاملات کے بارے میں سوچتے تھے۔ میں شاندار سیاسی نظریات پیش کر کے بات چیت کو پیچیدہ بنانا نہیں چاہتا تھا، چنانچہ میں نے عقل سلیم اور اپنی تاریخ کے حقائق پر

انحصار کیا۔ گفتگو شروع ہونے سے پہلے والیوونگا نے اڈا، لیٹا کا اور اس کے بھائی جارج کو بات چیت میں شریک ہونے کی دعوت دی مگر وہ کنی کترا گئے اور انہوں نے ہم دونوں کی باتیں سننے کو ترجیح دی۔ ''چچا اور بھتیجے کو بحث مباحثہ کرنے دیا جائے'' اڈا نے اظہار احترام کرتے ہوئے کہا آداب کا تقاضا یہ تھا کہ پہلے میں اپنا موقف پیش کروں اور دالیوونگا مداخلت نہیں کرے گا۔ پھر وہ جواب دے جبکہ میں سنتا رہوں گا۔

میں نے پہلی بات یہ کہی کہ بنتو اتھارٹیز ایکٹ نا قابل عمل ہے کیونکہ زیادہ سے زیادہ افریقی دیہات سے شہروں کی طرف نقل مکانی کر رہے ہیں۔ حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ افریقیوں کو ان کے نسلی گوشوں تک محدود رکھنے کی کوشش کی جائے کیونکہ وہ ان کے اتحاد کی طاقت سے خوفزدہ تھی۔ میں نے کہا کہ لوگ جمہوریت چاہتے ہیں اور سیاسی قیادت کے متمنی ہیں جو میرٹ پر آگے آئے، پیدائشی حق کی بنا پر نہیں۔ اس کے برعکس بنتو اتھارٹیز کا منصوبہ جمہوریت سے فرار کے مترادف تھا۔

والیوونگا کا جواب یہ تھا کہ وہ اپنے شاہی خانوادے کا مرتبہ بحال کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو برطانویوں نے کچل ڈالا تھا۔ اس نے قبائلی نظام اور روایتی قیادت کی اہمیت پر زور دیا، چنانچہ وہ اس نظام کو مسترد نہیں کرنا چاہتا تھا جو ان چیزوں کو تحفظ دیتا تھا۔ وہ بھی جنوبی افریقہ کو آزاد دیکھنا چاہتا تھا مگر اس کا خیال تھا کہ یہ مقصد حکومت کی جداگانہ ترقیاتی پالیسی کے ذریعے زیادہ تیزی سے اور زیادہ پرامن طور پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اے این سی خونریزی اور کشیدگی لائے گی۔ اس نے یہ کہہ کر بات ختم کی کہ اسے یہ جان کر حیرت اور پریشانی ہوئی ہے کہ میں تھیمبو شاہی خانوادے میں اپنی پوزیشن کے باوجود روایتی قیادت کے اصول کی حمایت نہیں کر رہا۔

والیوونگا اپنی بات کہہ چکا تو میں نے کہا کہ اگرچہ میں بطور چیف اس کی ذاتی

پوزیشن کو خوب سمجھتا ہوں مگر مجھے اس امر کا یقین ہے کہ اس کے اپنے مفادات افریقی برادری کے مفادات سے متصادم ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو میں اپنے مفادات کو لوگوں کے مفادات کے تابع کرنے کی کوشش کرتا۔ میں نے فوراً اس آخری نکتے پر تاسف ظاہر کیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ گفت وشنید میں اپنے مخالف پر برتری جتانے سے اسے قائل کرنے میں مدد نہیں ملتی۔ میں نے مشاہدہ کیا کہ میرے اس ریمارک پر والیو ونگا کا رویہ سخت ہو گیا تھا، چنانچہ میں نے گفتگو جلدی سے زیادہ عام مسائل کی طرف موڑ دی۔

ہم تمام شب باتیں کرتے رہے لیکن ایک دوسرے کے موقف کے قریب نہ آسکے۔ اور سورج نکل رہا تھا جب ہم رخصت ہوئے۔ ہم مختلف راہوں پر چلتے آرہے تھے جنہوں نے ہمیں ایک دوسرے سے متصادم کر دیا تھا۔ اس پر مجھے دکھ ہوا کیونکہ میں چند ہی آدمیوں سے اتنا متاثر ہوا تھا جتنا کہ والیو ونگا سے اور میرے لیے اس سے زیادہ کوئی خوشی کی بات نہیں ہو سکتی تھی کہ میں اس کے شانہ بشانہ لڑوں۔ لیکن ایسا ہو نہ سکا۔ خاندانی معاملات میں ہم دوست رہے، مگر سیاسی طور پر ہم مخالفت اور حریف کیمپوں میں تھے۔

اس صبح میں قونو واپس چلا آیا اور چند اور دن وہاں گزارے۔ میں دوستوں اور رشتے داروں سے ملنے کے لیے کھیتوں میں سے گزر کر جاتا مگر میرے بچپن کی جادوئی دنیا روٹھ گئی تھی ایک شام میں نے ماں اور بہن کو خدا حافظ کہا۔ میں نے ہسپتال میں سابا تا کی الوداعی عیادت کی اور اس کی صحت یابی کے لیے دعا کی اور صبح سویرے تین بجے میں کیپ ٹاؤن کے راستے پر رواں دواں تھا۔ چمکیلی چاندنی اور صبح کی خالص ہوا نے مجھے دریائے کائی کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے تروتازہ رکھا۔ سڑک تہہ در تہہ پہاڑیوں کے اوپر سے گزرتی ہے اور جب سورج طلوع ہوا میری طبیعت لطافت آشنا ہوتی چلی گئی۔ آخری بار میں اس سڑک پر اٹھارہ سال پہلے گزرا

تھا جب جونگن تابا مجھے گاڑی میں بٹھا کر ہیلڈ ٹاؤں لے گیا تھا۔

اسمگلر میرا ہم سفر بن گیا

میں آہستہ آہستہ گاڑی چلا رہا تھا جب میں نے سڑک کے کنارے ایک لنگڑاتے آدمی کو دیکھا جو میری طرف ہاتھ ہلا کر اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے جبلی طور پر گاڑی روک لی اور اس سوار کر لیا۔ وہ میری ہی عمر کا تھا، پست قامت اور قدرے گنوار تھا۔ وہ کئی روز سے نہایا نہیں تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی کار امتاتا کے دوسرے طرف خراب ہوگئی تھی اور وہ کئی روز سے پورٹ ایلزبتھ کی طرف پیدل چلا آ رہا تھا۔ مجھے اس کی کہانی بے ربط معلوم ہوئی اور میں نے اس کی گاڑی کا ماڈل پوچھا:

''ایک بیوک'' اس نے جواب دیا

''اور رجسٹریشن؟''

اس نے مجھے ایک نمبر بتایا

چند منٹ بعد میں کہا: ''تم نے رجسٹریشن نمبر کیا بتایا تھا؟''

اب کے اس نے مختلف نمبر بتایا۔ مجھے شک ہوا کہ وہ ایک پولیس مین ہے، چنانچہ میں نے طے کر لیا کہ اس سے مطلب کی بات ہی کروں گا میرا یہ ذہنی تحفظ میرے ہم سفر کے نوٹس میں نہ آ سکا کیونکہ وہ پورٹ ایلزبتھ تک تمام راستے میں باتیں کرتا رہا۔ اس نے مختلف تجسس آمیز باتوں کا ذکر کیا۔ وہ علاقے کی تاریخ خوب جانتا تھا۔ اس نے مجھ سے یہ نہ پوچھا کہ میں کون ہوں اور میں نے بھی نہ بتایا۔ وہ پر لطف آدمی تھا اور میں نے اس کی گفتگو کو مفید اور دلچسپ پایا۔

میں ایسٹ لندن میں رکا اور اے این سی کے چند لوگوں سے بات چیت کی روانہ ہونے سے پہلے میں نے بستی میں کچھ دوسرے لوگوں سے بھی بات چیت کی اور ان میں سے ایک مجھے سفید کپڑوں میں پولیس والا لگا۔ اس دوران میرے ساتھی نے میری شناخت جان لی تھی اور کار میں بیٹھنے کے چند منٹ بعد اس نے کہا ''منڈیلا، کیا

تم جانتے ہو سرے والا ایک شخص پولیس مین تھا؟'' اس پر میرے اپنے شبہات اٹھ کھڑے ہوئے اور میں نے اپنے ساتھی سے کہا ''دیکھو، میں نے کیسے جان لیا کہ خود تم ایک پولیس مین نہیں ہو! تمہیں یہ بتانا ہوگا کہ تم ہو کون ورنہ میں تمہیں واپس سڑک پر اتار دوں گا۔''

اس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا ''نہیں، میں اپنا ٹھیک ٹھیک تعارف کراتا ہوں'' پھر اس نے اعتراف کیا کہ وہ ایک اسمگلر ہے اور ساحل پونڈ ولینڈ سے ڈگہ یعنی چرس اسمگل کر کے لا رہا تھا کہ پولیس روڈ بلاک سے آمنا سامنا ہو گیا۔ اس نے پولیس کو دیکھتے ہی کار سے باہر چھلانگ لگائی اور فرار ہونے کی کوشش کی۔ پولیس والوں نے فائر کر دیا جس سے اس کی ایک ٹانگ زخمی ہو گئی اس کے لنگڑانے اور ذریعہ سفر نہ ہونے کا سبب یہی تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ پولیس اس کا پیچھا کر رہی ہے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے اس قدر خطرناک دھندا کیوں اختیار کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ پہلے وہ استاد بننا چاہتا تھا لیکن اس کے ماں باپ اتنے غریب تھے کہ اسے کالج میں داخل نہیں کرا سکتے تھے۔ سکول سے فارغ ہو کر وہ ایک فیکٹری میں کام کیا کرتا تھا لیکن اجرت اتنی کم تھی کہ اپنا گزارا بھی مشکل تھا۔ اس نے ماں باپ کو کچھ دینے کے لیے ڈگہ کی اسمگلنگ شروع کر دی اور جلد ہی اس میں اتنا منافع ملنے لگا کہ اس نے فیکٹری چھوڑ دی۔ اس نے کہا کہ دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک میں اسے اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ ''میں دیکھتا تھا کہ سفید آدمی جو اہلیت اور دماغ میں مجھ سے کمتر تھے، مجھ سے پچاس گنا زیادہ کما رہے تھے'' طویل وقفے کے بعد اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا ''میں اے این سی کارکن بھی ہوں'' اس نے بتایا کہ اس نے 1952ء کی ڈیفائنس کمپین میں بھی حصہ لیا تھا اور پورٹ ایلزبتھ میں مختلف مقامی کمیٹیوں میں خدمات انجام دی تھیں۔ میں نے اس سے مختلف شخصیتوں

کے بارے میں استفسار کیا اور لگتا تھا کہ وہ ان سب کو جانتا تھا۔ دراصل وہ ان لوگوں میں سب سے زیادہ قابل اعتبار تھا جو ڈیفائنس کمپین کے دوران جیل گئے تھے۔ جہد آزادی کے دروازے ان سب کے لیے کھلے ہیں جو ان میں سے گزرنا چاہیں۔

فوجداری مقدمے بکثرت بھگتانے والے وکیل کی حیثیت سے میں ایسی کہانیاں سننے کا عادی تھا۔ بارہا میں نے آدمیوں کو اتنے روشن دماغ اور باصلاحیت پایا تھا جتنا کہ میرا یہ ہم سفر جو گزارا کرنے کے لیے جرائم پر اتر آیا تھا۔ اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ بعض افراد موروثی طور پر یا بری پرورش کی وجہ سے جرائم پر اتر آتے ہیں مگر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ نسلی امتیاز بہت سوں کو جرائم پر آمدہ کرتا ہے جو بصورت دیگر قانون پسند شہری ہوتے۔ یہ منطقی بات ہے کہ ایک غیر اخلاقی اور غیر منصفانہ قانونی نظام اپنے قوانین وضوابط کے لیے نفرت کو جنم دیتا ہے۔

شام کو ہم پورٹ ایلزبتھ پہنچ گئے جہاں زیڈ کے میتھیوس کے بیٹے جو میتھیوس نے ہماری رہائش کا انتظام کیا۔ اگلی صبح میں ریمنڈ اصلابا، فرانسس بارڈ اور گووان امیکی سے ملا اور میری یہ امیکی سے پہلی ملاقات تھی۔ مجھے اس کے کارنامے کا علم تھا کیونکہ طالب علمی میں میں نے اس کا کتابچہ دی ٹرانسکائی ان دی میکنگ پڑھا تھا۔ وہ ٹرانسکائی میں ایک کوآپریٹو سٹور چلا رہا تھا جسے جلد ہی اس نے چھوڑ دیا اور ہفتہ وار نیو ایج کا ایڈیٹر بن گیا گووان سنجیدہ، صاحب فکر اور فصیح البیان تھا اور علم وفضل کی دنیا اور سرگرم سیاست دونوں میں طاق تھا۔ وہ کانگریس آف دی پیپل کی منصوبہ بندی کرنے میں نہایت سرگرم رہا تھا اور تنظیم میں قیادت کی اعلیٰ ترین سطح تک پہنچنے والا تھا۔

جنگل میں ببون سے ''مکالمہ''

علی الصباح میں کیپ ٹاؤن روانہ ہو گیا اور راس دوران میرا واحد ہم سفر میرا ریڈیو تھا۔ اس سے پہلے میں نے پورٹ ایلزبتھ اور کیپ ٹاؤن کے مابین سڑک کا سفر کبھی

نہیں کیا تھا اور میں میلوں تک سحر انگیز مناظر کی توقع کر رہا تھا۔ دن گرم تھا اور سڑک کے دونوں طرف گھنے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ مجھے شہر سے نکلے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ ایک بڑا سانپ سڑک پر سرسراتا نظر آیا اور گاڑی اس کے اوپر سے گزر گئی۔ میں توہم پرست نہیں اور شگون پر یقین نہیں رکھتا، مگر سانپ کی موت پر میں خوش نہ ہوا۔ میں زندہ اشیاء کو مارنا پسند نہیں کرتا، اس مخلوق کو بھی نہیں جسے دیکھ کر بعض لوگوں پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

ایک بار میں ہومانس ڈورپ سے گزر رہا تھا۔ جنگل گھنے سے گھنا ہوتا گیا اور میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ہاتھی اور ببون نامی بندر دیکھے۔ ایک بڑا ببون میرے آگے سے سڑک پار کرنے لگا تو میں نے کار روک لی۔ وہ کھڑا ہو گیا اور مجھے یوں ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگا جیسے وہ سپیشل برانچ کا سراغ رساں ہو۔ یہ عجب ستم ظریفی تھی کہ میں ایک افریقی ہوتے ہوئے بھی کہانیوں اور داستانوں کے افریقہ کو پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا ایسی خوبصورت سرزمین اور ساری ہماری پہنچ سے باہر ہو، اس پر سفید فام قابض ہوں اور ایک کالے آدمی کی رسائی اس تک نہ ہو۔ ایسے حسین علاقے میں رہنے پر میں پارلیمنٹ کا الیکشن لڑنے کو ترجیح نہیں دے سکتا تھا۔

ایک مجاہد آزادی جہاں بھی جاتا ہے، باغیانہ خیالات اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ ناسنا کے قصبے میں جو پورٹ ایلزبتھ سے ایک سو میل مغرب میں ہے، میں اردگرد کا جائزہ لینے کے لیے رک گیا۔ قصبے سے ذرا بلندی پر سڑک حد نظر تک ایک متنوع نظر پیش کرتی ہے۔ ہر طرف میں نے گھنا جنگل دور دور تک پھیلا دیکھا۔ میں نے سبزے کے ساتھ ساتھ اس امکان کا بھی جائزہ لیا کہ یہاں گوریلا فوج کے لیے کئی جگہیں ہیں جہاں نظروں سے اوجھل رہ کر وہ تربیت حاصل کر سکتی ہے۔

میں نے گوری کو خیرات دی

میں آدھی رات کیپ ٹاؤن پہنچ گیا اور وہاں دو ہفتے ٹھہرنا پڑا۔ میں نے میتھو

ڈسٹ چرچ کے رہنما عزت ماب والٹر ٹیکا کے ہاں قیام کیا مگر میرے اکثر دن جانسن انگوی ویلا اور گرین وڈ انگوٹیانا کے ساتھ گزرتے تھے۔ انگوی ویلا مغربی کیپ کی اے این سی شاخ کا چیئرمین تھا اور انگوٹیانا اس کی ایگزیکٹو کارکن تھا۔ دونوں کمیونسٹ اور وزیلیان چرچ کے سرکردہ رکن تھے۔ میں روزانہ اے این سی کے عہدیداروں سے ملنے کے لیے ووسٹر، پارل سٹیان بوش، سائمنز ٹاؤن اور ہرمانوس جیسے مقامات کا سفر اختیار کرتا۔ میں وہاں اپنے قیام کے ہر دن کی منصوبہ بندی کرتا تھا۔ اور جب میں نے پوچھا کہ اتوار کا کیا پروگرام ہے جو ٹرانسوال میں میرا کام کا دن ہوتا تھا، تو انہوں نے کہا کہ یہ گرجے جانے کے لیے مخصوص ہے۔ میں نے احتجاج کیا مگر بے سود کم از کم افریقہ میں کمیونزم اور عیسائیت میں دوری نہیں تھی۔

ایک روز جب میں شہر میں پیدل جا رہا تھا، میں نے ایک گوری عورت کو کوڑے پر مچھلی کی ہڈیاں چچوڑتے دیکھا۔ وہ غریب اور بظاہر بے گھر تھی، لیکن وہ جوان اور پر کشش تھی۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ سفید فام غریب بھی ہوتے ہیں جو افریقیوں ہی کی طرح سراپا افلاس ہوتے ہیں، لیکن کسی ایسے گورے کو میں نے شاذو نادر ہی دیکھا تھا۔ میں سڑکوں پر سیاہ فام بھکاری دیکھنے کا عادی تھا اور اب ایک گوری بھکارن کو دیکھ کر میں چونک پڑا اگرچہ میں بالعموم افریقی بھکاریوں کو خیرات نہیں دیتا تھا مگر اس عورت کو پیسے دینے کو میرا بہت جی چاہا۔ اس لمحے مجھے نسلی امتیاز کی عیاریوں کا ٹھیک ٹھیک احساس ہوا کیونکہ افریقیوں کو روزانہ جن مصائب سے گزرنا پڑتا ہے، انہیں ایک معمول خیال کیا جاتا ہے جبکہ میرا دل اس خستہ حال گوری عورت کے لیے فوراً پسیج گیا۔ جنوبی افریقہ میں غریب اور سیاہ فام ہونا ایک معمول تھا اور غریب اور سفید فام ہونا ایک سانحہ۔

’’نیو ایج‘‘ پر سیکیورٹی کی یلغار

جب میں کیپ ٹاؤن سے روانہ ہونے کی تیاری کر رہا تھا میں ’’نیو ایج‘‘ کے دفتر

بعض پرانے دوستوں سے ملنے گیا تا کہ ان کی ادارتی پالیسی پر گفت وشنید ہو جائے ''نیو ایج'' بائیں بازو کی مختلف مطبوعات پر پابندی لگنے کے بعد نکلنا شروع ہوا تھا اور یہ اے این سی کا حامی تھا۔ یہ 27 ستمبر کی صبح تھی اور جب میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا تو مجھے دفتر کے اندر غصیلی آوازوں اور فرنیچر کے گھسیٹے جانے کا شور سنائی دیا۔ میں نے فریڈ کارنی سن کی آواز پہچان لی جو اخبار کا مدیر اور اس کی روح رواں تھا۔ مجھے سیکیورٹی پولیس کی کھردری آوازیں سنائی دیں جو دفتر کی تلاشی لینے کی ذمے داری نبھا رہی تھی۔ میں خاموشی سے لوٹ آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کوئی تنہا واقعہ نہیں تھا بلکہ جنوبی افریقہ کی تاریخ میں قومی سطح پر سب سے بڑے دھاوے کا ایک حصہ تھا۔ سازش، بغاوت اور سپریشن آف کمیونزم کی خلاف ورزی کے الزام میں کوئی بھی شے ضبط کر لینے کے اختیارات سے لیس پولیس نے ملک بھر میں پانچ سو سے زیادہ افراد کے گھروں اور دفتروں کی تلاشی لی۔ جوہانس برگ میں میری دفتر کی تلاشی لی گئی اور ڈاکٹر ومروکا، فادر ہڈلسٹن اور پروفیسر میتھیوس کے گھر کھنگالے گئے۔ کیپ ٹاؤن میں میرے آخری دن پر تلاشی کی اس مہم نے اپنے منحوس سائے ڈال دیئے تھے اور یہ حکومت کی پہلے سے زیادہ جابرانہ اور نئی پالیسی پر عملدرآمد کا پہلا قدم تھا۔ اب پابندیوں کا ایک نیا راؤنڈ شروع ہونے کا امکان تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں بھی ان کی زد میں آؤں گا۔ اس شام عزت مآب ٹیکا اور ان کی بیوی نے بہت سے لوگوں کو فہمائش کی کہ وہ مجھے الوداع کہنے آئے ہم ان لوگوں کی بہتری کے لیے دعا کرنے کے لیے جھک گئے جن کے گھروں پر پولیس نے دھاوے بولے تھے۔ میں اپنے پسندیدہ وقت یعنی تین بجے قبل از فجر روانہ ہوا اور آدھ گھنٹے بعد میں کمبرلے کی سڑک پر جا رہا تھا۔ کمبرلے کان کنی کے لیے مشہور قصبہ تھا جہاں پچھلی صدی میں ہیروں کا کاروبار شروع ہو گیا تھا۔

مجھے ایک رات ڈاکٹر آرتھر لے ٹیلی کے ہاں ٹھہرنا تھا۔ آرتھر جو بعد میں اے این

سی کے ٹریژرر جنرل بنے ایک سمجھدار میڈیکل پریکٹیشنر تھے۔ مجھے سردی لگ گئی تھی، چنانچہ میرے وہاں پہنچنے پر علیک سلیک ہوئی اور پھر انہوں نے مجھے بستر پر لٹا دیا۔ وہ ایک بہادر اور مخلص آدمی تھے اور ڈیفائنس کمپین کے دوران وہ ڈیفائرز کے ایک چھوٹے گروہ کی قیادت کرتے ہوئے جیل گئے تھے۔ یہ ایک ڈاکٹر کے لیے ایک ایسے قصبے میں خطرناک اقدام تھا جہاں سیاہ فام سیاسی سرگرمیوں میں شاذونادر ہی حصہ لیتے تھے۔ جوہانس برگ میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگوں کا تعاون حاصل ہو جاتا ہے جو ایک سی خطرناک سرگرمیوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ لیکن کمبرلے جیسے قدامت پرست مقام پر، جہاں پر نقد و نظر کے لیے آزاد پریس تھا نہ عدلیہ، ایسے اقدام کے لیے سچی دلیری درکار ہوتی ہے۔ ڈیفائنس کمپین کے دوران یہ واقعہ کمبرلے ہی میں پیش آیا تھا کہ اے این سی کے ایک سرکردہ رکن کو مقامی مجسٹریٹ کی طرف سے کوڑے لگوائے گئے تھے۔

مجھے زکام ہونے کے باوجود آرتھر نے اگلی شام مجھے اپنے گھر میں اے این سی کے ایک اجتماع سے خطاب کرنے کی اجازت دے دی۔ اگلی صبح تین بجے میں روانگی کی تیاری کر رہا تھا مگر آرتھر اور ان کی اہلیہ نے اصرار کیا کہ ناشتہ کر کے جاؤں۔ ان کی یہ خواہش میں رد نہ کر سکا۔ یوں جوہانس برگ واپسی کے سفر میں خاصا وقت لگا اور رات کے کھانے سے کچھ پہلے میں گھر پہنچ گیا۔ میرے بچوں نے پر جوش نعروں سے میرا استقبال کیا جو یہ جانتے تھے کہ ان کے ابو ان کے لیے تحفے ضرور لائیں گے۔ میں نے ایک ایک کر کے انہیں تحائف تھما دیئے جو میں نے کیپ ٹاؤن میں خریدے تھے۔ بچوں نے اس دورے کے بارے میں جو سوالات کیے ان کے میں نے تحمل سے جواب دیئے۔ اگرچہ یہ حقیقی تعطیل تو نہیں تھی، تاہم مجھ پر اس کا خوشگوار اثر ہوا تھا۔ میں اپنے وجود میں ایک نئی توانائی محسوس کر رہا تھا اور سیاسی جنگ کا مورچہ سنبھالنے کے لیے پھر تیار تھا۔

اپنی واپسی کے فوراً بعد میں نے اے این سی کی ورکنگ کمیٹی کو اپنے دورے کی رپورٹ دی۔ ان کو سب سے بڑی تشویش یہ تھی کہ کانگریس الائنس حکومت کے منصوبوں کو روکنے کے لیے کافی مضبوط ہے یا نہیں۔ میں نے انہیں اچھی خبر نہیں دی تھی۔ میں نے کہا کہ ٹرانسکائی ایک منظم اے این سی علاقہ نہیں اور اے این سی کا وہاں تھوڑا بہت جو اثر و رسوخ ہے سیکیورٹی پولیس اسے آناً فاناً ہوا میں اڑا دے گی۔ میں نے ایک متبادل حل پیش کیا جس کے بارے میں مجھے پتہ تھا کہ یہ غیر مقبول ہو گا۔ اے این سی نئے بنتو اتھارٹیز ڈھانچے میں شامل کیوں نہ ہو جائے تاکہ عوام سے اس کے رابطے کا ذریعہ برقرار رہے۔ وقت گزرنے پر یہ شرکت ہمارے اپنے نظریات اور پالیسیوں کے لیے ایک پلیٹ فارم ثابت ہو گی۔

نسلی امتیاز پر مبنی نظام میں کسی نوع کی شرکت کے مشورے کی شدید مخالفت ہوئی۔ اپنے ابتدائی دنوں میں میں نے بھی اس کی سرتوڑ مخالفت کی تھی۔ لیکن میرا ملکی شعور یہ تھا کہ نسبتاً بہت کم لوگ جدوجہد آزادی میں شریک ہونے کو تیار ہیں۔ ہمیں عوام سے ان کی شرائط پر روابط رکھنے چاہئیں خواہ بظاہر اس کا مطلب تعاون ہی نکلتا ہو۔ میرا نظریہ یہ تھا کہ ہماری جماعت کو ایک بڑا خیمہ ہونا چاہیے جس کے اندر اتنے زیادہ لوگ آجائیں جتنے ممکن ہوں۔

تاہم اس وقت میری رپورٹ کو ایک اور ہمہ نوع رپورٹ کی وجہ سے کم اہمیت دی گئی۔ بنتو علاقوں کی سماجی و اقتصادی ترقی کے لیے ٹام لنسن کمیشن کی رپورٹ کی اشاعت نے قومی سطح پر ایک بحث مباحثے کا آغاز کر دیا تھا۔ اس سرکاری کمیشن نے نام نہاد بنتو ایریاز یا بنتوستان کی ترقی کے لیے ایک منصوبہ تجویز کیا تھا۔ یہ دراصل ''جداگانہ ترقی'' یا گرینڈ اپارٹ ہائڈ (عظیم نسلی امتیاز) کا ایک بلیو پرنٹ تھا۔

بنتوستان سسٹم کا تصور وزیر مقامی امور ڈاکٹر ایف ایچ وروورڈ نے جنوبی افریقہ کی نسلی پالیسیوں پر عالمی تنقید کو خاموش کرنے کے لیے پیش کیا تھا لیکن اس کے ساتھ

ہی اس کا ایک مقصد نسلی امتیاز کو باقاعدہ جواز بخشتا تھا۔ بنتوستان یا ریزروز جیسا کہ انہیں پکارا جاتا تھا، جداگانہ نسلی محصور علاقے یا افریقی شہریوں کے لیے ہوم لینڈز ہوتے۔ ورووَرڈ کا کہنا تھا افریقیوں کو ان ریزروز میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے خطوط پر ترقی کر سکیں۔ اس نظریئے کا مقصد جاری حالت کو برقرار رکھنا تھا جس میں تیس لاکھ سفید فام 87 فیصد زمین کے مالک تھے اور اسی لاکھ افریقیوں کو بقیہ 13 فیصد علاقے میں دھکیلا گیا۔

یہ رپورٹ مختلف نسلوں کی باہم آمیزش کے نظریئے کو مسترد کر کے کالوں اور گوروں کی جداگانہ ترقی کی پالیسی کی سفارش کرتی تھی۔ اس میں افریقی علاقوں کی صنعتکاری کی سفارش کرتے ہوئے یہ کہا گیا تھا کہ ہر وہ ترقیاتی پروگرام جو افریقیوں کو ان کے اپنے علاقے میں ترقی کے مواقع فراہم نہیں کرتا، ناکامی سے دوچار ہو گا۔ کمیشن کا کہنا تھا کہ افریقیوں کی موجودہ جغرافیائی ہیبت بڑی نازک ہے، لہٰذا افریقی علاقوں کو ایک وحدت میں سمونے کے بجائے بڑے نسلی گروہوں کے ساتھ ''تاریخی منطق'' ہوم لینڈز قائم کیے جائیں۔

لیکن کمیشن کے تجویز کردہ الگ الگ بنتوستانوں کی تخلیق مضحکہ خیز تھی۔ مجوزہ ہوم لینڈ سسٹم کا شو پیس ٹرانسکائی تین جداگانہ جغرافیائی بلاکوں میں تقسیم ہونا تھا سوازی بنتوستان لیبوا میں سے ہر ایک کے تین ٹکڑے ہونے تھے، گازنکولے کے چار، سکائی کے سترہ، بوپھوتسوانہ کے انیس اور کوازولو کے انتیس۔ نیشنلسٹ حکومت عوام کی جانوں سے ایک گورکھ دھند تشکیل دے رہی تھی۔

ہوم لینڈ سسٹم تشکیل دینے کا حکومتی مقصد یہ تھا کہ ٹرانسکائی اور دوسرے افریقی علاقے سفید صنعت کے لیے بدستور سستی لیبر فراہم کرتے رہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک پنہاں مقصد یہ تھا کہ اے این سی اور جہدِ آزادی کی اپیل کو رائیگاں کرنے کے لیے ایک افریقی متوسط طبقہ وجود میں لایا جائے۔

اے این سی نے ٹام لنسن کمیشن کی بعض زیادہ لبرل سفارشات کے باوجود اس کی رپورٹ کی مذمت کی۔ جیسا کہ میں نیوالیوونگا کو بتایا، جداگانہ ترقی ایک ایسے مسئلے کا مصنوعی حل تھا جسے حل کرنے کے لیے گوروں کے ذہن میں کوئی نقشہ نہیں تھا۔ آخر کار حکومت نے رپورٹ منظور کر لی مگر اس کی بہت سی سفارشات یہ کہہ کر مسترد کر دیں کہ یہ زیادہ ترقی پسند ہیں۔

امنڈتی تاریکی اور سرکاری پالیسیوں کے بارے میں میری قنوطیت (Pessimism) کے باوجود میں مستقبل کے متعلق غور و فکر کر رہا تھا۔ میرا ہمیشہ یہ تصور رہا ہے کہ انسان کی جائے پیدائش کے نزدیک اس کا ایک مکان ہونا چاہیے جہاں امن و سکون سے وقت گزار سکے جو اسے اور کہیں میسر نہیں آتا۔

والٹر کے ہمراہ میں نے ٹرانسکائی کا سفر کیا۔ ہم دونوں امتاتا اور ڈربن دونوں جگہ جہاں کہیں بھی گئے اے این سی کے مختلف لوگوں سے ملے۔ ایک بار پھر سپیشل برانچ پولیس ہمارا بے ڈھب تعاقب کرنے لگی۔ ڈربن میں ہم نٹال انڈین کانگریس کے اپنے دوستوں سے ملے تاکہ علاقے میں سیاسی سرگرمیوں کو بڑھاوا دیا جا سکے۔ امتاتا میں والٹر کی مدد سے سی کے ساکوی کو ایک قطعہ زمین کی قیمت کی ادائیگی کر دی جو شہر میں اس کی ملکیت تھا ساکوی بھنگا کا ایک رکن تھا اور مقامی نمائندہ کونسل میں خدمات انجام دے چکا تھا۔ ہماری موجودگی میں اس نے ایک واقعہ بیان کیا جو گزشتہ ہفتے ساباتا کے عظیم مقام ٹھمبین میں پیش آیا تھا جہاں تھوستانوں کے تعارف کے حوالے سے سرکاری حکام اور چیفس کا ایک اجلاس جاری تھا۔ بہت سے چیفس نے سرکاری پالیسی پر تنقید کی اور مجسٹریٹ پر زبانی حملے کیے۔ یوں اجلاس گرما گرمی میں ختم ہو گیا۔ اس سے تھو اتھارٹیز ایکٹ پر بنیادی اعتراضات ہمارے علم میں آئے۔

مارچ 1956ء میں نسبتاً آزادی کے کئی ماہ بعد، مجھے اپنی تیسری نظر بندی کے

احکام موصول ہوئے جنہوں نے پانچ سال کے لیے مجھے جوہانسبرگ میں پابند کر دیا اور اتنے ہی عرصے کے لیے مجھے جلسے جلوسوں میں شرکت سے روک دیا گیا اگلے ساٹھ ماہ تک میں ایک ہی ضلع میں نظر بند رہا اور اس دوران وہی گلیاں، افق پر سونے کی کانوں کا وہی ملبہ اور وہی آسمان دیکھتا رہا۔ اب مجھے یہ جاننے کے لیے کہ جوہانسبرگ سے باہر کیا ہو رہا ہے، اخبارات اور لوگوں کی فراہم کردہ اطلاعات پر گزارا کرنا تھا اور ایک یہ معاملہ ایسا تھا جسے میں کبھی کسی طور پر پسند نہیں کرتا تھا۔

لیکن اس بار اپنی نظر بندیوں کے متعلق میرا رویہ یکسر بدل گیا تھا۔ جب مجھے پہلی بار نظر بند کیا گیا تھا، میں نے اپنے ایزا رسانوں کے اصول وضوابط کی پابندی کی۔ اب میں نے ان پابندیوں کے خلاف اپنے اندر ایک نفرت پیدا کر لی تھی۔ میں جہد آزادی میں شرکت اور اپنی سیاسی سرگرمیوں کے دائرہ کار کو متعین کرنے کا اختیار اس دشمن کے ہاتھ میں دینے کو تیار نہیں تھا جس کے خلاف میں لڑ رہا تھا۔ اپنے مخالفوں کو یہ اختیار دینا ایک طرح کی شکست تھا، چنانچہ میں نے عزم کر لیا کہ میں اپنا جیلر خود بنوں گا۔ جلد ہی جوہانس برگ میں ایک تلخ جھگڑے میں ثالثی کی ذمہ داری مجھ پر آن پڑی۔ فریقین بری طرح محاذ آرا تھے اور دونوں میری حمایت کے خواہاں تھے۔ ہر فریق تنظیم کے اندر بعض جائز شکایات رکھتا تھا اور ہر شکایت دوسرے کے مفاد سے ٹکراتی تھی۔ شدید تو تکار کے بعد تند و تیز لڑائی کا خطرہ پیدا ہو چلا تھا، چنانچہ میں نے معاملہ ٹھنڈا کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ یہ جھگڑا ڈونلڈسن آرلینڈو کمیونٹی سنٹر کے باکسنگ اینڈ ویٹ لفٹنگ کلب کا تھا جہاں میں ہر شام ورزش کرنے جاتا تھا۔

میں 1950ء میں اس کلب میں شامل ہوا تھا اور تقریباً ہر فارغ شام کمیونٹی سنٹر میں گزارتا تھا گزشتہ چند سال سے میں اپنے بیٹے تھیمبی کو بھی کلب لے جاتا تھا اور 1956ء تک جب وہ دس برس کا تھا، ایک پرشوق مگر دھان پان پیپر ویٹ باکسر بن

چکا تھا۔ کلب کے منتظم جوہانس مولوتسی تھے اور اس کی رکنیت پیشہ ور اور شوقیہ دونوں طرح کے باکسروں پر مشتمل تھی نیز اپنے پیشے سے مخلص مختلف ویٹ لفٹرز بھی یہاں آتے تھے۔ ہمارا سٹار باکسر جیری مولوئی بعد میں ٹرانسوال لائٹ ویٹ چیمپئن اور نیشنل ٹائٹل کے لیے نمبرون کھلاڑی بنا۔

جمنازیم کا ساز و سامان نہایت ادنیٰ تھا۔ ہم ایک رنگ (Ring) کا بار نہیں اٹھا سکتے تھے اور سیمنٹ کے فرش پر ورزش کرتے تھے جو اس وقت بے حد خطرناک ثابت ہوتا جب ایک باکسر ناک ڈاؤن ہو جاتا۔ ہمارے پاس ایک سنگل پنچ بیگ اور باکسنگ کے دستانوں کے چند جوڑے تھے اور ہمیں ان ہی پر فخر تھا۔ ہمارے پاس دوائیں تھیں نہ سپیڈ بال، مناسب باکسنگ ٹرنک تھے نہ جوتے اور نہ ماؤتھ گارڈز ہیڈ گارڈ تو کسی کے پاس بھی نہیں تھا سامان کی کمی کے باوجود اس جمنازیم نے بنٹام ویٹ چیمپئن آف ساؤتھ افریقہ ایرک انٹ سیلے اور ٹرانسوال فلائی ویٹ چیمپئن فریڈی انگیڈی جیسے کھلاڑی پیدا کیے۔ فریڈی، منڈیلا اینڈ ٹیمبو میں میرے معاون کے طور پر کام کرتا رہا تھا۔ مل ملا کر ہمارے ہاں شاید بیس یا تیس ارکان تھے۔

اگر چہ میں فورٹ ہیئر میں کچھ باکسنگ کرتا رہا تھا مگر جوہانسبرگ آ کر میں اس میں بڑے شوق سے حصہ لینے لگا۔ میں کوئی بڑا نمایاں باکسر کبھی نہ بن سکا۔ میں ہیوی ویٹ ڈویژن میں تھا اور نہ تو سپیڈ کی کمی پوری کرنے کے لیے میرے پاس طاقت تھی اور نہ طاقت کی کمی پوری کرنے کے لیے سپیڈ میں باکسنگ میں مار سے اتنا لطف اندوز نہیں ہوتا تھا جتنا کہ اس کی سائنس سے میری دلچسپی اس میں تھی کہ کس طرح ایک باکسر اپنے آپ کو بچانے کے لیے اپنے جسم کو ادھر ادھر حرکت دیتا ہے، وہ حملہ کرنے اور پسپا ہونے دونوں کے لیے کیا اسٹراٹیجی اختیار کرتا ہے اور ایک میچ میں خود کو کیسے پیش کرتا ہے۔ باکسنگ مساویانہ کھیل ہے۔ رنگ میں عہدہ، عمر، رنگ اور دولت کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ جب آپ اپنے حریف کے گرد چکر کاٹ رہے ہوتے ہیں

اوراس کی توانائیوں اور کمزوریوں کو ٹھونک بجا کر دیکھتے ہیں تو آپ کی نگاہ اس کے رنگ یا سماجی مرتبے پر نہیں ہوتی۔ سیاست میں داخل ہونے کے بعد میں نے کوئی حقیقی فائٹنگ نہیں کی۔ میری بڑی دلچسپی ورزش میں تھی۔ میں نے ذہنی تناؤ اور دباؤ سے چھٹکارا پانے کے لیے سخت ورزش کو بہترین ذریعہ پایا۔ صبر آزما کسرت کے بعد میں اپنے آپ کو ذہنی اور جسمانی طور پر ہلکا پھلکا محسوس کرتا تھا۔ یہ اپنے آپ کو ایک ایسے شغل میں ڈالنے والی بات تھی جو آزادی کی جدوجہد سے ہٹ کر تھا ایک شام کی ورزش کے بعد میں اگلی صبح کو اٹھتا تو اپنے آپ کو مضبوط، چاق و چوبند اور فائٹ کے لیے پھر سے تیار پاتا۔

میں پیر سے جمعرات تک ہر شام ڈیڑھ گھنٹہ جمنازیم میں گزارتا۔ اپنے کام سے سیدھا گھر جاتا، تھیمبی کو ساتھ لیتا اور ہم کمیونٹی سنٹر چلے جاتے۔ وہاں ایک گھنٹہ ورزش کرتے جس میں روڈ ورک، رسی کودنا، شیڈو باکسنگ شامل ہوتے۔ پھر پندرہ منٹ کا باڈی ورک، نیزہ بازی اور کچھ ویٹ لفٹنگ ہوتی۔ اگر کوئی مقابلہ یا ٹورنا منٹ ہوتا تو ٹریننگ ٹائم دو اڑھائی گھنٹے تک بڑھا لیتے۔

ہم دونوں باری باری ٹریننگ سیشن کی قیادت کرتے تا کہ قیادت، اقدام اور خود اعتمادی کی صفات پیدا ہوں۔ تھیمبی ان سیشنوں کی قیادت کر کے بہت لطف اندوز ہوتا۔ جن راتوں میں میرا بیٹا انچارج ہوتا میرے لیے معاملہ قدرے مشکل ہوتا کیونکہ وہ نکتہ چینی کرنے پر مجھے سنگل آؤٹ کر دیتا جب کبھی میں سست پڑتا تو وہ مجھے آڑے ہاتھوں لیتا۔ جمنازیم میں ہر کوئی مجھے ''چیف'' کہہ کر پکارتا تھا مگر تھیمبی مجھے یہ اعزاز دینے سے احتراز کرتے ہوئے ''مسٹر منڈیلا'' کہہ کر بلاتا اور کبھی کبھی جب وہ اپنے ''بوڑھے آدمی'' سے ہمدردی محسوس کرتا تو مائی برا (My Bra) کہتا جو ٹاؤن شپ کی بولی میں ''مائی برادر'' کے معنی دیتا تھا۔ جب کبھی وہ مجھے بیکار کھڑے دیکھتا تو سختی سے کہا ''مسٹر منڈیلا! آج شام آپ ہمارا وقت ضائع کر رہے

ہیں اگر آپ ساتھ نہیں دے سکتے تو گھر جا کر بوڑھی عورت کے پاس کیوں نہیں بیٹھتے؟'' ہر کوئی ان چوٹوں سے خاصا لطف اندوز ہوتا اور میں اپنے بیٹے کو اتنا خوش اور پر اعتماد دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سماتا

کلب کا پر تعاون ماحول اس وقت درہم برہم ہو گیا جب سکپر مولوتی اور جیری مولوئی کے مابین جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ جیری اور دوسرے باکسر محسوس کرتے تھے کہ سکپر کلب پر کافی توجہ نہیں دے رہا۔ سکپر ایک ماہر کوچ تھا مگر وہ اپنا علم آگے بانٹنے کے لیے شاذونادر ہی موجود ہوتا۔ وہ باکسنگ کی داستانوں کا مورخ تھا اور 1915ء میں ہوانا میں جیک جیکسن کی مشہور فائٹ کے تمام چھبیس راؤنڈ بیان کر سکتا تھا جب دنیا کے پہلے بلیک ہیوی ویٹ چیمپئن نے اپنا ٹائٹل کھو دیا تھا۔ لیکن سکپر صرف میچ یا ٹورنامنٹ شروع ہونے سے پہلے دکھائی دیتا تھا تا کہ اپنی تھوڑی سی فیس وصول کر سکے جو اس کا حق تھی۔ خود مجھے جیری کے نقطہ نظر سے اتفاق تھا مگر میں نے قضیہ چکانے کی پوری پوری کوشش کی تا کہ مفاہمت کی فضا قائم رہ سکے۔ آخر میں تو میرا بیٹا بھی سکپر پر جیری کی تنقید سے اتفاق کرنے لگا اور اب میں کلب کی ٹوٹ پھوٹ کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

جیری کی قیادت میں باکسروں نے دھمکی دی کہ وہ الگ ہو کر اپنا کلب قائم کر لیں گے۔ میں نے سب ارکان کا ایک اجلاس بلایا جو اس لحاظ سے ایک پر بہار اجلاس تھا کہ اس کی کارروائی سیسوتھو، زولو، ژوسا اور انگریزی زبانوں میں ہو رہی تھی۔ سکپر نے باغی باکسروں پر حملہ آور ہوتے ہوئے شیکسپیئر کا بھی حوالہ دیا اور جیری پر ڈبل کراسنگ کا الزام لگایا جیسے بروٹس نے سیزر کو دغا دیا تھا ''بروٹس اور سیزر کون ہیں؟'' میرے بیٹے نے پوچھا اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا کسی نے کہا ''کیا وہ مر نہیں گئے؟'' اس پر سکپر بولا ''ہاں مگر بے وفائی کی حقیقت تو زندہ ہے۔''

اجلاس کسی فیصلے کے بغیر برخاست ہو گیا اور باکسر ایک اور جگہ چلے گئے جبکہ وہیٹ

لفٹر زکمیونٹی سنٹر ہی میں رہے۔ میں نے باکسروں کا ساتھ دیا اور علیحدگی کے پہلے چند ہفتے ہم نے ایک ایسی جگہ مشق کی جو ایک مجاہد آزادی کے لیے تکلیف دہ تھی، یہ ایک پولیس جمنازیم تھا۔ اس کے بعد اینگلی کن چرچ نے آرلینڈ و ایسٹ میں ہمیں معقول کرائے پر جگہ دے دی اور ہم نے سائمن (امشینگو) شابالا کی رہنمائی میں مشق شروع کر دی جو بعد میں اے این سی کے سرکردہ زیر زمین مجاہدین آزادی بن گئے۔

نئی جگہ کی سہولتیں پہلی جگہ سے بہتر نہ تھیں اور کلب کی تشکیل نو کبھی نہ کی گئی۔ تمام سیاہ فام اتھلیٹوں اور فنکاروں کی طرح افریقی باکسر غربت اور نسل پرستی کی دوہری رکاوٹوں کے شکنجے میں گرفتار تھے۔ ایک افریقی باکسر جو رقم کماتا تھا وہ بیشتر کھانے، کرائے اور کپڑوں پر خرچ ہو جاتی اور جو کچھ بچتا وہ باکسنگ کے ساز و سامان اور تربیت پر اٹھ جاتا۔ اسے کسی سفید باکسنگ کلب سے منسلک ہونے کی خواہش ہوتی تو انکار کر دیا جاتا جبکہ فرسٹ ریٹ ورلڈ کلاس باکسر بننے کے لیے ضروری سامان اور ٹرینر سفید کلبوں ہی میں تھے۔ گورے پیشہ ور باکسروں کے برعکس افریقہ پیشہ ور باکسروں کو فل ٹائم کام کرتے تھے۔ نیزہ بازی کے پارٹنر کم ہی تھے اور انہیں معاوضہ بھی کم ملتا تھا لہٰذا مناسب ڈرل اور مشق کے بغیر ان کی کارکردگی بڑی متاثر ہوتی تھی، پھر بھی بہت سے افریقی کھلاڑی ان مشکلات پر قابو پانے کے قابل ہو جاتے اور بڑی کامیابی حاصل کرتے۔ ایلجا (میسٹر) موکونی، اینوخ (سکول بوائے)، انہلاپو، کانیگرو موٹو، رنگ میں اپنا سٹائل رکھنے والے عظیم کھلاڑی لیوی (گولڈن بوائے) مادی، انکوسانا امغاجی، ماکیڈ موفوکنگ اور نارمن سیکلگا پانی جیسے باکسروں نے عظیم فتوحات حاصل کیں جبکہ ہمارے عظیم ترین ہیرو جیک تولی نے برٹش اینڈ ایمپائر فلائی ویٹ ٹائٹل جیتا وہ اس بات کی سب سے شاندار مثال تھا کہ اگر افریقی باکسروں کو موقع دیا جائے تو وہ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

------------ اختتام ------------ حصہ اول ------------

کے لیے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ پولیس نے دروازوں، الماریوں، خانوں اور ہر اس جگہ کی تلاشی لی جہاں ممنوعہ اشیاء پوشیدہ ہو سکتی تھیں 45 منٹ بعد روسو نے آمدم برسر مطلب کے لہجے میں کہا ''منڈیلا! ہمارے پاس تمہاری گرفتاری کا وارنٹ ہے میرے ساتھ چلو'' میں نے وارنٹ پر ایک نگاہ ڈالی اور یہ الفاظ دکھائی دیئے:

Hoog verraad High Treason (صریح بغاوت)

میں ان کے ساتھ پولیس گاڑی کی طرف چل پڑا۔ اپنے بچوں کے سامنے گرفتار ہونا کوئی خوشگوار بات نہیں اگرچہ گرفتار ہونے والا یہ جانتا ہو کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ درست ہے۔ لیکن بچے صورت حال کی پیچیدگی کو نہیں سمجھتے۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے والد کو گورے حکام کسی وضاحت کے بغیر ساتھ لے جا رہے ہیں۔

روسو گاڑی چلا رہا تھا اور میں ہتھکڑی کے بغیر، فرنٹ سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کے پاس شہر میں میرے دفتر کی تلاشی کا وارنٹ تھا اور ہم دو سپاہیوں کو راستے میں اتار کر اسی طرف جا رہے تھے۔ ہم ایک تنہا سڑک پر جا رہے تھے جو غیر آباد علاقے سے گزرتی تھی۔ میں نے روسو سے کہا کہ آپ کو مجھے تنہا اور ہتھکڑی کے بغیر لے جانے میں بہت اعتماد ہوگا۔ وہ خاموش رہا میں نے کہا ''اگر میں آپ پر قابو پا کر بے بس کر دوں تو کیا ہوگا؟''

روسو نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا ''تم آگ سے کھیل رہے ہو، منڈیلا''

''آگ سے کھیلنا میرا کھیل ہے'' میں نے جواب دیا

''اگر تم ایسی ہی باتیں کرتے رہے تو مجھے تمہیں ہتھکڑی لگانی پڑے گی'' اس نے دھمکی دی۔

''اور اگر میں انکار کر دوں تو؟''

یہ تند و تیز مکالمہ چند منٹ جاری رہا لیکن جب ہم آباد علاقے میں لینگاٹ پولیس

اسٹیشن کے پاس پہنچے، روسو نے مجھ سے کہا ''منڈیلا! میں نے تم سے اچھا سلوک کیا ہے اور مجھے امید ہے تم بھی ایسا ہی کرو گے۔ میں تمہارے مذاق ہرگز پسند نہیں کرتا۔''

پولیس اسٹیشن میں تھوڑی دیر رک کر روسو نے ایک اور پولیس آفیسر کو ساتھ لیا اور میرے دفتر کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے پینتالیس منٹ تک اس کی تلاشی لی۔ وہاں سے مجھے وہ مارشل سکوائر لے گئے جہاں سرخ اینٹوں سے بنی جوہانس برگ جیل ہے جس میں میں نے 1952ء کی خلاف ورزی مہم کے دوران چند راتیں گزاری تھیں۔ میرے بہت سے ساتھی پہلے ہی وہاں موجود تھے جنہیں اس صبح سویرے گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔ اگلے چند گھنٹوں کے دوران اور دوست اور ساتھی وارد ہونے لگے۔ یہ وہ ''ہونجا'' تھا جس کا منصوبہ حکومت عرصے سے بنا رہی تھی کوئی دی سٹار کے سہ پہر ایڈیشن کی ایک کاپی چھپا کر اندر لے آیا اور اس کی شہ سرخیوں سے پتہ چلا کہ پولیس دھاوا ملک گیر سطح پر ہوا تھا اور کانگریس الائنس کے تمام بڑے بڑے لیڈر سنگین غداری اور حکومت کا تختہ الٹنے کی مبینہ سازش کے الزام میں گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ جنہیں ملک کے مختلف حصوں سے گرفتار کیا گیا تھا چیف لوتھولی، مونٹی نائیکر، ریگی سٹمپر، للیان انگوئی، پائٹ بے لیولڈ، انہیں فوجی طیاروں کے ذریعے جوہانس برگ لایا گیا تھا جہاں ان پر مقدمہ چلنا تھا کل 144 افراد گرفتار کیے گئے تھے۔ اگلے دن ہمیں عدالت میں پیش کر کے فرد جرم سنا دی گئی۔ ایک ہفتے بعد والٹر سیسولو اور مزید گیارہ افراد گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتار شدگان میں 105 افریقی تھے، 21 ہندوستانی، 23 گورے اور 7 رنگ دار اے این سی کی نظر بند اور غیر نظر بند تقریباً پوری ایگزیکٹو قیادت گرفتار کر لی گئی تھی۔ آخر کار حکومت حرکت میں آ گئی تھی۔

جلد ہی ہمیں واپس جوہانسبرگ جیل لے گئے جس کو عرف عام میں قلعہ (Fort)

کہا جاتا تھا۔ یہ قلعہ نما عمارت شہر کے وسط میں ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ ہم اندر داخل ہوئے اور ایک آؤٹ ڈور چوکور عمارت میں لے جا کر حکم دیا گیا کہ سارے کپڑے اتار دیں اور دیوار کے ساتھ قطار بنالیں۔ ہم کو ایک گھنٹے سے زیادہ وہاں اس حالت میں کھڑے رہنے پر مجبور کیا گیا کہ ہم سرد ہوا میں کانپ رہے تھے اور سب اپنی اس کیفیت پر دلگرفتہ تھے پادری، پروفیسر ڈاکٹر، وکلاء، تاجر، درمیانی اور بڑی عمر کے افراد جن سے عموماً عزت واحترام کا سلوک کیا جاتا تھا۔ جب میں نے اپنے اردگرد افراد کا جائزہ لیا تو کبیدہ خاطر ہونے کے باوجود میں ایک قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکا۔ یہاں پہلی مرتبہ اس کہاوت کی سچائی مجھ پر آشکار ہوئی کہ (Cloths make the man) کپڑوں سے آدمی بنتا ہے۔ اگر عمدہ اجسام اور متاثر کن بدن ایک لیڈر بننے کے لیے لازم تھے تو میرے سامنے ہم میں سے بہت کم اس معیار پر پورے اترتے تھے۔

آخر کار ایک سفید ڈاکٹر نمودار ہوا اور اس نے ہم سے پوچھا کہ ہم میں سے کوئی بیمار تو نہیں کسی نے کسی بیماری کی شکایت نہ کی اب ہمیں کپڑے پہننے کا اذن ملا اور پھر دو بڑی کوٹھڑیوں میں لے گئے جن کا فرش سیمنٹ کا مگر فرنیچر کوئی نہ تھا۔ کوٹھڑیوں میں حال ہی میں پینٹ کیا گیا تھا اور وہ پینٹ کی بو سے بھری ہوئی تھیں۔ ہر ایک کو تین پتلے کمبل اور سیسل گھاس کی ایک چٹائی دی گئی ہر کوٹھڑی میں ایک فرشی لیٹرین تھی جو کسی آڑ کے بغیر تھی کہا جاتا ہے کہ کسی قوم کو اس وقت تک حقیقی طور پر جان لینے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا جب تک اس کی جیلوں میں جانے کا تجزیہ نہ ہو۔ ایک قوم کو اس سے نہیں پرکھا جا سکتا کہ وہ اپنے اعلیٰ ترین شہریوں سے کیا سلوک کرتی ہے بلکہ پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ وہ اپنے کمترین شہریوں سے کیا برتاؤ کرتی ہے اور جنوبی افریقہ کی گوری حکومت تو جیلوں میں بند افریقیوں سے جانوروں کا سا سلوک کرتی تھی۔

ہم قلعے میں دو ہفتے رہے اور مشکلات کے باوجود ہمارے جذبے انتہائی بلند رہے۔ ہمیں اخبارات کی اجازت مل گئی اور ہم احساس تشکر کے ساتھ غم و غصہ کی لہر کی خبریں پڑھتے تھے جو ہماری گرفتاریوں سے ابھری تھی۔ پورے جنوبی افریقہ میں احتجاجی جلسے اور مظاہرے ہو رہے تھے لوگ بینر اور پلے کارڈ اٹھائے نکلتے تھے جن پر لکھا ہوتا

"We stand by our Leaders"

(ہم اپنے قائدین کے ساتھ ہیں)

دنیا بھر میں ہماری قید و بند پر ہونے والے احتجاج کی خبریں ہم پڑھتے تھے۔

ہماری اجتماعی کوٹھڑی دور دراز سے لائے گئے مجاہدین آزادی کے لیے ایک طرح کا کنونشن بن گئی۔ ہم میں سے کئی شدید پابندیوں کے تحت رہ رہے تھے اور ہمارے لیے باہمی ملاقات اور گفت و شنید کے مواقع ناپید تھے۔ اب ہمارے دشمن نے ہم سب کو ایک ہی چھت کے نیچے لا جمع کیا تھا اور اس طرح ان برسوں میں کانگریس الائنس کی سب سے بڑی اور طویل ترین میٹنگ کا اہتمام ہو گیا جس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ نوجوان لیڈر معمر لیڈروں سے ملے جن کے بارے میں پہلے وہ صرف اخبارات میں پڑھتے تھے۔ نٹال کے لوگ ٹرانسوال کے آدمیوں میں گھل مل گئے۔ ہم نے مقدمے کے انتظار میں دو ہفتے گزارے تھے اور اس دوران ہم تبادلہ خیال کرتے اور ایک دوسرے کو اپنے تجربات سے آگاہ کرتے رہے۔

جیل میں رقص

ہر روز ہم سرگرمیوں کا ایک پروگرام سامنے رکھتے۔ پیٹرک مولوا اور پیٹر انتھائٹ، جو دونوں نمایاں یوتھ لیگی تھے، جسمانی ورزش کا اہتمام کرتے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو کا شیڈول طے ہوتا اور ہم اے این سی اور امریکی نیگروؤں دونوں کی تاریخ پر وفیسر میتھیوس کی زبانی سنتے۔ ڈبی سنگھ ایس اے آئی سی کی تاریخ پر لیکچر دیتا۔ آرتھر

لے ٹیلی مقامی بیسیوں کو زیر بحث لاتا جبکہ عزت ماب جیمز کالالا افریقی موسیقی پر گفتگو کرتا اور اپنے خوبصورت اونچے سروں میں گاتا۔ ہر روز ووئی سیلی مینی، جسے بعد میں سرکار نے سیاسی ''جرائم'' کی بنا پر پھانسی چڑھادیا آزادی کے گیت گانے والے گروہ کی رہنمائی کرتا ایک مقبول ترین گیت تھا:

Nans, indod, emnyama strijdom, Bhasobha''

n a n s

''indodemnyama strijdom

(کالا آدمی آ گیا، سٹرج ڈم! کالے آدمی سے ہوشیار، سٹرج ڈم!)

ہم اپنے پھیپھڑوں کا زور لگا کر گاتے اور اس طرح ہمارے جذبے جواں رہتے۔

ایک بار مسابالالا ینگوانے (جو زیادہ تر ایم بی ینگوا کے نام سے معروف تھا اور ایک زولو مزدور کا بیٹا اور نٹال اے این سی کا صوبائی سیکرٹری تھا) روایتی زولو جنگجو اور بادشاہ ''شاکا'' کی شان میں ایک گیت گا کر موسیقی پر لیکچر دیا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک کمبل میں لپیٹ لیا، ایک اخبار رول کر کے تلوار کی طرح ہاتھ میں پکڑا اور تعریفی گیت کے مصرعے دہراتے ہوئے کبھی آگے اور کبھی پیچھے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ ہم سب، جو زولو زبان نہیں سمجھتے تھے وہ بھی، مسحور ہو گئے۔ پھر اس نے ڈرامائی طور پر توقف کیا اور بلند آہنگ سے مصرع پڑھا:

inoyni edlezinyat! yathi isadlezinya,''

''yadlezinya!

اس مصرع میں شاکا کو عظیم شکاری پرندے سے تشبیہ دی گئی ہے جو سنگدلی سے اپنے دشمنوں کو ہلاک کرتا ہے۔ ان الفاظ کے اختتام پر سامعین میں ایک شوروغوغا بلند ہوا۔ چیف لوتھولی، جو اب تک خاموش بیٹھے تھے، اچھل کر کھڑے ہوئے اور پکار اٹھے ''انگو شاکا لووو!'' (یہ ہے شاکا!) پھر وہ ناچنے اور گیت کے بول دہرانے

لگے۔ بال روم کے ماہر رقاص اور بے تکے جو روایتی رقص جانتے تھے۔ نہ مغربی، سب ''انڈ لاموُ'' میں شامل ہو گئے جو اب ایک روایتی زولو جنگی رقص ہے۔ بعض کی حرکات پر وقار تھیں جبکہ دوسرے ٹھٹھرے ہوئے کوہ پیاؤں کے مانند تھے جو سردی کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ لیکن سب جوش وخروش سے ناچ رہے تھے۔ آناً فاناً کوئی ژھوسا رہا تھا نہ زولو، ہندوستانی رہا تھا نہ افریقی، دائیں بازو کا رہا تھا نہ بائیں بازو کا اور مذہبی رہا تھا نہ سیاسی رہنما۔ ہم سب قوم پرست اور محبِ وطن تھے جو اپنی مشترک تاریخ، اپنی ثقافت، اپنے ملک اور اپنی قوم کی محبت کے بندھن میں باہم جکڑے ہوئے تھے۔ اس لمحے کوئی چیز ہم سب کے باطن کی گہرائیوں میں متحرک تھی، الفت کا مضبوط رشتہ، جس نے ہم سب کو باہم باندھ رکھا تھا۔ اس لمحے ہمیں عظیم ماضی کے اس ہاتھ کا احساس ہوا جس نے ہمیں اس کل میں اکٹھے کیا تھا اور عظیم مقصد کی اس طاقت کا احساس ہوا جس نے ہم سب کو باہم جوڑ رکھا تھا۔

دو ہفتے بعد ڈرل ہال، جوہانس برگ میں ہماری پہلی پیشی ہوئی۔ یہ ایک طرح کی فوجی عدالت تھی جو باقاعدہ عدالت کے طور پر کام نہیں کرتی تھی۔ ڈرل ہال ایک عمارت کا کھلا احاطہ تھا جس پر آہنی چھت پڑی تھی اور اتنے زیادہ ملزموں پر مقدمہ چلانے کے لیے انہیں یہی عوامی عمارت مناسب نظر آئی تھی۔ ہمیں بند پولیس گاڑیوں میں لے جایا گیا جن کے ساتھ نصف درجن گاڑیاں مسلح سپاہیوں کی تھیں۔ حکومت ہمارے معاملے میں جس طرح احتیاطی حفاظتی تدابیر اختیار کر رہی تھی اس سے دیکھنے والے کو اندازہ ہوتا تھا کہ شاید بھرپور خانہ جنگی کی سازش پکڑی گئی تھی۔ ہمارے حامیوں کا ایک بڑا ہجوم ٹوسٹ سٹریٹ میں ٹریفک بلاک کر رہا تھا۔ ہم انہیں نعرے لگاتے اور گاتے سن رہے تھے اور وہ گاڑی کے اندر سے ہمارے جوابی نعرے سن رہے تھے۔ چونکہ ہجوم نے ہماری سست رفتار گاڑی کا گھیراؤ کر رکھا تھا، عدالت کی جانب ہمارا یہ سفر ایک فاتحانہ جلوس بن گیا۔ ڈرل ہال کے گردونواح کا سارا علاقہ

رائفلیں تانے پولیس مینوں اور سپاہیوں نے گھیر رکھا تھا ہماری گاڑیاں ہال کے پیچھے جا کر رکیں اور ان سے اتر کر ہم سیدھے عدالت میں چلے گئے۔

اندر ہمارے حامیوں کے ایک اور ہجوم نے ہمارا استقبال کیا حتیٰ کہ ہال ایک کمرہ عدالت کے بجائے ایک بلند آہنگ احتجاجی جلسہ گاہ لگتا تھا۔ ہم اے این سی کی تہنیتی انداز میں اپنے انگوٹھے اوپر اٹھائے چل کر عدالت میں آئے اور یوں واحد غیر سفید سیکشن میں بیٹھے اپنے حامیوں کے جذبات کا اشاروں سے جواب دیا۔ عدالت کے اندر کا ماحول تعزیری سے زیادہ جشن کا سا لگتا تھا جبکہ ملزمان اپنے حامیوں اور دوستوں میں گھل مل گئے تھے۔

ڈیڑھ سو انسان پنجرے میں

حکومت نے ہم سب 156 افراد پر الزام لگایا کہ ہم صریح بغاوت اور ملک گیر سازش کے مرتکب ہوئے تھے تاکہ تشدد سے موجودہ حکومت کا تختہ الٹ کر ایک کمیونسٹ مملکت قائم کر سکیں۔ فرد جرم کا عرصہ یکم اکتوبر 1952ء سے 13 دسمبر 1956ء تک محیط تھا جس میں پابندی شکن مہم، صوفیہ ٹاؤن کا انخلاء اور کانگریس آف دی پیپل شامل تھے۔ صریح بغاوت کا ساؤتھ افریقن لا انگلش لا پر مبنی نہیں تھا بلکہ یہ رومن ڈچ نظائر پر مبنی تھا اور یہ صریح بغاوت کو معاندانہ ارادے سے مملکت کی آزادی یا سلامتی کو نقصان پہنچانے یا خطرے میں ڈالنے کے مترادف قرار دیتا تھا۔

پہلی پیشی کا مقصد یہ تعین کرنا تھا کہ کیا حکومت کے پاس اتنے کافی الزامات ہیں کہ ہم پر سپریم کورٹ میں مقدمہ چلایا جا سکے۔ شہادت کے دو مرحلے تھے۔ پہلا مرحلہ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیشی تھا اگر مجسٹریٹ اس نتیجے پر پہنچتا کہ ملزمان کے خلاف کافی شہادت موجود ہے تو مقدمہ سپریم کورٹ میں چلا جاتا اور ایک جج کی عدالت میں چلتا اگر مجسٹریٹ یہ سمجھتا کہ شہادت ناکافی ہے تو مدعا علیہان بری کر

دیئے جاتے۔

مجسٹریٹ مسٹر ایف سی اے ویزل تھے جو بلوم فونٹائن کے چیف مجسٹریٹ تھے۔ پہلے روز جب مسٹر ویزل اپنی دھیمی آواز میں بولنے لگے تو ان کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ حکومت نے لاؤڈ سپیکر اور مائیکروفون کی فراہمی کا اہتمام نہیں کیا تھا، چنانچہ عدالت دو گھنٹے کے لیے ملتوی کر دی گئی اور لاؤڈ سپیکر کا بندوبست کیا جانے لگا۔ ہم صحن میں جمع ہو گئے اور ایک پکنک کا سا سماں بندھ گیا۔ باہر سے کھانے کی اشیاء ہمیں بھجوائی گئیں۔ ماحول تقریباً جشن کا سا تھا۔ دو گھنٹے بعد عدالت نے کارروائی اگلے دن پر ملتوی کر دی کیونکہ لاؤڈ سپیکر کا مناسب انتظام نہیں کیا جا سکتا تھا ہجوم کے نعروں کی گونج ایک بار پھر ہمیں کڑے پہرے میں واپس فورٹ لے گئے۔

اگلے روز عدالت کے باہر ہجوم پہلے سے زیادہ تھا اور پولیس کا رویہ زیادہ سخت تھا۔ پانچ سو کی مسلح نفری نے ڈرل ہال کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔ جب ہم پہنچے تو معلوم ہوا کہ سرکار نے ہمارے بیٹھنے کے لئے تار کے ایک پنجرہ نما جنگلے کا اہتمام کر رکھا ہے یہ کھمبوں اور افقی راڈوں سے منسلک ایک آہنی جال تھا جس کے سامنے اور اوپر گرل لگی ہوئی تھی۔ ہمیں اس جنگلے کے اندر داخل کر دیا گیا جہاں ہم بنچوں پر بیٹھ گئے جبکہ سولہ مسلح گارڈ گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔

قید کے علامتی تاثر کے علاوہ اس پنجرے نے ہمیں وکلاء سے رابطہ کرنے سے بھی روک رکھا تھا جنہیں اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ میرے ایک ساتھی نے کاغذ کے پرزے پر لکھ کر پنجرے کے پہلو سے لگا دیا ''Dangerous, Please do not feed'' (خطرناک کچھ نہ کھلایئے)

ہمارے حامیوں اور پارٹی نے صفائی کے وکلاء کی ایک بڑی ٹیم جمع کی ہوئی تھی جس میں برام فشر، نارمن روزن برگ، ازرائیل مالسلز، مورس فرینکس اور ورنن برانجے شامل تھے۔ ان میں سے کسی نے اس سے پہلے عدالت میں ایسا اہتمام نہیں

دیکھا تھا۔فرینکس نے کھلی عدالت میں شدید احتجاج کیا کہ حکومت نے اس کے موکلان کی ایسے مضحکہ خیز طریقے سے اہانت کا اہتمام کیا اور ان سے جنگلی درندوں کا سابرتاؤ کیا جا رہا ہے۔اس نے اعلان کیا کہ اگر یہ پنجرہ ہٹایا نہیں جاتا تو صفائی کی پوری ٹیم عدالت سے واک آؤٹ کر جائے گی۔مختصر التوا کے بعد مجسٹریٹ نے فیصلہ کیا کہ یہ پنجرہ اٹھالیا جائے اور فوری طور پر اس کا اگلا حصہ ہٹا دیا گیا۔

پھر مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ چیف پراسیکیوٹر مسٹر فان وائیکرک نے اٹھارہ ہزار الفاظ پر مشتمل ایڈریس پڑھنا شروع کیا اور ہمارے خلاف کراؤن کیس (تاج برطانیہ کے مقدمے) کا خاکہ پیش کیا۔عدالت کے باہر نعرے لگاتے اور گاتے ہوئے ہجوم کے باعث پراسیکیوٹر کی آواز بمشکل سنائی دے رہی تھی اگرچہ لاؤڈ سپیکر کا اہتمام کیا ہوا تھا ایک موقع پر سپاہیوں کی ایک ٹولی باہر چلی گئی۔پھر ہمیں ریوالور چلنے کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد نعروں اور مزید گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔عدالت ملتوی کر دی گئی جبکہ مجسٹریٹ نے وکلاء کے ساتھ ایک میٹنگ کی۔ بیس افراد زخمی ہوئے تھے۔

زرضمانت میں نسلی امتیاز

ہمارے خلاف الزامات دو دنوں تک پڑھ کر سنائے جاتے رہے فان وائیکرک نے کہا کہ وہ عدالت میں یہ ثابت کرے گا کہ ملزمان دوسرے ممالک کی مدد سے موجودہ حکومت کا بزور تختہ الٹنے کی سازش کر رہے تھے اور جنوبی افریقہ پر ایک کمیونسٹ حکومت مسلط کرنا چاہتے تھے۔یہ صریح غداری کا الزام تھا۔وکیل سرکار نے ہمارے کمیونسٹ عزائم کے ثبوت اور موجودہ حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی شہادت دونوں کے لیے فریڈم چارٹر کا حوالہ دیا۔تیسرے دن تک پنجرے کا بیشتر حصہ ہٹایا جا چکا تھا۔آخر کار چوتھے دن ہمیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ضمانت نسلی امتیاز کے بدلتے پیمانے کی ایک اور مثال تھی۔سفید فاموں کے لیے اڑھائی سو پونڈ،

ہندوستانیوں کے لیے ایک سو پونڈ اور افریقیوں اور رنگ داروں کے لیے پچیس پاؤنڈ غداری کے الزام میں رنگ ونسل کا خیال رکھا گیا تھا۔مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے خیر خواہوں نے ملزمان کی ضمانتیں پیش کیں۔گرفتار شدگان کی مدد کا یہ جذبہ بعد میں ٹریزن ٹرائل ڈیفنس فنڈ کے قیام کا باعث بنا جس کا آغاز بشپ ریوس، ایلن پیٹن اور ایلکس ہیپل نے کیا تھا۔میری بنسن اور فریڈ ایوسن نے مقدمے کے دوران اس فنڈ کا ٹھیک ٹھیک حساب رکھا۔ہمیں اس شرط پر رہا کیا گیا تھا کہ ہم ہفتے میں ایک بار پولیس کو رپورٹ کرتے رہیں اور عوامی اجتماعات میں شرکت سے منع کر دیا گیا۔عدالت کی کارروائی اوائل جنوری میں دوبارہ شروع ہونی تھی۔

اگلے روز میں خوش وخرم اور سویرے ہی اپنے دفتر پہنچ گیا۔آلیور اور میں دونوں جیل میں رہے تھے۔اس صبح میں کام کا آغاز کرنے والا تھا، جابا دو نامی ایک پرانا دوست ملنے آ گیا۔وہ ایک پیشہ ور ترجمان تھا جس سے پچھلے کئی ماہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔گرفتاریوں سے پہلے میں نے دانستہ اپنا وزن کم کر لیا تھا، اس خیال سے جیل جاتے وقت آدمی کو دبلا ہونا چاہیے تا کہ کم خوراک پر گزارہ ہو سکے۔جیل میں بھی میں نے ورزش جاری رکھی تھی اور اپنا جسم پتلا ہونے پر خوش تھا۔لیکن جابا دو نے میرا جسمانی جائزہ لیتے ہوئے کہا ''مادیبا! تم اتنے دبلے کیوں نظر آتے ہو؟'' افریقی ثقافت میں بھاری جسم دولت اور خوشحالی کی علامت شمار ہوتا ہے۔پھر اس نے طنز کے تیر چھوڑتے ہوئے کہا ''یار! تمہیں جیل کا خوف تھا۔یہی وجہ ہے کہ تم دبلے ہو۔ تم نے ژھوسا لوگوں کو ذلیل کر دیا ہے۔''

مقدمے سے پہلے ہی ایولین سے میری شادی ڈھیلی پڑنے لگی تھی 1953ء میں ایولین جنرل نرسنگ میں اپنے چار سالہ سرٹیفکیٹ کو اپ گریڈ کرنے میں جت گئی تھی۔ اس نے ڈربن میں کنگ ایڈورڈ ہفتم ہسپتال میں مڈوائفری کورس میں داخلہ لے لیا تھا جس کے باعث اسے کئی ماہ تک گھر سے باہر رہنا پڑا۔یہ اس لیے ممکن تھا کہ میری

ماں اور بہن ہمارے پاس مقیم تھیں اور وہ بچوں کی دیکھ بھال کر لیتی تھیں ڈربن میں اس کے قیام کے دوران میں کم از کم ایک موقع پر اس سے ملنے گیا تھا۔

ایولین امتحان پاس کر کے واپس آ گئی۔ وہ دوبارہ حاملہ تھی اور اس سال کے آخر میں اس نے مکازیوی کو جنم دیا جس کا نام اس بیٹی پر رکھا گیا جو چھ سال پہلے ہمیں داغ مفارقت دے گئی تھی۔ ہماری ثقافت میں فوت شدہ بچے کا نام نئے بچے کو دینا متوفی بچے کی یاد تازہ رکھنے کا ذریعہ خیال کیا جاتا ہے تاکہ اس بچے سے ایک روحانی تعلق برقرار رہے جو بہت جلد داغ جدائی دے گیا ہو۔

اگلے سال کے دوران ایولین واچ ٹاور آرگنائزیشن میں سرگرم رہی جو ''چرچ آف جیہووازوٹ نیس'' کا ایک حصہ ہے۔ آیا اس وقت اس نے اپنی زندگی کی بے اطمینانی کے باعث ایسا کیا تھا، یہ مجھے علم نہیں۔ جیہووازوٹ نیس بائبل کو ایمان کا واحد ماخذ قرار دیتا تھا اور وہ نیکی و بدی کے مابین ایک ملحمہ (Armageddon) بپا ہونے پر یقین رکھتا تھا۔ ایولین نے بڑی لگن سے ان کا مطبوعہ واچ ٹاور تقسیم کرنا شروع کر دیا اور مجھ پر کام کرنے لگی۔ وہ مجھ پر زور دیتی کہ میں جہاد آزادی سے اپنے اخلاص کے بدلے میں خدا سے اخلاص کا عقیدہ اپنا لوں۔ اگرچہ مجھے واچ ٹاور سسٹم کے بعض پہلو دلچسپ اور دقیع لگے مگر میں اس کا عقیدہ اپنا سکتا تھا نہ میں نے اپنایا۔ اس میں ایک گریز کا عنصر تھا جس نے مجھے اس سے پرے رکھا۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا تھا، ایولین کا عقیدہ اسے ظلم کے مقابلے میں قنوطیت اور خود سپردگی سکھاتا تھا اور یہ بات میرے لیے قابل قبول نہ تھی۔

اے این سی اور جہاد آزادی سے میرا اخلاص بے لچک تھا۔ اس سے ایولین کو پریشانی ہوتی تھی۔ اس نے فرض کر رکھا تھا کہ سیاست میرا جوانی کا شغل ہے اور کسی روز میں ٹرانسکائی واپس آ کر وہاں قانون کی پریکٹس شروع کر دوں گا۔ اگرچہ ایسا امکان بہت دور کی بات تھی مگر وہ اس حقیقت سے سمجھوتہ نہ کر سکی کہ جوہانسبرگ اب

ہمارا گھر ہے اور اس نے یہ خیال اپنے ذہن سے نہ نکالا کہ ایک روز ہم امتاتا واپس جا چکتے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ ایک بار میں ٹرانسکائی اپنے خاندان میں جا کر سابا تا کا مشیر بن گیا تو پھر مجھے سیاست یاد نہیں آئے گی۔ وہ دالیونگا کو اکساتی رہی کہ وہ مجھے امتاتا واپس آنے کی ترغیب دینے کی کوشش جاری رکھے۔ اس موضوع پر ہماری بار ہا تکرار ہوئی اور میں نے اسے تحمل سے سمجھایا کہ سیاست میرے لیے کوئی وقتی الجھاؤ نہیں بلکہ یہ میرا مشغلہ حیات ہے اور میری شخصیت کا ایک لازمی اور بنیادی حصہ ہے۔ وہ اسے قبول نہ کر سکی، چنانچہ ایک مرد اور ایک عورت جو زندگی میں اپنے اپنے کردار کے بارے میں اتنے مختلف نقطہ نظر رکھتے ہوں، اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

میں نے اسے جدوجہد آزادی کی ضرورت کا احساس دلانا چاہا جبکہ وہ مجھے مذہبی عقیدے کی قدر کا احساس دلانے کی کوشش کرتی تھی۔ جب میں اسے بتاتا کہ میں قوم کی خدمت کر رہا ہوں تو وہ جواب دیتی کہ خدا کی خدمت قوم کی خدمت پر فوقیت رکھتی ہے۔ ہمیں کوئی مشترکہ بنیاد نہیں مل رہی تھی اور مجھے یقین ہو رہا تھا کہ ہماری شادی اب مزید برقرار نہیں رہ سکتی۔

ہم اپنے بچوں کے قلب ونظر کا رخ متعین کرنے میں بھی باہم الجھ پڑتے تھے وہ انہیں مذہبی بنانا چاہتی تھی جبکہ میں چاہتا تھا کہ وہ سیاسی بنیں۔ وہ ہر موقع پر انہیں گرجے لے جاتی اور انہیں واچ ٹاور لٹریچر پڑھواتی۔ وہ دونوں بیٹوں کو واچ ٹاور پمفلٹ بھی دیتی کہ ٹاؤن شپ میں تقسیم کر آئیں میں ان سے سیاست پر گفتگو کیا کرتا تھا فیمی پائینرز کا رکن تھا، جو اے این سی کا نوجوانوں کا شعبہ تھا اس لئے وہ تو پہلے ہی سیاسی شعور سے بہرہ ور تھا۔ میں دوسرے بیٹے ماکگاتھو پر بڑے سادہ طریقے سے واضح کرتا کہ کس طرح گورے گالوں پر مظالم ڈھاتے ہیں۔

اپنے مکان کی دیواروں پر میں نے روز ویلٹ، چرچل، سٹالن گاندھی اور 1917ء میں سینٹ پیٹرز برگ پر عوامی دھاوے کی تصاویر لگا رکھی تھیں۔ میں

نے دونوں لڑکوں کو وضاحت سے بتایا کہ ان میں سے ہر ایک کون تھا اور اس نے کس مقصد کے لئے جدوجہد کی تھی وہ دونوں جانتے تھے کہ جنوبی افریقہ کے سفید فام لیڈر کسی بہت مختلف مقصد کے علمبردار رہیں۔ ایک دن ماکگاتھو دوڑتا ہوا گھر میں داخل ہوا اور آتے ہی اس نے کہا ''ڈیڈی! ڈیڈی! پہاڑی پر مالان ہے'' مالان پہلا نیشنلسٹ وزیراعظم تھا اور ماکگاتھو کو تبتو ایجوکیشن آفیشل ولی ماری پر اس کا شبہ ہوا تھا جس نے اعلان کیا تھا کہ وہ اس روز ٹاؤن شپ میں ایک عوامی جلسے سے خطاب کرے گا۔ میں یہ دیکھنے کے لئے باہر نکلا کہ ماکگاتھو کس کا ذکر کر رہا ہے کیونکہ اے این سی نے اس امر کو یقینی بنانے کے لیے ایک مظاہرہ کیا تھا کہ اس کا جلسہ کامیاب نہ ہو۔ جب میں باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ چند پولیس وینیں ماری کے جلو میں اس طرح جارہی ہیں جہاں وہ خطاب کرنے والا تھا لیکن جلسے کے شروع ہی میں گڑبڑ ہو گئی اور ماری تقریر کیے بغیر ہی بھاگ نکلا۔ میں نے ماکگاتھو کو بتایا کہ یہ مالان نہیں تھا اور نہ وہ آ سکتا تھا۔

پہلی شادی ٹوٹ گئی

ان دنوں میرے روز و شب انتہائی مصروفیت میں گزرتے تھے۔ صبح سویرے گھر سے نکلتا اور رات گئے لوٹتا۔ سارا دن دفتر میں کام کرنے کے بعد حسب معمول نوع بہ نوع ملاقاتوں میں وقت صرف ہوتا۔ ایولین میری ان ملاقات کی نوعیت نہیں سمجھتی تھی اور جب میں رات کو دیر سے گھر پہنچتا تو اسے شبہ ہوتا کہ میرا دوسری عورتوں سے میل جول ہے بارہا میں نے وضاحت کی کہ میں کس میٹنگ میں تھا، میں وہاں کیوں تھا اور وہاں کیا زیر بحث تھا لیکن وہ میری بات پر یقین نہ کرتی 1955ء میں اس نے مجھے الٹی میٹم دے دیا کہ میں اسے چن لوں یا اے این سی کو

والٹر اور البرٹینا سیسولو، ایولین کے بہت قریب تھے اور ان کی انتہائی خواہش تھی کہ ہم اکٹھے رہیں۔ ایولین، البرٹینا پر اعتماد کرتی تھی۔ ایک موقع پر والٹر نے ہمارے

معاملے میں مداخلت کی مگر میں نے برا مانا اور اس سے برملا کہہ دیا کہ یہ تمہارا مسئلہ نہیں۔ بعد میں مجھے اپنے اس رویئے پر افسوس ہوا کیونکہ والٹر نے ہمیشہ مجھ سے بھائیوں کا سا برتاؤ کیا تھا اور اس کی دوستی اور تعاون میں کبھی لغزش نہیں آئی تھی۔

ایک دن والٹر نے مجھے بتایا کہ وہ کسی کو دفتر میں مجھ سے ملوانا چاہتا ہے اس نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ میرا برادر نسبتی ہے میں اسے دیکھ کر حیران ہوا مگر ناخوش نہیں تھا۔ میں اپنی شادی کی برقراری سے مایوس ہو چکا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اسے اپنے احساسات سے آگاہ کرنا درست ہوگا۔

ہم تینوں اس مسئلے پر ہمدردانہ گفتگو کر رہے تھے۔ اس دوران والٹر نے یا میں نے اس قسم کا جملہ استعمال کیا ''آدمی جیسے کہ ہم ہیں'' ایولین کا برادر نسبتی ایک کاروباری شخص تھا جو سیاست اور سیاستدانوں کا مخالف تھا۔ وہ بھڑک اٹھا اور بولا ''اگر تم دونوں چھوکرے یہ خیال کرتے ہو کہ تم اسی پوزیشن میں ہو جس پوزیشن میں میں ہوں تو یہ مضحکہ خیز بات ہے۔ مجھ سے اپنا موازنہ مت کرو'' جب وہ رخصت ہو گیا تو ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنس دیئے۔

دسمبر میں ہماری گرفتاری کے بعد ہمیں دو ہفتے جیل میں رکھا گیا، ایولین اس دوران ایک بار مجھ سے ملنے آئی۔ لیکن جب ضمانت پر میری رہائی ہوگئی تو معلوم ہوا کہ وہ بچوں کو لے کر چلی گئی ہے گھر خالی اور بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہ پردے بھی اتار کر لے گئی تھی جس سے میری بڑی دل شکنی ہوئی۔ وہ اپنے بھائی کے ہاں چلی گئی تھی جس نے مجھے بتایا ''شاید اسی میں بہتری ہے ہو سکتا ہے جب معاملہ ٹھنڈا ہو جائے تو تم دوبارہ اکٹھے ہو جاؤ'' یہ مشورہ معقول تھا مگر اس کی ضرورت نہیں تھی۔

ایولین کے اور میرے اختلافات ناقابل مفاہمت تھے۔ میں آزادی کی جدوجہد میں اپنا طرز زندگی نہیں بدل سکتا تھا اور وہ اپنی ذات اور اپنے خاندان سے ہٹ کر کسی اور چیز سے میرے اخلاص کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک بہت اچھی

عورت تھی، دلکش، توانا اور وفا دات اور ایک عمدہ ماں میں نے اس کے احترام میں کبھی کمی نہیں کی اور ہمیشہ اس کی تعریف کی لیکن آخر کار ہوا یہ کہ ہماری شادی نہ چل سکی۔

کسی بھی شادی کا ٹوٹنا صدمے کا باعث ہوتا ہے خصوصاً بچوں کے لیے ہمارا خاندان بھی مستثنیٰ تھا اور تمام بچے ہماری علیحدگی سے شدید متاثر ہوئے۔ ماکگاتھو میرے بستر میں سونے کا عادی تھا۔ وہ ایک شریف بچہ تھا اور فطری طور پر سکون بخش تھا۔ وہ میرے اور اپنی ماں کے مابین کسی نہ کسی طرح کی مفاہمت کرانے کی کوشش کرتا۔ ماکازیوی ابھی بہت چھوٹی تھی اور مجھے یاد ہے کہ ایک روز جب میں دفتر میں تھا نہ جیل میں میں بغیر اطلاع کے گھر گیا۔ وہ ہمیشہ ایک بہت پیار کرنے والی بچی تھی لیکن ایک روز جب اس نے مجھے دیکھا تو وہ اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گئی وہ نہیں جانتی تھی کہ میری طرف دوڑ کر آئے یا پیچھے ہٹ جائے، مسکرائے یا منہ بسور لے۔ اس کے ننھے سے دل میں ایک کشمکش برپا تھی جو نہیں جانتا تھا کہ اس عقدے کو کیسے حل کرے۔ یہ بڑا تکلیف دہ منظر تھا۔

تھیمبی جو اس وقت دس سال کا تھا، سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ اس نے پڑھائی چھوڑ دی اور اسے سکول سے اٹھالیا گیا۔ ایک موقع پر وہ انگریزی اور شیکسپیئر میں بڑی دلچسپی لیتا تھا مگر ہماری علیحدگی کے بعد وہ پڑھائی سے نفور ہوتا چلا گیا۔ اس کے سکول کے پرنسپل نے ایک موقع پر مجھ سے بات کی لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا تھا جب کبھی ممکن ہوتا میں اسے جمنازیم لے جاتا اور وقتاً فوقتاً وہ قدرے اچھی کارکردگی دکھاتا۔ کئی مواقع پر جب میں وہاں موجود نہ ہوتا اور بعد میں جب میں زیر زمین تھا والٹر تھیمبی کو اپنے بیٹے کے ہمراہ لے جاتا تھا۔ ایک بار وہ اسے ایک میچ دکھانے لے گیا اور واپس آ کر اس نے مجھ سے کہا یار! وہ چھوکرا خاموش ہے ہماری علیحدگی کے بعد تھیمبی اکثر میرے کپڑے پہن لیتا اگر چہ وہ اس کے قدوقامت سے

بڑے ہوتے، تاہم وہ اسے دور رہنے والے باپ سے ایک طرح کی قربت کا احساس دلاتے تھے۔

9 جنوری 1957ء کو ہم ایک بار پھر ڈرل ہال میں جمع ہوئے۔ اب وکلائے صفائی کی باری تھی کہ وہ سرکار کے الزامات کی تردید کریں ہمارے بڑے وکیل ورنن بیرانج نے ہمارے خلاف سرکاری کیس کی سمری بیان کرتے ہوئے ہماری طرف سے دلائل پیش کیے۔ اس نے کہا "ہم یہ مفروضہ شدت سے مسترد کرتے ہیں کہ فریدم چارٹر کی دفعات باغیانہ یا مجرمانہ ہیں اس کے برعکس ہمارا موقف یہ ہے کہ اس چارٹر میں جو خیالات اور نظریات بیان کیے گئے ہیں اگرچہ وہ موجودہ حکومت کی پالیسی سے لگا نہیں کھاتے مگر بنی نوع انسان کی تمام نسلوں اور رنگوں کی بھاری اکثریت، اور اس ملک کے شہریوں کی بھی بھاری اکثریت انہیں تسلیم کرتی ہے" اپنے وکلاء کے مشورے سے ہم نے طے کیا تھا کہ ہم صرف یہ ثابت کرنے پر اکتفا نہیں کریں گے کہ ہم بغاوت سے مبرا ہیں بلکہ یہ بھی ثابت کریں گے کہ یہ ایک سیاسی مقدمہ ہے جس میں حکومت ہمارے ایسے افعال پر ہمیں ابتلا کا نشانہ بنا رہی ہے جو اخلاقی طور پر جائز ہیں۔

لیکن وکیل صفائی کے دلائل کے بعد عدالتی طریق کار کا نا گوار ڈراما شروع ہو گیا۔ مقدمے کے پہلے مہینے میں سرکار نے شہادتیں پیش کیں۔ ہر کاغذ، پمفلٹ، دستاویز، کتاب، نوٹ بک، خط اور رسالہ اور اخباری تراشے جو پولیس نے پچھلے تین سال کی تلاشیوں میں جمع کیے تھے، ایک ایک کر کے پیش کیے گئے اور یہ کل 12000 کی تعداد میں تھے انہوں نے کانگریس آف دی پیپل کے دو نشان بھی ان میں شامل کر لیے تھے اور وہ کارڈ سوپ ود میٹ (گوشت والا سوپ) اور سوپ ود آؤٹ میٹ (گوشت کے بغیر سوپ) بھی

ابتدائی جرح کے دوران جسے مہینوں جاری رہنا تھا، ہم دنوں تک افریقی اور

افریکنز مخبروں کو سنتے رہے جو اے این سی کی میٹنگز کے نوٹس یا تقریروں کے متن پڑھتے تھے۔ یہ بیانات ہمیشہ الجھے ہوئے، اکثر بے معنی یا صریحاً جھوٹے ہوتے۔ بیرانج نے بعد میں ان پر جرح کرتے ہوئے ثابت کیا کہ بہت سے افریقی مخبر انگریزی زبان سمجھ یا لکھ ہی نہیں سکتے تھے جس میں تقریریں کی گئی تھیں۔

استغاثہ کے جھوٹ کا پول کھل گیا

حکومت کے اس غیر معمولی الزام کو سہارا دینے کے لیے کہ ہم موجودہ حکومت کی جگہ ایک سوویت طرز کی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے، وکیل استغاثہ کا انحصار یونیورسٹی آف کیپ ٹاؤن کے صدر شعبہ پولیٹکل سائنس پروفیسر اینڈریو مرے کی شہادت پر تھا۔ مرے نے ہم سے چھینے گئے کئی کاغذات فریڈم چارٹرسمیت کمیونسٹک قرار دے دیئے۔ پروفیسر مرے شروع میں باخبر لگتا تھا مگر یہ اس وقت تک تھا جب تک بیرانج کی جرح شروع نہیں ہوئی تھی۔ بیرانج نے کہا کہ وہ مختلف دستاویزات سے بہت سے پیرے مرے کو سنا کر اس سے پوچھنا چاہتا ہے آیا کہ وہ کمیونسٹک ہیں یا نہیں۔ پھر اس نے پہلا پیرا پڑھا جس میں عام کارکنوں کو اس ضرورت کا احساس دلایا گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے تعاون کریں اور ایک دوسرے کا استحصال نہ کریں مرے نے کہہ دیا کمیونسٹک اس پر بیرانج نے انکشاف کیا کہ یہ بیان جنوبی افریقہ کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر مالان کا ہے۔ پھر بیرانج نے دو اور کاغذات پڑھ کر سنائے اور پروفیسر مرے نے انہیں بھی کمیونسٹک قرار دے دیا۔ یہ پیرے دراصل امریکی صدور ابراہم لنکن اور روڈرو ولسن کی تقریروں کے تھے۔ جرح کا نقطہ عروج وہ تھا جب بیرانج نے مرے کو ایک اور پیرا پڑھ کر سنایا جسے پروفیسر نے بلا تامل صریحاً کمیونزم کا پرچار قرار دیا۔ تب بیرانج نے انکشاف کیا کہ یہ بیان خود پروفیسر مرے کا ہے جو اس نے عشرہ 1930ء میں تحریر کیا تھا۔

مقدمے کے ساتویں مہینے وکیل سرکار نے کہا کہ وہ منصوبہ بند تشدد پیش کرے گا جو

خلاف ورزی مہم کے دوران پیش آیا تھا اس نے اپنے پہلے گواہ سولومن انگوبیس کو پیش کیا جس کی سنسنی خیز گواہی بظاہر اے این سی کو موردالزام ٹھہراتی تھی انگوبیس ایک صاف گو آدمی تھا اور تیس پینتیس کے پیٹے میں تھا۔ انگریزی پر اسے کامل عبور نہ تھا اور اس وقت ایک غبن کے سلسلے میں سزا بھگت رہا تھا۔ اس نے شہادت کی ابتدا میں عدالت کو بتایا کہ اس نے فورٹ ہیئر سے بی اے کی ڈگری لی ہے اور وہ پیشہ ور وکیل ہے اس نے کہا کہ وہ اے این سی کی پورٹ ایلزبتھ برانچ کا سیکرٹری اور نیشنل ایگزیکٹو کا رکن رہا ہے۔ اس نے نیشنل ایگزیکٹو کی ایک میٹنگ میں موجود ہونے کا دعویٰ کیا جس میں والٹر سیسولو اور ڈیوڈ بوپاپے کو روس بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تھا تاکہ وہ جنوبی افریقہ میں پرتشدد انقلاب کے لیے اسلحہ خرید کرلائیں۔ اس نے کہا کہ وہ اس میٹنگ میں بھی موجود تھا جس میں 1952ء کے پورٹ ایلزبتھ کے فسادات کی منصوبہ بندی کی گئی تھی اور اس کی موجودگی میں اے این سی نے فیصلہ کیا تھا کہ ٹرانسکائی میں تمام گوروں کو اسی طرح قتل کر دیا جائے جس طرح وہ کینیا میں ماؤ ماؤ تحریک میں قتل کیے گئے تھے انگوبیس کی ڈرامائی گواہی نے عدالت کے اندر اور باہر ایک سنسنی پھیلا دی یوں سازش کی ایک شہادت سامنے آ گئی تھی۔

لیکن جب ورنن نے انگوبیس پر جرح کی تو یہ انکشاف ہوا کہ وہ تو ایک پاگل اور جھوٹا ہے۔ بیرانج کی جرح کرنے کی مہارت کے باعث اسے اسانگوما کا عرف عام دیا گیا تھا جس کے معنی ہیں روحانی معالج جو بیماریوں سے شفا دیتا ہے اس نے کہا کہ انگوبیس نہ یونیورسٹی گریجویٹ ہے اور نہ اے این سی کا رکن اور اس کے نیشنل ایگزیکٹو کا رکن ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بیرانج نے ثبوت پیش کیا کہ انگوبیس نے یونیورسٹی ڈگری کی سند جعلسازی سے حاصل کی تھی اور وہ کئی سال غیر قانونی طور پر وکالت کرتا رہا اور اس کے خلاف غبن کا ایک مقدمہ زیر التوا ہے۔ اس نے پورٹ ایلزبتھ کے فسادات کی منصوبہ بندی کے وقت وہاں موجود ہونے کا جو

ذکر کیا ہے، اس وقت وہ غبن کے الزام میں ڈربن جیل میں تھا۔ یوں انگوبیس کی گواہی کا سچائی سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ بیرانج نے اپنی جرح کے آخر میں گواہ سے پوچھا کیا تم جانتے ہو لفنگا کسے کہتے ہیں؟ انگوبیس نے کہا کہ وہ نہیں جانتا اس پر بیرانج بلند آواز سے کہا ''جناب! آپ ایک لفنگے ہیں''

ملزمان میں جو سلوو بھی تھے جو ایک اعلیٰ پائے کے وکیل تھے۔ انہوں نے اپنی صفائی خود پیش کی ۔وہ حکومت کے لیے خاصے تندوترش ثابت ہوئے اور انہوں نے اپنے چبھتے ہوئے سوالات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قوانین کی خلاف ورزی حکومت نے کی ہے کانگریس نے نہیں سلوو کی جرح بھی حکومت کے لیے ویسی ہی تباہ کن ثابت ہوئی جیسی بیرانج کی تھی مخبر جرمیاہ مولسن سپیشل برانچ کے چند افریقی ارکان میں سے ایک تھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ اسے اے این سی کے رہنماؤں کی تقریروں میں سے جملے زبانی یاد ہیں جو اس نے سنے تھے لیکن جو کچھ اس نے بیان کیا وہ بے ربط الفاظ تھے یا صریحاً جعل سازی

سلوو ''کیا تم انگریزی سمجھتے ہو؟''

مولسن ''اتنی اچھی طرح نہیں''

سلوو ''کیا تمہارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے انگریزی میں ان تقریروں کی رپورٹنگ کی مگر تم انگریزی اچھی طرح نہیں سمجھتے؟''

مولسن 'ہاں عزت مآب'

سلووو ''کیا تم اس بات سے اتفاق کرتے ہو کہ تمہارے تیار کردہ نوٹس زیادہ تر لغویات ہیں؟''

مولسن ''مجھے علم نہیں''

اس آخری جواب پر مدعا علیہان بے اختیار ہنس پڑے مجسٹریٹ نے ہنسنے پر ہمیں ملامت کی اور کہا ''کارروائی اتنی مضحکہ خیز نہیں جتنی محسوس ہوتی ہے''

ایک موقع پر مجسٹریٹ وسل نے سلوو سے کہا کہ عدالت کے وقار کو ٹھیس پہنچا رہا ہے اور توہین عدالت میں اسے جرمانہ کر دیا۔ اس پر بیشتر ملزمان میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور یہ چیف لوتھولی کا باز رکھنے والا ہاتھ ہی تھا جس نے بہت سے مدعا علیہان کو توہین عدالت میں سزایاب ہونے سے روکا۔

جب شہادتیں جاری تھیں جو زیادہ تر قانونی موشگافیوں کی متقاضی تھیں، ہم اپنے آپ کو دوسرے معاملات میں مصروف رکھنے لگے۔ میں اکثر پڑھنے کے لیے کوئی کتاب یا کسی مقدمے کے کاغذات ساتھ لے آتا۔ دوسرے لوگ اخبارات پڑھتے، لفظی معمے حل کرتے یا شطرنج یا الفاظ بنانے کی گیم کھیلتے۔ وقتاً فوقتاً مجسٹریٹ ہمیں توجہ نہ دینے پر زجر و توبیخ کرتا۔ تب کتابیں اور معمے غائب ہو جاتے لیکن بتدریج شہادتیں جب کچھوے کی چال سے پھر شروع ہو جاتیں، ہم گیمز اور پڑھنے کی چیزوں میں پھر مشغول ہو جاتے۔

مقدمے کی ابتدائی کارروائی ہی سے حکومت مایوس ہو گئی تھی۔ جوں جوں کارروائی آگے بڑھ رہی تھی، یہ واضح سے واضح تر ہو رہا تھا کہ حکومت ایک ہارے ہوئے مقدمے کو بڑھاوا دینے کے لیے شہادتیں گھڑ رہی ہے آخر کار 11 ستمبر کو یعنی ڈرل ہال میں ہمارے اکٹھے ہونے کے دس ماہ بعد پراسیکیوٹرز نے اعلان کیا کہ ابتدائی کارروائی میں حکومت کا کیس مکمل ہو گیا ہے۔ مجسٹریٹ نے وکلائے صفائی کو چار مہینے دیئے کہ وہ اپنا کیس تیار کرنے کے لیے ٹائپ شدہ شہادتوں کے 8000 صفحات اور 12000 دستاویزات کھنگال لیں۔

ابتدائی کارروائی پورے 1957ء میں جاری رہی تھی۔ عدالت ستمبر میں ملتوی ہو گئی اور وکلائے صفائی شہادتوں کی نقد و نظر مصروف ہو گئے۔ تین ماہ بعد کسی انتباہ اور کسی وضاحت کے بغیر حکومت نے اعلان کیا کہ 61 ملزمان کے خلاف الزامات واپس لے لیے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر اے این سی کے نسبتاً کمتر عہدوں کے

افراد تھے مگران میں چیف لوتھولی اور آلیو ٹیمبو بھی تھے۔سرکار کے چیف لوتھولی اور ٹیمبو کو رہا کرنے پر ہمیں خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی۔

جنوری 58ء میں جب حکومت کو اپنے الزامات سمیٹنے تھے، ایک نیا پراسیکیوٹر اوسوالڈ پیرو کیوسی عدالت میں پیش ہوا۔پیرو سابق وزیر دفاع و انصاف تھا اور نیشنل پارٹی کی سیاست کا اہم ستون تھا وہ مدت سے افریکنر نیشنلسٹ تھا اور نازی مقاصد کا کھلم کھلا حامی رہا تھا۔اس نے ایک بار ہٹلر کو اپنے عہد کا عظیم انسان قرار دیا تھا وہ کمیونزم کا شدید دشمن تھا۔پیرو کی تعیناتی اس امر کی غماز تھی کہ حکومت مقدمے کی اب تک کی کارروائی سے مایوس ہے اور ہر حالت میں فتح پانے کو بہت اہمیت دیتی ہے۔

پیرو کے الزامات سمیٹنے سے پہلے بیرانج نے اعلان کیا کہ وہ اس بنیاد پر اپنے موکلان کو بری کرنے کی درخواست دے گا کہ حکومت ان کے خلاف کافی شہادت نہیں پیش کرسکی۔پیرو نے یہ درخواست مسترد کرنے کی استدعا کرتے ہوئے ملزمان کی اشتعال انگیز تقریروں میں سے اقتباسات پیش کیے اور عدالت کو بتایا کہ پولیس کو ایک انتہائی خطرناک سازش کی مزید شہادتیں ملی ہیں اس نے جذباتی لہجے میں کہا ملک ایک آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے یہ ایک موثر اور انتہائی ڈرامائی کارکردگی تھی۔یوں پیرو نے مقدمے کی فضا ہی بدل دی۔ہم حد سے زیادہ خود اعتمادی میں مبتلا تھے اور اب ہمیں یاد دلایا گیا کہ ہم ایک سنگین الزام کا سامنا کررہے ہیں۔ ہمارے وکیل نے ہمیں بتایا ”اپنے آپ کو بے وقوف نہ بناؤ تم لوگ جیل بھی جاسکتے ہو“

ابتدائی کارروائی کے تیرہ ماہ بعد مجسٹریٹ نے فیصلہ دیا کہ ملزمان کے خلاف اسے اتنی کافی وجوہات ملی ہیں کہ ان پر ٹرانسوال سپریم کورٹ میں صریح غداری کا مقدمہ چلایا جائے۔جنوری میں عدالت ملتوی ہوگئی جبکہ باقی پچانوے مدعا علیہان پر مقدمہ چلنا تھا ہمیں کوئی پتہ نہ تھا کہ اصل مقدمہ کب شروع ہوگا۔

حسن کا جادو چل گیا

ابتدائی کارروائی کے دوران وقفہ ایک سہ پہر میں اپنے ایک دوست کو گاڑی میں یونیورسٹی آف وٹواٹرسرانڈ آرلینڈو کے میڈیکل سکول لے گیا۔ ہم برگواناتھ ہسپتال کے پاس سے گزرے جو جوہانس برگ میں کالوں کے لیے مشہور ہسپتال تھا۔ جب ہم ایک قریبی بس سٹاپ کے نزدیک سے گزر رہے تھے میں نے اپنی آنکھ کے گوشے سے ایک خوبصورت نوجوان عورت کو دیکھا جو بس کا انتظار کر رہی تھی۔ میں اس کے حسن سے متاثر ہوا اور اس پر ایک بھرپور نظر ڈالنے کے لیے اپنی گردن موڑی لیکن میری گاڑی بہت تیزی سے آگے نکل گئی۔ اس عورت کا چہرہ میرے ذہن میں اٹک گیا اور میں نے یہاں تک سوچا کہ گاڑی موڑ کر مخالف سمت میں اس کے نزدیک سے گزروں، تاہم اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر میں اپنی راہ چلتا گیا۔

چند ہفتے بعد ایک عجیب اتفاق ہوا۔ میں اپنے دفتر میں تھا جب میں نے آلیور کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو وہی عورت اپنے بھائی کے ساتھ آلیور کے ڈیسک کے سامنے بیٹھی تھی میں چکرا گیا اور پوری پوری کوشش کی کہ اس موقع پر اپنی حیرت یا خوشی کا اظہار نہ کروں آلیور نے میرا ان سے تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ ایک قانونی معاملے میں اس سے ملنے آئے ہیں۔

اس کا نام نومزاموونی فریڈ مادی کیزیلا تھا مگر وہ ونی کے عرفی نام سے معروف تھی اس نے جوہانس برگ میں جان ہوف میر سکول آف سوشل ورک سے حال ہی میں اپنی تعلیم مکمل کی تھی اور وہ برگواناتھ ہسپتال میں پہلی سیاہ فام خاتون سوشل ورکر کے طور پر کام کر رہی تھی اس وقت میں نے اس کے پس منظر یا قانونی مسئلے پر کم ہی توجہ دی کیونکہ میرے اندر کی دنیا اس کی آمد سے زیروزبر ہو گئی تھی۔ ہماری قانونی فرم اس کا مقدمہ کیسے نپٹائے گی، اس سے زیادہ مجھے یہ فکر تھی کہ میں اسے باہر تفریح پر کیسے لے جا سکوں گا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ محبوب کی پہلی نظر انسان کو گھائل کر

دیتی ہے یا نہیں مگر میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ جس آن میں نے ونی نومزامو کو پہلی بار دیکھا تھا اسی لمحے میرے اندر یہ خواہش انگڑائیاں لینے لگی تھی کہ میں اسے اپنی بیوی بنا لوں۔

ونی سی کے مادی کیزیلا کے گیارہ بچوں میں سے چھٹی تھی۔وہ ایک سکول پرنسپل تھے جواب کاروبار کرتے تھے۔ونی کو دیئے گئے نام نومزامو کا مطلب ہے جو جدوجہد کرتا یا مشکلات سے گزرتا ہے اور یہ نام بھی ایسے ہی پیش گو تھا جیسے میرا نام اس کا تعلق بیزانا پونڈولینڈ سے تھا جو ٹرانسکائی کے اس حصے سے متصل علاقہ تھا جہاں میں نے پرورش پائی تھی وہ قبیلہ آماانگوآ یانا کے فونڈوخیل سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے پردادا مادی کیزیلا تھے جو انیسویں صدی کے نٹال کے ایک طاقتور چیف تھے اور انیکا نے کے عہد میں ٹرانسکائی میں آکر آباد ہوئے تھے۔

ونی سے شادی

اگلے روز میں نے ونی کو ہسپتال فون کیا اور اس سے درخواست کی کہ ٹریزن ٹرائل ڈیفنس فنڈ کے لیے جان ہوف میر سکول سے چندہ اکٹھا کرے یہ محض اس ظہرانے پر بلانے کا ایک بہانہ تھا چنانچہ اسے دعوت دی جو اس نے قبول کر لی میں نے ٹاؤن میں اس کی رہائش گاہ سے اسے گاڑی میں ساتھ لیا اور اپنے دفتر کے قریب ایک انڈین ریستوران میں لے گیا اور یہ ان چند جگہوں میں سے ایک تھا جہاں افریقیوں کی تواضع کی جاتی تھی اور میں اکثر وہاں کھانا کھاتا تھا۔ونی کا حسن خیرہ کن تھا اور اس حقیقت نے تو اس کی کشش وچند کر دی تھی کہ اس نے پہلے کبھی کری نہیں چکھی تھی اور وہ اپنے تالو کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے پانی کے گلاس پی گلاس پر رہی تھی۔

ظہرانے کے بعد میں اسے گاڑی میں جوہانس برگ اور ایوٹین کے درمیان ایک علاقے کی سیر کرانے لے گیا جو ایلڈوریڈو پارک سے آگے ایک کھلا سرسبز میدان تھا۔ہم ہری ہری گھاس پر چلتے رہے جو ٹرانسکائی کی گھاس جیسی ہی تھی جہاں ہم

دونوں نے پرورش پائی تھی میں نے اس سے اپنی آرزوؤں اور ٹریزن ٹرائل (مقدمہ غداری) کی مشکلات کا ذکر کیا۔ میں نے فوراً یہ طے کرلیا تھا کہ میں اس سے شادی کروں گا اور اسے یہ بتا بھی دیا اس کی نشاط، اس کا جذبہ، اس کی جوانی، اس کا حوصلہ اور اس کا عزم یہ سب چیزیں میں نے اس لمحے ہی محسوس کرلی تھیں جب اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

اگلے ہفتوں اور مہینوں کے دوران جب کبھی موقع ملتا، ہم ایک دوسرے سے ملتا رہے۔ وہ ڈرل ہال اور میرے دفتر میں ملاقات کے لیے چلی آتی۔ وہ جمنازیم میں میری کارکردگی دیکھنے بھی آئی وہ تھیمبی، ماگاتھو اور مکازیوی سے ملی وہ پارٹی میٹنگز اور سیاسی مباحثوں میں شرکت کرتی۔ میں اس سے اظہارمحبت اور اسے سیاست کی طرف راغب کرنے کے دونوں کام کر رہا تھا۔ طالبہ کی حیثیت سے ونی نان یورپین یونٹی موومنٹ میں دلچسپی رکھتی تھی کیونکہ اس کا ایک بھائی تھا جو اس جماعت میں شامل تھا بعد کے برسوں میں میں اس کی اس ابتدائی وابستگی کے حوالے سے اسے چھیڑا کرتا اور یہ کہتا تھا کہ اگر وہ مجھ سے نہ ملی ہوتی تو اس پارٹی کے کسی لیڈر سے شادی کرلیتی۔

ایولین سے طلاق کے کاغذات داخل کراتے ہی میں نے ونی سے کہہ دیا کہ اسے مائیکل ہارمل کی بیوی رے ہارمل سے مل کر شادی کے لباس کا ناپ دینا چاہیے۔ ایک سرگرم سیاست دان ہونے کے ساتھ ساتھ رے ایک اچھی ملبوسات ساز بھی تھی۔ میں نے ونی سے استفسار کیا کہ وہ شادی پر کتنی سکھی سہیلیوں کو بلانا چاہتی ہے اور اسے مشورہ دیا کہ وہ بیزانا جا کر اپنے والدین کو اطلاع دے کہ ہم شادی کر رہے ہیں۔ ونی ہنس ہنس کر لوگوں کو بتاتی رہی ہے کہ میں نے اسے کبھی باقاعدہ شادی کی تجویز پیش نہیں کی تھی لیکن میں نے ہمیشہ اس سے کہا ہے کہ میں نے تو پہلی ڈیٹ ہی پر شادی کی تجویز پیش کردی تھی اور میں اس روز ہی سے اسے ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھنے

لگا تھا۔

مقدمہ بغاوت اپنے دوسرے سال میں تھا اور اس سے ہماری قانونی پریکٹس بری طرح متاثر ہوئی۔ منڈیلا اینڈ ٹیمبو فرم کی شکست وریخت ہو رہی تھی کیونکہ ہم وہاں موجود ہی نہیں ہوتے تھے یوں آلیور اور میں شدید مالی مشکلات سے گزر رہے تھے۔ چونکہ آلیور کے خلاف الزامات واپس لے لیے گئے تھے، وہ مقدمات بھگتا کر کچھ تلافی کر سکتا تھا مگر نقصان تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ہم انتہائی مصروف پریکٹس چھوڑ کر جیل گئے تھے اور لوگ اب پلٹ کر اس فرم کے پاس جانے لگے تھے جس سے پہلے شاذونادر ہی کوئی موکل رجوع کرتا تھا۔ اب میرے پاس اتنی گنجائش بھی نہیں تھی کہ میں اس قطعہ زمین کی بقایا قیمت کے پچاس پونڈ ادا کر دیتا جو میں نے امتاتا میں خریدا تھا، چنانچہ مجھے اس پلاٹ سے دستبردار ہونا پڑا۔

میں نے یہ ساری باتیں ونی کے گوش گزار کر دیں۔ میں نے اسے بتایا کہ غالب امکان یہ ہے کہ ہمیں اس کی قلیل تنخواہ ہی پر گزر بسر کرنی پڑے جو اسے سوشل ورکر کی حیثیت سے ملتی تھی۔ ونی سمجھ گئی اور اس نے کہا کہ وہ خطرات مول لینے اور اپنی قسمت مجھ سے وابستہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ میں نے اس سے کبھی سونے اور ہیروں کا وعدہ نہ کیا اور نہ کبھی میں یہ فراہم کر سکتا تھا۔

ہماری شادی 14 جون 1958ء کو ہوئی میں نے اپنی نظر بندی کے احکام میں نرمی کی درخواست دی اور مجھے چھ دن کے لیے جوہانس برگ سے باہر جانے کی رخصت ملی۔ میں نے روایتی دلہن کی قیمت لوبولا کا بھی اہتمام کیا جو ونی کے والد کو ادا کرنی تھی۔

برات 12 جون کو صبح سویرے جوہانس برگ سے روانہ ہوئی اور سہ پہر گئے ہم بیزانا پہنچ گئے جیسا کہ ایک نظر بند کے لیے ضروری تھا، میں سب سے پہلے پولیس اسٹیشن گیا اور اپنی آمد کی اطلاع کی۔ غروب آفتاب پر ہم امبونگوینی یعنی دلہن گھر

پہنچے۔ وہاں مقامی عورتوں کے ایک انبوہ نے خوشی کے گیت گا کر ہمارا استقبال کیا اس تقریب کے بعد وئی اور میں الگ الگ سدھارے وہ عروسی گھر چلی گئی جبکہ مجھے برات کے ہمراہ وئی کے ایک رشتے دار کے گھر میں ٹھہرایا گیا۔

شادی کی اصل تقریب ایک مقامی گرجے میں انجام پائی۔ اس کے بعد وئی کے بڑے بھائی کے گھر میں جشن برپا ہوا جو مادی کیزیلا خیل کا آبائی گھر تھا۔ عرسی کار اے این سی کے رنگوں سے سجائی گئی تھی۔ رقص کیے اور گیت گائے گئے اور وئی کی بھاری بھرکم دادی نے ہم سب کے لیے ایک خصوصی رقص کا مظاہرہ کیا اے این سی کی پوری ایگزیکٹو مدعو کی گئی تھی لیکن ان کی نظر بندیوں کے باعث ان کی حاضری محدود رہی۔ شرکت کرنے والوں میں ڈوما نوکوی، للیان انگوئی، ڈاکٹر جیمز انجونگوی، ڈاکٹر ولسن کونکو اور روکٹر ٹائمز اشے شامل تھے۔

”جیل کے پرندے“ کا اعزاز

آخری اعزازی تقریب بیزانا ٹاؤن ہال میں منعقد ہوئی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے بہترین تقریر وئی کے باپ نے کی تھی۔ ہر ایک کی طرح اس نے بھی مشاہدہ کیا تھا کہ شادی پر بن بلائے مہمانوں میں سکیورٹی پولیس کے بہت سے افراد شامل تھے۔ اس نے اپنی بیٹی سے محبت، ملک سے میری مخلصانہ وابستگی اور سیاستدان کی حیثیت سے میرے خطرناک کریئر کا ذکر کیا۔ جب وئی نے پہلی بار اسے شادی کا بتایا تھا تو وہ کہہ اٹھا تھا ”لیکن تم تو ایک جیل کے پرندے سے شادی کر رہی ہو“ اب شادی کے موقع پر اس نے کہا کہ وہ مستقبل کے متعلق پر امید نہیں اور ایسے مشکل دنوں میں ایسی شادی بغیر کسی رو رعایت کے جانچی جائے گی اس نے وئی سے کہا کہ وہ ایک ایسے شخص سے شادی کر رہی ہے جو پہلے ہی تحریک آزادی سے شادی کر چکا ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کی خوش نصیبی کے لیے دعا کی اور یہ کہتے ہوئے اپنی تقریر ختم کی ”اگر تمہارا شوہر جادوگر ہے تو تم ضرور ایک جادوگرنی بن جاؤ گی“ یہ سمجھانے کا ایک انداز

تھا کہ تمہیں اپنے شوہر کی پیروی کرنی چاہیے خواہ وہ کوئی بھی راہ اختیار کرے۔ پھر اس تقریب میں میری بہن امے کینی نے میری طرف سے تقریر کی۔

تقریب کے اختتام پر شادی کے کیک کا ایک ٹکڑا دلہن کیلئے لپیٹ دیا گیا تا کہ دلہا کے آبائی گھر لے جائے اور اس سے شادی کے دوسرے مرحلے کا آغاز ہو۔ لیکن اس تقریب کی نوبت نہ آئی کیونکہ میری رخصت کی مدت ختم ہو رہی تھی اور ہمیں جوہانس برگ لوٹنا پڑا وِنی نے کیک کا وہ ٹکڑا حسب روایت احتیاط سے محفوظ کیا ہوا تھا ہمارے مکان نمبر 8115 آرلینڈو ویسٹ میں ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے دوستوں اور خاندان والوں کا ایک بڑا اجتماع تھا ایک بھیڑ ذبح کی گئی اور ہمارے اعزاز میں ضیافت دی گئی۔

ہنی مون کے لیے وقت تھا نہ پیسے اور ہماری زندگی تیزی سے روٹین میں ڈھل گئی جس پر مقدمہ بغاوت حاوی تھا۔ ہم صبح بہت جلدی جاگتے، عموماً چار بجے میری روانگی سے پہلے وِنی ناشتا تیار کرتی۔ پھر میں مقدمہ بغاوت کی عدالت جانے والی بس پکڑتا یا اپنے دفتر جا نکلتا۔ جہاں تک ممکن تھا سہ پہریں اور شامیں اپنے دفتر میں اس کوشش میں گزرتیں کہ ہماری پریکٹس چلتی رہے اور کچھ کمائی ہو۔ شامیں اکثر سیاسی کام اور اجلاسوں کی نذر ہو جاتیں۔ مجاہد آزادی کی بیوی اکثر ایک بیوہ کے مانند ہوتی ہے، اس وقت بھی جب اس کا شوہر جیل سے باہر ہو اگرچہ مجھ پر غداری کا مقدمہ چل رہا تھا وِنی نے مجھے ایک پر امید مقصد دیا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے زندگی کا ایک نیا اور دوسرا موقع ملا ہو۔ اس سے میری محبت نے مجھے اس جدوجہد کے لیے نئی قوت فراہم کی جو مستقبل قریب میں درپیش تھی۔

ہماری ہڑتال ناکام رہی

1958ء میں ملک کو درپیش بڑا مسئلہ عام انتخابات کا تھا یہ "عام" اس لحاظ سے تھے کہ ان میں تیس لاکھ سفید فام تو حصہ لے سکتے تھے مگر ایک کروڑ تیس لاکھ افریقیوں

میں سے کوئی بھی نہیں ہم نے غور وخوض کیا کہ اس پر احتجاج کیا جائے یا نہیں مرکزی مسئلہ یہ تھا کہ کیا ایسے انتخابات سے جن میں صرف گورے حصہ لے سکتے ہیں، افریقیوں کے لیے کوئی فرق پڑے گا؟ جہاں تک اے این سی کا تعلق تھا، اس کا جواب یہ تھا کہ ہم لاتعلق نہیں رہ سکتے خواہ ہمیں انتخابی عمل سے باہر رکھا جائے۔ ہم انتخابات سے خارج تھے مگر غیر متاثر نہیں تھے۔ نیشنل پارٹی کی شکست ہمارے اور سارے افریقیوں کے مفاد میں تھی،

اے این سی نے اپریل میں انتخابات کے دوران دوسری تنظیموں کے تعاون سے ایک تین روزہ ہڑتال کی کال دی کارخانوں اور دکانوں میں ریلوے اسٹیشنوں اور بس سٹاپوں پر، ریستورانوں اور ہسپتالوں میں اور گھر گھر پمفلٹ بانٹے گئے۔ اس مہم کا بڑا نعرہ تھا نیشنلسٹوں کو جانا چاہیے! ہماری تیاریوں نے حکومت کو پریشان کر دیا انتخابات سے چار دن پہلے حکومت نے حکم نامہ جاری کیا کہ کسی بھی شہری علاقے میں دس سے زیادہ افریقیوں کا اجتماع غیر قانونی ہوگا۔

مجوزہ احتجاج، بائیکاٹ یا کام چھوڑ ہڑتال سے ایک رات پہلے کال کے لیڈروں کو زیر زمین چلے جانا تھا تاکہ پولیس یلغار ناکام بنائی جا سکے جو لازماً عمل میں آنی تھی ابھی پولیس کی طرف سے چوبیس گھنٹے ہماری نگرانی شروع نہیں ہوئی تھی اور ایک دو روز کے لیے غائب ہو جانا آسان تھا۔ ہڑتال سے پہلی رات والٹر آلیور موسز کوٹانی جے بی مارکس، ڈان نلومی، ڈوما نوکوی اور میں آرلینڈو میں اپنے معالج ڈاکٹر انتھاتو موٹلانا کے گھر رہے اگلی صبح بہت سویرے ہی ہم اسی علاقے میں ایک اور گھر میں منتقل ہو گئے جہاں ہم شہر بھر میں دوسرے رہنماؤں سے فون پر رابطہ کر سکتے تھے۔ ان دنوں مواصلاتی رابطے بہت اچھے نہیں تھے، خصوصاً ٹاؤن شپس میں جہاں بہت کم لوگوں کے پاس فون تھے، چنانچہ ہڑتال کی نگرانی و رہنمائی کرنا ایک مایوس کن کام تھا۔ اگلی صبح سویرے ہم نے اپنے آدمی ٹاؤن شپس میں اہم مقامات پر یہ دیکھنے کے

لیے روانہ کیے کہ لوگ ریل گاڑیوں، بسوں اور ٹیکسیوں پر کام پر جا رہے ہیں یا نہیں وہ بری خبریں لائے بسیں اور گاڑیاں لوگوں سے بھری ہوئی تھیں لوگ ہڑتال کو نظر انداز کر رہے تھے تب ہم نے اس امر پر توجہ دی کہ وہ شریف آدمی جس کے گھر میں ہم مقیم تھے، کہیں نظر نہیں آ رہا۔ وہ چپکے سے کھسک کر کام پر چلا گیا تھا۔ ہڑتال ناکامی سے دوچار ہو رہی تھی۔

اب ہم نے طے کیا کہ ہڑتال ختم کر دی جائے۔ تین روزہ ہڑتال جو پہلے ہی دن ختم کر دی جائے، ایک دن کی ناکامی ہوتی ہے اور جو ہڑتال تین دن مسلسل ناکام رہے، وہ سخت ناکامی قرار پاتی ہے۔ پسپائی رسوا کن تو تھی لیکن ہم محسوس کرتے تھے کہ پسپا نہ ہونا زیادہ رسوا کن ہوگا۔ ہماری طرف سے ہڑتال ختم کرنے کے اعلان کے بعد آدھ گھنٹے کے اندر اندر سرکار کے زیر انتظام ساؤتھ افریقن براڈ کاسٹنگ کارپوریشن (ایس اے بی سی) نے ہمارا اعلان عین میں نشر کر دیا۔ بالعموم ایس اے بی سی، اے این سی کو یکسر نظر انداز کرتی تھی۔ صرف شکست کی صورت میں ہمارے نام ان کی نشریات میں آتے تھے۔ اس مرتبہ تو انہوں نے ہمارے فیصلے کی ستائش بھی کی۔ اس پر موسز کوتانی کو بڑا تاؤ آیا۔ ایس اے بی سی پر ہماری تعریف ناقابل برداشت ہے اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا کوتانی نے اعتراض کیا کہیں ہم بہت جلد اقدام کر کے حکومت کے ہاتھوں میں کھیل تو نہیں رہے۔ یہ تشویش بجا تھی لیکن فیصلے افتخار یا ہراس کی بنا پر نہیں کیے جاتے بلکہ خالص سٹراٹیجی کی بنا پر ہوتے ہیں اور یہاں سٹراٹیجی کا تقاضا تھا کہ ہم ہڑتال ختم کر دیں یہ حقیقت کہ دشمن نے ہماری پسپائی کا استحصال کیا تھا اس امر کی دلالت نہیں کرتی تھی کہ ہم نے پسپا ہو کر غلطی کی تھی۔

لیکن بعض علاقوں تک یہ پیغام نہ پہنچ سکا کہ ہڑتال ختم کر دی گئی ہے جبکہ ایسے علاقے بھی تھے جنہوں نے ہماری کال حقارت سے ٹھکرا دی پورٹ ایلز بتھ میں جو اے این سی کا گڑھ تھا، پہلے دن کی نسبت دوسرے اور تیسرے دن ہڑتال بہتر رہی،

تاہم مجموعی طور پر ہم اس حقیقت کو چھپا نہیں سکتے تھے کہ ہڑتال ناکامی سے دوچار ہوئی ہے اور جب ووٹ پڑے تو ''مرتے کو ماریں شاہ مدار'' کے مصداق نیشنلسٹوں کے ''عوامی ووٹوں'' میں دس فیصد سے زائد اضافہ ہو چکا تھا۔

ملازمہ کا صاف انکار

ہم نے اس امر پر گرما گرم بحث مباحثہ کیا کہ کیا ہمیں جبری اقدامات کرنے چاہئیں تھے۔ کیا ہمیں ''پکٹس'' سے کام لینا چاہیے تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کو جبراً ان کے کام پر جانے سے روک دیا جائے؟ سخت موقف رکھنے والوں کا کہنا تھا کہ اگر ہم پکٹوں کا اہتمام کرتے تو ہڑتال کامیابی سے ہمکنار ہوتی۔ لیکن میں نے ہمیشہ ایسے ہتھکنڈوں کی مخالفت کی۔ عوام کی آزادانہ حمایت پر انحصار بہترین حکمت عملی ہے، بصورت دیگر یہ حمایت کمزور اور چمپت ہو جاتی ہے۔ ایک سیاسی تنظیم کو پناہ گاہ ہونا چاہیے، قید خانہ نہیں۔ تاہم اگر تنظیم یا عوام کی اکثریت کوئی فیصلہ کر لے تو اکثریت کے مفادات میں اقلیت کے خلاف بعض صورتوں میں جبر سے کام لیا جا سکتا ہے۔ ایک اقلیت خواہ وہ کتنی ہی بلند آہنگ کیوں نہ ہو، اسے اکثریت کی رائے کو ناکام بنانے کا حق نہیں دیا جا سکتا۔

اپنے گھر میں، میں نے مختلف قسم کا جبر استعمال کرنے کی کوشش کی مگر بے سود عید المتھم خولو میری ہی عمر کی سوتھو بولنے والی عورت ان دنوں ہماری خانگی معاون تھی۔ عیدا ایک ملازمہ سے زیادہ گھر کی فرد تھی اور میں اسے ''بہن'' کہہ کر بلاتا تھا۔ عیدا فوجی چستی کے ساتھ گھر چلاتی تھی اور وِنی میں اس کے احکام برضا و رغبت مانتے تھے۔ میں اس کے حکم پر اکثر دوڑ کر کام کرتا۔

ہڑتال سے پہلے دن میں عیدا اور اس کے بارہ سالہ بیٹے کو گاڑی میں گھر لا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اگلے روز کے لیے میری کچھ قمیصیں دھو کر استری کر دے۔ جواب میں طویل خاموشی طاری رہی اور پھر عیدا نے میری طرف مڑ کر کہا ''آپ

خوب جانتے ہیں کہ میں یہ نہیں کرسکتی'' اس کے لہجے کی نفرت چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

میں اس کے ردعمل کی شدت پر حیران رہ گیا میں نے پوچھا ''کیوں نہیں؟''

''کیا آپ بھول گئے کہ میں بھی ایک کارکن ہوں؟'' اس نے قدرے اطمینان سے کہا ''کل میں ہڑتال پر ہوں گی، اپنی قوم اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ!''

اس کے بیٹے نے میری پریشانی بھانپ لی اور اس نے اپنے طفلانہ میں یہ کہہ کرتناؤ کم کرنے کی کوشش کی انکل نیلسن آپ سے ہمیشہ بہن کا سا برتاؤ کرتے ہیں، ایک کارکن کا سا نہیں۔ اس پر وہ تیخ پا ہوکر اپنے بیٹے سے کہنے لگی ''لڑکے! اس وقت تم کہاں تھے جب میں اس گھر میں اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہی تھی؟ اگر میں تمہارے انکل نیلسن کے خلاف شدت سے نہ لڑی ہوتی تو آج مجھ سے بہن کا سا برتاؤ نہ ہوتا'' عید اگلے روز کام پر نہ آئی اور میری قمیصیں استری کے بغیر رہیں۔

بیوی سیاستدان بن گئی

بہت کم معاملات اتنی اعصابی کشاکش کے حامل تھے جتنا عورتوں کے ''پاسوں'' کا معاملہ حکومت عورتوں پر پاس مسلط کرنے کے عزم سے پیچھے نہیں ہٹ رہی تھی اور عورتیں اس کی مزاحمت کرنے کے عزم سے دست کش نہیں ہو رہی تھیں۔ اگرچہ حکومت اب پاسوں کو ''ریفرنس بکس'' کہنے لگی تھی، مگر عورتوں کو بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ انہیں اب بھی دس پونڈ جرمانے یا ایک ماہ قید کی سزا ہوسکتی تھی اگر وہ ریفرنس بک پیش کرنے میں ناکام رہتیں۔

1957ء میں اے این سی ویمنز لیگ کی کوششوں سے حوصلہ پا کر ملک بھر میں خواتین نے، دیہی علاقوں میں اور شہروں میں، حکومت کے اس اصرار کے خلاف شدید ردعمل ظاہر کیا کہ وہ ہر وقت پاس اپنے ہمراہ رکھیں عورتیں حوصلہ مند، مستقل مزاج، پرجوش اور ان تھک تھیں اور پاسوں کے خلاف ان کے احتجاج نے حکومت

مخالف احتجاج کا ایک ایسا معیار قائم کر دیا جس کی پہلے کوئی مثال نہ تھی، چنانچہ چیف لوتھولی نے کہا تھا ''جب عورتیں آزادی کی جدوجہد میں سرگرم حصہ لے رہی ہیں تو زمین پر کوئی طاقت ہمیں اپنے عرصہ زندگی میں آزادی حاصل کرنے سے نہیں روک سکتی۔''

پورے جنوب مشرقی ٹرانسوال میں، سٹینڈرٹن، ہائیڈل برگ، بالفور اور دوسرے مقامات پر ہزاروں عورتوں نے احتجاج کیا۔ مقدمہ بغاوت کے وقفے میں فرانس بارڈ اور فلورنس ماٹو میلا نے اپنے آبائی شہر پورٹ ایلزبتھ میں پاس رکھنے سے انکار کے لیے خواتین کو منظم کیا۔ اکتوبر میں جوہانس برگ میں سنٹرل پاس آفس کے باہر خواتین کا ایک بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا اور انہوں نے ان عورتوں کو بھگا دیا جو پاس لینے آئی تھیں اور ان کلرکوں کو بھی جو اس دفتر میں کام کرتے تھے۔ اس طرح پاس آفس میں کام بند ہو گیا۔ پولیس نے سینکڑوں عورتیں گرفتار کر لیں۔

ان گرفتاریوں کے تھوڑا عرصہ بعد ایک روز ونی اور میں آرام کر رہے تھے جب اس نے مجھے خاموشی سے بتایا کہ وہ آرلینڈو کی خواتین کے گروہ میں شامل ہونے کا ارادہ رکھتی ہے جو اگلے روز پاس آفس کے باہر احتجاج کریں گی۔ میں قدرے چکرا گیا۔ اگرچہ میں اس کی حب الوطنی پر خوش تھا اور میں نے اس کی جرات کی تعریف کی مگر میں اس کے اس فیصلے پر چونک اٹھا ونی ہماری شادی کے بعد سے روز افزوں سیاست زدہ ہو رہی تھی اور اس نے اے این سی ویمنز لیگ کی آرلینڈو برانچ میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور اس سلسلے میں ہر آن خود میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

اب میں نے اسے بتایا کہ ''میں تمہارے فیصلے کی تائید کرتا ہوں لیکن میں تمہیں تمہارے اس اقدام کی سنگینی سے آگاہ کیے دیتا ہوں یہ ایک اقدام تمہاری زندگی کو یکسر بدل ڈالے گا'' افریقی معیار سے ونی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی

اور جنوبی افریقہ میں زندگی کی بعض ناخوشگوار تر حقیقتوں سے بچی ہوئی تھی۔ کم از کم اسے یہ فکر کبھی لاحق نہیں ہوئی تھی کہ اس کا اگلا کھانا کہاں سے آئے گا۔ ہماری شادی سے پہلے وہ اضافی دولت اور آسائش کے حلقوں میں در آئی تھی اور یہ ایسی زندگی تھی جو مجاہدین آزادی کی اکثر مفلسانہ زندگی سے بہت مختلف تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ اگر وہ گرفتار ہوگئی تو اس کا آجر یقیناً اسے ملازمت سے جواب دے دے گا، اور یہ آجر صوبائی انتظامیہ تھی اور ہم دونوں جانتے تھے کہ یہ اس کی قلیل آمدنی ہی تھی جس سے گھر کا خرچ چلتا تھا اور یہ کہ اسے بطور سوشل ورکر غالباً دوبارہ کام نہیں ملے گا کیونکہ اس کی قید کے نتیجے میں پبلک ادارے اسے ملازم رکھنے سے کترائیں گے۔ آخری بات یہ تھی کہ وہ حاملہ تھی، چنانچہ میں نے اسے جسمانی سختیوں اور جیل کی رسوائیوں سے متنبہ کیا۔ میرا یہ ردعمل بظاہر سخت تھا لیکن ایک شوہر اور ایک رہنمائے تحریک کی حیثیت سے میں اسے اپنی ذمے داری خیال کرتا تھا کہ اس کے اس اقدام کے ممکنہ نشیب وفراز اس کے سامنے کھول کر رکھ دوں۔ میرے اپنے احساسات ملے جلے تھے کیونکہ ایک شوہر اور ایک لیڈر کے تفکرات ہمیشہ اکٹھے نہیں ہوتے۔

افریقی خواتین کا بے نظیر احتجاج

لیکن ونی ایک پرعزم ہستی ہے اور میرا خیال ہے کہ میرے قنوطی ردعمل نے اس کے عزم کو اور مضبوط بنا دیا۔ وہ میری پوری بات سنتی رہی اور پھر اس نے مجھ سے کہہ دیا کہ وہ ایک ارادہ کر چکی ہے اور اس پر قائم ہے۔ اگلی صبح میں نے اسے ناشتے کے لیے جلدی اٹھا دیا اور ہم والٹر کے ہاں اس کی بیوی البرٹینا سے ملنے گئے جو تحریک احتجاج کی ایک رہنما تھی پھر ہم نے موٹر آرلینڈو میں پھنفینی اسٹیشن کی طرف موڑ دی جہاں سے عورتیں ٹاؤن جانے والی ریل گاڑی پکڑتی تھیں اس کے گاڑی پر چڑھنے سے پہلے میں اس سے ہم آغوش ہوا ونی گھبرائی ہوئی مگر پرعزم تھی جب وہ کھڑکی سے میری طرف ہاتھ ہلا رہی تھی تب میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک طویل اور

خطرناک سفر پر چل نکلی ہے جس کے انجام کے بارے میں ہم دونوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا۔

سینکڑوں عورتیں جو ہانس برگ کے وسط میں سنٹرل پاس آفس کے باہر جمع تھیں ان میں بوڑھی بھی تھیں اور جوان بھی بعض کی پشت پر بچے سوار تھے بعض قبائلی کمبل پہنے ہوئے تھیں جبکہ اوروں نے چست سوٹ پہن رکھے تھے۔ بعض قبائلی کمبلی پہنے ہوئے تھیں جبکہ اوروں نے چست سوٹ پہن رکھے تھے۔ وہ گاتی، مارچ کرتی اور نعرے لگاتی تھیں۔ منٹوں کے اندر مسلح پولیس نے ان کا گھیراؤ کر لیا۔ ان سب کو گرفتار کر کے بسوں میں دھکیلا اور مارشل سکوائر پولیس اسٹیشن لے چلے۔ عورتیں بسوں میں بھی خوشی سے نعرے لگا رہی تھیں۔ بعض رپورٹروں سے کہہ رہی تھیں ''ہماری میڈموں سے کہہ دو ہم کل کام پر نہیں آئیں گی'' اس روز ایک ہزار سے زیادہ خواتین گرفتار کی گئیں۔

میں اس لیے باخبر نہیں تھا کہ میں ایک گرفتار شدہ عورت کا شوہر تھا بلکہ اس لیے کہ منڈیلا اور ٹیمبو کو بیشتر گرفتار شدگان کی قانونی نمائندگی کے لیے بلایا گیا تھا۔ میں فوراً قیدیوں سے ملنے اور ان کی ضمانت کرانے کے لیے مارشل سکوائر پولیس اسٹیشن لے چلے۔ عورتیں بسوں میں بھی خوشی سے نعرے لگا رہی تھیں۔ بعض رپورٹروں سے کہہ رہی تھیں ''ہماری میڈموں سے کہہ دو ہم کل کام پر نہیں آئیں گی'' اس روز ایک ہزار سے زیادہ خواتین گرفتار کی گئیں۔

میں اس لیے باخبر نہیں تھا کہ میں ایک گرفتار شدہ عورت کا شوہر تھا بلکہ اس لیے کہ منڈیلا اور ٹیمبو کو بیشتر گرفتار شدگان کی قانونی نمائندگی کے لیے بلایا گیا تھا میں فوراً قیدیوں سے ملنے اور ان کی ضمانت کرانے کے لیے مارشل سکوائر کی طرف چل دیا۔ میں نے ونی سے ملاقات کی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ دمک اٹھا اور وہ برہنہ پا پولیس سیل میں بہت خوش نظر آتی تھی۔ یوں لگتا تھا مجھے اس نے ایک بہت بڑا تحفہ دیا

تھا جس کے متعلق وہ سمجھتی تھی کہ مجھے خوش کردے گا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے تم پر فخر ہے لیکن میں وہاں ٹھہر کر باتیں نہ کرسکا کیونکہ مجھے بہت سا قانونی کام نپٹانا تھا۔

اگلے دن کے اختتام تک گرفتار شدگان کی تعداد دو ہزار تک پہنچ گئی اور بہت سوں کو فورٹ بھیج دیا گیا جہاں انہیں مقدمہ چلنے کا انتظار کرنا تھا۔ اس سے نہ صرف میرے اور آلیور کے لیے بلکہ پولیس اور جیل حکام کے لیے بھی گھمبیر مسائل پیدا ہو گئے۔ جیل میں ان سب کو رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ وہاں بہت کم کمبل، بہت کم چٹائیاں اور ٹائلٹس اور بہت کم خوراک تھی۔ فورٹ کے اندر حالات ابتر اور غلیظ تھے۔ جہاں اے این سی کے بہت سے لوگ مجھ سمیت عورتوں کی ضمانتیں کرانے کے لیے بے چین تھے، وہاں ویمنز لیگ کی نیشنل پریذیڈنٹ للیان انگوائی اور ساؤتھ افریقن ویمنز فیڈریشن کی سیکرٹری کا خیال تھا کہ احتجاج کو حقیقی اور موثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ خواتین اتنا عرصہ جیل میں گزاریں جتنے عرصے کے لیے مجسٹریٹ انہیں جیل بھیجنے کا حکم دیں۔ میں نے ان سے بحث وتکرار کی مگر انہوں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ عورتوں کا معاملہ ہے اور اس میں اے این سی اور بے قرار شوہروں کو دخل نہیں دینا چاہیے۔ میں نے للیان سے کہا کہ اسے فیصلہ کرنے سے پہلے خود عورتوں سے اس مسئلے پر رائے لینی چاہیے، چنانچہ میں اسے جیل کی کوٹھڑیوں تک لے گیا تاکہ وہ قیدیوں کا عندیہ معلوم کرسکے۔ بہت سی اس خیال سے مایوس تھیں کہ ان کی ضمانت ہو جائے گی کیونکہ انہیں کافی حد تک آگاہ نہیں کیا گیا تھا کہ جیل میں ان پر کیا بیتے گی۔ مفاہمانہ اقدام کے طور پر میں نے للیان کو مشورہ دیا کہ عورتیں دو ہفتے جیل میں گزار لیں اور اس کے بعد ان کی ضمانتیں کرالی جائیں گی۔

اگلے دو ہفتوں کے دوران میں نے گھنٹوں عدالت میں وقت گزارا اور خواتین کی ضمانتیں کرانے کا اہتمام کیا۔ بعض مایوس تھیں اور انہوں نے اپنا غصہ مجھ پر نکالا۔ ''منڈیلا! میں تمہارے اس طرح کیس بھگتانے سے تنگ آ گئی ہوں'' ایک عورت نے

مجھ سے کہا۔ ''اگر آج ضمانت نہ ہوئی تو میں دوبارہ عدالت میں پیش نہیں ہوں گی'' رشتے داروں اور فنڈ جمع کرنے والے تنظیموں کے تعاون سے ہم دو ہفتوں کے اندر ان سب کی ضمانتیں کرانے میں کامیاب ہو گئے۔

دو گوری لڑکیوں کا جرم

وِنی اپنے جیل کے تجربات سے کبیدہ خاطر نہیں لگتی تھی۔ اگر اسے مشکلات پیش آتیں تو وہ مجھ سے کسی صورت ان کا ذکر نہ کرتی۔ جب وہ جیل میں تھی تو دو اٹھارہ انیس برس کی افریکنر نگران عورتوں سے اس کا دوستانہ ہو گیا۔ وہ ہمدردانہ اور پر شوق تھیں اور وِنی کی ضمانت پر رہائی کے بعد ہم نے انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے دعوت قبول کر لی اور ریل گاڑی پر آرلینڈو آئیں۔ ہم نے گھر میں انہیں ظہرانہ دیا اور اس کے بعد وِنی انہیں ٹاؤن شپ کی سیر کرانے لے گئی۔ وِنی اور دونوں جیل نگران تقریباً ہم عمر تھیں اور ان کی خوب نبھ رہی تھی۔ وہ یوں ایک دوسری کی باتوں پر ہنستی تھیں جیسے باہم بہنیں ہوں۔ دونوں لڑکیوں نے پر لطف دن گزارا اور یہ کہہ کر وِنی کا شکریہ ادا کیا کہ وہ دوبارہ آنا چاہیں گی۔ لیکن جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ یہ ناممکن تھا کیونکہ انہیں آرلینڈو آنے کے لیے نان یورپین ڈبے میں بیٹھنا پڑا تھا۔ دراصل کوئی ''سفید ریل گاڑی'' آرلینڈو نہیں آتی تھی کیونکہ کوئی سفید فام آرلینڈو کا رخ ہی نہیں کرتا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ دونوں لڑکیاں گوروں کی نظروں میں آ گئی تھیں اور جلد ہی یہ بات عام ہو گئی کہ فورٹ جیل کی دو افریکنر نگران لڑکیاں وِنی اور منڈیلا سے ملنے آرلینڈو گئی تھیں۔ ہمارے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر ان کے لئے ضرور مسئلہ بن گیا کیونکہ جیل حکام نے انہیں برطرف کر دیا۔ ہم نے دوبارہ انہیں دیکھا نہ ان کے بارے میں کچھ سنا۔

یہودی معبد میں پیشی

جنوری میں ابتدائی سماعت کے اختتام سے لے کر چھ ماہ تک ہم انتظار کرتے اور

رسمی طور پر مقدمہ چلنے کے لیے تیاری کرتے رہے جو اگست 1958ء میں شروع ہونے والا تھا۔ حکومت نے ایک خصوصی ہائیکورٹ قائم کی، جس کے تین رکن تھے۔ مسٹر جسٹس ایف ایل رمف صدر تھے اور مسٹر جسٹس کینیڈی اور مسٹر جسٹس لڈورف باقی دو ارکان۔ ججوں کا یہ پینل امید افزا نہیں تھا۔ تینوں جج گورے تھے اور حکمران پارٹی سے تعلقات رکھتے تھے۔ جج رمف ایک قابل شخص اور اوسط جنوبی افریقی گوروں سے زیادہ باخبر تھے۔ تاہم افواہ یہ تھی کہ وہ ایک خفیہ افریکنر تنظیم بروڈر بونڈ کے رکن تھے جو افریکنر اقتدار کو مستحکم بنانے کی علمبردار تھی۔ جج لڈورف نیشنل پارٹی کے ایک معروف رکن تھے اور جج کینڈی کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ کینیڈی کی شہرت پھانسی دینے والے جج کی سی تھی جنہوں نے دو گورے پولیس والوں کے قتل پر تیئس افریقیوں کے ایک گروہ کو سزائے موت سنائی تھی۔

مقدمہ شروع ہونے سے کچھ پہلے حکومت نے ایک اور ناخوشگوار داؤ کھیلا۔ اس نے اعلان کیا کہ جائے مقدمہ جوہانسبرگ سے پریٹوریا تبدیل کی جا رہی ہے جو چھپیس میل دور تھا۔ مقدمہ ایک سابق صومعہ میں چلنا تھا جسے ایک عدالت میں تبدیل کیا گیا تھا۔ سب ملزمان اور ہمارے وکلاء صفائی جوہانسبرگ میں رہتے تھے اس لیے ہم روزانہ پریٹوریا کا سفر اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ مقدمہ اب ہمارا زیادہ وقت لیتا اور ہمارے زیادہ پیسے خرچ ہوتے تھے اور ان دونوں چیزوں کی ہمارے پاس فراوانی نہیں تھی۔ پہلے جو لوگ اپنے کام جاری رکھ سکتے تھے ان کے لیے یہ اس لیے ممکن تھا کہ عدالت ان کے کام کی جگہوں کے نزدیک تھی۔ اب جائے مقدمہ کی تبدیلی ہمارے جذبوں کو کچلنے کی ایک کوشش تھی کیونکہ اس صورت میں ہم اپنی قدرتی حمایتیوں سے دور ہو جاتے تھے۔ پریٹوریا نیشنل پارٹی کا گڑھ تھا اور وہاں اے این سی کا وجود برائے نام تھا۔ تقریباً تمام بانوے ملزمان ایک کھڑکھڑاتی تکلیف دہ بس میں پریٹوریا لے جائے گئے جس میں نشستوں کی جگہ سخت لکڑی کے تختے لگے تھے۔ بس

روزانہ صبح چھ بجے روانہ ہوتی اور پرانے صومعہ پہنچنے میں دو گھنٹے لیتی۔ آنے جانے میں ہمیں تقریباً پانچ گھنٹے لگتے یہ وقت ہم بال بچوں کے لیے خوراک، رہائش اور کپڑوں کی خریداری کی ادائیگی کے لیے روپیہ کمانے میں بہتر طور پر خرچ کر سکتے تھے۔

عدالت میں رسہ کشی

ایک بار پھر ہمیں روشن دماغ اور زور آور وکلاء صفائی مل گئے جن کی قیادت اسرائیل میسلز کر رہے تھے اور بران فشر، ریکس ویلشن، ورنن بیرانج، سڈنی کینٹ رج، ٹونی اوڈاوڈ اور جی نکولس ان کے معاون تھے۔ مقدمہ چلنے کے پہلے دن انہوں نے ایک خطرناک قانونی مہم جوئی کے ساتھ اپنی جارحانہ وکالت کا مظاہرہ کیا جس کا ہم نے وکلاء کے ساتھ مشورے سے فیصلہ کیا تھا ہی میلسز ڈرامائی طور پر اٹھے اور وہ درخواست کی کہ لڈورف اور رمف دونوں جج اس بنا پر مقدمہ سننے سے انکار کر دیں کہ دونوں متصادم مفادات رکھتے تھے جو انہیں ہمارے مقدمے کے لیے لاگ منصف بننے سے روکتے تھے۔ اس پر کمرہ عدالت میں سرگوشیاں ہوئیں جو سنی جا سکتی تھیں۔ وکیل صفائی نے کہا کہ رمف نے پہلے ہی 1952ء کے ڈیفائنس ٹرائل کے جج کی حیثیت سے موجودہ مقدمے کے بعض پہلوؤں پر فیصلہ دیا تھا اور اس لیے یہ انصاف کا تقاضا نہیں تھا کہ وہ اس مقدمے کو سنیں۔ ہمارا موقف یہ تھا کہ لڈورف متعصب ہیں کہ انہوں نے 1954ء میں پولیس کے وکیل کی حیثیت سے حکومت کی نمائندگی کی تھی جب ہیرلڈ ولپ نے کانگریس آف دی پیپل کے ایک اجلاس سے پولیس کے اخراج کے لیے عدالت میں چارہ جوئی کی تھی۔

یہ ایک خطرناک سٹراٹیجی تھی کیونکہ ہم آسانی سے یہ قانونی لڑائی جیت سکتے تھے مگر جنگ ہار جاتے اگرچہ ہم لڈورف اور رمف دونوں کو نیشنل پارٹی کے مضبوط حامی قرار دیتے تھے لیکن ملک میں اس سے کئی بدتر جج تھے جو ان کی جگہ لے سکتے تھے۔

دراصل جہاں ہم چاہتے تھے کہ لڈورف بینچ سے نکل جائیں، وہیں خفیہ طور پر پرامید تھے کہ رمف جن کا ہم ایک دیانت دار جج کی حیثیت سے احترام کرتے تھے، کیس سننے سے انکار کا فیصلہ نہیں کریں گے۔ رمف ہمیشہ قانون کے علمبردار رہے خواہ ان کی اپنی سیاسی رائے کچھ ہی کیوں نہ ہو اور ہمیں یقین تھا کہ جب قانون کی بات ہو گی تو ہم بے گناہ ہی قرار پائیں گے۔

اس سوموار کو فضاء پر انتظار تھی جب سرخ لبادوں میں تین جج کمرہ عدالت میں تشریف فرما ہوئے۔ جج لڈورف نے اعلان کیا کہ وہ مقدمہ سننے سے دست بردار ہو رہے ہیں اور مزید یہ کہا کہ وہ سابقہ مقدمے کے بارے میں یکسر بھول گئے ہیں۔ لیکن رمف نے مقدمے سے علیحدہ ہونے سے انکار کر دیا اور اس کے بجائے یقین دہانی کرائی کہ ڈیفائنس کیس میں ان کا فیصلہ اس مقدمے کے حوالے سے ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو گا۔ ہم ان کے اس فیصلے سے خوش ہوئے۔ لڈورف کی جگہ حکومت نے مسٹر جسٹس بیکر کو تعینات کیا جسے ہم شروع ہی سے صحیح سمجھتے تھے اور جس کی نیشنل پارٹی سے کوئی وابستگی نہیں تھی۔

اس پہلی مہم کی کامیابی کے بعد ہم نے دوسری مہم آزمائی جو اتنی ہی خطرناک تھی۔ ہم نے ایک طویل اور تفصیلی بحث چھیڑ دی جس میں استغاثہ پر اعتراضات کیے۔ ہمارا دعویٰ یہ تھا کہ استغاثہ مبہم اور قطعیت سے عاری ہے۔ ہم نے یہ دلیل بھی دی کہ صریح غداری ثابت کرنے کے لیے تشدد کی منصوبہ بندی ہونا ضروری ہے اور استغاثہ کے لیے اپنے اس دعوے کی مثالیں پیش کرنا لازم ہے کہ ہم تشدد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہماری بحث کے آخر میں یہ واضح تھا کہ تینوں جج اسے تسلیم کرتے ہیں۔ اگست میں عدالت نے قانون انسداد کمیونزم کے تحت عائد کردہ دو الزامات میں سے ایک مسترد کر دیا۔ دو ماہ سے زیادہ عرصے کی قانونی رسہ کشی کے بعد 13 اگست کو حکومت نے اچانک استغاثہ واپس لینے کا اعلان کر دیا۔ یہ غیر معمولی

بات تھی لیکن ہم حکومت کے انحرافی ہتھکنڈوں سے اس قدر آشنا تھے کہ ہم خوشیاں نہیں منا سکتے تھے۔ ایک ماہ بعد استغاثہ نے زیادہ محتاط الفاظ میں ایک نئی فرد جرم جاری کرتے ہوئے اعلان کیا کہ فی الحال مقدمہ صرف تیس ملزمان کے خلاف چلے گا اور دوسروں پر بعد میں مقدمہ چلایا جائے گا میں پہلے تیس افراد میں شامل تھا جو سب اے این سی کے ارکان تھے۔

نئی فرد جرم کے تحت استغاثہ پر اب لازم تھا کہ تشدد کرنے کے ارادے کو ثابت کرے۔ پیرو نے کہا کہ ملزمان جانتے تھے کہ فریڈم چارٹر کے مقاصد کے حصول کا مطلب ہوگا ''حکومت کا بذریعہ تشدد تختہ الٹنا'' قانونی رسہ کشی 1959ء کے وسط تک جاری رہی جب عدالت نے بقیہ اکسٹھ کے خلاف حکومت کا استغاثہ مسترد کر دیا۔ اس کے بعد والے مہینوں میں کمرہ عدالت کی کارروائی اس قدر خشک ترین قانونی مہم جوئی پر مشتمل تھی جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ حکومت کے کیس کا بودا پن ظاہر کرنے میں وکلائے صفائی کی کامیابی کے باوجود حکومت کی ڈھٹائی برقرار تھی، چنانچہ وزیر عدل نے کہا ''یہ مقدمہ چلتا رہے گا خواہ اس پر کتنے ہی لاکھوں کروڑوں پونڈ خرچ آئیں یہ کتنا ہی طول پکڑے، اس کی پروا نہیں۔''

دنیا میں کیا لائی ہو؟

4 فروری 1958ء کی نصف شب کے فوراً بعد میں ایک میٹنگ سے لوٹا تو ونی کو گھر میں اکیلے اور درد سے کراہتے پایا۔ یہ درد زدہ تھا۔ میں اسے جلدی سے برگوانا تھ ہسپتال لے گیا مگر ہمیں بتایا گیا کہ ابھی زچگی میں کئی گھنٹے رہتے ہیں۔ میں وہاں کچھ دیر ٹھہرا حتیٰ کہ مجھے مقدمہ بھگتنے کے لیے پریٹوریا روانہ ہونا پڑا۔ مقدمے کی کارروائی سے فارغ ہو کر میں نے ڈوما نوکری کے ہمراہ فوراً جوہانس برگ کا رخ کیا اور ہسپتال پہنچ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ ماں اور بیٹی ٹھیک ٹھاک ہیں۔ میں نے نوزائیدہ بچی کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اسے حقیقی منڈیلا کہہ کر پکارا یا میرے

رشتے دار چیدا لڈنگی نے اس کا نام ''زینانی'' تجویز کیا جس کا مطلب ہے ''تم دنیا میں کیا لائی ہو؟'' یہ ایک شاعرانہ نام ہے جو ایک چیلنج کے انداز میں تجویز کرتا ہے کہ اس کے حامل کو معاشرے کو کچھ دینا چاہیے۔

میری والدہ ونی کی مدد کے لیے ٹرانسکائی سے آ گئیں اور انہوں نے زینانی کو ایک ژہوسا چتسمہ دینے کا اہتمام کیا۔ اس کے لیے ایک قبائلی معالج انیا نگا کو بلایا گیا تا کہ وہ بچی کو روایتی نباتاتی غسل دے۔ لیکن ونی اس کی شدید مخالف تھی۔ اس کے خیال میں یہ غسل غیر صحت مند اور دقیانوسی تھا۔ اس کے بجائے اس نے بچی کے جسم پر زیتون کا تیل ملا، اوپر جانسز بے بی پاوڈر چھڑکا اور اس کے منہ میں شارک مچھلی کا تیل انڈیلا۔

جیسے ہی ونی چلنے پھرنے لگی میں اپنے بچوں کی ماں کو گاڑی چلانا سکھانے لگا۔ گاڑی چلانا ان دنوں مردوں کا شغل تھا۔ بہت کم عورتیں، افریقی عورتیں تو بہت کم، ڈرائیور سیٹ پر نظر آتی تھیں۔ لیکن ونی آزاد خیال تھی اور ڈرائیونگ سیکھنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے اور یہ مفید بھی تھا کیونکہ میں زیادہ تر باہر رہتا تھا اور اس کے شوفر کے طور پر کام نہیں کر سکتا تھا۔ شاید میں ایک بے صبر استاد ہوں یا شاید میری شاگرد ہی گرم دماغ تھی، جب میں نے آرلینڈو کی ایک نسبتاً چوڑی اور خاموش سڑک پر ونی کو سبق دینے کی کوشش کی تو ہمارا گیئر بدلنے پر بھی جھگڑا ہوتا رہا۔ آخر کار جب اس نے میری کئی ہدایات نظر انداز کر دیں تو میں کار سے نکل کر گھر چلا آیا۔ لگتا تھا ونی نے میری شاگردی کے بجائے اپنے طور پر بہتر کارکردگی دکھائی کیونکہ وہ اگلے ایک گھنٹے تک ٹاؤن شپ کے گرد اکیلی گاڑی چلاتی رہی۔ اس وقت تک ہم مفاہمت کے لیے تیار ہو چکے تھے اور یہ ایک ایسی کہانی ہے جس کا بعد میں کئی بار ذکر کر کے ہم ہنس دیتے تھے۔

عائلی زندگی اور امومت (Mother hood) نے ونی کو اعتدال اور توازن

بخشتا۔ اس وقت وہ پچیس برس کی جوان عورت تھی جسے ابھی اپنا ایک کردار مکمل طور پر تشکیل دینا تھا۔ میری تشکیل پہلے ہی ہو چکی تھی اور میں قدرے بے ڈھب تھا۔ میں جانتا تھا کہ دوسرے لوگ اکثر اسے ''منڈیلا کی بیوی'' گردانتے ہیں۔ بلاشبہ اس کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ میرے سائے میں اپنا تشخص قائم کر سکے، چنانچہ میں نے پوری پوری کوشش کی کہ وہ اپنے طور پر کھل سکے اور اس نے میری طرف سے کسی مدد کے بغیر ایسا کیا۔

نئ افریقی قوم پرست جماعت

6 اپریل 1959ء کو جو جان فان رائیبک کے راس امید پر اترنے کی برسی تھی، ایک نئ تنظیم نے جنم لیا جو ملک کی بڑی افریقی سیاسی تنظیم کی حیثیت سے اے این سی کی حریف بننے اور گوروں کے غلبے کو مسترد کرنے کی راہ پر گامزن ہوئی جس کا آغاز تین صدیاں پہلے ہوا تھا۔ آرلینڈ و کمیونل ہال میں ملک بھر سے چند سو نمائندے اکٹھے ہوئے اور انہوں نے پان افریکنسٹ کانگریس تشکیل دی۔ اس افریقی جماعت نے اے این سی کی کثیر نسلی پالیسی صریحاً مسترد کر دی۔ ہماری طرح جنہوں نے پندرہ سال پہلے یوتھ لیگ تشکیل دی تھی، نئ جماعت کے بانی بھی یہ سمجھتے تھے کہ اے این سی غیر ضروری طور پر صلح جو ہے، عوام سے کوئی ہوئی ہے اور اس پر غیر افریقیوں کا تسلط ہے۔

رابرٹ سوبکوی پان افریکنسٹ کانگریس (پی اے سی) کے صدر منتخب ہوئے اور پوٹلاکو لیبا لو نیشنل سیکرٹری دونوں سابق اے این سی یوتھ لیگی تھے۔ پی اے سی نے اپنا ایک منشور اور دستور پیش کیا۔ سوبکوی نے اپنے افتتاحی خطاب میں یہ کال دی ''افریقیوں کی حکومت افریقیوں کے ذریعے اور افریقیوں کے لیے'' پی اے سی نے اعلان کیا کہ وہ سفید فاموں کی برتری ختم کرنے اور ایک ایسی حکومت قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ جو اصلاً افریقی، معناً اشتراکی اور شکلاً جمہوری ہو۔ انہوں نے

کمیونزم اور اس کی تمام شکلوں کو مسترد کر دیا اور ان کے خیال میں گورے اور ہندوستانی ''غیر ملکی اقلیتی گروہ'' یا اجنبی (Alines) تھے جن کے لیے جنوبی افریقہ میں کوئی جگہ نہیں تھی جنوبی افریقہ صرف افریقیوں کے لیے تھا اور کسی اور کے لیے نہیں۔

پی اے سی کی پیدائش ہمارے لیے کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ افریکنسٹ یعنی قوم پرست افریقی تین سال سے زیادہ عرصے سے بلند آہنگ میں اپنی شکایات کا اظہار کر رہے تھے۔ 1957ء میں انہوں نے نیشنل کانفرنس میں ٹرانسوال ایگزیکٹو کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد منظور کروانا چاہی تھی مگر انہیں شکست ہوئی تھی۔ انہوں نے 1958ء میں الیکشن ڈے سٹے ایٹ ہوم یعنی انتخابی عمل سے الگ رہنے کی پالیسی کی مخالفت کی تھی اور اس کے نتیجے میں ان کے لیڈر پوٹلا کو لیبالو کو اے این سی سے نکال دیا گیا تھا۔ نومبر 1958ء کی اے این سی کانفرنس میں افریکنسٹوں کے ایک گروہ نے یہ کہہ کر منشور آزادی (فریڈم چارٹر) کی مخالفت کا اعلان کیا تھا کہ اس سے افریقی قوم پرستی کے اصولوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

پی اے سی کا دعویٰ تھا کہ اس نے ان اصولوں سے تحریک حاصل کی ہے جو 1912ء میں اے این سی کے قیام کے وقت اپنائے گئے تھے مگر اس کے نظریات زیادہ تر جذباتی افریقی قوم پرستی سے اخذ کیے گئے تھے جو انطوان لمبیڈی اور اے پی اڈا نے 1944ء میں یوتھ لیگ کی بنیاد رکھتے وقت پیش کی تھی۔ پی اے سی کے اجتماعات میں اس دور کے محاوروں اور نعروں کا وافر استعمال ہوتا تھا ''افریقہ'' افریقیوں کے لیے اور ''ریاستہائے متحدہ افریقہ'' لیکن اس کی علیحدگی کا فوری سبب اس کا منشور آزادی اور کانگریس الائنس لیڈرشپ میں گوروں اور ہندوستانیوں کی موجودگی پر اعتراض تھا۔ یہ جماعت بین النسلی تعاون کی زیادہ تر اس لیے مخالف تھی کہ اس کے خیال میں گورے، کمیونسٹ اور ہندوستانی اے این سی پر تسلط جمانے

آئے تھے۔

پی اے سی کے بانی سب میرے اچھے جاننے والے تھے۔ رابرٹ سوبکوی ایک پرانا دوست تھا۔ وہ محاورتاً جنٹل مین اور سکالر تھا۔ اس کے رفقائے کار اسے ''پروف''یعنی پروفیسر کہا کرتے تھے۔ وہ اصولوں کی قیمت ادا کرنے کے لیے ہر آن تیار رہتا اور اس بنا پر میں ہمیشہ اس کا احترام کرتا تھا۔ پوٹلا کولیبالو، پیٹر رابو روکو اور زیفانیا موتھوپنگ سب دوست اور سابق رفقائے کار تھے۔ مجھے یہ جان کر حیرت اور قدرے بدمزگی ہوئی کہ میرے سیاسی مرشد گاؤر رادیبے نے پی اے سی میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ مجھے یہ بات بڑی عجیب لگی کہ کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے ایک سابق رکن نے ایک ایسی تنظیم سے منسلک ہونے کا فیصلہ کیا جو اس وقت مارکسزم کو کھلم کھلا مسترد کرتی تھی۔

جن لوگوں نے پی اے سی کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کی تھی، ان میں سے بہت سوں نے ایسا ذاتی خفگیوں یا مایوسیوں کے باعث کیا تھا اور وہ جہد آزادی کے آگے بڑھنے کا نہیں سوچ رہے تھے بلکہ ان کی سوچ کا محور حسد یا انتقام کے اپنے احساسات تھے۔ میرا ہمیشہ یہ یقین رہا ہے کہ ایک مجاہد آزادی بننے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے کئی ذاتی احساسات دبا دیئے جائیں جو انسان کو ایک عوامی تحریک کے جزو کے بجائے ایک جداگانہ فرد ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ وہ تو لاکھوں کروڑوں عوام کی آزادی کے لیے لڑ رہا ہوتا ہے، ایک فرد کی عظمت کے لیے نہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ انسان ایک روبوٹ بن جائے اور تمام ذاتی احساسات اور رجحانات کو فارغ خطی دے دے۔ لیکن جس طرح ایک مجاہد آزادی اپنے خاندان کو عوام کے ماتحت کر دیتا ہے اسی طرح اسے اپنے ذاتی احساسات کو تحریک کے ماتحت رکھنا چاہیے۔

مجھے پی اے سی کا رویہ اور اس کے نظریات خام لگے۔ ایک فلسفی نے ایک بار کہا

تھا کہ اگر ایک شخص جوانی میں لبرل یعنی آزاد خیال نہیں اور بڑھاپے میں قدامت پسند نہیں تو یہ انوکھی اور نا مناسب بات ہے۔ میں ایک قدامت پسند نہیں۔ انسان جب بلوغت اور پختگی کو پہنچتا ہے تو وہ لامحالہ اپنی جوانی کے بعض خیالات ونظریات کو غیر ترقی یافتہ اور تجربے سے عاری قرار دیتا ہے۔ جہاں مجھے افریکنسٹوں کے نظریات سے ہمدردی تھی اور ان میں سے کئی کبھی میرے بھی نظریات تھے، وہیں میرا اس امر پر یقین تھا کہ جہد آزادی انسان سے تقاضا کرت ہے کہ وہ مفاہمتیں کرے اور اس قسم کا نظم وضبط قبول کرے جس کی وہ جوانی میں مزاحمت کرتا تھا جبکہ وہ اشتعال پذیر اور جلد باز تھا۔

امریکی دفتر خارجہ کی محبوبہ

پی اے سی نے ایک ڈرامائی اور بیش تمنائی (Over ambitious) پروگرام پیش کیا جو مسائل کے شتابی حل تجویز کرتا تھا۔ اس کا سب سے ڈرامائی اور سادہ لوح وعدہ یہ تھا کہ 1963ء کے آخر تک آزادی حاصل کر لی جائے گی اور اس نے افریقیوں پر زور دیا کہ وہ اس تاریخی ساعت کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھیں۔ اس میں وعدہ کیا گیا تھا ''1960ء میں ہم پہلا قدم اٹھائیں گے اور 1963ء میں ہمارا آخری قدم حریت اور آزادی کی طرف اٹھے گا۔'' اگرچہ اس پیشگوائی نے عوام میں امید اور جوش پیدا کر دیا جو انتظار کرتے کرتے تھک گئے تھے مگر ایک تنظیم کے لیے یہ ہمیشہ خطرناک بات ہوتی ہے کہ وہ ایسے وعدے کرے جو وہ پورے نہ کر سکے۔

پی اے سی کی کمیونزم دشمنی کے باعث وہ مغربی پریس اور امریکی وزارت خارجہ کی محبوبہ بن گئی جس نے اس کی پیدائش کو افریقن لیفٹ کے دل میں خنجر جان کر اس کی پذیرائی کی حتیٰ کہ نیشنل پارٹی کو پی اے سی کی شکل میں ایک پوشیدہ اتحادی نظر آیا۔ انہیں پی اے سی میں اپنی کمیونزم دشمنی کا عکس دکھائی دیا اور جداگانہ ترقی کے اپنے نظریئے کی حمایت جھلکتی نظر آئی۔ گورے نیشنلسٹ بھی بین النسلی تعاون کو مسترد

کرتے تھے، چنانچہ نیشنل پارٹی اور امریکی دفتر خارجہ دونوں اپنے مقاصد کی خاطر نئی جماعت کی اہمیت اور جسامت میں مبالغہ آرائی کو موزوں خیال کرتے تھے۔

اگرچہ ہم نے اسے خوش آمدید کہا کہ پی اے سی کے ذریعے کوئی بھی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لے سکتا ہے مگر اس تنظیم کا کردار تقریباً ہمیشہ تباہ کن ثابت ہوا۔ انہوں نے نازک موقع پر عوام کو تقسیم کردیا اور اسے فراموش کرنا مشکل تھا۔ جب ہم عام ہڑتال کی کال دیتے تو وہ لوگوں کو کام پر جانے کی تلقین کرتے اور ہم جو بھی اعلان کرتے اس کا توڑ کرنے کے لیے وہ گمراہ کن بیانات دیتے۔ بایں ہمہ پی اے سی نے میرے اندر ایک امید کی جوت جگادی کہ اگرچہ اس کے بانی اے این سی ہی سے ٹوٹنے والے آدمی ہیں مگر ہمارے دونوں گروہوں کے مابین اتحاد ممکن ہے۔ میں نے سوچا کہ ایک بار گرما گرم حجت بازی ٹھنڈی پڑ گئی تو جہد آزادی کا مشترک عنصر ہمیں باہم قریب لے آئے گا۔ اس یقین سے ولولہ پا کر میں نے ان کے پالیسی بیانوں اور سرگرمیوں پر خصوصی توجہ دی تاکہ اختلافات کے بجائے قربتیں تلاش کرسکوں۔

پی اے سی کی افتتاحی کانفرنس کے اگلے دن میں نے سوبکوی سے ملاقات کی اور اس کے صدارتی خطاب کی ایک نقل اور دستور اور دوسرا پالیسی مواد طلب کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری دلچسپی سے خوش ہوا ہے اور اس نے کہا کہ وہ اس امر کو یقینی بنائے گا کہ مجھے میرا مطلوبہ مواد مل جائے۔ کچھ عرصہ بعد میں دوبارہ اس سے ملا اور اپنی طلب یاد دلائی اور اس نے کہا کہ مطلوبہ مواد سپرد ڈاک کردیا گیا ہے اور وہ جلد مل جائے گا۔ بعد میں میں پوٹلاکو لیبالو سے ملا اور اس سے کہا ''یار! تم لوگ اپنے مطبوعہ مواد کا مجھ سے وعدہ کرتے رہتے ہو مگر دیتے نہیں ہو'' اس کا جواب تھا ''نیلسن! ہم نے تمہیں وہ مواد نہ دینے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تم صرف اس لیے مانگتے ہو کہ اسے مہم پر حملہ کرنے کے لیے استعمال کرسکو'' میں نے یہ بے بنیاد خیال

اس کے ذہن سے نکالا تو وہ نرم پڑ گیا اور پھر میرا مطلوبہ سارا مواد مجھے مل گیا۔

8بنتوستانوں کا قیام

1959ء میں پارلیمنٹ نے پروموشن آف بنتو سیلف گورنمنٹ ایکٹ منظور کر لیا جس نے آٹھ جداگانہ نسلی بنتوستان قائم کر دیئے۔ یہ اس نسلی امتیاز کی بنیاد تھی جسے مملکت ''گروٹ'' یا گرینڈ اپارٹ ہائڈ قرار دیتی تھی۔ قریباً انہی دنوں حکومت نے ایکس ٹینشن آف یونیورسٹی ایجوکیشن ایکٹ کے نام سے ایک مغالطہ انگیز قانون نافذ کیا جو گرینڈ اپارٹ ہائڈ کی دوسری کڑی تھا اور اس نے نسلی طور پر ''کھلی'' یونیورسٹیوں میں غیر سفید فاموں کا داخلہ بند کر دیا۔ ''قانون خود اختیاری بنتو'' کے نفاذ کے وقت وزیر بنتو انتظامیہ وترقی ڈی ویٹ نیل نے کہا ''ہر فرد اور پاپولیشن گروپ کی بہبود کا اہتمام اس کے اپنے قومی دائرے ہی میں بہتر طور پر ہو سکتا ہے۔ افریقی سفید فام کمیونٹی میں کبھی مدغم نہیں ہو سکتے۔''

بنتوستان پالیسی کا غیر اخلاقی پہلو اس امر سے ظاہر تھا کہ ستر فیصد عوام کو صرف تیرہ فیصد زمین دی جا رہی تھی۔ نئی پالیسی کے تحت اگرچہ افریقیوں کی دو تہائی آبادی نام نہاد سفید علاقوں میں رہتی تھی مگر شہریت انہیں صرف اپنے ''ٹرائبل ہوم لینڈز'' یا ''قبائلی علاقوں'' میں مل سکتی تھی۔ اس اسکیم نے ہمیں سفید علاقوں میں آزادی دی نہ ان علاقوں میں آزادی سے ہمکنار کیا جنہیں وہ ''ہمارے'' علاقے گردانتے تھے۔ وروورڈ نے کہا ''بنتوستانوں کے قیام سے اس قدر خیر خواہی پیدا ہو گی کہ وہ باغیوں کی پرورش گاہ کبھی نہیں بنیں گے۔''

حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی دیہی علاقوں میں کھلبلی مچ گئی تھی بہت کم علاقے اتنے ہٹیلے پن سے لڑے جتنا زیرست کا علاقہ جہاں چیف ابرام موبا کی قیادت میں نام نہاد بنتو اتھاورٹیز کے خلاف عوامی مزاحمت ہوئی تھی۔ ایسے علاقے عموماً پریس کی نظروں میں نہیں آتے تھے اور حکومت وہاں تک عام رسائی نہ ہونے کی وجہ سے اپنی

ظالمانہ کارروائیوں کی پردہ پوشی کرنے میں کامیاب رہتی۔ بیسیوں بے گناہ لوگ گرفتار کیے گئے۔ انہیں اذیتیں دی گئیں اور جیلوں میں ڈالا گیا، ان پر پابندیاں عائد کی گئیں، انہیں مارا پیٹا گیا، قتل کیا گیا اور ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ سیخوخونے لینڈ کے لوگوں نے بھی بغاوت کر دی اور ان کے سرداروں مورو موشے سیخوخونے، گاڈفر سیخوخونے اور دوسرے کونسلر گرفتار کیے گئے اور ان پر پابندیاں لگائی گئیں۔ ایک سیخوخونے چیف ''کولا نے گولوکو'' کو جو حکومت کا مہرہ خیال کیا جاتا تھا قتل کر دیا گیا 1960ء تک سیخوخونے لینڈ کی مزاحمت کھلی محاذ آرائی میں بدل گئی اور لوگ ٹیکس ادا کرنے سے انکار کرنے لگے۔

زیرست اور سیخوخونے لینڈ میں اے این سی کی شاخوں نے احتجاجی سرگرمیوں میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انتہائی سختیوں کے باوجود زیرست کے علاقے میں اے این سی کی بہت سی نئی شاخیں وجود میں آ گئیں جن میں سے ایک نے تقریباً دو ہزار ارکان بھرتی کیے۔ سیخوخونے لینڈ اور زیرست جنوبی افریقہ میں پہلے علاقے تھے جہاں حکومت نے اے این سی پر پابندی عائد کی اور یہ ان دور دراز علاقوں میں ہماری قوت کا ثبوت تھا۔

مشرقی پونڈولینڈ میں بھی احتجاجی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی جہاں حکومت کے آلہ کاروں پر حملے کیے گئے اور انہیں قتل کیا گیا۔ تھیمبولینڈ اور زولو لینڈ نے شدید مزاحمت کی اور یہ ان علاقوں میں تھے جو سب سے آخر میں زیر اطاعت آئے تھیمبو لینڈ میں 1955ء سے مزاحمت جاری تھی اور سابا تا احتجاجی تحریک کا ایک حصہ تھا۔

میرے لیے یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی کہ لوگوں کے غم و غصے کو میرے بھتیجے اور ایک وقت کے اتالیق ''کے ڈی ماتن زیما'' کے خلاف بھڑکایا گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ والی دونگا حکومت سے تعاون کر رہا تھا۔ میری وہ تمام اپیلیں جو گذشتہ برسوں میں اس سے کی گئی تھیں، رائیگاں گئی تھیں۔ ایسی اطلاعات ملی تھیں کہ ماتن

زیما کے ہیڈ کوارٹر سے آنے والے امپس یعنی روایتی جنگجوؤں نے وہ دیہات جلا دیئے تھے جنہوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔اس پر کئی قاتلانہ حملے کیے گئے۔یہ حقیقت بھی تکلیف دہ تھی کہ وِنی کا باپ ماتن زیما کا مشیر اور نہ ڈگمگانے والا حامی تھا یہ وِنی کے لیے بڑی مشکل صورتحال تھی اس کا باپ اور اس کا خاوند ایک ہی معاملے میں متضاد سمتوں میں سرگرم تھے۔اسے اپنے باپ سے محبت تھی لیکن اس کی سیاست کو وہ مسترد کرتی تھی۔

بہت سے مواقع پر ٹرانسکائی سے قبائلی اور رشتے دار آرلینڈو میں میرے پاس آئے اور انہوں نے شکایت کی کہ ان کا سردار حکومت سے تعاون کر رہا ہے۔سابا تو نتو اتھارٹیز کا مخالف تھا اور اس نے سر تسلیم خم نہ کیا،لیکن میرے ملاقاتیوں کو خدشہ تھا کہ ماتن زیما اسے برطرف کر دے گا اور آخر کار یہی ہوا۔ایک موقع پر دالی دونگا خود ٹریزن ٹرائل کے دوران ملنے آیا اور میں اسے پریٹوریا اپنے ساتھ لے گیا۔کمرہ عدالت میں، عسی میلز نے ججوں سے اس کا تعارف کرایا اور انہوں نے اس کے مطابق اسے عزت سے کرسی پر بٹھایا۔لیکن باہر ''ملزمان'' کے درمیان اس کی اتنی عزت افزائی نہ ہوئی۔وہ مختلف ''ملزمان'' سے درشتی کے ساتھ باتیں کرتا رہا جو اسے غدار قرار دیتے تھے۔اس نے اعتراض کیا کہ وہ ''جداگانہ ترقی'' کے مخالف کیوں ہیں للیان انگوئی نے برملا کہا تائی یینی اویادی لا لولوا منٹو (اللہ! یہ آدمی تو اشتعال پھیلانے والا ہے)

عدلیہ کی چکی

کہا جاتا ہے کہ اللہ کی چکی بہت آہستہ آہستہ پیستی ہے۔لیکن جنوبی افریقہ کے عدالتی نظام کا مقابلہ کارخانہ قدرت بھی نہیں کر سکتا 3 اگست 1959ء کو یعنی ہماری گرفتاریوں کے دو سال آٹھ مہینے اور قانونی رسہ کشی کے پورے ایک سال بعد پرانے صومعہ میں اصل مقدمہ شروع ہوا۔آخر کار ہم پر رسمی طور پر فرد جرم عائد ہوئی

اور ہم سب تیسوں نے جرم کا اقرار نہ کیا۔

ہمارے وکلاءِ صفائی کی قیادت ایک بار پھر عسی میلز کر رہا تھا اور سڈنی کینٹ رج، برام فشر اور ورنن بیرانج اس کے معاون تھے۔ اس مرتبہ مقدمہ جلد شروع ہو گیا تھا۔ مقدمے کے پہلے دو مہینوں میں حکومت نے ریکارڈ کے طور پر دو ہزار دستاویزات پیش کیں اور دو سو دس گواہ بلائے، جن میں سے دو سو اسپیشل برانچ کے ارکان تھے۔ ان مخبروں نے اعتراف کیا کہ وہ الماریوں اور بستروں کے نیچے چھپ کر اے این سی کے ارکان کے بھیس میں کام کرتے رہے اور انہوں نے ہر وہ داؤ کھیلا جس سے وہ ہماری پارٹی کے اجلاسوں کی کارروائی سن سکتے تھے۔ تاہم کئی دستاویزات اور تقریریں جو حکومت نے پیش کیں وہ عام دستاویزات اور عام تقریریں تھیں جو سب کے لیے دستیاب تھیں۔ پہلے کی طرح سرکاری شہادت کتابوں، کاغذات اور دستاویزات پر مشتمل تھی جو ان چھاپوں کے دوران ملزمان سے چھینی گئی تھیں جو 1952ء اور 1956ء کے دوران مارے گئے تھے۔ ان میں پولیس کے وہ نوٹس بھی شامل تھے جو اس عرصے میں کانگریس کی میٹنگز کے دوران لیے گئے۔ پہلے کی طرح سپیشل برانچ آفیسرز کی تیار کردہ ہماری تقریروں کی رپورٹیں بالعموم گڈمڈ اور غیر درست رپورٹوں کے باعث ہمیں ایسی باتوں پر جرمانہ ہو سکتا ہے جو ہم نے نہیں کہیں، ایسی باتوں پر سزائے قید ہو سکتی ہے جو ہم نے نہیں سنیں اور ایسے کاموں پر ہمیں پھانسی ہو سکتی ہے جو ہم نے نہیں کیے۔

ظہرانے کے وقفے میں ہمیں باہر قریب ہی پادری کی رہائش گاہ کے کھلے باغیچے میں بیٹھنے کی اجازت دی گئی جہاں ہمیں کھانا فراہم کیا گیا جو بلاشبہ مسز تھایا ناگی پلائی اور ان کی سہیلیوں نے تیار کیا تھا۔ وہ تقریباً روزانہ ہمارے لیے ایک مسالے دار ہندوستانی کھانا تیار کرتیں اور صبح و سہ پہر کے وقفوں کے لیے چائے، کافی اور سینڈوچ بناتیں۔ یہ وقفے عدالت سے ایک طرح کی چھوٹی تعطیلات تھے اور ان

کے دوران ہمیں موقع مل جاتا تھا کہ ایک دوسرے سے سیاست پر گفتگو کرسکیں۔اس باغیچے میں جاکارانڈا کے درختوں کے سائے میں گزرنے والے لمحات ہمارے مقدمے کے خوشگوارترین لمحات تھے کیونکہ کئی لحاظ سے یہ مقدمہ ایک عدل کے مقدمے سے زیادہ ہماری قوت برداشت کا امتحان تھا۔

11اکتوبر کی صبح جب ہم عدالت جانے کی تیاری کررہے تھے ہم نے ریڈیو پر ایک اعلان سنا کہ پراسیکیوٹراوسوالڈپیرو دل کے دورے سے اچانک انتقال کر گئے ہیں۔ان کی موت حکومت کے لیے ایک شدید صدمہ تھی اوراس کے بعد سے سرکاری وکلاءکی ٹیم کی اثرآفرینی اورزورکم پڑ گیا۔اس روزعدالت میں جج رمف نے پیروکو جذباتی خراج تحسین پیش کیا اوران کی قانونی مہارت اورراست بازی کی تعریف کی۔اگرچہ ہم ان کی غیرموجودگی میں فائدہ اٹھاسکتے تھے،ہم نے ان کی موت پر خوشیاں نہ منائیں۔ہم نے اپنے مخالف کے لیے ایک خاص احترام کارویہ اختیار کر لیا تھا کیونکہ پیرو کے نفرت انگیز سیاسی نظریات کے باوجودوہ ایک ہمدردانسان تھے اوران میں اس حکومت کی شدید ذاتی نسل پرستی عنقاتھی جس کی وہ نمائندگی کررہے تھے ان کاہمیں نرمی سے ''افریقن'' کہناان کے برتری پسند سیاسی رجحانات سے لگا نہیں کھاتا تھا(جبکہ ہمارے ایک وکیل وقتاًفوقتاًاپنی لسانی لغزش سے ہمیں نیٹو زیعنی مقامی قراردیتے تھے(ایک عجیب صورتحال میں پرانے صومعہ کے اندرہماری چھوٹی سی دنیامتوازن لگتی جب ہرصبح ہم دیکھتے کہ پیرواپنی میزپردائیں بازوکااخبارنووے آرڈرپڑھ رہے ہیں۔پیرو نے ابتدائی جرح کی ایک سوجلدیں ہمیں مفت فراہم کر کے بڑی فیاضی کاثبوت دیا تھا۔اس سے ہمارے وکلاء کی خاصی رقم بچ گئی تھی۔ ایڈووکیٹ ڈی فوس سرکاری ٹیم کے نئے سربراہ بنےمگران میں اپنے پیشرو کی سی فصاحت اورتیزی نہیں تھی۔

پیرو کی وفات کے فوراًبعداستغاثہ نے اپنی شہادتیں مکمل کرلیں اورماہرگواہوں پر

جرح کا آغاز پروفیسر مرے سے کیا جو کمیونزم کے ماہر خیال کیے جاتے تھے اور ابتدائی جرح کے دوران اپنے موضوع کے حوالے سے انتہائی نا اہل ثابت ہوئے تھے۔میسلر کی بے پناہ جوابی جرح کے دوران مرے نے تسلیم کیا کہ آزادی کا منشور دراصل ایک انسان دوست دستاویز ہے جو جنوبی افریقہ کے سخت حالات میں غیر سفید فاموں کے فطری ردعمل اور ان کی آرزوؤں کا مظہر ہے۔

استغاثہ کا دھماکہ

مرے واحد سرکاری گواہ نہیں تھا جس نے سرکاری کیس کو بڑھاوا دینے کے لیے کچھ نہ کیا۔سرکاری شہادتوں کی موٹی موٹی جلدوں اور ماہر گواہوں کی طول طویل گواہیوں کے باوجود استغاثہ اس امر کا ٹھوس ثبوت پیش کرنے میں ناکام رہا تھا کہ اے این سی نے تشدد کی سازش کی تھی اور ''ملزمان'' اس کا علم رکھتے تھے۔پھر مارچ میں استغاثہ نے اعتماد کے ایک نئے دھماکے کا مظاہرہ کیا۔وہ اپنی سب سے تباہ کن شہادت پیش کرنے والے تھے۔اخبارات میں بڑے شوروشغب کے بعد حکومت نے رابرٹ ریشا کی خفیہ طور پر ریکارڈ کردہ تقریر عدالت میں سنوائی۔یہ تقریر اس نے 1956ء میں ہماری گرفتاری سے چند ہفتے پہلے ٹرانسوال والنٹیر انچیف کی حیثیت سے آزادی پسند رضا کاروں کے کمرہ بھر اجتماع کے سامنے کی تھی۔کمرہ عدالت میں کامل خاموشی تھی اور ریکارڈنگ کی گونج اور پس منظر کے شور کے باوجود سامعین کو رابرٹ کا ہر لفظ واضح سنائی دیتا تھا۔ریکارڈ کے الفاظ تھے:

''جب آپ منظم ہوں اور پارٹی آپ سے تشدد نہ کرنے کو کہے تو آپ کو تشدد نہیں ہونا چاہیے،لیکن اگر آپ ایک سچے رضا کار ہیں اور آپ سے متشدد ہونے کے لیے کہا جائے تو آپ کو بالکل متشدد ہو جانا چاہیے۔آپ قتل کیجیے،ضرور قتل کیجیے! یہی میرا پیغام ہے۔''

استغاثہ کا خیال تھا کہ اس نے اپنا کیس ثابت کر دیا ہے۔اخبارات میں ریشا کے

الفاظ شہ سرخیوں میں چھپے اور ان میں سرکاری حلقوں کے فہم وشعور کی باز گشت تھی۔ حکومت کے نزدیک اس تقریر سے اے این سی کے حقیقی اور خفیہ ارادوں کا اظہار ہوتا تھا اور اس سے اے این سی کے عدم تشدد کے عوامی چہرے سے پردہ اٹھتا تھا۔لیکن دراصل رابرٹ ریشا کے الفاظ ایک استعارہ تھے۔وہ ایک شاندار اور پر جوش مقرر تھا اور اس کا استعارے کا انتخاب بدقسمتی تھا۔لیکن جیسا کہ وکلاءصفائی نے ثابت کیا وہ صرف نظم وضبط کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ایک رضا کار کو جو حکم ملے اس پر عمل کرنا چاہیے خواہ وہ ناخوشگواری ہو۔پے بہ پے ہمارے گواہان نے یہ گواہی دی کہ ریشا کی تقریر نہ صرف سیاق وسباق سے ہٹ کر لی گئی ہے بلکہ یہ اے این سی کی پالیسی کی نمائندگی بھی نہیں کرتی۔

استغاثہ نے اپنا کیس 10 مارچ 1960ءکو مکمل کیا اور چار دن بعد ہماری صفائی کا پہلا گواہ پیش ہونا تھا۔ہم مہینوں سے پرسکون تھے لیکن جوں ہی ہم اپنے بیانات کی تیاری کرنے لگے ہم جارحانہ انداز اختیار کرنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ہم دشمن کے حملے بہت عرصے سے برداشت کرتے آرہے تھے۔

صفائی کے بےباک گواہ

اخبارات میں خاصی خیال آرائی ہوتی رہی کہ ہمارا پہلا گواہ چیف لوتھولی ہوگا۔ بظاہر صومت کا خیال بھی یہی تھا، چنانچہ استغاثہ کو بہت پریشانی ہوئی جب 14 مارچ کو ہمارا پہلا گواہ لوتھولی نہیں بلکہ ڈاکٹر ولسن کونکو کی شکل میں سامنے آیا۔

کونکو ایک زولو مویشی پرور کسان تھا جس کا تعلق نٹال کے خوبصورت اکسوپو ضلع سے تھا۔ایک پیشہ ور معالج ہونے کے علاوہ وہ یوتھ لیگ کے بانیوں میں سے ایک تھا، ڈیفائنس کمپین کا ایک سرگرم شریک اور اے این سی کا خزانچی تھا۔اس کا بیان شروع ہونے سے پہلے یونیورسٹی آف واٹوٹرسرانڈ میں اس کے شاندار تعلیمی ریکارڈ کے بارے میں پوچھا گیا، جہاں اس نے میڈیکل کلاس میں سرفہرست رہ کر ڈگری

حاصل کی تھی اور سفید فام لڑکوں اور لڑکیوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ جب کونکو کی اسناد کا حوالہ دیا گیا تو مجھے یہ واضح تاثر ملا کہ جسٹس کینیڈی جو خود بھی نٹال سے تھا، اس نے فخر محسوس کیا نٹال والے اپنے علاقے سے وفاداری کے لیے مشہور ہیں اور وابستگی کا یہ خاص رشتہ رنگ پر بھی غالب آ جاتا ہے۔ کئی اہل نٹال تو خود کو گورے زولو خیال کرتے تھے۔ جسٹس کینیڈی ہمیشہ ایک منصفانہ ذہن والے آدمی سمجھے جاتے تھے اور ولسن کونکو کی مثال سے میں نے بھانپ لیا کہ وہ ہمیں ناقابل توجہ ہنگامہ کھڑا کرنے والوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ وقیع آرزوؤں کے حامل افراد کی حیثیت سے دیکھنے لگا ہے جو تبھی اپنے ملک کی مدد کر سکتے ہیں اگر خود ان کا ملک ان کی مدد کر سکے۔ کونکو کی گواہی کے آخر میں جب اس کی بعض طبی کامرانیوں کا ذکر ہوا تو کینیڈی نے زولو زبان میں جس میں اسے خاصی مہارت تھی کہا ''سنجالوتھینا مازولو'' جس کا مطلب ہے ہم زولو اسی طرح کے ہوتے ہیں الغرض کونکو ایک پرسکون اور گرہ دار گواہ ثابت ہوا جس نے اے این سی کی عدم تشدد سے وابستگی ثابت کر دی۔

اگلے گواہ چیف لوتھولی تھے۔ اپنی عظمت اور اخلاص سے انہوں نے عدالت پر ایک گہرا تاثر قائم کیا۔ وہ ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے، چنانچہ عدالت نے فیصلہ کیا کہ ان کی شہادت کے دوران وہ صرف صبح کے اوقات میں بیٹھے گی۔ ان کی اعلیٰ گواہی کئی دن جاری رہی اور تقریباً تین ہفتے ان پر جوابی جرح ہوئی۔ انہوں نے اے این سی کی پالیسی کے ارتقا کا محتاط اور واضح خاکہ پیش کیا اور استاد اور چیف کی حیثیت سے ان کی سابقہ پوزیشنوں نے ان کے الفاظ میں مزید وزن اور اعتبار پیدا کر دیا۔ ایک سچے مسیحی کی حیثیت سے وہ اس موضوع کو زیر بحث لانے کے لیے انتہائی موزوں شخص تھے کہ کس طرح اے این سی نے نسلی ہم آہنگی کے لیے مخلصانہ جدوجہد کی تھی۔

چیف نے اپنی شہادت میں انسان کی اندرونی نیکی پر اپنے یقین کا ذکر کرتے

ہوئے کہا کہ کس طرح اخلاقی ترغیب اور اقتصادی دباؤ مل کر گورے جنوبی افریقیوں کے دلوں میں تبدیلی لانے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ اے این سی کی عدم تشدد کی پالیسی زیر بحث لاتے ہوئے انہوں نے اس امر پر زور دیا کہ عدم تشدد اور امن پسندی میں ایک فرق ہے۔ امن پسندوں نے اس وقت بھی اپنا بچاؤ کرنے سے انکار کر دیا جب ان پر حملہ کیا گیا لیکن عدم تشدد کے پیروکاروں کا رویہ لازماً یہ نہیں تھا۔ بعض اوقات افراد اور اقوام خواہ وہ عدم تشدد پر عمل پیرا نہ بھی تھے، انہیں اپنا بچاؤ کرنا پڑا جب ان پر حملہ کیا گیا۔

جب میں نے کونکو اور لوتھولی کے بیانات سنے، میں نے سوچا کہ جج غالباً اپنی زندگی میں پہلی بار اپنے خانہ زادوں کو نہیں سن رہے جو وہی کچھ کہتے تھے جس کی ان کے آقا ان کے منہ سے اگلوانے کی خواہش رکھتے تھے بلکہ اب وہ آزاد اور منجھے ہوئے افریقیوں کے منہ سے ان کے سیاسی اعتقادات اور انہیں عملی جامہ پہنچانے کے پرامید طریقوں کے متعلق سن رہے تھے۔

ایڈووکیٹ ٹرین گروو نے چیف پر جوابی جرح کی اور ان کے منہ سے یہ اگلوانے کی سرتوڑ کوشش کی کہ اے این سی پر کمیونسٹوں کا غلبہ تھا اور وہ عوام کے لیے طے شدہ عدم تشدد اور پرتشدد انقلاب برپا کرنے کے ایک خفیہ منصوبے کی دوہری پالیسی پر عمل پیرا تھی۔ چیف نے ٹرین گروو کے الجھاوے میں پڑنے سے انکار کر دیا جس کی طرف وہ انہیں لا رہا تھا۔ وہ مجسم اعتدال تھے، بالخصوص جبکہ ٹرین گروو توازن کا دامن چھوڑتا دکھائی دیتا تھا۔ ایک موقع پر سرکاری وکیل نے انہیں منافقت کا الزام دیا۔ چیف نے وکیل کی اس تہمت کو نظر انداز کرتے ہوئے پرسکون رہ کر بینچ سے کہا ''مائی لارڈ میرا خیال ہے سرکار دیوانی رہی ہے''

لیکن 21 مارچ کو چیف لوتھولی کی شہادت کمرہ عدالت سے باہر پیش آنے والے ایک واقعے کے باعث منقطع ہو گئی۔ اس روز ملک میں ایک اتنا بڑا واقعہ پیش آیا کہ

جب چیف ایک ماہ بعد دوبارہ گواہی دینے آئے تو کمرہ عدالت اور پورا جنوبی افریقہ ایک مختلف جگہ تھے۔

پی اے سی کی پاس مخالف مہم

دسمبر 1959ء کی اے این سی سالانہ کانفرنس ڈربن میں اس شہر کے ہنگامہ خیز پاس مخالف مظاہروں کے دوران منعقد ہوئی۔ کانفرنس نے متفقہ طور پر ایک ملک گیر پاس مخالف مہم چلانے کا فیصلہ کیا جو 31 مارچ کو شروع ہونی تھی اور اس کا نقطہ عروج 26 جون طے پایا تھا جب بڑی تعداد میں پاس جلائے جانے تھے

منصوبہ بندی فوراً شروع ہوگئی 31 مارچ کو مقامی حکام کے پاس وفود بھیجے گئے۔ اے این سی کے عہدیداروں نے ملک کے دورے کیے اور مہم کے بارے میں شاخوں سے بات چیت کی۔ اے این سی کے فیلڈ ورکروں نے بستیوں اور کارخانوں میں پیغام پہنچادیا۔ پمفلٹ، سٹکر اور پوسٹر چھاپ کر ملک میں پھیلا دیئے گئے اور ریل گاڑیوں اور بسوں میں چسپاں کر دیئے گئے۔

ملک بھر کا موڈ سخت تھا۔ حکومت پارٹی پر پابندی عائد کرنے کی دھمکیاں دے رہی تھی اور کابینہ کے وزراء اے این سی کو انتباہ کر رہے تھے کہ اسے جلد ہی ''بے دستانہ مکے'' کے ساتھ کچل دیا جائے گا۔ افریقہ میں ہر کہیں آزادی کی جدوجہد آگے بڑھ رہی تھی 1957ء میں گھانا کی آزاد جمہوریہ کے قیام پر اس کے افریقی اتحاد کے حامی اور نسلی امتیاز کے دشمن رہنما کوامے نکرومہ نے اپنے بیانات سے گورے نیشنلسٹوں کو چوکنا اور جنوبی افریقہ میں اختلاف رائے دبانے میں ان کے عزم کو پختہ تر کر دیا تھا 1960ء میں افریقہ میں سترہ سابقہ نوآبادیوں کو آزادی ملنے والی تھی۔ فروری میں برطانوی وزیراعظم ہیرلڈ میکملن نے جنوبی افریقہ کا دورہ کیا اور پارلیمنٹ کے سامنے ایک تقریر کی جس میں افریقہ میں ''تبدیلی کی ہواؤں'' کے چلنے کا ذکر کیا۔

اس وقت لگتا تھا پان افریکنسٹ کانگریس (پی اے سی) کہیں گم ہو چکی ہے۔ اس

کے رہنما پیروکاروں کی تلاش میں تھے اور انہیں ابھی وہ اقدام شروع کرنا تھا جو انہیں سیاسی نقشے پر مرتسم کرتا۔ وہ اے این سی کی پاس مخالف مہم کو جانتے تھے اور انہیں اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ لیکن کانگریس کی تحریک کا ساتھ دینے کے بجائے انہوں نے اسے سبوتاژ کرنا چاہا۔ پی اے سی نے اعلان کیا کہ وہ 21 مارچ کو اپنی پاس مخالف مہم شروع کر رہی ہے جو ہماری مہم سے دس دن پہلے شروع ہونی تھی۔ یہ تاریخ متعین کرنے کے لیے ان کا کوئی اجلاس نہیں ہوا تھا اور کسی اہمیت کا کوئی تنظیمی کام نہیں کیا گیا تھا۔ یہ موقع پرستی کا دیدہ دلیرانہ اقدام تھا۔ ان کے اقدامات میں دشمن کو شکست دینے سے زیادہ اے این سی کو گہنانے کی خواہش زیادہ کارفرما تھی۔

طے شدہ مظاہروں سے چار دن پہلے سوبکوی نے ہمیں دعوی دی کہ ہم پی اے سی کا ساتھ دیں۔ ان کی یہ دعوت اتحاد کی علامت نہیں تھی بلکہ پی اے سی پر ہونے والی اس تنقید کو روکنے کا ایک ہتھکنڈہ تھی کہ وہ ہمارا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ انہوں نے یہ پیشکش آخری لمحات میں کی تھی، چنانچہ ہم نے ان کی مہم میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ 21 مارچ کی صبح سوبکوی اور اس کی ایگزیکٹو چل کر آرلینڈو پولیس اسٹیشن پہنچے تا کہ انہیں گرفتار کرلیا جائے۔ اپنے اپنے کام پر جانے والے ہزاروں لوگوں نے پی اے سی کے آدمیوں کو نظر انداز کر دیا۔ مجسٹریٹ کی عدالت میں سوبکوی نے اعلان کیا کہ پی اے سی اپنے اس نعرے کے مطابق اپنا دفاع نہیں کرے گی ''نہ ضمانت، نہ صفائی، نہ جرمانہ'' ان کا خیال تھا کہ شرکائے احتجاج کو چند ہفتوں سے زیادہ کی سزا نہیں ملے گی۔ لیکن سوبکوی کو تین ہفتوں کی نہیں بلکہ تین سال کی سزا سنا دی گئی جبکہ جرمانے کا متبادل اختیار بھی نہیں تھا۔

شارپ ویل میں قتل عام

جوہانس برگ میں پی اے سی کی کال کا ردعمل کم سے کم رہا ڈربن، پورٹ ایلزبتھ یا

ایسٹ لندن میں کوئی مظاہرہ نہ ہوا۔ لیکن ایوٹین میں زیڈ بی مولیٹی اور ان کے معاونین جومولیفی اور روسوموزی میک نے پوری ٹاؤن شپ کی حمایت حاصل کر لی جہاں کئی سو آدمیوں نے پاسوں کے بغیر گرفتاریاں پیش کیں۔ کیپ ٹاؤن میں اس کی تاریخ کا سب سے بڑا اینٹی پاس مظاہراہ ہوا۔ کیپ ٹاؤن کے باہر لانگا ٹاؤن شپ میں کم وبیش تیس ہزار افراد سڑکوں پر آئے جن کی قیادت نوجوان طالب علم فلپ گوسانا کر رہا تھا۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا تو ہجوم بے قابو ہو گیا اور اس کے نتیجے میں دو افراد مارے گئے۔ لیکن وہ مقام جہاں خونریز ترین مظاہرے ہوئے، شارپ ویل تھا۔

شارپ ویل، جوہانس برگ کے 35 میل جنوب میں ایک چھوٹا قصبہ تھا جو ایک صنعتی کمپلیکس میں واقع تھا۔ یہاں پی اے سی کے سرگرم لوگوں نے تنظیم سازی کا شاندار کام کیا تھا۔ اول سہ پہر کوئی ہزار افراد کا ہجوم شارپ ویل پولیس اسٹیشن کے گرد جمع ہو گیا۔ مظاہرین غیر مسلح تھے اور نظم وضبط قائم رکھے ہوئے تھے۔ ان کے مقابلے میں پولیس نفری صرف 75 افراد کی تھی اور وہ گھبرائے ہوئے تھے۔ نہ انتباہی گولیاں چلیں اور نہ گولی چلانے کا حکم سنائی دیا۔ پولیس نے بس آناً فاناً ہجوم پر فائر کھول دیا اور خوف سے پلٹ کر بھاگتے مظاہرین پر بھی فائرنگ کرتی رہی۔ جب علاقہ صاف ہوا تو وہاں 69 افریقیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں سے اکثر کی پشت پر گولیاں لگی تھیں جبکہ وہ بھاگ رہے تھے۔ ہجوم پر سات سو سے زیادہ گولیاں چلائی گئیں جن سے چار سو سے اوپر افراد زخمی ہوئے جن میں درجنوں عورتیں اور بچے شامل تھے۔ یہ ایک قتل عام تھا اگلے روز دنیا بھر کے اخبارات نے اس درندگی کی تصویریں صفحہ اول پر شائع کیں۔

شارپ ویل فائرنگ نے قومی خلفشار اور حکومتی بحران پیدا کر دیا۔ امریکی دفتر خارجہ سمیت پورے کرہ ارض سے احتجاجی بیانات کا تانتا بندھ گیا۔ پہلی بار سلامتی

کونسل نے جنوبی افریقہ کے معاملات میں مداخلت کی اور حکومت کو فائرنگ کا الزام دیتے ہوئے اس پر زور دیا کہ وہ نسلی ماوات عمل میں لانے کے اقدامات کرے۔ جوہانس برگ ایکسچینج نے چھلانگ لگائی اور سرمایہ **ملک** سے باہر جانے لگا۔ جنوبی افریقہ کے گورے **ملک** چھوڑ کر چلے جانے کے منصوبے بنانے لگے۔ لبرلز نے وروورڈ پر زور دیا کہ وہ افریقیوں کو مراعات دیں حکومت نے اصرار کیا کہ شارپ ویل ایک کمیونسٹ سازش کا نتیجہ ہے۔

هم نے شناختی پاس جلا دیئے

شارپ ویل کے قتل عام نے **ملک** میں ایک نئی صورتحال پیدا کردی۔ پی اے سی کے رہنماؤں کی موقع پرستی اور خام حکمت عملی کے باوجود شارپ ویل اور لانگا میں اس کے وابستگان نے اپنے مظاہروں میں بڑے حوصلے اور استقلال کا ثبوت دیا۔ ایک ہی دن میں وہ جدوجہد آزادی کی صف اول میں پہنچ گئے تھےاور رابرٹ سوبکوی کی **ملک** کے اندر اور باہر تحریک آزادی کے نجات دہندہ کی حیثیت سے تعریف کی جا رہی تھی۔ ہمیں اے این سی والوں کو جلد از جلد اس نئی صورتحال سے مفاہمت کرنا تھی اور ہم نے ایسا ہی کیا۔

ہمارے چند ارکان والٹر، ڈومانوکوی، جوسلاوو اور میں نے جوہانس برگ میں رات بھر ایک اجلاس منعقد کیااور اپنے ردعمل کا منصوبہ بنایا۔ ہم جانتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح ہمیں ان واقعات کواپنانا اورعوام کوغم وغصہ کے اظہار کا راستہ دینا ہے۔ ہم نے اپنا منصوبہ چیف لوتھولی تک پہنچایا جوانہوں نے فوراً تسلیم کرلیا 26 مارچ کو چیف نے جوہانس برگ میں اپنا پاس علانیہ طور پر جلایا اور دوسروں سے کہا کہ وہ بھی ایسا ہی کریں۔ انہوں نے شارپ ویل کے مظالم پر 28 مارچ کو بطور احتجاج دفاتر میں اور کام پر حاضر نہ ہونے کا اعلان کیا اور اس دن کو ''ماتم کا قومی دن'' قرار دیا۔ پھر آرلینڈو میں ڈومانوکوی اور میں نے سینکڑوں لوگوں اور درجنوں پریس

فوٹوگرافروں کے سامنے اپنے پاس جلائے۔

دو دن بعد 8 مارچ کو ملک بھر میں لاکھوں افریقیوں نے چیف کی کال پر عظیم الشان مظاہرے کیے ایک حقیقی عوامی تنظیم ہی ایسی سرگرمیوں کا اہتمام کرسکتی تھی اور اے این سی نے ہی ایسا کیا۔ کیپ ٹاؤن میں پچاس ہزار افراد شاپ ویل فائرنگ کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے لانگا ٹاؤن شپ میں جمع ہوئے۔ کئی علاقوں میں فسادات پھوٹ پڑے۔ اس پر حکومت نے ہنگامی حالت نافذ کردی، حبس بے جا کے خلاف درخواست دینے کی رعایت معطل کردی اور ہر قسم کی تخریب کاری کے خلاف بے پناہ اختیارات حاصل کرلیے جنوبی افریقہ پر اب مارشل لا مسلط تھا۔

میری نئی گرفتاری

30 مارچ کی رات ڈیڑھ بجے میرے دروازے کی بے موقع بار بار کھٹکھٹاہٹ نے مجھے جگا دیا۔ یہ پولیس کی آمد کی علامت تھی۔ میں نے دل میں کہا ''وقت آ گیا ہے'' اور جب دروازہ کھولا تو نصف درجن مسلح سکیورٹی پولیس والوں کو سامنے پایا انہوں نے پورے گھر کو درہم برہم کردیا اور جو کاغذ ملا اپنی تحویل میں لے لیا۔ ان میں میری والدہ کی ان یادداشتوں کے مسودات بھی تھے جو میں تیار کرتا رہا تھا اور جو خاندانی تاریخ اور قبائلی داستانوں سے متعلق تھیں۔ پھر کبھی میں انہیں دیکھ نہ پایا۔ انہوں نے میری بیوی کو یہ اطلاع دینے سے انکار کردیا کہ مجھے کہاں لے جایا جارہا ہے۔ میں نے صرف ہاتھ کے اشارے سے ونی کو پرسکون رہنے کو کہا کیونکہ تسلی کے الفاظ کہنے کا موقع نہیں تھا۔

تیس منٹ بعد ہم نیو لینڈز پولیس اسٹیشن پہنچ گئے جس سے میں خوب آشنا تھا کیونکہ اپنے موکلان سے ملنے کئی بار وہاں آیا تھا۔ یہ تھانہ صوفیہ ٹاؤن یا اس کی باقیادت میں واقع تھا کیونکہ ماضی کی رتی بستی آبادی اب مسمار شدہ عمارتوں کے کھنڈروں اور خالی پلاٹوں سے عبارت تھی۔ تھانے کے اندر مجھے اپنے بہت سے

ساتھی ملے جنہیں اسی طرح بستروں سے اٹھا کر یہاں لایا گیا تھا۔ جیسے جیسے رات گذری مزید ساتھی پہنچتے گئے۔ صبح تک ہماری تعداد چالیس ہوگئی ہمیں آہنی سلاخوں سے گھرے احاطے میں ٹھونس دیا گیا جہاں آسمان کی چھت تھی اور ایک مدھم بلب روشن تھا۔ جگہ اس قدر تنگ تھی کہ ہم رات بھر کھڑے رہے۔

سوا سات بجے ہمیں ایک کوٹھڑی میں لے جایا گیا جس کے فرش میں اجابت کے لیے ایک سوراخ تھا جہاں سے وہ گٹر میں بہا دی جاتی ہمیں کمبل دیئے گئے نہ خوراک، نہ چٹائیاں اور نہ ٹائلٹ پیپر۔ اجابت کا سورخ بار بار بند ہو جاتا اور کمرے میں بدبو نا قابل برداشت ہو جاتی۔ ہم نے بارہا احتجاج، خوراک کا بھی مطالبہ کیا مگر جواب میں طفل تسلیاں ملیں۔ اس پر ہم نے فیصلہ کیا کہ اگلی مرتبہ دروازہ کھلا تو ہم زور کر کے ملحقہ احاطے میں چلے جائیں گے اور اس وقت تک اس کوٹھڑی میں نہیں لوٹیں گے جب تک ہمیں کھانا فراہم نہیں کیا جاتا۔ ڈیوٹی پر موجود پولیس مین نے آ کر دروازہ کھولا تو وہ ہمارے تیور دیکھ کر وہاں سے کھسک گیا جبکہ ہم کوٹھڑی سے نکل کر احاطے میں چلے آئے۔ چند منٹ بعد ایک سارجنٹ احاطے میں داخل ہوا اور اس نے ہمیں کوٹھڑی کے اندر جانے کا حکم دیا

''اندر چلو'' وہ چیخا ''اگر تم نہیں جاتے تو میں پچاس ڈنڈا بردار لے آؤں گا اور ہم مار مار کر تمہاری کھوپڑیاں توڑ دیں گے'' سانحہ شارپ ویل کے پیش نظر اس کی یہ دھمکی خالی از علت نہیں تھی۔

جیل کمانڈر سے ''گستاخی''

اسٹیشن کمانڈر ہمیں دیکھنے احاطے کے دروازے پر آیا۔ پھر قریب آ کر اس نے مجھے ڈانٹا کہ میں جیبوں میں ہاتھ ڈالے کیوں کھڑا تھا ''کیا افسر کی موجودگی میں تم ایسا رویہ دکھاتے ہو؟'' وہ دھاڑا ''اپنے منحوس ہاتھ جیبوں سے باہر نکالو'' میں نے اپنے ہاتھ مضبوط سے جیبوں میں ڈالے رکھے جیسے میں ایک برفیلے دن چہل قدمی

کر رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے ہاتھ جیبوں سے تبھی باہر نکالوں گا جب ہمیں کھانا دیا جائے گا۔

تین بجے سہ پہر یعنی ہماری تھانے میں آمد کے دس پندرہ گھنٹے بعد مکئی کے پتلے دلیے کی بڑی سی بالٹی لائی گئی مگر برتن ندارد عام حالات میں، اسے کھانے کے قابل خیال نہ کرتا لیکن اس وقت ہم اپنے بے دھلے ہاتھوں سے اسے نعمت غیر مترقبہ جان کر تناول کرنے لگے۔ کھانے کے بعد ہم نے اپنی نمائندگی کے لیے ایک کمیٹی چنی جس میں ڈوما نوکوی اور زیڈ بی مولیٹی پبلسٹی سیکرٹری پان افریکنسٹ کانگریس اور میں شامل تھے مجھے اس کا ترجمان چنا گیا۔ ہم نے فوراً غیر موزوں حالات پر احتجاج اور اس بنا پر اپنی فوری رہائی کا مطالبہ کرتے ہوئے ایک پٹیشن تیار کی کہ ہماری حراست غیر قانونی ہے۔

چھ بجے شام ہمیں سونے کی چٹائیاں اور کمبل دیئے گئے اس بے تکے اور انتہائی گندے بستر کی تفصیل بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں کمبل خشک خون اور قے سے آلودہ تھے، ان پر جوئیں، کیڑے اور لال بیگ رینگ رہے تھے اور ان سے گندے نالے کی طرح بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔

رہائی چند لمحوں کی

آدھی رات کے لگ بھگ ہمیں باہر بلایا گیا۔ لیکن کس لیے؟ یہ ہم نہیں جانتے تھے۔ بعض ساتھی رہائی کی توقع پر مسکرا دیئے۔ مجھے سب سے پہلے آواز پڑی قید خانے کے صدر دروازے پر لے جا کر مجھے پولیس افسروں کی ایک پارٹی کے سامنے چند لمحات کے لیے رہا کر دیا گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں پیش قدمی کرتا، ایک پولیس افسر نے پکار کر پوچھا ''نام'' میں نے جواب دیا ''منڈیلا''

''نیلسن منڈیلا!'' افسر بولا ''میں ایمرجنسی ریگولیشنز کے زیر اختیار تمہیں گرفتار کرتا ہوں'' یوں ہمیں رہائی نہ ملی بلکہ ہنگامی حالت کے تحت گرفتار کر لیا گیا اور اس کے نفاذ

کا علم ہمیں اپنی نئی گرفتاری پر ہوا۔ ہم میں سے ہر ایک کو چند سیکنڈ کی رہائی کے بعد دوبارہ حراست میں لے لیا گیا تھا۔ پہلے ہماری گرفتاری غیر قانونی تھی، چنانچہ نصف شب کو ہنگامی حالت نافذ کر کے ہمیں قانونی طور پر گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ہم نے کمانڈر کے نام ایک یادداشت لکھی کہ ہمیں ہمارے حقوق سے آگاہ کیا جائے۔

اگلی صبح مجھے کمانڈر کے دفتر بلایا گیا جہاں رابرٹ ریشا سے ملاقات ہوئی جس کی گرفتاری کے بعد سٹیشن کمانڈر اس سے تفتیش کر رہا تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا ریشا نے کمانڈر سے پوچھا کہ گزشتہ رات تم منڈیلا پر کیوں پھٹ پڑے تھے۔ اس کا جواب گوروں کے صاحب پن کی بین مثال تھا ''منڈیلا نے گستاخی کی تھی'' میں نے جواب دیا ''میں تم جیبوں کے لیے اپنے ہاتھ جیبوں سے باہر نکالنے کا پابند نہیں، پہلے نہ اب'' اس آن سپیشل برانچ ڈی ٹیکو سارجنٹ بلبرگ دفتر میں داخل ہوا اور اس نے خوشگوار لہجے میں کہا ہیلو نیلسن! اس پر میں نے کڑا جواب دیا ''میں تمہارے لیے نیلسن نہیں، مسٹر منڈیلا ہوں۔'' قریب تھا کہ کمرے میں لڑائی شروع ہو جائے، ایک اہلکار خبر لایا کہ ہمیں مقدمہ غداری میں پیشی کے لیے پریٹوریا لے جایا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مضحکہ خیز صورتحال پر ہنسوں یا روؤں۔ چھتیس گھنٹے کی اس بدسلوکی اور ہنگامی حالت کے نفاذ کے بعد حکومت کو اور کوئی راستہ نہیں سوجھا تھا کہ وہ ہمارے خلاف مایوس کن اور گھسا پٹا مقدمہ جاری رکھے۔ ہمیں سیدھے پریٹوریا لوکل پرزن لے جا کر کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا۔

چیف لوتھولی سے بدسلوکی

اس دوران ہماری غیر موجودگی میں 31 مارچ کو عدالت نے دوبارہ کام شروع کر دیا تھا مگر گواہوں کا کٹہرہ بڑی حد تک خالی تھا، جو حاضر ہوئے وہ ملزمان تھے جنہیں پولیس ہنگامی حالت کے تحت گرفتار کرنے میں ناکام رہی تھی۔ چیف لوتھولی کی گواہی بیچ میں رہ گئی تھی، چنانچہ جج رمف نے ان کی غیر حاضری کا سبب پوچھا تو انہیں بتایا

گیا کہ چیف کو گزشتہ رات حراست میں لے لیا گیا ہے۔ رمف اس وضاحت پر خاصے ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ ان کے مقدمے کی راہ میں ہنگامی حالت حائل کیوں ہو۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ پولیس، چیف لوتھولی کو عدالت میں لائے تاکہ وہ اپنی ادھوری شہادت مکمل کر سکیں۔ عدالت کچھ دیر کے لیے ملتوی ہو گئی۔

بعد میں پتہ چلا کہ چیف کی گرفتاری کے بعد ان پر حملہ ہوا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ ایک وارڈر نے انہیں دھکا دیا جس سے ان کا ہیٹ فرش پر گر پڑا۔ جب وہ ہیٹ اٹھانے کے لیے جھکے تو ان کے سر اور چہرے پر ضربیں لگائی گئیں۔ یہ سب کچھ ہماری قوت برداشت سے باہر تھا۔ ایک صاحب عظمت، مخلص مسیحی اور دل کی خطرناک حالت والے انسان سے وہ لوگ باڑے کے جانور کا سا سلوک کر رہے تھے جو ان کے جوتوں کے تسمے باندھنے کے اہل نہیں تھے۔

جب ہم دوبارہ عدالت میں پہنچے تو جج رمف نے بتایا گیا کہ پولیس نے چیف کو عدالت میں لانے سے انکار کر دیا ہے۔ اس پر جج نے عدالت ایک دن کے لیے ملتوی کر دی۔ ہمیں اب گھر جانے کی توقع تھی لیکن جب عدالت کے احاطے سے نکل کر سواری کی تلاش میں تھے کہ ہم سب کو ایک بار پھر گرفتار کر لیا گیا۔

باغی چین اسمگل ہو گیا

پولیس نے حسب معمول اپنی کارکردگی کے جوش میں ایک مضحکہ خیز حرکت کی۔ ایک ملزم وِلٹن امکوائی جو ایک یونین لیڈر اور اے این سی کے رکن تھے، پورٹ ایلزبتھ سے مقدمے کے لیے پریٹوریا آئے تھے۔ کسی طرح وہ اپنے ساتھیوں سے الگ ہو گئے تھے۔ جب وہ عدالت کے صدر دروازے پر پہنچے اور انہوں نے اپنے ساتھیوں کی دوبارہ گرفتاری کا ہنگامہ دیکھا تو ایک پولیس مین سے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ سپاہی نے انہیں وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ وِلٹن وہیں کھڑے رہے۔ سپاہی نے دوبارہ چلے جانے کا حکم دیا تو وِلٹن نے اسے بتایا کہ وہ ایک ملزم ہے۔ افسر نے انہیں

جھوٹا قرار دے کر گرفتار کرنے کی دھمکی دی کہ وہ انصاف کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس نے غضبناک ہو کر حکم دیا کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ یہ آخری موقع تھا جب کسی نے انہیں عدالت میں دیکھا۔ اگلے دو ماہ وہ زیر زمین رہے، گرفتاریوں سے بچتے رہے اور پھر انہیں اسمگل کر کے ملک سے باہر لے جایا گیا۔ باہر جا کر وہ کانگریس آف ٹریڈ یونینز کے نمائندہ خارجہ بنے اور بعد میں فوجی تربیت کے لیے چین چلے گئے۔

اس رات ہم ٹرانسوال کے دوسرے حصوں کے گرفتار شدگان سے ملے۔ ملک بھر میں پولیس کے چھاپوں کے ذریعے دو ہزار سے زیادہ افراد مقدمہ چلائے بغیر حراست میں لے لیے گئے تھے۔ یہ مرد اور خواتین تمام نسلوں اور نسلی امتیاز کی مخالف تمام جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ سپاہیوں کو ڈیوٹیوں پر طلب کر لیا گیا تھا اور ملک بھر میں فوجی دستے اہم مقامات پر تعینات کر دیئے گئے تھے۔ 8 اپریل کو کمیونزم کو کچلنے کے قانون کے تحت اے این سی اور پی اے سی کو غیر قانونی تنظیمیں قرار دے دیا گیا۔ ایک رات کے اندر اے این سی کا رکن بننا جیل کی سزا اور جرمانے کی تعزیر کا سزاوار ٹھہرا تھا۔ اے این سی کے مقاصد کو آگے بڑھانے کی سزا دس برس قید تک تھی۔ اب اے این سی کے زیر اہتمام غیر متشدد اور قانونی اجتماعات بھی غیر قانونی ٹھہرے تھے۔ آزادی کی جدوجہد نئے دور میں داخل ہو گئی تھی ہم سب اب قانون کے مجرم تھے۔

روٹی اور چینی کی نسلی تقسیم

ہنگامی حالت کے دوران ہم پریٹوریا لوکل جیل میں رہے جہاں حالات اتنے ہی خراب تھے جتنے نیوزلینڈز میں نو ضرب سات فٹ کی کوٹھڑیوں میں پانچ پانچ قیدی ٹھونس دیئے گئے۔ کوٹھڑیاں غلیظ تھیں، روشنی معدوم اور ہوا کا گزر برائے نام تھا۔ ایک اجابت کا پاٹ تھا جس کا ڈھکن ڈھیلا تھا۔ کمبلوں میں کیڑے رینگتے تھے۔ دن

میں ایک بار ایک گھنٹے کے لیے ہمیں باہر نکالا جاتا تھا۔

پریٹوریا میں اپنے دوسرے دن ہم نے جیل کے کمانڈنگ آفیسر کرنل سٹین مین کے پاس ایک وفد بھیجا اور شکایت کی کہ قیدیوں کے حالات بڑے خراب ہیں۔ کرنل کا جواب گستاخانہ تھا۔ اس نے کہا کہ ہم ثبوت پیش کریں اور ساتھ ہی ہمیں جھوٹے قرار دیا ''تم اپنے غلیظ گھروں سے کیڑے میری جیل میں لے آئے ہو'' اس نے طنزیہ طور پر کہا۔

میں نے کہا کہ ہمیں ایک ایسا کمرہ بھی چاہیے جو خاموش ہو اور جہاں روشنی کا اچھا اہتمام ہوتا کہ ہم اپنے مقدمے کی تیاری کرسکیں۔ کرنل پھر نفرت سے پھٹ پڑا'' حکومت کے ضابطے قیدیوں کو اجازت نہیں دیتے کہ اگر وہ پڑھ سکتے ہیں تو کتابیں پڑھیں'' کرنل کے اس نفرت انگیز رویئے کے باوجود جلد ہی کوٹھڑیوں میں رنگ و روغن کر دیا گیا، جراثیم کش ادویہ چھڑکی گئیں اور ہمیں نئے کمبل اور اجابت کے پاٹ دیئے گئے۔ ہمیں دن کا زیادہ حصہ صحن میں رہنے کی اجازت مل گئی اور جو لوگ بغاوت کے مقدمے میں ملوث تھے انہیں صلاح مشورے کے لیے ایک بڑی کوٹھڑی دی گئی جس میں ہمیں قانونی کتابیں رکھنے کی بھی اجازت تھی۔

پریٹوریا لوکل جیل اب ہمارا گھر تھی۔ ہم مقدمہ بھگتنے کے لیے صبح روانہ ہوتے اور سہ پہر کو لوٹتے۔ نسلی امتیازی ضابطوں کے تحت جیل میں قیدیوں کی تقسیم رنگ کی بنا پر کی گئی تھی۔ ہم اپنے گورے ساتھیوں سے تو الگ تھے ہی مگر ایک ہی نان وائٹ احاطے میں اپنے ہندوستانی اور رنگ دار ساتھیوں سے علیحدگی ہمیں حکام کا پاگل پن لگتی تھی۔ ہم نے مطالبہ کیا کہ ہم سب کو اکٹھے رکھا جائے۔ اس کے جواب میں ہر قسم کی بے تکی وضاحتیں پیش کی گئیں کہ ایسا کیوں ضروری ہے۔ جب سرخ فیتے کی روایتی سختی نسل پرستی کی تنگ نظری سے ملتی ہے تو اس کا نتیجہ ذہنی فتوری ہوتا ہے۔ لیکن آخر کار حکام نے ہتھیار ڈال دیئے اور بغاوت کا مقدمہ بھگتنے والوں کو ایک جگہ

اکٹھے کر دیا گیا۔

اگرچہ ہمیں اکٹھے رکھا گیا، ہماری خوراک نسل کی بنیاد پر مقرر کی گئی۔ ناشتے میں افریقیوں، ہندوستانیوں اور رنگ داروں کو ایک ہی مقدار میں کھانا ملتا، مگر ہندوستانیوں اور رنگ داروں کو نصف چمچ چینی بھی ملتی جس سے ہم محروم تھے۔ رات کے کھانے میں بھی خوراک ایک ہی تھی لیکن ہندوستانیوں اور رنگ داروں کو چار اونس ڈبل روٹی بھی ملتی جبکہ ہمیں نہ ملتی۔ یہ آخری امتیاز اس عجیب عذر کی بنا پر برتا جاتا تھا کہ افریقی فطری طور پر روٹی پسند نہیں کرتے جسے زیادہ مہذبانہ یا ''مغربی'' کھانا گردانا جاتا تھا۔ قیدی گوروں کی خوراک افریقیوں کی خوراک سے کہیں زیادہ بڑھیا تھی حکام رنگ کی تفریق کے اس قدر عادی تھے کہ کالوں اور گوروں کو فراہم کی جانے والی چینی اور روٹی کا رنگ بھی مختلف ہوتا تھا۔ سفید قیدیوں کو سفید چینی اور سفید روٹی ملتی جبکہ رنگ داروں اور ہندوستانیوں کو شکر اور بھوری روٹی دی جاتی تھی۔

مجھے قید کے دوران ایک غیر معمولی استحقاق حاصل رہا اور وہ تھا ہر ویک اینڈ پر جوہانس برگ کا پھیرا۔ یہ کوئی جیل سے تعطیل نہیں تھی بلکہ ایک بس والے کی سی چھٹی تھی۔ ہنگامی حالت کے نفاذ سے عین پہلے آلیور اے این سی کی ہدایات پر جنوبی افریقہ سے باہر چلا گیا تھا۔ ہم عرصے سے حکومت کا آہنی ہاتھ پڑنے کا انتظار کر رہے تھے، چنانچہ کانگریس نے فیصلہ کیا تھا کہ بعض ارکان پارٹی پر مکمل پابندی عائد ہونے سے پہلے بیرون ملک جا کر پارٹی کو مضبوط بنانے کا کام کرتے رہیں۔

''میں فرار نہیں ہوں گا''

آلیور کی بیرون ملک روانگی تحریک کی بہترین منصوبہ بندی اور خوش قسمتی کے تحت عمل میں آئی تھی۔ اس وقت ہمارے حاشیہ خیال میں نہ تھا کہ پارٹی کا بیرونی ونگ کس قدر ضروری ہو جائے گا۔ اپنی فہم و فراست اور بردباری، اپنے صبر و تحمل اور تنظیمی مہارت اور اپنی قائدانہ اور پرجوش اہلیت کے باعث آلیور کا انتخاب اس کام کے

لیے بالکل درست تھا۔

روانگی سے پہلے آلیور نے ایک مقامی وکیل ہائی ڈیوڈ آف کو رضامند کرلیا تھا کہ وہ ہمارا دفتر بند کرنے اور ہمارے ادھورے مقدمے نپٹانے کی ذمے داری اپنے سر لے۔ ڈیوڈ آف نے کرنل پرنسلو سے خصوصی درخواست کی کہ وہ مجھے ہر ہفتے کے آخر میں جوہانس برگ جانے کی اجازت دیں تاکہ میں ان کی معاونت کرسکوں۔ دریا دلی کے جوش میں کرنل مان گیا اور اس نے اجازت دے دی کہ مجھے ہر جمعے کی سہ پہر گاڑی میں جوہانس برگ لے جایا جائے اور سوموار کی صبح عدالت میں پیشی کے لیے واپس لایا جائے۔ سارجنٹ کروگر اور میں جمعے کو ایک بجے عدالت برخاست ہونے پر روانہ ہوتے۔ اپنے دفتر پہنچ کر میں ڈیوڈ آف اور اپنے اکاؤنٹنٹ ناتھن مارکس کے ساتھ کام کرتا۔ رات میں مارشل سکوائر پرزن میں گزارتا اور دن اپنے دفتر میں۔

سارجنٹ کروگر ایک بلند قامت اور مرعوب کن آدمی تھا جو ہمارے ساتھ اچھا سلوک کرتا۔ پریٹوریا سے جوہانس برگ جاتے ہوئے وہ اکثر کار روک لیتا اور مجھے اندر چھوڑ کر ایک دکان میں جا گھستا اور ہم دونوں کے لیے خشک گوشت، نارنگیاں اور چاکلیٹ خرید لاتا۔ میرے ذہن میں خیال آتا، خصوصاً جمعہ کو کہ کار سے کود کر نکل جاؤں جبکہ گلیوں اور بازاروں میں بڑی رونق ہوتی اور آدمی آسانی سے ہجوم میں غائب ہوسکتا تھا۔

دفتر میں، میں ہنگامی ضرورت کی چیزیں خریدنے سیڑھیاں اتر کر گراؤنڈ فلور کیفے تک چلا جاتا اور ایک دو بار جب ونی مجھ سے ملنے آئی تو کروگر نے سر جھٹک کر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی۔ ہم دونوں کے مابین شریف آدمی کی سی مفاہمت تھی۔ میں فرار نہیں ہوں گا اور اسے مشکل میں نہیں ڈالوں گا کیونکہ وہ مجھے ایک حد تک آزادانہ نقل وحرکت کی اجازت دیتا تھا۔

25 اپریل کو مقدمہ پھر شروع ہونے سے پہلے عسی میلر نے ہم دونوں کو بلایا کہ ہنگامی حالت کے سنگین اثرات پر بات چیت کی جائے جو مقدمے کی پیش رفت پر مرتب ہو رہے تھے۔ ہنگامی ضوابط کے تحت ملزمان اور ہمارے وکلاء کے مابین مشاورت عملاً ناممکن ہوگئی تھی۔ ہمارے وکلاء کے لیے جو جوہانس برگ میں پریکٹس کرتے تھے، جیل میں ہم سے ملنا دشوار تھا اور وہ ہمارا کیس تیار نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اکثر پریٹوریا لوکل جیل پہنچتے تو انہیں بتایا جاتا کہ ہم سے ملاقات ممکن نہیں۔ ان سے ہماری ملاقات ہو بھی جاتی تو ہمیں ہراساں کیا جاتا اور اکثر بات چیت بیچ میں رہ جاتی۔ مزید برآں میسلر نے بتایا کہ ہنگامی ضوابط کے تحت جو پہلے ہی حراست میں ہیں وہ عدالت میں بیان دینے کے بعد مزید حراست کے مستوجب ٹھہریں گے کیونکہ ان کے بیانات "تخریبی" (Sebversive) قرار دیئے جائیں گے اور پھر انہیں زیادہ سزا بھگتنی ہوگی۔ صفائی کے گواہ جو ابھی قید نہیں تھے، بیان دینے کی صورت میں حراست کے خطرے سے دوچار تھے۔

ہم نے وکلاء صفائی فارغ کر دیئے

صفائی کے وکلاء نے تجویز پیش کی کہ وہ احتجاج کے طور پر مقدمے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ میسلر نے اس طرح الگ ہو جانے کے سنگین نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس طرح ایک کیپٹل کیس (مقدمہ سزائے موت) میں ہمیں اپنی صفائی خود پیش کرنی ہوگی۔ اس نے کہا کہ اس دور کی معاندانہ فضا میں ججوں کو یہ مناسب لگے گا کہ وہ ہمیں طویل معیاد کی سزا سنا دیں۔ ہم نے آپس میں اس پر بحث وتمحیص کی اور انتیس ملزمان میں سے ہر ایک نے کھل کر اپنی رائے دی۔ جس امر پر سب کا اتفاق رائے ہوا وہ یہ تھا کہ ہمارے وکلاء کی غیر موجودگی میں ڈوما نوکوی اور میں مقدمے کی تیاری میں مدد دیں گے۔ میں اس ڈرامائی تحریک کے حق میں تھا کیونکہ اس سے ہنگامی حالت کی ناانصافیاں آشکار ہوتی تھیں۔

26 اپریل کو ٹرانسوال کے پہلے افریقی ایڈووکیٹ عدالت میں کھڑے ہوئے اور یہ سنسنی خیز اعلان کیا کہ ملزمان وکلائے صفائی کو ہدایت کر رہے ہیں کہ وہ مقدمے سے الگ ہو جائیں ۔تب میسلر نے سادگی سے کہا ''ہمیں مزید اختیارِ وکالت حاصل نہیں رہا، چنانچہ ہم یورلارڈ شپ کو مزید تکلیف نہیں دیں گے ۔اس سے تین ججوں کے پینل کو صدمہ پہنچا جنہوں نے ہمیں سخت انتباہ کرتے ہوئے اپنی صفائی خود پیش کرنے کے خطرات سے آگاہ کیا۔لیکن ہمیں ان کی گفتگو پسند نہ آئی کیونکہ ہم حکومت کے لئے لینے کو بے چین تھے ۔''

ہماری اسٹراٹیجی سادہ اور نوعیت کے اعتبار سے مدافعانہ تھی ،مقدمے کو اس قدر لٹکایا جائے حتیٰ کہ ہنگامی حالت اٹھالی جائے اور ہمارے وکلا واپس آسکیں ۔مقدمہ پہلے ہی اتنا طول کھینچ گیا تھا کہ اگر ہم اسے مزید طول دیتے تو کوئی مضائقہ نہ ہوتا۔ عملاً یہ اسٹراٹیجی قدرے مزاحیہ رنگ اختیار کرگئی ۔قانون کے مطابق ہم میں سے ہر ایک اپنی صفائی خود پیش کرسکتا تھا اور ہر دوسرے ملزم کو بطور گواہ بلا سکتا تھا اور ہر ملزم ہر گواہ پر جوابی جرح کرسکتا تھا۔ ہمارے نام حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیئے گئے تھے اور ملزم نمبر 1 ٹرانسوال انڈین یوتھ کانگریس کا فرید ایڈمز تھا۔اب فرید، ملزم نمبر 2 ایلن جوزف کو اپنے گواہ کے طور پر بلا کر اپنے کیس کا آغاز کرتا ۔فرید اس پر جرح کر چکتا تو دوسرے ستائیس ملزم اس پر جوابی جرح کرتے ۔پھر سرکاری وکیل ایلن اس پر جوابی جرح کرتا اور ملزم نمبر 1 اس پر دوبارہ جرح کرتا ۔پھر فرید ملزم نمبر 3 کو بلاتا اور اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا اور یہ پورا عمل دہرایا جاتا حتیٰ کہ ہر ملزم اسی طریقے سے بلایا جاتا ۔اس رفتار سے ہزاروں لاکھوں سال تک ہم پر مقدمہ چلتا رہتا۔

گوری اور کالی سلاخیں

جیل سے ایک مقدمے کی تیاری کبھی آسان نہیں ہوتی اور ہمارے کیس میں تو

روایتی نسلی امتیاز کی بندشیں بھی حائل تھیں ۔تمام ملزمان کو ایک دوسرے سے ملنے کی ضرورت تھی لیکن جیل کے ضابطے مرد اور خاتون قیدیوں کو باہمی ملاقات سے روکتے تھے۔جیل حکام سے گفت وشنید کے بعد ہمیں سخت پابندیوں کے تحت مشاورت کی اجازت مل گئی۔ ہیلن جوزف، لیلیان، لیون اور برتھا کو مختلف جیلوں اور احاطوں سے، جہاں وہ نسلی اور جنسی امتیاز کے تحت قید تھیں، افریقی مردوں کو جیل میں لایا گیا۔پہلی پابندی یہ تھی کہ سفید اور سیاہ قیدیوں اور مذکر اور مونث قیدیوں کے مابین کوئی جسمانی ربط نہیں ہوسکتا۔حکام نے سفید فام ہیلن اور لیون کو ہم سے جدا کرنے کے لیے ایک آہنی گرل اور انہیں سیاہ فام لیلیان اور برتھا سے الگ کرنے کے لیے ایک دوسری گرل کھڑی کردی جبکہ وہ دونوں بھی مقدمے کی تیاری میں حصہ لے رہی تھیں۔ہیلن کو لیلیان سے رنگ کے باعث جدا کیا گیا تھا اور ہم سے جنس اور رنگ دونوں کی بنا پر الگ کیا گیا تھا۔ایک ماہر تعمیرات بھی ایسا ڈھانچا کھڑا کرنے میں مشکل محسوس کرسکتا تھا۔جیل میں ہم آہنی رکاوٹوں کے ذریعے ایک دوسرے سے جدا تھے جبکہ عدالت میں ہم سب آزادانہ گھل مل جاتے تھے۔

سب سے پہلے ہمیں فرید کو کمرہ عدالت کے آداب سکھانے کی ضرورت تھی اور ہیلن کو اس کے بیان کی ریہرسل کرانا تھی۔ہیلن کی مدد کرنے کے لیے میں فرید کا رول ادا کر رہا تھا جو وہ کمرہ عدالت میں ادا کرتا۔میں نے کمرہ عدالت کا انداز اختیار کرتے ہوئے جرح کا آغاز کیا۔

''نام؟'' میں نے کہا

''ہیلن جوزف'' اس نے جواب دیا

''عمر؟''

خاموشی میں نے دہرا کر کہا ''عمر؟''

ہیلن بدستور خاموش رہی۔پھر کچھ لمحوں کے بعد اس نے چمک کر کہا ''نیلسن! اس

مقدمے سے میری عمر کا کیا تعلق ہے؟''

ہیلن اتنی ہی پرکشش تھی جتنی کہ جرأت مند لیکن وہ مغرور بھی تھی وہ اپنی عمر کے متعلق بڑی حساس تھی۔ میں نے وضاحت کی کہ گواہ کے کوائف جیسے نام، عمر، پتہ اور جائے پیدائش تحریر میں لانا قانونی روایت ہے۔ ایک گواہ کی عمر سے عدالت کو اس کی گواہی جانچنے میں مدد ملتی ہے اور اس کا سزا پر اثر ہوتا ہے۔

میں نے جرح جاری رکھی ''عمر؟''

ہیلن اپنی بات پر اڑ گئی اس نے کہا ''نیلسن! میں کسی صورت میں اس کا جواب نہیں دوں گی، آپ آگے چلیں''

پھر میں نے اس سے کئی ایک سوال پوچھے جن کی وہ سرکاری وکیل سے توقع کر رہی تھی، چنانچہ ایک مرحلے پر اس نے میری طرف مڑتے ہوئے کہا ''تم منڈیلا ہو یا پراسیکیوٹر؟''

کچھ اور لطیف لمحات بھی آئے جن میں سے بعض خاصے حوصلہ افزا تھے۔ مجھے ویک اینڈ پر ہیلن جوزف سے ملنے اور عدالتی کارروائی کے ریکارڈ سے اسے آگاہ کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ ان مواقع پر میں وہ دوسری قیدی عورتوں سے مل کر ممکنہ گواہ کے طور پر ان کی رائے معلوم کرتا تھا۔ میں گوری نگران عورتوں سے بڑی ملنساری سے پیش آتا اور مشاہدہ کرتا کہ میری جیل میں آمد ان کے لیے خاصی دلچسپی کا باعث بنتی تھی۔ ان کے علم میں کبھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ افریقی وکیل یا افریقی ڈاکٹر جیسی جنس بھی ہوسکتی ہے، چنانچہ وہ مجھے ایک انوکھی مخلوق خیال کرتی تھیں۔ لیکن جیسے جیسے میں ان سے زیادہ شناسا ہوا، ان کا رویہ زیادہ دوستانہ ہوتا چلا گیا۔ میں ان سے مذاق میں کہتا کہ ان کا کوئی بھی قانونی معاملہ ہو تو میں نپٹا دوں گا۔ کامل مساوات کی بنیاد پر گوری نگران خواتین کی ایک سیاہ فام سے سنجیدہ مسائل پر گفتگو کا نتیجہ یہی نکل سکتا تھا کہ نسلی امتیاز کے بارے میں ان کے مفروضات کمزور پڑ جائیں۔

ایک بار ہیلن سے طویل گفتگو کے دوران میں ایک نگران خاتون کی طرف مڑا، جو ہماری ملاقات کے دوران وہاں موجود رہتی تھی، اور کہا: ''مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس نہ ختم ہونے والی مشاورت سے تمہیں بور کیا'' وہ بولی ''نہیں، تم مجھے ہرگز بور نہیں کر رہے۔ میں اس سے لطف اندوز ہو رہی ہوں'' میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ہماری گفتگو پر توجہ دے رہی تھی اور ایک دو بار اس نے چھوٹا موٹا مشورہ بھی دیا تھا۔ میں نے اسے مقدمے کے اضافی فائدے کے طور پر لیا۔ اکثر خاتون نگرانوں کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہمیں جیل میں کیوں ڈالا گیا ہے۔ بتدریج وہ ہم سے پوچھنے لگیں کہ ہم کس مقصد کے لیے لڑ رہے تھے اور ہم جیل بھگتنے کے لیے تیار کیوں ہو گئے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ نیشنل پارٹی مختلف نسلوں میں ہر قسم کے اختلاط کی شدید مخالف تھی۔ صرف وہ گورے رائے دہندگان کالے خطرے کے تصور کو ذہن میں جگہ دے سکتے تھے جو افریقی تصورات اور پالیسیوں سے بے بہرہ تھے اور وہی نیشنل پارٹی کے نسل پرست فلسفے کی حمایت کر سکتے تھے۔ مختلف نسلوں میں میل جول سے نفرت نہیں بلکہ مفاہمت اور آخر کار ہم آہنگی جنم لیتی۔

قید میں کثیف لمحات

جیل میں لطیف لمحات کثیف لمحات کی تلافی نہیں کر سکتے تھے۔ جب میں پریٹوریا میں تھا، ونی کو مجھ سے ملنے کے کئی مواقع ملے اور ہر بار وہ زینانی کو ساتھ لاتی جو ان دنوں چلنا اور باتیں کرنا سیکھ رہی تھی۔ اگر نگران اجازت دے دیتے تو میں اسے گود میں لے کر چومتا اور ملاقات کے آخر میں ونی کے حوالے کر دیتا۔ جب ونی مجھے خدا حافظ کہہ رہی ہوتی اور نگران انہیں واپس لے جا رہے ہوتے تو ''زینی'' اکثر مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتی اور مجھے اس کے چہرے کے تاثر سے چل جاتا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں ان کے ساتھ کیوں نہیں جا سکتا۔

عدالت میں فرید ایڈمز اپنی ایویڈنس ان چیف (سرگروہ شہادت) کے ذریعے

ہوشیاری سے ہیلن کی رہنمائی کرتا۔ وہ اکثر ججوں سے ترکی بہ ترکی بحث کرتی اور بعض اوقات انہیں لاجواب کر دیتی۔ اب ہم بڑی توانائی اور اعتماد سے بات کرتے تھے اور اب کوئی وقت گزاری کے لیے جوابی جملے بازی نہیں کرتا تھا، چنانچہ سرکار اور استغاثہ کو پہلی بار احساس ہونے لگا کہ ملزم مرد اور خواتین حقیقی اہلیت رکھتے ہیں۔

جنوبی افریقہ کے قانون کے مطابق جب ہم سپریم کورٹ میں تھے، ڈوما نوکوی واحد شخص تھا جسے ایک وکیل کی حیثیت سے ججوں کو براہ راست مخاطب کرنے کی اجازت تھی۔ بطور وکیل میں اسے ہدایات دے سکتا تھا مگر مجھے تکنیکی لحاظ سے عدالت کو مخاطب کرنے کی اجازت نہ تھی اور نہ کوئی اور ملزم ایسا کر سکتا تھا۔ ہم نے اس درست مفروضے کی بنا پر اپنے وکلاء فارغ کر دیئے تھے کہ عدالت میں نمائندہ وکیل نہ ہونے کے باعث ایک ملزم کو عدالت سے مخاطب ہونے کی اجازت دی جائے گی۔ چنانچہ میں نے عدالت کو مخاطب کیا اور ہماری مایوسی کی انتہا نہ رہی جب جسٹس رمف نے مجھے ٹوک دیا ''مسٹر منڈیلا! تم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہو کہ بطور وکیل صرف مسٹر نوکوی کو عدالت سے مخاطب ہونے کی اجازت ہے؟'' میں نے جواب دیا ''ٹھیک ہے مائی لارڈ! میرا خیال ہے ہم سب اس کی پابندی کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ آپ مسٹر نوکوی کو ان کی فیس ادا کرنے کو تیار ہوں'' اس کے بعد کسی نے ملزمان کے عدالت سے مخاطب ہونے پر اعتراض نہ کیا۔

جب فرید، ہیلن اور بعد والے گواہوں سے سوال کر رہا تھا، میں اور ڈوما اس کے پہلوؤں میں بیٹھے اسے سوالات فراہم کر رہے تھے اور زیر بحث آنے والے قانونی مسائل سے نپٹنے میں اس کی مدد کر رہے تھے۔ یوں عام طور پر اسے ازخود زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن ایک روز جب ہم مستقل دباؤ میں تھے، ہم ہر چند سیکنڈ بعد کوئی مشورہ اس کے کان میں ڈال دیتے تھے۔ فرید تھکا ہوا لگتا تھا اور ہمارے پاس امدادی ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔ پھر ہم سے مشورہ کیے بغیر فرید نے اچانک یہ کہتے ہوئے

ججوں سے التوا کی درخواست کی کہ وہ تھک گیا ہے۔ ججوں نے اس کی درخواست یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ یہ التوا کے لیے کافی وجہ نہیں اور ساتھ ہی وہ انتباہ دہرایا جو انہوں نے اس روز کیا تھا جب ہمارے وکلا مقدمے سے الگ ہوئے تھے۔

اس سہ پہر جب ہم لوٹے تو کسی کو گانے کا خیال نہ آیا اور ہر کوئی پژمردہ چہرہ لیے بیٹھ گیا۔ ملزموں کے مابین ایک بحران ابل رہا تھا۔ جیل میں ہماری آمد پر بعض نے ایک میٹنگ بلانے کا مطالبہ کیا، چنانچہ میں نے سب ساتھی اکٹھے کیے۔ پورٹ ایلزبتھ کے ایک تاجر جے انکامپسنی نے خلاف ورزی مہم (Defiance Campaign) کے دوران خلاف ورزوں کے خاندانوں کی خاصی مدد کی تھی۔ اب وہ میٹنگ میں مجھے آڑے ہاتھوں لینے والوں میں پیش پیش تھا۔ اس نے احترام کی علامت کے طور پر میرا خاندانی نام لیتے ہوئے کہا ''مادیبا! میں چاہتا ہوں کہ تم ہمیں بتاؤ کہ تم نے ہمارے وکلا کو کیوں بھگا دیا'' میں نے اسے یاد دلایا کہ وکلاء کسی ایک فرد کی طرف سے فارغ نہیں کیے گئے تھے بلکہ ان کی مقدمے سے علیحدگی اس سمیت سب کے اتفاق رائے سے عمل میں آئی تھی ''لیکن ہم عدالتی طریقہ کار کے بارے میں کیا جانتے تھے مادیبا؟'' اس نے کہا ''ہم نے تو تم وکلا پر اعتبار کیا تھا''

خاصی تعداد میں ساتھی انکامپسنی کے ہم خیال تھے۔ میں نے انہیں بے دل ہونے کے خطرات سے آگاہ کیا اور مصر رہا کہ ہم ٹھیک کر رہے ہیں۔ میں نے کہا آج معمولی سی رکاوٹ پیش آئی اور آگے ہمیں بدتر مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ ہمارا مقدمہ سرکار اور قانون شکنی کے چند ملزمان کے مابین چلنے والے مقدمے سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ یہ قوت کا امتحان ہے، ایک غیر اخلاقی نظریئے کے مقابلے میں ایک اخلاقی نظریئے کی طاقت کی آزمائش ہے اور ہمیں اپنے وکلا کی قانونی تکنیک سے زیادہ دیگر امور کی فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس پر ان کا احتجاج زائل ہوگیا۔

جب ہیلن جوزف پر جوابی جرح اور دوبارہ جرح ہو چکی تو ملزم نمبر 3 احمد کاتھرادا کا مقدمہ شروع ہوا۔ کاتھرادا کے دوسرے گواہ یعنی ملزم نمبر 4 سٹینلے لولان کلرڈ پیپلز پانگریس کی ایگزیکٹو کے رکن تھے، ان کے بیان کے دوران ہی وزیراعظم ورورڈ نے اعلان کیا کہ ''ہنگامی حالت جلد ہی اٹھالی جائے گی۔ ہنگامی حالت کبھی اس ارادے سے نافذ نہیں کی گئی تھی کہ یہ مستقل طور پر رہے گی'' حکومت کو یقین تھا کہ اس نے جہد آزادی کا گلا کامیابی سے گھونٹ دیا ہے۔ اس مرحلے پر ہمارے صفائی کے وکلا واپس آ گئے جس سے ہم سب نے سکھ کا سانس لیا اگرچہ ہم چند ہفتے اور جیل میں رہے۔ ہم نے پانچ ماہ سے زیادہ قید میں گزارے تھے اور اپنے وکلا کے بغیر مقدمہ بھگتایا تھا۔

عدالت میں میرا موقف

میرا اپنا بیان 3 اگست کو شروع ہوا۔ دوسروں کے بیانات کی تیاری کے ذریعے میں اس کے لیے خوب تیار تھا۔ تین سال کی خاموشی، پابندی اور اندرونی جلاوطنی کے بعد میں اس موقع کے انتظار میں تھا۔ کہ ان لوگوں کے سامنے اپنا موقف پیش کر سکوں جو میرے بارے میں فیصلہ صادر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اپنی ایویڈنس ان چیف میں، میں نے اعتدال کی تلقین کی اور اے این سی کی غیر متشدد جدوجہد کی توثیق کی۔ ایک سوال کے جواب میں کہ کیا جمہوریت تدریجی اصلاحات سے حاصل کی جاسکتی ہے، میں نے کہا کہ ایسا ممکن ہے۔ میں نے کہا:

ہم عالمی بالغ رائے دہندگی کی حمایت کرتے ہیں اور اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے اقتصادی دباؤ ڈالنے کو تیار ہیں۔ ہم امتیازی قوانین کی خلاف ورزی اور'' گھروں پہ قیام'' جیسی مہمات، اکیلے یا اکٹھے چلاتے رہیں گے حتیٰ کہ حکومت یہ کہنے پر مجبور ہوگی ''جنٹل مین! اس طرح کی صورتحال کہ قوانین کو چیلنج کیا جارہا ہے، نہیں چل سکتی۔ آؤ ہم مذاکرات کرلیں'' میں اپنی ذاتی رائے میں کہوں گا'' ٹھیک

ہے آؤ مذاکرات کرلیں'' اور حکومت کہے گی'' ہمارا خیال ہے کہ یورپی آباد کار فی الحال اس طرح کی حکومت کے لیے تیار نہیں جس میں غیر یورپی ان پر غالب آ جائیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ہم تمہیں 60 نشستیں دے دیں'' یوں افریقی آبادی پارلیمنٹ میں اپنی نمائندگی کے لیے 60 افریقیوں کا انتخاب کرے گی۔ ہم تحریک کو پانچ سال کے لیے بالائے طاق رکھ دیں گے اور پانچ سال بعد اس کا جائزہ لیں گے میری رائے میں یہ ایک فتح ہو گی مائی لارڈ! یہ افریقیوں کے لیے عالمی بالغ رائے دہندگی کے حصول کی طرف ایک اہم اقدام ہوگا اور پھر ہم پانچ سال کے لیے کہیں گے کہ ہم نے سول نافرمانی ملتوی کر دی ہے۔

ریاست یہ ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی کہ میں ایک خطرناک اور تشدد پر اکسانے والا کمیونسٹ تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں کمیونسٹ تھا نہ کمیونسٹ پارٹی کا رکن، تاہم میں اپنے کمیونسٹ دوستوں سے الگ ہونے کا تاثر دینا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اگرچہ ایسے خیالات پیش کرنے پر مجھے واپس جیل بھیجا جا سکتا تھا، کمیونسٹوں نے ہمیں جو اتنی زیادہ مدد دی تھی، میں نے اس کی توثیق کرنے میں کوئی تامل نہ کیا۔ ایک موقع پر جج نے سوال اٹھایا کہ کیا میں سمجھتا ہوں کہ یک جماعتی ریاست جنوبی افریقہ کے لیے ایک قابل عمل آپشن ہے۔ میں نے کہا:

مائی لارڈ! یہ کسی نظام کا مسئلہ نہیں، یہ جمہوریت کا مسئلہ ہے۔ اگر جمہوریت کسی یک جماعتی نظام میں بہترین طور پر کارفرما ہو تو میں اس نظریئے کا بغور جائزہ لوں گا۔ لیکن اگر جمہوریت کثیر جماعتی نظام میں بہترین طور پر کارفرما ہو سکتی ہو تو میں اس کا جائزہ لوں گا۔ مثلاً اس ملک میں فی الحال کثیر جماعتی نظام ہے لیکن جہاں تک غیر یورپیوں کا تعلق ہے، یہ بدترین قسم کا غیر آئینہ نظام ہے جس کا آپ تصور کر سکتے ہیں۔

رمف سے تکرار

جج رمف نے جب عالمی رائے دہندگی کے نظریئے کے بارے میں وہی غلطی کی جو اتنے سارے گورے جنوبی افریقی کرتے تھے تو میں ان سے تکرار کرنے لگا۔ ان کا تصور یہ تھا کہ یہ ذمے داری نبھانے کے لیے ووٹروں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ ایک تنگ نظر شخص کو یہ سمجھانا مشکل ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں کہ وہ پڑھا لکھا ہو اور بی اے ہو اور یہ کہ ایک ان پڑھ شخص بھی ایک اعلیٰ ڈگری کے حامل شخص کے مقابلے میں کہیں زیادہ تعلیم یافتہ ہو سکتا ہے۔

جسٹس رمف ''ایک مملکت کی حکومت میں ایسے لوگوں کی شرکت کی قدرو قیمت کیا ہے جو کچھ نہ جانتے ہوں؟''

منڈیلا ''مائی لارڈ! تب کیا ہوتا ہے جب ان پڑھ گورے ووٹ دیتے ہیں؟''

جسٹس رمف کیا وہ انتخابی لیڈروں کے اتنے ہی اثر میں نہیں ہوتے جتنے کہ بچے؟

منڈیلا نہیں مائی لارڈ! عملاً ہوتا یہ ہے کہ ایک آدمی کسی خاص علاقے میں ایک نشست پر انتخاب کے لیے کھڑا ہوتا ہے، وہ ایک منشور پیش کر کے کہتا ہے ''یہ وہ نظریات ہیں جن کے لیے میں کھڑا ہوں'' وہ دیہی علاقہ ہو تو وہ کہے گا ''میں مویشی چرانے کی حد بندی کے خلاف ہوں'' پھر اس شخص کی اس پالیسی کے پیش نظر آپ فیصلہ کرتے ہیں کہ اگر آپ اسے پارلیمنٹ میں بھیج دیں تو وہ آپ کے مفادات کا تحفظ کرے گا یا نہیں اور اس بنیاد پر آپ ایک امیدوار کے حق میں ووٹ دیتے ہیں اس کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں۔

جسٹس رمف وہ صرف اپنے مفادات پیش نگاہ رکھتا ہے

منڈیلا نہیں، ایک شخص جب ایک ایسے آدمی کو دیکھتا ہے جو اس کے نقطہ نظر کی نمائندگی بہتر طور پر کر سکے گا تو وہ اس کے حق میں ووٹ دیتا ہے۔

میں نے عدالت کو بتایا کہ ہمیں یقین ہے کہ ہم اپنے مقاصد تشدد کے بغیر اپنی

عددی برتری کے بل بوتے پر حاصل کرسکتے ہیں۔ میں نے کہا

ہمارے ذہنوں میں تھا کہ مستقبل قریب میں ان مقاصد کا حصول ہمارے لیے ممکن ہوگا اور ہم اس یقین کی بنا پر کام کرتے رہے کہ خود یورپی تعصب اور عناد کی اس دیوار کے باوجود، جس کا ہمیں سامنا تھا، غیر معینہ مدت کے لیے ہمارے مطالبات سے بے رخی اختیار نہیں کرسکتے کیونکہ ہم اپنی اقتصادی دباؤ کی پالیسی سے انکے پیٹ پہ ضرب لگا رہے ہیں۔ یورپی اسے لاتعلقی سے دیکھنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ انہیں اس کا جواب دینا ہوگا اور مائی لارڈ! وہ جواب دے رہے ہیں۔

قید سے رہائی

اگست کے آخری دن ایمرجنسی اٹھالی گئی۔ ان پانچ ماہ میں ہم پہلی بار گھر جارہے تھے۔ جب جوہانس برگ میں لوگوں نے سنا کہ ہنگامی حالت ختم ہوگئی ہے تو وہ اس خیال سے موٹر گاڑیوں میں پریٹوریا آپہنچے کہ ہمیں رہائی مل سکتی ہے۔ چنانچہ جب ہمیں رہائی ملی تو ہمارے دوستوں اور اہل خانہ نے ہمارا پرمسرت استقبال کیا۔ ونی بھی پریٹوریا چلی آئی تھی اور ہمارا ملاپ خوشیوں سے معمور تھا۔ میں نے پانچ ماہ سے اپنی بیوی کا ہاتھ تھاما تھا نہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔ اس رات پانچ ماہ بعد پہلی بار میں اپنے بستر پر سویا۔

جیل میں رہنے کے بعد آدمی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نعمت خیال کرتا ہے۔ حسب خواہش سیر کو جانا، دکان میں جا کر اخبار خریدنا، باتیں کرنا یا خاموش رہنا اور اپنی ذات پر کنٹرول حاصل ہونے کی خوشی۔

ایمرجنسی کے خاتمے کے بعد بھی مقدمہ مزید نو ماہ یعنی 9 مارچ 1961ء تک جاری رہا۔ کئی لحاظ سے یہ ملزمان کے لیے سنہری دن تھے کیونکہ ہمارے اپنے لوگ کٹہرے میں بے خوف کھڑے اے این سی کی پالیسی بیان کررہے تھے۔ رابرٹ ریشا نے پرزور الفاظ میں حکومت کے اس فضول الزام کی تردید کی کہ اے این سی

حکومت کو تشدد کرنے پر اکسا رہی ہے تا کہ وہ جواب میں تشدد کر سکیں۔گرٹ سباندی نے عدالت کو افریقی کاشتکاروں کے مصائب کے بارے میں آگاہ کیا۔لیڈی سمتھ کے اکاسی سالہ عزت ماب آئزک بہندی نے، جو افریقن نیٹو مشن چرچ کے مبلغ تھے، اس امر کی وضاحت کی کہ ہم نے ہڑتالوں کے بجائے ''گھروں پر قیام'' کا داؤ آزمایا تھا۔

اکتوبر میں پروفیسر میتھیوس کو ہمارے آخری گواہ کے طور پر بلایا گیا۔وہ گواہوں کے کٹہرے میں بڑے پرسکون تھے اور انہوں نے پراسیکیوٹروں سے ایسا برتاؤ کیا جیسے وہ سب ان کے شاگرد ہوں جنہیں سخت تادیب کی ضرورت ہے۔اکثر وہ ترش رو پراسیکیوٹر کو اس قسم کا جواب دیتے: ''تم دراصل مجھ سے یہ کہلوانا چاہتے ہو کہ تقریر جو تمہارے خیال میں تشدد پر اکساتی ہے، میری پارٹی کی پالیسی کی نمائندگی کرتی ہے۔اول تو تمہارا مفروضہ غلط ہے اور دوم میں ہرگز تمہاری مطلوبہ بات نہیں کہوں گا''

انہوں نے خوبصورت الفاظ میں وضاحت کی کہ افریقی عوام جانتے ہیں کہ ایک غیر متشدد جدوجہد میں کٹھن مراحل بھی آئیں گے۔اس کے باوجود انہوں نے اس راستے کا انتخاب کیا ہے کیونکہ وہ آزادی کو ہر شے پر ترجیح دیتے ہیں۔انہوں نے کہا کہ عوام غلامی سے نجات پانے کے لیے شدید ترین مصائب خوشی خوشی جھیلیں گے۔پروفیسر میتھیوس کے بیان سے وکلائے صفائی کے سر فخر سے بلند ہو گئے۔ان کی گواہی مکمل ہونے پر جسٹس کینیڈی نے اپنا ہاتھ لہراتے ہوئے یہ امید ظاہر کی کہ اگلی مرتبہ وہ بہتر حالات میں ملیں گے۔

مستقبل کی خفیہ منصوبہ بندی

ایمر جنسی اٹھنے کے بعد، ہماری نیشنل ایگزیکٹو نے مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے ستمبر میں ایک خفیہ اجلاس کیا۔مقدمے کے دوران ہم نے جیل میں گفت وشنید کی تھی

لیکن اب ہمارا پہلا رسمی اجلاس ہو رہا تھا۔ ریاست اپنے آپ کو بیرونی خطرے کے لیے نہیں بلکہ اندرونی خطرے کے لیے مسلح کر رہی تھی۔ ہم نے عہد کیا کہ ہم منتشر نہیں ہوں گے بلکہ زیر زمین جدوجہد جاری رکھیں گے۔ ہمیں اے این سی کے کانفرنسیں، برانچ میٹنگز اور عوامی اجتماعات منعقد کرنے کے دستور میں پیش کردہ جمہوری طریق کار سے ہٹ کر کام کرنا تھا۔ کانگریس کی ان تنظیموں سے رابطہ استوار کرنے کے لیے نئے ڈھانچے وضع کرنے تھے جن پر پابندی نہیں لگی تھی۔ لیکن یہ تمام نئے ڈھانچے غیر قانونی تھے اور ان میں شریک ہونے والوں کو قید و بند کا سامنا کرنا تھا۔ ایگزیکٹو کمیٹی اور اس کے ماتحت ڈھانچوں کو غیر قانونی حالات کے مطابق ڈھالنا تھا۔ اشد ضرورت کے تحت ہم نے اے این سی یوتھ لیگ اور ویمن لیگ توڑ دیں۔ بعض نے ان تبدیلیوں کو شدید مزاحمت کی لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہم اب ایک غیر قانونی جماعت تھے۔ ان لوگوں کے لیے جنہیں اس میں شرکت جاری رکھنا تھی سیاست ایک پرخطر شعبے سے بڑھ کر ایک واقعی خطرناک پیشہ بن گئی تھی

اگرچہ منڈیلا اینڈ ٹیمبو کا دفتر بند ہو چکا تھا اور اس کے بقیہ معاملات طے ہو چکے تھے، میں جو بھی قانونی کام جاری رکھ سکتا تھا، میں نے جاری رکھا۔ کئی ساتھیوں نے اپنے دفتر، عملہ اور فون مجھے پیش کر دیئے لیکن میں زیادہ تر احمد کاتھرادا کے فلیٹ نمبر 13 خولواد ہاؤس سے کام انجام دیتا رہا۔ اگرچہ میری پریکٹس بکھر گئی تھی، ایک وکیل کی حیثیت سے میری شہرت ابھی ماند نہیں پڑی تھی۔ جلد ہی نمبر 13 کا لاؤنج اور بیرونی راہداری موکلوں سے بھرنے لگے۔ کیتھی گھر لوٹتی تو پتہ چلتا کہ واحد کمرہ جس میں وہ بسیرا کر سکتی ہے اس کا باورچی خانہ ہے۔

بیٹی "زندزسوا" کی پیدائش

اس عرصے کے دوران مجھے کھانے کا بمشکل وقت ملتا اور اپنے اہل خانہ سے ملنے کا بھی کم ہی موقع ملتا۔ میں اپنے کیس کی تیاری کے لیے پریٹوریا میں دیر تک ٹھہرتا یا

کسی اور کیس سے نپٹنے کے لیے جلد جوہانس برگ واپس چلا جاتا۔ جب میں اہل خانہ کے ساتھ رات کا کھانا کھانے بیٹھتا تو فون کی گھنٹی بج اٹھتی اور مجھے بلا لیا جاتا۔ ونی دوبارہ حاملہ تھی اور خاصی بیمار بھی۔ اسے امید تھی کہ اس کا خاوند بذات خود ہسپتال میں ہوگا جب وہ بچے کو جنم دے گی، لیکن ایسا ہونا تھا نہ ہوا۔

1960ء میں کرسمس کے عدالتی التوا کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ ماکگاتھو ٹرانسکائی میں بیمار ہے۔ جہاں وہ سکول جاتا تھا، چنانچہ میں نے اپنی ''احکام کی پابندی'' کی خلاف ورزی کی اور اس کو دیکھنے چلا گیا۔ میں رات بھر گاڑی چلاتا رہا اور راستے میں صرف پٹرول کے لیے رکا۔ ماکگاتھو کو جراحی کی ضرورت تھی، لہٰذا میں نے اسے اپنے ساتھ جوہانس برگ لانے کا فیصلہ کیا میں نے پھر رات بھر گاڑی چلائی اور صبح ہم جوہانس برگ پہنچ گئے۔ اسے اس کی ماں کے پاس چھوڑ کر میں خود اس کی جراحی کے لیے انتظامات کرنے چلا گیا۔ جب میں واپس پہنچا تو معلوم ہوا کہ ونی دردِ زہ میں مبتلا ہے۔ میں فوراً برج میں میموریل ہسپتال کے غیر یورپی حصے میں پہنچا اور وہاں جا کر پتہ چلا کہ ماں اور بچی رہائشی حصے میں منتقل ہو گئی ہیں۔ نوزائیدہ بچی ٹھیک ٹھاک تھی لیکن ونی بہت کمزور تھی۔

ہم نے اپنی بچی کا نام زندزسوا رکھا۔ یہ نام ژہوسا قوم کے مشہور شاعر سیموئیل امخائی کی بیٹی کے نام پر رکھا گیا جس نے برسوں پہلے ہیلڈ ٹاؤن میں مجھے متاثر کیا تھا۔ شاعر طویل سفر کے بعد لوٹا تو اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی بیوی کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ حاملہ تھی اور اس نے فرض کر لیا تھا کہ بچی کا باپ کوئی اور آدمی تھا ہمارے کلچر میں جب ایک عورت زچگی کی حالت میں ہو اور اس نے بچے کو جنم دیا ہو تو شوہر دس دن تک اس مکان میں داخل نہیں ہوتا جس میں زچہ و بچہ مقیم ہوں۔ لیکن شاعر اس قدر غصے میں تھا کہ وہ اس روایت کی پابندی نہ کر سکا اور ایسیگائی یعنی خنجر ہاتھ میں لیے مکان میں داخل ہوا تا کہ وہ ماں اور بچی دونوں کو

گھونپ دے۔ لیکن جب اس نے بچی کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ خود اس کی شبیہہ ہے تو اس نے پیچھے ہٹ کر کہا اوزندزیلی جس کا مطلب ہے ''تمہاری ساخت مضبوط ہے'' اسی مناسبت سے اس نے بچی کا نام زندزسوا رکھ دیا۔

میری خفیہ ذمے داریاں

استغاثہ کو اپنی بحث سمیٹنے میں ایک ماہ سے زیادہ عرصہ لگا اور ججوں نے بیچ میں کئی بار ٹوک کر بحث کی خامیوں پر توجہ دلائی۔ مارچ میں ہماری باری تھی۔ عسی میسلد نے تشدد کے الزامات یکسر مسترد کر دیئے۔ اس نے کہا ''عدم تعاون اور خاموش مزاحمت سے ہمیں انکار نہیں۔ ہم صاف صاف کہیں گے کہ اگر عدم تعاون اور خاموش مزاحمت کھلی بغاوت کے مترادف ہیں تو پھر ہم مجرم ہیں۔ لیکن یہ امور کسی طرح قانون بغاوت کے دائرہ کار میں نہیں آتے۔''

میسلد کی بحث برام فشر نے جاری رکھی لیکن 23 مارچ کو جج نے اس کی اختیاری بحث روک دی۔ ہماری بحث ابھی ہفتوں جاری رہنی تھی مگر ججوں نے ایک ہفتے کے التواء کی مانگ کی۔ یہ بے قاعدہ بات تھی لیکن ہم نے اسے ایک امید افزا علامت جانا کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے پہلے ہی اپنی رائے قائم کر لی ہے۔ ہمیں چھ دن بعد عدالت میں آنا تھا اور ہمارا خیال تھا کہ اس روز فیصلہ سنا دیا جائے گا۔ اس دوران میں اپنے کام میں لگ گیا۔

التوا کے دو دن بعد میری پابندی کی مدت ختم ہو رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس اس سے آگاہ نہیں ہو گی کیونکہ وہ شاذونادر ہی اس امر کا خیال رکھتی تھی کہ پابندی کب ختم ہو رہی ہے۔ کم و بیش پانچ برسوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں جوہانس برگ سے باہر جانے یا کسی اجلاس میں شریک ہونے کے لیے آزاد ہو رہا تھا۔ اس ویک اینڈ میں پائٹر مارزبرگ میں ایک عرصے سے مجوزہ ''آل ان کانفرنس'' منعقد ہو رہی تھی۔ اس کا مقصد تمام جنوبی افریقیوں کا ایک قومی دستوری کنونشن منعقد کرنا تھا۔ یہ

خفیہ طور پر طے پایا تھا کہ میں اس کانفرنس کا بڑا مقرر رہوں گا۔ جس روز میرا خطاب تھا، مجھے اس سے پچھلی رات 300 میل گاڑی چلا کر پائٹر مارزبرگ پہنچنا تھا۔

میری روانگی سے پچھلے دن نیشنل ورکنگ کمیٹی نے ہماری سٹراٹیجی پر غور و حوض کے لیے ایک خفیہ اجلاس کیا۔ جیل میں اور جیل سے باہر کئی ملاقاتوں کے بعد ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم زیر زمین رہ کر کام کریں گے اور ایم پلان کے خطوط کے مطابق سٹراٹیجی اختیار کریں گے۔ اس طرح پارٹی خفیہ طور پر زندہ رہے گی۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر ہمیں سزائیں نہ ہوئیں تو میں مجوزہ نیشنل کنونشن کی تنظیم کے لیے ملک بھر کا خفیہ دورہ کروں گا کیونکہ زیر زمین رہ کر فل ٹائم کام کرنے والا ہی دشمن کی عائد کردہ وہ ظالمانہ پابندیوں سے آزاد ہوگا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ میں زیادہ پبلٹی کی خاطر بعض مواقع پر منظر عام پر آؤں گا جس سے ظاہر ہوگا کہ اے این سی ہنوز کام کر رہی ہے۔ یہ تجویز میرے لیے حیرت انگیز تھی نہ پسندیدہ لیکن میں جانتا تھا کہ مجھے یہ کام کرنا ہو گا۔ یہ پرخطر ذمے داری ہوگی اور اس کے لیے مجھے اپنے اہل خانہ سے جدا رہنا ہو گا۔ لیکن جب ایک شخص کو اپنے نظریئے کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حق نہ دیا جائے تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ وہ قانونی مفرور بن جائے۔

اہل خانہ سے اگلی جدائی

جب میں اس اجلاس سے لوٹا تو ونی نے جیسے میرے چہرے پر میرے خیالات پڑھ لیے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جان گئی کہ میں ایسی زندگی میں داخل ہونے والا تھا جس کا ہم دونوں میں سے کوئی بھی خواہاں نہیں تھا۔ جو کچھ طے پایا تھا، میں نے اس کی تفصیل اسے بتائی اور یہ بھی بتایا کہ میں کل روانہ ہو جاؤں گا۔ اس نے کمال ضبط سے کام لیا جیسے وہ پہلے اس کی توقع کر رہی تھی۔ جو فرائض مجھے انجام دینے تھے وہ سمجھ گئی تھی اگرچہ اس سے اس کے لیے زندگی مشکل ہوتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ

میرے لیے ایک چھوٹا سوٹ کیس پیک کردے۔ میں نے اسے بتایا کہ میری غیر موجودگی میں دوست اور رشتے دار اس کا خیال رکھیں گے۔ میں نے یہ نہیں بتایا کہ میں کتنا عرصہ باہر رہوں گا اور اس نے پوچھا بھی نہیں۔ یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ مجھے پریٹوریا لوٹنا تھا کیونکہ سوموار کو شاید فیصلہ سنایا جانا تھا۔ خواہ نتیجہ کچھ بھی ہوتا، مجھے گھر واپس نہیں آنا تھا۔ اگر مجھے سزا ہو جاتی تو سیدھے جیل جانا تھا۔ اگر ہمیں بری کر دیا جاتا تو مجھے فوراً زیر زمین چلے جانا تھا۔

میرا بیٹا تھیمسی، ٹرانسکائی میں اسکول جاتا تھا، لہٰذا میں اسے خدا حافظ نہیں کہہ سکتا تھا، تاہم اس سہ پہر میں ماکگاتھو اور اپنی بیٹی ماکازیوی کو آرلینڈو ویسٹ میں ان کی ماں کے ہاں سے اپنے ہاں لے آیا۔ ہم نے کچھ وقت اکٹھے شہر سے باہر میدان میں چہل قدمی کرنے، باتیں کرنے اور کھیلنے میں گزارا۔ پھر ہم نے انہیں خدا حافظ کہا جبکہ میں نہیں جانتا تھا کہ دوبارہ ان سے کب ملوں گا۔ ایک مجاہد آزادی کے بچے بھی یہ جان لیتے ہیں کہ اپنے باپ سے زیادہ سوالات نہیں کرتے اور میں ان کی آنکھوں سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ سمجھ گئے ہیں کہ کوئی سنگین واقعہ پیش آنے والا ہے۔

میں نے دونوں چھوٹی بیٹیوں کو چوم کر خدا حافظ کہا اور جب میں ولس کونکو کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا تو انہوں نے ہاتھ ہلا کر مجھے الوداع کہا اور یوں میں نٹال کے طویل سفر پر روانہ ہو گیا۔

پائٹر مارزبرگ کی آل ان کانفرنس

پائٹر مارزبرگ میں ’’آل ان کانفرنس کے لیے **ملک** بھر سے پندرہ سو افراد جمع ہوئے تھے جو ڈیڑھ سو مختلف مذہبی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی تنظیموں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ جب میں 25 مارچ، ہفتے کی شام جلسہ گاہ کے اسٹیج پر پر جوش اور روفادار سامعین کے سامنے نمودار ہوا تو پانچ سال بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں ایک عوامی پلیٹ فارم پر آزادی سے تقریر کرنے والا تھا۔ پر جوش تالیوں اور نعروں سے میرا

استقبال کیا گیا۔ میں ایک ہجوم سے خطاب کرنے کے تجربے کی شدت بھلا ہی چکا تھا۔"

اپنی تقریر میں، میں نے ایک قومی کنونشن کو کال دی جس میں تمام جنوبی افریقی، کالے اور گورے، ہندوستانی اور رنگ دار برادرانہ طور پر مل بیٹھے اور ایک آئین وضع کریں جو مجموعی طور پر اہل وطن کی آرزوؤں کا آئینہ دار ہو۔ میں نے اتحاد پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اگر ہم ایک آواز ہو کر مطالبہ کریں تو ہم ناقابل تسخیر ہوں گے۔

آل ان کانفرنس میں مساوی بنیادوں پر تمام بالغ مردوں اور عورتوں کے منتخب نمائندوں کا ایک قومی کنونشن بلانے کا مطالبہ کیا گیا تاکہ جنوبی افریقہ کے لیے ایک نیا غیر نسلی جمہوری آئین تیار کیا جائے۔ ایک نیشنل ایکشن کونسل حکومت تک یہ مطالبہ پہنچانے کے لیے چنی گئی اور مجھے اس کا آنریری سیکرٹری بنایا گیا۔ اگر حکومت ایسا کنونشن بلانے میں ناکام رہے تو ہم 29 مئی کو ملک گیر پیانے پر ایک تین روزہ سٹے اوے (Stay away) تحریک شروع کر دیں گے اور ساتھ ہی جنوبی افریقہ کو ایک جمہوریہ قرار دے دیں گے۔ مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ حکومت ہماری تجویز مان لے گی۔

اکتوبر 1960ء میں حکومت نے اس سوال پر ایک آل وائٹ ریفرنڈم کرایا تھا کہ جنوبی افریقہ کو ایک جمہوریہ بننا چاہیے۔ یہ افریکنر نیشنلزم کا ایک پرانا خواب تھا، جس کا مقصد اس ملک سے اپنے رابطے منقطع کرنا تھا جس سے وہ انگلو بوئر وار میں لڑتے رہے تھے۔ اس ریفرنڈم میں جمہوریہ کی حمایت میں 52 فیصد ووٹ پڑے تھے اور جمہوریہ ہونے کا اعلان 31 مئی 1961ء کو کیا جانا تھا۔ ہم نے اس اعلان کی تاریخ پر اپنی "گھر پہ رہو" (Stay at home) مہم چلانے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ ہمارے نزدیک ایسی تبدیلی محض نمائشی تھی۔

کانفرنس کے فوراً بعد میں نے وزیراعظم ورووَرڈ کو ایک خط بھیجا جس میں ایک

قومی آئینی کنونشن بلانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ میں نے انتباہ کیا تھا کہ اگر وہ کنونشن بلانے میں ناکام رہے تو ہم ملک میں سب سے زیادہ عوامی تین روزہ ہڑتال کرادیں گے جو 29 مئی کو شروع ہوگی'' آپ کی حکومت جو جوابی اقدامات کرسکتی ہے، مجھے ان کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں'' میں نے لکھا تھا ''پچھلے بارہ مہینوں کے دوران ہم ایک جابرانہ آمریت کے دور سے گزرے ہیں'' میں نے اس امر کے اخباری بیانات بھی جاری کیے کہ سٹے ایٹ ہوم ہڑتال پرامن اور غیر متشدد ہوگی۔ وروورڈ نے اس کا جواب نہ دیا اور محض پارلیمنٹ میں میرے خط کو ''پرغرور'' کہنے پر اکتفا کیا۔ اس کے بجائے حکومت طاقت کا خوفناک ترین مظاہرہ کرنے پر اتر آئی جو ملکی تاریخ میں پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

عدالت کا منصفانہ فیصلہ

29 مارچ 1961ء مقدمہ بغاوت کے فیصلے کا دن تھا جس کی مدت سے توقع کی جارہی تھی۔ اس دن کی صبح پرانے صومعہ کے دروازے کھلنے سے پہلے ہی ہمارے حامیوں اور پریس والوں کا ہجوم اندر داخل ہونے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ سینکڑوں لوٹا دیئے گئے۔ جب ججوں نے عدالت میں نظم وضبط قائم کیا تو وزیٹر گیلری اور پریس بنچ پر ہو چکے تھے۔

چند لمحے بعد جسٹس رمف نے اپنی موگری بجائی تو استغاثہ نے فرم جرم تبدیل کرنے کی غیر معمولی درخواست پیش کردی۔ انگریزی محاورے کے مطابق یہ گیارہ بجے کا انچاسواں منٹ تھا اور اب دو سال کی تاخیر سے تبدیلی کی درخواست کی جارہی تھی۔ عدالت نے استغاثہ کو آڑے ہاتھوں لیا اور گیلری سے دھیمی تائید سنائی دی۔

''عدالت میں خاموشی!'' اردلی نے پکار کر کہا اور جج رمف نے اعلان کیا کہ تین ججوں کا پینل ایک فیصلے تک پہنچ گیا ہے۔ کمرہ عدالت میں اب کامل خاموشی تھی اپنی گہری اور ہموار آواز میں جج رمف نے عدالت کے اخذ کردہ نتائج پیش کیے یہ

درست ہے کہ افریقن نیشنل کانگریس حکومت کو تبدیل کر کے اس کی جگہ ایک ''ترقی پسند اور بنیادی طور پر مختلف قسم کی مملکت'' کے قیام کے لیے کام کر رہی تھی، یہ درست ہے کہ افریقن نیشنل کانگریس نے ڈیفائنس کمپین کے دوران احتجاج کے غیر قانونی ذرائع اختیار کیے تھے، یہ درست ہے کہ بعض اے این سی لیڈروں نے ایسی تقریریں کی تھیں جن میں تشدد کی تلقین کی گئی تھی اور یہ درست ہے کہ اے این سی میں بائیں بازو کا مضبوط رجحان موجود تھا جو اس کے سامراج دشمن، مغرب دشمن اور روس نواز رویوں میں عیاں تھا، لیکن اس عدالت میں جو شہادتیں پیش کی گئیں اور ہمیں جو حقائق معلوم ہوئے ان سب کی بنا پر اس عدالت کے لیے اس نتیجے پر پہنچا مشکل ہے کہ افریقن نیشنل کانگریس نے تشدد کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنے کی پالیسی اختیار کی تھی، محض اس لیے کہ عوام کو مملکت کے خلاف براہ راست تشدد کی کارروائیاں انجام دینے کے لیے تیار کیا جانا تھا۔

عدالت نے کہا کہ استغاثہ یہ ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے کہ اے این سی ایک کمیونسٹ تنظیم ہے یا یہ کہ فریڈم چارٹر میں ایک کمیونسٹ مملکت کا تصور دیا گیا ہے۔ چالیس منٹ خطاب کرنے کے بعد جسٹس رمف نے کہا ''ملزمان مجرم نہیں پائے گئے لہٰذا بری کیے جاتے ہیں''

سامعین کی گیلری سے تحسین و آفرین کا شور اٹھا۔ ہم کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے اور کمرہ عدالت میں خوش و خرم حامیوں کو ہاتھ لہرا کر جواب دیا۔ باہر ہجوم نے ہمیں دیکھ کر نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ہم میں سے بہت سوں نے اپنے وکلائے صفائی کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ عسی میسلز کی حالت میں یہ آسان کام نہیں تھا کیونکہ وہ بھاری تن و توش کا مالک تھا۔ فلیش کیمرے ہمارے چاروں طرف کام کر رہے تھے۔ ہماری نظریں دوستوں، بیویوں اور رشتے داروں کی طرف اٹھ گئیں ونی آئی ہوئی تھی اور میں نے خوشی میں اسے گلے لگا لیا اگرچہ میں جانتا تھا کہ

میں اس لمحے تو آزاد ہوں مگر اس آزادی کا تحفظ کرنے کے قابل نہیں ہوں جب ہم سب باہر اکٹھے ہوئے تو مقدمہ بغاوت کے ملزمان اور ہجوم سب گانے لگے ''انکوسی سکے لیل ایا فریقہ!''

بیش از چار سال کی عدالتی کارروائی اور درجنوں پراسیکیوٹروں، ہزاروں دستاویزات اور شہادتوں کے لاکھوں صفحات کو پیش کرنے کے بعد حکومت اپنے مشن میں ناکام رہی تھی۔ فیصلہ حکومت کے لیے پریشان کن تھا، اندرون ملک بھی اور بیرون ملک بھی۔ حکومت اس فیصلے سے ہمارے معاملے میں تلخ تر ہوگئی۔ اس نے جو سبق سیکھا وہ یہ نہیں تھا کہ ہماری شکایت جائز تھیں بلکہ یہ تھا کہ اسے اور زیادہ بے رحم ہونے کی ضرورت ہے۔

میں اس فیصلے کو قانونی نظام کی حمایت یا اس امر کا ثبوت قرار نہیں دیتا تھا کہ ایک کالا آدمی ایک گورے آدمی کی عدالت میں انصاف حاصل کر سکتا ہے۔ یہ ایک درست اور منصفانہ فیصلہ تھا، لیکن یہ بڑی حد تک ایک اعلیٰ ڈیفنس ٹیم اور ججوں کے اس پینل کی انصاف پسندی کا نتیجہ تھا۔

تاہم عدالتی نظام جنوبی افریقہ میں شاید واحد مقام تھا جہاں ایک افریقی ممکنہ طور پر منصفانہ سماعت کی توقع کر سکتا تھا اور جہاں قانون کی حکمرانی کا لاگو ہونا ہنوز ممکن تھا۔ یہ بات ان عدالتوں کے لیے خاص طور پر درست تھی جن کی صدارت یونائیٹڈ پارٹی کے مقرر کردہ روشن خیال جج کرتے تھے۔ ان میں سے بہت سے ابھی تک قانون کی حکمرانی قائم کیے ہوئے تھے۔

ججوں کا بے تعصب کردار

بطور طالبعلم مجھے سکھایا گیا تھا کہ جنوبی افریقہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں قانون کی حکمرانی برتر ہے اور تمام افراد پر لاگو ہوتی ہے خواہ ان کا سماجی مقام یا سرکاری مرتبہ کیسا ہی ہو۔ میں تہہ دل سے اس پر یقین رکھتا تھا اور اس مفروضے کی بنیاد پر اپنی

زندگی کی منصوبہ بندی کر رہا تھا لیکن ایک وکیل اور ایک سرگرم سیاسی کارکن کی حیثیت سے میرے کیریئر نے میری آنکھوں پر پڑے تمام پردے اتار دیئے۔ میں نے دیکھا کہ مجھے لیکچر روم میں جو کچھ پڑھایا گیا تھا اور کمرہ عدالت میں جو کچھ میں نے سیکھا ان میں بڑا فرق ہے۔ پہلے میں قانون کا ایک تصوراتی نقطہ نظر رکھتے ہوئے اسے انصاف کی تلوار گردانتا تھا لیکن اب میرا تصور قانون ایک ایسے ہتھیار کا تھا جسے حکمران طبقہ معاشرے کو اپنے لیے سازگار کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ میں نے عدالت میں انصاف کی توقع کبھی نہیں کی اگرچہ میں انصاف کے لیے لڑتا رہا اور بعض اوقات مجھے انصاف ملا بھی۔

مقدمہ بغاوت میں تینوں ججوں نے اپنے تعصّبات، اپنی تعلیم اور اپنے پس منظر سے بلند ہو کر فیصلہ دیا انسانوں میں اچھائی کی ایک جھلک ہوتی ہے جسے دفن کیا یا چھپایا جا سکتا ہے اور جو کسی وقت اچانک غیر متوقع طور پر ابھر سکتی ہے۔ جسٹس رمف نے اپنے منفرد آداب سے پوری کارروائی کے دوران تاثر دیا کہ وہ گوری اقلیت کی حکمرانی کے نقطہ نظر کے حامی ہیں۔ تاہم آخر میں لازمی انصاف پسندی ان کے فیصلے پر غالب آ گئی۔ کینیڈی اپنے شرکائے کار سے کم قدامت پرست تھا۔ اور مساوات کے نظریے سے متاثر لگتا تھا۔ مثلاً وہ اور ڈوما ایک بار ڈربن سے جوہانس برگ ایک ہی طیارے میں گئے اور جب ائیر لائن نے ڈوما نوکوی کو شہر لے جانے سے انکار کر دیا تو کینیڈی نے بھی اس میں سوار ہونے سے انکار کر دیا۔ جج بیکر ہمیشہ فراخ دل اور اس امر سے آگاہ نظر آیا کہ اس کے سامنے کھڑا ملزم مملکت کے ہاتھوں خاصی تکالیف برداشت کر چکا ہے۔ میں ان تینوں ججوں کو انفرادی حیثیت میں لیتے ہوئے انہیں عدالت یا مملکت یا ان کی نسل کے نمائندے نہیں گردانتا تھا بلکہ ناسازگار حالات میں انسانی شرافت کے نمونے خیال کرتا تھا۔

جج بیکر کی بیوی دوسروں کی ضروریات کے بارے میں بڑی حساس تھی۔ ہنگامی

حالت کے دوران وہ سامان اکٹھا کر کے ملزمان کو پہنچاتی رہی تھی۔

لیکن حکومت کی رسوا کن شکست کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ دوبارہ ایسا نہیں ہونے دے گی۔ اس روز کے بعد سے حکمرانوں نے ان ججوں پر انحصار کرنا چھوڑ دیا جنہیں خود انہوں نے مقرر نہیں کیا تھا۔ اب وہ بزعم خویش قانونی زمیوں کی پابندی کرنے والے نہیں تھے جو ''دہشت گردوں'' کو تحفظ اور سزا یافتہ قیدیوں کو جیل میں بعض سہولتیں دیتی تھیں۔ مقدمہ بغاوت کے دوران ایسی کوئی مثالیں دیکھنے میں نہیں آئی تھیں کہ قیدیوں کو الگ تھلگ رکھا گیا ہو، پیٹا گیا ہو اور اذیت دی گئی ہوتا کہ ان سے معلومات اگلوائی جائیں۔ یہ تمام حرکتیں اس کا فیصلہ ہونے کے بعد روزمرہ کا معمول بن گئیں۔

☆☆☆☆☆

حصہ ششم :: سیاہ فام بھگوڑا

پادری کا اللہ سے شکوہ

فیصلے کے بعد میں گھر نہ لوٹا اگرچہ دوسرے لوگ جشن منانے کے موڈ میں تھے مگر میں جانتا تھا کہ حکام کسی بھی وقت وار کر سکتے ہیں اور میں انہیں کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ مجھے فکر یہ تھی کہ میں پابندی لگنے یا گرفتاری سے پہلے کسی طرف نکل جاؤں، چنانچہ میں نے جوہانس برگ میں ایک محفوظ گھر میں رات گزاری۔ یہ ایک عجیب وغریب بستر میں بے چین رات تھی اور میں ہر کار کی آواز پر یہ سوچ کر چونک اٹھتا کہ باہر پولیس آئی ہوگی۔

والٹر اور ڈوما نے میرے سفر کی پہلی مسافت کے لیے مجھے الوداع کہا۔ مجھے پورٹ ایلزبتھ پہنچنا تھا۔ وہاں میں گوان امبیکی اور ریمنڈ اصلابا سے ملا اور پارٹی کے نئے زیرزمین ڈھانچے پر بات چیت کی۔ ہم نے یہ ملاقات ڈاکٹر ماسلا پاتھر کے گھر کی تھی جنہیں بعد میں اس کے جرم میں دو سال کی سزا بھگتنی پڑی کہ اس نے ہمیں اپنے ہاں مل بیٹھنے کا موقع فراہم کیا تھا میں پارٹی کے طے کردہ محفوظ گھروں میں لبرل پورٹ ایلزبتھ مارننگ پوسٹ کے ایڈیٹر سے ملا اور ایک قومی کنونشن منعقد کرنے کی مہم پر گفتگو کی اور اس کے بعد میں کئی اخبارات نے تائید کی بعد میں لبرل ہفتہ وار Contact کے ایڈیٹر و پبلشر پیٹرک ڈنکن سے ملا لبرل پارٹی کا بانی رکن اور ہمای ڈیفائنس مہم کے دوران خلاف ورزی کرنے والے گوروں میں شامل تھا۔ اس کا اخبار مسلسل لکھتا رہا تھا کہ اے این سی کی پالیسیوں پر کمیونسٹ حاوی ہیں مگر جب مجھ سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے پہلی بات یہ کہی کہ مقدمہ غداری کے ریکارڈ کے قریبی مطالعے سے وہ اس مفروضے کو ترک کر چکا ہے اور اپنے اخبار میں اس کی اصلاح کر دے گا۔

اس رات میں نے کیپ ٹاؤن میں افریقی بستیوں کے پادریوں کے اجتماع سے

خطاب کیا۔ میں نے اس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ایک پادری کا افتتاحی دعا اتنے برسوں سے میرے ساتھ رہی اور مشکل وقت میں قوت کا سرچشمہ ثابت ہوئی۔ اس نے تمام انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی بخشش وعطا اور رحم وکرم پر ذات باری تعالیٰ کا شکریہ عطا کیا۔ لیکن پھر اس نے اللہ کریم سے یہ گلہ کرنے کی جسارت کر ڈالی کہ اس کی مخلوق میں سے بعض دوسروں کے مقابلے میں پسے ہوئے ہیں اور یہ کہ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان مستضعفین کی حالت زار پر توجہ نہیں دے رہا۔ پھر پادری نے کہا کہ اگر مالک کل نے سیاہ فاموں کو غلاموں سے نجات دلانے کی طرف کچھ اور پیش رفت نہ کی تو سیاہ فام اس پورے معاملے کو اپنے ہاتھوں میں لینے پر مجبور ہوں گے

آمین۔

کیپ ٹاؤن میں اپنی آخری صبح میں ہوٹل سے جارج پیک کی ہمراہی میں نکل رہا تھا جو ساؤتھ افریقن کلرڈ پیپلز آرگنائزیشن کا بانی رکن تھا۔ میں ہوٹل کے رنگ دار مینجر کے پاس اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے رکا کہ اس نے بہت اچھی طرح میری دیکھ بھال کی تھی۔ وہ میرا ممنون تھا اور ساتھ قدرے متوحش بھی۔ اس نے مجھے شناخت کر لیا تھا، چنانچہ وہ مجھ سے کہنے لگا ''رنگ دار آبادی اس خوف میں مبتلا ہے کہ افریقی حکومت کے تحت بھی وہ اتنے ہی ستم زدہ ہوں گے جتنے کہ موجودہ گوری حکومت کے تحت ہیں'' وہ ایک متوسط طبقے کا کاروباری آدمی تھا جس کا افریقیوں سے غالباً کوئی رابطہ نہ تھا اور وہ ان سے اسی طرح خوفزدہ تھا جس طرح کہ گوروں سے رنگ دار آبادی کی طرف سے یہ تشویش ہر کہیں بالخصوص صوبہ کیپ میں پائی جاتی تھی اگرچہ مجھے دیر ہو رہی تھی میں نے اس شخص کے سامنے فریڈم چارٹر کی وضاحت کی اور اس امر پر زور دیا کہ ہم غیر نسل پرستی پر اخلاص کے ساتھ کاربند ہیں۔ آخر ایک مجاہد آزادی کو عوام تک اپنا نقطہ نظر پہنچانے کے لیے ہر موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

جب میں رات کی مخلوق بنا

اگلے روز میں نیشنل ایگزیکٹو اور ڈربن میں کانگریس تحریک کی جوائنٹ ایگزیکٹوز کے خفیہ مشترکہ اجلاس میں شرکت کی جس میں یہ امر زیر بحث تھا کہ مجوزہ ایکشن سٹے ایٹ ہوم (Stay at home) کی شکل میں ہو یا منظم ہڑتالوں اور مظاہروں کے ساتھ مکمل ہڑتال کی جائے۔ جو لوگ سٹرائیک کے حق میں تھے ان کا کہنا تھا کہ سٹے ایٹ ہوم سٹرٹیجی جو ہم 1950ء سے استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں اپنی افادیت کھو چکی ہے اور ایک ایسے وقت میں جب پی اے سی عوام الناس کو اپیل کر رہی ہے جہاد آزادی کی زیادہ جنگجو صورتیں لازم ہو گئی ہیں۔ متبادل نقطہ نظر جس کی میں نے وکالت کی، یہ تھا کہ سٹے ایٹ ہوم پالیسی ہمیں دشمن پر ضرب لگانے کا موقع دیتی ہے جبکہ اسے جوابی ضرب لگانے سے روکتی ہے۔ میں نے دلیل دی کہ ہماری مہمات میں عوام کا اعتماد خاصا بڑھ چکا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی جانوں کو غیر ضروری طور پر خطرے میں ڈالنے کے روادار نہیں میں نے کہا ''شارپ ویل نے مظاہرین کی تمام تر جرأت وشہامت کے باوجود دشمن کو موقع دیا کہ وہ ہمارے لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنائے۔ میں اس امر سے آگاہ ہونے کے باوجود سٹے ایٹ ہومز کے حق میں ہوں کہ ملک بھر میں ہمارے لوگ جامد قسم کی جدوجہد پر مطمئن نہیں ہو رہے مگر میرے خیال میں ہمیں جامع منصوبہ بندی کی غیر موجودگی میں اپنے ثابت شدہ ہتھکنڈوں کو خیر باد نہیں کہنا چاہیے اور جامع منصوبہ بندی کے لیے فی الحال ہمارے پاس وقت ہے نہ وسائل''

زیر زمین رہنے کے لیے جائے قیام بدلنا ضروری ہے جیسے زلزلے کا نفسیاتی خطرہ درپیش ہو اس کے لیے ہر عمل کی منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا اور بظاہر غیر اہم ہو کوئی چیز معصوم نہیں ہوتی۔ ہر چیز پر تنقیدی نگاہ ڈالی جاتی ہے اس میں آپ اپنی ذات کے لیے نہیں ہو سکتے۔ آپ جو کردار ادا کر رہے ہوں آپ کو اس میں

پوری طرح سمانا پڑتا ہے۔ بعض لحاظ سے جنوبی افریقہ میں ایک سیاہ فام کو زیر زمین رہنے کے لیے اپنے آپ کو زیادہ تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ نسلی امتیاز کی پالیسی کے تحت وہ پہلے بھی قانونیت اور غیر قانونیت کے درمیان اور کشادگی اور پوشیدگی کے درمیان سائے کی سی زندگی بسر کرتا تھا۔ جنوبی افریقہ میں سیاہ فام ہونے کا مطلب تھا کہ کسی پر بھروسہ نہ کیا جائے اور یہ پوری زندگی زیر زمین رہنے سے کچھ مختلف نہ تھا۔

الغرض میں رات کی مخلوق بن گیا۔ میں دن کے دوران اپنے خفیہ ٹھکانے میں بسیرا کرتا اور اندھیرا ہونے پر فرائض انجام دینے کے لیے باہر نکل آتا۔ میں نے زیادہ تر جوہانس برگ کو مرکز بنائے رکھا مگر جب ضروری ہوتا میں دوسرے شہروں کی طرف بھی نکل جاتا میں خالی فلیٹس میں، لوگوں کے گھروں میں جہاں کہیں بھی تنہائی میں اور لوگوں کی نظروں سے دور رہ سکتا قیام کرتا تھا۔ اگر چہ میں انسانوں میں گھلنے ملنے والا شخص ہوں لیکن میں تنہائی کو زیادہ پسند کرتا ہوں اب اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے تنہائی میں منصوبہ بندی اور غور و خوض کرنے اور تراکیب سوچنے کا شغل اپنایا۔ لیکن انسان تنہائی کو ایک حد تک ہی برداشت کر سکتا ہے۔ اپنے بیوی بچوں کے بغیر تنہائی مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔

زیر زمین رہنے کی کلید یہ ہے کہ آدمی لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے۔ جس طرح اپنے آپ کو سب کے سامنے نمایاں کرنے کے لیے کمرے میں داخل ہونے کا ایک طریقہ ہے اسی طرح اپنے آپ کو غیر اہم بنانے کے لیے چلنے پھرنے اور دوسروں سے برتاؤ کرنے کا ایک طریقہ بھی ہے۔ ایک لیڈر کی حیثیت سے آدمی اکثر اپنے آپ کو نمایاں رکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ایک مفرور کا طرز عمل اس کے الٹ ہوتا ہے۔ زیر زمین رہ کر میں اٹھا کر نہیں چلتا تھا اور نہ سیدھا کھڑا ہوتا۔ میں زیادہ نرمی مگر کم صفائی اور امتیاز سے بات کرتا۔ میں اب زیادہ مستعد اور خوامخواہ دخل

دینے والا نہیں تھا۔ میں لوگوں سے کوئی مطالبہ نہیں کرتا تھا بلکہ انہیں موقع دیتا کہ وہ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں اپنی حجامت بنواتا نہ بال کٹواتا۔ میرا اکثر بھیس ایک شوفر یا گارڈن بوائے کا ہوتا۔ میں فیلڈ ورکر کا نیلا اوور آل پہنے رکھتا اور بغیر رم کے چشمہ استعمال کرتا جو مزاوتی ٹی گلاسز کہلاتا ہے۔ میں اپنی کار میں بھی شوفر کی ٹوپی اور اوور آل پہنتا تھا۔ اس پوز میں بچت تھی کیونکہ میں اپنے ''مالک'' کی کار چلانے کے بہانے سفر کرسکتا تھا۔

بلیک پم پرنل یا کالا جنگلی

ان ابتدائی مہینوں میں جب میری گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے اور پولیس میرے تعاقب میں تھی میری مفرور شخصیت اخبارات کے لیے فکر و خیال کا موضوع بنی رہی۔ ایسی خبروں اور مضامین کو صفحہ اول پر جگہ دی جاتی تھی جن میں یہ دعویٰ کیا گیا ہوتا کہ مجھے فلاں فلاں جگہ دیکھا گیا ہے۔ ملک بھر میں سڑکوں پر چیک پوسٹیں قائم کی گئیں تاکہ مجھے گرفتار کیا جاسکے لیکن پولیس کو بار بار ناکامی ہوتی مجھے بلیک پم پرنل (Black pippernel) یعنی کالے جنگلی کا تحقیر آمیز نام دیا گیا۔ یہ بیرونس اورکزی کے افسانوی کردار سکارلٹ پم پرنل (ارغوانی جنگلی یا بھگوڑا) سے ماخوذ تھا جو انقلاب فرانس کے دوران بڑی دلیری کے ساتھ ہر بار گرفتاری سے بچ نکلتا ہے (یاد رہے پم پرنل ایک جنگلی پودا ہے جس پر ارغوانی یا نیلے پھول آتے ہیں مترجم)

میں نے ملک بھر کا خفیہ دورہ کیا۔ میں کیپ کے مسلمانوں کے پاس گیا، نٹال کے شوگر ورکرز کے ساتھ رہا اور پورٹ ایلزبتھ میں فیکٹری ورکروں سے ملاقاتیں کیں۔ میں ملک کے مختلف حصوں میں ٹاؤن شپوں میں پھرتا اور رات کو خفیہ اجلاسوں میں شرکت کرتا۔ میں بلیک پم پرنل کے افسانے میں رنگ بھرنے کے لئے جیب بھر تین پنی کے سکے (Tickeys) لیتا اور ٹیلی فون باکس سے انفرادی طور پر اخباری

رپورٹروں کوفون کرکے اپنی نئی منصوبہ بندی یا پولیس کی نا اہلی کے مزیدار قصے سناتا۔ میں پولیس کا منہ چڑانے اور لوگوں کو خوش کرنے کے لیے کبھی کہیں جا نکلتا اور کبھی کہیں۔

میرے زیر زمین تجربات کے بارے میں کئی جذب آفریں اور نادرست کہانیاں گردش میں تھیں لوگ جرأت کی خوبصورت کہانیاں پسند کرتے ہیں تاہم کئی بار میں بال بال بچا جس کی کسی کو خبر نہ ہوسکی۔ ایک موقع پر میں شہر میں گاڑی پر جا رہا تھا کہ ٹریفک کی لال بتی پر رکنا پڑا۔ میں نے بائیں طرف دیکھا تو ساتھ والی کار میں وٹواٹر سرانڈ سیکیورٹی برانچ کے چیف کرنل سپنگلر پر نگاہ پڑی۔ بلیک پم پرنل اگر اس کے ہاتھ آجاتا تو اس کی سرکاری نیک نامی میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا مگر میں ایک کارکن کی ٹوپی پہنے ہوئے تھا، جسم پر نیلا اوورآل تھا اور آنکھوں پر چشمہ لگا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھنے کی زحمت نہ کی لیکن وہ چند سیکنڈ جو میں نے بتی سبز ہونے کے انتظار میں گزارے مجھے گھنٹوں پر پھیلتے محسوس ہوئے۔

ایک سہ پہر جب میں جوہانس برگ میں ایک شوفر کے بھیس میں لمبا ڈسٹ کوٹ اور ٹوپی پہنے ہوئے تھا، میں ایک نکڑ پر انتظار میں کھڑا تھا کہ مقررہ شخص مجھے پک کرلے۔ اتنے میں ایک افریقی پولیس مین دانستہ میری طرف ڈگ بھرتا نظر آیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں بھاگنے کے لیے کوئی جگہ ہے۔ لیکن میرے ایسا کرنے سے پہلے وہ میری طرف مسکرا دیا اور راہ گیروں کی نظریں بچا کر اس نے انگوٹھے اوپر کرکے مجھے اے این سی کا سلیوٹ کیا اور پھر یہ جا وہ جا۔ اسی طرح کے واقعات کئی بار ہوئے اور جب میں نے دیکھا کہ بہت سے افریقی پولیس مین ہمارے طرفدار ہیں تو میرے عزم و ثبات میں اضافہ ہوگیا۔ ایک سیاہ فام سارجنٹ ونی کو بتاتا رہتا تھا کہ پولیس کیا کر رہی ہے۔ وہ سرگوشی کرتے ہوئے کہتا ''ونی! اس بات کو یقینی بناؤ کہ مادیبا بدھ کو الیگزینڈرا میں موجود نہ ہو کیونکہ اس روز وہاں پولیس چھاپے مارے

گی‘‘جہد آزادی کے دوران سیاہ فام پولیس والوں پر اکثر شدید نکتہ چینی کی جاتی تھی لیکن ان میں بہت سے خفیہ کردار ادا کرتے رہے جو ہمارے لیے بڑا قابل قدر تھا۔

میزبان خاتون نے دھتکار دیا

جب میں زیر زمین تھا جس قدر ممکن تھا میں اپنی وضع قطع ناتراشیدہ اور سال خوردہ رکھتا۔ میرے اوورآل یوں لگتے تھے جیسے وہ زندگی بھر کی مشقت سے گزرتے ہوں۔ پولیس کے پاس میری ایک ڈاڑھی والی تصویر تھی۔ میرے ساتھیوں نے مجھ پر زور دیا کہ میں ڈاڑھی منڈوا دوں مگر میں اپنی ڈاڑھی سے مانوس ہو گیا تھا اس لیے میں نے ان کے مشورے پر کان نہ دھرے۔

یہی نہیں کہ مجھے بارہا پہچان لیا جاتا تھا بلکہ بعض اوقات جھڑک دیا جاتا۔ ایک دفعہ میں جوہانس برگ کے ایک دور دراز علاقے میں ایک اجلاس میں شرکت کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ ایک معروف پادری نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر میرے رات کو ٹھہرنے کا بندوبست کیا۔ میں نے اس مکان پر پہنچ کر دستک دی اور اس سے پہلے کہ میں بتاتا کہ میں کون ہوں، جواب میں ایک معمر خاتون پکار اٹھی: ’’نہیں، ہم تم جیسے آدمی کو ٹھہرانا نہیں چاہتے!‘‘ اور یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔

زیر زمین میرا بیشتر وقت 29 مئی کے سٹے ایٹ ہوم کی منصوبہ بندی کی نذر رہا۔ یہ مملکت اور تحریک آزادی کے مابین عملاً ایک جنگ کی شکل بن رہی تھی۔ مئی کے اواخر میں حکومت نے اپوزیشن لیڈروں پر ملک گیر چھاپے مارنے شروع کیے۔ جلسے جلوسوں پر بندش لگا دی گئی، چھاپہ خانے قبضے میں لے لیے گئے اور پارلیمنٹ میں جلدی سے ایسے قوانین منظور کروائے گئے جو پولیس کو یہ اختیار دیتے تھے کہ وہ ملزم قیدیوں کو بغیر مقدمہ چلائے بارہ دن تک حراست میں رکھ سکتی ہے۔

وزیر اعظم ورووڑ نے اعلان کیا کہ اے این سی کے ہمدرد اخبارات سمیت جو ادارے ہڑتال کی حمایت کر رہے ہیں وہ آگ سے کھیل رہے ہیں۔ یہ اعلان

حکومت کی بے رحمی کا کھلا اظہار تھا۔ حکومت نے صنعتی اداروں پر زور دیا کہ وہ اپنے کارکنوں کو رات کو سونے کی جگہیں فراہم کریں تاکہ انہیں ہڑتال کے دوران گھر واپس نہ جانا پڑے۔ سٹے ایٹ ہوم سے دو روز پہلے حکومت نے جنوبی افریقہ کی تاریخ میں زمانہ امن کی طاقت کا سب سے بڑا مظاہرہ کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے فوج نے سب سے بڑے پیانے پر فوجیوں کو ڈیوٹی پر بلایا۔ پولیس والوں کی چھٹیاں بھی منسوخ کر دی گئیں۔ ٹاؤن شپوں کو جانے آنے کے لئے راستوں پر فوجی دستے تعینات کر دیئے گئے۔ ٹاؤن شپوں کی گندی گلیوں میں جہاں ٹینک گڑگڑا رہے تھے، اوپر ہیلی کاپٹر پرواز کر رہے تھے تاکہ نیچے جھپٹ کر کسی بھی اجتماع کو تتر بتر کر دیں رات کو ہیلی کاپٹر مکانات پر سرچ لائٹیں مارتے تھے۔

انگریزی اخبارات نے مہم شروع ہونے سے کئی دن پہلے ہی اس کی وسیع پبلسٹی کر دی تھی۔ لیکن سٹے ایٹ ہوم کی پیشگی شام پورا انگریزی پریس ٹھٹک گیا اور اس نے لوگوں پر زور دیا کہ وہ صبح کام پر جائیں۔ پی اے سی نے ہمارے سٹے ایٹ ہوم کو سبوتاژ کرنا چاہا اور ہزاروں پمفلٹ پھیلا کر عوام پر زور دیا کہ وہ سٹے ایٹ ہوم کی مخالفت کریں۔ ان پمفلٹوں میں اے این سی لیڈروں کی مزمت کی گئی تھی۔ پی اے سی کے اس اقدام پر ہمیں صدمہ ہوا۔ مذمت کرنا ایک بات ہے جسے ہم برداشت کر سکتے تھے لیکن لوگوں سے کام پر جانے کی اپیل کر کے ایک ہڑتال کو ناکام بنانا دشمن کے مفادات پورے کرنے کے مترادف تھا۔

گورا سپاہی دھوکا کھا گیا

سٹے ایٹ ہوم کی پیشگی شام مجھے سوویٹو کے ایک محفوظ مکان میں اے این سی کی جوہانسبرگ قیادت سے ملاقات کرنی تھی۔ پولیس کی رکاوٹوں سے بچنے کے لیے میں کلپ ٹاؤن کے راستے سوویٹو میں داخل ہوا جہاں عموماً گشت نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جیسے ہی میں ایک اندھا موڑ مڑا میری گاڑی سیدھی اس تک جا پہنچی جس سے میں

بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سڑک بند تھی۔ ایک گورے پولیس مین نے اشارہ کیا کہ میں رک جاؤں۔ میں اپنے اوورآل اور شوفر والی ٹوپی کے معمول کے لباس میں تھا۔ اس نے کھڑکی میں سے میرا جائزہ لیا اور پھر آگے بڑھ کر خود کار کی تلاشی لی۔ بالعموم یہ افریقی پولیس کی ڈیوٹی تھی۔ جب اسے کچھ نہ ملا تو اس نے مجھ سے پاس طلب کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں غلطی سے پاس گھر چھوڑ آیا ہوں اور ایک فرضی پاس نمبر بھی بتا دیا۔ اس پر اس نے مطمئن ہو کر مجھے چلے جانے کا اشارہ کر دیا۔

29 مئی سوموار کو سٹے ایٹ ہوم کا پہلا دن تھا۔ سینکڑوں ہزاروں لوگوں نے کام پر نہ جا کر اپنے عہدوں اور روزگار سے ہاتھ دھونے کا خطرہ مول لیا۔ ڈربن میں ہندوستانی کارکن کارخانوں سے باہر نکل آئے جبکہ کیپ ٹاؤن میں ہزاروں رنگ دار کارکن گھروں پر رہے۔ جوہانس برگ میں مزدوروں کی نصف تعداد گھروں پر رہی جبکہ پورٹ ایلزبتھ میں یہ شرح اس سے بھی اونچی رہی۔ میں نے پریس میں اس ردعمل کو شاندار قرار دیا اور اپنے عوام کی تعریف کی کہ انہوں نے حکومت کے بے مثال تخویفی ہتھکنڈوں کا بہادری سے سامنا کیا ہے گوروں کا ''یوم جمہوریہ'' کا جشن ہمارے احتجاج سے دب کر رہ گیا تھا۔

اگرچہ پہلے روز کے سٹے ایٹ ہوم کی اطلاعات **ملک** کے مختلف حصوں میں شدید ردعمل کا پتہ دیتی تھیں مجموعی طور پر یہ ردعمل ہماری توقعات سے کم تر تھا۔ مواصلاتی رابطے مشکل تھے اور بری خبریں اچھی خبروں کی نسبت ہمیشہ زیادہ سرعت سے پھیلتی محسوس ہوتی تھیں۔ جیسے جیسے مزید اطلاعات موصول ہوئیں میں ردعمل سے دلگرفتہ اور مایوس ہوا۔ اس شام کے احساسات حوصلہ شکن اور غصے کا باعث تھے، چنانچہ میں نے ڈیلی میل کے بنجامن پوگرنڈ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ عدم تشدد کی تحریک کے دن گنے جا چکے ہیں۔

''گھر پہ رہو'' تحریک فلاپ ہو گئی

سٹے ایٹ ہوم کے دوسرے دن میں نے اپنے رفیقوں کے مشورے سے اس کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اس صبح ایک سفید مضافاتی بستی کے ایک محفوظ فلیٹ میں مقامی اور غیر ملکی پریس کے مختلف لوگوں سے ملاقات کی اور سٹے ایٹ ہوم کو ایک بار پھر ''شاندار کامیابی'' قرار دیا۔ لیکن میں نے اس حقیقت کو فاش کر دیا کہ مجھے یقین ہے کہ ایک دنیا دن طلوع ہو رہا ہے۔ میں نے کہا ''اگر حکومت ہماری عدم تشدد کی تحریک کو ننگی قوت سے کچلنا چاہتی ہے تو ہمیں اپنے حربوں پر نظر ثانی کرنی پڑے گی۔ میرا خیال ہے کہ ہم عدم تشدد کی پالیسی کے سوال کا باب بند کر رہے ہیں'' یہ ایک بڑا اعلان تھا اور میں اس کے مضمرات جانتا تھا۔ ہماری ایگزیکٹو نے پارٹی میں زیر بحث آنے سے پہلے ایسے ریمارکس دینے پر تنقید کی لیکن ایک متذبذب تنظیم کو اس سمت میں لے جانے کے لیے جہاں آپ لے جانا چاہتے ہوں کسی کو تو اپنا خیال عوام کے سامنے پیش کرنا ہی ہوتا ہے۔

ہمارے اندر تشدد کے استعمال پر بحث اوائل 1960ء سے ہو رہی تھی۔ میں نے سب سے پہلے 1952ء میں مسلح جدوجہد پر والٹر سیسولو کے ساتھ بحث کی تھی۔ اب پھر میں نے اس سے بات چیت کی اور ہم نے اس پر اتفاق کیا کہ پارٹی کو ایک نئے راستے پر چلنا پڑے گا۔ کمیونسٹ پارٹی نے خفیہ طور پر اپنی زیر زمین تشکیل نو کر لی تھی اور اپنا عسکری بازو قائم کرنے پر غور کر رہی تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ میں مسلح جدوجہد کا معاملہ ورکنگ کمیٹی میں اٹھاؤں اور جون 61ء کی ایک میٹنگ میں میں نے ایسا کر دیا۔

میں نے اپنی تجویز بیان کرنی شروع ہی کی تھی کہ کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری اور اے این سی کے طاقتور ترین رکن موسز کوٹانی نے جوابی حملہ کرتے ہوئے مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے اس تجویز پر کافی احتیاط سے غور نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ میں حکومت کے اقدامات سے ناکارہ اور مفلوج ہو گیا ہوں اور اب مایوسی میں انقلابی لب ولہجہ

استعمال کرنے پر اتر آیا ہوں۔ اس نے زور دے کر کہا ’’اگر ہم پر فکر اور کافی پر عزم ہوں تو پرانے حربوں کی اب بھی گنجائش ہے۔ اگر ہم منڈیلا کے تجویز کردہ راستے پر چل نکلے تو ہم معصوم عوام کو دشمن کے ہاتھوں مروا دیں گے۔‘‘

موسز کی گفتگو تاثر خیز تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ اس نے میری تجویز کو شکست سے دو چار کر دیا ہے حتیٰ کہ والٹر بھی میری حمایت میں نہ بولا، چنانچہ میں نے تجویز واپس لے لی۔ بعد میں میں نے والٹر سے اپنی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس نے میری حمایت کیوں نہیں کی تھی اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ یہ ویسی ہی احمقانہ حرکت ہوتی جیسے غضبناک شیروں کے ایک غول سے لڑنے کی کوشش کی جائے۔ والٹر ایک ڈپلومیٹ اور حاضر دماغ ہے۔ اس نے کہا ’’میں موسز کی آپ سے نجی ملاقات کا اہتمام کرتا ہوں اس طرح آپ اس کے سامنے اپنا موقف بیان کر سکتے ہیں میں زیر زمین تھا مگر والٹر نے ہماری ملاقات ٹاؤن شپ کے ایک مکان میں کرائی اور ہم نے سارا دن باتیں کرتے گزارا۔‘‘

’’جنگلی بھینسے کا حملہ‘‘

میں نے ملائمت سے وضاحت کی کہ میں کویں اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ ہمارے لیے اب تشدد کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ میں نے ایک قدیم افریقی کہاوت استعمال کی ’’سیطانا یا سی بوکوی کا ڈائیطا لا‘‘ (جنگلی بھینسے کا حملہ خالی ہاتھوں سے نہیں روکا جا سکتا) موسز طویل عرصے سے کمیونسٹ تھا، چنانچہ میں نے اسے بتایا کہ اس کی پوزیشن باٹسٹا کے زیر حکومت کیوبا کی کمیونسٹ پارٹی کی سی ہے۔ پارٹی کو اصرار تھا کہ انقلابی اقدام کے لیے ابھی مناسب حالات پیدا نہیں ہوئے لہٰذا انہوں نے انتظار کیا کیونکہ وہ محض لینن اور سٹالن کی نصابی کتابی اصطلاحوں کی پیروی کر رہے تھے۔ لیکن کاسترو انتظار نہ کر سکا، وہ میدان عمل میں کود پڑا اور کامیاب رہا۔ اگر تم بھی کتابی حالات کا انتظار کرتے رہے تو وہ کبھی وقوع پذیر نہیں ہوں گے۔ میں نے موسز سے صاف

صاف کہا کہ اس کا ذہن اے این سی کے اس پرانے سانچے میں اٹکا ہوا ہے کہ وہ ایک قانونی تنظیم ہے لوگ پہلے ہی اپنے عسکری یونٹ تشکیل دے رہے ہیں اور واحد تنظیم جو ان کی قیادت کی صلاحیت رکھتی ہے اے این سی ہے۔ ہم ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں کہ عوام ہم سے آگے ہیں اور اب وہ واقعی ہم سے آگے ہیں۔

دن بھر کی گفتگو کے بعد موسز نے مجھ سے کہا ''نیلسن! میں تم سے کوئی وعدہ نہیں کرتا مگر تم دوبارہ یہ مسئلہ کمیٹی میں اٹھاؤ، پھر ہم دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے'' چنانچہ ایک ہفتے کے اندر ایک میٹنگ رکھ لی گئی جس میں ایک بار پھر میں نے وہی مسئلہ اٹھایا اس مرتبہ موسز خاموش رہا اور اجلاس کی عام رائے یہ تھی کہ مجھے یہ تجویز نیشنل ایگزیکٹو کے سامنے پیش کرنی چاہیے والٹر محض مسکرا دیا۔

اس دور کے تمام اجلاسوں کی طرح ڈربن میں اجلاس خفیہ طور پر رات کو منعقد ہوا تا کہ ہم پولیس کی نظروں میں نہ آسکیں۔ مجھے شبہ تھا کہ مشکل پیش آئے گی کیونکہ چیف لوتھولی اجلاس میں موجود تھے اور میں عدم تشدد سے ان کی اخلاقی وابستگی سے آگاہ تھے۔ مجھے وقت بھی کھٹکتا تھا کیونکہ میں مقدمہ غداری کے فوراً بعد تشدد کا سوال اٹھا دیا تھا جبکہ اس مقدمے کے دوران ہمارا موقف تھا کہ عدم تشدد اے این سی کا ناقابل خلاف ورزی اصول ہے اور یہ کوئی ایسا حربہ نہیں جسے حالات کے مطابق تبدیل کرلیا جائے۔ میں بذات خود اس کے برعکس یقین رکھتا تھا یہ کہ عدم تشدد ایک حربہ ہے جسے ترک کردینا چاہیے جب یہ مزید کام نہ آتا ہو۔

اجلاس میں میں نے کہا کہ حکومت نے تشدد کے سوا ہمارے لیے کوئی متبادل نہیں چھوڑا اور یہ غلط اور غیر اخلاقی روش ہوگی کہ اپنے عوام کے سامنے کوئی متبادل پیش کیے بغیر انہیں حکومت کے مسلح حملوں کا نشانہ بنوا دیا جائے۔ میں نے پھر کہا کہ عوام نے ہتھیار اٹھا لیے ہیں۔ تشدد شروع ہو جائے گا خواہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس تشدد کے ہم خود رہنمائی کریں اصولوں کے مطابق جہاں ہم نے ظلم کی

علامتوں پر حملہ کر کے انسانی جانیں بچالی تھیں؟ اگر اب ہم نے قیادت کی باگ ڈور نہ سنبھالی تو جلد ہی ہم پیچھے رہ جائیں گے اور پھر ہمیں ایک ایسی تحریک کے پیچھے چلنا پڑے گا جس پر ہمارا کوئی کنٹرول نہ ہو گا۔

چیف نے پہلے تو میرے دلائل کی مزاحمت کی۔ ان کے نزدیک عدم تشدد محض ایک حربہ نہیں تھا۔ لیکن ہم تمام رات انہیں قائل کرتے رہے اور میرا خیال ہے کہ اپنے دل میں وہ جان گئے تھے کہ ہم درست کہتے ہیں۔ آخر کار وہ مان گئے کہ عسکری مہم ناگزیر ہے۔ جب بعد میں کسی نے اشارۃً کہا کہ غالباً چیف یہ راستہ اپنانے پر آمدہ نہیں تو وہ بول اٹھے ''اگر کوئی یہ سمجھتا کہ میں صلح پسند ہوں تو وہ میرے چوزے اٹھانے کی کوشش کرے اور اسے پتہ چل جائے گا کہ وہ کس قدر غلط سمجھتا ہے''۔ نیشنل ایگزیکٹو نے رسمی طور پر ورکنگ کمیٹی کے ابتدائی فیصلے کی منظوری دے دی۔ چیف اور دوسروں نے تجویز پیش کی کہ ہمیں اس قرارداد کو اس طرح نہیں لینا چاہیے جیسے اے این سی نے اس پر بحث نہیں کی۔ وہ ہمارے ان ساتھیوں کی قانونیت کو داغدار نہیں کرنا چاہتے تھے جن پر پابندیاں نہیں تھیں۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ عسکری تحریک ایک جداگانہ اور آزاد تنظیم ہو جو اے این سی سے منسلک ہو اور اس کے مجموعی کنٹرول میں ہو مگر بنیادی طور پر وہ خودمختار ہو۔ اس جہد آزادی کے دو الگ الگ دھارے ہوں گے۔ ہم نے چیف کی تجویز فوراً قبول کر لی۔ چیف اور دوسروں نے اس نئے فیز کے بارے میں خبردار کیا کہ یہ پارٹی کے بنیادی کاموں اور جہد آزادی کے روایتی طریقوں کو نظر انداز کرنے کا بہانہ نہ بن جائے۔ ایسا ہوا تو یہ بھی خودشکنی کے مترادف ہو گا کیونکہ کم از کم شروع میں مسلح جدوجہد تحریک کا مرکز و محور نہیں ہو گی۔

ہم نے تشدد کو تیاگ دیا

اگلی رات ڈربن میں جوائنٹ ایگزیکٹو کا اجلاس ہونا تھا۔ اس میں انڈین کانگریس، کلرڈ پیپلز کانفرنس، ساؤتھ افریقن کانگریس آف ٹریڈ یونینز اور کانگریس آف ڈیمو

کریٹس شامل تھیں۔ اگرچہ ان دوسرے گروپوں نے اے این سی کے فیصلے مروت میں قبول کر لیے مگر میں جانتا تھا کہ میرے بعض ہندوستانی ساتھی تحریک کے مائل بہ تشدد ہونے کی شدید مخالفت کریں گے۔

اجلاس کا آغاز نا مبارک رہا۔ چیف لوتھولی صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ میں چاہوں گا میرے ساتھی آج رات اس پر از سر نو غور کریں۔ ظاہر تھا چیف ہمارے نئے راستے سے پوری طرح متفق نہ تھے۔

ہمارا اجلاس رات آٹھ بجے شروع ہوا اور یہ ہنگامہ خیز تھا۔ میں نے وہی نکات پیش کیے جو میں پیش کرتا چلا آ رہا تھا مگر کئی لوگوں نے ذہنی تحفظات کا اظہار کیا۔ یوسف کاچھالیا اور ڈاکٹر نائیکر نے ہم سے التجا کی کہ ہم اس راستے پر نہ چلیں کیونکہ اس صورت میں حکومت پوری تحریک آزادی کو ذبح کر ڈالے گی۔ جے این سنگھ جو ایک شعلہ بیان خطیب تھے ان کے الفاظ آج بھی میرے دماغ میں گونجتے ہیں ان کا کہنا تھا ''عدم تشدد نے ہمیں ناکام نہیں کیا، ہم نے عدم تشدد کو ناکام بنایا ہے'' میں نے جواب میں کہا درحقیقت عدم تشدد نے ہمیں ناکام بنایا ہے کیونکہ اس نے حکومت کا تشدد روکنے یا ہم پر مظالم ڈھانے والوں کے دل بدلنے کے لیے کچھ نہیں کیا۔

ہم تمام رات بحث و تمحیص میں لگے رہے اور صبح کی اولین گھڑیوں میں میں نے محسوس کیا کہ پیشرفت ہونے لگی ہے۔ بہت سے ہندوستانی لیڈر اب عدم تشدد کے خاتمے کے بارے میں افسوسناک لہجے میں بات کر رہے تھے۔ لیکن ساؤتھ افریقن کانگریس کے رکن ایم ڈی نائیڈو پھٹ پڑے اور انہوں نے اپنے ہندوستانی ساتھیوں سے کہا کیا تم جیل جانے سے ڈرتے ہو؟ بس یہی انجام ہونا تھا!

ان کے اس جملے نے میٹنگ میں ہلچل مچا دی۔ جب آپ کسی شخص کے خلوص پر اعتراض کریں گے تو لڑائی ہو گی۔ پوری بحث واپس عدم مفاہمت کی طرف مڑنے لگی۔ لیکن پھر دن نکلنے کے قریب قرارداد پیش کر دی گئی۔ کانگریس نے مجھے اختیار

دیا کہ میں اپنی راہ پر پیش قدمی کروں اور اے این سی سے الگ ایک نئی عسکری تنظیم تشکیل دوں۔ اے این سی کی پالیسی ہنوز عدم تشدد کی ہو گی۔ مجھے اختیار دیا گیا کہ اس تنظیم کی تشکیل کے لیے جس کسی کو ساتھ ملانے کی ضرورت ہو، اسے ساتھ ملاؤں اور یہ تنظیم مادر تنظیم کے براہ راست کنٹرول میں نہیں ہو گی۔

یہ ایک تاریخ ساز اقدام تھا۔ پچاس برس تک اے این سی عدم تشدد کو اپنے مرکزی اصول کے طور پر اپنائے ہوئے تھی جو ہر قسم کے اعتراض اور بحث و تکرار سے بالا تھا۔ لیکن اب سے وہ ایک مختلف قسم کی تنظیم کا روپ اختیار کر رہی تھی۔ ہم ایک نئے اور زیادہ خطرناک راستے پر چل نکلے تھے جو منظم تشدد کا راستہ تھا اور جس کے نتائج ہم جانتے تھے نہ جان سکتے تھے۔

نئی عسکری تنظیم MK کا قیام

میں جو کبھی ایک سپاہی نہیں رہا تھا، جس نے کبھی کوئی جنگ نہیں لڑی تھی، جس نے کبھی دشمن کی طرف فائر نہیں کیا تھا اب مجھے ایک فوج کھڑی کرنے کا فریضہ سونپ دیا گیا تھا۔ یہ ایک تجربے کار جرنیل کے لیے بھی ہمت آزما کام تھا۔ میرے جیسے نو آموز کا تو ذکر ہی کیا اس نئی تنظیم کا نام ''امخونتو وی سزوی'' (تفنگ قوم) مختصراً اسے MK کہا گیا۔ نیزہ بطور علامت چنا گیا کیونکہ اس سادہ ہتھیار سے افریقیوں نے گوروں کی توسیع پذیری کا صدیوں مقابلہ کیا تھا۔

اگرچہ اے این سی کی ایگزیکٹو میں گوروں کی رکنیت نہیں ملتی تھی ''ایم کے'' اس کی پابند نہیں تھی۔ جلد ہی میں نے والٹر سیسولو کے ساتھ جو سلاوو کو رکن بنالیا اور ہم تینوں نے اس کی ہائی کمان تشکیل دی جا کا میں چیئرمین تھا ''جو'' کے ذریعے میں نے کمیونسٹ پارٹی کے سفید ارکان کی خدمات حاصل کر لیں جنہوں نے تشدد کے راستے کا عزم کر رکھا تھا اور پہلے ہی سرکاری ٹیلی فون لائنیں کاٹنا جیسی سبوتاژ کی کارروائیاں کر چکے تھے۔ ہم نے جیک ہوگسن کو جو دوسری جنگ عظیم میں سپرنگ

بوک لیجن میں رہ کر جنگ لڑ چکا تھا اور رستی برنشپنان دونوں کو پارٹی ممبرز بنالیا۔ جیک ہمارا پہلا ڈیمولیشن ایکسپرٹ بن گیا۔ ہمارا مینڈیٹ حکومت کے خلاف تشدد کی کارروائیاں کرنا تھا اور یہ فیصلہ بھی ہونا تھا کہ یہ کارروائیاں کس نوعیت کی ہوں ہمارا ارادہ تھا کہ ایسی کارروائیوں سے آغاز کیا جائے کہ افراد کے خلاف تشدد کم سے کم ہو لیکن وہ حکومت کے خلاف انتہائی نقصان دہ ہو۔

میں نے اس واحد طریقے سے آغاز کیا جو میرے علم میں تھا یعنی مطالعہ اور ماہرین سے گفتگو۔ میں ایک انقلاب کا آغاز کرنے کے بنیادی اصول معلوم کرنا چاہتا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ اس موضوع پر بہت کچھ تحریر میں آ چکا ہے، چنانچہ میں نے مسلح جنگ خصوصاً گوریلا جنگ پر دستیاب لٹریچر کھنگالنا شروع کیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ ایک گوریلا جنگ کے لیے کون سے حالات مناسب ہوتے ہیں، کس طرح ایک گوریلا فورس تشکیل دے کر اس کی تربیت اور اسے سرگرم عمل کرنے کا اہتمام کیا جائے، اسے کسی طرح مسلح کیا جائے اور اسے رسد کہاں سے ملے یہ تمام بنیادی سوالات ہمارے سامنے تھے۔

گوریلا جرنیل کا خط

ہر ذریعہ معلومات میرے لیے دلچسپی کا باعث تھا۔ میں نے کمیونسٹ پارٹی آف کیوبا کے سیکرٹری جنرل بلاس روکا کی رپورٹ پڑھی جو باٹسٹا حکومت کے دوران ان کی جدوجہد پر مشتمل تھی جوانہوں نے ایک غیر قانونی تنظیم کے طور پر کی تھی۔ ڈینیز رائنس کی تصنیف کمانڈو میں میں نے اینگلو بوئر جنگ کے دوران بوئر جنرلوں کے جنگی حربوں کے بارے میں پڑھا۔ میں نے چی گویرا، ماؤزے تنگ اور فیڈل کاسترو کی تصانیف کا مطالعہ کیا۔ ایڈگر سنو کی شاندار تصنیف ''ریڈ سٹار اوور چائنہ'' میں یہ دیکھا کہ یہ ماؤ کا عزم اور غیر روایتی سوچ تھی جس نے اسے فتح سے ہمکنار کیا تھا۔ میں نے مناحم بیگن کی ریوولٹ (Rovlet) پڑھی اور اس حقیقت سے متاثر ہوا کہ

اسرائیلی لیڈر نے ایک ایسے ملک میں گوریلا جنگ کی قیادت کی تھی جہاں پہاڑ تھے نہ جنگل اور ہمارے حالات بھی ایسے ہی تھے (یہ جنگ دراصل صیہونی دہشت گردوں کی غاصبانہ جنگ تھی جو انہوں نے برطانوی سامراج کے سائے میں یورپ سے آکر فلسطینی قوم کے خلاف برپا کی تھی اور مغربی ممالک کے تعاون سے وہ فلسطینی مسلمانوں کو ان کی سرزمین سے باہر نکال کر اسرائیل کی ناجائز مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس میں انہیں یورپ، امریکہ اور سوویت روس حتیٰ کہ نام نہاد اقوام متحدہ نے جائز طور پر ایک یہودی مملکت قائم کرنے کی جنگ قرار دیا جسے عالم اسلام کے سوا تمام دنیا نے درست تسلیم کرلیا۔ چنانچہ نیلسن منڈیلا جیسے لوگ آج تک اس جھوٹے پروپیگنڈے کے اسیر ہیں اور آج عالم اسلام کے بیشتر ممالک اور یاسر عرفات جیسے فلسطینی لیڈر بھی مغرب اور اسرائیل کی عسکری و صنعتی برتری سے مرعوب ہو کر اس ناجائز صیہونی مملکت کو جائز تسلیم کرنے پر مجبور ہیں مترجم) میں مسولینی کے خلاف ایتھوپیا کے لوگوں کی جدوجہد اور کینیا، الجزائر اور کیمرون کی گوریلا فوجوں کے بارے میں مزید جاننے کے لیے بیتاب تھا۔

میں جنوبی افریقہ کے ماضی میں چلا گیا۔ میں نے سفید آدمی کی آمد سے پہلے اور بعد کی تاریخ پڑھی۔ میں نے افریقی بمقابلہ افریقی، افریقی بمقابلہ گورے اور گورے بمقابلہ گورے، ساری جنگیں کھنگالیں۔ میں نے ملک کے بڑے صنعتی علاقوں، نظام حمل ونقل اور مواصلاتی نیٹ ورک کا ایک سروے کیا۔ میں نے ملک کے تفصیلی نقشے فراہم کیے اور ملک کے مختلف علاقوں کی زمین کا باقاعدہ تجزیہ کیا۔

26 جون 1961ء کو جو ہمارے نزدیک یوم آزادی تھا میں نے زیر زمین سے جنوبی افریقی اخبارات کے نام ایک خط جاری کیا جس میں حالیہ سٹے ایٹ ہوم کے دوران عوام کے حوصلے کی تعریف کی اور ایک بار پھر قومی آئینی کنونشن کی کال دی۔ میں نے پھر اعلان کیا کہ اگر حکومت ایسا کنونشن منعقد کرنے میں ناکام رہی تو عدم

تعاون کی ملک گیر تحریک چلائی جائے گی۔ میرے خط میں لکھا تھا:

مجھے اطلاع ملی ہے کہ میری گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں اور یہ کہ پولیس میری تلاش میں ہے۔ نیشنل ایکشن کونسل نے اس مسئلے پر مکمل اور سنجیدہ غور و خوض کیا ہے اور مجھے ہدایت کی ہے کہ میں گرفتاری نہ دوں۔ میں نے اس پر صاد کیا ہے اور اپنے آپ کو ایک ایسی حکومت کے سامنے پیش نہیں کروں گا جسے میں تسلیم نہیں کرتا۔ ہر سنجیدہ سیاستدان یہ محسوس کرے گا کہ آج کی ملکہ صورت حال میں اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر کے سستی شہادت کا طلبگار ہونا احمقانہ اور مجرمانہ حرکت ہے۔

میں نے وہ راستہ چنا ہے جو زیادہ مشکل ہے اور جس میں جیل خانے کی نسبت زیادہ خطرات اور مصائب پوشیدہ ہیں۔ مجھے اپنے بیوی بچوں، اپنی والدہ اور بہنوں سے جدائی برداشت کرنی پڑ رہی ہے تاکہ اپنے وطن میں ایک مفرور کی زندگی گزاروں۔ مجھے اپنا کاروبار بند اور پیشہ ترک کرنا پڑا ہے اور غربت کا مزہ چکھنا پڑ رہا ہے جیسا کہ میرے اکثر ہم وطن چکھ رہے ہیں میں آپ کے شانہ بہ شانہ، انچ بہ انچ اور میل بہ میل حکومت سے لڑوں گا حتیٰ کہ فتح حاصل ہو جائے۔ اب آپ کو کیا کرنا ہے؟ کیا آپ ہمارے ساتھ چلیں گے یا کیا آپ حکومت کی ان کوششوں میں تعاون کریں گے جو وہ آپ کی اپنی قوم کے دعاوی اور خواہشات کو کچلنے کے لیے کر رہی ہے؟ کیا آپ میری اور آپ کی اپنی قوم کی زندگی اور موت کے مسئلے میں خاموش اور غیر جانبدار رہیں گے؟ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ میں جنوبی افریقہ سے باہر جاؤں گا نہ گرفتاری دوں گا۔ صرف مصائب، قربانی اور عسکری عمل کے ذریعے آزادی حاصل کی جا سکتی ہے۔ جدوجہد میری زندگی ہے۔ میں اپنی زندگی کے آخری سانس تک آزادی کے لیے جدوجہد جاری رکھوں گا۔

بارود کا پہلا دھماکا

پہلے چند زیر زمین مہینوں کے دوران میں چند ہفتے مارکیٹ سٹریٹ میں ایک

خاندان کے ہاں رہا جس کے بعد بیریا میں بیچلر فلیٹ کی پہلی منزل کے ایک کمرے میں وولفی کو دیش کے ساتھ رہا۔ یہ ڈاؤن ٹاؤن سے شمال میں کچھ فاصلے پر ایک خاموش سفید مضافاتی بستی تھی۔ وولفی کانگریس آف ڈیموکریٹس کا رکن اور نیو ایج کا رپورٹر تھا اور دوسری جنگ عظیم میں جرمنوں کے خلاف شمالی افریقہ اور اٹلی میں لڑ چکا تھا۔ اس کا فنون جنگ کا علم اور جنگ کا براہ راست تجربہ دونوں میرے لیے انتہائی مفید تھے۔ اس کے مشورے پر میں نے جرمن جنرل کارل فون کلاس وٹس کا کلاسیک کام آن وار (On war) پڑھا۔ کلاس وٹس کا مرکزی نظریہ کہ جنگ دوسرے ذرائع سے ڈپلومیسی کا تسلسل ہے، میرے اپنے خیالات سے لگا کھاتا تھا۔ میں وولفی پر انحصار کرتا تھا کہ وہ میرے لیے پڑھنے کا مواد فراہم کرے اور مجھے خدشہ ہے کہ میں اس کے کام اور خوشیوں دونوں کی قیمت پر اس کی زندگی میں داخل ہو گیا تھا۔ لیکن وہ ایسا ملنسار اور شرمیلا تھا کہ اس نے کبھی شکایت نہ کی۔

میں نے قریباً دو ماہ اس کے فلیٹ میں گزارے۔ میں کیمپ بیڈ پر سوتا اور دن کو کھڑکیوں کے پردے کھینچ کر مطالعہ کرنے اور منصوبہ بندی میں گزارتا اور رات ملاقاتوں اور اجلاس منظم کرنے میں صرف ہوتی۔ ہر صبح میں وولفی کو ناراض کرتا تھا کیونکہ میں پانچ بجے اٹھتا، جوگنگ کا لباس پہنتا اور ایک گھنٹے سے زیادہ ایک ہی جگہ دوڑتا رہتا۔ آخر کار وولفی نے میرے اس نسخے کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور میرے ساتھ صبح کی کسرت کرنے لگا اور اس کے بعد وہ ٹاؤن روانہ ہو جاتا۔

ایم کے تنظیم اس وقت دھماکے شروع کرنے کی مشق کر رہی تھی۔ ایک شام میں وولفی کے ساتھ مضافات میں ایک پرانے اینٹوں کے بھٹے پر ایک مظاہرے کے لیے گیا۔ میرا باہر جانا خطرے کی بات تھی مگر میں ''ایم کے'' کے پہلے دھماکہ خیز تجربے کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ اینٹوں کے بھٹوں پر دھماکے معمول کی بات تھے کیونکہ خشت ساز مٹی کو نرم کرنے کے لیے ڈائنامائٹ استعمال کرتے تھے تاکہ مشینیں

اینٹیں بنانے کے لیے مٹی نکال سکیں۔ جیک ہوگسن اپنے ہمراہ تیل کا کنستر لایا تھا جو نائٹروگلیسرین سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے ٹائمنگ یعنی دھماکے کا وقت متعین کرنے کے لیے ایک آلہ بنایا تھا جو ایک بال پوائنٹ پین کے اندر آ جاتا تھا۔ اس وقت تاریکی تھی اور ہمارے پاس صرف ایک چھوٹی سے لائٹ تھی اور ہم ایک طرف کھڑے تھے جب جیک نے آغاز کیا۔ جب تیاری ہوگئی تو ہم نے پیچھے رہ کر تیس سیکنڈ تک گنتی گنی بارود شور کے ساتھ پھٹا اور زمین میں گڑھا پڑ گیا دھماکا کامیاب رہا تھا۔ ہم سب تیزی سے اپنی کاروں کی طرف پلٹے اور مختلف سمتوں میں چل دیے۔

کھٹے دودھ نے مجھے بھگا دیا

میں ہیریا میں خود کو محفوظ پاتا تھا۔ میں باہر نہیں جاتا تھا۔ چونکہ یہ گوروں کا علاقہ تھا، پولیس مجھے تلاش کرنے کے لیے ادھر آنے کا غالباً سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ جب دن کو فلیٹ میں مطالعہ کر رہا ہوتا میں اکثر ایک پنٹ دودھ کھڑکی میں رکھ دیتا تاکہ اس میں خمیر پیدا ہو جائے۔ میں اس کھٹے دودھ کا بہت شوقین ہوں جو ژھوسا لوگوں میں اماسی کہلاتا ہے اور صحت بخش غذائیت سے بھرپور شمار ہوتا ہے۔ اسے تیار کرنا بہت آسان ہے۔ بس یہ کہ کھلی ہوا میں رہنے دیا جائے یہ گاڑھا اور کھٹا ہو کر دہی کی طرح بن جاتا ہے۔ میں نے وولفی کو بھی آمادہ کیا کہ وہ چکھ کر دیکھے لیکن جب اس نے چکھا تو وہ بڑا بدمزہ ہوا۔

ایک شام جب وولفی لوٹا تو ہم فلیٹ میں گپ شپ کرنے لگے۔ تب مجھے قریبی کھڑکی سے کسی کی گفتگو سنائی دی۔ دو کالے آدمی زولو میں باتیں کر رہے تھے مگر مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے کیونکہ پردے کھنچے ہوئے تھے۔ میں نے وولفی کو اشارہ کیا کہ خاموش رہے۔

''اس کھڑکی کی دہلیز میں'' ہمارا دودھ کیا کر رہا ہے؟ ایک افریقی نے پوچھا

''تم کیا بات کر رہے ہو؟'' دوسرے نے جواب میں کہا

''کھڑکی کی دہلیز میں کھٹا دودھ اماسی وہاں کیا کررہا ہے؟'' پہلی آواز پھر آئی پھر خاموشی کا وقفہ رہا۔ تیز آنکھوں والا افریقی یہ کہہ رہا تھا کہ صرف ایک کالا آدمی ہی اس طرح کھڑکی میں دودھ رکھ سکتا ہے۔ مگر ایک کالا آدمی گورے علاقے میں رہ کر کیا کررہا ہے؟ تب مجھے احساس ہوا کہ اب مجھے یہاں سے چل دینا چاہیے اور اگلی رات میں کسی اور ٹھکانے کی طرف روانہ ہوگیا۔

مالی، مزدور اور زرعی سائنسدان

اب میں جوہانس برگ میں ایک ڈاکٹر کے ہاں مقیم ہوا رات کو سرونٹ کوارٹر میں سوتا اور دن کو ڈاکٹر کے سٹڈی روم میں کام کرتا۔ جب کبھی دن کو گھر میں کوئی آتا تو میں عقبی صحن میں جا کر مالی بن جاتا۔ پھر میں نے نٹال میں گنے کے ایک فارم میں دو ہفتے گزارے جہاں میں افریقی مزدوروں کے ایک گروہ کے ساتھ ایک چھوٹی سی آبادی میں رہا جو ٹونگات کہلاتی تھی اور ڈربن کے ساحل سے اوپر کی طرف تھی۔ میں ایک ہوسٹل میں ایگریکلچرل ڈیمانسٹریٹر کے بھیس میں بھی رہا جو حکومت کی فرمائش پر زمین کی قدرو قیمت کا اندازہ لگانے آیا تھا۔

تنظیم نے مجھے ڈیمانسٹریٹر کے اوزار دے رکھے تھے اور میں دن کا ایک حصہ مٹی کو ٹیسٹ کرنے اور تجربے کرنے میں گزارتا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں تھی کہ میں کیا کررہا ہوں اور میں خیال نہیں کرتا کہ میں ٹونگارٹ کے لوگوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب رہا تھا۔ لیکن یہ مرد اور عورتیں جو زیادہ تر فارم ورکر تھے وہ ایک طبعی شعور سے بہرہ ور تھے اور کبھی میری شناخت کے بارے میں سوال نہ کرتے حتیٰ کہ اس وقت بھی خاموش رہتے جب وہ رات کو لوگوں کو کاروں میں آتے دیکھتے جن میں بعض معروف مقامی سیاستدان تھے۔ اکثر میں رات بھر میٹنگوں میں شریک ہوتا اور سارا دن سوتا رہتا اور یہ ایک زرعی سائنسدان کا معمول نہیں تھا۔ لیکن اگرچہ میں دیگر معاملات میں مصروف رہتا، مجھے افریقی آبادی کے ساتھ قربت محسوس ہوتی تھی۔

میں اتوار کو عبادت میں شرکت کرتا اور ان صیہونی مسیحی پادریوں کے بائبل کو تھپتھپانے کے پرانے انداز سے لطف اندوز ہوتا۔ جب میں وہاں سے رخصت ہونے کا پروگرام بنا رہا تھا، میں نے ایک بوڑھے آدمی کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے میری اچھی طرح دیکھ بھال کی تھی اس نے کہا ''آپ جب آئیں ہم خوش آمدید کہیں گے، لیکن کویدینی (نوجوان آدمی!) ہمیں یہ تو بتا دیجئے کہ چیف لوتھولی کیا چاہتے ہیں'' میں حیران رہ گیا مگر جلدی سے کہا ''اچھا تو یہ بہتر ہوگا کہ آپ یہ سوال اسی سے کریں اور میں اس کی طرف سے جواب نہیں دے سکتا۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ ہماری زمین ہمیں واپس دلوانا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ ہمارے بادشاہوں کا اقتدار انہیں واپس مل جائے اور وہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کے قابل ہوسکیں اور جس طرح مناسب سمجھیں اپنی زندگیاں بسر کریں''

''اور وہ یہ کام کیسے کرے گا اگر اس کے پاس فوج نہیں ہے؟'' بوڑھا آدمی بولا

میں اسے بہت کچھ بتانا چاہتا تھا کہ میں ایک ایسی فوج تیار کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں مگر میں بتا نہ سکا۔ اگرچہ اس بوڑھے آدمی کے جذبات سے مجھے حوصلہ ملا تھا، میں کچھ پریشان ہوا کہ دوسرے بھی میرے مشن سے آگاہ ہو گئے ہیں۔ اس جگہ میں نے خاصا عرصہ قیام کرلیا تھا۔ چنانچہ اگلی رات میں اتنی ہی خاموشی سے چل دیا جتنی خاموشی سے آیا تھا۔

ویٹر کا دلچسپ تجربہ

میرا اگلا پتہ چھپنے کی جگہ سے زیادہ ایک پناہ گاہ کا تھا۔ للیز لیف فارم رائیونیا میں واقع تھا جو ہانس برگ کے شمالی پرو مضافات تھے۔ میں اکتوبر مے وہاں منتقل ہوا۔ ان دنوں رائیونیا زیادہ تر فارموں اور چھوٹی ملکیتوں پر مشتمل تھا۔ یہ فارم ہاؤس اور جائیداد تحریک آزادی نے اس مقصد کے لیے خریدی تھی کہ زیر زمین افراد کے لیے ایک محفوظ مکان ہو۔ یہ ایک پرانا مکان تھا جسے مرمت کی ضرورت تھی اور کوئی وہاں

نہیں رہتا تھا۔

میں اس بہانے اس میں منتقل ہوا کہ میں ہاؤس بوائے یا کیئر ٹیکر ہوں اور اس جگہ کی دیکھ بھال کروں گا جب تک میرا مالک آ کر اس کا قبضہ نہیں لے لیتا۔ میں نے ڈیویڈ موٹسا مائی کا نام اختیار کر لیا تھا اور یہ میرے ایک سابق موکل کا نام تھا۔ فارم میں، میں سادہ نیلا اوورآل پہنتا جو کالے خادموں کا لباس تھا۔ دن کو یہاں معمار، سفیدی کرنے والے اور کارکن کام میں مصروف ہوتے جو بڑی عمارت کی مرمت کا کام کرتے اور اسے باہر توسیع دیتے رہتے۔ ہم چاہتے تھے کہ بہت سے چھوٹے کمرے بن جائیں تاکہ مزید لوگ یہاں ٹھہر سکیں۔ کارکن سب افریقی تھے اور سب الیگزینڈرا ٹاؤن شپ سے آتے تھے۔ وہ ہمیشہ مجھے ''ویٹر'' یا ''بوائے'' کہہ کر پکارتے اور کبھی میرا نام پوچھنے کی زحمت نہ کرتے۔ میں ان کے لیے ناشتہ تیار کرتا اور قبل از دوپہر اور سہ پہر کو ان کے لیے چائے بناتا۔ وہ مجھے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے فارم میں بھی بھیج دیتے یا مجھے فرش صاف کرنے یا کوڑا اٹھانے کا کہہ دیتے۔

ایک شام میں نے انہیں بتایا کہ میں نے کچن میں چائے تیار کر دی ہے۔ وہ اندر آ گئے اور میں نے پیالیوں، چائے، دودھ اور چینی کی ٹرالی ان کے آگے کر دی۔ ہر آدمی نے ایک ایک پیالی اٹھائی اور پینے لگے۔ جب میں ٹرے اٹھائے ایک آدمی کے پاس پہنچا تو وہ ایک کہانی آدھی سنا چکا تھا۔ اس نے پیالی اٹھا لی مگر وہ میری طرف دھیان دینے کے بجائے کہانی سنانے میں زیادہ کھویا ہوا تھا۔ اس نے چمچ ہوا میں تھام رکھا تھا اور باتیں کرتے کرتے اس کے ساتھ اشارے کرتا جاتا۔ وہ چینی دان سے چینی لینے کے بجائے کہانی سنائے جا رہا تھا۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسی کئی منٹ گزر گئے ہوں۔ آخر کار قدرے کبیدہ خاطر ہو کر میں آگے بڑھنے لگا۔ تب اس کی نگاہ میری طرف اٹھی اور وہ ترشی سے بولا: ''ویٹر!

یہاں واپس آؤ میں نے تو نہیں کہا تھا کہ تم جا سکتے ہو۔"

کئی لوگوں نے افریقی معاشرے کی مساوات پسند فطرت کی تخیلاتی تصویر کشی کی ہے اور اگر چہ میں اس عام تصویر سے متفق ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ افریقی ہمیشہ ایک دوسرے سے مساوی سلوک نہیں کرتے۔ صنعتی عمل نے شہری افریقیوں میں سٹیٹس کا وہ تصور متعارف کرانے میں بڑا کردار ادا کیا ہے جو گورے معاشرے میں عام ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک میں ایک حقیر، ایک خادم اور ایک بے پیشہ شخص تھا اس لیے حقارت کے برتاؤ کا مستحق تھا۔ میں نے اپنا کردار اتنا اچھا ادا کیا کہ ان میں سے کسی کو شبہ نہ ہوا کہ میں جو کچھ نظر آتا ہوں، حقیقت اس سے مختلف ہے۔

مزدور ہر شام غروب آفتاب کے وقت گھروں کو لوٹ جاتے اور میں اگلی صبح تک تنہا ہوتا۔ مجھے خاموشی کے یہ لمحات بہت پسند تھے۔ لیکن اکثر شاموں کو میں میٹنگز میں شرکت کے لیے نکل جاتا اور آدھی رات لوٹتا۔ ان اوقات میں ایک ایسی جگہ لوٹ کر آنا اکثر میرے لیے باعث پریشانی ہوتا جسے میں اچھی طرح جانتا نہیں تھا اور جہاں میں غیر قانونی طور پر فرضی نام سے رہ رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک رات میں ڈر ہی تو گیا جب مجھے جھاڑیوں میں ایک سایہ لپکتا نظر آیا۔ میں نے کھوج لگانے کی کوشش کی مگر وہاں کوئی دکھائی نہ دیا۔ یوں ایک زیر زمین مجاہد آزادی خوف کے تحت بہت کم سو پاتا ہے۔

کئی ہفتے بعد ریمنڈ اصلا با فارم پر مجھ سے آملا۔ وہ پورٹ ایلز بتھ سے سفر کر کے آیا تھا۔ رے ایک پکا زدور لیڈر تھا۔ وہ کیپ ایگز یکٹو اور کمیونسٹ پارٹی کا رکن اور پہلا اے این سی لیڈر تھا جو ڈیفائنس کمپین میں گرفتار ہوا تھا۔ اے این سی نے اسے "امخو نتو دی سزوی" کے لیے پہلا ریکروٹ چنا تھا۔ وہ تین دوسرے افراد کے ہمراہ عوامی جمہوریہ چین میں فوجی تربیت کے لیے روانگی سے پہلے تیاری کے لیے آیا تھا۔ ہم نے ان رابطوں کی تجدید کر لی تھی جو والٹر نے 1952ء میں استوار کیے تھے۔ رے

میرے پاس دو ہفتے مقیم رہا اور اس نے ان مسائل کی واضح تصویر پیش کی جو اے این سی کو ایسٹرن کیپ میں درپیش تھے۔ میں نے ''ایم کے دستور'' کی تحریر و تشوید میں اس کی مدد بھی حاصل کر لی۔ جو سلاوو اور رسٹی برنشتائن بھی ہم سے آ ملے جن کا اس ستور کی ڈرافٹنگ میں خاصا ہاتھ تھا۔

ریمند کی روانگی کے بعد مائیکل ہارمل مختصر وقت کے لیے میرے پاس آیا جو زیر زمین کمیونسٹ پارٹی کی ایک اہم شخصیت، کانگریس آف ڈیموکریٹس کا بانی رکن اور جریدہ ''لبریشن'' کا ایڈیٹر تھا۔ مائیکل ایک روشن فکر نظریہ ساز تھا۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے لیے پالیسی معاملات پر کام کر رہا تھا اور اس ہمہ وقت کام کے لیے اسے ایک خاموش اور محفوظ مقام درکار تھا۔

یہودی خاندان کی پناہ میں

دن کے دوران میں مائیکل سے ذرا فاصلے پر رہتا کیونکہ اگر ایک گورا پیشہ ور آدمی اور ایک افریقی ہاؤس بوائے باقاعدہ گفت و شنید کر رہے ہوتے تو یہ ایک غیر معمولی طور پر چونکا دینے والی بات ہوتی۔ لیکن رات کے وقت، ورکروں کے چلے جانے کے بعد، ہم کمیونسٹ پارٹی اور اے این سی کے باہمی تعلق کے بارے میں طویل بات چیت کرتے۔ ایک رات میں میٹنگ کے بعد دیر سے فارم لوٹا۔ جب میں وہاں اکیلا ہوتا تو میں اس امر کا اطمینان کر لیتا تھا کہ تمام دروازے اور بتیاں بند ہیں۔ میں چند احتیاطیں بھی مدنظر رکھتا کیونکہ رائیوونیا میں آدھی رات کو ایک سیاہ فام کا کار چلا کر ایک چھوٹے فارم (Small holding) میں داخل ہونا غیر ضروری سوالات کی دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لیکن اس رات میں نے دیکھا کہ بتیاں جل رہی ہیں اور جب میں مکان کے قریب پہنچا، ریڈیو چلنے کی شائیں شائیں سنائی دی۔ اگلا دروازہ کھلا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو مائیکل کو بستر پر گہری نیند سوتے پایا۔ میں سکیورٹی کی اس خلاف ورزی پر غضبناک ہوا اور اسے جگا کر کہا ''بندہ خدا! تم

بتیاں جلتی اور ریڈیو چلتا کیسے چھوڑ دیتے ہو!'' وہ مدہوشی میں تیخ پا ہو کر بولا ''نیل! کیا تمھیں میری نیند خراب کرنی چاہیے؟ کیا تم صبح تک انتظار نہیں کر سکتے تھے؟'' میں نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ سکیورٹی کا معاملہ ہے اور پھر میں نے اس کے غیر ذمے دارانہ رویئے پر اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

اس کے بعد جلد ہی آرتھر گولڈ رائخ اور اس کا خاندان باقاعدہ کرایہ داروں کی حیثیت سے بڑے مکان میں چلے آئے اور میں نو تعمیر شدہ گھریلو ملازم کی کاٹیج میں منتقل ہو گیا۔ آرتھر کی موجودگی ہماری سرگرمیوں کے لیے ایک محفوظ پردہ ثابت ہوئی۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ایک فنکار اور ڈیزائنر تھا اور کانگریس آف ڈیموکریٹس کا رکن اور ''ایم کے'' کے پہلے ارکان میں سے ایک تھا۔ اس کی سیاست کی پولیس کو خبر نہ تھی اور اس سے کبھی پوچھ تاچھ ہوئی تھی نہ اس پر چھاپہ پڑا تھا۔ عشرہ 1940ء میں آرتھر فلسطین میں جیوش نیشنل موومنٹ کے عسکری بازو پالماخ (Palmach) سے مل کر لڑتا رہا تھا۔ گوریلا جنگ کے متعلق اس کی معلومات وسیع تھیں اور اس نے میری معلومات کے کئی خلاف پر کرنے میں میری مدد کی۔ ایک آتش بجاں شخص کی حیثیت سے اس نے فارم کی فضا میں آتشیں جذبوں کی لہر دوڑا دی (کیا ستم ظریفی ہے کہ فلسطینی مسلمانوں کا خون بہانے والا ظالم اور دہشت گرد یہودی جنوبی افریقہ جا کر سیاہ فاموں کی تحریک آزادی کا حامی بن گیا مترجم)

فارم پر باقاعدہ گروپ میں آخری اضافہ مسٹر جیلیمان کا تھا۔ وہ ایک ملنسار گورپنشنر اور تحریک آزادی کا پرانا ساتھی تھا جو فارم فورمین بن کر آیا تھا۔ جیلیمان، سیخوخو نے لینڈ سے بہت سے نوجوان کارکن ساتھ لایا تھا، چنانچہ یہ مقام جلد ہی اس دیہی لاقے میں ایک اور سال ہولڈنگ نظر آنے لگا۔ وہ اے این سی کا رکن نہیں تھا لیکن وہ وفادار، سمجھدار اور محنتی تھا۔ میں اس کے لیے ناشتہ اور رات کا کھانا تیار کرتا تھا اور وہ ہمیشہ مہربان دکھائی دیتا۔ بہت بعد میں اس نے میری مدد کرنے کی ایک جرات

مندانہ کوشش کرتے ہوئے اپنی زندگی اور روزگار کو بھی خطرے میں ڈال دیا۔

بچے نے مجھے سبق سکھایا

فارم پر سب سے پر مسرت اوقات وہ تھے جب میری بیوی اور اہل خانہ مجھ سے ملنے آتے۔ جب گولڈ رائخ اور اس کی اہلیہ مکان میں آ گئے تو ونی ہر ویک اینڈ پر ملنے کے لیے آنے لگی۔ ہم اس کی آمد کے بارے میں بڑے محتاط تھے۔ ایک ڈرائیور اسے گھر سے لاتا اور راستے میں کسی جگہ اتار دیتا۔ وہاں سے ایک دوسرا ڈرائیور اسے کار میں بٹھاتا اور فارم پر لے آتا۔ بعد میں وہ خود گاڑی چلا کر بچوں کے ساتھ آنے لگی لیکن وہ ادھر ادھر کے چکر کاٹ کر آتی تھی۔ پولیس نے ابھی اس کی ہر نقل و حرکت کا تعاقب شروع نہیں کیا تھا۔

ان ایک اینڈز پر بعض اوقات وقت رک جاتا جب ہم یہ فرض کرتے کہ یہ چرائے ہوئے لمحات ہماری زندگی کا استثناء نہیں بلکہ معمول ہیں۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ ہمیں للیز لیف میں اپنے گھر کی نسبت زیادہ خلوت میسر تھی۔ بچے ادھر ادھر بھاگ اور کھیل سکتے تھے اور ہم تھوڑے عرصے ہی کے لیے سہی، اس ''مصور بلبلے'' میں محفوظ تھے۔

ونی میرے لیے ایک پرانی رائفل لائی جو آرلینڈو میں میرے پاس تھی۔ آرتھر اور میں اسیف ارم پر نشانہ بازی یا فاختائیں شکار کرنے کے لیے استعمال کرنے لگے۔ ایک روز جب میں مکان کے اگلے لان میں تھا، میں نے ایک درخت کی بلندی پر بیٹھی ایک چڑیا کا بندوق سے نشانہ لیا۔ آرتھر کی بیوی ہیزل گولڈرائخ مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے مذاق کرتے ہوئے کہا کہ تم ہرگز نشانہ نہیں لگا سکو گے۔ لیکن اس نے جیسے ہی یہ جملہ کہا، چڑیا زمین پر آ رہی میں اس کی طرف مڑ کر فخر کا اظہار کرنے ہی والا تھا کہ گولڈرائخ کا بیٹا پال، جو تقریباً پانچ سال کا تھا، آنکھوں میں آنسو لیے میری طرف آیا اور بولا ''ڈیوڈ! تم نے اس پرندے کو کیوں مار دیا؟ اس کی ماں غمگین ہو گی'' اس پر میرا موڈ فوراً فخر سے شرمساری میں بدل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس

چھوٹے بچے میں مجھ سے کہیں زیادہ انسانیت ہے۔ یہ اس شخص کے لیے ایک عجیب احساس تھا جو ایک نوخیز گوریلا فوج کا لیڈر تھا۔

گوریلا جنگ کی تیاریاں

''ایم کے'' کی سمت اور شکل کیا ہوگی، اس کی منصوبہ بندی میں ہم نے چار قسم کی پر تشدد سرگرمیوں پر غور کیا۔ سبوتاژ گوریلا جنگ، دہشت گردی اور کھلا انقلاب ایک چھوٹی اور نومولود فوج کے لیے کھلا انقلاب ناقابل تصور تھا۔ دہشت گردی کو جو لوگ استعمال کرتے تھے، یہ ان کے لیے کچھ سازگار نہیں تھی کیونکہ اس سے ان کی عوامی حمایت میں کمی آتی تھی جو دوسری صورت میں انہیں حاصل ہوسکتی تھی۔ گوریلا جنگ ممکن تھی لیکن چونکہ اے این سی تشدد کا راستہ اختیار کرنے میں متامل تھی، اس لیے ہمیں تشدد کی ایسی شکل اپنانے ہی میں مصلحت نظر آتی تھی جو افراد کو کم از کم نقصان پہنچائے اور یہ تھا سبوتاژ

چونکہ سبوتاژ میں جانیں ضائع ہونے کا امکان نہیں تھا، اس سے بعد میں مختلف نسلوں کے مابین مفاہمت کی بہترین امید پیدا ہوتی تھی۔ ہم گوروں اور کالوں کے درمیان خونیں جھگڑا کھڑا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ افریکنروں اور انگریزوں کے مابین دشمنی اینگو بوئر وار کے پچاس سال بعد بھی تندو تیز تھی۔ اگر ہم ایک سول وار کا آغاز کر دیتے تو گوروں اور کالوں کے مابین کس طرح کے نسلی روابط جنم لیتے، یہ سوچا جا سکتا ہے۔ سبوتاژ کا ایک اضافی فائدہ یہ بھی تھا کہ اس کے لیے کم سے کم افرادی قوت درکار تھی۔

ہماری سٹراٹیجی یہ تھی کہ فوجی تنصیبات، پاور پلانٹس، ٹیلی فون لائنوں اور مواصلاتی رابطوں پر منتخب دھاوے بولے جائیں۔ ان اہداف سے نہ صرف مملکت کی فوجی اثر پذیری میں رکاوٹ پڑتی بلکہ نیشنل پارٹی کے حامی بھی خوفزدہ ہوجاتے، غیر ملکی سرمایہ کاری بھی رک جاتی اور معیشت بھی کمزور پڑ جاتی۔ ہمیں امید تھی کہ اس سے

حکومت ''لو اور دو'' کی میز پر چلی آئے گی ''ایم کے'' کے ارکان کو سخت ہدایات کی گئیں کہ ہم کوئی جانی نقصان برداشت نہیں کریں گے۔ لیکن اگر سبوتاژ نے وہ نتائج نہ دکھائے جو ہم چاہتے تھے تو ہم اگلے مرحلے کی طرف بڑھنے کے لیے تیار تھے اور یہ تھا گوریلا جنگ اور دہشت گردی کا مرحلہ۔

''ایم کے'' کا ڈھانچہ اس کی مادر تنظیم کی عکاسی کرتا تھا۔ نیشنل ہائی کمانڈ سب سے اوپر تھی، اس کے نیچے ہر صوبے میں علاقائی کمانڈ تھی اور اس کے نیچے لوکل کمانڈز اور سیل تھے ریجنل کمانڈز ملک بھر میں قائم کی گئی تھیں اور مشرقی کیپ جیسے علاقے میں پچاس سے اوپر سیل تھے۔ ہائی کمانڈ حربے اور عام اہداف متعین کرتی اور تربیت اور مالیت کی انچارج تھی ہائی کمانڈ کے طے کردہ فریم ورک میں ریجنل کمانڈز کو اختیار حاصل تھا کہ حملے کے لیے مقامی اہداف کا انتخاب کریں ''ایم کے'' کے تمام ارکان کو کسی آپریشن میں مسلح ہو کر جانے اور کسی طرح زندگی و ک خطرے سے دوچار کرنے کی ممانعت تھی۔

ایک مسئلہ جو ہمیں ابتدا میں درپیش تھا، وہ ''ایم کے'' اور اے این سی کے مابین منقسم وفاداریوں کا سوال تھا۔ ہمارے بیشتر رکروٹ اے این سی کے ارکان تھے جو مقامی شاخوں میں مستعد تھے لیکن پھر ہمیں یہ پتہ چلا کہ ایک مرتبہ جب وہ ''ایم کے'' کے لیے کام کرنے لگے تو انہوں نے مقامی کام کرنا چھوڑ دیا جو وہ پہلے کرتے چلے آ رہے تھے۔ جب مقامی شاخ کے سیکرٹری کے علم میں آتا کہ بعض اشخاص اب پارٹی اجلاسوں میں شرکت نہیں کر رہے تو وہ کسی ایک سے رابطہ کر کے کہتا ''یار! تم پچھلی میٹنگ میں کیوں نہیں آئے تھے؟'' اور وہ شخص جواب دیتا: ''اوہ! میں ایک اور میٹنگ میں تھا۔''

''کس طرح کی میٹنگ؟'' سیکرٹری کہتا

''اوہ! میں بتا نہیں سکتا'' جواب ملتا

''تم اپنے سیکرٹری کو نہیں بتا سکتے؟''

اس گفتگو میں اس رکن کی دوسری وفاداری سیکرٹری کے علم میں آتی۔ کچھ ابتدائی غلط فہمیوں کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہا گر مقامی شاخ کے ارکان ''ایم کے'' میں بھرتی کیے جائیں تو سیکرٹری کو لازماً اطلاع دی جائے کہ اس کا ایک رکن اب ''ایم کے' میں شامل ہے۔

چیف کو نوبل امن انعام ملا

دسمبر کی ایک گرم سہ پہر جب میں للیز لیف فارم کے باورچی خانے میں بیٹھا تھا، میں نے ریڈیو پر یہ اعلان سنا کہ چیف لوتھولی کو اوسلو میں ایک تقریب میں نوبل امن انعام سے نوازا گیا ہے۔ حکومت نے انہیں دس دن کا ویزا جاری کیا تھا کہ ملک سے باہر جا کر ایوارڈ وصول کر لیں۔ مجھے بلکہ ہم سب کو بے حد خوشی ہوئی۔ پہلی مرتبہ ہماری جدوجہد کو اور جہد آزادی کے رہنما اور ایک انسان کی حیثیت سے چیف کی کامیابیوں کو تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ مغرب کے اس اعتراف کی علامت تھی کہ ہماری جدوجہد اخلاقی جدوجہد ہے جسے بڑی طاقتیں بڑے عرصے سے نظر انداز کرتی چلی آئی تھیں۔ یہ ایوارڈ نیشنلسٹوں کے منہ پر ایک طمانچہ تھا جن کا پروپیگنڈہ لوتھولی کو ایک خطرناک ایجی ٹیٹر اور کمیونسٹ سازش کا سرغنہ قرار دیتا تھا۔ افریکنر ہکا بکا رہ گئے۔ ان کے نزدیک یہ ایوارڈ مغربی لبرل عناصر کی تخریب انگیزی اور سفید جنوبی افریقیوں کے خلاف عناد کی ایک اور مثال تھا۔ جب ایوارڈ کا اعلان ہوا، چیف پر پانچ سالہ پابندی کا تیسرا سال جا رہا تھا جو اس کی نقل وحرکت کو نٹال میں ضلع سٹانجر تک محدود کرتی تھی۔ اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اسے دل کا عارضہ تھا اور اس کی یادداشت فروتر تھی لیکن ایوارڈ ملنے پر اسے بڑی مسرت ہوئی اور ہم سب کو بھی۔

یہ اعزاز ایک ایسے وقت میں ملا جو مناسب نہیں تھا کیونکہ اس کے ساتھ ہی ایک ایسا اعلان سامنے آیا جس نے خود ایوارڈ کو ایک سوالیہ نشان بنا دیا۔ جس روز لوتھولی

اوسلو سے لوٹا، اس سے اگلے روز ''ایم کے'' نے اپنے ظہور کا ڈرامائی اعلان کر دیا۔ ایم کے ہائی کمان کے احکام پر 16 دسمبر کی صبح سویرے، جسے گورے جنوبی افریقی ''یوم ڈنگین'' کے طور پر مناتے تھے، جوہانس برگ، پورٹ الیزبتھ اور ڈربن میں الیکٹرک پاور سٹیشنوں اور سرکاری دفاتر میں خانہ ساز بم پھٹنے لگے۔ ہمارا ایک آدمی پطروس مولائف بے خبری میں مارا گیا۔ یہ ایک ''ایم کے'' سپاہی کی پہلی موت تھی۔ جنگ میں موت بد قسمتی مگر ناگزیر ہوتی ہے۔ ہر شخص جو ''ایم کے'' میں شامل ہوتا تھا، جانتا تھا کہ اسے انتہائی قربانی دینے کے لیے بلایا جا سکتا ہے۔

دھماکوں کے وقت نئے ایم کے منشور پر مشتمل ہزاروں پمفلٹ ملک بھر میں پھیلا دیئے گئے جس میں امخونتو وی سزوی کی پیدائش کا اعلان کیا گیا تھا:

''امخونتو وی سزوی کے یونٹوں نے آج سرکاری تنصیبات پر، خصوصاً جو نسلی امتیاز کی پالیسی سے منسلک ہیں، منصوبے کے تحت حملے کیے۔ امخونتو وی سزوی ایک نئی آزاد تنظیم ہے جسے افریقیوں نے تشکیل دیا ہے۔ اس کی صفوں میں تمام نسلوں کے جنوبی افریقی شامل ہیں۔ امخونتو وی سزوی آزادی اور جمہوریت کی جدوجہد نئے طریقوں سے جاری رکھے گی جو ایک منظم قومی آزادی کی تحریک کی سرگرمیوں کو تقویت پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔''

''کسی بھی قوم کی زندگی میں ایک ایسا وقت آتا ہے جب اس کے لیے صرف دو چوائس رہ جاتے ہیں۔ سر تسلیم خم کر دے یا لڑنے کے لیے تیار ہو جائے۔ جنوبی افریقہ کے لیے اب وہ وقت آ گیا ہے۔ ہم سر تسلیم خم نہیں کریں گے اور ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ان تمام ذرائع سے، جو ہماری قوم، ہمارے مستقبل اور ہماری آزادی کے دفاع کے لیے ہمارے اختیار میں ہوں، جوابی ضرب لگائیں''

''ہم امخونتو والے ہمیشہ یہ کوشش کرتے آئے ہیں، جیسا کہ ہماری تحریک آزادی نے کوشش کی ہے، کہ ہم خونریزی اور خانہ جنگی کے بغیر آزادی حاصل کر لیں۔ ہمیں

امید ہے کہ اس مرحلے پر ہی آہی، ہمارے اس پہلے اقدام سے ہر کسی کو اس تباہ کن صورتحال کا احساس ہو جائے گا جس کی طرف نیشنلسٹوں کی پالیسی ہمیں لے جا رہی ہے۔ ہمیں امید ہے اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے، ہم حکومت اور اس کے حامیوں کو عقل کے ناخن لینے پر آمادہ کر سکیں گے تاکہ معاملات کے خانہ جنگی کے مایوس کن مرحلے تک پہنچنے سے پہلے حکومت اور اس کی پالیسیاں دونوں تبدیل کی جا سکیں۔''

خونی دریا کی جنگ

ہم نے سولہ دسمبر، یوم ڈنگین، بوجوہ چنا تھا۔ اس روز گورے جنوبی افریقہ 1938ء میں خونیں دریا کی جنگ (Battle of Blood River) میں عظیم زولو رہنما ڈنگین کی شکست کی یاد مناتے ہیں۔ ڈنگین، جو شاکا کا سوتیلا بھائی تھا، اس وقت طاقتور ترین افریقی ریاست پر حکومت کرتا تھا جو دریائے لمپوپو کے جنوب میں ہمیشہ سے چلی آتی تھی۔ اس روز بوئر توسیع پسندوں کی گولیاں زولو جنگجوؤں کے بھالوں پر سبقت لے گئیں اور قریبی دریا کا پانی افریقیوں کے خون سے سرخ ہو گیا۔ تب سے افریکنر 16 دسمبر کو افریقیوں پر افریکنروں کی فتح کے طور پر اور یہ ظاہر کرنے کیلئے مناتے تھے کہ خدا ان کی پشت پر ہے جبکہ افریقی اس دن اپنی قوم کے قتل عام پر ماتم کرتے تھے۔ ہم نے 16 دسمبر کو یہ ظاہر کرنے کے لیے چنا کہ افریقی لڑنے مرنے پر اتر آئے ہیں اور یہ کہ راستی، اور ڈائنا مائٹ، ہمارے ہتھیار ہیں۔

دھماکے حکومت کے لیے اچنبھا تھے۔ اس نے سبوتاژ کو گھناؤنے جرائم قرار دے کر ان کی مذمت کی اور اس کے ساتھ ہی اس احمق چھوکروں کا کام ٹھہرا کر اس کا مضحکہ اڑایا۔ دھماکوں نے گورے جنوبی افریقیوں کو الم آمیز احساس دلایا کہ وہ ایک آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہیں۔ ادھر کالے جنوبی افریقیوں کو احساس ہو گیا کہ

اے این سی اب ایک جامد مزاحمت کی تحریک نہیں رہی بلکہ ایک طاقتور بھالا ہے جو جہد آزادی کو گورا اقتدار کے دل میں لے جائے گا۔ ہم نے دھماکوں کے ایک اور سلسلے کی منصوبہ بندی کی اور اسے عملی جامہ پہنایا۔ یہ دھماکے دو ہفتے بعد نئے سال کی شام (New years eve) کو ہوئے۔ گھنٹیاں بجنے اور سائرن چنگھاڑنے کی ملی جلی آوازیں ہماری آزادی کی جدوجہد میں ایک نئے دور کی علامت بن گئیں۔

انخو نتو کے اعلان سے حکومت کے بدنیتی پر مبنی اور اتنے بڑے پیانے پر سخت جوابی جارحانہ اقدام کو مہمیز ملی جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اب پولیس کی سپیشل برانچ نے ''ایم کے'' کے ارکان کی گرفتاری کو اپنا اولین مشن ٹھہرایا اور اس میں انہوں نے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ ہم نے ان پر ظاہر کر دیا تھا کہ ہم اب مزید ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتے اور حکومت کو یہ ظاہر کرنا تھا کہ ایسی تحریک کو بیخ و بن سے اکھاڑنے سے اسے کوئی چیز نہیں روک سکتی جو اس کی نگاہ میں اس کی بقا کے لیے عظیم ترین خطرہ ہے۔

ماکگاتھو نے بھانڈا پھوڑ دیا

جب ونی ملنے آتی تو مجھے یہ زعم ہوتا، خواہ مختصر مدت ہی کے لیے سہی، کہ میرے اہل خانہ سرکاری انتقام سے محفوظ ہیں۔ اس کی ملاقاتیں اب کم ہو رہی تھیں کیونکہ پولیس زیادہ چوکس ہو گئی تھی، ونی زندزی اور زینانی کو رائیونیا ساتھ لاتی تھی لیکن یہ دونوں بچیاں اتنی کم عمر تھیں کہ انہیں علم نہیں تھا کہ میں یہاں چھپا ہوا ہوں۔ ماکگاتھو اس وقت گیارہ سال کا تھا اور جانتا تھا، چنانچہ اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ کسی کے سامنے میرے اصلی نام کا انکشاف نہ کرے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ چھوٹا ہونے کے باوجود اتنا پرعزم ہے کہ میری شناخت کو راز میں رکھ سکتا ہے۔

لیکن اس سال کے آخر میں ایک روز وہ فارم پر آرتھر کے گیارہ سالہ بیٹے نکولس گولڈرائخ کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ونی میرے لیے ''ڈرم'' نامی جریدے کی ایک کاپی

لائی تھی اور ماگاتھو اور نکولس کھیلتے کھیلتے اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ اچانک ماگاتھو میری ایک تصویر پر اٹک گیا جو میرے زیر زمین جانے سے پہلے لی گئی تھی۔ ''یہ میرے والد ہیں!'' وہ پکارا تھا نکولس کو اعتبار نہ آیا اور اس کے شک وشبہ پر ماگاتھو نے یہ ثابت کرنے پر تل گیا کہ اس کی بات صحیح ہے۔ پھر اس نے اپنے دوست کا بتایا کہ میرے والد کا اصلی نام نیلسن منڈیلا ہے ''نہیں تمہارے والد کا نام ڈیوڈ ہے'' نکولس نے جواب دیا، پھر وہ بھاگ کر اپنی امی کے پاس گیا اور پوچھنے لگا کیا انکل کا نام ڈیوڈ ہے یا نہیں۔ اس نے جواب دیا ''ہاں ان کا نام ڈیوڈ ہی ہے'' نوکلس نے پھر اپنی امی کو بتایا کہ ماگاتھو کہتا ہے کہ اس کے والد کا اصلی نام نیلسن ہے۔ اس پر ہیزل چونک اٹھی اور جلد ہی یہ فرو گزاشت میرے علم میں بھی آئی۔ ایک بار پھر مجھے احساس ہوا کہ مجھے ایک ہی جگہ رہتے خاصی مدت ہوگئی ہے۔ بایں ہمہ میں وہیں مقیم رہا کیونکہ ہفتہ دس دن کے اندر میں ایک ایسے مشن پر روانہ ہونے والا تھا جو مجھے ان مقامات پر لے جاتا جن کے میں نے فقط خواب دیکھے تھے۔ اب جہد آزادی مجھے پہلی مرتبہ ملکی سرحدوں سے باہر لے جانے والی تھی۔

میرا پہلا غیر ملکی سفر

دسمبر میں اے این سی کو پان افریقن فریڈم موومنٹ فار ایسٹ، سنٹرل اینڈ ساؤدرن افریقہ یا پیف میکسا (Pafmecsa) کی طرف سے دعوت موصول ہوئی کہ فروری 1962ء میں اولیس ابابا میں اس کی کانفرنس میں شرکت کرے۔ پیف میکسا، جو بعد میں آرگنائزیشن آف افریقن یونیٹی (او اے یو) بن گئی، افریقہ کی آزاد مملکتوں کو اکٹھا کرنے اور براعظم میں آزادی کی تحریکوں کو فروغ دینے کی علمبردار تھی۔ یہ کانفرنس اے این سی کے لیے اہم رابطوں کا ذریعہ بنتی اور اس سے ہمیں ''ایم کے'' کے لیے مدد، رقم اور تربیت کی فراہمی کا پہلا اور بہترین موقع مل سکتا تھا۔

زیر زمین ایگزیکٹو نے مجھ سے کہا کہ میں کانفرنس میں اے این سی کے وفد کی قیادت کروں۔ اگرچہ میں باقی افریقہ کو دیکھنے اور براعظم سے تعلق رکھنے والے آزادی کے مجاہدوں سے ملنے کا متمنی تھا، مجھے اس امر پر بڑی تشویش تھی کہ اس طرح اس عہد کی خلاف ورزی ہوگی جو میں نے باندھا تھا کہ میں اپنا ملک نہیں چھوڑوں گا اور زیر زمین رہ کر کام کروں گا۔ چیف لوتھولی سمیت میرے ساتھیوں نے اصرار کیا کہ میں کانفرنس میں جاؤں لیکن یہ بھی کہا کہ اس کے فوراً بعد لوٹ آؤں، چنانچہ میں نے شرکت کا فیصلہ کرلیا۔

افریقہ میں میرا مشن کانفرنس میں شرکت سے کہیں وسیع تر تھا۔ مجھے اپنی نئی فوجی فورس کے لیے سیاسی اور اقتصادی مدد کا انتظام کرنا تھا اور زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ہمارے آدمیوں کے لیے فوجی تربیت کا اہتمام براعظم کے اتنے سارے مقامات پر ہو جتنے ممکن ہوں۔ میں نے یہ بھی عزم کیا تھا کہ باقی افریقہ میں ہماری نیک نامی میں اضافہ ہو جہاں ہم ابھی تک نسبتاً غیر معروف تھے پی اے سی نے اپنی پروپیگنڈہ مہم چلا رکھی تھی اور مجھے یہ اختیار دیا گیا تھا کہ جہاں کہیں ممکن ہو اپنا کیس آگے بڑھاؤں۔

روانگی سے پہلے میں خفیہ طور پر گروٹ ویل گیا تا کہ چیف سے مشورہ کرسکوں۔ ہماری میٹنگ جو شہر کے ایک محفوظ مکان میں ہوئی مسرت افزا نہیں تھی۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں چیف ''ایم کے'' کی تشکیل کے فیصلے کے وقت موجود تھے اور اس کی پیشرفت کے بارے میں اتنے ہی آگاہ تھے جتنا کہ اے این سی کا کوئی اور رکن لیکن چیف کی صحت اچھی نہیں تھی اور ان کی یادداشت بھی ویسی نہیں تھی جیسی کبھی ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا کہ ''ایم کے'' کی تشکیل کے وقت ان سے مشورہ نہیں کیا گیا۔ میں نے کوشش کی کہ وہ انہیں وہ بات چیت یاد دلاؤں جو ہم نے ڈربن میں تشدد کا حربہ آزمانے کے بارے میں کی تھی لیکن وہ انہیں یاد نہیں پڑتی تھی

زیادہ تر اسی سے یہ فسانہ پھیل گیا کہ چیف کو ''ایم کے'' کی تخلیق کے بارے میں آگاہ نہیں کیا گیا تھا اور وہ اے این سی کے تشدد کا حربہ آزمانے کے حق میں نہیں تھے۔ یہ بات حقیقت سے یکسر بعید تھی۔

بیچوانا لینڈ سے دارالسلام تک

اپنی روانگی سے پچھلی رات میں نے شمالی مضافات میں گورے دوستوں کے مکان پر وٹی کے ساتھ گزاری تھی اور وہ میرے لیے ایک نیا سوٹ کیس لائی تھی جو اس نے پیک کیا تھا۔ اسے میرے ملک سے باہر جانے پر تشویش تھی لیکن اس بار بھی اس کے اعصاب مضبوط رہے اور اس نے ایک بیوی سے زیادہ ایک سپاہی کا مظاہرہ کیا۔

اے این سی نے ٹانگانیکا (موجودہ تنزانیہ) میں دارالسلام تک میرے سفر کا انتظام کیا تھا۔ وہاں سے مجھے اویس ابابا کی پرواز پکڑنی تھی۔ منصوبہ یہ تھا کہ والٹر، کاتھرادا اور ڈوما نوکوی سوویٹو میں ایک خفیہ مقام پر مجھ سے ملیں گے اور سفری کاغذات میرے سپرد کریں گے۔ وہیں میری ملک سے روانگی سے پہلے آخری مشاورت کے لمحات بھی میسر آنے تھے۔

احمد کاتھرادا مقررہ وقت پر آ گئے لیکن والٹر اور ڈوما کو بہت دیر ہو گئی۔ آخر کار مجھے متبادل انتظامات کرنے پڑے اور کیتھی نے ایک شخص کو ڈھونڈ لیا جو مجھے بیچوانا لینڈ (موجودہ بوٹسوانا) پہنچاتا اور وہاں سے میں طیارہ پکڑ لیتا۔ بعد میں پتہ چلا کہ والٹر اور ڈوما کو راستے میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔

کار میں بیچوانا لینڈ کا سفر صبر آزما تھا۔ ایک تو پولیس کی پریشانی تھی، دوسرے اس سے پہلے میں کبھی اپنے ملک کی سرحدوں سے باہر نہیں گیا تھا۔ ہماری منزل جنوبی افریقہ کی سرحد کے نزدیک لوباٹسی نامی شہر تھا۔ ہم نے کسی مشکل کے بغیر سرحد پار کر لی اور پچھلی سہ پہر کو لوباٹسی پہنچ گئے جہاں مجھے دارالسلام سے آیا ہوا تار ملا کہ میں اپنا سفر ایک پندرھواڑے کے لیے ملتوی کر دوں۔ میں اپنے ٹریزن ٹرائل کے ایک

ساتھی نخش کائٹ سنگ کے ہاں ٹھہرا جو اس وقت سے لوباٹسی منتقل ہو گئے تھے۔

اس سہ پہر میں پروفیسر کے ٹی موٹسیٹی سے ملا۔ وہ بیچوانا پیپلز پارٹی کے صدر تھے جس کی تشکیل زیادہ تر سابق اے این سی ارکان نے کی تھی۔ اب میرے پاس غیر متوقع فارغ وقت تھا جسے میں نے مطالعے، کانفرنس کے لیے اپنی تقریر تیار کرنے اور شہر کے بالائی جانب جنگل اور خوبصورت پہاڑیوں میں گھومنے پھرنے میں گزارا۔ اگرچہ میں اپنے ملک کی سرحدوں سے زیادہ دور نہیں تھا، مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی اجنبی سرزمین میں آ گیا ہوں۔ اکثر میکس ملوائی بھی میرے ہمراہ ہوتا جو میرے ٹرانسکائی کے ایک دوست کا بیٹا اور پی اے سی کا ایک نوجوان رکن تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم سفری مہم (Safari) پر نکلے ہوں کیونکہ جنگل میں ہمیں ہر طرح کے جانور ملتے تھے۔ ان میں خوش فعلیوں میں مگن بونوں کا ایک گروہ بھی تھا جن کا میں نے کچھ دیر تعاقب کیا۔ مجھے ان کی فوجی انداز کی تنظیم اور حرکات بہت پسند آئیں۔

جلد ہی جو میتھیوس مجھ سے آ ملے جو بسوتو لینڈ (موجودہ لیسوتھو) سے آئے تھے میں نے اصرار کیا کہ ہمیں جلد دارالسلام پہنچنا چاہیے۔ جنوبی افریقی پولیس نے اے این سی کے ایک ساتھی کو انہی دنوں اغوا کر لیا تھا لہٰذا میں سمجھتا تھا کہ جتنا جلد ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں بہتر ہو گا، چنانچہ ایک طیارے کا اہتمام کیا گیا جس پر ہماری منزل شمالی بیچوانا لینڈ میں کاسانی نامی قصبہ تھا جو ایسی جگہ واقع تھا جہاں چار ملکوں کی سرحدیں ملتی تھیں بیچوانا لینڈ، شمالی وجنوبی رہوڈیشیا اور جنوب مغربی افریقہ (یاد رہے شمالی وجنوبی رہوڈیشیا اور جنوب مغربی افریقہ اب بالترتیب زمبیا، زمبابوے اور نیمبیا کہلاتے ہیں مترجم ان دنوں یہ نوآبادیاں انہی ناموں سے موسوم تھیں۔ کاسانی کی اترپٹی (Landing Strip) پانی میں گھری ہوئی تھی، چنانچہ ہمیں کئی میل دور جنگل میں ایک خشک ترپٹی پر اترنا پڑا۔ رائفلوں سے مسلح ایک مقامی ہوٹل کا مینجر

ہمیں لینے آیا۔اس نے بتایا کہ اسے تاخیر اس لیے ہوئی کہ بدمست ہاتھیوں کے ایک غول نے راستہ روک رکھا تھا۔وہ ایک کھلی وین میں تھا۔ میں اور جو پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ راستے میں مجھے ایک سست گام شیرنی جنگل میں نکلتی دکھائی دی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں جوہانس برگ کی اپنی گلیوں سے بہت دور آ نکلا ہوں۔ میں نے افسانوں اور کہانیوں کے افریقہ میں پہلی مرتبہ قدم رکھا تھا۔

ایک خطرناک فضائی پرواز

اگلی صبح سویرے ہم امبیا روانہ ہوئے جو شمالی رہوڈیشیا کی سرحد کے نزدیک ٹانگا نیکا کا ایک قصبہ تھا۔ہم نے آبشار وکٹوریا کے نزدیک سے اڑ کر ایک سلسلہ کوہ کے متوازی شمال کا رخ کیا۔پہاڑوں کے اوپر سے گزرتے ہوئے پائلٹ نے امبیا سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر کوئی جواب نہ آیا۔''امبیا امبیا''وہ مائیکروفون میں پکارتا رہا۔موسم بدل گیا تھا اور پہاڑوں پر ائیر پاکٹ بنی ہوئی تھیں اور طیارہ اس طرح اوپر نیچے جھٹکے کھاتا تھا جیسے متلاطم پانی پر کارک۔اب ہم بادلوں اور دھند میں اڑ رہے تھے۔ مایوسی میں پائلٹ طیارہ نیچے لاتا اور پہاڑوں میں بل کھاتی سڑک کے اوپر رہنے کی کوشش کرتا۔اس وقت تک دھند اتنی گہری ہوگئی تھی کہ ہمیں سڑک نظر نہیں آتی تھی اور جب پائلٹ نے طیارے کو اچانک ایک طرف موڑا تو مجھے محسوس ہوا کہ ہم ایک پہاڑی چوٹی سے ٹکرانے سے بال بال بچے ہیں جو یک لخت سامنے آ گئی تھی۔ہنگامی الارم کام کرنے سے رک گیا تھا اور مجھے یاد ہے میں زیر لب کہہ رہا تھا'' بس اب ہم مارے گئے!''چرب زبان ''جو'' بھی پتھر کے مانند ساکت تھا۔پھر جب ہمیں آگے بادلوں میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا میں نے خیال کیا کہ ہم ایک پہاڑ سے ٹکرانے والے ہیں۔لیکن عین اس وقت ہم خراب موسم سے نکل کر شاندار صاف موسم میں آ گئے۔ میں نے کبھی طیارے کی پرواز سے لطف نہیں اٹھایا اور یہ تو سب سے خوفناک سانحہ تھا جو مجھے طیارے پر پیش آیا۔میں بعض اوقات بہادری کا مظاہرہ

کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں اور اس پرواز میں بھی میں نے یوں ظاہر کیا جیسے مجھے کوئی تشویش نہ ہوئی ہو۔

ہم نے ایک مقامی ہوٹل میں قیام کیا اور یہ دیکھا کہ برآمدے میں کالوں اور گوروں کا ہجوم نرم گفتگو میں مصروف ہے۔ اس سے پہلے کبھی میں نے کوئی عوامی جگہ یا ہوٹل نہیں دیکھا تھا جہاں رنگ ونسل کی پابندیاں نہ ہوں۔ ہم ٹانگانیکا افریقن نیشنل یونین کے مسٹر اموا کان گیل کا انتظار کر رہے تھے جو رکن پارلیمنٹ تھے اور ہم سے آشنا نہ ہونے کے باعث پہلے پہنچ کر ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ جو رکن پارلیمنٹ تھے اور ہم سے آشنا نہ ہونے کے باعث پہلے پہنچ کر ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ ایک افریقی مہمان سفید فام استقبالہ کلرک (Receptionist) کے پاس پہنچا اور ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: ''مادام! کیا ایک مسٹر اموا کان گیل نے ان دو معززین کے بارے میں پوچھا تھا؟'' وہ بولی: ''جناب! مجھے افسوس ہے اس نے پوچھا تو تھا مگر میں انہیں بتانا بھول گئی۔''

''مادام! محتاط رہیے'' اس نے نرم لیکن مضبوط لہجے میں کہا ''یہ لوگ ہمارے مہمان ہیں اور ہم چاہیں گے کہ ان کو مناسب توجہ ملے۔''

جولیس نائریری سے ملاقات

تب مجھے حقیقتاً احساس ہوا کہ میں ایک ایسے ملک میں ہوں جس پر افریقیوں کی حکومت ہے۔ میں اپنی زندگی میں پہلی بار ایک آزاد انسان تھا۔ اگرچہ میں ایک مفرور تھا اور اپنے وطن میں رہنا چاہتا تھا میں نے محسوس کیا کہ میرے کندھوں سے غلامی کا بوجھ اتر گیا ہے۔ میں ٹانگانیکا میں جہاں کہیں بھی گیا میری جلد کی رنگت پر حرف گیری کے بجائے اسے از خود قبول کر لیا گیا۔ پہلی بار یہاں میری شخصیت کا اندازہ میری جلد کی رنگت سے نہ کیا گیا بلکہ میرے ذہن و کردار کے پیمانے سے کیا گیا۔ اگرچہ اپنے اس سفر کے دوران مجھے اکثر گھر یاد آتا تھا، میں پہلی مرتبہ یہاں

اپنے آپ کو گھر میں محسوس کرتا تھا۔

ہم اگلے روز دارالسلام پہنچے اور میں جولیس نائریری سے ملا جو اس نو آزاد ملک کے پہلے صدر تھے۔ ہم نے ان کے مکان میں بات چیت کی جو ہرگز شاندار نہیں تھا اور مجھے یاد ہے کہ وہ اپنی سادہ سی چھوٹی آسٹن کار خود چلاتے تھے۔ اس سے میں بہت متاثر ہوا کیونکہ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ ایک عوامی آدمی ہیں۔ نائریری ہمیشہ اصرار کرتے کہ طبقہ واریت افریقہ کے لیے اجنبی شے ہے جبکہ اشتراکیت ویسی شے ہے۔

میں نے ان کے سامنے اپنے ملک کی صورت حال کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ان سے مدد کی اپیل کی۔ وہ ایک محتاط اکل کھرے آدمی تھے جو ہمارے مشن سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن جنوبی افریقہ کی صورت حال کے بارے میں ان کے خیالات نے مجھے حیران اور آزردہ کیا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ ہم مسلح جدوجہد ملتوی کر دیں جب تک کہ سوبکوی جیل سے باہر نہ آجائے۔ یوں پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ سوبکوی کی پارٹی پی اے سی باقی افریقہ میں مقبول ہے۔ میں نے پی اے سی کی کمزوری کا ذکر کیا اور یہ دلیل دی کہ التوا مجموعی طور پر تحریک آزادی کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ میں شہنشاہ ہیل سلاسی کی حمایت حاصل کروں اور اس سے ملاقات کا اہتمام کرنے کا وعدہ بھی کیا۔

میرا پروگرام تھا کہ دارالسلام میں آلیور ٹیمبو سے ملاقات ہو لیکن میری تاخیر کی وجہ سے وہ انتظار نہ کر سکا تھا اور میرے لیے یہ پیغام چھوڑ گیا تھا کہ میں اس کے پیچھے لاگوس پہنچ جاؤں جہاں اسے آزاد مملکتوں کی لاگوس کانفرنس میں شرکت کرنا تھی۔ عکرا کی پرواز کے دوران میری ہائمی باسز اور اس کی اہلیہ سے ملاقات ہوئی۔ باسز جو کبھی میرا آجر تھا، اسے عکرا میں ایک عہدے کی پیشکش ہوئی تھی۔ اس کی انتہا پسندانہ سیاست اور بائیں بازو کی سرگرمیوں نے اسے جنوبی افریقہ میں ناپسندیدہ شخصیت

قرار دلوایا تھا اور اب وہ گھانا میں سیاسی پناہ لے رہا تھا۔

سوڈانی کسٹم آفیسر سے دلچسپ مکالمہ

طیارہ خرطوم میں رکا اور ہم کسٹم کلیئرنس کے لیے قطار میں لگ گئے۔ ''جو میتھیوس'' آگے تھا، پھر میں اور میرے پیچھے باسز اور اس کی اہلیہ تھے۔ چونکہ میرے پاس پاسپورٹ نہیں تھا، میں ٹانگانیکا سے جاری شدہ ایک ابتدائی دستاویز رکھتا تھا جس میں صرف یہ کہا گیا تھا: ''یہ نیلسن منڈیلا ہے، جمہوریہ جنوبی افریقہ کا ایک شہری اسے ٹانگانیکا سے روانہ ہونے اور واپس یہاں آنے کی اجازت ہے'' میں نے امیگریشن کاؤنٹر پر بیٹھے بوڑھے سوڈانی کو یہ کاغذ تھما دیا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''میرے بیٹے! سوڈان میں خوش آمدید'' پھر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میرے کاغذ پر مہر لگا دی۔ باسز میرے پیچھے تھا اور اس نے بھی ایسا ہی کاغذ پیش کر دیا۔ بوڑھے آدمی نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا اور پھر قدرے ترش ہو کر بولا ''یہ کیا ہے؟ یہ کاغذ کیسا ہے؟ یہ سرکاری نہیں ہے۔''

باسز نے تحمل سے وضاحت کی کہ یہ دستاویز اسے ٹانگانیکا میں دی گئی تھی کیونکہ اس کے پاس پاسپورٹ نہیں تھا ''تمہارے پاس پاسپورٹ نہیں؟'' امیگریشن آفیسر نے نفرت سے کہا ''تمہارے پاس پاسپورٹ کیونکر نہیں؟ تم تو ایک سفید فام ہو!'' باسز نے جواب دیا کہ اسے اپنے **ملک** میں ابتلا سے گزرنا پڑا ہے کیونکہ اس نے کالوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کی ہے۔ سوڈانی شک وشبہ کا شکار دکھائی دیتا تھا بولا: ''مگر تم گورے آدمی ہو!'' ''جو'' نے میری طرف دیکھا اور جان گیا کہ میں کیا سوچ رہا تھا۔ اس نے سرگوشی کی کہ میں مداخلت نہ کروں کیونکہ ہم سوڈان میں مہمان تھے اور اپنے میزبان کی مہمان نوازی کو مشتعل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن میرا سابق آجر ہونے سے قطع نظر باسز نے افریقیوں کی آزادی کے لیے حقیقتاً خطرات مول لیے تھے لہٰذا میں اسے بے یارومددگار نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ''جو'' کے ساتھ روانہ ہونے کے

بجائے میں کسٹم آفیسر کے پاس کھڑا رہا اور ہر بار جب باسز کچھ کہتا میں قدرے جھک کر آفیسر کی طرف یوں اشارہ کرتا جیسے میں تصدیق کر رہا تھا کہ باسز جو کچھ کہہ رہا ہے، درست ہے۔ بوڑھا آدمی سمجھ گیا کہ میرا منشا کیا تھا۔ اس نے اپنا لہجہ نرم کر لیا اور آخر کار اس کی دستاویز پر مہر لگاتے ہوئے کہا "سوڈان میں خوش آمدید!"

میں نے تقریباً دو سال سے آلیور ٹیمبو کو نہیں دیکھا تھا، چنانچہ جب وہ عکرا ائیر پورٹ پر مجھ سے ملا میں بمشکل اسے پہچان پایا۔ وہ پہلے کلین شیو با قاعدہ حجامت کراتا تھا مگر اب اس کی ڈاڑھی اور لمبے بال تھے اور اس نے فوجی انداز کا لباس پہن رکھا تھا جو پورے براعظم میں مجاہدین آزادی کا شعار تھا۔ (غالباً! میرے بارے میں اس کا ردعمل بھی ایسا ہی تھا) یہ ملاقات مسرت انگیز تھی اور میں نے اس عظیم کام پر اسے سراہا جو اس نے بیرون ملک انجام دیا تھا۔ اس نے گھانا، انگلینڈ، مصر اور ٹانگانیکا میں اے این سی کے دفاتر پہلے ہی قائم کر دیئے تھے اور بہت سے دوسرے ملکوں میں ہمارے لیے قابل قدر رابطے استوار کیے تھے۔ بعد میں، میں نے جہاں کہیں کا بھی سفر کیا، مجھے اس مثبت تاثر کا پتہ چلا جو آلیور نے سفارتکاروں اور سیاستدانوں پر مرتب کیا تھا۔ وہ پارٹی کا بہترین ممکن سفیر تھا۔

حبشی پائلٹ اور میری پریشانی

آزاد مملکتوں کی لاگوس میں کانفرنس کا مقصد تمام افریقی مملکتوں کو متحد کرنا تھا لیکن آخر کار یہ نااتفاقی کا شکار ہو گئی کیونکہ یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ کس مملکت کو اس میں شامل کیا جائے اور کس ملک کو باہر رکھا جائے۔ میں کانفرنس میں پس منظر میں رہا کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ جنوبی افریقی حکومت کو پتہ چلے کہ میں ملک سے باہر ہوں حتیٰ کہ میں ادیس ابابا میں پیف میکسا (Pafmecsa) کانفرنس میں منظر عام پر آ گیا۔

عکرا سے ادیس ابابا جانے والے طیارے میں ہماری گاور رادیے، پیٹر مولوٹسی اور پی اے سی کے دوسرے ارکان سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی پیف میکسا میں شرکت کے

لیے جا رہے تھے۔ وہ سب مجھے دیکھ کر حیران ہوئے اور جلد ہی ہم جنوبی افریقہ کے بارے میں بات چیت میں کھو گئے۔ گفتگو کی فضا پر لطف اور سکون بخش تھی۔ اگر چہ مجھے گاور کے اے این سی کو چھوڑ دینے کا جان کر آزردگی ہوئی مگر اس سے میری خوشی کم نہ ہوئی جو اس سے مل کر حاصل ہوئی تھی۔ زمین سے اوپر فضا میں اور گھر سے بہت دور ہمیں متحد کرنے والے پہلو کہیں زیادہ تھے اور جدا کرنے والے کم۔

ہم کچھ دیر خرطوم میں رکے جہاں سے ہم نے ادیس ابابا جانے والی ایتھوپین ایئر ویز کی پرواز پکڑی۔ یہاں مجھے ایک عجیب سے احساس کا تجربہ ہوا۔ جب میں طیارے میں سوار ہو رہا تھا، میں نے دیکھا کہ پائلٹ سیاہ فام تھا اس سے پہلے میں نے کبھی ایک سیاہ فام پائلٹ نہیں دیکھا تھا، اور جونہی میں نے اسے دیکھا مجھے اپنی پریشانی بروقت چھپانی پڑی۔ ایک کالا آدمی طیارہ کیسے اڑا سکتا ہے؟ لیکن لمحہ بھر بعد میں اپنے آپ میں آ گیا۔ میرا ذہن دراصل نسلی امتیاز کی فضا میں غلطاں ہو گیا تھا اور میں سوچنے لگا تھا کہ افریقی فروتر ہیں اور یہ کہ طیارہ اڑانا صرف گورے آدمی کا کام ہے۔ میں نے اپنی نشست سے ٹیک لگا لی اور اپنی اس سوچ پر خود کو لتاڑنے لگا۔ پھر جب ہم فضا میں بلند ہوئے تو میری پریشانی جاتی رہی اور میں ایتھوپیا کے جغرافیے کا مطالعہ کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ کس طرح گوریلا فوج اطالوی استعمار سے لڑنے کے لیے ان جنگلوں کو پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرتی تھی۔

ہیل سلاسی کا ایتھوپیا

پہلے جسے ابی سینیا کہتے تھے، وہ اب ایتھوپیا کہلاتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس کی بنیاد حضرت عیسیٰ سے بہت پہلے حضرت سلیمان کے بیٹے اور ملکہ سبا نے رکھی تھی۔ اگر چہ اسے درجنوں بار فتح کیا گیا، ایتھوپیا افریقی نیشنلزم کی جائے پیدائش رہا ہے۔ اتنے زیادہ دوسرے افریقی ممالک کے برعکس اس نے ہر مرتبہ استعماریت کے خلاف جنگ لڑی۔ گزشتہ صدی میں شاہ مینلک نے اطالویوں کا منہ پھیر دیا تھا

اگر چہ اس صدی میں ایتھوپیا ان کی پیش قدمی روکنے میں ناکام رہا۔1930ء میں ہیل سلاسی شہنشاہ بنا اور اس نے موجودہ ایتھوپیا کی تاریخ تشکیل دی۔میری عمر اس وقت سترہ برس تھی جب مسولینی کی فوجوں نے ایتھوپیا کی تاریخ تشکیل دی۔میری عمر اس وقت سترہ برس تھی جب مسولینی کی فوجوں نے ایتھوپیا پر حملہ کر دیا۔اس حملے سے نہ صرف اس ڈکٹیٹر سے میری نفرت میں اضافہ ہوا بلکہ مجھے فاشزم ہی سے نفرت ہوگئی۔اگر چہ اٹلی نے1936ء میں ایتھوپیا فتح کر لیا تو سلاسی ملک چھوڑ دینے پر مجبور ہو گیا لیکن جب1939ء میں اتحادی فوجوں نے اطالویوں کو ایتھوپیا سے نکال باہر کیا تو وہ اپنے ملک لوٹ آیا۔

میرے ذہن میں ایتھوپیا کا ایک خاص تصور ہمیشہ قائم رہا تھا اور مجھے فرانس، انگلینڈ اور امریکہ کے مجموعی دورے سے کہیں زیادہ ایتھوپیا کو دیکھنے میں کشش محسوس ہوتی تھی۔میں محسوس کرتا تھا کہ ایتھوپیا جا کر گویا میں اپنی جنم بھومی کی سیر کروں گا اور وہ جڑیں تلاش کروں گا جنہوں نے مجھے افریقی بنایا ہے اور شہنشاہ سے ملاقات تو تاریخ سے مصافحہ کرنے کے مترادف ہوگی۔

ہمارا پہلا قیام شاہی شہر ادیس ابابا میں تھا جو اپنے اس عرف سے لگا نہیں کھاتا تھا کیونکہ اس میں شان والی کوئی بات نہیں تھی۔صرف چند پختہ سڑکیں تھیں۔بھیڑ بکریاں زیادہ اور کاریں کم۔شاہی محل، اور راس ہوٹل سے قطع نظر، جہاں ہم مقیم تھے، بہت کم عمارتیں ایسی تھیں جو جوہانس برگ کی انتہائی معمولی عمارتوں کا مقابلہ کر سکتی تھیں۔جب جمہوریت کی بات ہوتی تو بھی موجودہ ایتھوپیا کوئی قابل تقلید نمونہ پیش نہیں کرتا تھا۔وہاں کوئی سیاسی پارٹیاں نہیں تھیں، حکومت کے کوئی عوامی ادارے نہیں تھے۔اختیارات کی کوئی تقسیم نہیں تھی، صرف شہنشاہ تھا جو اقتدار اعلیٰ کا مالک تھا اور تمام اختیارات اس کی ذات میں مرکوز تھے۔

یہودا کا شیر پریڈ میں

کانفرنس کے افتتاح سے پہلے وفود برازید کے ننھے سے قصبے میں اکٹھے ہوئے۔ مرکزی چوک میں ایک شاندار اسٹیج بنایا گیا تھا۔ آلیور اور میں اسٹیج پر ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئے۔ اچانک ہمیں دور سے آتی بگل کی موسیقی سنائی دی اور پھر بینڈ گونجنے لگا جس کے ساتھ افریقی ڈھول بھی پے بہ پے بج رہے تھے۔ جب موسیقی قریب آئی تو مارچ کرتے سینکڑوں قدموں کی دھمک سنائی دینے اور محسوس ہونے لگی۔ چوک کے ایک طرف کی عمارت کے پیچھے پانچ سو حبشی سپاہی چار چار کی قطاروں میں مارچ کر رہے تھے اور ہر ایک نے اپنے وردی پوش کندھے پر ایک نئی نویلی رائفل ٹھا رکھی تھی۔ جب فوجی دستہ مارچ کرتے ہوئے اسٹیج کے عین سامنے پہنچا تو اچانک زبان میں ایک حکم گونجا اور پانچ سو سپاہی فردِ واحد کی طرح رک گئے اور انہوں نے گھوم کر خیرہ کن وردی میں ملبوس ایک معمر آدمی کو ٹھا ٹھک سلیوٹ کیا۔ یہ تھے اعلیٰ مرتبت شہنشاہ ایتھوپیا، ہیل سلاسی، یہودا کے شیر۔ یہاں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ میں کالے سپاہیوں کو دیکھ رہا تھا جو کالے جرنیلوں کے زیرِ حکم تھے اور جنہیں کالے رہنما داد و تحسین دے رہے تھے جو سب ایک حبشی سربراہ مملکت کے مہمان تھے۔ یہ ایک ہیجان خیز لمحہ تھا۔ میں توقع کرنے لگا کہ یہی منظر میرے اپنے ملک کے مستقبل میں نظر آئے گا۔

پریڈ کے بعد اگلی صبح آلیور اور میں نے ایک میٹنگ میں شرکت کی جہاں ہر تنظیم کو نمائندگی کی توثیق کی درخواست دینا تھی ہمیں یہ معلوم کر کے ناخوشگوار حیرت ہوئی کہ یوگنڈا کے ایک مندوب نے ہماری درخواست کی مخالفت کی تھی جسے یہ شکایت تھی کہ ہماری جماعت ژہوسا لوگوں کی قبائلی تنظیم ہے۔ میرا فوری ردِعمل یہ تھا کہ اس دعوی کو نفرت انگیز قرار دے کر مسترد کر دیا جائے لیکن آلیور کا خیال تھا کہ ہمیں بس یہ وضاحت کر دینی چاہیے کہ ہماری تنظیم افریقیوں کو متحد کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے اور اس کی رکنیت عوام کے تمام طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو حاصل ہے۔

میں نے ایسا ہی کیا اور یہ بھی کہا کہ ہماری پارٹی کے صدر چیف لوتھولی ایک زولو ہیں۔اس پر ہماری درخواست قبول کر لی گئی۔ یہاں مجھے احساس ہوا کہ براعظم کے بہت سے لوگ اے این سی کو پی اے سی کے زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں جو اس پارٹی نے ہمارے بارے میں پھیلا رکھا ہے۔

ہمارے میزبان عالی جاہ شہنشاہ نے کانفرنس کا سرکاری طور پر افتتاح کیا جنہوں نے بھاری بھر کم پھول دار فوجی وردی پہن رکھی تھی۔ میں یہ دیکھ حیران ہوا کہ شہنشاہ کتنے چھوٹے لگتے تھے۔لیکن ان کی شان اور ان کے اعتماد نے انہیں ایک افریقی دیو کا سا روپ دے رکھا تھا۔ یہاں پہلی مرتبہ میں نے ایک سربراہ مملکت کو سرکاری رسومات انجام دیتے اور ان سے گزرتے دیکھا اور مجھے اس میں بڑی کشش محسوس ہوئی۔ وہ بالکل سیدھے کھڑے تھے اور یہ ظاہر کرنے کے لیے بس ہلکا سا سر کو جھکاتے تھے کہ وہ سن رہے ہیں۔ان کے تمام افعال سے ایک شان ہویدا تھی۔

یوگنڈا کے وزیر اعظم کا مشورہ

پروگرام کے مطابق شہنشاہ کے بعد میری تقریر تھی اور میں اس صبح کا واحد دوسرا مقرر تھا۔کئی مہینوں کے بعد پہلی مرتبہ میں نے ڈیوڈ موتسامائی کا بھیس اتار پھینکا اور پھر سے نیلسن منڈیلا بن گیا۔ اپنی تقریر میں میں نے جنوبی افریقہ میں جدوجہد آزادی کی تاریخ کا جائزہ پیش کیا اور ان وحشیانہ قتل عام کا تذکرہ کیا جن کا ہماری قوم کے خلاف ارتکاب کیا گیا تھا۔ میں نے 1921ء کے سانحہ بلھوک کا ذکر کیا جب فوج اور پولیس نے ایک سو تراسی غیر مسلح کسانوں کو گولیوں سے بھون ڈالا تھا اور پھر چالیس سال بعد پیش آنے والے سانحہ شارپ ویل کی تفصیلات پیش کیں۔ میں نے وہاں جمع مختلف قوموں کے مندوبین کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے جنوبی افریقہ کی حکومت پر دباؤ ڈالا خصوصاً گھانا، نائجیریا اور ٹانگانیکا کا جنہوں نے تحریک چلا کر جنوبی افریقہ کو برطانوی دولت مشترکہ سے نکلوانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ میں

نے امخونتو وی سزوی کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے وضاحت کی کہ پرامن جدوجہد کے تمام مواقع ہمارے لیے بند کر دیئے گئے ہیں میں نے کہا" اگر ایک قیادت اپنے سیاسی ہتھیاروں کو تیز کرنے میں متامل ہو جہاں وہ کم موثر ہو گئے ہوں تو وہ اپنے ہی عوام کے خلاف جرم کا ارتکاب کرتی ہے گزشتہ سال 16 دسمبر کی رات پورا جنوبی افریقہ امخونتو دی سزوی کے بھاری ملکوں سے ہل رہا تھا" جیسے ہی میں نے یہ کہا یوگنڈا کے وزیر اعظم پکار اٹھے انہیں پھر ایک مکا مارو

پھر میں نے اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا:

"میں ابھی ساؤتھ افریقہ سے باہر آیا ہوں اور پچھلے دس ماہ میں نے اپنے ملک میں قانون کے بھگوڑے کی طرح اپنے خاندان اور دوستوں سے جدا رہ کر گزارے ہیں۔ جب مجھے اس طرح کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا تو میں نے ایک عوامی بیان دیا جس میں اعلان کیا کہ میں ملک چھوڑ کر نہیں جاؤں گا اور زیر زمین رہ کر کام کرتا رہوں گا۔ میرا مطلب یہی تھا اور میں اس عہد کی پاسداری کروں گا۔"

اس اعلان پر کہ میں جنوبی افریقہ لوٹ جاؤں گا، زبردست داد و تحسین ملی۔ ہمیں پہلے بولنے کا موقع دے کر ہماری حوصلہ افزائی کی گئی تھی تاکہ پیفف میکسا کو ہمارے کاز کو جانچنے اور یہ فیصلہ کرنے کا موقع مل سکے کہ وہ ہماری تنظیم کو کس قدر مدد دے سکتے ہیں۔ کئی افریقی ممالک کہیں اور متشدد تحریکوں کی حمایت کرنے میں تامل کا شکار تھے لیکن میری تقریر نے ان لوگوں کو یہ تسلیم کرنے میں مدد دی کہ جنوبی افریقہ کے مجاہدین آزادی کے پاس ہتھیار اٹھانے کے سوا کوئی متبادل نہیں رہا۔

کینیتھ کاؤنڈا سے ملاقات

آلیور اور میں نے یونائیٹڈ نیشنل انڈی پنڈنس پارٹی آف ناردرن رہوڈیشیا (یو این آئی پی) کے رہنما اور زیمبیا کے مستقبل کے صدر کینیتھ کاؤنڈا سے نجی بات چیت کی جولیس نائریری کی طرح کاؤنڈا کو جنوبی افریقی مجاہدین آزادی میں اتحاد و اتفاق

نہ ہونے پر تشویش تھی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ جب سوبکوی جیل سے باہر آئے تو ہم سب کو متحد ہو جانا چاہیے۔ شارپ ویل کے سانحے نے پی اے سی کو افریقیوں میں اس قدر مقبولیت عطا کر دی تھی جو اس کے بطور تنظیم اثر ورسوخ سے کہیں بڑھ کر تھی۔ کاؤنڈا جو کبھی اے این سی کے رکن رہ چکے تھے، انہوں نے ہمیں بتایا کہ انہیں گورے کمیونسٹوں سے ہمارے اتحاد پر تشویش ہے اور اس سے افریقہ میں ہمارے بارے میں منفی تاثر ابھرتا ہے۔ کمیونزم کے متعلق مغرب ہی میں نہیں، افریقہ میں بھی شکوک وشبہات تھے۔ یہ بات میرے لیے انکشاف کا درجہ رکھتی تھی اور اپنے اس دورے کے دوران یہ نقطہ نظر مجھے بار بار سننا پڑا۔

جب میں نے اپنا یہ موقف بیان کرنے کی کوشش کی کہ یو این آئی پی کی طرف سے پی اے سی کی حمایت غلط فہمی پر مبنی ہے، کاؤنڈا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''نیلسن! اس موضوع پر مجھ سے بات کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوئلہ نیو کاسل لے جانا (اس انگریزی کہاوت کا اردو مترادف ہے الٹے بانس بریلی کو مترجم) میں تمہارا حامی اور چیف لوتھولی کا پیروکار ہوں۔ لیکن میں یو این آئی پی کی واحد آواز نہیں ہوں۔ تمہیں سائمن کاپوپوی سے ضرور بات کرنی چاہیے۔ اگر تم اسے آمادہ کر لو تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔ کاپوپوی، یو این آئی پی کے سیکنڈ ان کمانڈ تھے، چنانچہ میں نے اگلے روز ان سے ملاقات کا اہتمام کیا۔ میں نے آلیور سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو وہ بولا: ''نیل! تمہیں اس سے اپنے طور پر ملنا چاہیے۔ اس صورت میں تم پوری طرح کھل کر بات کر سکتے ہو

میں نے پورا دن کاپوپوی کے ساتھ گزارا اور اس سے ایک حیرت انگیز ترین کہانی سنی ''ہم آپ کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے ہیں'' اس نے کہا ''اور آپ کو پورے اے این سی وفد سے بھی اگر ہمیں ان دو چیزوں سے آپ کی تنظیم کا اندازہ کرنا ہو تو ہم یقیناً آپ کے کیمپ میں ہوں گے لیکن ہم نے پی اے سی کی طرف سے پریشان کن

رپورٹیں سنی ہیں، یہ کہ "امخونتو دی سزوی" کمیونسٹ پارٹی اور لبرل پارٹی کی تخلیق ہے اور یہ کہ اے این سی تنظیم کا تصور صرف یہ ہے کہ افریقیوں کو گوروں کی توپوں کا چارہ بنا دیا جائے۔"

میں نے برملا کہہ دیا کہ مجھے حیرت ہے آپ دیکھ ہی نہیں سکے کہ یہ کہانی کس طرح سراسر جھوٹی ہے۔ میں نے کہا: "پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ لبرل پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی ایک دوسری کی شدید دشمن ہیں اور وہ پتے کھیلنے کے لیے اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔ دوسری یہ کہ میں خودنمائی کا خطرہ مول لے کر یہاں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ خود میں ایم کے (امخونتو وی سزوی) کی تشکیل کے پیچھے سب سے بڑا محرک تھا" آخر میں میں نے کہا کہ میں پی اے سی سے بڑا مایوس ہوا ہوں کہ اس نے ایسے جھوٹ پھیلائے ہیں۔

دن کے اختتام تک میں نے کاپو پوی کو قائل کرلیا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک میٹنگ بلائے گا اور اس میں خود ہمارا کیس پیش کرے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ یہ جنوبی افریقہ کے بارے میں باقی افریقہ میں معلومات کی کمی اور پی اے سی کی طرف سے اے این سی کو بدنام کرنے کی طول طویل مہم دونوں کی ایک اور مثال تھی۔ کاپو پوی نے میری خوش نصیبی کی دعا کی کیونکہ کانفرنس اب ختم ہوگئی تھی۔ یہ کامیاب رہی تھی لیکن ہمیں اپنا راستہ خود نکالنا تھا۔

سرزمین مصر میں

طالب علمی کے دور میں مجھ پر مصر دیکھنے کا جنوں سوار ہوا تھا جو افریقی تہذیب کا گہوارہ ہے اور جہاں فن اور ڈیزائن میں بے پایاں حسن کے نادر خزانے ہیں۔ میں اہرام اور ابوالہول کو دیکھنا اور دریائے نیل کو پار کرنا چاہتا تھا جو افریقی دریاؤں میں سب سے بڑا ہے۔ ادیس ابابا سے آلیور، رابرٹ ریشا (جسے میرے بقیہ سفروں میں میرا ساتھ دینا تھا) اور میں پرواز کر کے قاہرہ پہنچے۔ میں نے قاہرہ میں اپنے پہلے

دن کی پوری صبح عجائب گھر میں گزاری فن پارے دیکھے، نوادرات کا مشاہدہ کیا، نوٹس لیے اور ان لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں جنہوں نے وادی نیل کی قدیم تہذیب کی بنیاد رکھی تھی ۔ یہ کوئی آثار قدیمہ میں شوقیہ دلچسپی نہیں تھی ۔ افریقی قوم پرستوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ گوروں کے اس جھوٹے دعوے کی تردید کے لیے شواہد سے مسلح ہوں کہ افریقی کسی مہذب ماضی سے بے بہرہ ہیں جس کا مغربی تہذیبوں سے مقابلہ کیا جاسکے ۔ ایک ہی صبح میں نے یہ دریافت کرلیا کہ مصری عظیم فن پارے اور تعمیراتی شاہکار تخلیق کر رہے تھے جب گورے ابھی غاروں میں رہتے تھے ۔

مصر ہمارے لیے ایک اہم نمونہ تھا کیونکہ ہم بذات خود اشتراکی اقتصادی اصلاحات کے پروگرام کا مشاہدہ کر سکتے تھے جو صدر ناصر نے جاری کر رکھا تھا۔ انہوں نے زمین کی نجی ملکیت کم کر دی تھی، معیشت کے بعض سیکٹر قومیا لیے تھے، تیز صنعتی عمل کا آغاز کر دیا تھا، تعلیم عام کر دی تھی اور ایک جدید فوج تعمیر کی تھی ۔ ان میں سے بیشتر اصلاحات اسی نوعیت کی تھیں جو ہم اے این سی والے کسی روز عمل میں لانے کی توقع رکھتے تھے، تاہم اس وقت ہمارے لیے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ مصر واحد افریقی ملک ہے جو ایسی فوج، بحریہ اور فضائیہ رکھتا ہے جن کا ہر لحاظ سے جنوبی افریقہ کی افواج سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے ۔

ایک روز بعد آلیور لندن روانہ ہوگیا اور جاتے وقت اس نے وعدہ کیا کہ روبائی اور مجھ سے گھانا میں آملے گا۔ روبائی اور میں نے اپنے دورے پر روانہ ہونے سے پہلے ان مباحث پر غور کیا جو ہمیں ہر ملک میں پیش کرنے تھے ۔ میرا رجحان یہ تھا کہ اپنے ملک کی سیاسی صورتحال اس قدر سچائی سے اور معروضی طور پر بیان کروں جس قدر ممکن ہو اور پی اے سی کی کامرانیوں کو حذف نہ کروں ۔ ہر نئے ملک میں مجھے اپنے ہوٹل میں بند ہو جانا تھا تا کہ ملک کی پالیسیوں، تاریخ اور قیادت کے بارے میں

اچھی طرح معلومات حاصل کرسکوں۔ روبائی نے اس کے برعکس کیا۔ ایک فطری جارحیت پسند کی حیثیت سے ہمارے وہاں پہنچتے ہی وہ ہوٹل سے نکل جاتا اور بازاروں میں گھومتا پھرتا اور لوگوں سے مل کر اوران سے باتیں کر کے معلومات جمع کرتا۔ ہم ایک انمل جوڑا تھے کیونکہ میں غیر رسمی لباس پہنتا جس کا میں زیر زمین عادی ہو گیا تھا، خاکی اور مشقتی کپڑے، جبکہ روبائی ہمیشہ ایک چست سوٹ میں لوگوں کے سامنے آتا۔

سفر تیونس اور مراکش کا

تیونس جو ہمارا پہلا سٹاپ تھا، ہم وہاں کے وزیر دفاع سے ملے جو چیف لوتھولی سے خاصی مشابہت رکھتے تھے۔ لیکن ان کی مشابہت ایک مقام پر آ کر ختم ہو جاتی تھی کیونکہ جب میں ان کے سامنے اپنے ملک کی صورت حال بیان کر رہا تھا اور پی اے سی کے رابرٹ سوبکوی جیسے لیڈروں کے جیل میں ہونے کا ذکر کر رہا تھا، انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا ''جب وہ جیل سے باہر آئے گا تو وہ تمہیں ختم کر دے گا'' اس پر روبائی کی بھویں تن گئیں (بعد میں انہوں نے کہا: ''یار! تم پی اے سی کا کیس اتنی اچھی طرح پیش کر رہے تھے کہ وہ لوگ خود بھی اس طرح پیش نہیں کر سکتے تھے'' لیکن میں وزیر کے سامنے پوری تصویر پیش کرنے پر مصر تھا۔ اگلے روز جب ہم صدر بورقیبہ سے ملے تو ان کا ردعمل مثبت اور فوری تھا۔ انہوں نے ہمارے سپاہیوں کے لیے تربیت اور پانچ ہزار پونڈ کے اسلحے کی پیشکش کی۔

ہمارا اگلا ٹھہراؤ رباط، مراکش میں تھا۔ اس کی قدیم اور پر اسرار فصیل، اس کی فیشن ایبل دکانیں اور قرون وسطیٰ کی مسجدیں افریقہ، یورپ اور شرق اوسط کا دلکش آمیزہ لگتی تھیں۔ بظاہر مجاہدین آزادی بھی اسے ایسا ہی سمجھتے تھے کیونکہ رباط بالفعل براعظم پر چلنے والی ہر تحریک آزادی کا چوراہا (Crossroad) تھا۔ وہاں ہماری ملاقات موزمبیق، انگولا، الجزائر اور کیپ وردی کے مجاہدین آزادی سے ہوئی۔ یہ الجزائری

انقلابی فوج کا صدر دفتر بھی تھا، چنانچہ ہم نے کئی دن ڈاکٹر مصطفیٰ کے ساتھ گزارے جو مراکش میں الجزائری مشن کے سربراہ تھے۔ انہوں نے ہمیں فرانسیسیوں کے خلاف الجزائری تحریک مزاحمت کی تاریخ پر بریفنگ دی۔

الجزائر کی صورتحال ہماری اپنی صورتحال سے اس لحاظ سے قریبی مشابہت رکھتی تھی کہ باغیوں (حریت پسندوں) کو گورے آبادکاروں کی ایک بڑی تعداد کا سامنا تھا۔ جو مقامی اکثریتی آبادی پر حکومت کرتے تھے۔ انہوں نے بیان کیا کہ کس طرح ایف ایل این (قومی محاذ آزادی) نے 1954ء میں چند گوریلا حملوں سے جدوجہد شروع کی تھی اور اس کا حوصلہ انہیں ویت نام میں ڈین بین پھو کے مقام پر فرانسیسیوں کی شکست سے ہوا تھا۔ شروع میں ایف ایل این کا خیال تھا کہ وہ فرانس کو فوجی شکست دے سکتے ہیں لیکن پھر انہیں احساس ہو گیا کہ خالصتاً فوجی فتح ناممکن ہے۔

اس کے بجائے انہوں نے گوریلا جنگ شروع کر دی۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کا کہنا تھا کہ گوریلا جنگ کا مقصد فوجی فتح حاصل کرنا نہیں بلکہ سیاسی اور اقتصادی قوتوں کو کھلی چھوڑنا ہے جو دشمن کو سپر انداز ہونے پر مجبور کر دیں۔ انہوں نے ہمیشہ مشورہ دیا کہ فوجی اقدام کی منصوبہ بندی کرتے وقت جنگ کے سیاسی پہلو کو نظر انداز نہ کریں۔ ان کے خیال میں بین الاقوامی رائے عامہ بعض اوقات جیٹ لڑاکا طیاروں کی ایک ٹکڑی سے زیادہ کارآمد ہوتی ہے۔

الجزائری محاذ آزادی کی پریڈ میں

تین دن بعد انہوں نے ہمیں عوجدہ بھیج دیا۔ مراکشی سرحد کے اندر واقع یہ گرد آلود چھوٹا سا قصبہ مراکش میں الجزائری فوج کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ہم محاذ پر ایک آرمی یونٹ میں گئے اور ایک موقع پر میں نے دوربین پکڑ کر آنکھوں سے لگائی تو مجھے سرحد پار فرانسیسی دستے دکھائی دیئے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے محسوس کیا اپنے سامنے

فرانسیسی نہیں بلکہ ساؤتھ افریقن ڈیفنس فورس کی وردیاں دیکھ رہا ہوں۔

دو دن بعد میں احمد بن باللہ کے اعزاز میں ہونے والی فوجی پریڈ میں مہمان تھا جو آزادی الجزائر کے پہلے وزیراعظم بننے والے تھے اور جو حال ہی میں فرانسیسی جیل سے باہر آئے تھے۔ میں نے جو فوجی پریڈ ادیس ابابا میں دیکھی تھی، یہ پریڈ اس سے بہت مختلف تھی۔ یہ ایتھوپیا کی تازہ بتازہ، باقاعدہ اور خوبصورت وردیوں والی فوج نہیں تھی بلکہ یہ الجزائر میں گوریلا تحریک کی چلتی پھرتی تاریخ تھی۔

پریڈ میں سب سے آگے پگڑیوں، لمبی عباؤں اور چپلوں میں فخرمند اور جنگ آزمودہ مجاہد تھے جنہوں نے کئی سال پہلے جہاد آزادی شروع کیا تھا۔ انہوں نے وہ ہتھیار اٹھا رکھے تھے جو استعمال کیے تھے تلواریں، پرانی توڑے دار رائفلیں، جنگی کلہاڑے اور بھالے ان کے پیچھے نوجوان سپاہی آئے، ان سب نے جدید ہتھیار اٹھا رکھے تھے اور وہ بھی فخر سے قدم اٹھاتے تھے۔ بعض نے بھاری ٹینک شکن اور طیارہ شکن توپیں پکڑ رکھی تھیں۔ لیکن یہ سپاہی ایتھوپیوں کی سی چستی اور درستی کے ساتھ مارچ نہیں کر رہے تھے۔ یہ ایک گوریلا فوج تھی اور یہ وہ سپاہی تھے جنہوں نے اپنے فیتے میدان جنگ کی بھٹی میں جیتے تھے، جو وردیوں اور پریڈوں سے زیادہ لڑائی اور جنگی حربوں کو اہمیت دیتے تھے۔ ادیس ابابا کے فوجی دستوں سے میں نے ولولہ پایا تھا اور اب یہاں عوجدہ میں، میں جان گیا تھا کہ ہماری اپنی فوج بھی زیادہ تر ان دستوں جیسی ہوگی اور مجھے امید تھی کہ وہ بھی انہی کی طرح بہادری سے لڑے گی۔

آخر میں جیسا تیسا ایک فوجی بینڈ تھا جس کی قیادت سوڈانی نامی ایک شخص کر رہا تھا۔ بلند قامت، تنومند اور پر اعتماد یہ شخص اتنا کالا تھا جتنی کہ رات۔ وہ ایک تقریباتی عصا لہراتا آ رہا تھا اور جب ہم نے اسے دیکھا تو ہم سب کھڑے ہو گئے اور تالیاں بجا کر اس کی تحسین کرنے لگے۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ سب کی نظریں ہماری طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ہم صرف اس لیے بینڈ

ماسٹر کو داد و تحسین سے نواز رہے تھے۔ کہ وہ ایک کالا آدمی تھا جبکہ مراکش میں کالے چہرے نایاب تھے۔ ایک بار پھر مجھے نیشنلزم اور نسل پرستی نے آ لیا تھا۔ ہم نے فوری ردعمل ظاہر کیا تھا کیونکہ ہم یوں محسوس کرتے تھے جیسے ہم ایک افریقی بھائی کو دیکھ رہے ہوں۔ بعد میں ہمارے میزبانوں نے ہمیں بتایا کہ سوڈانی ایک افسانوی سپاہی تھا اور مشہور تھا کہ اس نے پورا ایک فرانسیسی دستہ تن تنہا گرفتار کر لیا تھا۔ لیکن ہم اسے اس کے کارناموں کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے رنگ کی بنیاد پر داد دے رہے تھے۔

مراکش سے میں صحرائے اعظم کے اوپر سے پرواز کر کے مالی کے دارالحکومت بماکو پہنچا اور پھر گنی چلا آیا۔ مالی سے گنی کی پرواز ایک طیارے کے بجائے ایک مقامی بس کا منظر پیش کرتی تھی۔ طیارے کی راہداری میں مرغیاں پھڑ پھڑا رہی تھیں، عورتیں آ جا رہی تھیں جنھوں نے سر پر ٹوکریاں اٹھا رکھی تھیں اور وہ مونگ پھلی اور خشک سبزیوں کے پیکٹ بیچ رہی تھیں۔ یہ ایک جمہوری طرز کی پرواز تھی اور مجھے یہ بہت اچھی لگی۔

سیرالیون میں میرا جعلی تشخص

میرا اگلا ٹھہراؤ سیرالیون میں تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ان کی پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا ہے، چنانچہ میں نے اس کا مشاہدہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں ایک سیاح کی طرح عمارت میں داخل ہوا اور مجھے سپیکر کے قریب ایک نشست دی گئی۔ ایوان کے سیکرٹری میرے پاس آئے اور مجھے اپنی شناخت کرانے کو کہا۔ میں نے ان سے سرگوشی کی ''میں جنوبی افریقہ کے چیف لوتھولی کا نمائندہ ہوں'' انہوں نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور سپیکر کو بتانے چلے گئے۔ بعد میں سیکرٹری نے بتایا کہ مجھے غیر ارادی طور پر وہ نشست دی گئی ہے جو بالعموم ملاقاتیوں کو نہیں دی جاتی بلکہ اس معاملے میں استثناء ان کے لیے اعزاز کی بات تھی۔

ایک گھنٹے کے اندر اجلاس ملتوی ہو گیا اور جب میں ارکان پارلیمنٹ اور مہمانوں

کے درمیان کھڑا چائے پی رہا تھا تو میرے سامنے ایک قطار بن گئی اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ پوری پارلیمنٹ مجھ سے مصافحہ کرنے کے لیے قطار میں لگ گئی تھی۔ میں بڑا ممنون ہو رہا تھا حتیٰ کہ قطار میں تیسرے یا چوتھے شخص نے آہستگی سے کچھ ایسی بات کی کہ "نوبل امن انعام جیتنے والے چیف لوتھولی سے ہاتھ ملانا بڑے اعزاز کی بات ہے" میں جعلی چیف تھا سیکرٹری مجھے غلط سمجھا تھا۔ پھر وزیر اعظم سر ملٹن مارگائی مجھ سے ملانے لائے گئے اور سیکرٹری نے مجھے چیف کہہ کر میرا تعارف کرایا۔ میں نے سیکرٹری کو یہ بتانے کی برملا کوشش کی کہ میں چیف لوتھولی نہیں ہوں مگر اس نے توجہ نہ دی اور پھر میں نے فیصلہ کیا کہ مہمانداری کے تقاضے سے میں اپنا جعلی تشخص جاری رکھوں۔ بعد میں صدر سے ملاقات ہوئی تو میں نے اپنے تشخص کی غلط فہمی کا ذکر کیا۔ وہ مسکرا دیئے اور انہوں نے مجھے فیاضانہ مادی امداد کی پیشکش کی۔

ٹب مین اور شیخو طوری سے ملاقات

میں لائبیریا میں صدر ٹب مین سے ملا جنہوں نے نہ صرف پانچ ہزار ڈالر ہتھیاروں اور تربیت کے لیے دیئے بلکہ دھیمی آواز سے کہا: "کیا آپ کے پاس جیب خرچ ہے؟" میں نے اعتراف کیا کہ جیب خرچ تو بس ایسے ہی ہے۔ اس پر ان کا معاون ایک لفافہ لے آیا جس میں میرے لیے چار سو ڈالر نقد تھے۔ لائبیریا سے میں گھانا پہنچا جہاں آلیور ملا اور گنی کے سفر عبداللہ دیالو نے ہماری تواضع کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ جب میں گنی میں تھا تو میری شیخو طوری سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ انہوں نے انتظام کر دیا کہ ہم وہیں سے اس خشک اور بنجر ملک میں واپس جائیں۔ آلیور اور میں طوری سے مل کر بڑے متاثر ہوئے۔ وہ ایک درمیانے سے بنگلے میں رہتے تھے اور پرانا سوٹ پہن رکھا تھا جس کا رنگ اڑ چکا تھا اور اسے ڈرائی کلینر کے پاس بھجوانے کی بھی ضرورت تھی۔ ہم نے اپنا کیس ان کے سامنے رکھا۔ اے این سی اور "ایم کے" کی تاریخ بیان کی اور "ایم کے" کی مدد کے لے پانچ ہزار

ڈالر مانگے۔ انہوں نے بڑی توجہ سے بات سنی اور قدرے رسمی لہجے میں کہا ''گنی کی حکومت اور عوام جنوبی افریقہ کے اپنے بھائیوں کی پوری پوری حمایت کرتے ہیں اور اس حوالے سے ہم نے اقوام متحدہ میں بیانات دیئے ہیں'' پھر وہ اٹھ کر کتابوں کی الماری تک گئے، اپنی دو کتابیں نکالیں جن پر انہوں نے میرے اور آلیور کے لیے آٹوگراف دیئے۔ پھر انہوں نے ہمارا شکریہ ادا کیا اور اس پر ملاقات ختم ہوگئی۔

آلیور اور اس میں بہت کبیدہ خاطر ہوئے۔ ہمیں ایک اور ملک سے بلایا گیا تھا اور ہمیں جو کچھ دیا گیا وہ فقط ان کی دو دستخط شدہ کتابیں تھیں۔ کیا ہم نے اپنا وقت ضائع کیا تھا؟ کچھ دیر بعد جب ہم اپنے ہوٹل روم میں تھے، وزارت خارجہ کے ایک افسر نے دروازہ کھٹکھٹایا اور ہمیں ایک سوٹ کیس پیش کیا۔ ہم نے اسے کھولا تو وہ بینک نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ آلیور اور میں نے وفور مسرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ لیکن پھر آلیور کا چہرہ بدل گیا۔ وہ بولا: ''نیلسن! یہ گنی کا سکہ ہے۔ یہاں سے باہر اس کی کوئی قدر نہیں، یہ فقط کاغذ ہیں'' لیکن پھر اسے ایک خیال آیا ہم وہ رقم چیک سفارت خانے لے گئے جہاں اس کا ایک دوست تھا اور اس نے اسے قابل تبادلہ کرنسی میں بدل دیا۔

مسلم ملک کا مسیحی شاعر صدر

داکار کی بندرگاہ میں جو پتلی ماہر گیر کشتیاں لنگر انداز تھیں ان کی شان میں خوش نمائی سے ان سینگالی عورتوں کی خوش وضع کچھ کم نہیں تھی جو لہراتے لبادے اور سروں پر پگڑ اوڑھے شہر میں آ جا رہی تھیں۔ میں قریبی منڈی میں گھومتا پھرا جس میں نادر مسالوں اور خوشبوؤں کی مہک رچی بسی ہوئی تھیں۔ سینیگالی خوش اندام لوگ ہیں اور آلیور اور میں نے جو مختصر وقت ان کے ملک میں گزارا اس سے میں لطف اندوز ہوا۔ ان کے معاشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ کس طرح مختلف عناصر فرانسیسی، اسلامی اور افریقی مل جل کر ایک بے مثال اور ممتاز ثقافت تخلیق کر سکتے ہیں۔

صدر لیو پولڈ سنگھور سے ملاقات کو جاتے ہوئے آلیور کو دمے کا شدید دورہ پڑا۔ اس نے ہوٹل واپس جانے سے انکار کر دیا اور میں اسے اپنی پشت پر اٹھا کر سیڑھیوں کے ذریعے صدر کے دفتر میں لے گیا۔ سنگھور کی آلیور کی حالت پر بڑی تشویش ہوئی اور انہوں نے اصرار کیا کہ ان کا ذاتی معالج اس کی نگہداشت کرے گا۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ سنگھور سے چوکنا رہوں کیونکہ اطلاعات ملی تھیں کہ الجزائر میں سینیگالی سپاہی فرانسیسیوں کی مدد کر رہے تھے اور یہ کہ صدر ہنوز سابق استعماری حکومت (Ancien Regime) کے ضابطوں اور سحر انگیزیوں کے اسیر تھے۔ ابھرتی ہوئی قوموں میں ہمیشہ اپنے استعماری آقاؤں کے طور طریقوں کے بارے میں ایک دیرپا پرکشش ہمیشہ رہے گی، اور میں بھی اس سے مبرا نہیں تھا۔ صدر سنگھور ایک عالم اور شاعر تھے اور انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ شاکا پر تحقیقی مواد جمع کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس عظیم افریقی جنگ جو کے بارے میں پے بہ پے کئی سوالات کر کے ہمیں مسرت آمیز حیرت سے دوچار کر دیا۔ ہم نے افریقہ کی صورتحال مختصراً بیان کی اور فوجی تربیت اور رقم کے لیے اپنی درخواست پیش کی۔ سنگھور نے جواب دیا کہ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں جب تک کہ پارلیمنٹ کا اجلاس نہیں ہوتا۔

اس اثناء میں انہوں نے خواہش کی کہ ہم وزیر انصاف ایم دابوزیر نامی سے ملاقات کریں۔ پھر صدر نے مجھ سے ایک خوبصورت فرانسیسی لڑکی کا تعارف کرایا جس کے بارے میں وضاحت کی کہ یہ وزیر انصاف سے میری ملاقات میں ترجمانی کے فرائض انجام دے گی۔ میں کچھ نہ بولا مگر پریشان ہوا۔ میں ایک نوجوان عورت کی موجودگی میں جسے میں جانتا نہیں تھا اور نہ اس پر اعتبار کر سکتا تھا، فوجی تربیت کے بہت حساس مسائل پر کس طرح کھل کر گفتگو کر سکتا تھا! سنگھور نے میری پریشانی بھانپ لی، چنانچہ انہوں نے کہا: ''منڈیلا! فکر نہ کرو یہاں فرانسیسی ہماری افریقی آرزوؤں پر ٹھیک پورے اترتے ہیں۔''

جب ہم وزیر کے دفتر پہنچے، ہمیں استقبالیہ حصے میں کچھ افریقی سیکرٹری ملے۔ایک سیاہ فام سیکرٹری نے اس فرانسیسی خاتون سے پوچھا کہ وہاں کیا کر رہی ہے۔اس نے کہا کہ اسے صدر نے ترجمانی کے لیے بھیجا ہے۔اس پر بحث وتکرار ہوئی اور اس اثنا میں ایک سیکرٹری نے میری طرف مڑ کر کہا: ''سر! کیا آپ انگریزی بول سکتے ہیں'' میں نے کہا میں بول سکتا ہوں تو اس نے جواب دیا: ''وزیر صاحب بھی انگریزی بول سکتے ہیں، لہذا آپ ان سے براہ راست گفتگو کر سکتے ہیں۔آپ کو کسی ترجمان کی ضرورت نہیں'' فرانسیسی لڑکی ہکا بکا ہو کر ایک طرف کھڑی تھی جب میں وزیر سے ملنے اندر چلا گیا۔انہوں نے ہمارے مطالبات پورے کرنے کا وعدہ کیا اور انجام کار یہ ہوا کہ اگرچہ سنگھور نے ہمیں وہ کچھ فراہم نہ کیا جس کا ہم نے تقاضا کیا تھا، مگر انہوں نے مجھے ایک سفارتی پاسپورٹ فراہم کر دیا اور داکار سے ہماری اگلی منزل، لندن، تک طیارے کا کرایہ ادا کر دیا۔

اپنے خوابوں کے لندن میں

مجھے اعتراف ہے کہ میں کسی قدر انگلو فائل (انگریز نواز) ہوں جب میں مغربی جمہوریت اور آزادی کا سوچتا تو برطانوی پارلیمانی نظام کا سوچتا تھا۔کئی طرح سے انگریز میرے نزدیک انسانی شرافت کا نمونہ تھا۔برطانیہ کے پارلیمانی جمہوریت کا گھر ہونے کے باوجود یہ ایک ایسی جمہوریت تھی جس نے میرے عوام پر ایک نفرت انگیز عدم مساوات کا نظام مسلط کیا تھا۔اگرچہ میں برطانوی استعمار کے تصور سے خوف کھاتا تھا، میں نے انگریزی طور طریقوں کی ترغیبات کبھی مسترد نہ کیں۔

اس ملک کو دیکھنے کی خواہش سے قطع نظر جس کے متعلق میں نے اتنے عرصے سے پڑھ اور سن رکھا تھا، میری انگلستان جانے کی آرزو کی بہت سی وجوہات تھیں۔مجھے آلیور کی صحت کے بارے میں تشویش تھی اور میں چاہتا تھا کہ اسے علاج کرانے کی ترغیب دوں۔میں اس کی بیوی ایڈیلیڈ اور ان کے بچوں سے اور یوسف دادو سے ملنا

چاہتا تھا جو اب وہاں مقیم تھا اور کانگریس تحریک کی نمائندگی کر رہا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ لندن میں مجھے گوریلا جنگ پر لٹریچر مل سکتا تھا جو اور کہیں نہیں مل سکا تھا۔

لندن میں پھر میں نے اپنے پرانے زیر زمین طریقے اختیار کر لیے کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وہاں موجودگی کی خبر لیک ہو کر جنوبی افریقہ پہنچ جائے۔ جنوبی افریقن سکیورٹی سروسز کے ہتھکنڈے لندن تک پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن میں کوئی راہب نہیں تھا، میرے وہاں طے شدہ دس دن اے این سی کے کام، دوستوں سے ملاقاتوں اور وقتاً فوقتاً ایک پیشہ ور سیاح کی طرح سیاحت کے لیے وقف تھے۔ ایک برطانوی دوست میری بینسن کے ہمراہ، جس نے ہماری جدوجہد کے متعلق بہت کچھ لکھا تھا، آلیور اور میں نے اس شہر کے مناظر دیکھے جو کبھی کم و بیش دو تہائی کرہ ارض پر حکمرانی کر چکا تھا ویسٹ منسٹر ایبے، بگ بین، ایوان پارلیمنٹ وغیرہ ان عمارتوں کے حسن سے میں متاثر ہوا مگر مجھے زیادہ دلچسپی ان اقدار میں تھی جن کی یہ نمائندگی کرتی تھیں۔ جب ہم نے ویسٹ منسٹر ایبے کے نزدیک جنرل سمٹس کا مجسمہ دیکھا تو آلیور اور میں نے مذاق سے کہا کہ شاید کسی روز اس کے بجائے ہمارا مجسمہ وہاں نصب ہوگا۔

مجھے بہت سے لوگوں نے خبر دی تھی کہ ڈیوڈ ایسٹور کا اخبار آبزرور کوریج میں پی اے سی کی طرف جھکاؤ رکھتا تھا اور اس کے اداریے یہ کہتے تھے کہ اے این سی ماضی کی جماعت کے بارے میں گفتگو کی۔ مجھے علم نہیں میری باتوں کا اس پر اثر ہوا یا نہیں لیکن اس کی کوریج یقیناً تبدیل ہوگئی۔ انہوں نے مجھے ترغیب دی کہ میں کئی نمایاں سیاستدانوں سے ملوں؟ چنانچہ میں نے لیبر ایم پی ڈینس ہیلی کی معیت میں لیبر پارٹی کے لیڈر ہگ گیٹ سکیل اور لبرل پارٹی کے لیڈر جوگر یمانڈ سے ملاقاتیں کیں۔

اپنے قیام لندن کے آخری مرحلے میں میں یوسف سے ملا مگر یہ ایک خوش کن

ملاقات نہیں تھی۔ آلیور کو اور مجھے اپنے سفروں کے دوران بار بار ایک مشکل پیش آئی تھی۔ یکے بعد دیگرے کئی افریقی رہنماؤں نے ہم سے گورے اور ہندوستانی کمیونسٹوں سے اپنے روابط کے بارے میں سوالات کیے تھے اور بعض نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ کمیونسٹ اے این سی پر حاوی ہیں۔ ہماری غیر نسل پرستی اتنا بڑا مسئلہ نہ بنتی اگر ہمیں کھلی قوم پرستانہ اور گورا دشمن پی اے سی کی تشکیل کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ باقی افریقہ میں اکثر افریقی لیڈر پی اے سی کے نظریات کو اے این سی کے نظریات سے بہتر سمجھ سکتے تھے۔ آلیور نے ان امور پر یوسف سے بحث کی تھی جو آلیور کے اخذ کردہ نتائج پر ناخوش تھا۔ آلیور نے فیصلہ کیا تھا کہ زیادہ آزاد کردار اپنانا چاہیے اور الائنس کے دوسرے ارکان کو ملوث کیے بغیر یک طرفہ طور پر بعض اقدامات کرنے چاہئیں اور مجھے اس سے اتفاق تھا۔

لندن میں اپنی آخری شام میں نے ان مسائل پر یوسف سے بحث کرتے گزاری۔ میں نے وضاحت کی کہ اب جبکہ ہم مسلح جدوجہد کا آغاز کر رہے تھے ہمیں رقوم، تربیت اور امداد کے لیے دوسری افریقی اقوام پر انحصار کرنا ہوگا، اس لیے ماضی کی نسبت ان کے خیالات کو زیادہ اہمیت دینی ہوگی۔ یوسف کا خیال تھا کہ میں اور آلیور اے این سی کی پالیسی تبدیل کر رہے تھے اور یہ کہ ہم غیر نسل پرستی سے الگ ہو رہے تھے جو فریڈم چارٹر کا اصل اصول تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم غیر نسل پرستی کو مسترد نہیں کر رہے تھے۔ ہم صرف یہ کہہ رہے تھے کہ اے این سی کو زیادہ تر اپنا سہارا لینا چاہیے اور وہ بیانات دینے چاہئیں جو کانگریس الائنس کی پالیسی کا حصہ نہ ہوں۔ اکثر اے این سی، ساؤتھ افریقن انڈین کانگریس اور کلرڈ پیپلز کانگریس ایک ایسے مسئلے پر ایک اجتماعی بیان دیتی تھیں جو صرف افریقیوں کو متاثر کرتا تھا۔ رویہ بدلنے کی ضرورت ہے۔ یوسف اس پر ناخوش ہوا اور پوچھتا رہا "پالیسی کا کیا ہوا؟" میں نے اسے بتایا کہ میں پالیسی کی بات نہیں کر رہا، امیج کی

بات کر رہا ہوں ہمیں اب اکٹھے کام کرنا ہوگا اور صرف اے این سی کو مساویوں کے مابین اول ظاہر ہونا چاہیے۔

ایتھوپیا میں گوریلا تربیت

اگرچہ لندن کے دوستوں سے رخصت ہو کر میں اداس تھا، اب میں اپنے دورے کے انتہائی نا آشنا حصے یعنی فوجی تربیت پر توجہ مرکوز کر رہا تھا۔ میں نے ادیس ابابا میں چھ ماہ کی تربیت لینے کا بندوبست کیا تھا۔ وہاں میری ملاقات وزیر خارجہ لیفو سے ہوئی جنہوں نے گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے کولفے نامی مضافاتی بستی میں لے گئے جو ایتھوپین رائٹ بٹالین کا ہیڈ کوارٹر تھی۔ وہاں مجھے سپاہ گری کا فن اور علم سیکھنا تھا۔ اگرچہ میں ایک اچھا نومشق مکا باز تھا، مجھے لڑائی کی مبادیات کے بارے میں بہت کم علم تھا۔ میرے ٹریز لیفٹیننٹ ووندوِنی ویفی کا ڈوا ایک تجربہ کار سپاہی تھیا ورا طالویوں کے خلاف زیرِ زمین لڑ چکے تھے۔ ہمارا پروگرام صبر آزما تھا ہم صبح 8 بجے سے دوپہر 1 بجے تک تربیت میں مصروف رہتے۔ پھر غسل اور ظہرانے کا وقفہ کرتے اور اس کے بعد 2 بجے سے شام 4 بجے تک تربیت جاری رہتی۔ 4 بجے سے رات تک کرنل ٹاڈیسی فوجی سائنس پر لیکچر دیتے۔ وہ پولیس کے اسسٹنٹ کمشنر بھی تھے اور انہوں نے شہنشاہ کے خلاف ایک حالیہ سازش کو ناکام بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ میں نے خودکار رائفل اور پستول چلانا سیکھ لیا تھا اور کولفے میں شاہی دستے کے ساتھ اور پچاس میل دور پوری بٹالین کے ساتھ ایک شوٹنگ رینج میں نشانہ بازی کی مشق کی تھی۔ مجھے عمارت تباہ کرنا اور مارٹر فائر کرنا سکھایا گیا اور میں نے یہ بھی سیکھا کہ چھوٹے بم اور سرنگیں کس طرح بناتے ہیں اور ان سے کسی طرح بچتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو ایک فوجی میں ڈھلتا محسوس کرتا تھا اور اسی طرح سوچنے لگا جس طرح ایک فوجی سوچتا ہے اور یہ ایک سیاست دان کی سوچ سے یکسر مختلف سوچ تھی۔

عسکری تربیت کے دوران میں مشقتی مارچوں (Fatigue Marches)

سے بہت لطف اٹھایا۔ اس مارچ میں آپ کو ایک گن، گولیاں اور کچھ پانی دیا جاتا ہے اور آپ کو مقررہ وقت کے اندر ایک طے شدہ مقام پر پہنچنا ہوتا ہے۔ ان مارچوں کے دوران مجھے اس علاقے کے خدوخال کا علم ہوا جو بہت خوبصورت تھے۔ گھنے جنگل تھے اور ان میں کہیں کہیں پہاڑیاں۔ ملک انتہائی پسماندہ تھا۔ لوگ لکڑی کے ہل استعمال کرتے اور بہت سادہ خوراک کھاتے جس میں خانہ ساز جو کی شراب شامل ہوتی۔ ان کا طرز زندگی دیہی جنوبی افریقہ کی زندگی سے مشابہ تھا۔ غریب لوگوں میں ہر کہیں مشابہت زیادہ ہوتی ہے اور اختلافات کم۔

ایتھوپین فوجی انسٹرکٹر کی دورنگی

میرے مطالعاتی سیشنوں میں کرنل ٹاڈیسی سے ان امور پر گفتگو ہوئی کہ ایک گوریلا فوج کیسے تشکیل دی جائے، فوج کی کمان کیسے کی جائے اور نظم وضبط کیسے برقرار رکھا جائے۔ ایک شام عشائیے کے دوران اس نے مجھ سے کہا ''منڈیلا! اب تم ایک روایتی سرمایہ دارانہ فوج نہیں بلکہ ایک فوج آزادی تشکیل دے رہے ہو۔ فوج آزادی ایک مساوات پسند فوج (Egalitarian Army) ہوتی ہے۔ تمہیں اپنے آدمیوں سے ایسا برتاؤ کرنا ہوگا جو ایک سرمایہ دارانہ فوج سے یکسر مختلف ہو۔ جب تم ڈیوٹی پر ہو تو تمہیں اپنا اختیار عزم و اعتماد اور ضبط کے ساتھ استعمال کرنا ہوگا۔ یہ کام سرمایہ دارانہ کمان سے مختلف نہیں۔ لیکن جب تم ڈیوٹی سے فارغ ہو جاؤ تو تمہیں معمولی سے معمولی سپاہی سے بھی کامل مساوات کی بنیاد پر برتاؤ کرنا چاہیے۔ تم وہی کچھ کھاؤ جو وہ کھاتے ہیں۔ اپنا کھانا اپنے دفتر میں نہ کھاؤ بلکہ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ اور پیو اور اپنے آپ کو ان سے الگ مخلوق نہ سمجھو۔''

یہ ساری باتیں قابل تعریف اور معقول لگتی تھیں۔ لیکن جب وہ مجھ سے یہ باتیں کر رہا تھا، ایک سارجنٹ ہال میں داخل ہوا اور اس نے کرنل سے پوچھا کہ فلاں لیفٹیننٹ اسے کہاں مل سکتا ہے۔ کرنل نے نفرت انگیز لہجے میں اس سے کہا: ''تم

دیکھ نہیں رہے کہ میں یہاں ایک اہم شخص سے بات چیت کر رہا ہوں؟ اب میری نظروں سے اوجھل ہو جاؤ'' اس کے بعد وہ پھر پہلے کی طرح نصیحت آمیز لہجے میں باتیں کرنے لگا۔

ٹریننگ کورس چھ ماہ جاری رہنا تھا لیکن آٹھ ہفتے بعد مجھے اے این سی کی طرف سے تار موصول ہوا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ میں جلد از جلد وطن لوٹ آؤں۔ ملک کے اندر مسلح جدوجہد تیز ہو رہی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ ایم کے (گوریلا فوج) کے کمانڈر موقع پر موجود ہو۔

کرنل ٹاڈیسی نے سرعت سے ایتھوپین ایئر لائن کی پرواز کے ذریعے میرے خرطوم جانے کا بندوبست کر دیا۔ میری روانگی سے پہلے اس نے مجھے ایک تحفہ دیا۔ ایک خودکار پستول اور دو سو گولیاں میں پستول کے تحفے اور اس کی ہدایات کے لیے اس کا ممنون تھا۔ اپنے مشقتی مارچز کے باوجود یہ اسلحہ ہر وقت اٹھائے پھرنا مجھے دوبھر معلوم ہوا۔ ایک گولی بھی حیرت انگیز طور پر بھاری ہوتی ہے جبکہ دو سو گولیاں اٹھائے پھرنا ایک چھوٹے بچے کو اپنی پشت پر اٹھانے کے مترادف تھا۔

سوئے وطن روانگی

خرطوم میں مجھے برٹش ایئر ویز کا ایک افسر ملا جس نے مجھے بتایا کہ میری دارالسلام کو رابطہ پرواز اگلے دن روانہ ہو گی، لہٰذا انہوں نے شہر کے ایک پوش ہوٹل میں میرے قیام کا اہتمام کیا ہے۔ میں اس پر کبیدہ خاطر ہوا کیونکہ بصورت دیگر میں غیر اہم تھرڈ کلاس میں ٹھہرنے کو ترجیح دیتا۔

جب میں اس ہوٹل پہنچا تو مجھے ایک طویل اور خوشنما برآمدے سے گزرنا پڑا جہاں کئی درجن سفید فام بیٹھے نا ؤ نوش میں مشغول تھے۔ یہ میٹل ڈی ٹیکٹر اور سکیورٹی چیک اپ متعارف ہونے سے پہلے کی بات ہے۔ میرا پستول ہولسٹر میں جیکٹ کے اندر تھا اور دو سو گولیاں کمر کے گرد لپٹی ہوئی تھیں۔ میرے پاس کئی ہزار پونڈ نقد بھی

تھے۔ مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ سب خوش پوش سفید فام مجھ پر نظریں گاڑے ہوئے ہیں اور کسی بھی لمحے مجھے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مجھے بحفاظت کمرے تک لے جایا گیا جہاں میں نے روم سروس کا حکم دیا اگرچہ ویٹروں کے قدموں کی چاپ مجھے چونکا دیتی تھی۔

خرطوم سے میں سیدھا دارالسلام گیا جہاں میں نے اخونتو کے پہلے اکیس رضا کاروں کو خوش آمدید کہا جو فوجی تربیت کے لیے ایتھوپیا جا رہے تھے۔ یہ ایک مسرت انگیز اور پر فخر لمحہ تھا کیونکہ ان لوگوں نے رضا کارانہ ایک ایسی فوج میں شمولیت قبول کی تھی جسے میں تشکیل دینے کی کوشش کر رہا تھا وہ ایک ایسی جنگ میں اپنی جانیں خطرے میں ڈال رہے تھے جو ابھی شروع ہونے کے مرحلے میں تھی اور وہ ان لوگوں کے لیے خطرناک ترین ہو سکتی تھی جو اولین بھرتی ہونے والوں میں شامل تھے۔ وہ نوجوان اور زیادہ تر شہروں کے رہنے والے تھے اور پر فخر اور پر عزم تھے۔ ہم نے "عدلیس" میں عشائیہ اکٹھے تناول کیا۔ ان لوگوں نے میرے اعزاز میں ایک بکرا ذبح کیا تھا میں نے ان کے سامنے اپنے دورے کی تفصیلات بیان کیں اور انہیں بیرون وطن اچھے رویئے اور نظم وضبط کا احساس دلایا کیونکہ وہ جنوبی افریقہ کی جہد آزادی کے نمائندے تھے میں نے کہا کہ فوجی تربیت سیاسی تربیت کے ساتھ ساتھ چلنی چاہیے کیونکہ ایک انقلاب صرف بندوق کا گھوڑا کھینچنے کا مسئلہ نہیں ہوتا، اس کا مقصد ایک منصفانہ اور عادلانہ معاشرہ تعمیر کرنا ہوتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے اپنے سپاہیوں نے مجھے سلامی دی۔

صدر نائریری نے مجھے امبیا جانے کے لیے ایک نجی طیارہ دیا اور وہاں سے براہ راست میں نے لوباٹسے کی پرواز پکڑی۔ پائلٹ نے مجھے اطلاع دی کہ ہم کانٹے میں اتریں گے۔ مجھے اس پر تشویش ہوئی کہ طیارے کا رخ کیوں بدلا گیا ہے۔ کانٹے میں مقامی مجسٹریٹ میرے استقبال کو موجود تھا۔ اس کے ساتھ سکیورٹی

والے بھی تھے۔ وہ سب سفید فام تھے۔ مجسٹریٹ نے آگے بڑھ کر مجھ سے میرا نام پوچھا میں پھر ڈیوڈ موتسامائی بن گیا مجسٹریٹ بولا: ''براہ کرم اپنا اصلی نام بتائیں کیونکہ مجھے ہدایات دی گئی ہیں کہ میں یہاں مسٹر منڈیلا سے ملوں اور انہیں ہر طرح کی مدد اور آمد و رفت کی سہولت فراہم کروں۔ اگر آپ مسٹر منڈیلا نہیں تو مجھے خدشہ ہے کہ آپ کو گرفتار کرنا پڑے گا کیونکہ آپ کے پاس ملک میں داخل ہونے کا اجازت نامہ نہیں کیا آپ نیلسن منڈیلا ہیں؟''

یہ عجب صورتحال تھی۔ دونوں صورتوں میں میری گرفتاری کا امکان تھا۔ میں نے کہا ''اگر آپ اصرار کرتے ہیں کہ میں ڈیوڈ موتسامائی نہیں بلکہ نیلسن منڈیلا ہوں تو میں آپ کو چیلنج نہیں کروں گا'' وہ مسکرا دیا اور بس اتنا کہا ''ہمیں کل آپ کی آمد کی توقع تھی'' پھر اس نے مجھے لفٹ کی پیشکش کی کہ آپ کو وہاں پہنچا دیں گے جہاں آپ کے ساتھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم موٹر گاڑی میں لوباٹسے پہنچے جہاں میری ملاقات جوموڈائس اور اے این سی کے حامی جوناس ماتلو نامی شخص سے ہوئی جو ان دنوں وہاں مقیم تھا۔ مجسٹریٹ نے مجھے بتایا کہ جنوبی افریقہ کی پولیس آگاہ ہے کہ آپ لوٹ رہے ہیں۔ اس نے مشورہ دیا کہ میں اگلے روز روانہ ہو جاؤں۔ میں نے اس مشورے اور مدد پر اس کا شکریہ ادا کیا لیکن جب میں ماتلو کے مکان پر پہنچا تو میں نے اسے بتایا کہ آج رات میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ مجھے ایک گورے تھیٹر ڈائریکٹر اور رکن ''ایم کے'' سیسل ولیمز کے ہمراہ جنوبی افریقہ واپس جانا تھا۔ اس کا شوفر بن کر میں اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا اور اس رات ہم جوہانس برگ روانہ ہو گئے۔

☆☆☆☆☆

حصہ ہفتم :: رائیو و نیا ٹرائل

سرحد پار کر کے میں نے گہرا سانس لیا۔ کوئی شخص طویل عرصہ باہر رہا ہو تو ہمیشہ اپنے گھر کی ہوا خوشبو دیتی ہے۔ یہ سردیوں کی صاف رات تھی اور یہاں ستارے بر اعظم کے کسی بھی اور مقام کی نسبت مجھے بڑھ کر خوش آمدید کہتے محسوس ہو رہے تھے۔ اگر چہ میں ایک دنیا کو پیچھے چھوڑ رہا تھا جہاں مجھے پہلی مرتبہ آزادی کا تجربہ ہوا تھا اور اس سرزمین میں لوٹ رہا تھا جہاں میں مفرور قرار دیا جا چکا تھا، پھر بھی اپنی پیدائش اور قسمت کی سرزمین میں واپس آ کر مجھے بڑا سکون محسوس ہوا۔

للیز لیف فارم کی خفیہ میٹنگ

بیچوانالینڈ اور شمالی ٹرانسوال کے درمیان درجنوں بے نشان سڑکیں سرحد کو آر پار کاٹتی ہیں اور سیسل بخوبی جانتا تھا کہ کون سی سڑک پکڑنی ہے۔ ڈرائیونگ کے دوران اس نے مجھے بہت سے واقعات سنائے جو میری غیر موجودگی میں پیش آئے تھے۔ ہم رات بھر سفر کرتے رہے تھے اور عین آدھی رات کے بعد سرحد پار کی تھی اور فجر کے وقت للیز لیف فارم پہنچ گئے۔ میں ابھی تک اپنی خاکی تربیتی وردی پہنے ہوئے تھا۔

للیز لیف فارم پہنچ کر مجھے آرام اور غور و فکر کا کوئی وقت نہ ملا کیونکہ اگلی شب ہی ہم نے ایک خفیہ میٹنگ منعقد کی جس میں میں نے ورکنگ کمیٹی کو اپنے دورے کے بارے میں بریف کیا۔ والٹر، موسز کوتانی، گووان امبیکی، ڈان ٹلومی، جے بی مارکس اور ڈوما نوکوی سب فارم پہنچ گئے تھے اور یہ ایک غیر متوقع ملاپ تھا۔ میں نے پہلے اپنے سفروں کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جس میں وصول شدہ رقوم اور تربیت کی پیشکشوں کا ذکر بھی تھا۔ علاوہ ازیں میں نے اے این سی کے سفید فاموں سے تعاون کے متعلق افریقی ممالک میں پائے جانے والے ذہنی تحفظات کی تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ مزید برآں نیمبیا کے رہنماؤں سے میری آخری ملاقات میرے

کانوں میں گونج رہی تھی جنھوں نے مجھے بتایا تھا کہ اگر چہ وہ جانتے ہیں کہ پی اے سی کے مقابلے میں اے این سی مضبوط تر اور مقبول تر ہے وہ پی اے سی کے خالص افریقی نیشنلزم کو سمجھتے ہیں لیکن انہیں اے این سی کے نان ریسنلزم (غیر نسل پرستی) اور کمیونسٹوں سے روابط پر حیرت ہوتی ہے۔ یہ بتا کر میں نے ان سے کہا کہ آلیور کے اور میرے خیال میں بر اعظم میں ہمارے نئے اتحادیوں کو یقین دلانے کے لیے اے این سی کو زیادہ آزادانہ روش اپنانی ہوگی کیونکہ انہی کی طرف سے ہمیں مالی امداد اور "امختونتو وی سزوی" کے لیے تربیت میسر آئے گی۔ میں نے کانگریس الائنس کی تشکیل نو کی تجویز پیش کی تا کہ اے این سی واضح طور پر قیادت کرتی نظر آئے۔ خصوصاً ان معاملات میں جو براہ راست افریقیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

یہ ایک سنجیدہ تجویز تھی اور اس کے لیے پوری قیادت سے مشورہ درکات حا۔ ورکنگ کمیٹی نے مجھ پر زور دیا کہ ڈربن جا کر چیف لوتھولی سے بات کروں سب اس پر رضامند تھے سوائے گووان امبیکی کے، جو ان دنوں للیز لیف فارم میں نہیں رہ رہا تھا بلکہ "ایم کے" کی ہائی کمان کے رکن کے طور پر موجود تھا۔ اس نے مجھ پر زور دیا کہ کسی اور کو بھیج دوں۔ اس نے کہا کہ یہ بہت خطرناک مسئلہ ہے اور پارٹی کو آپ کی سلامتی خطرے میں نہیں ڈالنی چاہیے، خصوصاً جبکہ آپ نئے نئے وطن لوٹے ہیں اور گوریلا تحریک (ایم کے) کو آگے بڑھانے کے لیے تیار ہیں اس دانشمندانہ تجویز کو مجھ سمیت ہر کسی نے مسترد کر دیا۔

گروٹ ویل میں چیف سے ملاقات

میں نے اگلی رات سیسل کی معیت میں رائیوونیا سے آگے سفر میں گزاری۔ اب پھر میں اس کا شوفر تھا۔ میں نے ڈربن میں بہت سی خفیہ میٹنگوں کا منصوبہ بنایا تھا۔ پہلی ملاقات مونٹی نائیکر اور اسماعیل میر سے ہوئی جنہیں میں نے اپنے دورے کے متعلق بریفنگ دی اور نئی تجویز پر گفتگو کی۔ مونٹی اور اسمٰعیل چیف کے بہت قریب

تھے اور چیف ان کے خیالات کا قابل قدر جانتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ لوتھولی کو بتا سکوں کہ میں نے اس کے دوستوں سے بات کی ہے اور اس معاملے میں ان کا ردعمل یہ ہے۔ اسماعیل اور مونٹی میرے اس خیال پر پریشان ہو گئے کہ اے این سی کو کانگریس الائنس میں قیادت کرنے اور افریقیوں کو متاثر کرنے والے معاملات سے متعلق اپنے بیانات جاری کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ ہر اس اقدام کے خلاف تھے جس سے الائنس متاثر ہوتا ہے۔

مجھے گروٹ ویل لے جایا گیا جہاں چیف مقیم تھا اور شہر میں ایک ہندوستانی خاتون کے مکان میں ہماری ملاقات ہوئی۔ میں نے چیف کے سامنے صورتحال قدرے تفصیل سے بیان کی اور وہ بیچ میں بولے بغیر سنتا رہا۔ جب میں اپنی بات کہہ چکا تو اس نے کہا کہ اسے غیر ملکی سیاستدانوں کا یہ نظریہ پسند نہیں کہ وہ اے این سی پر اپنی طرف سے ایک پالیسی مسلط کریں۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم نے نان ریشنلزم کی پالیسی بعض معقول وجوہ کی بنا پر اختیار کی ہے اور ہمیں اپنی پالیسی صرف اس خیال سے تبدیل نہیں کرنی چاہیے کہ یہ بعض غیر ملکی رہنماؤں کو راس نہیں آتی۔

میں نے چیف کو بتایا کہ یہ غیر ملکی سیاستدان ہماری پالیسی کو ڈکٹیٹ نہیں کر رہے بلکہ صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ اسے سمجھ نہیں پا رہے۔ میں نے کہا کہ میرا منصوبہ صرف یہ ہے کہ اے این سی کو زیادہ حقیقت پسند اور اپنے اتحادیوں کے لیے زیادہ قابل قبول بنانے کے لیے بنیادی اصلاحی تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں۔ میں اسے ایک دفاعی اقدام سمجھتا تھا کیونکہ اگر افریقی مملکتیں پی اے سی کی حمایت کرنے کا فیصلہ کر لیتیں تو ایک چھوٹی اور کمزور تنظیم اچانک ایک بڑی اور طاقتور تنظیم بن سکتی تھی۔

چیف اسی لمحے کوئی فیصلہ نہیں کر لیتا تھا میں دیکھ رہا تھا کہ میں نے جو کچھ کہا تھا وہ اس کے بارے میں سوچ بچار کر کے اپنے بعض دوستوں سے بات کرنا چاہتا تھا۔ جب میں نے اس سے اجازت چاہی تو اس نے مجھے محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ اس

شام میں نے شہر اور ٹاؤن شپوں میں کئی اور خفیہ ملاقاتیں کیں۔ اس سلسلے میں آخری ملاقات ڈربن میں ''ایم کے ریجنل کمانڈ'' سے ہوئی۔

ڈربن کمانڈ کی قیادت برونو امٹولو نامی سبوتاژ کے ماہر کے پاس تھی جس سے میں پہلے کبھی نہیں ملا تھا مگر اس سے میری دوبارہ ملاقات ڈرامائی طور پر مختلف حالات میں ہوئی تھی۔ میں نے انہیں اپنے دورہ افریقہ کے بارے میں بریف کیا اور ہمیں جو امداد ملی تھی اس کا اور تربیت کی پیشکشوں کا ذکر کیا میں نے تفصیل سے بتایا کہ فی الحال ایم کے سبوتاژ تک محدود ہے لیکن اگر سبوتاژ سے مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہوئے تو ہم غالباً گوریلا جنگ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

پولیس گھات میں تھی

اسی شام بعد میں فوٹو جرنلسٹ جی آر نائیڈو کے گھر، جہاں میں قیام پذیر تھا، اسماعیل و فاطمہ میر، مونٹی نائیکر اور این جے سنگھ سے بات چیت ہوئی۔ یہ ایک طرح کی ''خوش آمدید و الوداع پارٹی'' تھی کیونکہ میں اگلے دن جوہانس برگ روانہ ہونے والا تھا۔ یہ ایک خوشگوار شام تھی اور ایک طویل عرصے بعد میرے آرام کی پہلی رات۔ میں ڈٹ کر سویا اور پھر اتوار کی سہ پہر یعنی 5 بجے اگست کو سیسل سے جا ملا تاکہ اس کی قابل اعتماد آسٹن میں جوہانس برگ کے طویل سفر پر چل نکلوں۔

میں نے شوفر کا سفید ڈسٹ کوٹ پہنا اور سیسل کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا جبکہ وہ گاڑی چلا رہا تھا۔ پھر ہم باری باری گاڑی چلاتے رہے۔ یہ ایک صاف اور خنک دن تھا اور میں نٹال کے دیہی علاقے کے حسن سے لطف اندوز ہوتا گیا۔ سردیوں میں بھی نٹال سرسبز رہتا ہے۔ اب جبکہ میں جوہانس برگ لوٹ رہا تھا، میری خواہش تھی کہ میں کچھ وقت ونی اور بچوں کے ساتھ گزاروں۔ میں نے اکثر یہ تمنا کی تھی کہ افریقہ کے عجوبے دیکھنے میں ونی میرا ساتھ دے لیکن عملاً میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ جو کچھ میں دیکھ اور کر چکا ہوں اس سے ونی کو آگاہ کر دوں۔

افواہوں کی تردید کر دی۔ اخبارات اس کے حسن اور اس کی فصاحت و بلاغت کی کہانیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس کانفرنس میں اس نے سامعین سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''ہم یہ شہادت ڈھونڈنے میں وقت ضائع نہیں کریں گے کہ کس نے منڈیلا سے بے وفائی کی۔ ایسا پروپیگنڈہ اس لیے کیا جا رہا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے لڑتے رہیں اور نیشنلسٹ حکومت کے ظلم وستم کا مقابلہ کرنے کے لیے متحد نہ ہوسکیں۔''

اکثر بیان کردہ کہانی یہ تھی کہ ایک امریکی کونسلر افسر نے جس کے سی آئی اے سے روابط تھے، حکام کو مخبری کی تھی۔ اس کہانی کی کبھی تصدیق نہیں ہوسکی اور اس کی سچائی میں مجھے کوئی قابل اعتبار شہادت نہیں مل سکی۔ اگرچہ سی آئی اے امریکی استعمار کی حمایت میں کئی گھناؤنی سرگرمیوں کی ذمہ دار رہی ہے، میں اپنی گرفتاری کو اس کے کھاتے میں نہیں ڈال سکتا۔ درحقیقت میں اپنی نقل وحرکت کو خفیہ رکھنے کے بارے میں غیر محتاط تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے دورہ ڈربن کے دوران حکام کئی مختلف طریقوں سے میرا سراغ لگا سکتے تھے۔ فی الواقع حیرت کی بات یہ تھی کہ مجھے اس سے پہلے گرفتار کیوں نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے فورٹ کے ہسپتال میں چند روز گزارے تھے کہ مجھے پریٹوریا منتقل کر دیا گیا۔ جوہانس برگ میں آنے جانے کی کوئی پابندی نہیں تھی اور لوگ جوق در جوق مجھ سے ملنے آتے رہتے تھے۔ ملاقاتی جیل میں قیدی کا حوصلہ برقرار رکھتے ہیں اور ان کی آمد نہ ہونے پر قیدی کا دل ٹوٹ سکتا ہے۔ پریٹوریا منتقل کر کے حکام مجھے گھر سے دور ایسی جگہ رکھنا چاہتے تھے جہاں کم سے کم دوست مجھ سے ملنے آئیں۔

اخلاقی قیدی کی صحبت میں

مجھے ہتھکڑی لگا کر ایک پرانی وین میں ایک اور قیدی کی معیت میں پریٹوریا لے جایا گیا۔ وین اندر سے گندی تھی اور ہم تیل سے اٹے ایک فالتو ٹائر پر بیٹھ گئے جو بار

بار ادھر ادھر کھسک جاتا تھا جبکہ وین اپنی راہ چلی جارہی تھی۔ میرے ساتھی کا انتخاب بھی عجیب تھا۔ اس کا نام انکاڈی منگ تھا اور وہ سوویٹو کے ایک خوفناک ترین گروہ کا رکن تھا۔ عام طور پر حکام ایک سیاسی قیدی کو ایک عام اخلاقی قیدی کے ساتھ گاڑی میں نہیں بٹھاتے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں امید تھی کہ میں ان کاڈی منگ سے ہراساں ہو جاؤں گا جو ایک پولیس مخبر تھا۔ جب ہم جیل تک پہنچے تو میرے کپڑے گندے ہو چکے تھے اور مجھے اس پر غصہ تھا اور جب مجھے اس ساتھی کے ساتھ ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا تو میرا غصہ فزوں تر ہو گیا۔ آخر کار میرے مطالبے پر مجھے علیحدہ جگہ دی گئی جہاں میں اپنا مقدمہ تیار کر سکتا تھا۔

اب میرے ملاقاتیوں کو ہفتے میں صرف دو بار ملنے کی اجازت تھی۔ دور ہونے کے باوجود ونی باقاعدگی سے آتی اور ہمیشہ صاف کپڑے اور مزیدار کھانا لاتی۔ یہ اس کی حمایت کے اظہار کا ایک اور طریقہ تھا اور ہر بار جب میں نئی قمیض پہنتا تو مجھے اس کی محبت اور خلوص کا احساس ہوتا تھا۔ میں اس کی اس مشکل سے آگاہ تھا کہ کس طرح وہ دو چھوٹے بچوں کو گھر چھوڑ کر ہفتے کے وسط میں دوپہر کو پریٹوریا آتی تھی۔ کئی دوسرے بھی مجھ سے ملنے آتے تھے جو کھانا ساتھ لاتے۔ ان میں سرگشتہ وفا مسز پلائی بھی شامل تھیں جو ہر روز مجھے مسالے دار کھانا فراہم کرتی تھیں۔

حبشی نے میرا سیب رد کر دیا

میرے ملاقاتیوں کی دریا دلی کے باعث مجھے اپنی امارت کی پریشانی لاحق ہو گئی تھی اور میں چاہتا تھا کہ اپنے وارڈ کے دوسرے قیدیوں کو بھی کھانے میں حصہ دار بناؤں لیکن اس کی سختی سے ممانعت تھی۔ پابندیوں سے بچنے کے لیے میں وارڈروں کو کھانا پیش کر دیتا اور اس کے نتیجے میں وہ نرم پڑ سکتے تھے۔ اس کے پیش نظر میں نے ایک افریقی وارڈر کو ایک چمکتا سرخ سیب پیش کیا تو اس نے اس پر ایک نگاہ ڈال کر یہ کہتے ہوئے ٹھکرا دیا: ''اینگی پی فونی!'' (مجھے اس کی ضرورت نہیں) افریقی وارڈریا

تو گورے وارڈروں سے زیادہ ہمدرد ہوتے تھے یا اپنے آقاؤں سے سبقت لے جانے کے لیے زیادہ سخت ہوتے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد کالے وارڈر نے جب دیکھا کہ ایک گورے وارڈر نے وہی سیب لے لیا ہے جسے اس نے مسترد کیا تھا تب اس نے اپنا ذہن بدل لیا۔ جلد ہی میں اپنے سب قیدی ساتھیوں کو کھانا فراہم کرنے لگا۔

جیل کی انگوروں کی بیل میں سے جھانکا تو مجھے معلوم ہوا کہ والٹر کو بھی پریٹوریا لایا گیا ہے۔ اگرچہ ہم ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھے، ہم نے باہم رابطہ کرنے کا اہتمام کرلیا۔ والٹر نے ضمانت کی درخواست دی تھی اور اس کے اس فیصلے کو میری حمایت حاصل تھی۔ ضمانت عرصے سے اے این سی کے اندر ایک حساس معاملہ تھا۔ ایسے لوگ بھی تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں ضمانت کو ہمیشہ مسترد کردینا چاہیے کیونکہ اس کا مطلب یہ لیا جاسکتا تھا کہ ہم کمزور دل باغی ہیں جو قانونی نظام کی فرقہ وارانہ بندشوں کو قبول کرلیتے ہیں۔ میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ یہ نقطہ نظر دنیا بھر میں لاگو ہوتا ہے اور میرا خیال تھا کہ ہمیں اس مسئلے کا ایک مقدمے کی بنیاد پر جائزہ لینا چاہیے۔ جب سے والٹر اے این سی کا سیکرٹری جنرل بنا تھا مجھے احساس تھا کہ اسے جیل سے ضمانت پر نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ وہ پارٹی کے لیے اتنا اہم تھا کہ اسے جیل میں سڑنے کے لیے نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ اس کے معاملے میں ضمانت ایک نظریاتی مسئلہ نہیں بلکہ عملی ضرورت تھی۔ میرا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ میں زیر زمین رہا تھا جبکہ والٹر زیر زمین نہیں رہا تھا۔ میں بغاوت اور جدوجہد کی ایک عوامی علامت بن گیا تھا جبکہ والٹر پس منظر میں کام کرتا تھا۔ اس نے اتفاق کیا کہ میرے لیے ضمانت کی کوئی درخواست نہیں دینی چاہیے۔ ایک وجہ یہ تھی کہ ایسی درخواست منظور بھی نہ ہوتی لہٰذا میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے یہ عندیہ ملے کہ میں نے جو زیر زمین زندگی منتخب کی تھی اس کے نتائج کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

گورے جیل افسر کی حماقت

میرے اور والٹر کے اس نتیجے پر پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد مجھے پھر واپس فورٹ کے ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ اکتوبر کے لیے سماعت کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ جیل کی حمایت میں کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن جبری تنہائی مطالعہ کے لیے معاون ہوتی ہے۔ میں نے اپنی ایل ایل بی کی ڈگری کے لیے مطالعاتی خط و کتابت شروع کر دی تھی کیونکہ یہ ڈگری ایک ایڈووکیٹ کی حیثیت سے پریکٹس کی اجازت دیتی ہے۔ پریٹوریا لوکل جیل میں پہنچنے کے بعد میں نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ حکام کو خط لکھ کر اپنے مطالعہ کرنے کے ارادے کی اطلاع دی اور ''دی لاء آف ٹارٹس'' (The Law of Torts) کی ایک جلد خریدنے کی درخواست کی جو میرے نصاب میں شامل تھی۔

چند روز بعد پریٹوریا لوکل کا کمانڈنگ افسر کرنل آکیمپ، جو جیل کے افسروں میں بڑا بدنام تھا، میری کوٹھڑی میں داخل ہوا اور بڑے پرشوق لہجے میں بولا ''منڈیلا! تم ہماری گرفت میں آ ہی گئے۔'' پھر اس نے کہا ''بھلے مانس! تم ٹارچوں کے بارے میں ایک کتاب کیوں چاہتے ہو؟ کیا تم اسے اپنے مذموم سبوتاژ کے لیے استعمال کرنے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہو؟'' میری سمجھ میں نہ آئی کہ وہ کیا بات کر رہا ہے حتیٰ کہ اس نے میرا خط پیش کیا جس میں کتاب کی درخواست کی گئی تھی جسے میں ''دی لاء آف ٹارچز'' کہہ رہا تھا۔ میں اس پر مسکرا دیا اور وہ شیخ پا ہو گیا کہ میں اس سے سنجیدگی سے بات نہیں کر رہا۔ ٹارچ (Torch) کے لیے افریکان لفظ ٹورٹ (Toort) ہے جو ٹارٹ (Tort) سے بہت مشابہ ہے۔ میں نے وضاحت کی کہ انگریزی میں لفظ ''ٹارٹ'' کا مطلب ہے، ''قانون کی ایک شاخ'' اور اس کا مطلب ''لکڑی کی جلتی ہوئی چھڑی'' نہیں ہے جو ایک بم چلانے کے لیے استعمال ہو سکتی ہے۔ وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

ایک روز میں قلعے میں اپنے احاطے میں روزانہ کی ورزش کر رہا تھا جس میں جاگنگ، رننگ آن دی سپاٹ، پش اپس اور رسٹ اپس شامل تھیں۔ اس وقت موتیٰ دیناتھ نامی ایک بلند قامت خوبصورت ہندوستانی ساتھی نمودار ہوا جسے میں ایک خوشحال، شعلہ صفت تاجر کے طور پر قدرے جانتا تھا۔ وہ فراڈ کے الزام میں دو سال کی سزا بھگت رہا تھا۔ باہر ہم دونوں بس آشنا رہتے مگر جیل تو دوستی پروان چڑھانے کا مرکز ہے۔ دیناتھ اکثر صحن بھر میں میری جاگنگ میں میرا ساتھ دیتا۔ ایک روز اس نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا اگر وہ کمانڈنگ افسر سے جیل ہسپتال میں میرے ساتھ رہنے کی اجازت حاصل کرلے۔ میں نے کہا کہ میں اسے خوش آمدید کہوں گا مگر میرا خیال تھا کہ حکام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔ لیکن میرا خیال غلط تھا۔

یہ بڑی مضحکہ خیز بات تھی کہ دیناتھ جیسے سزا یافتہ قیدی کو مقدمہ چلنے کے منتظر ایک سیاسی قیدی کے ساتھ ٹھہرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن میں نے کچھ نہ کہا کیونکہ میں تو کسی نہ کسی کی صحبت کا متمنی تھا۔ دیناتھ دولتمند تھا اور نجی طور پر جیل حکام کو نقد نذرانے پیش کرتا تھا۔ ان رقوم کے عوض اسے کئی سہولتیں حاصل تھیں۔ وہ گورے قیدیوں کے لیے مخصوص کپڑے پہنتا، انہی کی خوراک کھاتا اور جیل میں کوئی کام نہ کرتا۔

ایک رات مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کرنل منار، جو جیل کا سربراہ اور ایک معروف افریکنر ایڈووکیٹ تھا، اسے لینے آیا اور دیناتھ رات بھر کے لیے اس کے ہمراہ چلا گیا اور اگلی صبح لوٹ کر آیا۔ اگر میں نے یہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو مجھے اس پر یقین نہ آتا۔

دیناتھ نے مجھے کابینہ کے وزراء کی مالی بدعنوانیوں اور گھپلوں کی کہانیاں سنائیں جو مجھے پرکشش لگیں۔ اس سے میرے لیے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ نسلی امتیاز

کس قدر زہرناک ہے جو سب شعبوں میں اخلاقی انحطاط کو پروان چڑھاتا ہے۔ میں اس بنا پر اس سے سیاسی یا حساس نوعیت کے معاملات پر گفتگو کرنے سے شعوری طور پر کتراتا تھا کہ وہ ایک مخبر بھی ہوسکتا ہے۔ایک بار اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں اپنے افریقی دورے کے بارے میں اسے بتاؤں اور میں نے اسے ٹال دیا۔آخر کار دیناتھ نے اپنی جلد رہائی کا بندوبست کیا اور اپنی دو سالہ سزا کے صرف چار مہینے گزار کر چلا گیا۔

فرار دوہرا مقصد پورا کرتا ہے۔یہ ایک مجاہد آزادی کو جیل سے چھڑاتا ہے تاکہ وہ جہاد جاری رکھ سکے بلکہ جہاں آزادی کو بھی بہت نفسیاتی فائدہ پہنچاتا ہے اور اس سے پبلسٹی کے میدان میں حکومت کو زبردست دھچکا لگتا ہے۔ایک قیدی کی حیثیت سے میں ہمیشہ فرار کا سوچتا تھا اور کمانڈنگ افسر کے دفتر آنے جانے کے دوران میں احتیاط سے دیواروں' گارڈز کی نقل وحرکت اور دروازوں میں مستعمل خاکہ بنایا جس میں جیل ہسپتال کی صحیح جائے وقوع اور اس طرف نکلنے والے دروازے خاص طور پر نمایاں تھے۔یہ نقشہ اسمگل کرا کے تحریک تک پہنچا دیا گیا جس کے ساتھ ہدایات تھیں کہ اسے ملاحظہ کرنے کے بعد فوراً ضائع کر دیا جائے۔

فرار کے منصوبے

فرار کے دو منصوبے تھے۔ایک دیناتھ نے وضع کیا تھا جسے میں نے نظر انداز کر دیا۔دوسرا منصوبہ اے این سی کی تخلیق تھا اور وہ جوسلاوو نے مجھ تک پہنچایا تھا۔یہ رشوتوں' چابیوں کی نقول اور ایک جعلی ڈاڑھی پر مشتمل تھا جو میری ایک جیکٹ کے شولڈر پیڈ کے ساتھ سی کر مجھ تک پہنچائی جانی تھی۔خیال یہ تھا کہ میں فرار ہونے کے بعد ڈاڑھی لگا لوں گا۔میں نے احتیاط سے منصوبے کا جائزہ لیا اور اس نتیجے تک پہنچا کہ یہ ادھورا ہے اور اس کی ناکامی کا امکان ناقابل قبول حد تک زیادہ ہے اور ایسی

ناکامی پارٹی کے لیے مہلک ہوگی۔ جو کے ساتھ ایک ملاقات میں' میں نے اپنے خیالات پر مشتمل ایک نوٹ اسے دیا۔ میں نے لکھا تھا کہ ''ایم کے'' اس آپریشن کے لیے تیار نہیں حتیٰ کہ ایک منتخب اور تربیت یافتہ فورس بھی ایسے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے قابل نہیں ہوگی۔ میرا مشورہ یہ تھا کہ یہ حربہ اس وقت تک ملتوی کر دیا جائے جب تک میں ایک سزا یافتہ قیدی نہیں بن جاتا اور حکام کم محتاط نہیں ہو جاتے۔ آخر میں' میں نے لکھا تھا۔ ''براہ کرم اسے پڑھ لینے کے بعد ضائع کر دیا جائے۔'' جو اور دوسروں نے فرار کی کوشش نہ کرنے کے بارے میں میرا مشورہ قبول کر لیا' لیکن اس نے فیصلہ یہ کیا کہ اس نوٹ کو تاریخی دستاویز کے طور پر محفوظ کر لیا جائے اور بعد میں یہ نوٹ بڑے منحوس وقت پر منظر عام پر آ گیا۔

ابتدائی سماعت سوموار 15 نومبر 1962ء کے طے پائی تھی۔ پارٹی نے ایک فری منڈیلا کمیٹی قائم کی اور ''منڈیلا کو رہا کرو'' کے نعرے کے ساتھ سرگرم مہم چلائی۔ ملک بھر میں احتجاجی جلسے منعقد ہوئے اور دیواروں کے پہلوؤں پر نعرے لکھے جانے لگے۔ حکومت نے میری قید سے متعلق ہر قسم کے اجتماعات پر پابندی لگا کر جواب دیا۔ لیکن تحریک آزادی نے یہ پابندی نظر انداز کر دی۔

سوموار کی سماعت کے لیے تیاری کے دوران فری منڈیلا کمیٹی نے عدالت کے باہر ایک عوامی مظاہرہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ منصوبہ یہ تھا کہ میری وین جس راستے سے گزرے گی' اس سڑک کے دونوں طرف لوگ ساتھ ساتھ کھڑے ہوں گے۔ اخباری رپورٹوں' ملاقاتیوں سے بات چیت اور جیل گارڈز کے تبصروں سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ ایک بڑا اور بلند آہنگ ہجوم اکٹھا ہونے کی توقع ہے۔

ہفتے کو جبکہ میں سوموار کی سماعت کی تیاری کر رہا تھا' مجھے اپنا سامان فوراً پیک کرنے کا حکم ملا کیونکہ سماعت پریٹوریا منتقل کر دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں حکام نے کوئی اعلان نہیں کیا تھا اور اگر میں ایک ہمدرد جیلر کے ذریعے باہر پیغام پہنچانے کا

بندوبست نہ کرتا تو باہر کسی کو علم نہ ہو سکتا کہ میں جوہانسبرگ سے روانہ ہو چکا ہوں۔

لیکن پارٹی نے فوری ردعمل ظاہر کیا اور پیر کی صبح جب میرا مقدمہ شروع ہوا' پرانا صومعہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مقدمہ بغاوت کے چار سال بعد صومعہ مجھے ایک دوسرا گھر لگا۔ میرا قانونی مشیر جوسلاوو حاضر نہ ہو سکا کیونکہ پابندیوں نے اسے جوہانسبرگ تک محدود رکھا اور اس کے بجائے بوب ہیپل نے میری صحیح معاونت کی۔

نے عدالت میں چیتے کی کھال پہنی

میں اس سوموار کی صبح سوٹ اور ٹائی کی بجائے روایتی چیتے کی کھال کا کیراس (Kaross) پہنے عدالت میں داخل ہوا۔ میرے حامیوں کا ہجوم یک آواز ہو کر بند مٹھیاں لہراتے ہوئے نعرے لگانے لگا...... ''اماندلا...... انگاویتھو!''

میرے ژہوسا لباس ''کیراس'' نے تماشائیوں میں بجلی کی لہر دوڑا دی جن میں سے اکثر میرے دوست اور خاندان والے تھے۔ ان میں سے بعض ٹرانسکائی سے چل کر آئے تھے۔ ونی نے بھی روایتی منکوں والی اوڑھنی اور ٹخنوں تک لمبا ژہوسا گھاگھرا پہن رکھا تھا۔

میں نے روایتی لباس اس علامتی اظہار کے لیے پہنا تھا کہ میں ایک کالا افریقی گورے آدمی کی عدالت میں چل کر آ رہا تھا۔ معنوی طور پر میں نے اپنے پشت پر اپنی قوم کی تاریخ' ثقافت اور ورثہ اٹھا رکھا تھا۔ اس روز میں نے اپنے آپ کو افریقی قوم پرستی' افریقہ کے مشکل مگر شاندار ماضی کا مورث اور اس کے غیر یقینی مستقبل کا مجسمہ محسوس کیا۔ کیراس بھی ''گورے انصاف کی نفاستوں'' سے نفرت کی ایک علامت تھا۔ میں خوب جانتا تھا کہ حکام میرے کیراس سے خوف کھائیں گے جیسا کہ اکثر گورے' افریقہ کے حقیقی کلچر سے خوف کھاتے ہیں۔

جب مجمع خاموش ہو گیا اور میرے مقدمے کی باری آئی تو میں نے رسمی طور پر

پراسیکیوٹر مسٹر بوش کو جسے میں وکالت کے دنوں سے جانتا تھا اور مسٹر ہیرڈن کو سلام کیا کہ وہ بھی مجھ سے آشنا تھا۔ پھر فوراً ہی میں نے اس بنا پر دو ہفتے کے ریمانڈ کی درخواست کی کہ میرے وکلاء کو اطلاع کرنے کا موقع دیئے بغیر مجھے پریٹوریا منتقل کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ مجھے ایک ہفتے کے التوا کی رعایت دے دی گئی۔

جب میں واپس اپنی کوٹھڑی میں پہنچا تو ایک گورے وارڈز نے بتایا کہ کمانڈنگ افسر کرنل جیکبز نے حکم دیا ہے کہ اپنا کیراس اس کے حوالے کر دوں۔ میں نے کہا: ''تم اسے بتا سکتے ہو کہ یہ اسے نہیں ملے گا۔'' یہ وارڈز ایک کمزور شخص تھا' چنانچہ وہ کانپنے لگا۔ اس نے مجھ سے بالفعل کیراس کی بھیک مانگی اور کہا کہ اگر وہ اسے لے کر نہ گیا تو اس کو معطل کر دیا جائے گا۔ میں نے اس پر ترس کھاتے ہوئے کہا: ''دیکھو' اپنے کمانڈنگ افسر کو بس اتنا بتا دو کہ یہ تم نہیں بلکہ منڈیلا کہہ رہا ہے۔'' تھوڑی دیر بعد کرنل جیکبز خود نمودار ہوا اور اس نے حکم دیا کہ کیراس اس کے حوالے کر دوں جسے اس نے میرا ''کمبل'' قرار دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ اسے وہ لباس اتروانے کا کوئی قانونی اختیار نہیں جو میں عدالت میں پہن کر گیا تھا اور اگر اس نے میرا کیراس ضبط کرنے کی کوشش کی تو میں یہ معاملہ سیدھا سپریم کورٹ میں لے جاؤں گا۔ کرنل نے پھر کبھی میرا ''کمبل'' لینے کی کوشش نہ کی لیکن حکام نے اسے فقط عدالت میں پہننے کی اجازت دی اور اس خوف سے عدالت آتے جاتے اسے پہننے سے منع کر دیا کہ اس سے دوسرے قیدیوں کو انگیخت ملے گی۔

تاریخی خطاب

جب ایک ہفتہ بعد مقدمہ دوبارہ شروع ہوا' تو اس سے پہلے کہ مجھ سے قانونی نکات پیش کرنے کا کہا جاتا' مجھے عدالت سے خطاب کرنے کی اجازت دی گئی۔ میں نے کہا: ''مجھے امید ہے کہ میں عدالت کے گوش گزار کر سکوں گا کہ یہ مقدمہ

افریقی عوام کی امنگوں کا مقدمہ ہے اور اس وجہ سے میں نے مناسب جانا کہ میں اپنی صفائی خود پیش کروں۔'' میں بینچ' گیلری اور پریس پر یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ میں مملکت کو مقدمے میں گھسیٹنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ پھر میں نے اس بنا پر مجسٹریٹ کی عدول حکمی کی درخواست کی کہ میں اپنے آپ کو ایک ایسی پارلیمنٹ کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کا اخلاقاً پابند خیال نہیں کرتا جس میں میری کوئی نمائندگی نہیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ مجھے ایک گورے جج سے انصاف مل سکے۔ میں نے کہا:......

'' ایسا کیوں ہے کہ میں اس کمرہ عدالت میں ایک گورے مجسٹریٹ اور ایک گورے پراسیکیوٹر کا سامنا کر رہا ہوں جبکہ دائیں بائیں گورے اردلی کھڑے ہیں: کیا کوئی دیانتداری سے اور سنجیدگی سے یہ کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کی فضا میں انصاف کے پلڑے برابر اور متوازن رہیں گے؟ ایسا کیوں ہے کہ اس ملک کی تاریخ میں کسی افریقی کو کبھی یہ اعزاز نہیں ملا کہ اس پر مقدمہ چلانے والے اس کے اپنے اقارب اور اس کے اپنے رنگ و خون کے ہوں؟ حضور والا! میں بتاتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے......

رنگ و نسل کی ان پابندیوں کا حقیقی مقصد اس امر کو یقینی بنانا ہے کہ عدالتوں میں کیا گیا انصاف مملکت کی پالیسی کے مطابق ہو خواہ وہ پالیسی انصاف کے اصولوں سے کتنی ہی متصادم ہو جنہیں پوری مہذب دنیا میں عدلیہ قبول کرتی ہے۔ جناب والا! میں نسلی امتیاز سے اور اس کی تمام صورتوں سے شدید نفرت کرتا ہوں۔ میں زندگی بھر اس کے خلاف لڑتا رہا ہوں اور اب بھی لڑتا ہوں اور لڑتا رہوں گا حتیٰ کہ میری زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ میں اس سیٹ اپ سے شدید نفرت کرتا ہوں جو میرے اردگرد پھیلا ہوا ہے۔ اس سے مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں ایک کالا آدمی ہوں جو ایک گورے آدمی کی عدالت میں پیش ہوا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔''

مقدمے کے دوران پراسیکیوٹر نے ٹرانسکائی اور جنوبی مغربی افریقہ سمیت ملک بھر سے ایک سو سے زیادہ گواہ بلائے۔ وہ پولیس مین' صحافی' ٹاؤن شپ سپرنٹنڈنٹ

اور پر حرز تھے۔ ان میں سے اکثر نے یہ ظاہر کرنے کے لیے فنی گواہی دی کہ میں غیر قانونی طور پر ملک سے باہر گیا تھا اور یہ کہ میں نے افریقی کارکنوں کو مئی 1961ء میں تین روزہ سٹے ایٹ ہوم کے دوران ہڑتال پر اکسایا تھا۔ اس میں کوئی تنازع نہیں تھا اور فی الواقع میں نے اسے متنازع بنایا بھی نہیں کہ میں فنی طور پر ان دونوں الزامات کا مجرم تھا۔

کے سیکریٹری پر جرح

پراسیکیوٹر نے مسٹر برنارڈ کو بلایا تھا جو وزیراعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے تا کہ وہ اس خط کی تصدیق کریں جس میں 'میں نے وزیراعظم سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ ایک قومی کنونشن بلائیں اور انہیں اطلاع دی تھی کہ اگر انہوں نے کنونشن نہ بلایا تو ہم ایک تین روزہ ہڑتال کا اہتمام کریں گے۔ مسٹر برنارڈ پر جرح کے دوران میں نے پہلے وہ خط عدالت میں پڑھا جو میں نے بھیجا تھا اور جس میں درخواست کی تھی کہ وزیراعظم تمام جنوبی افریقیوں کے لیے ایک قومی کنونشن بلائیں تا کہ ایک نیا غیر نسلی آئین لکھا جائے۔ جرح یوں ہوئی:

منڈیلا : کیا آپ نے یہ خط وزیراعظم کے سامنے رکھا تھا؟

گواہ : ہاں۔

منڈیلا : کیا وزیراعظم نے اس خط کا کوئی جواب دیا تھا؟

گواہ : انہوں نے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ اب کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ یہ خط ایسے معاملات اٹھاتا ہے جو اس ملک کے شہریوں کی بھاری اکثریت کے لیے انتہائی تشویشناک ہیں؟

گواہ : میں اتفاق نہیں کرتا۔

منڈیلا : کیا آپ اتفاق نہیں کرتے؟ آپ اتفاق نہیں کرتے

کہ انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کا سوال افریقی عوام کے لیے بنیادی اہمیت کا معاملہ ہے؟

گواہ : ہاں ایسا ہی ہے۔

منڈیلا : کیا ان باتوں کا اس میں ذکر ہے؟

گواہ : ہاں میرے خیال میں ایسا ہے۔

منڈیلا : آپ پہلے ہی اتفاق کر چکے ہیں کہ یہ خط آزادی اور شہری آزادیوں وغیرہ جیسے حقوق کے سوالات اٹھاتا ہے؟

گواہ : ہاں خط یہ سوالات اٹھاتا ہے۔

منڈیلا : اب آپ جانتے ہیں کہ افریقی ان حقوق سے بہرہ ور نہیں ہیں جن اس خط میں مطالبہ کیا گیا ہے؟ انہیں حکومت کے یہ حقوق دینے سے انکار کیا جاتا ہے۔

گواہ : بعض حقوق۔

منڈیلا : کوئی افریقی صوبائی کونسل یا میونسپل کونسلوں کا رکن نہیں بن سکتا؟

گواہ : ہاں۔

منڈیلا : افریقیوں کو اس ملک میں ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں؟

گواہ : جہاں تک پارلیمنٹ کا تعلق ہے انہیں ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں۔

منڈیلا : ہاں میں یہی بات کر رہا ہوں۔ میں پارلیمنٹ اور ملک کے دوسرے سرکاری اداروں، صوبائی کونسلوں اور میونسپل کونسلوں کی بات کر رہا ہوں۔ انہیں ووٹ کا حق نہیں؟

گواہ : یہ ٹھیک ہے۔

منڈیلا : کیا آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ دنیا میں کسی مہذب ملک میں ایک وزیراعظم کے لیے یہ شرمناک بات ہو گی کہ وہ ایک خط کا جواب دینے میں ناکام رہے جس میں اس ملک کے شہروں کی اکثریت کو متاثر کرنے والے معاملات اٹھائے گئے ہوں؟ کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں؟

گواہ : میں اسے سے اتفاق نہیں کرتا۔

منڈیلا : آپ اتفاق نہیں کرتے کہ ایک وزیراعظم کے لیے یہ بے اصولی ہو گی کہ وہ ایک خط کو نظر انداز کر دے جس میں اس ملک کے شہریوں کی بھاری اکثریت کو متاثر کرنے والے بنیادی معاملات اٹھائے گئے ہوں؟

گواہ : اس خط کو وزیراعظم نے نظر انداز نہیں کیا۔

منڈیلا : صرف سوال کا جواب دیں۔ کیا آپ اسے ایک وزیراعظم کے شایان شان سمجھتے ہیں کہ وہ ایسی درخواست کا جواب نہ دے جو ملک کے شہریوں کی بھاری اکثریت کی طرف سے ان کی بنیادی معاملات سے متعلق کی گئی ہو؟ آپ کہتے ہیں کہ یہ خط ہے؟

گواہ : وزیراعظم نے خط کا جواب دیا تھا۔

منڈیلا : مسٹر برنارڈ! میں آپ سے گستاخی نہیں کرنا چاہتا۔ کیا آپ میرے سوالات کا جواب دینے تک محدود رہیں گے؟ میں آپ سے جو سوال کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ کیا ایک وزیراعظم کی طرف سے یہ انتہائی نامناسب حرکت نہیں کہ وہ ایسے خط کا جواب نہ دے جس میں ملک کی بھاری اکثریت کو متاثر کرنے والے معاملات اٹھائے گئے ہوں؟

مسٹر برنارڈ اور میں کبھی متفق نہ ہوئے۔ آخر میں اس نے صرف یہ کہا کہ خط کا لہجہ جارحانہ اور روکھا تھا اور اس وجہ سے وزیراعظم نے اس کا جواب نہ دیا۔

نے عدالت کا گمراہ کیا

پوری کارروائی کے دوران پراسیکیوٹر اور مجسٹریٹ بار بار مجھ سے گواہوں کی تعداد کے بارے میں پوچھتے رہے جنہیں میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں ہمیشہ جواب دیتا: ''میں اتنے ہی گواہ بلانا چاہتا ہوں جتنے کہ حکومت بلانا چاہتی ہے' اس سے زیادہ نہیں۔''جب استغاثہ نے اپنا کیس مکمل کرلیا تو کمرہ عدالت میں خاموشی چھائی ہوئی تھی اور یہ توقع کی جارہی تھی کہ میں اپنی صفائی پیش کروں گا۔ اپنے پہلے گواہ کو بلانے کی بجائے میں نے اٹھ کر یہ برملا اعلان کیا کہ میں ہرگز کوئی گواہ پیش نہیں کررہا اور اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا کیس بند کردیا۔ کمرہ عدالت میں سرگوشیاں ہوئیں اور پراسیکیوٹر بے اختیار پکار اٹھا: ''او رخدا!''

میں نے شروع ہی سے عدالت کو گمراہ کیا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ الزام صحیح ہے اور حکومت کا کیس مضبوط ہے' چنانچہ گواہ بلا کر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کرنا بے سود نظر آتا تھا۔ اپنی جرح اور جج کو اپنی ہی عدول حکمی پر مجبور کرنے کی کوشش کے ذریعے میں نے وہ بیانات دے دیئے تھے جو میں عدالت کی ناانصافی کے بارے میں دینا چاہتا تھا۔ مجھے گواہ طلب کرکے ایک ایسی بات کو غلط ثابت کرنے میں کوئی فائدہ نظر نہ آیا جو ناقابل تردید تھی۔

مجسٹریٹ میرے عمل سے حیرت میں ڈوب گیا اور اس نے کچھ غیر یقینی انداز میں مجھ سے پوچھا: ''کیا تمہیں کچھ اور کہنا ہے؟''

''حضور عالی! میں کہتا ہوں کہ میں کسی جرم کا مجرم نہیں۔''

''کیا آپ کو یہی کچھ کہنا ہے؟''

''حضور والا! میں احترام سے یہ کہتا ہوں کہ اگر مجھے کچھ اور کہنا تھا تو وہ میں کہہ چکا ہوں۔''

پراسیکیوٹر نے پھر اپنے کاغذات کھنگالتے ہوئے ایک ایسی تقریر کے لیے تیار ہونے کی کوشش کی جس کی اسے امید نہیں تھی کہ کرنی پڑے گی۔ اس نے عدالت سے مختصر خطاب کیا اور مجسٹریٹ سے کہا کہ مجھے دونوں بنیادوں پر مجرم قرار دیں۔ پھر عدالت اگلے روز کے لیے ملتوی ہوگئی جب مجسٹریٹ کے فیصلے سنانے سے پہلے مجھے نرمی کی درخواست کرنے کا موقع دیا جانا تھا۔

کی مجھ سے معذرت

اگلے روز عدالت لگنے سے پہلے میں کمرہ عدالت سے پرے ایک دفتر میں بوب ہیپل سے باتیں کر رہا تھا جو مجھے کیس کے بارے میں مشورے دے رہا تھا اور ہم تعریف کر رہے تھے کہ گزشتہ روز اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے پہلی بار جنوبی افریقہ کے خلاف پابندیوں کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ بوب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ الزبتھ اور ڈربن میں سبوتاژ کے دو واقعات ہوئے ہیں اور یہ دونوں واقعات اقوام متحدہ کے ووٹ پر بطور جشن اور میرے مقدمے پر بطور احتجاج پیش آئے ہیں۔ ہم اس گفتگو میں مصروف تھے جب پراسیکیوٹر مسٹر بوش کمرے میں داخل ہوا اور اس نے بوب سے معذرت طلب کی۔

جب بوب چلا گیا تو وہ کہنے لگا: ''منڈیلا! میں آج عدالت میں نہیں آنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اپنے پیشے میں پہلی بار اس کام سے نفرت ہو رہی ہے جو میں کر رہا ہوں۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے کہ میں عدالت سے درخواست کروں کہ تمہیں جیل بھیج دے۔''

پھر اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور یہ امید ظاہر کی کہ نتیجہ میرے حق میں اچھا نکلے گا۔ میں نے اس کے جذبات کا شکریہ ادا کیا اور اسے یقین دلایا کہ میں یہ کبھی نہیں بھولوں گا جو اس نے میرے حق میں کہا ہے۔

حکام اس روز چوکس تھے۔ ہجوم مقدمے کے پہلے دن کی نسبت اس روز کہیں زیادہ

لگتا تھا۔تمام 150 غیر یورپی نشستیں بھر گئی تھیں۔ونی اپنے ژھوسا لباس میں موجود تھی اور ٹرانسکائی سے میرے بہت سے رشتے دار بھی آئے تھے۔سینکڑوں مظاہرین عدالت سے ایک بلاک پرے کھڑے تھے اور یوں لگتا تھا کہ پولیس والے بھی اتنے ہی ہیں جتنے کہ تماشائی......

جب میں کمرہ عدالت میں داخل ہوا تو میں نے اپنے دائیں بند مٹھی اٹھائی اور پکار کر کہا: ''اماندلا!'' جس کا جواب لوگوں نے پرزور ''انگاویتھو!'' کے نعرے سے دیا۔اس پر مجسٹریٹ نے اپنی موگری میز پر بجائی اور ''آرڈر'' پکارا۔جب عدالت میں خاموشی طاری ہوئی تو اس نے الزامات سمیٹے جس کے بعد مجھے بولنے کا موقع دیا گیا۔

استعمار کے بخیے ادھڑ گئے

میری نرمی کی درخواست ایک گھنٹے جاری رہی۔یہ ایک عدالتی اپیل نہیں تھی بلکہ ایک سیاسی بیان تھا۔میں عدالت پر واضح کرنا چاہتا تھا کہ میں کیسے اور کیونکر ایسا انسان بن گیا تھا جو کہ میں فی الواقع تھا اور جو کچھ میں نے کیا تھا وہ کیوں کیا تھا اور اگر مجھے موقع ملا تو دوبارہ وہی کام کیوں کروں گا۔میں نے کہا:

''کئی سال پہلے جب میں ٹرانسکائی میں اپنے گاؤں میں ایک لڑکے کی حیثیت سے پرورش پا رہا تھا'میں نے قبیلے کے بڑوں کو سفید آدمی کی آمد سے پہلے کے اچھے پرانے دنوں کے بارے میں کہانیاں بیان کرتے سنا تھا۔تب ہمارے لوگ اپنے بادشاہوں اور ان کے ایماپاکاتی کی جمہوری حکمرانی کے تحت امن سے رہتے تھے (ایماپاکاتی کے لغوی معنی ہیں ''اندر والے'' لیکن مروجہ معنی ہیں بادشاہ کے بہت قریبی لوگ)اور وہ آزادانہ اور اعتماد کے ساتھ' ملک بھر میں' کسی رکاوٹ کے بغیر نقل وحرکت کرتے تھے۔یہ ملک نام اور حقوق کے لحاظ سے اپنا تھا۔ہم یہاں کی زمین'

جنگلوں اور دریاؤں پر قابض تھے۔ ہم زمین کے نیچے سے معدنی دولت اور اس خوبصورت ملک کے چھپے خزانے نکالتے تھے۔ ہم اپنی حکومت قائم کرتے اور چلاتے تھے۔ ہم اپنے بازوؤں کے بل بوتے پر اپنی تجارت اور کاروبار منظم کرتے تھے۔ ہمارے بڑے ان جنگوں کی کہانیاں سناتے تھے جو مادر وطن کے دفاع میں ہمارے بزرگوں نے لڑی تھیں اور بہادری کے وہ کارنامے بیان کرتے تھے جو ان تاریخی دنوں میں ہی ہمارے جرنیلوں اور سپاہیوں نے انجام دیئے تھے۔

''اس ملک میں ابتدائی افریقی معاشروں کی ساخت اور تنظیم نے مجھے بہت متاثر کیا اور میرے سیاسی نقطۂ نظر کے ارتقاء میں اس کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ زمین' جو اس وقت پیداوار کا بڑا ذریعہ تھے' کوئی امیر یا غریب نہ تھا اور انسان کا انسان کے ذریعے کوئی استحصال نہ تھا۔ تمام لوگ آزاد اور مساوی تھے اور یہی حکومت کی بنیاد تھی۔ اس عام اصول کو تسلیم کرنے کا اظہار کونسلوں کے ادارے کی تشکیل کی صورت میں ہوا جنہیں مختلف مقامات پر ''امیزو'' یا ''پٹسو'' یا ''گوٹلا'' کہا جاتا تھا جو قبیلے کے معاملات چلاتی تھیں۔ ہر کونسل اس قدر مکمل جمہوری ہوتی کہ قبیلے کے تمام ارکان اس کے مباحث میں حصہ لے سکتے تھے۔ سردار اور رعایا' جنگجو اور معالج سب حصہ لیتے اور اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے۔ یہ ایک اتنا وزنی اور موثر ادارہ تھا کہ قبیلے والے اس سے رجوع کیے بغیر کبھی کوئی اہم قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔

''ایسے معاشرے میں بہت کچھ تھا جو ابتدائی نوعیت کا اور عدم تحفظ پر مبنی تھا اور یہ موجودہ دور کے تقاضوں پر کبھی پورا نہیں اتر سکتا تھا۔ لیکن ایسے معاشرے میں انقلابی جمہوریت کے بیج پنہاں ہوتے ہیں' جس میں کسی کو غلامی یا خدمت گذاری کی زنجیروں میں نہیں جکڑا جاتا اور جس میں غربت' احتیاج اور عدم تحفظ کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ یہ تاریخ ہے جو آج بھی مجھے اور ہماری سیاسی جدوجہد میں شریک میرے ساتھیوں کو ولولہ عطا کرتی ہے۔''

میں نے عدالت کو بتایا کہ کس طرح میں افریقن نیشنل کانگریس میں شریک ہوا تھا اور کس طرح اس کی جمہوریت اور غیر نسلیت کی پالیسی میرے گہرے نظریات کا عکس تھی۔ میں نے وضاحت کی کہ کس طرح ایک قانون دان کی حیثیت سے میں اکثر قانون کی پابندی یا اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ میں نے کہا:

''میں کہوں گا کہ اس ملک میں کسی سوچ بچار کرنے والے افریقی کی پوری زندگی مسلسل اسے ایک طرف اپنے ضمیر اور دوسری طرف قانون کے درمیان برپا تصادم میں دھکیلتی رہتی ہے۔ یہ تصادم کوئی اس ملک سے خاص نہیں ہے۔ یہ تصادم ہر ملک میں باضمیر لوگوں کے لیے' سوچنے والوں کے لیے اور گہرا احساس رکھنے والوں کے لیے جنم لیتا رہتا ہے۔ حال ہی میں برطانیہ میں' جو سلطنت کا اعلیٰ نمونہ ہے' ارل برٹرینڈ رسل کو' جو مغربی دنیا کے غالباً سب سے محترم فلسفی ہیں' اسی قسم کی سرگرمیوں کا مجرم ٹھہرا کر سزا سنائی گئی جن کی بنا پر آج میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں...... یہ قانون کے مقابلے میں اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے کی سزا تھی' یہ اپنی حکومت کی اپنائی ہوئی ایٹمی ہتھیاروں کی پالیسی کے خلاف احتجاج کی سزا تھی۔ وہ قانون کی مخالفت کرنے اور اس کے نتائج بھگتنے سے ہٹ کر کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ نہ میں ایسا کر سکتا ہوں اور نہ اس ملک میں بہت سے افریقی کر سکتے ہیں۔ وہ قانون جس طرح لاگو کیا جاتا ہے' وہ قانون جس طرح تاریخ کے طویل عرصے میں ارتقاء پا چکا ہے اور خصوصاً وہ قانون جس طرح نیشنلسٹ حکومت نے لکھا اور وضع کیا ہے' ایک ایسا قانون ہے جو ہمارے نقطۂ نظر سے غیر اخلاقی' نا منصفانہ اور ناقابل برداشت ہے۔ ہمارے ضمیر فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ ہمیں اس کے خلاف احتجاج کرنا چاہیے' ہمیں اس کی مخالفت کرنی چاہیے اور ہمیں اسے تبدیل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے...... میرے خیال میں لوگ یہ نہیں کر سکتے کہ کچھ نہ کریں' کچھ نہ کہیں' ناانصافی کے خلاف ردعمل

ظاہر نہ کریں'ظلم وتشدد کے خلاف احتجاج نہ کریں اور اچھے معاشرے اور اچھی زندگی کے لیے اس طرح جدوجہد نہ کریں جس طرح کہ وہ اسے دیکھتے ہیں۔''

میں نے ان ان گنت اوقات کا تفصیل سے ذکر کیا جن میں حکومت نے میرے زندگی' میرے پیشے اور میری سیاسی سرگرمیوں کو پابندیاں اور بندشیں لگا کر اور مقدمے چلا کر روکنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے مزید کہا:

''مجھے قانون کے ذریعے مجرم بنا دیا گیا' میرے کام کی وجہ سے نہیں بلکہ میں جن مقاصد کا علمبردار تھا ان کی وجہ سے' میرے افکار کی وجہ سے اور میرے ضمیر کی وجہ سے ۔کیا یہ بات کسی کے لیے باعث حیرت ہو سکتی ہے کہ ایسا انسان جسے حکومت نے بھگوڑا بنا دیا ہو' اسے ہمیشہ ایک بھگوڑے کی زندگی بسر کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے جیسا کہ میں نے مہینوں اس طرح کی زندگی گزاری ہے اور اس عدالت کے سامنے اس نوعیت کی گواہیاں بھی پیش ہوئی ہیں؟

''گزرے زمانے کے دوران میرے لیے اپنی بیوی بچوں سے جدا ہونا اور پرانے اچھے دنوں کو خدا حافظ کہنا آسان نہیں تھا جب دفتر میں دن بھر کے صبر آزما کام کے اختتام پر میں کھانے کی میز پر اپنے خاندان سے جا ملنے کا منتظر ہوتا تھا مگر اس کے بجائے مجھے ایک ایسے شخص کی زندگی اختیار کرنی پڑی جس کا پولیس مسلسل پیچھا کر رہی تھی اور مجھے اپنے ملک میں اپنے اعزہ واقارب سے جدا رہنا پڑا جبکہ مخبری اور گرفتاری کے خطرات مسلسل لاحق تھے۔ یہ زندگی قید کی سزا بھگتنے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل تھی۔کوئی آدمی جو اپنے ہوش وحواس میں ہو' ایک نارمل' خانگی اور معاشرتی زندگی پر' جو ہر مہذب معاشرے میں موجود ہوتی ہے' رضا کارانہ طور پر ایسی بھگوڑے پن کی زندگی کو ترجیح نہیں دے گا۔

''لیکن ایک ایسا وقت آتا ہے جیسا کہ میری زندگی میں آیا جب ایک آدمی کو نارمل زندگی گزارنے کا حق دینے سے انکار کر دیا جاتا ہے جب وہ صرف ایک بھگوڑے کی

زندگی گزار سکتا ہے کیونکہ حکومت نے ایسا حکم صادر کیا ہوتا ہے کہ وہ اس پر بھگوڑے پن کی حالت مسلط کرنے کے لیے قانون استعمال کرے گی۔ مجھے اس صورت حال میں دھکیل دیا گیا تھا۔ چنانچہ مجھے ایسے فیصلے کرنے پر کوئی افسوس نہیں جو میں نے کیے ہیں۔ اس ملک میں دوسرے لوگ بھی اسی طرح کے حالات میں دھکیل دیئے جائیں گے۔ اور وہ بھی پولیس کے مظالم اور حکومت کے انتظامی اقدامات کے نتیجے میں میرا راستہ اپنانے پر مجبور ہوں گے اور اس کا مجھے یقین ہے۔''

میں نے یاد دلایا کہ کتنی ہی بار ہم نے اپنی مشکلات حکومت کے سامنے رکھیں اور ہر بار حکومت نے ہمیں نظر انداز کیا یا بالائے طاق رکھا۔ میں نے 1961ء کی ''سٹے اوے (Stay away) تحریک کا ذکر کیا جو اس وقت آخری حربے کے طور پر چلائی گئی جب حکومت نے ہم سے گفت وشنید کرنے یا ہمارے مطالبات تسلیم کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ حکومت ہی تھی جس نے ہمارے عدم تشدد پر مبنی مطالبات کے مقابلے میں تشدد اختیار کر کے تشدد کو ہوا دی۔ میں نے بتایا کہ حکومت کے ان اقدامات کے باعث ہی ہم نے زیادہ جنگ جویانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ میں نے کہا کہ مجھے اپنی پوری سیاسی زندگی میں ان ساتھیوں کے شانہ بشانہ لڑنے کا امتیاز حاصل ہوا جن کی صلاحیتیں اور قربانیاں مجھ سے کہیں زیادہ تھیں۔ بہت سے اور لوگوں نے مجھ سے پہلے اپنے نظریات کی قیمت ادا کی تھی اور میرے بعد کئی اور ایسا کریں گے۔

حجت

سزا سنائے جانے سے پہلے میں نے عدالت کو آگاہ کیا کہ حکومت مجھے جو بھی سزا دے اس سے جدوجہد آزادی کے ساتھ میرے اخلاص میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ میں نے کہا: ''جناب والا! میں نہیں سمجھتا کہ یہ عدالت مجھ پر ان جرائم کی

تعزیریں لاگو کرتے ہوئے جن کام میں مجرم ٹھہرایا گیا ہوں اس خیال سے متاثر ہو گی کہ تعزیرات انسانوں کو اس راستے پر چلنے سے روک دیں گی جسے وہ درست سمجھتے ہوں...... تاریخ بتاتی ہے کہ تعزیرات اس وقت انسانوں کو نہیں روکتیں جب ان کا ضمیر بیدار ہو جائے نہ وہ میری قوم اور ساتھیوں کو روکیں گی جن کے ساتھ یا ان سے پہلے میں نے کام کیا۔

''میں اپنی سیاسی سرگرمیوں کی ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں اگرچہ میں جانتا ہوں کہ اس ملک کی جیلوں میں ایک افریقی کی زندگی کس قدر تلخ اور مایوس کن ہے۔ میں ان جیلوں میں رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ جیل کی دیواروں کے پیچھے بھی افریقیوں کے خلاف نسلی امتیاز بھی کتنی شدت ہے' تاہم یہ تجربات مجھے اس راستے سے نہیں ہٹا سکتے جو میں نے اختیار کیا ہے نہ وہ میرے جیسے دوسرے لوگوں کو ہٹا سکیں گے کیونکہ انسانوں کے نزدیک ان کے اپنے ملک میں آزادی ان کی آرزوؤں کی معراج ہے' لہذ انظریاتی آدمیوں کو اس راستے سے کوئی شے نہیں ہٹا سکتی۔ جیل کے اندر مجھے جن خوفناک حالات کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے ان کے حوالے سے میرے خوف سے کہیں زیادہ طاقتور ان خوفناک حالات سے میری نفرت ہے جن کا نشانہ ملک بھر میں جیلوں سے باہر میری قوم کے لوگ بن رہے ہیں۔

''جناب والا! آپ ان جرائم کی جو بھی سزا مجھے دینا چاہیں جن کا اس عدالت میں مجھے مجرم ٹھہرایا گیا ہے مگر آپ یقین رکھئے کہ جب میری سزا مکمل ہو گی میں اس وقت بھی اپنی قوم کے اجتماعی ضمیر سے متاثر ہوں گا جیسا کہ انسان ہمیشہ متاثر ہوتے ہیں' میں اس وقت بھی اپنے قوم سے روا رکھے جانے والے نسلی امتیاز سے اپنی نفرت سے متاثر ہوں گا۔ جب میں اپنی سزا پوری کر کے باہر آؤں گا تو دوبارہ ان ناانصافیوں کے خاتمے کے لیے قومی جدوجہد میں شامل ہو جاؤں گا جب تک وہ ناانصافیوں ہمیشہ کے لیے ختم نہیں ہو جاتیں۔

''میں نے اپنی قوم اور جنوبی افریقہ کی طرف سے عائد ہونے والا اپنا فرض ادا کیا ہے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے بعد آنے والے یہ اعلان کریں گے کہ میں بے گناہ تھا اور یہ کہ جن مجرموں کو اس عدالت میں پیش کرنا چاہیے تھا وہ ارکان حکومت تھے۔''

سزا سنادی گئی

جب میں تقریر ختم کر چکا تو مجسٹریٹ نے سزا پر غور کرنے کے لیے دس منٹ کے وقفے کا حکم دیا۔ میں نے کمرۂ عدالت سے نکلنے سے پہلے مڑ کر ہجوم کی طرف دیکھا۔ مجھے جو سزا ملنے والی تھی اس کے بارے میں میرے ذہن میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ کمرۂ عدالت میں جو سخت تناؤ کی حال میں تھا' ٹھیک دس منٹ بعد مجسٹریٹ نے سزا کا اعلان کیا۔ لوگوں کو ہڑتال پر اکسانے کی سزا تین سال اور پاسپورٹ کے بغیر ملک سے باہر جانے کی سزا دو سال' کل سزا پانچ سال اور اس میں پیرول پر رہائی کا کوئی امکان نہیں ۔ یہ ایک سخت سزا تھی' چنانچہ حاضرین میں آہ وزاری کا شور اٹھا۔ جب عدالت برخاست ہوئی تو میں گیلری کی طرف مڑا اور تین بار آماندلا کا نعرہ لگاتے ہوئے بند مٹھی لہرائی ۔تب مجمع نے اپنے طور پر ہمارا خوبصورت ترانہ ''انکوسی سکے لیل ایا فریقہ!'' گانا شروع کر دیا۔ لوگ گا اور ناچ رہے تھے اور جب مجھے لے جایا گیا تو عورتیں الو کی سی آواز نکال رہی تھیں۔ گیلری میں گونجنے والے ایک لمحے کے لیے بھلا دیا کہ میں وہ سزا بھگتنے کے لیے جیل جا رہا ہوں جو ایک سیاسی جرم کے ارتکاب پر جنوبی افریقہ میں اب تک لاگو ہونے والی سخت ترین سزا ہے۔

سیڑھیوں کے نیچے مجھے اجازت دی گئی کہ میں ونی کو خدا حافظ کہوں اور اس موقع پر وہ بالکل غمزدہ نہیں تھی۔ اس کا حوصلہ بلند تھا اور اس نے کوئی آنسو نہ بہائے۔ وہ پر اعتماد نظر آتی تھی اور اتنی ہی تحریک آزادی کی ساتھی لگتی تھی جتنی کہ وہ ایک بیوی......

وہ مجھ سے ہم آغوش ہوتے وقت بھی پرعزم رہی۔ جب مجھے پولیس وین میں لے جایا جارہا تھا تو باہر لوگ ابھی تک گاتے سنائی دے رہے تھے ''انکوسی سکے لیل ایا فریقہ!''

جیل نہ صرف آپ سے آپ کی آزادگی چھین لیتی ہے بلکہ وہ آپ کا تشخص چھیننے کی بھی کوشش کرتی ہے۔ جیل میں ہر کوئی ایک وردی پہنتا ہے ایک ہی خوراک کھاتا ہے اور ایک ہی شیڈول پر عمل کرتا ہے۔ تعریف کے لحاظ سے یہ ایک خالص ہمہ اختیار مملکت ہوتی ہے جو آزادی یا انفرادیت کو برداشت نہیں کرتی۔ ایک مجاہد آزادی اور ایک انسان کی حیثیت سے آدمی کو جیل کی اس کوشش کے خلاف لڑنا ہوتا ہے جو وہ اسے ان صفات سے محروم کرنے کے لیے بھی روا رکھتی ہے۔

کے مسکن میں

کمرہ عدالت سے مجھے سیدھا پریٹوریا لوکل جیل میں لے جایا گیا جو ایک سرخ اینٹوں کا افسردہ سا بھوتوں کا مسکن تھا جسے میں خوب جانتا تھا۔ لیکن اب میں ایک سزا یافتہ قیدی تھا' مقدمے کا منتظر قیدی نہیں' چنانچہ اب مجھ سے احترام کا وہ معمولی برتاؤ بھی نہیں کیا گیا جو مقدمے کے منتظر قیدی سے روا رکھا جاتا ہے۔ میرے اپنے کپڑے اتروا لیے گئے اور کرنل جیکبز نے آخر کار میرا ''کیراس'' ضبط کرلیا۔ اب مجھے افریقیوں کے لیے مخصوص جیل کی دھاری دار وردی جاری کی گئی۔ یہ ایک چھوٹے پاجامے' ایک کھردری خاکی قمیض' کینوس کی ایک جیکٹ' جرابوں' چپل اور کپڑے کی ایک ٹوپی پر مشتمل تھی۔ چھوٹا پاجامہ صرف افریقیوں کو دیا جاتا کیونکہ حکام افریقی مردوں کو صرف ''لڑکے'' خیال کرتے تھے۔

میں نے حکام کو اطلاع دی کہ میں کسی طرح بھی چھوٹا پاجامہ نہیں پہنوں گا اور اس سلسلے میں احتجاج کے لیے عدالت میں جانے کو بھی تیار ہوں۔ بعد میں جب مجھے

رات کا کھانا دیا گیا جس میں سخت ٹھنڈا دلیہ تھا اور ساتھ نصف چمچ چینی تھی تو میں نے اسے کھانے سے انکار کر دیا۔ کرنل جیکبز نے اس پر غور کیا اور اس کا ایک حل نکالا۔ حیل یہ تھا کہ میں لمبا پاجامہ پہن سکتا تھا اور اپنا کھانا کھا سکتا تھا اگر میں تنہا کوٹھڑی میں رہنے پر رضامند ہوتا۔ کرنل نے کہا: ''ہم تمہیں دوسرے سیاسی قیدیوں کے ساتھ ٹھہرا رہے تھے لیکن اب تم تنہا رہو گے۔ مجھے امید ہے تم اس سے لطف اندوز ہو گے۔'' میں نے اسے یقین دلایا کہ جب تک مجھے اپنی پسند کا پہننے اور کھانے کی اجازت ہے اس وقت تک تنہائی کی قید میرے لیے اچھی ہو گی۔

بیگوں سے گفتگو

اگلے چند ہفتوں کے لیے میں مکمل طور پر تنہا رہا۔ میں نے کسی دوسرے قیدی کا چہرہ دیکھا نہ کسی کی آواز سنی۔ مجھے دن کے تئیس گھنٹے کوٹھڑی میں بند رکھا جاتا۔ صرف تیس منٹ صبح اور تیس منٹ سہ پہر کو ورزش کروائی جاتی۔ میں اس سے پہلے کبھی تنہائی میں نہیں رہا تھا اور ہر گھنٹہ مجھے ایک سال لگتا تھا۔ میری کوٹھڑی میں کوئی قدرتی روشنی نہ تھی اور میں اکثر سوچتا کہ آدھی رات ہو گئی ہے' حالانکہ اس وقت پچھلا سہ پہر کا وقت ہوتا تھا۔ میرے پاس پڑھنے یا لکھنے کو کچھ نہ تھا اور نہ کوئی مجھ سے بات کرنے والا تھا۔ ان حالات میں دماغ اپنے آپ گھومنے لگتا ہے اور آدمی مایوسی میں چاہتا ہے کہ اس کی اپنی ذات سے باہر کوئی چیز ہو جس پر وہ اپنی توجہ مرکوز کر سکے۔ میں ایسے آدمیوں کو جانتا ہوں جنہوں نے تنہا کوٹھڑی میں بند ہونے پر نصف درجن کوڑے کھانے کو ترجیح دی۔ تنہائی میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد میں اپنی کوٹھڑی میں کیڑے مکوڑوں کی صحبت بھی پسند کرنے لگا اور لال بیگوں سے گفتگو شروع کرنے پر اتر آیا۔

میرے احاطے میں ایک درمیانی عمر کا افریقی وارڈر تھا جو کبھی کبھار مجھے نظر آ جاتا

تھا۔ ایک دن میں نے اسے رشوت میں ایک سبب پیش کرنے کی کوشش کی تا کہ وہ مجھ سے بات چیت کرے۔ میں نے کہا! ''بابا! کیا میں آپ کو ایک سیب پیش کر سکتا ہوں؟'' وہ مڑ کر چلا گیا اور میری بعد کی کوششوں کا جواب بھی اس نے خاموشی کی شکل میں دیا۔ آخر میں اس نے کہا: ''بھلے مانس! تم لمبا پاجامہ اور بہتر خوراک چاہتے تھے' اب یہ دونوں چیزیں تمہیں مل رہی ہیں' پھر بھی تم خوش نہیں ہو۔'' وہ ٹھیک کہتا تھا۔ انسان صحبت کی غیر موجودگی سے زیادہ کوئی چیز انسان کی روح کو کچلنے والی نہیں۔ چند ہفتے بعد میں نے اپنا وقار بالائے طاق رکھ کر کرنل جیکبز کو بتایا کہ میں انسانی صحبت کے عوض لمبے پاجامے سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔

لوکل جیل میں

ان ہفتوں کے دوران میرے پاس اپنی قسمت پر غور کرنے کے لیے کافی وقت تھا۔ میں سوچتا تھا کہ ایک مجاہد آزادی کی جگہ اس کی قوم میں ہے جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں۔ میں نے حال ہی میں افریقہ میں گھوم پھر کر جو معلومات حاصل کی تھیں اور جو رابطے استوار کیے تھے وہ جدوجہد آزادی میں استعمال ہونے کے بجائے بے مصرف ہو رہے تھے۔ مجھے اس حقیقت پر بڑا غصہ آیا کہ میرے تجربات آزادی کی فوج تشکیل دینے میں استعمال نہیں ہوں گے۔

جلد ہی میں اپنے حالات کے خلاف شدید احتجاج کرنے لگا اور میں نے طالبہ کیا کہ مجھے پریٹوریا لوکل جیل میں دوسرے سیاسی قیدیوں کے ساتھ رکھا جائے۔ ان میں رابرٹ سوبکوی بھی تھے۔ آخر کار میری درخواست قبول کر لی گئیں لیکن ساتھ ہی کرنل جیکبز کی طرف سے یہ سخت وارننگ بھی ملی کہ اگر میں نے بے تمیز طور پر طریقے پھر اختیار کیے تو اسکے سنگین نتائج بھگتنا ہوں گے۔ میرے خیال میں میں نے کبھی یہ تصور نہیں کیا تھا کہ اپنی زندگی میں اس قدر ٹھنڈا مکئی کا دلیا کھانا پڑے گا۔

انسانی صحبت سے قطع نظر میں سوبکوی اور دوسرے لوگوں سے بات چیت کرنے کا مشتاق تھا جن میں سے اکثر پی اے سی سے تعلق رکھتے تھے کیونکہ میرا خیال تھا کہ جیل میں ہم ایک اتحاد قائم کر سکتے ہیں جو باہر رہ کر قائم نہیں کر سکتے تھے۔ جیل کے حالات ایک طرح سے نزاعی امور کو دبا دیتے ہیں اور افراد کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ اختلافات سے زیادہ اتفاقات کو پیش نظر رکھنے لگتے ہیں۔

پریٹوریا لوکل میں جب مجھے دوسرے قیدیوں کے ساتھ صحن میں لے جایا گیا تو ہم نے گرمجوشی سے ایک دوسرے کو سلام کیا۔ رابرٹ سوبکوی کے علاوہ وہاں جان گیٹ سیوی تھے جو ساؤتھ افریقین کانگریس آف ٹریڈ یونینز کے رکن تھے۔ آرون مولیٹی جو اے این سی کے ممبر اور نیو ایج کے لیے کام کرتے تھے اور سٹیفن تیفو بھی تھے جو ایک سرکردہ کمیونسٹ مزدور کمیونسٹ مزدور لیڈر اور پی اے سی کے ممبر تھے۔ رابرٹ نے مجھ سے کہا کہ میں انہیں افریقی دورے کی تفصیلات سناؤں جو میں نے خوشی سے بیان کیں۔ میں نے کسی لاگ لپیٹ کے بغیر بتایا کہ باقی افریقہ میں پی اے سی او اے این سی کے بارے میں وہاں کے لوگوں کا تصور کیا ہے۔ اپنے بیان کے آخر میں میں نے کہا کہ کچھ امور ایسے ہیں جن کے بارے میں میری خواہش ہے کہ ہم ان کا جائزہ لیں۔ لیکن حکام جنہوں نے شروع میں ہم دونوں کو قربت مہیا کی تھی انہوں نے ہمیں الگ الگ کر دیا۔ ہم ایک راہداری میں سنگل کوٹھڑیوں میں رہتے تھے جو راہداری کے مخالف سروں پر واقع تھیں۔

کبھی کبھار اس وقت ہمیں بات چیت کرنے کا موقع مل جاتا جب ہم جیل کے صحن میں زمین پر پاس پاس بیٹھ کر بے ڈھنگے پرانے ڈاک کے تھیلوں کو سلائی کرتے اور ان کی مرمت کرتے تھے۔ میں ہمیشہ سے سوبکوی کا احترام کرتا تھا اور میں نے اسے ایک متوازن اور معقول آدمی پایا۔ لیکن ہمیں پیش نظر معاملے یعنی جیل کے حالات کے بارے میں ایک دوسرے سے خاصا اختلاف تھا۔ سوبکوی کا خیال تھا کہ جیل کے

ابتر حالات پر احتجاج کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم مملکت کے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہمیں جیل میں ڈال سکتی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ توہین آمیز حالات میں رہنا ہمیشہ نا قابل قبول رہا ہے اور یہ کہ پوری تاریخ میں سیاسی قیدیوں نے ان حالات میں کو بہتر بنانے کے لیے لڑنا اپنا فرض کیا ہے۔ سوبکوی نے جواب دیا کہ جیل کے حالات اس وقت تک تبدیل نہیں ہوں گے جب تک ملک میں تبدیلی نہیں آتی۔ مجھے اس سے کامل اتفاق تھا لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ ایک ایسے ملک میں ہم جدوجہد کرنے سے کیونکر رک سکتے ہیں جس میں ہم اس وقت لڑ سکتے ہیں۔ ہم یہ مسئلہ کبھی حل نہ کر پائے لیکن ہم نے اس کی طرف کچھ پیش قدمی کرتے ہوئے کمانڈنگ آفسر کو ایک مشترکہ خط بھیجا جس میں جیل کے حالات کے بارے میں اپنی شکایات درج کی تھیں۔

سوبکوی نے جیل میں کبھی کمزوری نہیں دکھائی تھی۔ لیکن پریٹوریا میں وہ قدرے حساس اور چڑچڑا ہو گیا تھا اور اس کا ذمہ دار سٹیفن تیفو تھا۔ تیفو' سوبکوی کے لیے سوہان روح بن گیا تھا۔ وہ اسے چھیڑتا' برا بھلا کہتا اور چیلنج کرتا۔ بہترین اوقات میں بھی تیفو ایک مشکل ساتھی ثابت ہوتا۔ وہ بدہضمی کا شکار رہتا' حجت بازی کرتا اور حکم چلاتا۔ وہ گرہ دار اور صاحب علم بھی تھا اور روسی تاریخ کا ماہر تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک جنگ جو تھا جو ہر کسی سے لڑتا رہتا حتیٰ کہ اپنے دوستوں سے بھی۔ تیفو اور سوبکوی ہر روز جھگڑتے تھے۔

آزادی...... 1963ء میں''

مجھے سوبکوی سے پالیسی امور پر بات چیت کرنے کا اشتیاق تھا اور ایک معاملہ جس پر میں نے اس سے گفتگو کی وہ پی اے سی کا نعرہ ''آزادی 1963ء میں'' تھا۔ میں نے سوبکوی سے کہا: ''اس سے زیادہ خطرناک بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ لیڈر ایک ایسا

مطالبہ کرے جس کے متعلق وہ جانتا ہو کہ پورا نہیں ہو سکتا۔ اس سے لوگوں میں جھوٹی توقعات پیدا ہوتی ہیں۔''

میں نے یہ بات انتہائی احترام کے ساتھ کہی تیفو بیچ میں کود پڑا اور سوبکوی کو لتاڑنے لگا۔ اس نے کہا: ''بوب! تمہارا منڈیلا سے ٹھیک واسطہ پڑا ہے۔ تم جانتے ہو وہ صحیح کہتا ہے۔'' تیفو اپنی رو میں کہتا گیا حتیٰ کہ سوبکوی کے لیے معاملہ ناقابل برداشت ہو گیا اور اسے کہنا پڑا: ''مجھے تنہا چھوڑ دو۔'' لیکن تیفو نہ رکا۔ وہ کہتا چلا گیا: ''بوب! لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ تمہیں مار دیں گے کیونکہ تم نے انہیں دھوکا دیا ہے۔ بوب! تم ابھی نابالغ ہو......تم ایک حقیقی سیاستدان نہیں ہو......''

تیفو مجھے بھی زچ کرنے کی پوری پوری کوشش کرتا۔ ہر صبح جب وارڈر ہمارے احاطے میں پہنچتے وہ ان سے خوراک' صفائی' گرمی یا سردی جیسی کو شکایت کرتا۔ ایک دن ایک افسر نے اسے کہا: ''دیکھو' تم ہر صبح شکایت کیوں کرتے ہو؟''

''میں شکایت کرتا ہوں کیونکہ ہر میری ذمہ داری ہے کہ میں شکایت کروں۔'' سٹیفن نے کہا۔

''منڈیلا کی طرف دیکھو' وہ تو ہر روز شکایت نہیں کرتا۔'' افسر نیکہا۔

''آہا'' تیفو نے نفرت سے کہا۔ ''منڈیلا ایک چھوکرا جو سفید آدمی سے ڈرتا ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے۔ ایک صبح میں جاگا تو ہر اخبار میں چھپا تھا...... منڈیلا' منڈیلا' منڈیلا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ منڈیلا کون ہے۔ اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ منڈیلا کون ہے۔ وہ ایک چھوکرا ہے جسے تم لوگوں نے کسی مقصد کے لیے تیار کیا ہے جو میں نہیں سمجھتا۔ یہ ہے منڈیلا کا تعارف!''

دو ہفتے بعد والٹر میسولو ہم سے آملا جس پر اس وقت جوہانسبرگ میں لوگوں کو ہڑتال پر اکسانے کے جرم میں مقدمہ چل رہا تھا جب میں پریٹوریا میں تھا۔ اسے چھ سال کی سزا ملی تھی۔ ہمیں جیل میں بات کرنے کے کوئی ایک مواقع مل جاتے تھے'

چنانچہ ہم نے والٹر کی ضمانت کی درخواست بات چیت کی جبکہ اس کی اپیل التواء میں تھی اور اس اقدام کی میں نے زور و شور سے حمایت کی تھی۔ دو ہفتے بعد اسے ضمانت پر رہا کر دیا گیا اور تحریک نے اسے ہدایت کی کہ وہ زیر زمین چلا جائے جہاں سے اسے تحریک آزادی کی قیادت کرنا تھی اور یہ کام اس نے بخوبی کیا۔

نانا سیتا کا دیدار

والٹر کے جانے کے کچھ عرصہ بعد ایک روز میں سوبکوی کے ساتھ جیل ہسپتال کی طرف جا رہا تھا جب صحن میں پچیس گز دور مجھے نانا سیتا نظر آیا۔ سیتا ایک سر کردہ ہندوستانی مہم باز تھا جس نے 1952ء میں بوکس برگ میں ہمارے ''خلاف ورزی مہم'' کی قیادت کی تھی اور اسے پریٹوریا کے ایک مجسٹریٹ نے اپنا مکان خالی کرنے سے انکار پر سزا سنائی تھی۔ اس مکان میں وہ چالیس سال سے زیادہ عرصے سے رہ رہا تھا لیکن یہ اس زمین پر واقع تھا جسے گروپ ایریاز ایکٹ کی رو سے ''سفید'' قرار دے دیا گیا تھا۔ وہ کبڑا ہو گیا تھا اور یہ دیکھ کر کہ وہ شدید جوڑوں کے درد کے باوجود ننگے پاؤں ہے مجھے اپنی چپلوں میں بے آرامی محسوس ہوئی۔ میں اس کے پاس جا کر اسے سلام کرنا چاہتا تھا لیکن نصف درجن وارڈروں کی نگرانی میں چلتے ہوئے ہم مجبور تھے۔

اچانک اور بغیر کسی پیشگی علامت کے چلتے چلتے میں گر پڑا۔ میں کنکریٹ کے فٹ پاتھ سے ٹکرایا اور میری بائیں آنکھ پر ایک گہرا زخم آ گیا جس پر تین ٹانکے لگے۔ اس سے پہلے فورٹ میں میرا ہائی بلڈ پریشر تشخیص ہوا تھا اور مجھے بعض گولیاں دی گئی تھیں۔ بظاہر میری نقاہت کا سبب یہ تھا کہ میں نے ان گولیوں کی زیادہ خوراک لے لی تھی۔ وہ گولیاں مجھ سے لے لی گئیں اور مجھے کم نمک والی خوراک دی جانے لگی تو اس سے میرا مسئلہ حل ہو گیا۔

اس سہ پہر کو سزایاب ہونے کے بعد سے ونی سے میری پہلی ملاقات طے تھی۔ ٹا کے لگتے یا نہ لگتے میں اس ملاقات سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو اسے بڑی تشویش ہوئی۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں ٹھیک ہوں اور تفصیل سے بتایا کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس کے باوجود افواہیں گردش کرنے لگیں کہ میری صحت گر گئی ہے۔

اکتوبر 1962ء میں میرے مقدمے کے دوران اے این سی نے اپنی سالانہ کانفرنس منعقد کی جو 1959ء کے بعد سے ایسی پہلی کانفرنس تھی۔ چونکہ ہماری پارٹی اب غیر قانونی تھی کانفرنس عین سرحد پار بیچوانا لینڈ میں لوباٹسے میں منعقد ہوئی۔ یہ کانفرنس ایک سنگ میل ثابت ہوئی کیونکہ اس نے اے این سی اور ''ایم کے'' کو مبینہ طور پر مربوط کر دیا۔ اگر چہ نیشنل ایگزیکٹو نے کہا: ''ہم اب بھی عوامی سیاسی عمل پر زور دیتے ہیں۔'' مگر امخونتو کو ''ہماری تحریک آزادی کا عسکری بازو'' کہا گیا 'یہ اختلاف اس لیے رکھا گیا کہ دہشت گردی کے زیادہ غیر ذمہ دارانہ افعال کو دبایا جائے جن کا ارتکاب ان دنوں پوقو والے کر رہے تھے۔ ژہوسا زبان میں ''قوپو'' کا مطلب ہے ''آزاد'' یا ''الگ تھلگ'' اور یہ تنظیم پی اے سی کے ساتھ ڈھیلا سا تعلق رکھتی تھی اور ان کی دہشت گردی کا نشانہ گورے اور ان کے افریقی ساتھی دونوں بنتے تھے۔ اے این سی چاہتی تھی کہ عوام اس کی نئی عسکریت پسندی دیکھ لیں مگر وہ انہیں یہ بھی دکھانا چاہتی تھی کہ وہ کنٹرول میں اور ایک ذمہ دار تنظیم ہے۔

''خود اختیار ہوم لینڈ''

حکومت نے فیصلہ کیا تھا کہ 'جداگانہ ترقی'' کے پروگرام کو تیز کر کے دنیا پر یہ ظاہر کیا جائے کہ نسلی امتیاز کی پالیسی میں قوموں کی انفرادی ''آزادی'' کی بھی گنجائش ہے۔ اس کے لیے جو نمونہ چنا گیا وہ تھا۔ جنوری 1962ء میں ورووَرڈ نے اعلان کیا

تھا کہ جنوبی افریقہ ٹرانسکائی کو حکومت خود اختیار دینا چاہتا ہے۔ 1963ء میں ٹرانسکائی ایک ''خود اختیار'' ہوم لینڈ بن گیا۔ نومبر 1963ء میں ٹرانسکائی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات منعقد ہوئے لیکن ایک کے مقابلے میں تین کی اکثریت سے ووٹروں نے ایسے ارکان منتخب کیے جو ہوم لینڈ پالیسی کے مخالف تھے۔

اس کے باوجود بنتوستان سسٹم وجود میں لایا گیا۔ ووٹروں نے اس کی مخالفت کی تھی اور صرف ووٹ دے کر اس میں شرکت کی تھی۔ اگرچہ مجھے بنتوستان سے چڑ تھی مگر میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اے این سی کو اس نظام اور اس میں شامل افراد دونوں کو اپنی پالیسیوں کے لیے ایک پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرنا چاہیے بالخصوص اس لیے کہ ہمارے اتنے سارے لیڈر اب قید و بند یا جلاوطنی کی وجہ سے بے آواز تھے۔ بنتو حکام کے خلاف دہشت گردی بڑھ گئی تھی۔ جوں جوں سبوتاژ کے واقعات بڑھتے گئے حکومت کے حفاظتی اقدامات میں اضافہ ہوتا گیا۔ نیا وزیر انصاف جان ورسٹر جسے خود بھی دوسری جنگ عظیم کے دوران اتحادیوں کے مخالفت کرنے پر نظر بند کیا گیا تھا' وہ انتہائی طور پر جذبات سے عاری انسان تھا۔ اس کے نزدیک دہشت گردی کا بہترین اور واحد جواب آہنی مکا تھا۔

دن نظر بندی قانون

مئی 1963ء میں حکومت نے انخونتو کی ''کمر توڑنے کے لیے'' قانون سازی کی جیسا کہ ورسٹر نے بیان کیا۔ دی جنرل لاء امینڈمنٹ ایکٹ نے جو بجا طور پر ''نوے دن نظر بندی قانون'' مشہور ہوا حبس بیجا کے خلاف درخواست کا حق ساقط کر دیا اور ہر پولیس آفیسر کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ کسی سیاسی جرم کے شبہ میں وارنٹ کے بغیر کسی کو بھی حراست میں لے سکتا ہے...... اور گرفتار شدگان کو مقدمے' الزام' وکیل تک رسائی یا نسلی امتیاز کے خلاف تحفظ کے بغیر نوے دن کی حراست میں رکھا جا سکتا

تھا اور نوے دن تک حراست میں جیسا کہ ورسٹر نے بیان کیا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توسیع کی جا سکتی تھی۔ اس قانون نے ملک کو ایک پولیس سٹیٹ میں تبدیل کر دیا۔'' نوے دن نظر بندی قانون'' نے حکام کو جتنے اختیار دے دیئے ان سے زیادہ کوئی آمر حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے نتیجے میں پولیس زیادہ وحشی ہو گئی' قیدی آئے دن پیٹے جانے لگے اور جلد ہی ہم نے برقی جھٹکوں' گلا گھونٹنے اور تشدد کی دوسری اقسام کی خبریں سنیں۔ پارلیمنٹ میں ہیلن سوزمن نے لبرل پروگریسو پارٹی کی نمائندگی کرتے ہوئے اس ایکٹ کے خلاف واحد ووٹ ڈالا۔

اس قانون کے تحت غیر قانونی تنظیموں کی رکنیت اختیار کرنے پر سزا بڑھا دی گئی۔ کمیونزم یا دوسری ممنوعہ تنظیموں کے ''مقاصد کو آگے بڑھانے'' پر پانچ سال کی سزا کو سزائے موت میں بدل دیا گیا۔ سیاسی قیدیوں کو دوبارہ حراست میں لیا جانے لگا' جیسا کہ مجھے مئی 1963ء میں پتہ چلا جب سوبکوی کی تین سالہ سزا ختم ہوئی تو اسے رہا کرنے کے بجائے حکومت نے اس پر الزام لگائے بغیر بس دوبارہ حراست میں لے لیا اور پھر اسے روبن آئی لینڈ بھیج دیا گیا۔

ورسٹر نے جون 1962ء کا سبوتاژ ایکٹ وضع کرنے کا اعزاز بھی حاصل کیا جو خانہ گرفتاریوں اور زیادہ سخت نظر بندی کی اجازت دیتا تھا جسے عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح شہری آزادیاں اس حد تک حدود کر دی گئیں جو انتہائی فاشٹ آمریتوں کا وتیرہ تھا۔ سبوتاژ کی اب کم از کم سزا پانچ سال تھی جس میں پیرول پر رہائی کی کوئی گنجائش نہ تھی اور زیادہ سے زیادہ سزائے موت تھی۔ چونکہ ایکٹ کے الفاظ میں بہت وسعت تھی' مداخلت بے جا یا غیر قانونی طور پر ہتھیار قبضے میں رکھنے جیسی سرگرمیوں کو بھی سبوتاژ قرار دیا جا سکتا تھا۔ پارلیمنٹ کا ایک اور ایکٹ ایک نظر بند شخص کی طرف سے دیئے گئے بیان کی اشاعت کو ممنوع قرار دیتا تھا۔ میں نے جو کچھ کہا یا کبھی کہا تھا اس میں سے کوئی بات اخبارات میں شائع نہیں کی جا سکتی تھی۔

نیوا تیج کو 1962ء کے آخر میں بند کر دیا گیا اور ممنوعہ مطبوعہ مواد قبضے میں رکھنا جرم قرار پایا جس کی سزا دو سال کی جیل تھی۔ خانہ گرفتاری (House Arrest) کا بھی اہتمام کیا گیا تھا اور اس کا معروف استعمال سفید فام سرگرم سیاسی کارکن ہیلن جوزف پر کیا گیا۔

کے قید خانے میں

مئی کی آخری تاریخوں کی ایک رات تھی' ایک وارڈر میری کوٹھڑی کی طرف آیا اور اس نے مجھے اپنا سامان پیک کرنے کا حکم دیا۔ میں نے پوچھا کیوں؟ لیکن اس نے جواب نہ دیا۔ دس منٹ کے اندر اندر مجھے نیچے استقبالیہ دفتر میں لے جایا گیا جہاں تین اور سیاسی قیدی بھی تھے۔ تیفو' جاں گیٹ سیوی اور آرون مولیٹی۔ کرنل آئیمپ نے رکھائی سے ہمیں اطلاع دی کہ ہمارا تبادلہ کیا جا رہا ہے۔ ''کہاں؟'' تیفو نے پوچھا۔ ''ایک ایسی جگہ جو بہت خوبصورت ہے۔'' آئیمپ نے کہا۔ ''کہاں؟'' تیفو پھر بولا۔ ''ڈائی آئی لانڈ'' (جزیرہ) آئیمپ نے جواب دیا۔ اور جزیرہ ایک ہی تھا ......روبن آئی لینڈ!

ہم چاروں کو اکٹھی بیڑیاں لگا دی گئیں اور ایک بے کھڑکی کی وین میں بیٹھا دیا گیا جس میں صرف ایک رفع حاجت کا ڈول (Sanitary Busket) تھا۔ ہم رات بھر سفر کرتے رہے اور اگلی سہ پہر کو کیپ ٹاؤن کی گودیوں میں پہنچے۔ بیڑیوں میں اکٹھے بندھے آدمیوں کے لیے متحرک وین میں رفع حاجت کے ایک ہی ڈول کو فراغت کے لیے استعمال کرنا کوئی آسان یا خوشگوار کام نہیں۔

کیپ ٹاؤن کی گودیاں مسلم پولیس اور گھبرائے ہوئے اور سفید کپڑوں میں ملبوس افسروں سے بھری پڑی تھیں۔ ہمیں بیڑیوں سمیت ایک پرانی چوبی فیری کے تہہ خانے میں کھڑے رہنا پڑا اور یہ ایک مشکل کام تھا کیونکہ جہاز ساحل سے دور

سمندری لہروں پر ہچکولے کھاتا تھا۔ تہہ خانے میں اوپر کی طرف ایک چھوٹے سوراخ میں سے ہی روشنی اور ہوا اندر آتی تھی۔ یہ سوراخ ایک اور کام بھی آتا تھا۔ جیل کے سپاہی اوپر سے ہم پر پیشاب کر کے خوش ہوتے تھے۔ ابھی سورج کی روشنی باقی تھی جب ہمیں عرشے پر لے جایا گیا اور اس وقت ہم نے جزیرے کو پہلی بار دیکھا۔ یہ سرسبز اور خوبصورت جزیرہ ایک جیل سے زیادہ ایک تفریح گاہ لگتا تھا۔

''ایسی کوی تھینی'' (جزیرے پر)..... ژہوسا لوگ سمندری تنگنائے سے ابھرتے چٹانی ٹاپو کو اسی طرح پکارتے تھے جو کیپ ٹاؤن کے ساحل سے اٹھارہ میل دور ہے۔ جب ''آئی لینڈ'' کہا جاتا تو ہر کوئی جانتا تھا کہ یہ کس کا ذکر ہو رہا ہے۔ میں نے اس جزیرے کے بارے میں پہلی بار بچپن میں سنا۔ ژہوسا قوم میں روبن آئی لینڈ مشہور و معروف تھا کیونکہ ان کے ساڑھے چھ فٹ کے کمانڈر ماکانہ کو جس نے چوتھی ژہوسا جنگ میں ژہوسا فوج کی قیادت کی تھی اور 1819ء میں دس ہزار جنگجوؤں کو گراہمز ٹاؤن پر چڑھا لایا تھا اور انگریزوں نے جنگ جیت کر ماکانہ کو روبن آئی لینڈ میں نظر بند کر دیا تھا۔ اس نے کشتی کے ذریعے اس جزیرے سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر اس کے ساحل تک پہنچنے سے پہلے ہی کشتی ڈوب گئی۔ اس مجاہد کی یادیں میری قوم کی زبان میں رچی بسی ہیں جو ''بھولی بسری امید'' کے لیے ''اوکوزا کو کا نکسے لی'' کا جملہ استعمال کرتے ہیں۔

کی آبادی

ماکانہ واحد افریقی ہیرو نہیں تھا جو اس جزیرے پر قید رہا۔ 1958ء میں آٹشو ماؤ کو جسے یورپی مورخ ہیری دی سٹرینڈ لوپر کہتے ہیں' کھوی کھوئی قبیلے اور ڈچوں کے مابین جنگ کے دوران جان فان رائبیک نے یہیں نظر بند کیا تھا۔ مجھے آٹشو ماؤ کی یاد میں سکون محسوس ہوا کیونکہ اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ واحد انسان تھا جو روبن

آئی لینڈ سے فرار ہونے میں کامیاب رہا تھا اور یہ مہم اس نے کیپ ٹاؤن کے ساحل تک ایک چھوٹی کشتی میں سر کی تھی۔

جزیرے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ڈچ زبان میں سیل مچھلی کے لیے لفظ روبن (Ribben) استعمال ہوتا تھا۔ کبھی یہ مچھلیاں بنگویلا کی سرد رو میں بہہ کر بکثرت اس جزیرے کے ساحل پر آلگتی تھیں۔ بعد میں یہ جزیرہ یکے بعد دیگرے کوڑھیوں کی آبادی، پاگلوں کی پناہ گاہ اور ایک بحری اڈے میں تبدیل ہو گیا۔ اب حال ہی میں حکومت نے اسے دوبارہ جیل میں تبدیل کیا تھا۔

موٹے تازے گورے وارڈروں کے ایک گروہ نے ''یہ جزیرہ ہے، تم یہیں مرو گے!'' کے نعروں سے ہمارا استقبال کیا۔ ہمارے سامنے ایک احاطہ تھا جس کے دونوں طرف محافظوں کے لیے کمرے تھے۔ مسلح گارڈ احاطے کے راستے پر دونوں طرف کھڑے تھے۔ فضا نہایت کشیدہ تھی۔ ایک لمبے سرخ چہرے والے سپاہی نے پکار کر ہم سے کہا: ''میں ہوں تمہارا باس!'' وہ بدنام کلائن ہانس بھائیوں میں سے ایک تھا جو قیدیوں پر وحشیانہ ظلم کرنے میں مشہور تھے۔ وارڈر (سپاہی) ہمیشہ افریکان زبان بولتے تھے۔ اگر کوئی قیدی انگریزی میں جواب دیتا تو سپاہی کہتا: ''میں کافروں سے محبت کرنے والوں کی زبان نہیں سمجھتا۔'' (یہ عجب ستم ظریفی تھی کہ ڈچ آبادکار افریقیوں کے عیسائی ہو جانے کے باوجود انہیں کافر کہتے تھے اور انگریزوں کو افریقیوں کے ہمدرد خیال کرتے تھے۔ اسی لیے وہ انگریزی کو کافروں سے محبت کرنے والوں کی زبان کہتے تھے..... (مترجم)

:

نے ہار نہ مانی

جب ہم جیل کی طرف جا رہے تھے تو سپاہی چلائے۔ ''دو دو! دو دو!'' مطلب یہ تھا کہ ہم دو آگے اور دو پیچھے ہو کر چلیں۔ میری جوڑی تیفو کے ساتھ بنی۔ پھر گارڈ چیخنے

لگے: ''ہاک ہاک!'' افریکان زبان میں ''ہاک'' کا مطلب ہے ''آگے بڑھو'' لیکن روایتی طور پر یہ لفظ مویشیوں کے لیے مخصوص ہے۔

اب سپاہی ہم سے مطالبہ کر رہے تھے کہ ہم تیز چلیں لیکن میں نے تیفو کی طرف مڑ کر زیر لب کہا کہ ہمیں ایک مثال قائم کر دینی چاہیے۔ اگر آج ہم نے ہار مان لی تو آئندہ ہم ان کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ تیفو نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہمیں ان پر ظاہر کرنا تھا کہ ہم روزمرہ کے مجرم نہیں ہیں بلکہ سیاسی قیدی ہیں اور ہمارے نظریات کی بنا پر ہمیں سزا دی جا رہی ہے۔ میں نے تیفو کو اشارہ کیا کہ ہم دونوں آگے آگے چلیں، چنانچہ ہم آگے ہو کر چلنے لگے۔ ایک بار جب ہم آگے ہو گئے تو ہم نے اپنی رفتار دھیمی کر لی اور ایسا ہم نے جان بوجھ کر کیا۔ سپاہی ناقابل اعتبار تھے۔ کلائن ہانس کہنے لگا: ''سنو، یہ جوہانسبرگ نہیں ہے، یہ پریٹوریا نہیں ہے، یہ روبن آئی لینڈ ہے اور ہم یہاں کوئی حکم عدولی برداشت نہیں کریں گے...... ہاک! ہاک!'' لیکن ہم نے اپنی باوقار چال جاری رکھی۔ کلائن ہانس نے ہمیں رکنے کا حکم دیا اور پھر ہمارے آگے آن کھڑا ہوا۔ وہ بولا: ''دیکھو آدمی، ہم تمہیں مار دیں گے۔ ہم کوئی احمقانہ بات نہیں کر رہے۔ تمہاری بیویاں اور بچے اور مائیں اور باپ کبھی نہیں جان سکیں گے کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا۔ یہ ہمارا آخری انتباہ ہے...... ہاک! ہاک!''

میں نے جواب میں کہا: ''تم اپنا فرض ادا کر رہے ہو اور ہم اپنا ادا کر رہے ہیں۔'' میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ ہم ہار نہیں مانیں گے، چنانچہ ہم نے ہار نہیں مانی کیونکہ کوٹھڑیوں کے قیدی تو ہم پہلے ہی تھے۔ ہمیں ایک مستطیلی، پتھروں سے بنی عمارت میں لے جایا گیا جہاں ہم ایک بڑے کھلے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے کا فرش چند انچ گہرے پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سپاہی چلائے۔ ''ٹریک اوئٹ! ٹریک اوئٹ!'' (کپڑے اتار دو! کپڑے اتار دو!) جب ہم اس حکم کی تعمیل میں ایک ایک کر کے کپڑے اتارتے تو سپاہی کپڑا پکڑتے، تیزی سے اس کی تلاشی لیتے اور پھر پانی میں

پھینک دیتے۔ ہر ایک کی جیکٹ بھی اتروا کر تلاشی کے بعد پانی میں پھینکی گئی' پھر سپاہیو نے ہمیں حکم دیا کہ کپڑے پہن لیں۔ مطلب یہ تھا کہ ہم پانی سے نچڑتے کپڑوں میں ملبوس ہو جائیں۔

بال لمبے کیوں؟

اس وقت دو افسر کمرے میں داخل ہوئے۔ دونوں میں سے کمتر افسر کیپٹن تھا جس کا نام گیرک تھا۔ شروع ہی سے ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ہم پر کوئی ہتھکنڈہ ضرور آزمائے گا۔ کیپٹن نے آرون مولیٹی کی طرف اشارہ کیا جو ہم چاروں میں سے نوجوان اور بہت نرم آدمی تھا' اور کہا: ''تمہارے بال اتنے لمبے کیوں ہیں؟'' آرون کچھ نہ بولا۔ کیپٹن چلایا: ''میں تم سے بات کر رہا ہوں! تمہارے بال اتنے لمبے کیوں ہیں؟ یہ ضابطے کے خلاف ہے۔ تمہارے بال کٹے ہونے چاہئیں۔ یہ لمبے کیوں ہیں؟'' پھر اس نے توقف کیا اور میری طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے بولا: ''اس لڑکے کی طرح!'' اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ میں خاموش نہ رہ سکا اور کہنا شروع کیا: ''اب ادھر دیکھو' ہمارے بالوں کی لمبائی ضابطوں سے متعین ہوتی ہے......''

لیکن اس سے پہلے کہ میری بات ختم ہوتی' وہ غیر یقینی انداز میں چلایا: ''کبھی مجھ سے اس طرح کی بات نہ کرنا لڑکے!'' اور پھر وہ میری طرف بڑھنے لگا۔ میں خوفزدہ ہو گیا۔ انسان کو یہ جان کر کوئی خوشگوار احساس نہیں ہوتا کہ کوئی اس پر ضرب لگانے والا ہے جبکہ وہ اپنا بچاؤ کرنے کے قابل نہیں۔

جب وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا' میں نے ممکنہ ثابت قدمی کے ساتھ کہا: ''اگر تم مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے تو میں تمہیں اس ملک کی اعلیٰ ترین عدالت میں لے جاؤں گا اور جب میرے مقدمے کا فیصلہ ہو گا تو تم اتنے ہی بے چارہ ہو گے جتنا گرجے کا ایک چوہا۔'' جیسے ہی میں نے بات شروع کی تھی وہ رک گیا تھا اور میری تقریر کے

اختتام پر وہ مجھے حیرت سے تک رہا تھا۔ میں خود بھی قدرے حیران تھا۔ اندر سے میں ڈر گیا تھا اور میں نے یہ بات حوصلے سے نہیں بلکہ ایک طرح کی بہادری سے کی تھی۔ ایسے موقع پر انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے تاثرات سے دلیری کا اظہار کرے خواہ وہ اندر سے کچھ اور ہی محسوس کر رہا ہو۔

''تمہارا ٹکٹ کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا اور میں نے اپنا ٹکٹ یعنی کارڈ اس کے حوالے کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کچھ گھبرا گیا تھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے کہا۔ میں نے سر سے اپنے ٹکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''یہ اس پر لکھا ہوا ہے۔'' اس نے کہا: ''تم کتنے عرصے کے لیے جیل میں ہو؟'' میں نے پھر ٹکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''یہ اس پر لکھا ہوا ہے۔'' اس نے نیچے دیکھ کر کہا: ''پانچ سال! تم پانچ سال کے لیے اندر ہو اور پھر بھی تم اتنے مغرور ہو! کیا تم جانتے ہو کہ پانچ سال کی سزا کا کیا مطلب ہے؟'' میں نے کہا: ''یہ میرا معاملہ ہے۔ میں پانچ سال کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں لیکن میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں کہ کوئی مجھے دق کرے۔ تمہیں قانون کے اندر رہ کر کام کرنا چاہیے۔''

لیفٹیننٹ کی بدکلامی

کسی نے اسے نہیں بتایا تھا کہ ہم کون ہیں یا یہ کہ ہم سیاسی قیدی ہیں یا یہ کہ میں ایک قانون دان ہوں۔ میں نے خود تو مشاہدہ نہیں کیا تھا لیکن دوسرا افسر' جو ایک لمبا خاموش آدمی تھا' ہماری تکرار کے دوران غائب ہو گیا تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ کرنل شائن تھا' روبن آئی لینڈ کا کمانڈنگ آفیسر۔ پھر کیپٹن بھی اپنی آمد کی نسبت کہیں زیادہ خاموشی سے چلا گیا۔

اب ہم چاروں اکیلے تھے۔ سٹیفن' جس کے اعصاب جھنجھنا رہے تھے' بولے بغیر نہ رہ سکا: ''ہم نے بوئروں کو مشتعل کیا ہے۔ اب ہمیں مشکل وقت کے لیے تیار

رہنا چاہیے۔''وہ ابھی بات کر ہی رہا تھا کہ ایک ناٹے قد کا آدمی اندر داخل ہوا جس کا نام لیفٹیننٹ پریٹوریس تھا۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب پریٹوریس ژہوسا زبان میں ہم سے مخاطب ہوا جس سے لگتا تھا کہ وہ یہ زبان خوب جانتا ہے۔''ہم نے تمہارا ریکارڈ دیکھا ہے اور وہ اتنا برا نہیں سوائے اس شخص کے۔''اس نے سٹیفن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''تمہارا ریکارڈ گندا ہے۔''

سٹیفن پھٹ پڑا:''تم مجھ سے اس طرح بات کرنے والے کون ہو؟ تم کہتے ہو کہ میرا ریکارڈ گندا ہے۔ تم نے میری فائلیں پڑھی ہیں' ایہہ؟ اچھا' تم جان لوگے کہ مجھ پر عائد کیے گئے تمام الزامات ان مقدمات کے سلسلے میں ہیں جو میں اپنی قوم کے حقوق کے لیے لڑ رہا تھا۔ میں ایک مجرم نہیں ہوں' مجرم تم ہو۔''لیفٹیننٹ نے پھر سٹیفن کو انتباہ کیا کہ اگر اس نے دوبارہ کبھی اسے اس طرح مخاطب کیا تو وہ اس پر حملہ کر دے گا۔ روانہ ہونے سے پہلے پریٹوریس نے کہا کہ وہ ہمیں ایک ہی بڑی کوٹھڑی میں بند کر رہا ہے جس کی کھڑکیاں باہر کی طرف کھلتی ہیں اور پھر اس نے قدرے ظاہر داری سے کہا:''لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم ان کھڑکیوں میں سے کسی سے بات کرو' خصوصاً تم' منڈیلا!''

دار سپاہی کا انکشاف

پھر ہمیں ہماری کوٹھڑی میں لے جایا گیا اور یہ ان سب سے بہترین تھی جو میں نے اب تک دیکھی تھیں۔ اس کی کھڑکیاں بڑی تھیں اور ان تک آسانی سے رسائی ہو سکتی تھی۔ ایک دیوار کی کھڑکیوں میں سے دوسرے قیدی اور سپاہی وہاں سے گزرتے نظر آتے تھے۔ یہ کشادہ اور یقیناً اتنی بڑی تھی کہ ہم چاروں کے لیے کافی تھی اور اس کا اپنا ٹائیلٹ اور شاور تھے۔ یہ ایک تھکا دینے والا دن تھا اور کچھ دیر بعد ٹھنڈے دلئے کا عشائیہ کھا کر دوسرے سو گئے۔ میں فرش پر اپنے کمبل پر لیٹا تھا جب میں نے

کھڑکی کھٹکھٹائے جانے کی آواز سنی۔ میں نے اوپر دیکھا تو ایک گورا آدمی نظر آیا جو مجھے کھڑکی کے شیشے تک آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ مجھے لیفٹیننٹ کا انتباہ یاد تھا' لہذا میں لیٹا رہا۔ پھر مجھے ایک ساتھی کی سی سرگوشی سنائی دی: ''نیلسن! ادھر آؤ۔'' اس حقیقت نے کہ وہ میرا نام جانتا تھا' مجھے آمادہ کیا اور میں نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ میں کھڑکی تک گیا اور اس شخص کو دیکھا۔ اس کو محسوس ہوا ہو گا کہ میں اسے گورا سمجھتا ہوں' اس لیے اس نے سرگوشی میں جو پہلی بات کہی' وہ یہ تھی: ''میں بلوم فونٹائن سے ایک رنگ دار سپاہی ہوں۔'' پھر اس نے مجھے میری بیوی کی خبر سنائی۔ جوہانسبرگ کے اخبارات میں ایک رپورٹ چھپی تھی کہ میری بیوی مجھ سے ملنے پریٹوریا جیل پہنچی تھی لیکن ان لوگوں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ مجھے روبن آئی لینڈ بھیج دیا گیا ہے۔ میں نے اس اطلاع پر اس کا شکریہ ادا کیا۔

تمباکو اور سینڈوچ کی خفیہ رسد

''کیا آپ سگریٹ پیتے ہیں؟'' اس نے کہا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں سگریٹ نہیں پیتا اور اس پر اسے مایوسی ہوئی۔ پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے کہا: ''ہاں' لیکن میرے ساتھی پیتے ہیں۔'' اس پر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے کہا کہ وہ چند منٹ میں تمباکو اور سینڈوچ لے کر آئے گا۔ اب ہر کوئی جاگ اٹھا تھا۔ تیفو اور جان سگریٹ پیتے تھے' چنانچہ میں نے تمباکو کی تھیلی ان میں بانٹ دی اور سینڈوچ ہم سب نے تقسیم کر لیے۔

اگلے کئی ہفتے رنگ دار سپاہی تقریباً ہر رات تمباکو اور سینڈوچ لاتا رہا اور ہر رات میں تمباکو تیفو اور جان میں برابر تقسیم کرتا رہا۔ سپاہی بڑا خطرہ مول لے رہا تھا اور اس نے مجھے خبردار کیا کہ وہ براہ راست صرف مجھ سے معاملہ کرنے کے لیے تیار ہے ورنہ یہ انتظام ختم ہو جائے گا۔

جب ہم جزیرے پر پہنچے تو ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہاں دوسرے قیدی کتنے ہیں۔ چند دن کے اندر اندر ہمیں پتہ چل گیا کہ وہاں تقریباً ایک ہزار آدمی ہیں جو سب افریقی ہیں اور حال ہی میں یہاں پہنچے ہیں۔ ان لوگوں میں سے اکثر عام قانون کے قیدی تھے لیکن میں جانتا تھا کہ ان میں کچھ سیاسی قیدی بھی ہوں گے۔ میں ان سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ہم مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھے۔ پہلے چند روز ہمیں ہماری کوٹھڑیوں میں بند رکھا گیا اور باہر نکلنے کی اجازت بھی نہ دی گئی۔ ہم نے مطالبہ کیا کہ ہمیں دوسری قیدیوں کی طرح کام پر لگایا جائے اور جلد ہی یہ مطالبہ مان لیا گیا لیکن ہمیں تنہا کلائن ہانس کی نگرانی میں باہر لے جایا گیا۔ ہمارا پہلا کام نئے ڈالے گئے پائپوں پر مٹی ڈالنا تھا۔ یہ پائپ ایک چھوٹی پہاڑی پر ڈالے گئے تھے جہاں سے ہمیں جزیرے کا کچھ حصہ نظر آتا تھا جو جنگلی اور خوبصورت تھا۔

ہانس بھائیوں کی شہرت

پہلے روز ہم نے محنت کی لیکن آگے آنے والے ہر دن کلائن ہانس ہمیں اور محنت کرنے کو کہتا۔ وہ درشت لہجے میں کہتا جیسے کوئی کسی گھوڑے یا گائے کو ہانک رہا ہو۔ ''نہیں' آدمی! چلو' کام کرتے چلو۔'' ایک موقع پر سٹیفن جو ہم باقیوں سے زیادہ عمر کا تھا' اس نے بیلچہ زمین پر رکھ دیا تو کلائن ہانس فوراً ہی اسے دھمکیاں دینے لگا۔ لیکن سٹیفن نے افریکان زبان میں جواب دیا: ''تم جاہل جو اپنی زبان بھی ٹھیک طرح نہیں بول سکتے' مجھ سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں کیا کروں۔ میں اپنی رفتار ہی سے کام کروں گا۔ میں تو اتنا ہی کام کرنے کے لیے تیار ہوں اور اتنا ہی کر سکتا ہوں۔'' پھر اس نے بڑے وقار کے ساتھ اپنا بیلچہ اٹھایا اور کام کرنے لگا۔ سٹیفن افریکان زبان کا استاد رہا تھا اور وہ نہ صرف مکمل افریکان بولتا تھا بلکہ اس کی پیش رو بولی ہائی ڈچ بھی

جانتا تھا۔ وہ گورے سپاہیوں سے اس قدر شاندار اور فصیح زبان میں بات کرتا کہ وہ غالباً سمجھ نہ پاتے۔ لیکن وہ اس سے لسانی جنگ میں الجھنے کی بجائے خاموش رہنا بہتر سمجھتے تھے۔

جزیرے پر کلائن ہانس دو بھائی تھے اور دونوں کی شہرت یہ تھی کہ وہ قیدیوں پر بد نیتی سے حملہ آور ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں سے بڑا ہماری نگرانی پر مامور تھا۔ اسے ہم سے دور رہنے کو کہا گیا ہوگا' اس لیے اس نے ہمیں کبھی نہ چھوا۔ ان میں سے چھوٹے پر ایسی کوئی بندش نہ تھی۔ ایک روز ہم کام سے واپسی پر ایک سڑک پر پیدل آرہے تھے۔ راستے میں کئی سو قیدی ہتھ گاڑیوں میں ریت بھر کر لے جا رہے تھے۔ وہ غیر سیاسی قیدی تھے۔ قیدیوں کے دونوں گروہوں کو رکنے کا حکم ملا جبکہ دونوں بھائی گپ شپ کرنے لگے۔ چھوٹے بھائی نے اپنے ایک آدمی کو حکم دیا کہ اس کے بوٹ چمکا دے جبکہ وہ باتیں کر رہا تھا۔ میں نے کارکنوں کے دوسرے گروہ میں کچھ آدمی پہچان لیے جنہیں 1958ء میں سیخوخونے لینڈ میں کسانوں کی بغاوت کے بعد سزائے موت سنائی گئی تھی' چنانچہ میں مڑ کر انہیں اچھی طرح دیکھنے لگا۔ اس پر چھوٹے بھائی نے درشتی سے مجھے حکم دیا کہ میں دوسری طرف دیکھوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر میں دوسرے قیدیوں کے سامنے کھڑا نہ ہوتا تو میرا ردعمل کیا ہوتا لیکن اب میری عزت و آبرو خطرے میں تھی۔ میں نے منہ دوسری طرف کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر چھوٹا کلائن ہانس مجھ پر حملہ آور ہونے کے نمایاں ارادے سے میری طرف بڑھا لیکن جب وہ مجھ سے چند قدم دور تھا' اس کا بھائی بھاگ کر آیا اور اسے پکڑ کر اس کے کان میں کچھ کہا اور اس طرح یہ واقعہ گزر گیا۔

تمہارا پیٹ غائب ہو جائے گا''

ایک دفعہ جیل کا سربراہ ہم سے ملنے آیا جو پورے جزیرہ روبن کو چلانے کا ذمہ دار

تھا اور ہماری شکایات سننے آیا تھا۔اس کا نام تھیرون تھا جو قیدیوں کے روبرو آنا پسند نہیں کرتا تھا۔ میں نے اس کا مضحکہ اڑانا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے اس کی خوشامد بھی نہ کی اور کھرے لہجے میں کہا: ''ہم آپ کیش کرگزار ہیں کہ آپ ہم سے ملنے آئے ہیں کیونکہ ہمارے بہت سے مسائل ہیں جن کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ آپ حل کرسکیں گے۔'' میں نے مسائل گنوائے اور جب میں نے بات ختم کی تو اس نے کہا: ''میں دیکھوں گا کہ میں کیا کرسکتا ہوں۔''

شاید اس کا خیال تھا کہ اس نے بہت آسانی سے ہماری بات مان لی ہے لہٰذا چلتے چلتے وہ تیفو کی طرف مڑا، جس کا پیٹ بڑا تھا اور کہا: ''تمہارا یہ بڑا پیٹ یہاں جیل میں غائب ہو جائے گا۔افریکان میں پیٹ کے لیے لفظ Pens آتا ہے جس کا عام مطلب بھیڑیا مویشی کا پیٹ ہے اور انسانی پیٹ کے لیے لفظ ماگ (Maag) استعمال ہوتا ہے۔

سٹیفن نے جیل کے سربراہ کے اس مذاق کو نظر انداز نہ کیا اور اس توہین کا جواب دیئے بغیر نہ رہ سکا۔اس نے کہا: ''کیپٹن! تم جانتے ہو کہ تم مجھ سے ایسا کوئی برتاؤ نہیں کرسکتے جو مجھے حقیقتاً متاثر کرے کیونکہ میں دنیا میں سب سے زیادہ انقلابی سیاسی تنظیم کمیونسٹ پارٹی کا رکن ہوں جو کرۂ ارض پر مظلوم لوگوں کی خدمت کا امتیازی ریکارڈ رکھتی ہے۔تم اور تمہاری بیچاری نیشنل پارٹی تاریخ کا راکھ کا ڈھیر بن جائے گی جبکہ ہم دنیا پر حکمران ہوں گے۔ میں تمہاری بے عقل صدرِ مملکت کی نسبت بین الاقوامی سطح پر زیادہ معروف ہوں۔تم کون ہو! ایک معمولی ملازم جو توجہ دینے کے قابل ہی نہیں۔ جب میں جیل سے نکلوں گا تو مجھے تمہارا نام بھی یاد نہیں رہے گا۔'' تھیرون اپنے قدموں پر مڑا اور چلا گیا۔

ہمارے رنگ دار وارڈر کی راتوں کو آمد نے جزیرے کی سختی کم کرنے میں خاصا کردار ادا کیا۔لیکن اس عیاشی کے باوجود سٹیفن ابھی تک غیر مطمئن تھا۔تیفو ایک

زبردست تمباکونوش تھا۔ بعض اوقات وہ ساری رات دھوئیں کے مرغولے اڑانے میں گزاردیتا اور اگلے روز کے لیے اس کے پاس کوئی تمباکو نہ ہوتا۔ تاہم جان گیٹ سیوی اپنا تمباکو بچا کر رکھتا جو کبھی کم نہ پڑتا۔ ایک شام تیفو بڑے تلخ لہجے میں مجھ سے کہنے لگا: ''نیلسن! تم مجھے نظرانداز کررہے ہو۔ تم گیٹ سیوی کو مجھ سے زیادہ تمباکو دے رہے ہو۔''

نے تیفو کو سزا دی

تیفو کی بات درست نہ تھی لیکن میں نے سوچا کہ اس کے ساتھ کوئی داؤ کھیلنا چاہیے' چنانچہ میں نے کہا: ''ٹھیک ہے' ہر رات جب میں تمباکو حاصل کرتا ہوں آئندہ پہلے میں اسے دو حصوں میں بانٹوں گا اور پھر تمہیں موقع دوں گا کہ جو حصہ تم چاہو لے لو۔'' اس رات اور اس کے بعد ہر رات میں تمباکو کی دو برابر ڈھیریاں بناتا اور تیفو سے کہتا: ''چن لو۔''

تیفو اس وقت فیصلہ نہ کرسکنے کی اذیت میں ہوتا۔ وہ دونوں ڈھیریوں کو دیکھتا اور اس کا سر دونوں کے درمیان آگے پیچھے جھولتا رہتا۔ آخرکار مایوسی میں وہ ایک ڈھیری اٹھالیتا اور جاکر تمباکو پینے لگتا۔ اگرچہ یہ عمل مجھے خاصا منصفانہ اور مزاحیہ بھی لگتا تھا' مگر تیفو اس سے ناخوش تھا۔ جب وارڈر کھڑکی کے پاس پہنچتا تو وہ یہ یقین کرنے کے لیے ادھر ادھر منڈلانے لگتا کہ میں تمباکو کا ذخیرہ تو نہیں کررہا۔ اس سے وارڈر پریشان ہوجاتا اور مجھ سے کہتا: ''دیکھو میں صرف تم سے معاملہ کرتا ہوں۔ یہ سکیورٹی کا مسئلہ ہے۔'' میں نے کہا میں یہ بات سمجھتا ہوں۔ پھر میں نے تیفو کو انتباہ کیا کہ وہ آس پاس نہ آیا کرے جب میں وارڈر سے معاملہ کررہا ہوتا ہوں۔

تاہم اگلی رات جب وارڈر کھڑکی کے پاس آیا' تیفو چل کر سلاخوں تک پہنچا اور اس سے کہنے لگا۔ ''اب کے بعد میں اپنے حصے کا تمباکو خود لینا چاہتا ہوں' وہ مجھے براہ

راست دے دیا کرو۔'' سپاہی پریشان ہو گیا۔ اس نے کہا: ''منڈیلا! تم نے ہمارا معاہدہ توڑ دیا ہے۔ اب یہ نہیں چلے گا۔ میں یہ چیزیں تمہیں لا کر نہیں دوں گا۔'' میں نے تیفو کو پرے کھسکا دیا اور وارڈر سے تکرار کرنے لگا۔ میں نے کہا: ''دیکھو بھائی! وہ ایک بوڑھا چھوکرا ہے۔'' میرا اشارہ تیفو کی طرف تھا۔ ''اور وہ زیادہ نارمل نہیں ہے۔ ''یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔'' اس کی یہ حرکت نظر انداز کر دو۔'' چنانچہ وہ نرم پڑ گیا اور اس نے رسد مجھے دے دی مگر ساتھ ہی یہ انتباہ کیا کہ اگر دوبارہ ایسا ہوا تو معاملہ ختم ہو جائے گا۔

اس رات میں نے تیفو کو سزا دینا ضروری خیال کیا۔ میں نے کہا: ''دیکھو تم نے ہماری رسد میں رخنہ ڈال دیا ہے۔ آج رات تمہیں کوئی تمباکو یا سینڈوچ نہیں ملیں گے۔ تم نے اپنا استحقاق کھو دیا ہے۔ پس ہم تمہاری رسد منقطع کر رہے ہیں حتیٰ کہ تم اپنا رویہ درست کر لو۔'' تیفو خاموش رہا۔ اس رات ہم کوٹھڑی کے ایک کونے میں سینڈوچ کھاتے اور اخبار پڑھتے رہے جو وارڈر ہمارے لیے لاتا تھا۔ تیفو دوسرے کونے میں اکیلا بیٹھا رہا۔ آخر کار ہمیں نیند آ گئی۔ آدھی رات مجھے اپنے کندے پر بازو کا لمس محسوس ہوا جس سے میں ہڑبڑا کر جاگ اٹھا۔

یہ تیفو تھا، وہ آہستگی سے کہہ رہا تھا: ''نیلسن، نیلسن! تم نے میرے کمزور حصے پر ضرب لگائی ہے۔ تم نے مجھے میرے تمباکو سے محروم کر دیا ہے۔ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں، میں نے اپنی قوم سے پرخلوص وابستگی پر بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ تم یہاں جیل میں لیڈر رہو اور تم مجھے اس طرح سزا دے رہے ہو۔ نیلسن! یہ انصاف نہیں۔''

اب اس نے میری کمزور حصے پر ضرب لگائی تھی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے اپنے اختیار کا غلط استعمال کیا ہے۔ اس نے واقعی مجھ سے کہیں زیادہ تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ میں نے اپنا آدھا سینڈوچ نہیں کھایا تھا، چنانچہ وہ اسے دے دیا۔ میں نے

گیٹ سیوی کو اٹھایا جسے میں نے سارا تمباکو دے دیا تھا اور اس سے کہا کہ کیا وہ تمباکو میں سے تیفو کو حصہ دے گا۔تیفو ہمیشہ اکھڑ امزاج تھا لیکن اس کے بعد سے اس کا رویہ بہتر ہو گیا۔

جب ہم معمول کے مطابق کام کرنے لگے تو مجھ یا اندازہ ہوا کہ جزیرے پر دوسرے قیدیوں کی زندگی کیسے بسر ہوتی ہے۔حکام نے پی اے سی کے کچھ نوجوان سیاسی قیدی بھی ہمارے سامنے والی کوٹھڑیوں میں منتقل کر دیئے۔ رات کو ہم دروازوں کی سلاخوں میں سے ان سے گفتگو کر سکتے تھے۔مجھے پتا چلا کہ ان میں ایک نوجوان انقابیتی بینائی بھی ہے جو اتی کیزو ینی سے میرا بھتیجا لگتا ہے اور جسے میں نے آخری مرتبہ اس وقت دیکھا تھا جب وہ 1941ء میں ایک بچہ تھا۔

بھتیجے کی گفتگو

ہم نے ٹرانسکائی کی باتیں کیں اور خاندانی تریخ میں کھو گئے۔ایک رات جب اس کے دوست اس کے آس پاس تھے'اس نے کہا:''چچا آپ کس پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں؟''میں نے کہا میرا تعلق تو اے این سی سے ہے۔میرے اس جواب پر اس کے نوجوان ساتھی کبیدہ خاطر ہوئے اور اچانک ان کے چہرے کھڑکی سے غائب ہو گئے۔ کچھ دیر بعد میرا بھتیجا پھر نمودار ہوا اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں کبھی پی اے سی کا رکن رہا ہوں یا نہیں۔ میں نے جواب دیا میں کبھی پی اے سی میں نہیں رہا۔وہ بولا کہ اس کا خیال تھا میں اپنے دورۂ افریقہ کے دوران پی اے سی میں شامل ہو گیا تھا۔میں نے اسے بتایا کہ میں اس میں شامل نہیں ہوا اور یہ کہ میں ہمیشہ اے این سی کا رکن رہا ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔اس پر وہ پھر بدمزہ ہوئے اور غائب ہو گئے۔

مجھے بعد میں علم ہوا کہ پی اے سی نے پروپیگنڈہ کر رکھا تھا کہ جب میں افریقہ ک

مختلف ممالک کے دورے پر تھا تو میں پی اے سی میں شامل ہو گیا تھا۔ اگرچہ یہ جان کر مجھے خوشی نہ ہوئی مگر حیرت بھی نہ ہوئی۔ سیاست میں ایک شخص کبھی اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ چھوٹے لوگ کس طرح کسی صورتحال کے بارے میں پروپیگنڈے کا جال بنتے ہیں۔ کچھ دیر بعد میرا بھتیجا پھر آیا اور اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا میں نے پریٹوریا لوکل جیل میں سوبکوی سے مل کر بات چیت کی ہے۔ میں نے کہا کہ میں ان سے مل چکا ہوں اور ہم نے بہت اچھی بات چیت کی۔ اس پر انہیں خوشی ہوئی۔ انہوں نے مجھے شب بخیر کہا اور اس کے بعد وہ مجھے نظر نہ آئے۔

اسی شام چند گھنٹے بعد ایک کیپٹن کوٹھڑی میں آیا اور ہم چاروں سے کہا کہ اپنا سامان باندھ لیں۔ چند منٹ کے اندر میری ساتھی وہاں سے لے جائے گئے اور میں کوٹھڑی میں اکیلا رہ گیا۔ جیل میں وہ شخص اپنے آپ کو خوش قسمت خیال کرتا ہے جسے اپنے ساتھیوں کو خدا حافظ کہنے کا موقع ملے۔ وہ کسی کے ساتھ مہینوں غیر معمولی طور پر گھل مل کر رہ سکتا ہے اور پھر اچانک جدا ہونے کے بعد اس شخص کو دوبارہ کبھی نہیں دیکھ پاتا۔ یہ صورتحال قیدی کو انسان گریزی کی طرف لے جاتی ہے کیونکہ یہ اسے اپنے آپ میں مگن اور دوسروں سے الگ تھلگ رہنے پر مجبور کرتی ہے۔

اس رات بھوکا رہا

اب جبکہ میں تنہا تھا' میں قدرے پریشان بھی تھا۔ اور قیدیوں کے ساتھ رہ کر تحفظ کا احساس تھا مگر جب آپ تنہا ہوں تو کوئی آپ کا حال دیکھنے والا نہیں ہوتا۔ اس روز مجھے احساس ہوا کہ مجھے کھانا نہیں دیا گیا' چنانچہ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا، ''وارڈر! مجھے رات کا کھانا نہیں ملا۔''

''تمہیں چاہیے مجھے باس کہہ کر پکارو۔'' وہ غرایا۔ اور اس رات میں بھوکا رہا۔

اگلی صبح بہت سویرے مجھے پریٹوریا لے جایا گیا۔ محکمہ جیل خانہ جات نے پریس کو ایک بیان جاری کیا کہ میرے اپنے تحفظ کے لیے مجھے جزیرے سے واپس لایا گیا ہے کیونکہ پی اے سی کے آدمی مجھ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ یہ صریحاً جھوٹ تھا۔ وہ اپنے مقاصد کے لیے مجھے پریٹوریا واپس لائے تھے جو جلد ہی واضح ہو گئے۔

مجھے پریٹوریا لوکل میں قیدی تنہائی میں رکھا گیا۔ لیکن قیدیوں کے بھی ذرائع ہوتے ہیں' چنانچہ جلد ہی وہاں اے این سی کے بعض مہربانوں کی طرف سے مجھے رقعے اور پیغامات ملنے لگے۔ ایک پیغام ہنری فزی کی طرف سے آیا۔ وہ ''ایم کے'' کے ان افراد میں سے تھا جنہوں نے ایتھوپیا میں عسکری تربیت حاصل کی تھی اور جنہیں جنوبی افریقہ واپس آنے کی کوشش کرتے ہوئے گرفتار کرلیا گیا تھا۔ وہ اے این سی کے ان پہلے ارکان میں شامل تھے جن پر سبوتاژ ایکٹ کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔

جیل کی انگوروں کی بیل میں سے میں نے ان کی مدد کرنے کی کوشش کی اور انہیں ہیرلڈ وولپے سے رابطہ قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وولپے تو پولیس کی حراست میں ہے۔ یوں میری پہلی کوشش ناکام رہی۔ ایک روز جب مجھے ورزش کے بعد احاطے سے باہر لے جایا جارہا تھا' میں نے اینڈریو املانجینی کو دیکھا۔ میں نے آخری مرتبہ اسے ستمبر 1961ء میں دیکھا جب وہ فوجی تربیت کے لیے ملک سے باہر جارہا تھا۔ وہ لپے' املانجینی ......اور کون کون زیر حراست تھے؟ میں اس سے بے خبر تھا۔

1961ء کے اوائل میں ونی پر دو سال کی بندش لگ گئی تھی کہ وہ اپنے شہر سے کہیں اور نہیں جاسکتی۔ مجھے ایک اور قیدی سے پتہ چلا کہ حال ہی میں ونی کو بندش کی خلاف ورزی کی ملزم ٹھہرایا گیا ہے جس کا نتیجہ قید یا خانہ گرفتاری (House

(Arrest کی شکل میں نکل سکتا تھا۔ اب ونی بھی خردماغ تھی ۔بندش کا حکم اسے اشتعال دلانے والی بات تھی ۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اس نے احکام کی خلاف ورزی کی ہے اور میں اسے ایسا نہ کرنے کا کبھی مشورہ نہ دیتا لیکن مجھے اس پر بڑی تشویش تھی کہ اسے شاید جیل میں وقت گزارنا پڑے گا۔

دریافت کرلیا گیا تھا

جولائی 1963ء کی ایک صبح جب میں راہداری میں اپنی کوٹھڑی کی طرف جا رہا تھا' مجھے تھامس ماشی فانی نظر آیا جو للیز لیف فارم میں فورمین تھا۔ میں نے اسے گرمجوشی سے سلام کیا اگرچہ میں نے محسوس کیا کہ بلاشبہ حکام نے اسے یہ دیکھنے کے لیے میری راہداری میں بھیجا ہے کہ کیا میں اسے پہچانتا یا اس کا اعتراف کرتا ہوں ۔ میں بھلا اسے پہچانے بغیر کیسے رہ سکتا تھا! اس کی وہاں موجودگی کا صرف ایک ہی مطلب تھا۔حکام نے رائیوونیا دریافت کرلیا ہے۔

ایک یا دو دن بعد مجھے جیل کے دفتر میں طلب کیا گیا جہاں میری ملاقات اپنے ساتھیوں سے ہوئی ۔''والٹر' گوون امبیکی' احمد کاتھرادا' اینڈریو املانجینی' بوب ہیپل' ریمنڈ امبلا باجوایم کے ہائی کمان کارکن تھا اور حال ہی میں چین سے تربیت لے کر لوٹا تھا' الیاس موتسوالیدی' یہ بھی ایم کے کارکن تھا' ڈینس گولڈبرگ' ایک انجینئر اور کانگریس آف ڈیموکریٹس کا کارکن' رسٹی برنشٹائن' ایک ماہرتعمیرات اور سی اوڈی کارکن اور جمی کانٹور' ایک وکیل جو وولپے کا برادرنسبتی تھا۔ہم سب سے سبوتاژ کا الزام لگایا گیا اور ہمیں اگلے روز عدالت میں پیش ہونا تھا۔ میں نے اپنی پانچ سالہ سزا میں سے فقط نو ماہ گزارے تھے۔

جو کچھ پیش آیا تھا' مجھے تھوڑی تھوڑی کرکے اس کا تفصیلات ملیں۔ 11 جولائی کی سہ پہر ایک ڈرائی کلینرز وین فارم کے احاطے میں داخل ہوئی تھی ۔للیز لیف فارم کی

طرف سے کسی نے سامان لے جانے کی استدعا نہیں کی تھی۔ ایک نوجوان افریقی گارڈ نے گاڑی کو روکا تو اچانک درجنوں مسلح سپاہیوں اور بہت سے پولیس کتوں نے باہر نکل کر اس پر قابو پالیا۔ انہوں نے عمارات کا محاصرہ کر لیا اور مٹھی بھر افسر مین بلڈنگ اور بڑی بیرونی عمارت میں داخل ہو گئے۔ بیرونی عمارت میں انہیں ایک درجن افراد ایک میز کے گرد بیٹھے ایک دستاویز پر بحث کرتے ملے۔ والٹر کھڑکی سے کود گیا مگر پولیس کے ایک خونخوار کتے نے اسے روک لیا۔ گرفتار شدگان میں آرتھر گولڈ رائخ بھی شامل تھا جو گاڑی میں اس وقت فارم کے اندر آیا تھا جب پولیس محاصرہ کر رہی تھی۔

مائی بوئی فاش ہو گیا

پولیس نے پورے فارم کی تلاشی لی اور سینکڑوں دستاویزات اور کاغذات ضبط کر لیے اگر چہ اسے کوئی اسلحہ نہ ملا۔ ایک اہم ترین دستاویز میز ہی پر پڑی رہی تھی۔ آپریشن مائی بوئی' یہ جنوبی افریقہ میں گوریلا جنگ کا ایک منصوبہ تھا۔ ایک بھرپور چھاپے میں پولیس نے امخونتو وی سزوی کی پوری ہائی کمان گرفتار کر لی تھی اور سب کو نئے نوے روز حراست کے قانون کے تحت جیل میں بند کر دیا تھا۔

جو سلاوو اور برام فشر خوش قسمتی سے چھاپے کے وقت وہاں نہیں تھے حالانکہ وہ دن میں دو تین مرتبہ فارم میں جاتے تھے۔ نظر سے اوجھل ہونے کے باعث یہ بات غیر معمولی تھی کہ للیز لیف فارم کا نسبتاً پہلے سراغ نہیں لگ سکا تھا جبکہ حکومت کا رویہ سخت تر ہو گیا تھا اور پولیس جدید تر وسائل سے آراستہ تھی۔ گفتگو ریکارڈ کرنے کے لیے وائر ٹیپ کا استعمال عام تھا اور چوبیس گھنٹے نگرانی کی جاتی تھی۔ یہ چھاپہ حکومت کے لیے ایک کامیاب انقلاب تھا۔

عدالت میں پہلے دن ہمیں وکیل کو ہدایات دینے کا موقع نہ دیا گیا۔ ہمیں ایک

مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا اور سبوتاژ کا الزام لگایا گیا۔ چند روز بعد ہمیں ربام' ورنن بیرانج' جوئل جوفے' جارج بزوس اور آرتھر چاسکالسن سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ یہ سب ہمارا مقدمہ لڑ رہے تھے۔ مجھے اب بھی اوروں سے الگ رکھا گیا تھا کیونکہ میں سزا یافتہ قیدی تھا اور ان ملاقاتوں کے دوران مجھے اپنے ساتھیوں سے گفتگو کرنے کا پہلا موقع ملا تھا۔

برام بہت غمگین تھا۔ اپنی دھیمی آواز میں اس نے ہمیں بتایا کہ ہم ایک انتہائی سنگین مقدمے سے دوچار ہیں اور وکیل سرکار نے اسے آگاہ کیا ہے کہ وہ انتہائی سزا کا مطالبہ کریں گے' یعنی سزائے موت کا۔ اس نے کہا کہ صورتحال کے پیش نظر عین ممکن ہے یہی سزا سنا دی جائے۔ اس لمحے سے ہم پھانسی کے سائے تلے رہ رہے تھے۔ سزائے موت کا امکان ہی ہر شے کو بدل دیتا ہے۔ شروع ہی سے ہم اسے مقدمے کا لابدی نتیجہ خیال کر رہے تھے۔ حال ہی میں ہمارے جرائم سے کہیں کمتر جرائم کی سزا عمر قید سنائی گئی تھی۔

جیل افسران آپ کو ہمیشہ یاد دلاتے رہتے ہیں کہ آپ کو پھانسی ہو سکتی ہے۔ اس رات ایک محافظ سونے کے وقت میری کوٹھڑی کے دروازے پر آ دھمکا۔ ''منڈیلا! تمہیں سونے کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سونے والے ہو۔'' اس نے کہا۔ میں نے ایک لمحہ انتظار کیا اور پھر کہا۔ ''ہم سب' آپ سمیت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سونے والے ہیں۔'' اس سے مجھے قدرے سکون ہوا۔

کورٹ میں پیشی

9 اکتوبر 1963ء کو ہمیں مسلح محافظوں کی نگرانی میں ایک پولیس وین میں بٹھایا گیا۔ اس کے وسط میں ایک آہنی رکاوٹ تھی جو سفید قیدیوں کو افریقیوں سے الگ کرتی تھی۔ ہمیں پریٹوریا کے ایوان انصاف میں لے جایا گیا جہاں سپریم کورٹ

بیٹھتی ہے۔ یہاں مقدمہ سرکار بنام نیشنل کمان و دیگران شروع ہونے والا تھا جسے بعد میں مقدمہ سرکار بنام نیلسن منڈیلا و دیگران کا نام دیا گیا اور آج بالعموم اسے رائیوونیا ٹرائل کہا جاتا ہے۔ عدالت کے نزدیک پال کروگر کا مجسمہ نصب ہے جو جمہوریہ ٹرانسوال کا صدر تھا اور جس نے انیسویں صدی میں برطانوی استعمار کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ اس افریکار ہیرو کے مجسمے کے نیچے اس کا تقریر کا ایک اقتباس درج ہے۔ اس میں لکھا ہے: ''ہم اعتماد کے ساتھ اپنا کاز پوری دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ہم جیتیں یا مر جائیں' آزادی افریقہ میں سربلند ہوگی جیسے سورج صبح کے بادلوں سے نمودار ہوتا ہے۔''

ہماری وین پولیس ٹرکوں کے ایک کانوائے کے درمیان تھی۔ موٹر کیڈ کے آگے اعلیٰ پولیس افسران کو لیموزین گاڑیاں تھیں۔ ایوان انصاف مسلح پولیس والوں کے گھیرے میں تھا۔ ہمارے حامیوں کا ہجوم جو عمارت کے سامنے جمع تھا' اس سے بچنے کے لیے ہمیں عمارت کے عقب میں اتار کر بڑے آہنی گیٹ سے اندر لے جایا گیا۔ عمارت کے چاروں طرف پولیس افسر مشین گنیں لیے چوکس کھڑے تھے۔ جب ہم وین سے اترے تو ہمیں آزادی کے گیت گاتے اور نعرے لگاتے ہجوم کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اندر داخل ہوئے تو ہمیں کمرہ عدالت کے نیچے کوٹھڑیوں میں ٹھہرایا گیا۔ یہاں وہ مقدمہ چلنے والا تھا جسے اخبارات اور دنیا بھر میں جنوبی افریقہ کی تاریخ کا اہم ترین سیاسی مقدمہ قرار دیا گیا تھا۔

جب ہم کوٹھڑیوں سے باہر آئے تو ہر ملزم کے ساتھ دو مسلح سپاہی تھے اور جب ہم اونچی چھت کے آراستہ کمرۂ عدالت میں داخل ہوئے تو ہم میں سے ہر ایک ہجوم کی طرف مڑ کر بند مٹھی کا اے این سی سلام کیا۔ وزیٹرز گیلری میں ہمارے حامی پکار اٹھے: ''اماندلا انگاویتھو!'' اور ''مائی بوئی افریقہ!'' یہ نعرے پرجوش مگر خطرناک تھے۔ پولیس نے گیلری کے تمام تماشائیوں کے نام اور پتے لے لیے تھے اور جب وہ

کمرے عدالت سے نکلے تو ان کی تصویریں لے لیتے تھیں۔ کمرۂ عدالت مقامی اور بین الاقوامی صحافیوں اور غیر ملکی حکومتوں کے درجنوں نمائندوں سے بھرا ہوا تھا۔

اپنی خاکی نیکر پر شرم آئی

جب ہم سب اندر آ گئے تو پولیس افسروں کے ایک گروہ نے ہمارے اور تماشائیوں کے درمیان ایک مضبوط حلقہ بنالیا۔ مجھے اپنا خاکی شرٹ اور نیکر پر مشتمل جیل کے کپڑے اور پتلی چپل پہن کر عدالت میں آنا بہت معیوب لگا۔ ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت سے مجھے مناسب کپڑے پہنے کا اختیار نہیں تھا۔ بعد میں بہت سے لوگوں نے کہا کہ میں کس قدر غریب و مسکین لگتا تھا اور ایسی محض کپڑوں کی وجہ سے نہیں تھا۔ میں مہینوں جیل کے اندر اور باہر قید تنہائی میں رہا تھا اور میرا وزن پچیس پونڈ کم ہو گیا تھا۔ جب میں کمرہ عدالت میں داخل ہوا تو میں نے تکلیف آمیز مسکراہٹ کے ساتھ گیلری کی طرف دیکھا کیونکہ اپنے حامیوں کا دیدار میرے لیے بہترین دوا تھا۔

سکیورٹی خاص طور پر سخت تھی کیونکہ چند ہفتے پہلے آرتھر گولڈ رائخ 'ہیرلڈ وولپے' موسائی مولا اور عبدالحی جسات ایک نوجوان سپاہی کو رشوت دے کر جیل سے فرار ہو گئے تھے۔ آرتھر اور ہیرلڈ نے پادریوں کے بھیس میں سوازی لینڈ کی راہ لی تھیں اور وہاں سے طیارے میں ٹانگانیکا چلے گئے تھے۔ ان کا فرار اس وقت عمل میں آیا تھا جب زیر زمین تحریک کے بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں' چنانچہ اس واقعے کی خبر اخبارات میں جلی سرخیوں سے چھپی تھی۔ حکومت کو اس سے بڑی پریشانی ہوئی تھی اور عوام کا جذبہ دو چند ہو گیا تھا۔

رائیوونیا ٹرائل میں ہمارا جج مسٹر کوارٹس ڈی ویٹ تھا جو ٹرانسوال کا جج پریذیڈنٹ تھا۔ وہ ڈھیلا ڈھالا سرخ چغہ پہنے ہوئے ایک چوبی چھتر کے نیچے بیٹھا تھا۔

نیشنلسٹوں کے برسر اقتدار آنے سے پہلے وہ یونا یٹڈ پارٹی کا مقرر کردہ آخری جج تھا اور اسے حکومت کا طرفدار خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ ایک سخت چہرے والا جج تھا جو بیوقوفوں کو بخوشی برداشت نہیں کرتا تھا۔ پراسیکیوٹر ڈاکٹر پرسی یوتار تھا جو ٹرانسوال کا اٹارنی جنرل تھا اور پورے جنوبی افریقہ کا اٹارنی جنرل بننے کی خواہش رکھتا تھا۔ وہ ایک چھوٹا گنجا چالاک آدمی تھا اور جب غصے یا جذبات میں ہوتا یا اس کی آواز چیخنے لگتی تھی۔ وہ ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کا عادی تھا اور اگر کوئی قطعی بات نہ کہنا چاہتا تو پرتکلف زبان استعمال کرنے لگتا۔

جرم کو بوالعجبیاں

یوتار اٹھا اور عدالت سے مخاطب ہوا: ''می لارڈ! میں نیشنل ہائی کمان و دیگران کے خلاف سرکار کا مقدمہ پیش کرتا ہوں۔'' مجھے ملزم نمبر ایک قرار دیا گیا تھا۔ یوتار نے فرد جرم پیش کی اور کہا کہ ہم پر فوری طور پر الزام عائد کیا جائے اور سرسری طور پر مقدمہ چلایا جائے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہمیں فرد جرم کی نقل دی گئی تھی۔ استغاثہ نے اسے ہم سے چھپایا تھا اگرچہ انہوں نے وہ ''رانڈ ڈیلی میل'' کو فراہم کردی تھی جس نے اسے روز کی اشاعت میں پورے صفحات پر پھیلا کر شائع کیا تھا۔ فرد جرم میں ہم گیارہ افراد کو سبوتاژ کے دوسو واقعات میں ملوث ٹھہرایا گیا تھا جن کا مقصد پرتشدد انقلاب اور ملک پر مسلح حملے کی راہ ہموار کرنا تھا۔ وکیل سرکار کا کہنا تھا کہ ہم حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں عملاً شریک تھے۔

ہم پر غداری کے بجائے سبوتاژ اور سازش کے الزامات عائد کیے گئے تھے کیونکہ اس صورت میں طویل ابتدائی جرح کی ضرورت نہیں ہوتی جو وکلائے صفائی کے لیے بڑی مفید ہوتی ہے جبکہ غداری کے مقدمے میں طویل طویل جرح ہوتی ہے۔ بایں ہمہ دونوں صورتوں میں زیادہ سے زیادہ سزا پھانسی کی موت ہے۔ غداری کی صورت

میں سرکار کو اپنا کیس معقول شک سے مبرا ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اور ہر الزام کی تصدیق کے لیے دو گواہوں کی ضرورت پیش آتی ہے اور قانون سبوتاژ کے تحت یہ وکلائے صفائی کی ذمہ داری تھی کہ وہ ملزم کو بے گناہ ثابت کرے۔

برام فشر کھڑا ہوا اور اس نے عدالت سے اس بنا پر ریمانڈ کی درخواست کی کہ وکلائے صفائی کو اپنا کیس تیار کرنے کے لیے وقت نہیں ملا۔ اس نے اس طرف توجہ مبذول کرائی کہ بہت سے ملزمان کو بے حساب طوالت کے اوقات میں قید تنہائی میں رکھا گیا تھا۔ سرکار تین ماہ سے کیس کی تیاری کر رہی تھی جبکہ ہمیں فرد جرم اسی روز ملی ہے۔ جسٹس ڈی ویٹ نے ہمیں 29 اکتوبر تک تین ہفتوں کا التواء دے دیا۔

سرکاری ہتھکنڈے

مجھے یہ جان کر پریشانی ہوئی کہ ونی پہلے روز نہیں آسکی تھی۔ اس پر جانسبرگ سے باہر جانے پر بندوش تھی' لہذا عدالت میں آنے کے لیے اسے پولیس کی اجازت درکار تھی۔ اس نے درخواست دی تھی مگر وہ مسترد کر دی گئی تھی۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ ہمارے مکان پر چھاپہ پڑا تھا اور پولیس نے ونی کے ایک نوجوان رشتے دار کو حراست میں لے لیا تھا۔ ونی واحد بیوی نہیں تھی جسے ہراساں کیا جا رہا تھا۔ البرٹینا میسولو اور کیرولین موتسوالیدی کو نوے روزہ حراست کے قانون کے تحت حراست میں لے لیا گیا تھا اور روالٹر کے نوجوان بیٹے میکس کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ یہ سرکار کا دباؤ ڈالنے کا سب سے وحشیانہ ہتھکنڈہ تھا..... مجاہدین آزادی کے بیوی بچوں کو قید میں ڈال دینا۔ حکام بہت سے لوگوں سے جیل میں جو بھی سلوک کرتے تھے وہ برداشت کر لیتے تھے لیکن یہ خیال کہ حکومت وہی سلوک ان کے خاندان والوں سے بھی کر سکتی ہے' ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

آخر کار ونی نے وزیر انصاف سے اپیل کی جس نے اس طرح پر اسے مقدمے کی

کارروائی دیکھنے کی اجازت دے دی کہ وہ روایتی لباس نہیں پہنے گی۔ ستم ظریفی یہ کہ جو حکومت ہوم لینڈز میں ہم سے کہہ رہی تھی کہ ہم اپنی ثقافت کو سینے سے لگائے رکھیں، وہی ونی کو عدالت میں ژہوسا گاؤں پہننے سے منع کر رہی تھی۔

اگلے تین ہفتوں کے دوران ہمیں اجازت دی گئی کہ ہم اپنے کیس کی تیاری میں اپنے دن گزاریں۔ اب میں اپنے ساتھی ملزمان کے درمیان تھا اور ان کی صحبت نے میرے لیے ٹانک کا کام کیا۔ مقدمہ چلنے کے منتظر قیدیوں کی حیثیت سے ہم ہفتے میں دو نصف گھنٹے کی ملاقاتوں کے حقدار تھے اور دن میں ایک کھانا باہر سے بھجوایا جا سکتا تھا۔ مسز پلائی کے لذیذ کھانوں سے میں نے وہ وزن دوبارہ حاصل کر لیا جو کم ہو گیا تھا۔

جب ہم اپنی صفائی کی تیاری کر رہے تھے، حکومت اخبارات میں ہم پر مقدمہ چلا رہی تھی۔ عام طور پر جو مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہو اس پر عوام یا پریس میں تبصرہ نہیں کیا جا سکتا لیکن چونکہ رائیونیا میں گرفتار شدہ افراد نوے دن کی حراست کے قانون کی ذیل میں آتے تھے اور یوں فنی طور پر انہیں کسی جرم کے ملزم نہیں ٹھہرایا گیا تھا، لہٰذا یہ قانونی اصول ساقط ہو جاتا تھا۔ چنانچہ وزیر انصاف سے لے کر سب نے عوام کے سامنے ہمیں تشدد انقلابی قرار دیا۔ اخبارات میں آئے دن ''عسکری بنیادوں پر انقلاب'' جیسی سرخیاں جلوہ گر ہوتیں۔

:

اور ججوں کی ترتیب الٹ گئی

29 اکتوبر کو ہم پھر ایوان انصاف میں داخل ہوئے۔ ہجوم اب کے بھی بڑا اور پرجوش تھا۔ سکیورٹی بھی انتہائی سخت تھی۔ عدالت میں غیر ملکی سفارت خانوں کے افراد بھی آئے ہوئے تھے۔ اپنے ساتھیوں میں تین ہفتے رہ کر، میں ایک عزم نو سے سرشار تھا اور اس بار سوٹ پہن کر عدالت میں بے حد آرام محسوس کر رہا تھا۔ ہمارے

وکلاء نے ہماری جیل کے لباس میں عدالت میں پیشی پر اعتراض کیا تھا اور یوں اپنے کپڑے پہننے کا حق ہمیں مل گیا تھا۔ ہم نے بند مٹھیاں گیلری کی طرف لہرائیں۔ اس پر حکام کیطرف سے ہمیں متنبہ کیا گیا کہ اگر ہم نے دوبارہ ایسا کیا تو ہمیں جیل کے خاکی لباس میں عدالت میں پیش ہونے پر مجبور کیا جائے گا۔ ہمارے پر جوش اظہار کو روکنے کے لیے حکام نے اس عام ترتیب کو الٹ دیا کہ قیدی ججوں سے پہلے کمرہ عدالت میں لائے جائیں۔ اس روز اول کے بعد جج پہلے کمرۂ عدالت میں داخل ہوتے تا کہ ہماری آمد سے پہلے ہی جج برسر عدالت ہوں۔

ہم نے فوراً ہی استغاثہ پر دھاوا بول دیا۔ برام فشر نے سرکاری پیش کردہ فرد جرم کو دقیانوسی، خام اور بیہودہ الزامات پر مشتمل قرار دیا مثلاً یہ الزام کہ میں نے سبوتاژ کی بعض کارروائیوں میں فلاں فلاں تاریخ کو حصہ لیا تھا جبکہ میں پریٹوریا لوکل جیل میں تھا۔ یوتار حیران و پریشان ہوگیا۔ جج ڈی ویٹ نے اس کی طرف دیکھا کہ برام کی بحث کا جواب دے مگر اس نے متعلقہ بات کہنے کے بجائے ایسی بحث شروع کر دی جسے جج نے طنزیہ طور پر ''ایک سیاسی تقریر'' قرار دیا۔ یوتار نے آئیں بائیں شائیں کی تو جج کو کہنا پڑا: ''مسٹر یوتار! میں سمجھتا ہوں تمہاری بحث کی ساری بنیاد یہ ہے کہ تمہیں اطمینان ہے کہ ملزمان مجرم ہیں۔'' پھر ڈی ویٹ نے فرد جرم مسترد کر دی اور سیشن برخاست کر دیا۔

ہی میں پھر گرفتاری

فنی لحاظ سے ہم آزاد تھے، چنانچہ عدالت میں ایک شور بلند ہوا۔ لیکن جج ڈی ویٹ نے ابھی اپنی نشست چھوڑی بھی نہیں تھی کہ ہمیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ لیفٹیننٹ سوین پوئل نے ہم سے ہر ایک کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا کہ ''میں تمہیں سبوتاژ کے ایک الزام میں گرفتار کر رہا ہوں۔'' چنانچہ ہمیں واپس لے جا کر دوبارہ کوٹھڑیوں

میں بند کر دیا گیا۔ بایں ہمہ یہ حکومت کے منہ پر ایک طمانچہ تھا کیونکہ اسے اس مقدمے کا تانا بانا اب پھر بننا تھا جسے وہ ایک ایسا مقدمہ قرار دے رہی تھی جو تمام مقدمات کو ختم کر دینے والا تھا۔

سرکار نے فرد جرم پھر مرتب کی اور دسمبر کے اوائل میں پھر عدالت میں پیش ہوئے۔ ہم سب نے محسوس کیا کہ اس دوران جسٹس ڈی ویٹ کا رویہ ہمارے بارے میں زیادہ معاندانہ ہو گیا تھا۔ ہمیں شبہ تھا کہ اس کے سابق آزادانہ فیصلے پر حکومت کا نزلہ اس پر گرا تھا اور اس پر دباؤ ڈالا گیا تھا۔ نئے الزامات پڑھے گئے۔ ''ہم نے پر تشدد انقلاب کا آغاز کرنے کی ارادے سے سبوتاژ اور گوریلا جنگ کے لیے افراد بھرتی کیے تھے، ہم نے کمیونسٹ انقلاب کو حمایت فراہم کرنے کے مقصد سے جمہوریہ حملہ کرنے کی خاطر غیر ملکی فوجی یونٹوں کی مدد حاصل کرنے کی سازش تھی اور اس مقصد کے لیے ہم نے غیر ممالک سے فنڈز حاصل کیے تھے۔'' یوتار نے ڈرامائی انداز میں کہا کہ ملزمان نے جس اسلحے کے آرڈر دیئے تھے وہ جوہانسبرگ کو دھماکوں سے اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔

پھر رجسٹرار نے ہم سے جوابی دلائی مانگے۔ ہم نے اتفاق رائے سے یہ طے کیا تھا کہ ہم روایتی انداز میں عذر خواہی نہیں کریں گے بلکہ اس لمحے کو اس کارروائی سے اپنی نفرت کے اظہار کے لیے استعمال کریں گے۔

''ملزم نمبر 1، نیلسن منڈیلا! کیا تم جرم کا اقرار کرتے ہو یا نہیں کرتے؟''

میں نے اٹھ کر کہا: ''می لارڈ! میں نہیں بلکہ یہ حکومت ہے جسے کٹہرے میں ہونا چاہیے، میں جرم کا اقرار نہیں کرتا۔''

''ملزم نمبر 2، والٹر سیسولو! تم جرم کا اقرار کرتے ہو یا نہیں کرتے؟''

سیسولو: ''اس ملک میں جو کچھ ہوا ہے اس کے ذمے دار حکومت ہے، میں جرم کا اقرار نہیں کرتا۔''

جسٹس ڈی ویٹ نے کہا کہ اسے سیاسی تقریریں سننے میں دلچسپی نہیں بلکہ ہمیں

صرف یہ کہنا چاہیے کہ ہم جرم کا اقرار کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ اس کی یہ ہدایت نظر انداز کر دی گئی۔ ہر ملزم نے جرم کا اقرار نہ کرنے سے پہلے الزام لگایا کہ یہ حکومت ہی ہے جو مجرم ہے۔

وکیل استغاثہ کا ڈراما

کارروائی کے ڈرامے میں جان پیدا کرنے کے لیے سرکار نے یوتار کی تقریر کو براہ راست ساؤتھ افریقن براڈکاسٹنگ سسٹم پر نشر کرنے کے انتظامات کیے تھے۔ پراسیکیوشن ٹیبل پر اور جج کے سامنے مائیکروفون پڑے تھے۔ لیکن عین اس وقت جب یوتار کچھ کہنے کے لیے اپنا گلا صاف کر رہا تھا' برام فشر نے اٹھ کر عدالت سے مائیکروفون ہٹائے جانے کی اس بنا پر درخواست کی کہ اس نشریئے سے عدالتی کارروائی کی غیر جانبداری متاثر ہوگی اور یہ اہتمام عدالت کے وقار سے مناسبت نہیں رکھتا۔ یوتار کے پرزور التماس کے باوجود کہ مائیکروفون رہنے دیئے جائیں' جسٹس ڈی ویٹ نے انہیں ہٹانے کا حکم دیا۔

اپنے خطاب میں یوتار نے دلیل دی کہ اے این سی کے زیر زمین چلے جانے کے وقت سے' اس پارٹی نے تشدد کی پالیسی اپنالی ہے جس کا مقصد گوریلا جنگ کے ذریعے سبوتاژ سے لے کر ملک پر مسلح حملے تک رہنما کردار ادا کرنا ہے۔ اس نے کہا کہ ہم ہزاروں تربیت یافتہ گوریلا یونٹوں کو ملک بھر میں تعینات کرنے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ اور ان یونٹوں کو ایک عام بغاوت برپا کرنا تھی جس کے بعد ایک غیر ملکی طاقت کے فوجی یونٹوں کے ذریعے مسلح حملہ کیا جانا تھا۔ یوتار نے اعلان کیا: ''ملزمان نے منصوبہ بنایا تھا کہ اس طرح پیدا ہونے والی افراتفری' گڑبڑ اور بدنظمی کے دوران ایک عبوری انقلابی کونسل قائم کی جائے گی جو انتظامیہ کی جگہ لے گی اور ملک کا کنٹرول سنبھالے گی۔'' اس بڑے منصوبے کا انجن امخونتو ڈی سزوی تھا' جو اے این سی اور کمیونسٹ پارٹی کی زیر ہدایت حرکت میں آنا تھا اور امخونتو کا ہیڈ کوارٹر

رائیونیا تھا۔

اپنی شاندار نثر میں یوتار نے بیان کیا کہ کس طرح ہم نے ''ایم کے'' کے ارکان بھرتی کیے تھے' کس طرح ہم نے 1963ء کے لیے قومی سرکشی کی منصوبہ بندی کی تھی (یہاں اس نے ہمیں پی اے سی کے ساتھ خلط ملط کر دیا) کس طرح ہم نے رائیونیا میں ایک طاقتور ریڈیو اسٹیشن قائم کیا تھا اور کس طرح ہم سب سبوتاژ کی 222 کارروائیوں کے ذمے دار تھے۔ اس نے کہا الیاس موتسوالیدی اور اینڈریو ملانگینی ارکان بھرتی کرنے کے ذمے دار تھے اور ڈینس برگ' کیمپ میں بھرتی ہونے والوں کے لیے ایک خصوصی اسکول چلاتا تھا۔ اس نے مختلف بموں کی پیداوار اور بیرون ملک سرمایہ جمع کرنے کی تفصیلات بھی بیان کیں۔

بوڑھے نے دانستہ ملزم نمبر 1 کو نہ پہچانا

اگلے تین ماہ کے دوران سرکار نے 173 گواہ پیش کیے اور ہزاروں دستاویزات اور تصاویر پر مشتمل ریکارڈ داخل کیا جس میں مارکسزم کی معیاری تصانیف' گوریلا جنگ کی تاریخیں' نقشے' بلیو پرنٹ اور ڈیوڈ موتسمائی کے نام سے جاری شدہ ایک پاسپورٹ شامل تھے۔ پہلا گواہ ایک پولیس فوٹوگرافر تھا جس نے رائیونیا کی تصاویر لی تھیں اور اگلے گواہ گولڈرائخ فیملی کے گھریلو ملازم تھے جنہیں اس دوران حراست میں رکھا گیا تھا' حالانکہ ان کا گھر والوں کی سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان ملازموں نے کٹہرے میں ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم میں سے اکثر کو پہچان لیا۔ لیکن بوڑھے مسٹر جے لیمان سے جب ملزم نمبر 1 کو شناخت کرنے کے لیے کہا گیا تو اس نے میری مدد کی جرات مندانہ کوشش کرتے ہوئے عذر کیا کہ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اس پر پراسیکیوٹر نے اس سے کہا: ''دوبارہ دیکھو اور تمام چہروں کا غور سے جائزہ لے کر بتاؤ۔'' جے لیمان نے بڑے سکون سے کہا: ''میں نہیں سمجھتا کہ وہ ان میں ہے۔''

ہمیں حیرت تھی کہ میرا جرم ثابت کرنے کے لیے سرکار کے پاس کون سی شہادت ہے۔ میں ان دنوں ملک سے باہر تھا یا جیل میں جب رائیوونیا میں بیشتر منصوبہ بند ہوئی تھی۔ جب سزا یاب ہونے کے فوراً بعد میری پریٹوریا لوکل میں والٹر سے ملاقات ہوئی تھی تو میں نے اسے اس امر کو یقینی بنانے کی تاکید کی تھی کہ فارم سے میری تمام کتابیں اور نوٹس غائب کردیئے جائیں۔ لیکن مقدمے کے پہلے ہفتے کے دوران جب رسٹی برنشٹائن نے ضمانت کی درخواست دی، پرسی یوتار نے ڈرامائی طور پر فورٹ کا نقشہ اور ساتھ فرار کا ایک خاکہ پیش کیا جو میں نے وہاں اپنی نظر بندی کے دوران تیار کیا تھا۔ یوتار نے بلند آہنگ سے کہا کہ یہ اس امر کی شہادت ہے کہ ہم سب فرار ہونا چاہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ رائیوونیا سے میری کوئی چیز غائب نہیں کی گئی تھی۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ رائیوونیا میں میرے ساتھیوں نے فیصلہ کیا تھا کہ میرے فرار کا خاکہ محفوظ کیا جائے کیونکہ مستقبل میں اس کی تاریخی اہمیت ہو گی۔ لیکن فی الوقت یہ خاکہ رسٹی برنشٹائن کی ضمانت کی درخواست میں رکاوٹ بن گیا۔

غدار کی گواہی

سرکاری کا اہم ترین گواہ برونو امٹولو تھا۔ وہ عدالت میں ''مسٹر ایکس'' کے نام سے معروف تھا۔ مسٹر ایکس کا تعارف کراتے ہوئے یوتار نے عدالت کو بتایا کہ جرح تین دن جاری رہے گی اور پھر ڈرامائی انداز میں اس نے کہا کہ گواہ ''موت کے خطرے'' سے دوچار ہے۔ یوتار نے درخواست کی کہ گواہی بند کمرے میں لی جائے لیکن وہاں پریس کے نمائندے موجود ہوں بشرطیکہ وہ گواہ کو شناخت نہ کر سکتے ہوں۔

امٹولو ایک بلند قامت مضبوط جثے کا آدمی تھا جس کی یادداشت عمدہ تھی۔ وہ ڈربن کا زولو تھا جو ''ایم کے'' کے علاقہ نٹال کا رہنما بن گیا تھا۔ وہ ایک تجربہ کار

سبوتاژ کار تھا اور رائیو ونیا میں رہ چکا تھا۔ میں اس سے صرف ایک بار ملا تھا جب میں نے براعظم افریقہ کے دورے سے واپسی پر نٹال میں اس کے ''ایم کے'' لیڈر کے گروہ سے خطاب کیا تھا۔ میرے متعلق اس کی گواہی نے بالخصوص مجھے احساس دلایا کہ حکومت مجھے مجرم ٹھہرانے میں یقیناً کامیاب رہے گی۔

اس نے کہنا شروع کیا کہ وہ ایک ''ایم کے'' سبوتاژ کار تھا جس نے ایک میونسپل آفس، بجلی گھر کے پھاٹک اور ایک پاور لائن کو دھماکے سے اڑایا تھا۔ بڑے موثر اور قطعی انداز میں اس نے بم، زمینی سرنگیں اور گرنیڈ چلانے کی وضاحت کی اور یہ بھی بتایا کہ کس طرح ''ایم کے'' زیر زمین کام کرتی تھی۔ امٹولو نے کہا کہ اگرچہ اے این سی کے نظریات پر اس کا یقین کبھی متزلزل نہیں ہوا مگر جب اسے احساس ہوا کہ اے این سی اور ''ایم کے'' کمیونسٹ پارٹی کی آلہ کار ہیں تو پارٹی پر اس کا یقین جاتا رہا۔

امٹولو کی گواہی میں سادگی اور کھرا پن تھا لیکن اس نے اسے بنا سنوار کر پیش کرنے میں دوراز کار انداز اختیار رکھا۔ بلاشبہ یہ حرکت اس نے پولیس کے ایماء پر کی تھی۔ اس نے عدالت کو بتایا کہ میں نے نٹال ریجنل کمانڈ کے بارے میں ریمارکس دیتے ہوئے کہا تھا کہ تمام ''ایم اے'' کیڈر کو اچھے کمیونسٹ بھی ہونا چاہیے لیکن انہیں اپنے نظریات عوامی سطح پر افشا نہیں کرنے چاہئیں۔ درحقیقت میں نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اس کی گواہی کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ مجھے اور ''ایم کے'' کو کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ قرار دیا جائے۔

میں امٹولو کی غداری پر ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے اس امکان کو کبھی رد نہیں کیا تھا کہ اے این سی کے سینئر آدمی بھی پولیس تشدد کے تحت راز گل سکتے ہیں۔ لیکن سب بیانات سے ظاہر ہوتا تھا کہ امٹولو پر پولیس نے کبھی جسمانی تشدد نہیں کیا۔ کٹہرے میں اس نے ان لوگوں کو بھی ملوث کرنے کی کوشش کی جن کا مقدمے میں ذکر تک نہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ دل کا تبدیل ہو جانا ممکن ہے مگر اتنے سارے دیگر افراد سے

غداری، جن میں کئی بالکل بے گناہ تھے، میرے نزدیک ناقابل معافی تھی۔

جرح کے دوران ہمیں معلوم ہوا کہ امٹولو ''ایم کے'' میں شامل ہونے سے پہلے ایک نامی گرامی مجرم رہا تھا اور چوری کے الزام میں تین بار جیل گیا تھا۔ لیکن ان انکشافات کے باوجود وہ انتہائی نقصان دہ گواہ ثابت ہوا کیونکہ جج کے نزدیک وہ قابل اعتبار اور قابل یقین تھا اور اس کی گواہی نے تقریباً ہم سب کو مجرم بنا دیا۔

سرکار کے کیس کی بنیاد پر چھ صفحات کا پلان آف ایکشن تھا جو رایوونیا کے چھاپے میں ضبط کیا گیا تھا۔ ہائی کمان کے رہنما اس دستاویز کو میز پر لیے بیٹھے تھے جب پولیس فارم میں آدھمکی تھی۔ آپریشن مائی بوئی عمومی شکل میں ایک پلان پیش کرتا تھا جس کا مقصد ممکنہ طور پر گوریلا آپریشن شروع کرنا تھا اور اس میں یہ درج تھا کہ حکومت کے خلاف ایک مسلح عوامی بغاوت کو کیسے ہوا دی جا سکتی ہے۔ اس میں جنوبی افریقہ کے چار مختلف علاقوں میں چھوٹے گوریلا دستے اتارنے اور پہلے سے منتخب اہداف پر حملہ کرنے کا ذکر تھا۔ یہ دستاویز ملک بھر میں ابتدائی طور پر سات ہزار کے لگ بھگ ایم کے رنگروٹ بھرتی کرنے کا ہدف دیتی تھیں جنہیں ایک سو بیس تربیت یافتہ گوریلوں کے ابتدائی بیرونی دستے سے مل کر کام کرنا تھا۔

میرے نزدیک گوریلا جنگ قابل عمل نہ تھی

استغاثہ کا کیس بڑی حد تک اس دعویٰ پر مبنی تھا کہ آپریشن مائی بوئی کو اے این سی ایگزیکٹو نے منظور کیا تھا اور یہ ''ایم کے'' کا آپریٹنگ پلان بن گیا تھا۔ ہم نے یہ موقف پیش کیا کہ آپریشن مائی بوئی ابھی رسمی طور پر اختیار نہیں کیا گیا تھا اور گرفتاریوں کے وقت ابھی زیر بحث تھا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا، آپریشن مائی بوئی ایک ڈرافٹ دستاویز تھا جو نہ صرف منظور نہیں ہوا تھا بلکہ اپنے مقاصد اور منصوبوں میں سراسر غیر حقیقت پسندانہ تھا۔ میں یہ خیال نہیں کرتا تھا کہ گوریلا جنگ اس مرحلے پر ایک قابل عمل آپشن ہے۔

یہ منصوبہ میری غیر موجودگی میں ڈرافٹ کیا گیا تھا۔لہٰذا مجھے اس کے بارے میں بہت کم علم تھا۔رائیو ونیا کا مقدمہ بھگتنے والوں کے نزدیک بھی اس امر پر اختلاف تھا کہ آیا اس منصوبے کو اے این سی کی پالیسی کے طور پر منتخب کیا گیا تھا یا نہیں۔گووان' جس نے جوسلاوو کے ساتھ اس دستاویز کو ڈرافٹ کیا تھا' اس کا اصرار تھا کہ اس پر اتفاق رائے ہوا تھا اور اس کے خیال میں عدالت میں ہمارا یہ کہنا غلط تھا کہ یہ ابھی تک زیر بحث تھا۔لیکن دوسرے تمام ملزمان یہ کہتے تھے کہ یہ دستاویز جس کا خاکہ ہائی کمان نے تیار کیا تھا' اے این سی ایگزیکٹو کی طرف سے منظور نہیں کی گئی تھی اور چیف لوتھولی نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔اگرچہ ایک بڑا مقدمہ خاصا سنگین اور ڈراونا ہوسکتا تھا' ہمارے جذبے بالعموم بلند تھے۔ہم سب آپس میں پھانسی کے بارے میں ہنسی مذاق کرتے رہتے تھے۔ڈینس گولڈبرگ جو ملزمان میں سب سے کم عمر تھا' مزاح کی ناقابل روک حس رکھتا تھا اور اکثر ہمیں اس وقت بھی ہنسائے رکھتا جب ہمیں ہنسنا نہیں چاہیے تھا۔جب استغاثہ کے ایک گواہ نے بیان کیا کہ کس طرح ریمونڈ اصلابا کو بھیس بدلنے کے لیے ایک پادری کا سا کالر پہننا پڑا تھا' ڈینس نے اسے عزت ماب اصلابا کا نام دے کر ہمیں ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

سوین پول کی حماقت

نچلی منزل پر اپنے مشاورت کے کمرے میں ہم اکثر تحریری نوٹ لکھ کر باہم تبادلہ خیال کرتے تھے جنہیں ہم بعد میں جلا کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے تھے۔سپیشل برانچ کا ایک آفیسر جو ہماری نگرانی پر مامور تھا' لیفٹیننٹ سوین پول تھا۔وہ ایک ہٹا کٹا سرخ چہرے والا آدمی تھا جسے یقین تھا کہ ہم ہمیشہ اس کے درپے آزار رہتے ہیں۔ایک روز جب سوین پول دروازے سے ہماری نگرانی کر رہا تھا' گوان امبیکی نے خفیہ انداز میں ایک نوٹ لکھا۔پھر ڈرامائی انداز میں اس نے وہ نوٹ مجھے تھما دیا۔میں نے اسے پڑھا اور شعوری انداز میں سر ہلاتے ہوئے کیتھی کے سپرد کر دیا'

جس نے ظاہر داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیا سلائی نکالی جیسے نوٹ کو جلانا چاہتا ہو۔اسی وقت سوین پول کمرے میں آدھمکا۔اس نے کیتھی کے ہاتھوں سے کاغذ کا پرزہ چھینا اور کمرے کے اندر دیا سلائی جلانے کے خطرات کے متعلق کچھ کہا‘ پھر وہ کمرے سے باہر چلا گیا تا کہ اسے پڑھ لے۔چند سیکنڈ بعد وہ یہ کہتے ہوئے طوفان کی طرح واپس آیا۔"میں اس کے لیے تم سب کی ٹھکائی کروں گا۔" گوان نے بڑے لفظوں میں اس پر لکھا تھا۔"کیا سوین پول ایک خوش نما چھوکرا نہیں؟"

ہم جیل میں بند تھے اور ہماری جانیں آزمائش میں تھیں لیکن باہرنئ زندگی پھوٹ رہی تھی۔جمی کانٹر کی بیوی کی گود میں بچہ ہونے والا تھا۔جمی ایک وکیل تھا جسے سرکار کی طرف سے صرف اس لیے مقدمے میں الجھالیا گیا تھا کہ وہ ہیرلڈ وولپے کا برادر نسبتی تھا۔

مجھے نومولود کا گاڈ فادر بننا پڑا

ایک صبح سب ہم کٹہرے میں بیٹھے تھے‘ دوسرے سے ایک نوٹ میری طرف منتقل ہوا۔اس پر لکھا تھا:

"باربرا اور میں نے ممکنہ گاڈ فادرز پر بحث کی ہے اور آخر کار ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ خواہ لڑکا ہو یا لڑکی‘ آپ ماضی میں جو کہیں زیادہ نامعقول عہدے سنبھالتے رہے ہیں‘ اگر انہیں کی ذیل میں ہمارے بچے کے گاڈ فادر (مذہبی اتالیق) کا منصب قبول کرنے پر رضامند ہو جائیں تو ہم اسے اپنے لیے ایک اعزاز خیال کریں گے۔
"

واپس ڈاک سے میں نے جمی کو یہ نوٹ بھیجا:

"مجھے یہ منصب قبول کر کے کہیں زیادہ خوشی ہوگی‘ اور یہ میرے لیے اعزاز ہوگا‘ بچے کے لیے نہیں۔اب حکومت مجھے پھانسی پر لٹکانے کی جرات نہیں کر سکے گی۔"

سرکاری کیس 1963ء کے ایام کرسمس کے دوران جاری رہا اور 29 فروری

1964ء کو اختتام پذیر ہوا۔ ہمارے پاس شہادتوں کا جائزہ لینے اور اپنی صفائی کی تیاری کرنے کے لیے ایک ماہ سے کچھ اوپر وقت تھا۔ ہم استغاثہ کی شہادتوں سے یکساں متاثر نہیں ہوئے تھے۔ جیمز کانٹر کے خلاف کوئی گواہی نہیں تھی۔ وہ ہماری پارٹی کا رکن بھی نہیں تھا۔ اور اس پر کسی طرح مقدمہ نہیں چلنا چاہیے تھا۔ رسٹی برنشٹائن' ریمونڈ اصلابا اور احمد کاتھرادا کے معاملے میں ان کے سازش میں ملوث ہونے کی گواہی کمزور تھی' لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ انہیں جرم کا اقرار نہیں کرنا چاہیے۔ رسٹی کے معاملے میں تو گواہی یکسر نظر انداز کیے جانے کے قابل تھی۔ اسے صرف دوسروں کے ہمراہ رائیوونیا میں موجود ہونے پر پکڑ لیا گیا تھا۔ ہم میں سے باقی چھ کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ ہم بعض الزامات پر اپنے جرم کا اعتراف کر لیں گے۔

برام انتہائی قنوطیت پسند تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ خواہ ہم یہ ثابت کر دیں کہ گوریلا جنگکی منظوری نہیں دی گئی تھی اور ہماری سبوتاژ کی پالیسی کا مقصد انسانی جانوں کا اتلاف نہیں تھا' حکومت پھر بھی ہمیں سزائے موت دے سکتی ہے۔ وکلاء صفائی میں اس امر پر اختلاف تھا کہ آیا ہمیں عدالت میں بیان حلفی دینا چاہیے کہ نہیں۔ بعض کا کہنا تھا کہ اگر ہم نے بیان دے دیئے تو ہمارا کیس کمزور ہو جائے گا' تاہم جارج بیزوس نے کہا کہ اگر ہم بیان نہیں دیتے اور جج کو قائل نہیں کرتے کہ ہم نے گوریلا جنگ کا فیصلہ نہیں کیا تھا تو وہ یقیناً انتہائی سزا کا حکم صادر کر دے گا۔

ہمارا ایک حیرت انگیز فیصلہ

شروع ہی سے ہم نے واضح کر دیا تھا کہ ہم اس مقدمے کو قانون کی آزمائش کے لیے نہیں بلکہ اپنے نظریات کے پرچار کے لیے استعمال کریں گے۔ مثلاً ہم اس سے انکار نہیں کریں گے کہ ہم سبوتاژ کی کارروائیوں کے ذمہ دار تھے۔ ہم انکار نہیں کریں گے کہ ہمارا ایک گروہ عدم تشدد کی پالیسی سے ہٹ گیا تھا۔ ہمیں اپنی رہائی یا سزا میں کمی کروانے سے دلچسپی نہ تھی بلکہ ہمیں اس مقدمے کے ذریعے اس اعلیٰ مقصد کو

مستحکم کرنے میں دلچسپی تھی جس کے لیے ہم جدوجہد کر رہے تھے' خواہ ہمیں اس کی کوئی بھی قیمت دینی پڑتی۔ ہمیں قانونی اور اخلاقی مفہوم میں اپنی صفائی پیش نہیں کرنی تھی۔ ہم نے اس مقدمے کو دوسرے ذرائع سے کی جانے والی جدوجہد کا تسلسل سمجھا تھا۔ ہمیں ان باتوں کا فوری اعتراف کر لینا تھا جنہیں حکومت سچ سمجھتی تھی لیکن کوئی ایسی اطلاع فراہم نہیں کرنی تھی جس کے بارے میں ہم سمجھتے تھے کہ وہ دوسروں کو مقدمے میں الجھا سکتی ہے۔

ہمیں حکومت کے اس مرکزی موقف پر اعتراض کرنا تھا کہ ہم گوریلا جنگ پر اتر آئے تھے۔ ہمیں اعتراف کرنا تھا کہ ہم نے سبوتاژ کی کارروائیاں ناکام ہونے کی صورت میں گوریلا جنگ شروع کرنے کا ہنگامی منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن ہمیں یہ دعویٰ کرنا تھا کہ سبوتاژ کی مہم ابھی ناکام نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کے لیے کافی کوشش نہیں کی گئی تھی۔

ہمیں بے گناہ لوگوں کے قتل اور نقصان کا انکار کرنا تھا' جس کا حکومت ہم پر الزام لگاتی تھی' خواہ یہ دعویٰ صریحاً جھوٹ تھا یا ایسے واقعات کسی اور کی شرارت تھے۔ ہم نے غیر ملکی فوجی دستوں کی مداخلت کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ یہ دعوے کرنے کے لیے ہمارا خیال تھا کہ ہمیں عدالت کے سامنے آپریشن مائی بوئی کی وضاحت کرنی پڑے گی۔

اچھا کمیونسٹ کیسے بنا جائے؟

میرے اپنے معاملے میں عدالت کے پاس سزا دینے کے لیے کافی شہادت تھی۔ میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی دستاویزات ظاہر کرتی تھیں کہ میں غیر قانونی طور پر ملک سے باہر گیا تھا' اپنے آدمیوں کے لیے فوجی تربیت کا اہتمام کیا تھا اور امخونتو وی سزوی کی تشکیل میں میرا ہاتھ تھا۔ میری تحریر میں ایک اور دستاویز تھی جس کو "ایک اچھا کمیونسٹ کیسے بنا جائے" کا عنوان دیا گیا اور حکومت سمجھتی تھی کہ یہ اس امر کا

ثبوت ہے کہ میں ایک کارڈ رکھنے والا کمیونسٹ تھا۔ دراصل اس دستاویز کا عنوان لیوشاؤچی نامی چینی نظریہ ساز کی تصنیف سے لیا گیا تھا اور میں نے اسے موسز کوٹانی کے لیے ایک نکتے کا ثبوت پیش کرنے کے لیے تحریر کیا تھا۔ (لیوشاؤچی بعد میں چین کے صدر رہے۔) ہم عام جنوبی افریقیوں کے لیے کمیونزم کی اپیل کی بارے میں ایک رواں بحث مباحثے میں مصروف رہے تھے۔ میں نے طویل عرصے میں یہ موقف اختیار کیا تھا کہ کمیونسٹ ادب بڑی حد تک بوجھل، مخفی اور مغربی ارتکاز کا حامل ہے، لیکن اسے سادہ، واضح اور افریقی عوام سے متعلق ہونا چاہیے۔ موسز کو اصرار تھا کہ ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے نکتے کو ثابت کرنے کے لیے میں نے لیو کا مضمون لے کر اسے افریقن سامعین کے لیے دوبارہ لکھا تھا۔

میں پہلا گواہ بننے والا تھا، لہذا مجھے صفائی کا رخ متعین کرنا تھا۔ جنوبی افریقی عدالتوں میں گواہی کے کٹہرے میں گواہی صرف سوال کے جواب کی شکل میں دی جا سکتی ہے۔ میں اس روش پر کاربند رہنا نہیں چاہتا تھا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ بیان حلفی دینے کے بجائے میں کٹہرے میں ایک بیان پڑھ دوں گا جبکہ دوسرے بیان حلفی دیں گے اور جرح کے عمل سے گزریں گے۔

چونکہ کٹہرے میں بیان دینے والے گواہ پر جرح نہیں کی جاتی اور نہ جج کی طرف سے سوال کیے جاتے ہیں، اس کا بیان ایک عام بیان حلفی جیسا قانونی وزن نہیں رکھتا۔ جو افراد ایسا بیان دینے کی راہ اختیار کرتے ہیں وہ عموماً ایسا جرح سے بچنے کے لیے کرتے ہیں۔ ہمارے وکلاء نے مجھے انتباہ کیا کہ اس طرح میں نازک تر قانونی صورتحال میں الجھ جاؤں گا، میں نے اپنے بیان میں اپنی بے گناہی کے متعلق جو بھی بات کہی، جج اسے مسترد کر دے گا لیکن یہ ہماری اعلیٰ ترجیح رہی تھی۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ اپنی سیاست اور نظریات کے بارے میں ایک بیان سے اپنی صفائی کا آغاز کرنا اہم ہو گا جس سے بعد والوں کے لیے ایک سیاق و سباق قائم ہو جائے گا۔ میں پریں

یوتا رسے تیغ آزمائی کرنا چاہتا تھا لیکن یہ زیادہ اہم تھا کہ میں اس پلیٹ فارم کو اپنے مسائل نمایاں کرنے کے لیے استعمال کروں۔

ہم نے سرکاری وکیل کو الو بنایا

ہم نے سب یہ باہمی مشورے اور زیادہ تر تحریری نوٹس کے ذریعے طے کیا تھا کیونکہ کمرے مشاورت میں جاسوسی کے آلات لگے ہوئے تھے' ہم نے سرکار کے ان جاسوسی آلات کو بھی اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا اور انہیں غلط اور جھوٹی باتیں فراہم کیں۔ ہم نے اشارہ دیا کہ میں بیان حلفی دوں گا تا کہ وہ اپنا وقت جرح کی منصوبہ بندی میں صرف کریں۔ ایک مصنوعی گفتگو کے دوران میں نے اپنے وکیل جوئل جوفے کو بتایا کہ مجھے مقدمہ بغاوت کا ریکارڈ درکار ہو گا تکہ میں اپنا بیان حلفی تیار کرسکوں۔ ہم اس تصور پر مسکرا دیئے رہے گا۔

میں نے اپنا بیان تیار کرنے میں تقریباً دو ہفتے گزارے اور زیادہ تر کام شاموں کو اپنے کوٹھڑی میں کیا۔ جب یہ کام کر چکا تو میں نے اپنے رفیقوں اور ساتھی ملزموں کو پڑھ کر سنایا۔ انہوں نے اس کی منظوری دے دی اور چند تبدیلیوں کا مشورہ دیا۔ پھر میں نے برام فشر سے کہا کہ اس کا جائزہ لے۔ برام اسے پڑھ کر تشویش میں مبتلا ہو گیا اور ہال ہنسن نامی ایک معزز وکیل سے کہا کہ اسے پڑھ لے۔ ہنسن نے برام کو بتایا: ''اگر منڈیلا نے عدالت میں یہ بیان پڑھا تو وہ اسے سیدھے کمرہ عدالت کے پیچھے سے لے جائیں گے اور پھانسی پر لٹکا دیں گے۔'' اس سے برام کی تشویش کی تصدیق ہوتی تھی' چنانچہ اگلے روز وہ میرے پاس آیا اور اس نے زور دیا کہ میں تقریر میں ترمیم کرلوں۔ میں نے محسوس کیا کہ ہمیں پھانسی پر لٹکائے جانے کا امکان ہے' خواہ ہم عدالت میں کچھ ہی کیوں نہ کہیں' لہٰذا ہمیں وہ یہ کچھ کہنا چاہیے جس پر حقیقتاً یقین رکھتے ہیں۔ اس وقت ماحول انتہائی ڈراؤنا تھا اور اخبارات مسلسل خیال آرائی کر رہے تھے کہ ہمیں سزائے موت ملے گی۔ برام نے مجھ سے التجا کی کہ میں آخری پیرا

گراف نہ پڑھوں مگر میں اپنی بات پر اڑا رہا۔

ہماری صفائی کا آغاز

سوموار بیس اپریل کو سخت ترین سکیورٹی کے تحت ہمیں ایوان انصاف میں لے جایا گیا۔ اس بار ہماری صفائی شروع ہو رہی تھی۔ ونی میرے بھائی کے ہمراہ وہاں موجود تھی اور جب ہم عدالت میں داخل ہوئے تو میں نے ان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ عدالت اس بار بھی بھری ہوئی تھی۔

برام نے اعلان کیا کہ سرکاری شہادتوں کے بعض حصے ملزمان تسلیم کر لیں گے اور اس پر عدالت میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ لیکن برام کہتا چلا گیا کہ وکلاء صفائی سرکار کے بہت سے بیانات کا انکار کریں گے جن میں یہ دعویٰ بھی شامل تھا کہ امخونتو وی سزوی اے این سی کا عسکری بازو تھی۔ اس نے کہا کہ اے این سی اور ''ایم کے'' کے رہنماؤں نے ''ان دونوں تنظیموں کو الگ الگ رکھنے کی پوری کوشش کی۔ وہ ہر بار اس میں کامیاب نہ ہوئے لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر کوشش کی گئی تھی۔'' اس نے پرزور الفاظ میں اس الزام کی تردید کی کہ اے این سی کمیونسٹ پارٹی سے ہدایات لیتی تھی۔ اس نے کہا کہ ہم اس الزام کو چیلنج کریں گے کہ گولڈبرگ' کاتھرادا' برنشٹائن اور اصلابا امخونتو کے ارکان ہیں۔ اس نے کہا کہ ہم ثابت کریں گے کہ فی الواقع امخونتو نے آپریشن مائی بوئی کو نہیں اپنایا تھا اور یہ کہ ''ایم کے'' نے گوریلا جنگ کی تیاریاں نہیں کی تھیں۔

''اس کا انکار کیا جائے گا؟'' جسٹس ڈی ویٹ نے یوں پوچھا جیسے انہیں برام کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

''ہاں' اس کا انکار کیا جائے گا۔'' برام نے جواب دیا۔ ''شہادت سے یہ ثابت ہو گا کہ جبکہ گوریلا جنگ کی تیاریاں کی جا رہی تھیں' اس نوع کا کوئی منصوبہ کبھی نہیں اپنایا گیا تھا۔ اس پورے عرصے میں میں امید کی جاتی رہی کہ ایسے اقدام سے احتراز کیا

جا سکتا ہے۔''

پھر اپنی نرم آواز میں برام نے کہا: ''می لارڈ! صفائی کا کیس کٹہرے سے ملزم نمبر 1 کے بیان سے شروع ہوگا جس نے امخونتو کے قیام میں ذاتی طور پر حصہ لیا تھا اور جو عدالت کو تنظیم کے آغاز سے آگاہ کر سکے گا۔''

اس پر یوتار میز سے اچھلا اور پکار کر کہا: ''می لارڈ! می لارڈ!'' وہ پریشانی ہو گیا تھا کہ میں بیان حلفی نہیں دے رہا کیونکہ اس نے بلاشبہ میری جرح کے لیے تیاری کی تھی۔ اس نے قدرے مایوسی میں کہا: ''می لارڈ! کٹہرے سے بیان اتنا وزن نہیں رکھتا جتنا کہ ایک حلفیہ گواہی......''

جسٹس ڈی ویٹ نے رکھائی سے جواب دیا: ''ڈاکٹر یوتار! میرا خیال ہے وکیل صفائی اتنا کافی تجربہ رکھتا ہے کہ اپنے موکلان کو آپ کی مدد کے بغیر مشورہ دے سکے۔'' اس پر یوتار بیٹھ گیا۔

''نہ ہم اور نہ ہمارے موکلان کریمنل کوڈ کی دفعات سے ناواقف ہیں۔'' برام نے کہا۔ ''میں نیلسن منڈیلا کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اپنا بیان پڑھے۔''

عدالت میں میرا اعتراف

میں نے اٹھ کر کمرۂ عدالت کی طرف رخ کیا اور آہستگی سے پڑھنے لگا:

میں پہلا ملزم ہوں۔

میں بی اے کی ڈگری رکھتا ہوں اور میں نے جوہانسبرگ میں کئی سال مسٹر آلیور ٹیمبو کی شراکت میں ایک وکیل کی حیثیت سے پریکٹس کی۔ میں ایک سزا یافتہ قیدی ہوں اور اجازت کے بغیر ملک چھوڑنے اور مئی 1961ء کے آخر میں لوگوں کو ہڑتال پر اکسانے کے جرم میں پانچ سال کی سزا کاٹ رہا ہوں۔

میں برملا اعتراف کرتا ہوں کہ میں ان لوگوں میں سے ایک تھا جنہوں نے امخونتو وی سزوی کی تشکیل میں مدد دی تھی اور یہ کہ میں نے اس کے معاملات میں نمایاں رول ادا کیا تھا یہاں تک کہ مجھے اگست 1962ء میں گرفتار کر لیا گیا۔

میں شروع ہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ کارروائی کے آغاز میں سرکار کا یہ کہنا کہ جنوبی

افریقہ کی جدوجہد آزادی غیر ملکیوں یا کمیونسٹوں کے زیر اثر ہے' سراسر غلط ہے۔ میں نے انفرادی طور پر اور اپنی قوم کے رہنما کی حیثیت سے جو کچھ کیا ہے وہ جنوبی افریقہ میں اپنے تجربات اور اپنے پر فخر افریقی پس منظور کے احساس کے باعث کیا ہے اور اس وجہ سے نہیں کہ کسی غیر ملکی نے کیا کہا ہے۔

''میں ٹرانسکائی میں اپنی جوانی کے زمانے میں اپنے قبیلے کے بڑوں کو پرانے دنوں کی کہانیاں بیان کرتے سنتا تھا۔ جو کہانیاں وہ مجھے سناتے تھے' وہ ان جنگوں کی کہانیاں تھیں جو ہمارے آباء واجداد نے پدری وطن کے دفاع کے لیے لڑی تھیں۔ ڈنگانے اور بمباتھا' ہنٹسا اور ماکان' سقنگاتھی اور ڈالاسیلے' موشوشو اور سیخوخونے کے نام پوری افریقی قوم کی آن اور شان کی حیثیت سے سراہے جاتے تھے۔ تب مجھے امید تھی کہ زندگی مجھے اپنی قوم کی خدمت کرنے اور اس کی آزادی کی جدوجہد میں اپنا سا کردار ادا کرنے کا موقع فراہم کرے گی۔ اس مقدمے میں میرے خلاف جو الزامات ہیں' ان کے حوالے سے میں نے جو کچھ کیا ہے اس کی تحریک مجھے اسی امید سے ملی ہے۔

''اب مجھے تشدد کے سوال پر کچھ کہنا ہے۔ بعض باتیں جو عدالت میں کہی گئی ہیں سچ ہیں اور بعض غلط ہیں' تاہم میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میں نے سبوتاژ کی کارروائیوں کی منصوبہ بندی کی تھی۔ میں نے اس کا منصوبہ بے فکری کے جذبے سے نہیں بنایا تھا یا اس لیے نہیں کہ مجھے تشدد سے محبت ہے۔ میں نے اس کا منصوبہ اس سیاسی صورتحال کے تسلی بخش اور سنجیدہ جائزے کے بعد بنایا تھا جو سفید فاموں کی طرف سے میری قوم پر برسوں کے جبر' استحصال اور ظلم کے نتیجے میں ابھری تھی۔''

''ہم خانہ جنگی نہیں چاہتے تھے''

میں عدالت کو احساس دلانا چاہتا تھا کہ ہم نے کوئی کام غیر ذمہ داری سے یا پرتشدد سرگرمیاں اختیار کرنے کی پیچیدگیوں پر سوچ بچار کیے بغیر نہیں کیا تھا۔ میں نے اس

امر پر خاص طور پر زور دیا کہ ہم نے انسانی زندگی کو نقصان پہنچانے کا عزم کر رکھا تھا۔ میں نے کہا:

''ہم' اے این سی کے لوگ' ہمیشہ ایک غیر نسلی جمہوریت کے علمبردار رہے ہیں اور ہم نے ہر اس اقدام سے احتراز کیا جو قوموں کو ایک دوسری سے پہلے کی نسبت زیادہ دور کر سکتا تھا۔ لیکن سخت حقائق یہ تھے کہ پچاس برس کی عدم تشدد کی پالیسی نے افریقی عوام کو زیادہ جابرانہ قوانین اور کم سے کم حقوق کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔ ممکن ہے اس عدالت کے لیے یہ سمجھنا آسان نہ ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک عرصے سے لوگ تشدد کی باتیں کر رہے تھے اور اس دن کی باتیں کر رہے تھے جب وہ سفید آدمی سے لڑ کر اپنا ملک واپس حاصل کر سکیں گے...... اور ہم' اے این سی کے رہنماؤں نے ہمیشہ ان پر اثر انداز ہو کر انہیں تشدد سے احتراز کرنے اور پرامن ذرائع استعمال کرنے کی تلقین کی تھی۔ جبکہ ہم میں سے بعض نے مئی جون 1961ء میں اس پر بحث کی تھی' اس امر کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عدم تشدد سے غیر نسلی مملکت حاصل کرنے کی ہماری پالیسی سے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا اور اس پالیسی پر ہمارے پیروکاروں کا اعتماد متزلزل ہونے لگا تھا اور وہ دہشت پسندی کے پریشان کن تصورات اپنانے لگے تھے۔''

''اُمخونتو کی تشکیل نومبر 1961ء میں ہوئی تھی۔ جب ہم نے یہ فیصلہ کیا اور اس کے بعد اپنے منصوبے وضع کیے تو عدم تشدد اور نسلی ہم آہنگی کا اے این سی کا ورثہ ہمارے ساتھ تھا۔ ہم محسوس کرتے تھے کہ ملک خانہ جنگی کی طرف بڑھ رہا ہے جس میں کالے اور گورے ایک دوسرے سے لڑیں گے۔ ہم اس صورتحال کو پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ خانہ جنگی کا مطلب ان تصورات کی تباہی تھا جن کی اے این سی علمبردار تھی۔ خانہ جنگی سے نسلی امن کا حصول پہلے سے کہیں زیادہ مشکل ہو جاتا۔ جنوبی افریقہ کی تاریخ میں جنگ کے نتائج کی مثالیں پہلے ہی ہمارے سامنے ہیں۔

جنوبی افریقی (اینگلوبوئر) جنگ کے زخم مندمل ہونے میں پچاس سال سے زیادہ عرصہ لگا ہے۔اب بین النسلی خانہ جنگی کے زخم مندمل ہونے میں پچاس سال سے زیادہ عرصہ لگا ہے۔اب بین النسلی خانہ جنگی کے زخم مندمل کرنے میں کتنا عرصہ لگتا جو طرفین کے بے پناہ جانی نقصان کے بغیر نہیں لڑی جا سکتی؟''

میں نے کہا: ''سبوتاژ کی پالیسی مستقبل کے نسلی تعلقات کے لیے بہترین امید پیش کرتی تھی۔ ہمارا اولین کوششوں پر گورے حکمرانوں کا ردعمل تیز وتند اور وحشیانہ تھا۔سبوتاژ کی کارروائیوں کو ایسا جرم قرار دے دیا گیا جس کی سزا موت ہے۔ہم خانہ جنگی نہیں چاہتے تھے لیکن ہمیں ضرورت تھی کہ اس کے لیے تیار رہیں۔

''تجربے نے ہمیں قائل کیا تھا کہ بغاوت حکومت کو ہماری قوم کے ظالمانہ قتل عام کے غیر محدود مواقع فراہم کرے گی۔لیکن چونکہ جنوبی افریقہ کی سرزمین پہلے ہی معصوم افریقیوں کے خون سے تر بتر تھی، ہم اسے اپنا فرض محسوس کرتے تھے کہ اپنی قوم کو ظالم قوت سے بچانے کے لیے ایک طویل المیعاد منصوبے کے طور پر قوت استعمال کرنے کی تیاریاں کریں۔اگر جنگ ناگزیر تھی تو ہم چاہتے تھے کہ لڑائی ایسی شرائط پر ہو جو ہماری قوم کے لیے سب سے زیادہ سازگار ہوں۔وہ لڑائی جو ہمارے لیے بہترین امکانات اور طرفین کے کم سے کم جانی نقصانات کی ضمانت دیتی تھی، وہ گوریلا جنگ تھی، لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ مستقبل کی تیاریوں میں گوریلا جنگ کے امکان کو شامل کریں۔

فریڈم چارٹر یا اشتراکی بلیو پرنٹ

''تمام گوروں کو لازمی فوجی تربیت دی جاتی ہے لیکن افریقیوں کو ایسی تربیت نہیں دی گئی۔ہمارے خیال میں یہ لازم تھا کہ تربیت یافتہ افراد کا ایک گروہ تیار کیا جائے جو ایسی قیادت فراہم کر سکے جو گوریلا جنگ شروع ہونے کی صورت میں درکار ہو گی۔ہمیں ایسی صورتحال کے لیے تیاری کرنی تھی اس سے پہلے کہ مناسب تیاری

کرنے میں بہت تاخیر ہو جاتی۔‘‘

میں نے وضاحت کی کہ اس مرحلے پر جب ہماری گفت وشنید چل رہی تھی، میں پیف میکسا (Paf Mecsa) کانفرنس میں شرکت اور فوجی تربیت حاصل کرنے کے لیے ملک سے باہر چلا گیا۔ میں نے کہا کہ میں نے تربیت اس لیے حصال کی کہ اگر گوریلا جنگ چھڑ جائے تو میں اپنی قوم کے شانہ بشانہ کھڑا ہو کر لڑسکوں۔ پھر بھی میں اس پر امر پر یقین رکھتا تھا کہ سبوتاژ کے امکانات دور از کار ہیں اور انہیں شدت سے مسترد کر دینا چاہیے۔

میں نے عدالت کو اے این سی اور ’’ایم اے‘‘ کے مابین خط فاصل سے آگاہ کیا کہ بتایا کہ کس طرح ہم نے ان دونوں کو جدا جدا رکھنے کی صدق دلانہ کوششیں کیں۔ یہ ہماری پالیسی تھی لیکن عملاً یہ اتنی سادہ نہیں تھی۔ قید و بند کے باعث لوگوں کو اکثر دونوں تنظیموں میں کام کرنا پڑتا تھا۔ اگرچہ اس طرح کبھی کبھی دونوں کا امتیاز مبہم ہو جاتا تھا لیکن یہ ختم نہ ہو سکا۔ میں نے سرکار کے اس الزام کی تردید کی کہ اے این سی اور کمیونسٹ پارٹی کے اغراض و مقاصد ایک ہی تھے۔ میں نے کہا:

’’اے این سی کا نظریاتی عقیدی افریقی قوم پرستی کا عقیدہ ہے یہ ہمیشہ رہا ہے۔ یہ افریقی قوم پرستی کا وہ تصور نہیں ہے جو اس نعرے میں عیاں ہے: ’’سفید آدمی کو سمندر میں دھکیل دو۔‘‘ اے این سی جس افریقی قوم پرستی کی علمبردار ہے وہ افریقی عوام کی اپنے ملک میں آزادی اور تکمیل اور تسکین کا نظریہ ہے۔ اے این سی کی طرف سے اختیار کی گئی اہم ترین سیاسی دستاویز اس کا فریڈم چارٹر ہے۔ یہ کسی طرح بھی ایک سوشلسٹ ریاست کا بلیو پرنٹ نہیں۔ اے این سی نے اپنی تاریخ کے کسی دور میں کبھی ملک کے اقتصادی ڈھانچے میں انقلابی تبدیلی کی وکالت نہیں کی۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس نے سرمایہ دارانہ معاشرے پر کبھی تنقید نہیں کی۔

’’کمیونسٹ پارٹی کے برعکس اے این سی صرف افریقیوں کو رکن بناتی تھی۔ اس کا

بڑا مقصد افریقی عوام کے اتحاد اور ان کے لیے مکمل سیاسی حقوق کا حصول تھا اور آج بھی ہے۔ اس کے برعکس کمیونسٹ پارٹی کا بڑا مقصد سرمایہ داروں کو ہٹا کر ان کی جگہ ورکنگ کلاس حکومت کو لانا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی نے طبقاتی امتیازات پر زور دینے کی راہ اختیار کی جبکہ اے این سی انہیں ہم آہنگ کرنا چاہتی ہے۔

''یہ درست ہے کہ اے این سی اور کمیونسٹ پارٹی کے مابین اکثر قریبی تعاون رہا ہے۔ لیکن تعاون صرف ایک مشترک مقصد کا ثبوت ہے اور اس معاملے میں یہ مقصد گوروں کے غلبے کا خاتمہ تھا اور ایسا تعاون مفادات کی ایک مکمل برادری کا ثبوت نہیں ہے۔ دنیا کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ شاید اس کی نمایاں ترین مثال ہٹلر کے خلاف لڑائی میں برطانیہ عظمیٰ' ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین کے مابین تعاون میں ملتی ہے۔ ہٹلر کے سوا کسی نے یہ کہنے کی جرات نہ کی تھی کہ ایسے تعاون سے چرچل یا روزویلٹ' کمیونسٹ یا کمیونسٹوں کے آلہ کار بن جائیں گے' یا برطانیہ اور امریکہ ایک کمیونسٹ دنیا کی تشکیل کے لیے کام کر رہے ہیں۔

''گورے جنوبی افریقیوں کے لیے جو کمیونزم کے خلاف موروثی تعصب رکھتے ہیں شاید یہ سمجھنا مشکل ہے کہ تجربہ کار افریقی سیاستدان کمیونسٹوں کو اتنا جلد اپنا دوست کیوں بنا لیتے ہیں۔ لیکن ہمارے لیے وجہ صاف ظاہر ہے۔ ظلم کے خلاف لڑنے والوں کے مابین نظریاتی اختلافات ایک ایسی عیاشی ہیں جسے ہم اس مرحلے میں برداشت نہیں کر سکتے۔ مزید براں کئی عشروں تک کمیونسٹ جنوبی افریقہ میں واحد سیاسی گروہ تھے جو افریقیوں سے انسانوں اور اپنے مساوی انسانوں کا سلوک کرنے کو تیار تھے' جو ہمارے ساتھ کھانے کو تیار تھے' ہم سے گفتگو کرنے' ہمارے ساتھ رہنے اور ہمارے ساتھ کام کرنے کو تیار تھے۔ اس وجہ سے کئی افریقی ہیں جو آج آزادی اور کمیونزم کو مترادف سمجھنے کا رجحان رکھتے ہیں۔''

میرا اخراج کس کے لیے؟

میں نے عدالت کو بتایا کہ میں ایک کمیونسٹ نہیں اور میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ ایک افریقی محبِّ وطن سمجھا ہے۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میں ایک غیر طبقاتی معاشرے کے نظریئے میں کشش محسوس کرتا تھا یا یہ کہ میں مارکسٹ تصورات سے متاثر تھا۔ یہ بات افریقہ کی نو آزاد ریاستوں کے بہت سے رہنماؤں پر صادق آتی تھی جنہوں نے کسی طرح کے سوشلزم کی ضرورت کو قبول کر لیا تھا تا کہ اپنے عوام کو مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کے ہم پلہ بنا سکیں۔ میں نے کہا:

مارکسٹ لٹریچر کے مطالعے اور اور مارکسٹوں سے گفتگو سے مجھے یہ تاثر ملا ہے کہ کمیونسٹ مغرب کے پارلیمانی نظام کو غیر جمہوری اور رجعت پسند قرار دیتے ہیں لیکن اس کے برعکس میں ایسے نظام کا ثنا خواں ہوں۔

''میگنا کارٹا'، پٹیشن آف رائٹس اور بل آف رائٹس وہ دستاویزات ہیں جن کا دنیا بھر میں جمہوریت پسند لوگ احترام کرتے ہیں۔ برطانوی سیاسی اداروں اور رملک کے نظامِ عدم کے لیے میرے دل میں بڑا احترام ہے۔ میں برطانوی پارلیمنٹ کو دنیا میں سب سے زیادہ جمہوری ادارہ خیال کرتا ہوں اور اس کی عدلیہ کی آزادی اور غیر جانبداری ہمیشہ مجھ سے خراجِ تحسین وصول کرتی رہی ہے۔ امریکی کانگریس اور امریکہ میں اختیارات کی علیحدگی کا نظریہ اور اس کی عدلیہ کی آزادی بھی مجھ سے ایسا ہی خراج وصول کرتی ہے۔''

میں نے جنوبی افریقہ میں کالوں اور گوروں کی زندگی کے مابین خوفناک عدم مساوات تفصیل سے بیا کی۔ تعلیم، صحت، آمدنی اور ہر شعبہ زندگی میں کالے لوگ زندگی کے کمترین معیار کے حامل تھے جبکہ گوروں کا معیار زندگی دنیا میں بلند ترین تھا اور وہ اسے برقرار رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ میں نے کہا گورے اکثر دعویٰ کرتے ہیں کہ جنوبی افریقہ میں افریقی باقی براعظم کے افریقیوں کے نسبت کہیں بہتر زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں نے کہا ہماری شکایت یہ نہیں کہ ہم باقی افریقہ کی قوموں کے

مقابلے میں غریب ہیں بلکہ شکایت یہ ہے کہ ہم اپنے ملک میں گوروں کی نسبت غریب ہیں اور یہ کہ ہمیں اس عدم توازن کو درست کرنے سے قانون سازی کے ذریعے روکا گیا ہے۔ میں نے کہا:

''افریقی' انسانی شرف سے محرومی کے جس تجربے سے دوچار ہیں وہ گوروں کے غلبے کی پالیسی کا براہ راست نتیجہ ہے۔ گوروں کے غلبے کا مطلب ہے کالوں کی پسماندگی' گوروں کے غلبے کو برقرار رکھنے کے لیے جو قانون سازی کی گئی ہے وہ اس تصور کی غمازی کرتی ہے۔ جنوبی افریقہ میں کمتر کام لابدی طور پر افریقی لوگ انجام دیتے ہیں۔ جب کوئی ایسا کام انجام دینا ہو یا صفائی کرنی ہو تو سفید فام آدمی اردگرد کسی افریقی کو ڈھونڈتا ہے کہ وہ اس کے لیے یہ کام انجام دے خواہ وہ افریقی اس کا ملازم ہو یا نہ ہو۔

''غربت اور عائلی زندگی کی شکست وریخت کے ثانوی اثرات ہوتے ہیں۔ بچے افریقی ٹاؤن شپس میں گلیوں میں آوارہ پھرتے ہیں کیونکہ وہاں ان کی پڑھائی کے لیے اسکول نہیں یا ان کے پاس پیسے نہیں جن سے وہ اسکول جاسکیں یا گھر میں ان کے والدین نہیں جو انہیں اسکول بھجوائیں کیونکہ ماں باپ دونوں کو (اگر دونوں ہوں) خاندان کی گزر بسر کرنے کے لیے کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ اخلاقی قدروں کی شکست وریخت' غیر قانونی بچوں کی تعداد میں تشویش ناک اضافے اور بڑھتے ہوئے تشدد کی صورت میں نکلتا ہے جو صرف سیاسی طور پر نہیں بلکہ ہر کہیں پھوٹ پڑتا ہے۔

''افریقی پورے جنوبی افریقہ میں صرف جائزہ حصہ مانگتے ہیں۔ وہ تحفظ اور معاشرے میں ایک مقام چاہتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم مساوی سیاسی حقوق چاہتے ہیں کیونکہ ان کے بغیر ہماری نااہلیتیں ہمارا مستقل مقدر رہیں گی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بات اس ملک کے گوروں کو انقلابی محسوس ہوتی ہے کیونکہ اس صورت میں

ووٹروں کی اکثریت افریقی ہوگی۔ اس طرح سفید فام آدمی جمہوریت سے خوف کھاتا ہے۔

''اور یہی جمہوریت ہے جس کے لیے اے این سی لڑ رہی ہے۔ اس کی یہ جدوجہد حقیقتاً قوم پرستانہ ہے۔ یہ افریقی عوام کی جدوجہد ہے جس کے اپنے مصائب اور ان کے اپنے تجربے سے جذبہ حاصل کیا ہے۔ یہ زندگی رہنے کے حق کے لیے جدوجہد ہے۔''

میں اپنی تقریر پڑھ رہا تھا اور اس لمحے میں نے اپنے کاغذات وکلاء صفائی کی میز پر رکھ دیئے اور جج کی طرف رخ کر لیا۔ کمرہ عدالت انتہائی خاموش ہو گیا جب میں نے زبانی یہ آخری الفاظ کہے تو میری نگاہیں جسٹس ڈی ویٹ پر مرکوز تھیں۔

میں اس کے لیے جان دے دوں گا

''اپنے عرصہ زندگی میں میں نے اپنے آپ کو افریقی عوام کی اس جدوجہد کے لیے وقف کر دیا ہے۔ میں گوروں کے غلبے کے خلاف لڑتا رہا ہوں اور کالوں کے غلبے کے خلاف لڑتا رہا ہوں۔ مجھے جمہوری اور آزاد معاشرے کے نظریئے سے محبت ہے جس میں تمام افراد ہم آہنگی اور مساوی مواقع کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ یہ ایک نظریہ ہے جس کے لیے میں زندہ رہنے اور اس کے حصول کی تمنا کرتا ہوں۔ لیکن اگر ضرورت ہوئی تو اس نظریئے کے لیے جان دینے کے لیے بھی تیار ہوں۔''

اس وقت کمرہ عدالت میں مکمل خاموشی تھی۔ بیان کے اختتام پر میں نشست پر بیٹھ گیا۔ میں نے منہ موڑ کر گیلری کا سامنا نہ کیا اگرچہ مجھے احساس تھا کہ سب کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہیں۔ خاموشی کئی منٹوں پر پھیلتی محسوس ہوئی۔ لیکن دراصل یہ غالباً تیس سیکنڈ سے زیادہ جاری نہ رہی اور پھر گیلری سے مجھے گہری سسکیوں' اجتماعی'' ا......مممم' اور اس کے بعد عورتوں کی چیخوں کی آواز سنائی دی۔

میں چار گھنٹے سے زیادہ عرصہ اپنا بیان پڑھتا رہا تھا۔ سہ پہر کے چار بجے سے کچھ

اوپر وقت تھا اور یہ عموماً عدالت برخاست ہونے کا وقت تھا۔ لیکن جیسے ہی کمرہ عدالت میں امن وسکون ہوا، جسٹس ڈی ویٹ نے اگلے گواہ کو طلب کرلیا۔ جج نے میرے بیان کا تاثر کم کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میرا بیان اس روز کی واحد اور آخری ٹھہرے۔ لیکن اس اقدام سے میرے بیان کا تاثر کم نہ کیا جا سکا۔ جب میں اپنا بیان ختم کرکے بیٹھ گیا تو جسٹس ڈی ویٹ نے آخری بار میری نگاہیں ڈالی تھیں۔

میری اس تقریر نے مقامی اور غیر ملکی پریس دونوں میں وسیع پبلسٹی حاصل کی اور ''رانڈ ڈیلی میل'' میں یہ لفظ بہ لفظ شائع ہوئی، حالانکہ میرے تمام الفاظ قانونی طور پر ناقابل اشاعت تھے۔ اس تقریر نے ہماری صفائی کے طریق کار کا بھی اظہار کیا اور استغاثہ کو بھی غیر مسلح کردیا جس نے اپنا تمام کیس اس توقع کی بنیاد پر تیار کیا تھا کہ میں اپنی گواہی میں سبوتاژ کی ذمہ داری کا انکار کروں گا۔ اب یہ واضح تھا کہ ہم ان اقدامات کی ذمہ داری قبول کرنے سے احتراز کرنے کے لیے قانونی ذرائع استعمال کرنے کی کوششیں نہیں کریں گے جو ہم نے فخر کے ساتھ اور پیشگی غور وخوض کے بعد کیے تھے۔

سیسولو اور گووان کی گواہی

اب ملزم نمبر 2 والٹر سیسولو کی باری تھی۔ والٹر کو اس جرح کا تمام تر بار سہنا پڑا جس کی یوتار نے میرے لیے تیاری کی تھی۔ والٹر معاندانہ سوالات کی بوچھاڑ ہوئی مگر وہ ڈٹا رہا اور اس نے یوتار کے گھٹیا ہتھکنڈے ناکام بنا دیئے اور ہماری پالیسی سادہ اور صاف اصطلاحات میں بیان کی۔ اس نے زور دے کر کہا کہ آپریشن مائی بوئی اور گوریلا جنگ کی پالیسی کو اے این سی کی پالیسی کے طور پر اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے عدالت کو بتایا کہ اس نے خود بنا پر یہ پالیسی اختیار کرنے کی مخالفت کی تھی کہ یہ ناپختہ تھی۔

والٹر کے بعد گووان گواہوں کے کٹہرے میں آیا اور اس نے عدالت کے سامنے فخر سے کمیونسٹ پارٹی کی اپنی طویل رکنیت کا تذکرہ کیا۔ پراسیکیوٹر نے گووان سے پوچھا کہ اگر اس نے اپنے خلاف چار الزامات میں سے کئی تسلیم کر لیے ہیں تو وہ ان چار الزامات پر اعتراف جرم کیوں نہیں کرتا۔ گووان نے کہا: ''پہلی بات یہ ہے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے عدالت میں حلف اٹھا کر وہ بعض وجوہات بیان کرنی چاہئیں جن کی بنا پر میں ان تنظیموں میں شامل ہوا۔ اس سے اخلاقی فرض کا ایک احساس وابستہ تھا۔ دوسرے سادہ وجہ یہ ہے کہ اعتراف جرم میرے نزدیک اخلاقی جرم کے احساس کے مترادف ہوگا۔ میں تسلیم نہیں کرتا کہ میرے جوابات سے اخلاقی جرم وابستہ ہے۔''

گووان کی طرح احمد کاتھرادا اور رسٹی برنشٹائن نے کمیونسٹ پارٹی اور اے این سی کی رکنیت کی تصدیق کی۔ اگرچہ رسٹی رائیوونیا پر چھاپے کے دوران پکڑا گیا تھا' حکومت کے پاس اس کے خلاف براہ راست شہادت بس یہی تھی کہ اس نے فارم میں ریڈیو ایریل نصب کرنے میں مدد دی تھی۔ کاتھرادا نے اپنی تندو تیز اور شگفتہ گواہی میں سوتاژ کی کارروائیوں یا دوسروں کو ایسا کرنے پر اکسانے کے ارتکاب سے انکار کیا لیکن اس نے کہا کہ اس نے ایسی کارروائیوں کی صرف اس صورت میں حمایت کی تھی اگر ان سے جدوجہد آزادی کو بڑھاوا ملتا۔

میں نے جیمز سے ٹائی بدلی

ہم سب کو اس وقت حیرت ہوئی تھی جب ملزم نمبر 8 جیمز کنٹور کو گرفتار کر کے ہمارے گروپ میں شامل کیا گیا تھا۔ ہیرالڈ وولپے کا برادر نسبتی اور قانونی شریک کار ہونے سے قطع نظر جس نے اپنے دفتر کے ذریعے ہمارے لیے بہت سے کام انجام دیئے تھے' اس نے اے این سی یا ''ایم کے'' میں کبھی حصہ نہیں لیا تھا۔ اس کے خلاف بالفعل کوئی شہادت نہیں تھی اور میرا خیال یہ تھا کہ حکومت نے اسے مقدمے میں

صرف اس لیے گھسیٹا تھا کہ ترقی پسند وکلاء کو خوفزدہ کیا جائے۔

جس روز جسٹس ڈی ویٹ کو جمی (جیمز) کے کیس پر رولنگ دینی تھی ہم عدالت کے نیچے کوٹھڑیوں میں انتظار کر رہے تھے۔ میں نے جمی سے کہا' آیئے ہم خوش بختی کی خاطر اپنی ٹائیاں تبدیل کر لیں۔ لیکن جب اس نے میری طرف سے دی جانے والی چوڑی پرانی طرز اس خوبصورت ریشمی ٹائی سے مقابلہ کیا جو اس نے مجھے دی تھی' تو غالباً اس نے خیال کیا کہ میں صرف اپنی ملبوسات کی الماری کو سجانا چاہتا ہوں۔ جمی ایک طرح سے ملبوسات کا گھوڑا تھا لیکن وہ میری ٹائی پہن کر عدالت میں گیا اور جب جسٹس ڈی ویٹ نے اس کے خلاف الزامات مسترد کر دیئے تو اس نے ٹائی ہاتھ سے پکڑ کر یوں لہرائی جیسے مجھے سلام اور الوداع کہہ رہا ہو۔

ریمونڈ اصلابا' مشرقی کیپ میں اے این سی اور ''ایم کے'' کی ایک سرکردہ شخصیت تھا لیکن چونکہ حکومت کے پاس اس کے خلاف کافی گواہی نہیں تھی اس نے انکار کیا کہ وہ ''ایم کے'' کارکن تھا اور یہ بھی کہا کہ وہ سبوتاژ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ہم سب نے فیصلہ کیا کہ نہ ایلاس موٹسولیڈی ملزم نمبر 9 اور نہ اینڈریو املانگنی ملزم نمبر 10 اعتراف جرم کریں گے۔ وہ ''ایم کے'' کے نچلی سطح کے رکن تھے اور جو کچھ پہلے کہا جا چکا تھا' اس میں کوئی خاص اضافہ نہیں کر سکتے تھے۔ ایلاس موٹسولیڈی کو اگرچہ جیل میں پیٹا گیا تھا اور اذیت دی گئی تھی۔ اس نے تشدد کے سامنے کبھی ہتھیار نہ ڈالے۔ آخری ملزم اینڈریو املانگنی نے اپنے غیر حلفیہ بیان میں اعتراف کیا کہ وہ ''ایم کے'' کے لیے ہدایات اور پیغامات پہنچاتا رہا تھا اور اس کام میں آسانی کے لیے وہ پادری کا بھیس بدل لیتا تھا۔ اس نے بھی عدالت کو بتایا کہ جیل میں اس پر حملہ کیا گیا تھا اور اسے برقی جھٹکے بھی دیئے گئے تھے۔ اینڈریو آخری گواہ تھا لہٰذا وکلائے صفائی اب فارغ تھے۔ اب صرف آخری دلائل رہتے تھے اور ان کے بعد فیصلہ صادر ہونا تھا۔

سرکاری وکیل کی لن ترانیاں

20 مئی کو یوتار نے اپنی آخری تقریر کی۔ نیلے کور والی ایک درجن جلدیں اخباری نمائندوں کو اور ایک وکیل صفائی کو پیش کیں۔ اپنی خوبصورت پیکنگ کے باوجود یوتار کی تقریر استغاثہ کے کیس کا تحریف شدہ خلاصہ تھی اور اس میں فرد جرم کی کوئی وضاحت نہ تھی اور نہ شہادتوں کا کوئی جائزہ تھا۔ وہ توہین آمیز ذاتی حملوں سے بھری پڑی تھی...... ''اگرچہ یہ لوگ بمشکل ایک فیصد تنو آبادی کی نمائندگی کرتے تھے مگر وہ دنیا کو یہ بتاتے رہے کہ جنوبی افریقہ کے تمام افریقی مظلوم' ستم رسیدہ اور غمزدہ ہیں۔ ''جج ڈی ویٹ بھی یوتار کی تقریر سے محظوظ ہوتا نظر آتا تھا اور ایک موقع پر اس نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہہ دیا: ''مسٹر یوتار! تم اس امر کا اعتراف کرتے ہو کہ تم یہ ثابت کرنے میں ناکام رہے ہو کہ گوریلا جنگ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا' کیا تم اعتراف نہیں کرتے؟''

یوتار ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے تو اس کے بالکل برعکس سوچ رکھا تھا۔ ہم بھی حیران ہوئے کیونکہ جج کیسوال نے ہمیں امید کی کرن دکھائی تھی۔ یوتار نے توقف سے عدالت کو بتایا کہ گوریلا جنگ کی تیاریاں تو کی گئی تھیں۔

''ہاں' میں یہ جانتا ہوں۔'' ڈی ویٹ نے صبر و تحمل بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔ ''وکلاء صفائی اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ کہتے ہیں کہ ان کی گرفتاری سے پہلے گوریلا جنگ شروع کرنے کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اس سے میں یہ اخذ کرتا ہوں کہ تمہارے پاس اس کی تردید میں کوئی ثبوت نہیں اور یہ کہ تم اسے تسلیم کرتے ہو؟''

''جیسے حضور والا چاہیں۔'' یوتار نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

یوتار نے یہ کہہ کر اپنی بات ختم کی کہ یہ کیس نہ صرف کمال درجے کی غداری کا ہے بلکہ قتل اور قتل عمد کا بھی ہے......جن میں سے کسی الزام کا فرد جرم میں ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے پرفخر لہجے میں کہا: ''میں یہ کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ فرد جرم کا ہر ایک

الزام ثابت کیا جا چکا ہے۔'' وہ الس وقت بھی اس کے منہ سے یہ الفاظ ادا ہوئے' جانتا تھا کہ یہ بدیہی طور پر کھوکھلے الفاظ ہیں۔

وکیل صفائی آرتھر چیسکالسن پہلے کچھ قانونی سوالوں کا جواب دینے کے لیے کھڑا ہوا جو استغاثہ نے اٹھائے تھے۔اس نے یوتارکا یہ بیان مسترد کر دیا کہ اس مقدمے کا قتل سے کوئی تعلق تھا اور عدالت کو یاد دلایا کہ ''ایم کے'' کی مبینہ پالیسی یہ تھی کہ کوئی انسانی جان ضائع نہیں ہونی چاہیے۔ جب آرتھر یہ وضاحت کرنے لگا کہ دوسری تنظیموں نے سبوتاژ کی ان کارروائیوں کا ارتکاب کیا تھا جن کا الزام ملزمان پر لگا دیا گیا تو ڈی ویٹ نے یہ کہہ کہ مداخلت کی کہ وہ اس حقیقت کو پہلے ہی تسلیم کرتے ہیں۔یہ ایک اور غیر متوقع فتح تھی۔

وکیل صفائی میں بیٹھ گیا

اس کے بعد برام فشر نے دلائل دیئے اور حکومت کے دو انتہائی سنگین دعوؤں پر جرح کی...... یہ کہ ہم نے گوریلا جنگ شروع کی تھی اور یہ کہ اے این سی اور ''ایم کے'' دونوں تنظیمیں ایک ہی تھیں۔اگر چہ ڈی ویٹ نے کہا تھا کہ وہ سمجھتے ہیں گوریلا جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں لیکن ہم کوئی موقع ضائع کرنے کے روادار نہ تھے۔ لیکن جیسے ہی برام نے اپنے پہلے نکتے پر گفتگو شرع کی' ڈی ویٹ نے قدرے خشمگیں انداز میں کہا: ''میرا خیال ہے کہ میں اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا ہے۔میں قبول کرتا ہوں کہ گوریلا جنگ کا کوئی فیصلہ یا تاریخ طے نہیں پائی تھی۔''

جب برام نے دوسرے نکتے پر بات شروع کی تو ڈی ویٹ نے یہ کہہ کر پھر مداخلت کی کہ وہ یہ حقیقت بھی تسلیم کرتے ہیں کہ دونوں تنظیمیں الگ الگ تھیں۔ برام جو بالعموم ہر بات کے لیے تیار ہوتا تھا' ڈی ویٹ کے اس جواب کے لیے تیار نہ تھا' چنانچہ وہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا کہ جج نے اس کے دلائل پیش ہونے سے پہلے ہی تسلیم کر لیے تھے۔ہم خوش وخرم تھے...... اگر سزائے موت کا سامنا کرنے والوں کو

خوش وخرم کہا جا سکتا ہے۔عدالت تین ہفتوں کے لیے ملتوی ہوگئی جبکہ ڈی ویٹ فیصلے پرغور وخوض کرنے لگے۔

قید میں ایل ایل بی کا امتحان

دنیا رائیوونیا ٹرائل پر توجہ دے رہی تھی۔لندن میں سینٹ پال کیتھڈرل میں ہمارے لیے رات بھر دعائیہ تقریبات منعقد ہوئیں۔یونیورسٹی آف لندن کے طلبہ نے مجھے اپنی سٹوڈنٹس یونین کا غیر حاضری میں صدر منتخب کیا۔اقوام متحدہ کے ماہرین کے ایک گروہ نے جنوبی افریقہ کے لیے ایک قومی کنونشن پر زور دیا جو حقیقی نمائندہ پارلیمنٹ کے قیام کا اہتمام کرے اور انہوں نے نسلی امتیاز کے تمام مخالفوں کے لیے عام معافی کی سفارش کی۔جج ڈی ویٹ کے اپنا فیصلہ دینے سے دو روز پہلے اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل نے جنوبی افریقہ کی حکومت پر زور دیا کہ وہاس مقدمے کو ختم کرے اور ملزمان کو عام معافی دے دے۔کونسل کے اس اجلاس سے برطانیہ اور امریکہ سمیت چار ارکان غیر حاضر رہے۔

عدالت میں ہماری دوبارہ پیشی سے پہلے کے وقفے میں' میں نے یونیورسٹی آف لنڈن کے امتحانات کے لیے اپنے ایل ایل بی کے پرچے تحریر کیے۔اوروں کو یہ بات غالباً عجیب لگتی تھی کہمیں فیصلہ سنائے جانے سے چند روز پہلے قانون کے امتحانات دے رہا تھا...... اور میرے محافظوں کو تو یقیناً عجیب لگتی تھی جن کا کہنا تھا کہمیں جہاں جارہا ہوں وہاں مجھے قانون کی ڈگری کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ لیکن میں نے مقدمے کے دوران اپنا مطالعہ جاری رکھا تھا کیونکہ میں امتحان دینا چاہتا تھا۔میں اس کے بارے میں یکسوتھا اور بعد میں میں نے محسوس کیا کہ یہ اپنے آپ کو منفی سوچ سے بچانے کا ایک طریقہ تھا۔میں جانتا تھا کہ میں دوبارہ بہت جلد قانون کی پریکٹس نہیں کرسکوں گا۔لیکن میں اس کا متبادل زیرِغور نہیں لانا چاہتا تھا۔ آخرکار میں نے امتحانات پاس کرلیے۔

ہماری قسمت کا فیصلہ

جمعرات 11 جون کا ہم پھر ایوان انصاف میں فیصلے سننے کے لیے جمع ہوئے۔ہم جانتے تھے کہ ہم میں سے کم از کم چھ کے لیے مجرم ہونے کا فیصلہ آئے گا۔سوال یہ تھا کہ کیا سزائے موت ہوگی۔ڈی ویٹ نے عدالتی کارروائی شروع کرنے میں کوئی وقت ضائع نہ کیا۔اس نے دھیمے اور تیز لہجے میں بولنا شروع کیا:''میں نے ان نتائج کی وجوہات ریکارڈ کی ہیں جن تک میں پہنچا ہوں' انہیں پڑھ کر سنانا مناسب نہیں سمجھتا۔

''ملزم نمبر 1 چاروں الزامات میں مجرم پایا گیا ہے۔ملزم نمبر 2 چاروں الزامات میں مجرم پایا گیا ہے۔ملزم نمبر 3 چاروں الزامات میں مجرم پایا گیا ہے......''

ڈی ویٹ نے بڑے ملزمان میں سے ہر ایک کو چاروں الزامات میں مجرم قرار دیا۔کاتھرادا کو چار الزامات میں سے صرف ایک کا مجرم پایا گیا اور رسٹی برنشٹائن کو مجرم نہ پا کر بری کر دیا گیا۔

''میں آج سزا کے سوال پر کچھ نہیں کہنا چاہتا۔'' ڈی ویٹ نے کہا۔''سرکاری وکیل اور وکلاء صفائی کو مواقع دیئے جائیں گے کہ وہ کل صبح دس بجے حسب خواہش اپنا موقف پیش کر سکیں۔''اس کے بعد عدالت ملتوی ہوگئی۔

ہمیں امید تھی کہ کاتھرادا اور اصلابا سزا سے بچ جائیں گے'لیکن انہیں مجرم ٹھہرانا اس امر کی ایک اور علامت تھا کہ حکومت سخت لائن اختیار کر رہی ہے۔اگر وہ برائے نام شہادت پر اصلابا کو چاروں الزامات میں مجرم ٹھہرا سکتی تھی تو کیا سزائے موت ہم میں سے ان افراد سے زیادہ دور تھی جن کے خلاف پکی شہادت موجود تھی؟

''ہم اپیل نہیں کریں گے''

اس رات باہمی مشورے کے بعد والٹر' گووان اور میں نے اپنے وکیل کو اطلاع دی کہ ہمیں جو بھی سزا ملی' خواہ وہ سزائے موت ہو' ہم اپیل نہیں کریں گے۔ہمارے

فیصلے نے ہمارے وکلاء کو حیرت زدہ کر دیا۔ والٹر‘ گووان اور میں یہ سمجھتے تھے کہ اپیل ہمارا اس اخلاقی موقف کو نقصان پہنچائے گی جو ہم نے اختیار کیا تھا۔ ہمارا شروع ہی سے یہ موقف تھا کہ جو کچھ ہم نے کیا تھا‘ فخر سے اور اخلاقی وجوہات کی بناء پر کیا تھا۔ اب ہم اپیل کر کے دوسرا موقف اختیار کرنے کے روادار نہیں تھے۔ اگر ہمیں سزائے موت ہو جاتی تو ہم اس عوامی احتجاجی مہم کو روکنے کے روادار نہیں تھے جو یقیناً شروع ہو جاتی۔ اس دلیرانہ اور جرات مندانہ موقف کی روشنی میں جو ہم نے روشنی ہو جاتی۔ اس دلیرانہ اور جرات مندانہ موقف کی روشنی میں جو ہم نے شروع سے اختیار کیا تھا ایک اپیل اس موقف کی نفی محسوس ہو گی۔ ہمارا پیغام یہ تھا کہ آزادی کی جدوجہد میں کوئی قربانی اتنی زیادہ نہیں۔

ہمارے وکلاء ہمارے فیصلے پر ناخوش تھے اور اپیل کے متعلق بات کرنا چاہتے تھے لیکن والٹر‘ گووان اور میں چاہتے تھے کہ اگلے روز سزائے موت کے طریق کار کی تفصیلات پر گفتگو کریں گے۔ اگر ہمیں سزائے موت دی گئی تو پھر کیا ہو گا؟ ہمیں بتایا گیا کہ ڈی ویٹ کے سزائے موت کا اعلان کرنے کے بعد وہ پہلے ملزم کی حیثیت سے مجھ سے پوچھیں گے: ”کیا تمہارے پاس اس کے خلاف پیش کرنے کو کوئی دلیل ہے کہ تمہیں سزائے موت کیوں نہ دی جائے؟“ میں نے برام‘ جوئل اور ورنن کو بتایا کہ اس صورت میں میرے پاس کہنے کو بہت کچھ ہو گا۔ میں ڈی ویٹ کو بتاؤں گا کہ میں یہ بخوبی جانتے ہوئے جان دینے کو تیار ہوں کہ میری موت اس کاز کے لیے لوگوں میں جذبہ پیدا کرے گی جس کے لیے میں اپنی جان دے رہا ہوں۔ میری موت ...... ہماری اموات ...... رائیگاں نہیں جائیں گی۔ اگر ہم اس کاز کی کوئی خدمت کر سکتے ہیں تو وہ شہیدوں کی موت کی صورت میں بہتر طور پر ہو گی کہ ایسی خدمت ہم زندگی بھر نہیں کر سکتے۔ وکیل نے کہا کہ ایسی تقریر اپیل کے لیے زیادہ مفید نہیں ہو گی مگر میں نے حتمی طور پر کہہ دیا کہ ہم کوئی اپیل نہیں کر رہے۔

اگر ہمیں سزائے موت نہ بھی دی جاتی تو بھی اپیل نہ کرنے کی عملی وجوہات موجود تھیں۔ ایک وجہ یہ تھی کہ ہم اپیل ہار سکتے تھے۔ اپیلیٹ کورٹ یہ فیصلہ دے سکتی تھی کہ ڈی ویٹ نے بہت نرم فیصلہ کیا تھا اور یہ کہ ہم سزائے موت کے مستحق ہیں۔ یوں ہماری اپیل ہماری رہائی کے لیے بین الاقوامی دباؤ کا راستہ روک سکتی تھی۔

سرکار کے لیے ایک سزائے موت انتہائی عملی فیصلہ ہوتا۔ ہم نے سنا تھا کہ وزیر انصاف جان ورسٹر نے اپنے دوستوں کو بتایا تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران وزیراعظم سمٹ کی فاش ترین غلطی یہ تھی کہ انہوں نے اسے اس کی غداری پر پھانسی نہیں دی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ نیشنلسٹ اب وہی غلطی نہیں کریں گے۔

میں سزائے موت کے لیے تیار تھا۔ کسی بات کے لیے ٹھیک ٹھیک تیار رہنے کی خاطر انسان کو عملاً اس کی توقع رکھنی چاہیے۔ اگر دل میں یہ خیال ہو کہ یہ بات واقع نہیں ہوگی تو وہ اس کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ ہم سب تیار تھے' اس وجہ سے نہیں کہ ہم بہادر تھے بلکہ اس وجہ سے کہ ہم حقیقت پسند تھے۔ مجھے شیکسپیئر کا ایک مصرع یاد آ گیا:

''موت کے لیے حتمی طور پر تیار رہو' کیونکہ یا موت یا زندگی شیریں تر ہوگی۔''

''ورنہ جنوبی افریقہ کا مستقبل تاریک ہوگا''

جمعہ 12 جون 1964ء کو آخری بار عدالت میں داخل ہوئے۔ تقریباً ایک سال گزر گیا تھا جب رائیوونیا میں ہماری قسمت ساز گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ اب سکیورٹی غیر معمولی طور پر سخت تھی۔ ہمارا قافلہ چیختے چنگھاڑتے سائرنوں کے ساتھ بازاروں میں سے گزر رہا تھا۔ کورٹ ہاؤس کی جانب جانے والی تمام سڑکیں عام ٹریفک کے لیے بند کر دی گئی تھیں۔ پولیس ہر اس شخص کی شناخت کی پڑتال کرتی تھیں جو ایوان انصاف کے قریب جانے کی کوشش کرتا۔ انہوں نے مقامی بس اور ریلوے اسٹیشنوں پر بھی چیک پوائنٹس قائم کیے ہوئے تھے۔ اس خوف و ہراس کے باوجود دو ہزار افراد کو کمرہ عدالت کے سامنے جمع ہو گئے جو اس عنوان کے بینر اور کتبے اٹھائے

ہوئے تھے:

''ہم اپنے رہنماؤں کے ساتھ ہیں۔''

سامعین کی گیلری بھری ہوئی تھی اور مقامی اور غیر ملکی پریس کے لیے وہاں صرف کھڑے ہونے کی جگہ تھی۔ میں نے ونی اور اپنی ماں کو ہاتھ ہلا کر ہیلو کہا۔ انہیں وہاں دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ میری والدہ ٹرانسکائی سے مسلسل سفر کر کے آئی تھیں۔ کمرہ عدالت میں یہ دیکھنے کے لیے آنا ان کے لیے بہت عجیب احساس کا حامل ہوگا کہ ان کے بیٹے کو سزائے موت ہوگی یا نہیں۔ اگرچہ میرا خیال ہے کہ وہ سب کچھ جو ہو رہا تھا' میری والدہ اسے نہیں سمجھتی تھیں۔ میرے لیے ان کی حمایت میں کبھی لغزش نہ آئی۔ ونی بھی اپنی جگہ ثابت قدم تھی اور اس کی مضبوطی نے مجھے ثابت قدمی بخشی۔

رجسٹرار نے مقدمے کا عنوان پکارا: ''سرکار بنام نیلسن منڈیلا اور دیگران۔'' سزا سنائے جانے سے پہلے اس میں تخفیف کی دو درخواستیں پیش کی گئیں۔ ایک درخواست ہیرلڈ ہینسن نے پیش کی تھی اور دوسری مصنف ایلن پیٹن نے جو لبرل پارٹی کا نیشنل پریذیڈنٹ بھی تھا۔ ہینسن نے فصاحت کے ساتھ کہا کہ ایک قوم کی پر الم شکایات کی دبایا نہیں جا سکتا اور یہ کہ لوگ ہمیشہ ان شکایات کو آواز دینے کا راستہ تلاش کر لیں گے۔ ''یہ ان کے مقاصد نہیں تھے جو مجرمانہ تھے،'' ہینسن نے کہا۔'' بلکہ یہ صرف ذرائع تھے جو انہوں نے استعمال کیے۔'' اس نے کہا کہ جج صاحب کو اپنی قوم افریکروں کو یاد رکھنا چاہیے جنہوں نے اپنی آزادی کے لیے تشدد انہ جدوجہد کی تھی۔

اگرچہ پیٹن نے بذاتِ خود تشدد کی حمایت نہ کی مگر اس نے کہا کہ ملزمان کے پاس صرف دو متبادل تھے: ''اپنے سر جھکا دیں یا قوت کے ساتھ مزاحمت کریں۔'' اس نے کہا مدعا علیہان کو معافی ملنی چاہیے ورنہ جنوبی افریقہ کا مستقبل تاریک ہوگا۔

لیکن یوں لگتا تھا کہ ڈی ویٹ نے ان دونوں میں سے کسی کی بات توجہ سے نہیں

سنی تھی۔ جب وہ بول رہا تھا تو اس نے نہ اوپر نگاہ اٹھائی اور نہ کوئی نوٹس لیے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے خیالات میں کھویا ہوا ہے۔ بظاہر اس نے پہلے ہی ایک فیصلہ کر لیا تھا اور وہ اپنے فیصلہ کے انکشاف کے لیے صرف مناسب لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔

عمر قید...... زندہ رہنے کے لیے

جج نے ہمیں کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن وہ تو ہماری طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں درمیانی فاصلے پر مرکوز تھیں۔ اس کا چہرہ بہت زرد تھا اور اس کا سانس بہت زور زور سے چل رہا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور یہ جاننا چاہا کیا ہمیں سزائے موت ہو گی ورنہ عام حالات میں یہ پرسکون شخص اس قدر گھبراہٹ کا شکار کیوں ہے؟ اور پھر اس نے کہنا شروع کیا:

''اس مقدمے کے دوران میں نے غیر یورپی آبادی کی شکایت کے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔ ملزمان نے اور ان کے وکیل نے مجھے بتایا ہے کہ ملزمان جو سب غیر یورپی آبادی کے رہنما تھے' ان میں سراسر یہ خواہش ابھری تھی کہ ان شکایت کا ازالہ کیا جائے۔ میں کسی طرح قائل نہیں ہوا کہ ملزمان کے مقاصد اتنے ہی ایثار پیشہ تھے جتنا وہ عدالت کو یقین دلانا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ جو ایک انقلاب منظم کرتے ہیں' عموماً حکومت پر قبضہ کر لیتے ہیں اور ذاتی خواہش کو ان کے مقاصد سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔''

ڈی ویٹ ایک لمحے کے لیے رکا جیسے اپنا سانس بحال کرنا چاہتا ہو۔ اس کی آواز جو پہلے دھیمی تھی' اب بمشکل سنائی دیتی تھی۔ اس نے کہنا شروع کیا:

''اس عدالت کا کام' جیسا کہ کسی بھی اور ملک میں عدالت کا کام ہوتا ہے' امن و امان کو نافذ اور مملکت کے ان قوانین کو نافذ کرنا ہے جن کے اندر وہ کام کرتی ہے۔ جرم جس کا ملزمان پر عائد کیا گیا ہے اور جو بڑا جرم ہے' یعنی سازش کا جرم' وہ بالفعل

غداری کی ذیل میں آتا ہے۔ سرکار نے فیصلہ کیا ہے کہ جرم کی سزا اس شکل میں نہ دی جائے۔ اس کے پیشِ نظر اور معاملے پر سنجیدہ غور و خوض کرتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ سب سے بڑی سزا نہ دی جائے، جو عموماً اس طرح کے مقدمے میں جرم کی مناسب سزا ہوتی ہے اور اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے میں صرف اسی قدر رزمی کا اظہار کرسکتا ہوں۔ اس مقدمے میں سب ملزمان کی سزا عمر قید ہوگی۔''

ہم نے ایک دوسری کی طرف دیکھا اور مسکرا دیئے۔ کمرۂ عدالت میں ایک اجتماعی خاموشی چھائی رہی حتیٰ کہ ڈی ویٹ نے اعلان کیا کہ وہ ہمیں سزائے موت نہیں دے رہا، تاہم بعض حاضرین میں سراسیمگی پھیل گئی کیونکہ وہ ڈی ویٹ کے الفاظ سننے میں ناکام رہے تھے۔ ڈینس گولڈبرگ کی بیوی نے چلا کر کہا: ''ڈینس! یہ کیا ہے؟''

''عمر قید!'' وہ مسکراتے ہوئے پکارا۔ ''عمر قید...... زندہ رہنے کے لیے!''

میں نے مڑ کر گیلری کی طرف مسکراتے ہوئے نظریں ڈالیں کہ مجھے ونی اور اپنی ماں کے چہروں کی تلاش تھی، لیکن کمرہ عدالت میں خاصی افراتفری تھی۔ لوگ چلا رہے تھے اور پولیس ہجوم کو کبھی ادھر دھکیلتی تھی اور کبھی ادھر۔ مجھے اپنے پیاروں کے چہرے نظر نہ آئے۔ میں نے انگوٹھے لہرا کر اے این سی کا سلام کیا جب بیشتر حاضرین باہر کا رخ کر رہے تھے۔ ہمارے پولیس محافظین ہمیں جلدی سے کٹہرے سے نکال کر نیچے تہہ خانے میں لے جانے لگے۔ اگرچہ اس دوران میں ونی کا چہرہ تلاش کرتا رہا، مگر مجھے اس کی ایک جھلک صرف اس وقت دکھائی دی جب میں نیچے تہہ خانے کی طرف کھلنے والے دروازے میں سے گزر رہا تھا۔

کمرۂ عدالت کے نیچے ہمیں ہتھکڑیوں میں رکھا گیا۔ پولیس باہر ہجوم کے متعلق بہت پریشان تھی۔ انہوں نے اس امید میں ہمیں ایک گھنٹے سے زیادہ زیر زمین رکھا کہ لوگ منتشر ہو جائیں۔ پھر ہمیں عمارت کے عقب سے نکال کر سیاہ وین میں سوار

کیا گیا۔ ہمیں اپنے دائیں بائیں ایسکارٹ کرنے والی موٹر سائیکلوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہجوم سے بچنے کے لیے وین نے مختلف راستہ اختیار کیا۔ اس کے باوجود ہمیں ہجوم کی طرف سے ''اماندلا!'' کے پرزور نعرے اور ''انکوسی سکلی لے ایا فریقہ'' کے دھیمے خوش آہنگ نغمے سنائی دے رہے تھے۔ ہم نے کھڑکیوں کی سلاخوں میں سے بند مٹھیاں لہرا کر جواب دیا۔ ہمیں امید تھی کہ ہجوم ہمیں دیکھ سکے گا لیکن یہ علم نہیں تھا کہ لوگ ہمیں دیکھ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔

ہم سب اب سزا یافتہ قیدی تھے۔ ہمیں ڈینس گولڈ برگ سے الگ رکھا گیا کیونکہ وہ گورا تھا۔ اسے دوسرے وارڈ میں لے گئے جبکہ ہمیں دوسرے قیدیوں سے الگ پریٹوریا لوکل کی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا۔ اب نعروں اور نغموں کے بجائے ہمیں صرف دروازے اور گیٹ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

جیل کی چٹائی اور فیصلے کے مضمرات

اس رات جب میں اپنی کوٹھڑی کے فرش پر چٹائی پر لیٹا تھا' میں ڈی ویٹ کے فیصلے پر دماغ لڑانے لگا۔ پورے جنوبی افریقہ میں ہونے والے مظاہروں اور بین الاقوامی دباؤ نے یقیناً اس کے ذہن پر بوجھ ڈالا تھا۔ بین الاقوامی مزدور تنظیموں نے اس مقدمے پر احتجاج کیا تھا۔ دنیا بھر میں گودی مزدوروں نے جنوبی افریقہ کا سامان نہ لادنے اور نہ اتارنے کی دھمکی دی تھی۔ روسی وزیراعظم لیونڈ بریزنیف نے وروورڈ کے نام اپنے خط میں نرمی اختیار کرنے کو کہا تھا۔ امریکی کانگریس کے ارکان نے احتجاج کیا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ کے پچاس ارکان نے لندن میں مارچ کیا تھا۔ برطانوی وزیر خارجہ الیک ڈگلس ہیوم کے بارے میں افواہ تھی کہ وہ پس پردہ ہمارے کاز کی حمایت کے لیے کام کر رہا ہے۔ ایڈلائی سٹیونسن جو اقوام متحدہ میں امریکی نمائندہ تھا' اس نے اپنے خط میں کہا تھا کہ اس کی حکومت سزائے موت کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ میں نے سوچا کہ ایک بار ڈی ویٹ نے جب یہ

تسلیم کرلیا کہ ہم نے ابھی گوریلا جنگ شروع نہیں کی تھی اور یہ کہ اے این سی اور ''ایم کے'' جداگانہ تنظیمیں ہیں تو اس کے لیے سزائے موت سنانا مشکل ہو گیا ہوگا' اسے یہ سزا بہت سخت لگی ہوگی۔

وروورڈ نے پارلیمنٹ کو بتایا کہ دنیا بھر سے آنے والے احتجاجی تاروں اور مذمتی بیانات کا فیصلے پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس نے فخر سے کہا کہ میں نے سوشلسٹ ممالک سے آنے والے تمام تاررروی کی ٹوکری میں پھینک دیئے ہیں۔

کارروائی کے اختتامی لمحات میں جج ڈی ویٹ نے برام فشر تک اپنے یہ ریمارکس پہنچائے تھے کہ صفائی کی ٹیم نے اس مقدمے میں عالمی سطح پر خاصا پروپیگنڈہ کیا ہے۔ یہ شاید عالمی دباؤ کا اعتراف کرنے کا اس کا اپنا طریقہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ہمیں پھانسی ہوگئی تو عوام کی بڑی اکثریت اسے ہمارا قاتل گردانے گی۔ تاہم اس پر اس کی اپنی قوم کی طرف سے بھی خاصا دباؤ تھا۔ وہ ایک سفید فام افریکنر' جنوبی افریقی نظام کی تخلیق اور اپنے بنے بنائے ذہن کا مالک تھا۔ وہ اس نظام عقائد کے خلاف جانے کا کوئی رجحان نہیں رکھتا تھا جس نے اس کی اپنی تخلیق کی تھی۔ وہ ہمیں عمر قید کی سزا سنا کر اس دباؤ کے سامنے جھک گیا تھا اور ہمیں سزائے موت نہ سنا کر اس نے اس دباؤ کی مزاحمت کی تھی۔

ڈی ویٹ نے کاتھرادا' موتسوالیڈی اور رالانگینی کو جو سزائیں دیں' ان پر مجھے حیرت اور ناخوشی تھی۔ مجھے تو توقع تھی کہ وہ کاتھرادا کو بری کردے گا اور باقی دونوں کو ہلکی سزائیں سنائے گا جو ''ایم کے'' کے نسبتاً جونیئر ارکان تھے اور ان تینوں کے مجموعی جرائم باقی ہم سب کے جرائم سے لگا نہیں کھاتے تھے۔ لیکن ہم نے اپیل کا فیصلہ نہ کر کے کیتھی' اینڈریو اور الیاس کے لیے بھی بلاشبہ مشکل پیدا کر دی کیونکہ اپیل کی صورت میں عدالت ان کی سزاؤں میں تخفیف کر سکتی تھی۔

پریٹوریا لوکل میں ہر شام بتیاں بجھنے سے پہلے جیل افریقی قیدیوں کے ہم آہنگ

آزادی کے نغموں سے گونج اٹھتی۔ہم بھی زوروشور سے اس کورس میں شامل ہو کر گاتے۔لیکن ہر شام بتیاں مدھم پڑنے سے چند سیکنڈ پہلے جیسے کسی خاموش حکم کی اطاعت میں، گیتوں کی صدائیں رک جاتیں اور پوری جیل پر خاموشی طاری ہو جاتی۔پھر جیل بھر سے درجنوں جگہوں سے آدمی ''اماندلا!'' کا نعرہ لگاتے۔اس کے جواب میں سینکڑوں آوازیں ''انگاویتھو!'' کا نعرہ الاپتیں۔اکثر یہ پکارا اور جواب کا سلسلہ ہم شروع کرتے تھے مگر اس رات نامعلوم قیدیوں نے یہ کام کر ڈالا۔اور جیل بھر سے اٹھنے والی یہ آوازیں غیر معمولی طور پر مضبوط تھی اور یوں لگتا تھا جیسے وہ ہمیں آنے والے وقت کے لیے فولادی عزم عطا کر رہی ہوں۔

-----اختتام-------حصہ دوئم-----

حصہ ہشتم :: جزیرہ روبن میں تاریک سال

گوریلا فوج کے ٹھکانے کا فضائی جائزہ

نصف شب کا عمل تھا اور میں جاگتے ہوئے کوٹھڑی کی چھت کو گھور رہا تھا۔ مقدمے کے مناظر ابھی تک میرے دماغ میں گھوم رہے تھے۔ تب میں نے راہداری میں قدموں کی آہٹ سنی۔ میں دوسروں سے ہٹ کر اپنی کوٹھڑی میں بند تھا۔ دروازے پر کھٹکھٹاہٹ ہوئی اور سلاخوں میں سے کرنل آئیکمپ کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا: ''منڈیلا! کیا تم جاگ رہے ہو؟''

میں نے کہا: ''میں جاگ رہا ہوں'' وہ کہنے لگا۔ ''تم خوش قسمت آدمی ہو۔ ہمیں تمہیں ایسی جگہ لے جا رہے ہیں جہاں تمہیں تمہاری آزادی مل جائے گی۔ تم وہاں ادھر ادھر نقل و حرکت کر سکو گے۔ تمہیں صرف خاکستری دیواریں ہی نہیں، سمندر اور آسمان بھی نظر آئے گا۔''

وہ کوئی طنز نہیں کر رہا تھا۔ لیکن میں خوب جانتا تھا کہ وہ جس جگہ کا اشارہ کر رہا ہے۔ وہاں مجھے وہ آزادی نہیں ملے گی جس کی میں آرزو رکھتا تھا۔ پھر اس نے قدرے پراسرار انداز میں کہا: ''جب تک تم کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرو گے، وہاں تمہیں ہر چیز ملے گی جس کی تمہیں خواہش ہوگی۔

پھر آئیکمپ نے دوسروں کو جگایا، جو سب ایک ہی کوٹھڑی میں تھے اور انہیں اپنا سامان باندھنے کا حکم دیا۔ پندرہ منٹ بعد ہم پریٹوریا لوکل کی آہنی بھول بھلیوں سے نکل رہے تھے۔ جن کے ان گنت آہنی دروازے ہمارے کانوں میں کھڑکھڑا رہے تھے۔

باہر آتے ہی ہم ساتوں ...... والٹر، ریمونڈ، گووان، کیتھی، اینڈریو، الیاس اور مجھ ...... کو ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں اور ایک پولیس وین کے عقب میں ٹھونس دیا گیا۔ رات خاصی گزر چکی تھی مگر ہم میں سے کوئی تھکا ماندہ نہیں تھا اور ماحول ہرگز اداس نہ تھا۔ ہم

گرد آلود فرش پر بیٹھے گا اور گنگنا رہے تھے اور مقدمے کے آخری لمحات کی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ محافظوں نے ہمیں سینڈوچ اور ٹھنڈے مشروبات پیش کیے۔ لیفٹیننٹ فان وائیک پیچھے ہمارے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ ایک خوش مزاج آدمی تھا اور گیتوں کی جھونک میں اس نے ہمارے مستقبل کے متعلق ان پوچھی رائے دیتے ہوئے کہا: ''تم لوگ زیادہ عرصہ جیل میں نہیں رہو گے۔ تمہاری رہائی کا مطالبہ بہت زور ہے۔ ایک دو سال میں تم باہر ہو گے اور قومی ہیروؤں کی طرح لوٹو گے۔ ہجوم تم پر داد و تحسین نچھاور کریں گے' ہر کوئی تمہارا دوست بنا چاہے گا' عورتیں تمہاری خواستگار ہوں گی۔ آ...... تم لوگوں نے معرکہ انجام دیا ہے۔'' ہم کچھ کہے بغیر سنتے رہے' لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اس کی تقریر نے مجھے خاصا محظوظ کیا۔ بدقسمتی سے اس کی پیشگوائی پوری ہونے میں کم و بیش تین دہائیاں بیت گئیں۔

ہم خاموشی سے' خفیہ طور پر' بھاری تعداد میں پولیس کے جلو میں آدھی رات روانہ ہوئے اور آدھ گھنٹے بعد ہم نے خود کو شہر کے باہر ایک چھوٹے ہوائی اڈے پر پایا۔ وہاں ہمیں ایک ڈکوٹا طیارے پر سوار کیا گیا۔ یہ ایک بڑا فوجی نقل و حمل کا طیارہ تھا جو بہتر دن دیکھ چکا تھا۔ اس میں حرارت کا نظام نہیں تھا اور ہم اس کے پیٹ میں ٹھنڈے کانپ رہے تھے۔ ہم میں سے بعض نے اس سے پہلے کبھی طیارے میں سفر نہیں کیا تھا' چنانچہ وہ ہماری منزل سے زیادہ ہماری سفر کے بارے میں فکر مند لگتے تھے۔ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر طیارے میں اوپر نیچے جھٹکے کھانا انہیں بلند دیواروں کے پیچھے کوٹھڑیوں میں بند ہونے سے کہیں زیادہ خطرناک محسوس ہوتا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد نیچے زمین پر پو پھٹتی دکھائی دی۔ طیارے کے پہلوؤں کے سوراخوں میں سے جیسے ہی صبح کے آثار نظر آئے' میرے ساتھیوں نے اپنے چہرے کھڑکیوں کے شیشے سے لگا دیئے۔ ہم جنوبی مشرق میں اورنج فری سٹیٹ کے خشک ہموار میدانوں پر سے اڑتے چلے گئے اور پھر سرسبز اور کوہستانی

کیپ کا جزیرہ نما دکھائی دینے لگا۔ میں بھی پہلوؤں کے سوراخوں میں سے باہر دیکھتے ہوئے زمینی تناظر کا ایک سیاح کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک تزویر کار کی طرح جائزہ لے رہا تھا کیونکہ مجھے ان علاقوں کی تلاش تھی جہاں ایک گوریلا فوج اپنے آپ کو چھپا سکتی تھی۔

''ایم کے'' کی تشکیل سے لے کر یہ بحث چل رہی تھی کہ کیا جنوبی افریقہ کے دیہی علاقے ایک گوریلا فوج سے تعاون کریں گے۔ ہائی کمان کے اکثر ارکان کا خیال تھا کہ ایسا ممکن نہیں۔ جب ہم صوبہ کیپ میں متروس برگ کے جنگلوں سے ڈھکے پہاڑی علاقے پر سے اڑتے ہوئے گزرے، میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ وہ علاقہ ہے جہاں ہم گوریلا جنگ لڑ سکتے ہیں۔ سب ساتھی پر جوش ہو کر کھڑکیوں سے جا لگے تاکہ اس علاقے کا بہتر نظارہ کر سکیں اور فی الواقع گھنے جنگلوں سے ڈھکا علاقہ مجھے یوں لگا جیسے وہ ایک نو تشکیل شدہ گوریلا فوج کو پناہ دے سکتا ہو۔

چند منٹ بعد ہم کیپ ٹاؤن کے مضافات میں پہنچ گئے۔ جلد ہی ہمیں کیپ فلیٹس کے ڈبیا نما مکانات، ڈاؤن ٹاؤن کے چمکتے منارے اور ٹیبل ماؤنٹین کی افقی چوٹی نظر آنے لگی۔ پھر ہم خلیج ٹیبل اور بحر اوقیانوس کے تاریک نیلے پانیوں پر اڑتے چلے گئے اور پھر سامنے ہمیں جزیرہ روبن کے دھندلے نقوش نظر آنے لگے۔

سمندر میں جیل

ہم جزیرے کے ایک سرے پر فضائی پٹی پر اترے۔ یہ ایک بوجھل ابر آلود دن تھا اور جب میں نے طیارے سے باہر قدم رکھا، تو سردیوں کی ٹھنڈی ہوا ہماری پتلی جیل کی وردیوں میں گھستی چلی گئی۔ خودکار ہتھیاروں سے مسلح محافظوں نے ہمارا استقبال کیا۔ فضا میں تناؤ لیکن خاموشی تھی اور یہ اس پر جوش استقبال سے بالکل مختلف صورتحال تھی جس کا دو سال پہلے جزیرے میں میری آمد پر تجربہ ہوا تھا۔ ہمیں

ایک گاڑی میں بیٹھا کر پرانی جیل میں لے جایا گیا جو ایک الگ تھلگ پتھر کی عمارت تھی۔ ہمیں جیل سے باہر کھڑے کر کے ہم سے کہا گیا کہ کپڑے اتار دو۔ جیل کی زندگی کی ایک روایتی اہانت آمیز بات یہ ہے کہ جب آپ کو ایک جیل سے دوسری جیل میں منتقل کیا جائے تو پہلی چیز جس سے سابقہ پیش آتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ پرانی جیل کے کپڑے اتار کر نئی جیل کے کپڑے پہنیں۔ جب ہم نے پہلے والے کپڑے اتار ڈالے تو ہماری طرف جزیرے روبن کی سادہ خاکی وردیاں اچھال دی گئیں۔

نسلی امتیاز کے ضابطے لباس تک وسیع تھے۔ کیتھی کے سوا ہم سب کو نکریں' ایک ایک برائے نام سی جرسی اور ایک ایک کینوس جیکٹ ملی۔ کیتھی (کاتھرادا) جو ہمارے اندر ایک ہندوستانی تھا' اسے پاجامہ دیا گیا۔ عموماً افریقیوں کو کار کے ٹائروں سے بنی چپلیں ملتی تھیں لیکن اس مرتبہ ہمیں جوتے عطا ہوئے۔ جرابیں صرف کیتھی کو ملیں۔ افریقیوں کو نیکریں دینے کا مطلب ہمیں یہ یاد دلانا تھا کہ ہم ''لڑکے'' تھے۔ میں نے اس روز نیکر پہن لی لیکن عہد کیا کہ میں اسے زیادہ عرصہ نہیں پہنوں گا۔

محافظین نے اپنی بندوقوں کی نوک سے اشارہ کیا کہ ہمیں کہاں جانا تھا اور ان کا حکم بس یہ الفاظ تھے: '' آگے بڑھو...... خاموش...... رک جاؤ۔'' انہوں نے اس متکبرانہ انداز سے ہمیں دھمکیاں نہ دیں جن کا مجھے پچھلی بار تجربہ ہوا تھا اور نہ انہوں نے کسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا۔

پرانی جیل ہمارے لیے صرف عارضی کوارٹروں پر مشتمل تھی۔ حکام سیاسی قیدیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سکیورٹی والی ایک بالکل الگ تھلگ عمارت کی تکمیل کو آخری رنگ دے رہے تھے۔ جب تک ہم وہاں رہے ہمارے لیے باہر جانا یا دوسرے قیدیوں سے کوئی رابطہ رکھنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔

گورے کمانڈنگ آفیسر کا مذاق

چوتھی صبح ہمیں ہتھکڑیاں لگا کر ایک بند ٹرک میں سوار کیا گیا اور جیل کے اندر

ایک اور جیل میں لے گئے۔ یہ نئی عمارت ایک منزل مستطیل نما پتھر کا قلعہ تھا جس کے وسط میں سیمنٹ کے فرش کا صحن تھا اور یہ تقریباً سو فٹ لمبا اور تیس فٹ چوڑا تھا۔ اس کے تین طرف کوٹھڑیاں تھیں۔ چوتھی جانب بیس فٹ اونچی ایک دیوار تھی جس پر جرمن شیفرڈ کتوں والے محافظ گشت کیا کرتے تھے۔

کوٹھڑیوں کی تین قطاریں سیکشن اے بی اور سی کے نام سے موسوم تھیں اور ہمیں سیکشن بی میں رکھا گیا جو چوکور کے انتہائی مشرقی جانب تھا۔ ہمیں طویل راہداری کے دونوں طرف الگ الگ کوٹھڑیاں دی گئیں جن میں سے نصف کوٹھڑیاں صحن کی جانب تھیں۔ کل تیس کے لگ بھگ کوٹھڑیاں تھیں۔ ان سنگل کوٹھڑیوں میں قیدیوں کی مجموعی تعداد حسب معمول تقریباً چوبیس تھی۔ ہر کوٹھڑی میں ایک کھڑکی، ایک فٹ مربع کے قریب تھی جس میں آہنی سلاخیں لگی تھیں۔ کوٹھڑی کے دو دروازے تھے۔ ایک اندرونی دھاتی دروازہ یا آہنی سلاخوں والی گرل اور ایک بیرونی موٹی لکڑی والا دروازہ۔ دن کے دوران صرف گرل کو قفل لگایا جاتا مگر رات کو چوبی دروازہ بھی مقفل کر دیا جاتا۔

کوٹھڑیاں جلدی میں تعمیر کی گئی تھیں اور دیواریں ہمیشہ گیلی رہتی تھیں۔ جب میں نے کمانڈنگ آفیسر سے اس کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگا کہ تمہارے جسم اس نمی کو جذب کر لیں گے۔ ہم میں سے ہر ایک کو تین کمبل دیئے گئے جو اتنے مہین اور خستہ تھے کہ وہ عملاً شفاف تھے۔ ہمارا بستر سیسل یا خس کی ایک چٹائی پر مشتمل تھا۔ بعد میں ہمیں ایک ایک چمڑے کی چٹائی دی گئی اور قیدی اسے سیسل کی چٹائی کے اوپر بچھا لیتے تھے تاکہ کچھ نرمی میسر ہو۔ سال کے اس حصے میں کوٹھڑیاں اتنی سرد ہوتیں کہ ہم ہمیشہ پورے کپڑے پہن کر سوتے۔

مجھے جو کوٹھڑی دی گئی تھی وہ راہداری کے سرے پر تھی۔ صحن کی طرف دیکھنے کے لیے اس میں ایک چھوٹی کھڑکی تھی۔ میں اپنی کوٹھڑی کی لمبائی میں تین قدم چل سکتا

تھا۔ جب میں لیٹا ہوتا تو میرے پاؤں دیوار کو چھو رہے ہوتے اور دوسرے جانب میرا سر کنکریٹ سے لگا ہوتا۔ یہ لمبائی تقریباً چھ فٹ تھی اور دیواریں کم از کم دو فٹ موٹی تھیں۔ ہر کوٹھڑی کے باہر ایک سفید کارڈ آویزاں تھا جس پر قیدی کا نام اور جیل سروس نمبر درج تھا۔ میرے کارڈ پر لکھا تھا: ''این منڈیلا 466/64'' جس کا مطلب یہ تھا کہ میں 1964ء میں جزیرے میں داخل کیا جانے والا 466واں قیدی تھا۔ میں چھیالیس برس کا تھا' ایک سیاسی قیدی جسے عمر قید کی سزا ملی تھیں اور آہنی سلاخوں سے گھری یہ تنگ جگہ میرا گھر ٹھہری تھی اور میرا خیال تھا کہ مجھے یہاں زیادہ عرصہ نہیں رہنا پڑے گا۔

رنگا رنگ قیدیوں کی بہار

جلد ہی ہم سے بہت سے قیدی آ ملے جو جیل کے عام سیکشن میں بند تھے جو اینٹوں کی عمارت پر مشتمل تھا اور سیکشن بی سے زیادہ دور نہ تھا۔ جنرل جیل سیکشن ایف اور سیکشن جی کے نام سے موسوم تھی جس میں ایک ہزار کے لگ بھگ افراد قید تھے جو زیادہ تر عام قانون کے قیدی تھے۔ ان میں سے ایک چوتھائی سیاسی قیدی تھے اور ان میں سے چند ایک سیکشن بی میں ہمارے ساتھ ٹھہرائے گئے۔ ہم دو وجوہات کی بنا پر عام قیدیوں سے الگ تھلگ تھے۔ ہمیں سیکورٹی کے نقطۂ نظر سے خطرناک کیا جاتا تھا لیکن ہم سیاسی نقطۂ نظر سے اور زیادہ خطرناک تھے۔ حکام کا خیال تھا کہ ہم اپنے سیاسی نظریات سے دوسرے قیدیوں کو ''آلودہ'' کر سکتے تھے۔

ہمارے ساتھ ٹھہرائے گئے افراد میں جارج پیک بھی تھا جو جنوبی افریقی رنگ دار لوگوں کی تنظیم ایس اے سی پی او کا ایک بانی' مقدمہ بغاوت کا ایک ملزم اور حالیہ دنوں میں کیپ ٹاؤن سٹی کونسل کا ایک رکن تھا۔ اسے کیپ ٹاؤن جیل کے باہر دھماکہ خیز مواد رکھنے کے جرم میں سزا ہوئی تھی۔ ایک اور سرگرم رنگ دار سیاسی قیدی ڈینس بروٹس تھا جو ایک شاعر اور ادیب تھا' اس کا تعلق پورٹ ایلزبتھ سے تھا اور اسے اپنی

پابندی کے احکام کی خلاف ورزی پر جیل کی ہوا کھانی پڑی تھی۔ بلی نائر بھی ہمارے ساتھ آملا تھا جو مدت سے نٹال انڈین کانگریس کا رکن تھا اور اسے امخونتو وی سزوی کے ایک رکن کی حیثیت سے سبوتاژ کارروائی کرنے پر سزا سنائی گئی تھی۔

چند روز کے اندر اور قیدی ہم سے آملے۔ ان میں نیول الیگزینڈر بھی تھا جو ایک سرکردہ رنگ دار دانشور اور نان یورپین یونٹی مومنٹ کا رکن تھا اور اس نے کیپ ٹاؤن میں ایک ننھی انقلابی تنظیم کی داغ بیل ڈالی تھی جو ''یو چی چان کلب'' کے نام سے معروف تھی اور جہاں گوریلا جنگ کا مطالعہ کرایا جاتا تھا۔ نیول نے کیپ ٹاؤن یونیورسٹی سے بی اے کیا تھا اور جرمنی کی ٹیوبنگن یونیورسٹی سے جرمن ادب میں ڈاکٹریٹ کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ فیکاکل بام تھا جو کیپ ٹاؤن یونیورسٹی کا لاء سٹوڈنٹ اور یو چی چان کلب کا ایک اور رکن تھا۔ پھر زیفانیا موتھوپنگ تھا جو پی اے سی نیشنل ایگزیکٹو کا رکن تھا۔ زیف' آرلینڈو میں استاد رہ چکا تھا۔ وہ بنٹو ایجوکیشن کا شدید مخالف اور پی اے سی لیڈروں میں سے زیادہ عقل سلیم کا مالک تھا۔ ٹرانسکائی کے تین سالخوردہ کسان بھی ہمارے ساتھ قید تھے۔ انہیں کے ڈی ماتن زیما کو قتل کرنے کی سازش کے الزام میں سزا ہوئی تھی جو اب ٹرانسکائی کی خود اختیار حکومت کا وزیر اعلیٰ تھا۔

یہ تقریباً بیس قیدیوں کا ہمارا مرکزی گروہ تھا۔ بعض کو میں جانتا تھا بعض کے بارے میں سن رکھا تھا جبکہ دوسروں کو میں ہرگز نہیں جانتا تھا۔ جیل میں عموماً گنی چنی خوشگوار گھڑیاں وہ ہوتی ہیں جب پرانے دوست یا نئے چہرے ملتے ہیں مگر ان ابتدائی چند ہفتوں کے دوران فضا اس قدر گھمبیر تھی کہ ہم ایک دوسرے کو سلام کرنے کے قابل بھی نہیں تھے۔ جیل میں جتنے قیدی تھے اتنے ہی محافظ تھے اور وہ ہر ضابطہ دھمکیوں اور تخویف کے ساتھ نافذ کرتے تھے۔

جزیرے پر پہلی سست کام ہڑتال

پہلے ہفتے ہم نے جو کام شروع کیا اس نے ہمیں اگلے چند ماہ تک مصروف رکھا۔ ہر صبح والی بال کے سائز کے پتھروں کا بوجھ دروازے سے صحن میں اتار دیا جاتا۔ ہم ان پتھروں کو ہتھ گاڑیوں میں لاد کر صحن کے وسط میں لے جاتے۔ ہمیں چار پاؤنڈ کے ہتھوڑے دے جیئے جاتے یا بڑے پتھروں کے لیے چودہ پاؤنڈ کے ہتھوڑے۔ ہمارا کام ان پتھروں کا بجری میں تبدیل کرنا تھا۔ ہمیں چار قطاروں میں تقسیم کر دیا جاتا جو باہم ساڑھے چار گز کے فاصلے پر ہوتیں اور ہم زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھتے۔ ہر ایک کو ٹائروں سے بنا ایک موٹر ربڑ کا حلقہ دیا جاتا جس میں پتھر رکھ کر کوٹتے۔ اس حلقے کا مقصد یہ تھا کہ ٹوٹتے ہوئے سنگریزے اس کے اندر رہیں مگر وہ بمشکل یہ کام دیتا۔ آنکھوں کو بچانے کے لیے ہمیں آہنی جالی کے نقاب دیئے جاتے جو آسانی سے پہنے اتارے جا سکتے تھے۔

جیل کے وارڈر خاموشی برقرار رکھنے کے لیے ہمارے اندر چلتے پھرتے رہتے۔ ان پہلے چند ہفتوں کے دوران دوسرے سیکشنوں حتیٰ کہ دوسری جیلوں کے محافظ آ کر ہمیں تاڑتے رہتے جیسے ہم پنجروں میں بند نایاب جانوروں کا گروہ ہوں۔ کام مشکل اور اکتا دینے والا تھا۔ یہ اتنا جانفشانی کا کام نہیں تھا جو ہمیں گرم رکھتا اس میں اتنی توانائی صرف ہو جاتی تھی کہ ہمارے تمام پٹھے دکھنے لگتے تھے۔

جزیرہ روبن پر جون اور جولائی ناگوار ترین مہینے تھے۔ ہوا میں سردی تھی اور بارشوں میں آغاز ہوا چاہتا تھا۔ درجہ حرارت 40 فارن ہائیٹ سے اوپر جاتا کبھی محسوس نہ ہوتا۔ میں دھوپ میں بھی اپنی ہلکی خاکی قمیص کانپتا رہتا۔ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے ہڈیوں میں سردی اترنے کے احساس کی سمجھ آئی۔ دوپہر کو ہم ظہرانے کا وقفہ کرتے۔ پہلے ہفتے ہم سب کو سوپ دیا گیا جو گلے میں بری طرح لگتا تھا۔ سہ پہر کو ہمیں کڑی نگرانی میں ایک گھنٹے کے لیے ورزش کرنے کی اجازت دی گئی۔ ہم

قطار میں صحن کے ارد گرد تیز تیز چلتے رہے۔

پتھر کوٹنے کے ابتدائی دنوں میں ایک روز ایک محافظ نے کیتھی کو حکم دیا کہ بجری سے بھری ہتھ گاڑی دھکیل کر گیٹ کے پاس کھڑے ٹرک تک لے جائے۔ کیتھی دبلا پتلا آدمی تھا اور سخت جسمانی مشقت کا عادی نہ تھا۔ وہ ہتھ گاڑی کو دھکیل نہ سکا۔ وارڈر چلایا: ''لات ڈارڈائی کروئی والوپ!'' (اس ہتھ گاڑی کو حرکت دو!) کیتھی نے اسے آگے کو دھکا دیا مگر یوں لگتا تھا ہتھ گاڑی الٹ جائے گی۔ اس پر وارڈر ہنسنے لگے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کیتھی نے انہیں مسرور ہونے نہ دینے کا عزم کر رکھا تھا۔ میں خوب جانتا تھا کہ ہتھ گاڑی کیسے چلاتے ہیں' چنانچہ میں کود کر اس کی مدد کو گیا۔ اس سے پہلے کہ مجھے بیٹھ جانے کا حکم ملتا میں نے کیتھی کو گاڑی دھکیل کر بتایا کہ اسے آہستہ چلائے' اور یہ کہ یہ طاقت کا نہیں بلکہ توازن کا معاملہ ہے۔ اس نے سر ہلایا اور پھر احتیاط سے گاڑی چلا کر صحن کے پار لے گیا۔ اب وارڈروں کی ہنسی رک گئی۔

اگلی صبح حکام نے ایک بڑا ٹرک صحن میں کھڑا کر دیا اور اعلان کیا کہ اسے ہفتے کے آخر تک بھرنا ہوگا۔ ہم نے محنت کی اور اس میں کامیاب رہے۔ اگلے ہفتے وارڈر انچارج نے اعلان کیا کہ ٹرک کو تین چوتھائی لازماً بھرنا ہوگا۔ ہم نے زیادہ محنت سے کام کیا اور اس میں کامیاب رہے۔ اگلے ہفتے ہمیں حکم ملا کہ اسے اوپر تک بھر دیں۔ ہم جانتے تھے کہ ہم اسے زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکتے مگر ہم نے کچھ نہ کہا۔ ہم نے ٹرک تو اوپر تک بھر دیا لیکن وارڈروں نے ہمیں اشتعال دلایا تھا' چنانچہ ہم نے مسروقہ سرگوشیوں میں ایک پالیسی طے کر لی...... یہ کہ ہم کوٹہ برداشت نہیں کریں گے۔ اگلے ہفتے ہم نے جزیرے پر اپنی پہلی سست کام ہڑتال کا آغاز کر دیا۔ ہم نے حکام کو بڑھتے ہوئے اور نامنصفانہ مطالبات پر احتجاج کے لیے کام کی رفتار اس رفتار کے نصف سے بھی کم کر دی جو پہلے اختیار کی تھی۔ گارڈ فوراً بھانپ گئے اور ہمیں دھمکانے لگے مگر ہم نے اپنی رفتار تیز نہ کی اور ہم نے یہ سست کام سٹرا ٹیجی اس وقت

تک جاری رکھی جب تک صحن میں کام کرتے رہے۔

نیکر اور پاجامے کی کشمکش

جزیرہ روبن اس وقت سے بہت بدل گیا تھا جب میں 1962ء میں ایک پندرہ رھواڑے کے لیے یہاں آیا تھا۔ یہاں چند ہی قیدی تھے اور یہ جگہ ایک مکمل جیل سے زیادہ ایک تجربہ محسوس ہوتی تھی۔ دو سال بعد جزیرہ روبن بلاشبہ جنوبی افریقہ کے تعزیراتی نظام کی سخت ترین اور آہنی شکنجے کی حامل بیرونی چوکی تھی۔ یہ قیدیوں ہی کے لیے نہیں بلکہ جیل کے عملے کے لیے بھی مشکلات کا اڈا تھا۔ وہ رنگ دار وارڈر رخصت ہو گئے تھے جو سگریٹ اور ہمدردی فراہم کرتے تھے۔ اب محافظ سفید فام اور زیادہ تر افریکان بولنے والے تھے جو آقا اور غلام کا فاصلہ برقرار رکھنے کے متمنی تھے۔ وہ ہمیں حکم دیتے کہ ہم انہیں باس کہہ کر پکاریں اور ہم نے یہ حکم بجا لانے سے انکار کر دیا۔ جزیرہ روبن پر نسلی خلیج حتمی تھی۔ یہاں نہ سیاہ فام واڈر تھے۔ اور نہ گورے قیدی۔

ایک جیل سے دوسری جیل منتقل ہونے میں ہمیشہ سازگاری کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ لیکن جزیرہ روبن تک سفر کسی اور ملک میں جانے کے مانند تھا۔ اس کا الگ تھلگ ہونا اسے ایک اور جیل ہی نہیں بلکہ اپنی ہی قسم کی ایک دنیا بناتا تھا جو اس دنیا سے بہت ہٹ کر تھی جہاں سے ہم آئے تھے۔ وہ بلند جذبے جن کے ساتھ ہم پریٹوریا سے روانہ ہوئے تھے' یہاں کی سخت فضا نے کچل ڈالے تھے۔ ہمیں اس احساس کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کہ ہماری زندگی ناقابل رہائی حد تک ہیبت ناک ہو گی۔ پریٹوریا میں ہمیں احساس تھا کہ ہم اپنے دوستوں اور اہل خانہ سے رابطہ رکھتے ہیں مگر اس جزیرے پر محسوس ہوتا تھا کہ ہمارے سب رابطے کٹ چکے ہیں اور واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ ہونے کی تسلی تھی مگر یہ صرف تسلی ہی تھی۔ میرے خوف و ہراس کی جگہ تیزی سے اس احساس نے لے لی کہ ایک نئی اور

مختلف جنگ شروع ہو چکی ہے۔

اول روز سے میں نے نیکر پہننے پر مجبور کیے جانے پر احتجاج کیا تھا۔ میں نے جیل کے سربراہ سے ملنے کا مطالبہ کیا اور بہت سے شکایات کیں۔ محافظوں نے میرے احتجاج نظر انداز کر دیئے۔ لیکن دوسرے ہفتے کے اختتام پر مجھے ایک پرانا خاکی پاجامہ یوں دیا گیا کہ وہ میری کوٹھڑی کے فرش پر پڑا ملا۔ مجھے کسی پن لگے تھری پیس سوٹ نے بھی کبھی اتنی خوشی نہیں دی تھی۔ لیکن اسے پہننے سے پلے میں نے یہ دیکھنے کا اہتمام کیا کہ کیا میرے ساتھیوں کو بھی ایسے پاجامے مل گئے ہیں۔

میرے ساتھیوں کو پاجامے نہیں ملے تھے' چنانچہ میں نے وارڈر سے کہا کہ وہ پاجامہ واپس لے جائے۔ محافظ غرایا۔ ''منڈیلا! تم کہتے ہو کہ تمہیں لمبی پینٹ چاہیے اور جب ہم دیتے ہیں تو تم کہتے ہو کہ تمہیں وہ نہیں چاہیے۔'' محافظ نے کالے آدمی کا پہنا ہوا پاجامہ چھونے سے انکار کر دیا اور آخر کار کمانڈنگ آفیسر خود اسے واپس لینے میری کوٹھڑی تک آیا۔ اس نے کہا: ''بہت اچھا' منڈیلا! تمہیں وہی کپڑے ملا کریں گے جو اوروں کو ملتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا کہ اگر وہ مجھے لمبا پاجامہ دینے کو تیار ہے تو اوروں کو وہ کیوں نہیں ملے سکتے۔ اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

مولی ڈوب گئی

جزیرے پر ہمارے پہلے دو ہفتوں کے اختتام پر ہمیں اطلاع دی گئی کہ ہمارے وکلاء برام فشر اور جوئل جوفے اگلے روز ہم سے ملنے آرہے ہیں۔ جب وہ آپہنچے تو محافظ ہمیں ملاقات کی جگہ لے گئے۔ ان کی آمد کے دو مقصد تھے...... یہ دیکھنا کہ ہم کیسے رہ رہے تھے اور یہ تصدیق کرنا کہ کیا ہم ابھی تک اپنی سزاؤں کے خلاف اپیل نہ کرنے کے فیصلے پر قائم تھے یا نہیں۔ چند ہفتے گزرنے تھے جب میں نے انہیں دیکھا تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ وہ کسی اور دنیا سے آئے ہوئے

ملاقاتی لگتے تھے۔

ہم ایک خالی کمرے میں بیٹھ گئے۔ ہماری بات چیت کی نگرانی کے لیے ایک میجر دروازے کے باہر بیٹھا تھا۔ مجھے خواہش ہوئی کہ میں ان سے بغل گیر ہو جاؤں مگر میجر کی موجودگی کے باعث میں رک گیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہم سب ٹھیک ٹھاک ہیں اور یہ بھی واضح کر دیا کہ ہم ان تمام وجوہات کی بنا پر جو ہم پہلے بیان کر چکے تھے' ابھی تک اپیل کے خلاف ہیں اور ان میں یہ حقیقت بھی شامل تھی کہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہماری اپیل اے این سی کے دوسرے مدعا علیہان کے مقدمات کو متاثر کرے۔ لگتا تھا برام اور جوئل اپنے موقف سے دست بردار ہو گئے ہیں اگرچہ میں جانتا تھا کہ برام کا خیال یہی ہے کہ ہم اپیل داغ دیں۔

جب ہم اپنی گفتگو کو سمیٹ رہے تھے' میں نے برام سے اس کی اہلیہ مولی کے بارے میں پوچھا۔ جیسے ہی میں نے مولی کا نام لیا' برام اٹھ کھڑا ہوا' مڑا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ لوٹ کر آیا تو اپنے آپ پر قابو پا چکا تھا۔ اس نے گفتگو پھر شروع کر دی مگر میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔

اس کے کچھ دیر بعد ہماری ملاقات ختم ہو گئی اور جب ہم اپنی کوٹھڑیوں کی طرف واپس جا رہے تھے' میجر نے مجھ سے کہا: ''منڈیلا! کیا تمہیں برام کے رویئے پر صدمہ ہوا تھا؟'' میں نے کہا کہ ہاں مجھے صدمہ ہوا تھا۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ مولی پچھلے ہفتے ایک حادثے میں مر گئی تھی۔ اس نے کہا کہ برام گاڑی چلا رہا تھا اور اس نے سڑک پر گزرتے ایک جانور کو بچانا چاہا تھا جب کار بے قابو ہو کر دریا میں جا گری اور مولی ڈوب گئی تھی۔

اس خبر نے ہمیں غمزدہ کر دیا۔ مولی ایک حیرت انگیز عورت تھی' دریا دل اور بے غرض' تعصب سے یکسر پاک۔ وہ ایسے ایسے طریقوں سے برام کیلئے مددگار بنی تھی کہ ان کا جاننا ناممکن تھا۔ وہ بیوی' شریک کار اور دکھ سکھ کی ساتھی تھی۔ برام پہلے بھی

ایک صدمے سے دوچار ہو چکا تھا۔اس کا بیٹا ذیابیطس کا مریض تھا اور جوانی ہی میں داغ مفارقت دے گیا تھا۔

جب میں نے مولی کے بارے میں پوچھا تھا' تو برام کا یکلخت اٹھ کر باہر چلے جانا اس کے کردار کا خاصہ تھا۔وہ رواقی فلسفے پر کاربند تھا' لہذا اپنے آلام و مصائب کا بوجھ اپنے دوستوں پر ڈالنا پسند نہیں کرتا تھا۔ایک افریکنر کی حیثیت سے جس کی ضمیر نے اسے مجبور کیا تھا کہ اپنے استعماری ورثے کو خیر باد کہہ دے اور اپنی ہی قوم میں نکو بن جائے' اس نے جس جرات اور ایثار کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ ادھر میں صرف ناانصافی کے خلاف لڑا تھا' اپنی قوم کے خلاف نہیں۔

میں نے میجر سے کہا کہ میں برام کو تعزیت کا خط لکھنا چاہتا ہوں اور اس نے جواب دیا کہ تم لکھ سکتے ہو۔تب قیدیوں کی طرف سے خطوط نویسی کے ضابطے بڑے سخت تھے۔ ہمیں اپنے صرف قریبی خاندان والوں کو خط لکھنے کی اجازت تھی اور وہ بھی پانچ سو الفاظ تک کا خط جو چھ ماہ میں ایک بار ہی لکھا جا سکتا تھا' چنانچہ جب میجر نے میرا برام کو خط لکھنے کی مخالفت نہ کی تو مجھے حیرت اور خوشی ہوئی۔لیکن اس نے اس مفاہمت کا پاس نہ کیا۔ میں نے خط لکھ کر حوالے کر دیا مگر وہ کبھی ڈاک میں نہ بھیجا گیا۔

جیل کے معمولات

چند ماہ میں ہماری زندگی ایک سانچے میں ڈھل گئی۔جیل کی زندگی ایک معمول کے مطابق چلتی ہے۔ ہر دن پہلے جیسا ہوتا ہے' ہر ہفتہ پہلے جیسا گزرتا ہے اور سال ایک دوسرے میں مدغم ہوتے چلے جاتے ہیں۔کوئی بات جو اس معمول سے ہٹ کر ہو وہ حکام کو پریشان کر دیتی ہے کیونکہ روٹین یا معمول اس امر کی علامت ہے کہ جیل ٹھیک ٹھاک چل رہی ہے۔

روٹین قیدی کے لیے بھی تسکین بخش ہوتی ہے اور اسی لیے اور ایک پھندا ثابت

ہوتی ہے۔ روٹین ایک خوشگوار ملکہ ہو سکتی ہے جس کی مزاحمت مشکل ہو کیونکہ روٹین وقت کو تیز تر چلاتی ہے۔ جزیرہ روبن پر ہر طرح کی گھڑیاں اور گھڑیال ممنوع تھے' لہٰذا ہمیں کبھی ٹھیک پتہ نہیں چلتا تھا کہ وقت کیا ہے۔ ہم گھنٹیوں اور محافظوں کی سیٹیوں اور پکاروں کے پابند تھے۔ جب ہر ہفتہ پہلے سے مشابہ ہو تو قیدی کو یاد رکھنے کی کوشش کرنی ہوتی ہے کہ دن اور مہینہ کون سا ہے۔ میں نے جو پہلے کام کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اپنی کوٹھڑی کی دیوار پر ایک کیلنڈر بنا لیا۔ وقت کا احساس کھو دینا اپنی گرفت اور اپنا شعور تک کھو دینے کے مترادف ہے۔

جیل میں وقت سست پڑ جاتا ہے اور دن ختم ہونے میں نہیں آتے۔ وقت کے سست چلنے کا تاثر عموماً نکمے پن اور غیر مستعدی پر منتج ہوتا ہے۔ لیکن جزیرہ روبن پر یہ صورتحال نہیں تھی۔ ہم تقریباً ہر وقت کام' مطالعے یا جھگڑے نپٹانے میں مصروف رہتے۔ پھر بھی وقت برفانی گلیشیر کی سی رفتار سے گزرتا تھا۔ جزوی طور پر اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ باتیں جنہیں باہر چند گھنٹے یا دن لگتے ہیں' انہیں جیل میں مہینے یا سال لگ جاتے ہیں۔ دانت صاف کرنے کے نئے برش کی درخواست کو پورا ہونے میں چھ ماہ یا سال لگ سکتا ہے۔ احمد کاتھرادا نے ایک بار کہا کہ جیل میں منٹ' سالوں پر محیط لگ سکتے ہیں لیکن سال منٹوں کی طرح چلتے ہیں۔ سہ پہر کو صحن میں پتھر توڑنے کا عمل یوں لگ سکتا ہے کہ کبھی ختم ہونے کا نہیں' مگر پھر اچانک سال ختم ہو جاتا ہے اور آپ کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ سارے مہینے کہاں گئے۔

ہر قیدی' خصوصاً ہر سیاسی قیدی کے لیے چیلنج یہ ہوتا ہے کہ جیل میں صحیح سلامت کیسے رہے' جیل سے پورے کا پورا کیسے نکلے' اپنے اعتقادات کا تحفظ کیسے کرے اور کس طرح ان کی تکمیل کرے۔ اس تکمیل میں پہلا کام ٹھیک ٹھیک یہ سیکھنا ہے کہ اپنی بقا کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے پہلے اس دشمن کے مقصد سے آگاہ ہونا چاہیے اور اس کے بعد دشمن کے مقصد کو ناکام بنانے کی سٹرا ٹیجی اختیار کرنی

چاہیے۔ جیل کی تشکیل اس لیے ہوتی ہے کہ قیدی کے جذبے کو توڑا اور اس کے عزم کو تباہ کیا جائے۔ ایسا کرنے کے لیے حکام ہر کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہر اقدام کو تباہ کرتے ہیں اور انفرادیت کی تمام علامتوں کی نفی کرتے ہیں اور یہ سب کچھ وہ اس نظریئے سے کرتے ہیں کہ اس شعلے کو بجھا دیں جو ہم میں سے ہر ایک کو انسان بناتا اور یہ سمجھاتا ہیکہ ہم کون ہیں۔

میں نے مایوسی کو شکست دی

حکام ہمارے ساتھ جو کچھ کرنے کی کوشش کر رہے تھے ہماری بقا اسے سمجھنے اور یہ شعور دوسروں تک پہنچانے پر منحصر تھی۔ ایک آدمی کے لیے مزاحمت کرنا اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر میں تنہا ہوتا تو میں یہ کام کر گزرتا۔ لیکن حکام کی سب سے بڑی غلطی ہمیں اکٹھے رکھنا تھی کیونکہ اکٹھے رہ کر ہمارا عزم کئی گنا پختہ ہو جاتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو سہارا دیتے اور ایک دوسرے سے قوت حاصل کرتے تھے' جو کچھ ہم جاتے یا جو کچھ ہم سیکھتے تھے اس میں ایک دوسرے کو شریک کرتے تھے اور اس طرح ہمارا وہ حوصلہ کئی گنا بڑھ جاتا جو ہم انفرادی طور پر رکھتے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم جو مشکلات برداشت کرتے تھے ان پر ہم سب کا ردعمل ایک جیسا تھا۔ انسانوں کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں اور وہ کسی خارجی عمل پر مختلف ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے طاقتور لوگوں نے کمزوروں کو اوپر اٹھایا اور اس عمل میں دونوں طاقتور ہو گئے۔ آخر کار جیل میں ہمیں اپنی زندگیاں خود تخلیق کرنی پڑیں۔ جیل میں نظم وضبط وارڈروں کے ذریعے نہیں بلکہ ہمارے ذریعے قائم ہوا اور ایک طرح سے حکام بھی اسے تسلیم کرتے تھے۔

ایک رہنما کی حیثیت سے انسان کو بعض اوقات ایسے اقدامات کرنے ہوتے ہیں جو نامقبول ہوں یا جن کے نتائج مستقبل میں برسوں تک نامعلوم ہوں۔ ایسی فتوحات بھی ہوتی ہیں جن کی عظمت اور شان صرف اس حقیقت میں مضمر ہوتی ہے

کہ وہ فقط ان لوگوں کے علم میں رہتی ہیں جو انہیں حاصل کرتے ہیں۔ یہ بات جیل پر خاص طور پر صادق آتی ہے جہاں آپ کو اپنے نظریات پر کاربند رہ کر تسکین حاصل کرنا ہوتی ہے اگرچہ کوئی اور اس کے بارے میں نہیں جانتا۔

اب میں عملی لحاظ سے الگ تھلگ تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ میں جدوجہد ترک نہیں کروں گا۔ میں ایک مختلف اور کہیں چھوٹے دائرے میں تھا جہاں سامعین صرف ہم خود تھے یا ہمارے جیلر۔ ہم جیل میں اپنی جدوجہد کو پورے ملک کی جدوجہد کا عکس خیال کرتے تھے۔ ہم جیل کے اندر بھی اسی طرح سرگرم کار تھے جس طرح باہر سرگرم رہے تھے۔ نسل پرستی اور تشدد وہی تھے اور مجھے ان کے خلاف صرف مختلف شرائط پر لڑنا تھا۔

جیل اور اس کے حکام ہر شخص کو اس کے وقار اور عزت نفس سے محروم کرنے کی سازش کرتے ہیں۔ مجھے از خود یقین تھا کہ میں اس آزمائش سے عہدہ برآ ہوں گا کیونکہ کوئی شخص یا ادارہ جو مجھے میری عزت نفس سے محروم کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ ہار جائے گا کیونکہ میں کسی قیمت پر یا کسی دباؤ کے تحت اس کا شریک کار نہیں بنوں گا۔ میں نے کبھی سنجیدگی سے اس امکان پر غور نہیں کیا تھا کہ کسی روز میں جیل سے باہر نہیں آؤں گا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ عمر قید کا مطلب واقعی عمر قید ہے اور یہ کہ میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے مر جاؤں گا۔ شاید میں اس امکان کا انکار کر رہا تھا کیونکہ یہ اتنا ناخوشگوار تھا کہ اس کے متعلق سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن میں ہمیشہ سمجھتا تھا کہ کسی روز میں اپنے پاؤں کے نیچے پھر گھاس محسوس کروں گا اور ایک آزاد آدمی کی طرح دھوپ میں چلوں گا۔

میں بنیادی طور پر ایک رجائی ہوں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ وصف مجھے فطرت سے ملا ہے یا پرورش سے۔ رجائیت پسند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنا چہرہ روشنی کی طرف رکھے اور اس کے قدم آگے بڑھتے رہیں۔ کئی تاریک لمحات ایسے

آئے جب انسانیت پر میرا یقین سخت آزمائش میں پڑا لیکن میں نے اپنے آپ کو مایوسی کے سپرد نہ کیا اور نہ میں ایسا کر سکتا تھا...... کیونکہ اس راستے میں شکست اور موت پنہاں تھی۔

ہم ہوئے ''کافر''......

ہر صبح ساڑھے پانچ بجے محافظین ہمیں جگا دیتے۔ وہ ہماری راہداری کے سرے پر پیتل کی ایک گھنٹی بجا کر پکارتے: ''ورڈو یکر! شطان اوپ!'' (جاگو! اٹھو!) میں ہمیشہ سے سحر خیز ہوں اور یہ گھڑی مجھ پر کوئی بار نہیں تھی۔ اگرچہ ہمیں ساڑھے پانچ بجے جگا دیا جاتا، مگر پونے سات تک ہمیں اپنی کوٹھڑیوں سے باہر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس وقت تک ہم سے توقع کی جاتی تھی کہ ہم اپنے کوٹھڑیاں صاف کر لیں اور اپنی چٹائیاں اور کمبل لپیٹ دیں۔ ہماری کوٹھڑیوں میں بہتا پانی نہیں تھا اور اس کے بجائے رفع حاجت کے لیے آہنی ڈول تھے جو بیلیز (Ballies) کہلاتے تھے۔ ہر بیلی کا قطر دس انچ تھا اور اس کے سرے پر چینی مٹی کا ایک مجوف ڈھکن تھا جس میں پانچ آ سکتا تھا۔ اس ڈھکن میں پانچ شیو بنانے اور ہاتھ منہ صاف کرنے کے لیے ہوتا۔

پونے سات بجے جب ہمیں کوٹھڑیوں سے باہر نکالا جاتا، پہلا کام جو ہم کرتے وہ اپنے ڈول خالی کرنا تھا۔ راہداری کے سرے پر حوض میں ڈول اچھی طرح مانجھنے پڑتے تھے ورنہ ان سے بدبو آتی رہتی تھی۔ اپنے ڈول کی صفائی کا واحد خوشگوار پہلو یہ تھا کہ ان ابتدائی دنوں میں یہی وہ موقع ہوتا جب ہم اپنے ساتھیوں سے سرگوشی میں کوئی بات کر سکتے تھے۔ جب ہم ڈول صاف کر رہے ہوتے تو محافظ پاس نہیں پھٹکتے تھے لہٰذا ہمیں نرم گفتگو کا موقع مل جاتا تھا۔

ان ابتدائی چند ماہ کے دوران جنرل سیکشن کے قیدی ہماری کوٹھڑیوں میں کھانا تقسیم کرتے تھے۔ ناشتہ مکئی کے دلیے پر مشتمل ہوتا جسے وہ ایک برتن میں ڈال کر

ہماری کوٹھڑیوں کی سلاخوں میں سے اندر انڈیل دیتے۔ وہ یہ کام بڑی پھرتی سے کرتے اور ہمیں بھی بڑی فنکاری سے دلیہا پنے اپنے برتن میں لینا پڑتا تاکہ وہ زمین پر نہ گرنے پائے۔

چند ماہ بعد ناشتہ صحن کے اندر پرانے دھاتی ڈرموں میں تقسیم کیا جانے لگا۔ ہم سادہ دھاتی برتنوں میں دلیہ ازخوں حاصل کر لیتے۔ ہم میں سے ہر ایک کو دلیے کا ایک مگ ملتا۔ یہ دلیہ جسے کافی کہا جاتا تھا دراصل دلی ہوئی مکئی سے تیار کیا جاتا تھا جسے اس قدر بھونا جاتا کہ وہ کالا ہو جاتا اور پھر اسے گرم پانی میں ابال لیا جاتا۔ بعد میں جب ہم ازخود دلیہ لینے صحن میں جانے لگے، میں پہلے وہاں جا کر احاطے کے اندر جاگنگ کرنے لگتا تھا حتیٰ کہ ناشتہ آ پہنچتا۔

جیل میں ہر دوسری شے کی طرح خوراک امتیازی ہوتی ہے۔ عموماً رنگ داروں اور ہندوستانیوں کو افریقیوں کی نسبت قدرے بہتر خوراک ملتی لیکن یہ زیادہ امتیازی قسم کی نہ ہوتی۔ حکام یہ کہنا پسند کرتے تھے کہ ہمیں متوازن غذا دی جاتی ہے۔ یہ واقعی متوازن تھی، اس لحاظ سے کہ یہ بے مزہ اور ناقابل خوردنی کے درمیان کی چیز تھی۔ یہ خوراک ہمارے کئی احتجاجوں کی دعوت دیتی تھی۔ لیکن ان ابتدائی دنوں میں جیل کے محافظین بس یہ کہتے: ''آپ تم کافر جیل میں بہتر خوراک کھا رہے ہو اور ایسی خوراک تم نے گھر میں کبھی کھائی ہو گی۔'' (نسلی تعصب رکھنے والے مسیحی گورے افریقیوں کے مسیحیت قبول کر لینے کے باوجود نفرت سے انہیں ''کافر'' ہی کہتے...... مترجم)

''طاقت کا مشروب''

ناشتے کے دوران محافظین چلاتے: ''وال ان! وال ان!'' (قطاریں بنا لو! قطاریں بنا لو!) اور ہم اپنی کوٹھڑیوں کے باہر معائنے کیلئے کھڑے ہو جاتے۔ ہر قیدی کیلئے ضروری ہوتا کہ اس کی خاکی جیکٹ کے تینوں بٹن ٹھیک طرح بند ہوں۔

ہم سے توقع کی جاتی کہ جب محافظ معاینہ کرتا چلے تو ہم اپنا ہیٹ اتار دیں۔ اگر ہمارے بٹن ٹھیک طرح بند نہ ہوتے' ہماری ہیٹ سر سے نہ اترتے یا ہماری کوٹھڑیاں نا صاف ہوتیں تو ہمیں جیل کے ضابطے کی خلاف ورزی کے ملزم ٹھہرایا جاتا اور قید تنہائی یا کھانوں سے محرومی کی شکل میں سزا دی جاتی۔

معاینے کے بعد ہم صحن میں دوپہر تک پتھر توڑنے کا کام کرتے۔ اس کام میں کوئی وقفہ نہ ہوتا۔ اگر ہم سست پڑتے تو محافظین چلانے لگتے کہ کام تیز کرو۔ دوپہر کو لنچ کی گھنٹی بجتی اور صحن میں خوراک کا ایک اور دھاتی ڈرم پہیوں پر دھکیل کر لایا جاتا۔ افریقیوں کے لیے لنچ ابلے ہوئے مکئی کے دلیے پر مشتمل ہوتا۔ ہندوستانی اور رنگ دار قیدی "سیمپ" یعنی چاول کی کھچڑی تناول کرتے جو پسی ہوئی مکئی اور چاولوں کے سوپ کا سا آمیزہ ہوتی۔ سیمپ کے ساتھ بعض اوقات انہیں سبزیاں بھی مہیا کی جاتیں جبکہ ہم خالی دلیے پر اکتفا کرتے۔

لنچ میں ہمیں اکثر "فوزامانڈلا" دیا جاتا جس کا مطلب تھا "طاقت کا مشروب۔" یہ مکئی کے دلیے اور قدرے خمیر سے تیار کردہ سفوف تھا۔ اسے پانی یا دودھ میں ملایا جاتا ہے اور جب گاڑھا ہو تو مزے دار ہوتا ہے لیکن جیل حکام ہمیں اتنا کم سفوف دیتے کہ اس سے بمشکل پانی کا رنگ بدلتا۔ میں عموماً کئی دنوں تک سفوف بچاتا رہتا حتیٰ کہ وہ اتنا کافی ہو جاتا کہ اس سے مناسب مشروب بن سکے لیکن اگر حکام کو پتہ چل جاتا کہ کوئی قیدی سفوف جمع کر رہا تو وہ ضبط کر لیا جاتا اور اسے سزا بھی ملتی۔

لنچ کے بعد ہم چار بجے تک کام کرتے حتیٰ کہ محافظین تیز تیز سیٹیاں بجاتے اور ہم ایک بار پھر گنتی اور معاینے کیلئے قطاریں بنا لیتے۔ پھر ہمیں صفائی کیلئے آدھ گھنٹے کی مہلت ملتی۔ راہداری کے سرے پر باتھ روم میں سمندری پانی کے دو شاور لگے ہوئے تھے۔ ایک پانی کا نل تھا اور تام چینی کے تین بڑے بڑے بکٹ تھے جنہیں باتھ ٹب کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ہمیں گرم پانی میسر نہیں تھا۔ ہم ان ٹبوں کے

اندر کھڑے ہو جاتے یا چوکڑی مار کر بیٹھ جاتے اور نمکین سمندری پانی کیشاور کے نیچے جسم تر کر کے صابن لگاتے اور دن بھر کا میل اپنے جسم سے اتارتے۔ جب باہر سردی ہوتو ٹھنڈے پانی سے غسل خوشگوار نہیں ہوتا لیکن ہم اسے بھی لطف بنا لیتے۔ ہم نہاتے وقت کبھی کبھی گانے لگتے جس سے پانی کے یخ ہونے کا احساس کم ہوتا۔ ان ابتدائی دنوں میں یہی وقت ہوتا تھا جب ہم تبادلہ خیال کر سکتے تھے۔

کھانے میں ''بلی کا سر''

ساڑھے چار بجے راہداری کے سرے پر چوبی دروازے زور سے تھپتھپایا جاتا جس کا مطلب تھا کہ رات کا کھانا آ گیا ہے۔ عام قیدی ہمیں برتنوں میں کھانا دیتے اور ہم اسے کھانے کے لیے کوٹھڑیوں کی طرف لوٹ آتے۔ ہمیں پھر مکئی کا دلیہ ہی ملتا تھا۔ کبھی اس میں گاجر یا گوبھی چقندر کا ٹکڑا ڈال دیا جاتا جسے عموماً تلاش کرنا پڑتا۔ اگر ہمیں کوئی سبزی ملتی تو وہی کئی ہفتوں تک چلتی رہتی حتیٰ کہ گاجریں یا گوبھی باسی اور پھپھوندی لگی بھی ہوتیں اور ہم ان کو کھاتے کھاتے تنگ آ جاتے۔ ہر دوسرے دن ہمیں دلیے کے ساتھ گوشت کا ایک چھوٹا ٹکڑا بھی دیا جاتا۔ گوشت عموماً نرمی ہڈی کا ہوتا۔

رات کے کھانے میں رنگ دار اور ہندوستانی قیدیوں کو ایک چوتھائی چپاتی ملتی جو ''کیت کوپ'' کہلاتی تھی یعنی ''بلی کا سر'' کیونکہ اس کی شکل بلی کے سر جیسی ہوتی۔ کیت کوپ کے ساتھ مارجرین کی ایک ٹکیہ ملتی۔ افریقیوں کے بارے میں تصور کیا جاتا تھا کہ انہیں روٹی کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ یہ ''یورپی'' قسم کی خوراک تھی۔

ہمیں اس مقدار سے بھی کم خوراک دی جاتی تھی جس کی جیل کے ضابطے اجازت دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ باورچی خانے سے خوراک اسمگل ہوتی رہتی تھی۔ باورچی، جو سب عام قیدی ہوتے تھے، اپنے یا اپنے دوستوں کے لیے بہترین خوراک الگ کر لیتے۔ اکثر وہ زیادہ لذیذ اشیاء محافظین کے لیے رکھ لیتے تاکہ وہ ان

سے نرمی کا یا ترجیحی سلوک کریں۔

آٹھ بجے شب' رات کا محافظ ہمارے ساتھ راہداری میں بند ہو جاتا۔ وہ اندر سے راہداری کو تالا لگا کر چابی دروازے کے چھوٹے سے سوراخ میں سے باہر والے محافظ کو تھما دیتا۔ پھر وہ راہداری میں ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے حکم دیتا کہ ہم سو جائیں۔ روبن آئی لینڈ میں بتایا بجھانے کا بلند آہنگ حکم کبھی نہ گونجتا کیونکہ ہماری کوٹھڑی میں جالی سے ڈھکا واحد بلب دن رات جلتا رہتا تھا۔ بعد میں ان قیدیوں کو جو اعلیٰ ڈگری کے لیے مطالعہ کرتے تھے' اجازت دی گئی کہ وہ رات دس بجے تک پڑھ سکتے ہیں۔

ہم سونے سے پہلے ایک دوسرے سے تھوڑی گپ شپ کیا کرتے تھے۔ لیکن اگر ہم سرگوشیوں کے الفاظ صاف طور پر سن سکتے تھے تو وہ محافظ بھی سن لیتا تھا جو پکار اٹھتا ''راہداری میں خاموشی رہے۔'' وہ یہ تسلی کرنے کے لیے بھی راہداری میں ادھر سے ادھر چکر لگاتا کہ ہم پڑھ تو نہیں رہے۔ چند ماہ بعد ہم نے یہ اہتمام کیا کہ راہداری میں کچھ ریت بکھیر دیتے تاکہ محافظ کے قدموں کی آہٹ ہمیں سنائی دے سکے اور ہمیں باتیں بند کرنے یا کوئی ممنوعہ شے چھپانے کا وقت مل جائے۔ جب ہم خاموش ہو جاتے' محافظ اسی وقت راہداری میں اپنے چھوٹے سے دفتر میں اپنی نشست پر جا بیٹھتا جہاں وہ صبح تک اونگھتا رہتا۔

برام اور جوئل سے ملاقات کے کئی روز بعد ایک صبح ہمیں جیل کے صدر دفتر لے جایا گیا۔ یہ تقریباً ایک چوتھائی میل کے فاصلے پر تھا اور یہ ایک سادہ پتھر کی عمارت تھی جو ہماری اپنے سیکشن سے مشابہ تھی۔ وہاں پہنچے تو ہمیں انگلیوں کے نشانات لینے کے لیے قطاروں میں لگا دیا گیا۔ یہ جیل میں معمول کی بات تھی۔ لیکن اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے میں نے مشاہدہ کیا کہ ایک وارڈر کے ہاتھ میں کیمرہ ہے۔ ہمارے فنگر پرنٹس لے لیے گئے تو چیف وارڈر نے حکم دیا کہ تصویروں کے لیے قطار بنا

لیں۔ میں نے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ اپنی اپنی جگہ کھڑے رہیں اور پھر وارڈر سے کہا: ''میں چاہتا ہوں کہ آپ کمشنر جیل خانہ جات کی طرف سے ہماری تصویریں لیے جانے کا حکم نامہ دکھائیں۔'' میں جانتا تھا کہ قیدیوں کی تصویریں لینے کے لیے ایسا حکم نامہ درکار ہوتا ہے۔

قواعد و ضوابط سے آگاہ رہنا جیل میں ہمیشہ مفید ثابت ہوا کیونکہ خود وارڈر اکثر ان سے بے خبر ہوتے تھے اور اپنی برتر معلومات سے انہیں دھمکایا جا سکتا تھا۔ اب میری اس درخواست پر وارڈر چکرا گیا۔ اور وہ کمشنر جیل خانہ جات کی طرف سے کوئی وضاحت یا تحریری حکم نامہ پیش نہ کر سکا۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر ہم نے اپنی تصویریں لیے جانے پر آمادگی ظاہر نہ کی تو وہ میں چارج شیٹ کرے گا لیکن میں نے کہا کہ اگر حکم نامہ پیش نہیں کیا گیا تو تصویریں نہیں اتریں گی اور معاملہ یہیں ختم ہو گیا۔

ہتھوڑیوں کے بجائے بوسیدہ جرسیاں

چند ہفتے بعد ایک صبح چیف وارڈر نے ہمیں صحن میں کام کے لیے ہتھوڑیاں پکڑانے کے بجائے ہر ایک کو سوئی دھاگہ اور جیل میں پہنی ہوئی جرسیوں کا ایک ڈھیر دیا۔ ہمیں ہدایت کی گئی کہ ہم ان کی مرمت کریں لیکن انہیں دیکھا تو پتہ چلا کہ ان میں سے اکثر اتنی بوسیدہ ہیں کہ مرمت نہیں کی جا سکتیں۔ ہمیں یہ کام عجیب لگا اور حیرت ہوئی کہ جیل والوں کو یہ کیا سوجھی ہے۔ اس روز بعد میں گیارہ بجے مین گیٹ کھلا اور کمانڈنگ آفیسر سول لباس میں دو افراد کے ساتھ نمودار ہوا۔ سی او نے اعلان کیا کہ دونوں ملاقاتی ڈیلی ٹیلی گراف لندن کی طرف سے رپورٹر اور فوٹو گرافر ہیں۔ اس نے اس طرح کی بات کی جیسے بین الاقوامی پریس کے نمائندے باقاعدہ ہم سے ملنے آتے رہیں گے۔ اگرچہ یہ لوگ ہمارے پہلے سرکاری ملاقاتی تھے، ہم نے انہیں شک کی نگاہوں سے دیکھا۔ اول، وہ حکومت کے زیر اہتمام آئے تھے۔ دوم، ہم

جانتے تھے کہ ٹیلی گراف ایک قدامت پرست اخبار ہے جس کی ہمارے کاز سے ہمدردی کا امکان نہیں۔ ہم خوب جانتے تھے کہ ہماری حالات کے متعلق بیرونی دنیا میں بڑی تشویش پائی جاتی ہے اور یہ ظاہر کرنا حکومت کے مفاد میں تھا کہ ہم سے برا سلوک نہیں کیا جا رہا۔

دونوں صحافیوں نے صحن میں ہمارا جائزہ لیتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر ایک چکر لگایا۔ ہم اپنے سر نیچے کیے رہے اور اپنے کام پر توجہ مبذول رکھی۔ جب وہ ایک چکر لگا چکے تو ایک گارڈ نے مجھے کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا ''منڈیلا! آگے آؤ۔ تم اب ان سے بات کرو گے۔'' ان ابتدائی دنوں میں اکثر اپنے ساتھی قیدیوں کی طرف سے بات کیا کرتا تھا۔ لیکن جیل کے ضابطے واضح تھے کہ ہر قیدی کو صرف اپنے متعلق بات کرنے کی اجازت تھی۔ اس کا مقصد ہماری تنظیمیں طاقت کی نفی اور ہماری اجتماعی قوت کو توڑنا تھا۔ ہم نے اس ضابطے پر اعتراض کیا لیکن اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ہمیں شکایت پیش کرتے وقت لفظ We کہنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ لیکن ان ابتدائی برسوں میں جب حکام کو قیدیوں کی طرف سے بات کرنے کے لیے کسی ایک کی ضرورت پڑتی تو وہ میں ہی ہوتا۔

میں نے رپورٹر سے جس کا نام نیومین تھا' بیس منٹ تک بات کی اور جیل اور رائیونیا مقدمہ دونوں کے بارے میں بے لاگ باتیں کیں۔ وہ ایک ملنسار شخص تھا اور گفتگو کے آخر میں اس نے کہا کہ وہ فوٹوگرافر سے میری تصویر کھنچوانا چاہتا ہے۔ مجھے اس میں تامل تھا مگر پھر میں نرم پڑ گیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ تصویر بیرونی ممالک میں شائع ہو گی اور اگر مضمون تھوڑا سا بھی دوستانہ ہوا تو یہ ہمارے کاز کو بڑھاوا دے گی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس شرط پر آمادہ ہوں اگر مسٹر سیسولو بھی میرے ساتھ ہوں۔ آخر تصویر لی گئی جو ہم دونوں کو صحن میں کسی ایسے مسئلے پر باتیں کرتے دکھاتی ہے جو اب مجھے یاد نہیں۔ میں نے کبھی وہ مضمون دیکھا نہ اس کے

بارے میں سنا۔ جیسے ہی رپورٹر اور فوٹو گرافر نظروں سے اوجھل ہوئے وارڈروں نے جرسیاں اٹھالیں اور ہمیں پھر ہتھوڑیاں پکڑا دیں۔

امریکی مہمان کی آمد

ٹیلی گراف کے نمائندے ان ابتدائی سالوں میں ملاقاتیوں کے چھوٹے دھارے کے پیشرو ثابت ہوئے۔ جبکہ رائیوونیا مقدمہ ہنوز لوگوں کے ذہنوں میں گونج رہا تھا' حکومت بین الاقوامی برادری پر یہ ظاہر کرنے کی شائق تھی کہ ہم سے اچھا سلوک ہو رہا ہے۔ اخبارات میں جزیرہ روبن پر غیر انسانی حالات کے متعلق اور اس امر کی رپورٹیں شائع ہوئی تھیں کہ کس طرح وہاں ہم پر تشدد کیا جاتا تھا۔ ان الزامات نے حکومت کو پریشان کر دیا تھا اور اس کی تلافی کے لیے وہ بیرونی لوگوں کو بلاتی رہی تا کہ ان تنقیدی کہانیوں کی تردید ہو سکے۔

ایک برطانوی قانون دان نے ہم سے مختصر ملاقات کی جس نے عالمی عدالت میں نمیبیا کی آزادی کی وکالت کی تھی۔ اس کے بعد ہمیں اطلاع دی گئی کہ امریکن بار ایسوسی ایشن کے رکن مسٹر ہائنگ ہم سے ملنے آئیں گے۔ تب امریکی' جنوبی افریقہ کا شاذونادر ہی رخ کرتے تھے' چنانچہ میں ایک اتنی بلند پایہ تنظیم کے نمائندے سے ملنے کا بہت اشتیاق رکھتا تھا۔

مسٹر ہائنگ کی آمد کے روز ہمیں صحن میں بلا لیا گیا۔ امریکی' کمشنر جیل خانہ جات جنرل سٹائن کی معیت میں وارد ہوا۔ کمشنر صاحب عام حالات میں کم ہی جزیرے کا رخ کرتے تھے۔ وہ محکمہ جیل کے ایک غیر معمولی فرد تھے' شائستہ اور خوش اطوار۔ ان کا سوٹ عمدہ قسم اور جدید تراش کا ہوتا۔ وہ ملنسار تھے اور ہمیں ''جنٹل مین'' کہہ کر مخاطب کرتے حتیٰ کہ ہمارے سامنے سر سے ہیٹ بھی اتار لیتے' اور یہ کام جیل سروس میں کبھی کسی نے نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود جنرل سٹائن حکم کے بجائے چشم پوشی کے ذریعے ہمیں ابتلا میں رکھتے تھے۔ جزیرے میں جو کچھ ہو رہا تھا اس

سے وہ آنکھیں بند کر لیتے تھے ان کی عادتاً غیر حاضری سے جیل کے ظالم تر افسر اور شیر ہو جاتے اور انہیں کھلا پروانہ مل جاتا کہ وہ جو چاہیں کریں۔ اب جنرل نے انتہائی خوش اطواری سے ہماری مہمان کا تعارف کرایا اور کہا: ''جنٹل مین! براہ کرم آپ اپنا نمائندہ چن لیں۔'' بہت سے قیدیوں نے میرا نام لے دیا۔

جنرل سٹائن نے میری طرف اشارہ کیا اور میں کھڑا ہو گیا۔ جنرل کے برعکس مسٹر ہائنگ بھاری تن و توش کے تھے اور بنے سنورے نہیں تھے۔ میں نے ان کی آمد پر ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ان کی یہاں موجودگی ہمارے لیے اعزاز ہے۔ پھر میں نے اپنی شکایات مختصراً بیان کیں اور آغاز ہی میں یہ مرکزی اور اہم بات کہی کہ ہم سیاسی قیدی ہیں، مجرم نہیں اور ہم سے سیاسی قیدیوں ہی کا سلوک ہونا چاہیے۔ میں نے اپنی خوراک، رہائش کے حالات اور کام کی تفصیل سے متعلق شکایات بیان کیں۔ لیکن جب میں بول رہا تھا، مسٹر ہائنگ بیچ میں ٹوکتے رہے۔ جب میں نے بے شغف کام کے طویل اوقات کا ذکر کیا تو وہ بولے کہ قیدیوں کی حیثیت سے ہمیں کام کرنا ہو گا اور غالباً ہم ہڈ حرام ہیں۔

جب میں نے اپنی کوٹھڑیوں کے مسائل بیان کرنے شروع کیے تو انہوں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ پسماندہ امریکی جیلوں کے حالات جزیرہ روبن کی نسبت کہیں زیادہ خراب ہیں اور یہ تو ان کے مقابلے میں جنت ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہمیں ٹھیک سزا دی گئی ہے اور خوش قسمت ہیں کہ سزائے موت نہیں ملی جس کے غالباً ہم مستحق تھے۔

مسٹر ہائنگ کو پسینہ بہت آتا تھا اور ہم میں سے بعض کا خیال تھا کہ وہ ہرگز سنجیدہ نہیں۔ وہ جس لہجے میں بات کرتے تھے وہ میرے خیال میں جنوبی امریکی ریاستوں کا لہجہ تھا۔ انہیں باتیں کرتے ہوئے تھوکنے کی عجیب عادت تھی جس کا ہم میں سے کسی نے پہلے کبھی مشاہدہ نہیں کیا تھا۔

آخر کار جب میں ان کے منہ سے بہت باتیں سن چکا تو میں نے انہیں ٹوکتے ہوئے کہا: ''نہیں جناب! میں جو نکات بیان کر رہا ہوں آپ انہیں سمجھ نہیں رہے۔'' اس پر ہائننگ بگڑ گئے کہ میں ان کی تردید کر رہا ہوں جبکہ جنرل شٹائن دیکھتے اور کسی تبصرے کے بغیر سنتے رہے۔ ان حالات میں اپنا مزاج پرسکون رکھنا مشکل تھا۔ میرے ساتھی مسٹر ہائننگ کے ریمارکس پر ناراض ہوئے۔ انہیں اعتراض تھا کہ اس شخص کو یہاں آنے کی اجازت ہی کیوں دی گئی۔ عموماً اس قسم کے دورے سے ہمارے جذبوں کو مہمیز ملتی تھی، مگر مسٹر ہائننگ کی آمد مورال گرائے دیتی تھی۔ شاید حکام بھی یہی چاہتے تھے۔ ایک ایسے شخص سے ملاقات جس کی جانبداری اس قدر واضح اور جس میں سمجھنے کی صلاحیت بہت کم تھی، ہمارے لیے مایوس کن تھی۔ آخر میں ہائننگ ہمیں خدا حافظ کہے بغیر مڑا اور رخصت ہو گیا۔ ہمیں اسے جاتا دیکھ کر کوئی افسوس نہ ہوا۔

ہم برسوں بعد تک مسٹر ہائننگ کے رویئے پر گفتگو کیا کرتے اور بہت سے ساتھی اس کی باتوں اور تمسخر آمیز لہجے کی نقل اتارا کرتے۔ ہم نے دوبارہ ان کے بارے میں کبھی نہ سنا۔ انہوں نے جزیرہ روبن پر امریکن بار ایسوسی ایشن کے لیے کوئی دوستانہ جذبات پیدا نہیں کیے تھے۔

چھ ماہ میں صرف ایک خط

جیل میں حکام تمام قیدیوں کو چار قسموں یا کلاسوں میں بانٹتے ہیں۔ اے، بی، سی اور ڈی۔ قسم اے ان میں سرفہرست ہے اور سب سے زیادہ مراعات کی مستحق ٹھہرتی ہے۔ ڈی کلاس قیدی سب سے نیچے آتے ہیں اور ان کا استحقاق بھی سب سے نچلے درجے کا ہوتا ہے۔ تمام سیاسی قیدی، جنہیں حکام سکیورٹی پرزنرز کہتے تھے، جیل میں داخل ہو کر از خود ڈی کلاس میں شامل ہو جاتے تھے۔ اس تقسیم کے تحت ملنے والی مراعات میں ملاقاتیں اور خطوط، مطالعہ اور اشیائے ضرورت خریدنے کے مواقع

شامل تھے اور یہ سب ایک قیدی کی زندگی کا لازمہ ہیں۔ایک سیاسی قیدی کو کلاس ڈی سے کلاس سی تک پہنچنے میں عموماً برسوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔

ہم اس درجہ بندی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔یہ نظام بدعنوانی اور اہانت پر مبنی تھا اور عام قیدیوں کو بالعموم اور سیاسی قیدیوں کو بالخصوص دبا کر رکھنے کا ایک طریقہ تھا۔ہمارا مطالبہ تھا کہ سب سیاسی قیدی ایک ہی کیٹگری میں رکھے جائیں۔ اگرچہ ہم اس نظام پر تنقید کرتے تھے مگر اسے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کیونکہ درجہ بندی جیل کی زندگی کا لازمہ تھا۔اگر آپ ڈی گروپ قیدی کی حیثیت سے احتجاج کرتے کہ آپ کو ہر چھ ماہ میں صرف ایک خط کیوں ملتا ہے تو حکام کہتے۔''اپنا رویہ بہتر بناؤ اور سی گروپ قیدی بن جاؤ تو تم ہر چھ ماہ میں دو خطوط موصول کرنے کے حقدار ہو گے۔''اگر آپ شکایت کرتے کہ آپ کو اچھی خوراک نہیں ملتی تو حکام آپ کو یاد دلاتے کہ اگر تم اے گروپ میں ہوتے تو باہر سے منی آرڈر وصول کرنے اور پرزن ٹک شاپ سے زائد خوراک خریدنے کے حقدار' حتیٰ کہ ایک مجاہد آزادی بھی اشیائے ضرورت اور کتابیں خریدنے کی رعایت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

درجہ بندی ایک قیدیکی سزا کی طوالت کے متوازی چلتی تھی۔اگر آپکو اٹھ سال کی سزا ہوتی تو آپ کو پہلے دو سال ڈی کلاس میں رکھا جاتا' اگلے دو سال ہی کلاس میں' مزید اگلے دو سال بی میں اور آخری دو سال اے میں۔لیکن جیل حکام درجہ بندی کو سیاسی قیدیوں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے تھے۔وہ ان کے رویئے کنٹرول کرنے کے لیے دھمکی دیتے کہ وہ قیدی کا مشکل سے حاصل کردہ درجہ گھٹا دیں گے۔

اگر میں جزیرہ روبن پہنچنے سے پہلے قریباً دو سال جیل میں رہ چکا تھا' لیکن یہاں پہنچ کر میں ابھی تک ڈی کلاس میں تھا۔میں بالائی درجوں میں ملنے والی مراعات کی خواہش رکھتا تھا مگر میں اپنے رویئے پر مفاہمت کرنے سے انکار کر دیا۔

بالائی درجہ حاصل کرنے کا تیز ترین طریقہ یہ تھا کہ گدھے بن جاؤ اور شکایت نہ کرو۔ وارڈر مجھ سے کہتے: ''آ‘ منڈیلا! تم کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کیے رکھتے ہو‘ اس لیے تم اپنی بقیہ زادگی میں ڈی کلاس ہی میں رہو گے۔''

ہر چھ ماہ بعد قیدیوں کو پرزن بورڈ کے سامنے پیش کیا جاتا تاکہ ان کی درجہ بندی کا جائزہ لیا جا سکے۔ بورڈ جیل کے ضوابط کے پیش نظر ہمارے رویئے کا جائزہ لیتا تھا لیکن ہم نے دیکھا کہ وہ محض رویئے کا جائزہ لینے کے بجائے ایک سیاسی ٹربیونل کی حیثیت سے کام کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ بورڈ میں اپنی پہلی پیشی کے دوران حکام مجھ سے اے این سی اور میرے نظریات کے متعلق سوال پوچھتے رہے اگرچہ ان کا درجہ بند نظام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان سوالوں کے جواب دے کر یہ خیال کرنا کہ میں انہیں اپنے نظریات کا قائل کر سکتا ہوں‘ بیکار کوشش تھی۔ ان مختصر اوقات ہی میں ہم سے انسانوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا لہذا ایک ملاقات میں‘ میں نے سوالوں کے جواب دے دیئے۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ تو حکام کی طرف سے ہم سے معلومات اگلوانے کی ایک ٹیکنیک ہے اور میں اس میں پھنس گیا تھا۔ اس کے بعد جلد ہی ہم ساتھیوں نے اتفاق سے طے کیا کہ ہم جیل بورڈ کے سامنے سیاست پر بات نہیں کریں گے۔

پہلے درجے کے اعزہ کی بری خبریں

ڈی کلاس قیدی کی حیثیت سے میں ہر چھ ماہ کے دوران ایک ملاقات کا حقدار تھا‘ ایک خط لکھ سکتا تھا اور ایک ہی خط وصول کر سکتا تھا۔ میں نے اسے جیل سسٹم کی سب سے زیادہ غیر انسانی بندش پایا۔ اپنے خاندان سے رابطہ ایک انسان کا حق ہے اور اسے جیل سسٹم کی درجہ بندی سے محدود نہیں کیا جانا چاہیے۔ لیکن یہ تحدید تو جیل کی زندگی کی ایک حقیقت تھی۔

ملاقاتیں اور خطوط ''پہلے درجے'' کے رشتے داروں تک محدود تھے۔ اس پابندی

کو ہم نہ صرف تکلیف دہ پاتے تھے بلکہ یہ نسل پرستانہ بھی تھی۔ خاندانی قربت کا افریقی شعور یورپی یا مغربی معیار سے بہت مختلف ہے۔ ہمارے خاندانی ڈھانچے زیادہ بڑے اور کشادہ تر ہوتے ہیں۔ کوئی شخص جو ایک مشترک بزرگ کی نسل سے ہونے کا دعویدار رہا ہے ایک ہی خاندان کا رکن خیال کیا جاتا تھا۔

جیل میں اپنے خاندان کے متعلق بری خبر سید تر یہ بات ہوتی ہے کہ ان کی کوئی خبر ہی نہ ملے۔ قیدی اپنے خاندان کے تلخ یا ناگوار حقائق سے بے خبر رہے اور اس کے ذہن میں خاندان کے مفروضہ اور سانحات جگہ بناتے رہیں تو ان سے نپٹنا اس کے لیے انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے خاندان کے بارے میں کسی بری خبر پر مبنی خط موصول ہونے کو بالکل کوئی خط موصول نہ ہونے پر ترجیح دی جاتی تھیں۔

لیکن حکام اس تکلیف دہ پابندی کو بھی غلط طور پر استعمال کرتے تھے۔ ڈاک کی توقع بہت زیادہ ہوتی تھیں مگر ڈاک کی تقسیم مہینے میں ایک بار ہوتی اور بعض اوقات چھ چھ ماہ کسی خط کے بغیر گزر جاتے۔ اب چھ ماہ میں ایک خط کی اجازت ملنا لیکن پھر کوئی خط موصول نہ ہونا انتہائی حوصلہ شکن تھا۔ قیدی حیران ہوتا 'میرے بیوی بچوں کو کیا ہوا؟ میری ماں اور بہنوں پر کیا گزری؟ جب مجھے کوئی خط موصول نہ ہوتا' تو میں اپنے آپ کو عظیم صحرائے ''کرو'' کی طرح خشک اور بنجر محسوس کرتا۔ اکثر حکام نفرت کے جذبے سے ہماری ڈاک روک لیتے۔ مجھے یاد ہے محافظین کہتے تھے: ''منڈیلا! آپ کے لیے ہماری پاس خط ہے مگر ہم وہ آپ کو دے نہیں سکتے۔'' وہ کوئی وضاحت نہ کرتے کہ ایسا کیوں ہے اور خط کس کی طرف سے ہے۔ اس وقت میرا ضبط نفس کام آتا اور میں سخت ردعمل ظاہر کرنے سے رک جاتا۔ بعد میں' میں مناسب روش سے احتجاج کرتا اور کبھی کبھار خط مل جاتا۔

جب خطوط آتے تو ہمیں بے پایاں خوشی ہوتی۔ ایک خط گرمائی بارش کی طرح ہوتا جو صحرا میں بھی پھول کھلا سکتی ہے۔ جب حکام کوئی خط میرے حوالے کرتے تو

میں اسے پکڑنے کے لیے فوراً لپکتا نہیں تھا۔ اگرچہ خط فوراً چک لینے کی خواہش ہوتی تھی مگر میں اسے دھیرے سے پکڑتا تھا۔ اگرچہ میری تمنا ہوتی تھی کہ خط وہیں کھول کر پڑھ ڈالوں مگر میں حکام کو اپنے اس اشتیاق کا مظاہرہ دیکھنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔ میں آہستگی سے اپنی کوٹھڑی کی طرف لوٹتا جیسے مجھے اپنے اہل خانہ کا خط کھولنے سے پہلے اور کئی کام کرنے ہوتے تھے۔

ابتدائی چند ماہ کے دوران مجھے ونی کی طرف سے ایک خط موصول ہوا مگر وہ اس قدر سنسر ہو گیا تھا کہ اس میں القاب و آداب کے سوا کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ جزیرے کے سنسر حکام ناپسندیدہ عبارت پر سیاسی پھیر دیتے تھے۔ لیکن بعد میں انہوں نے اس خیال سے یہ طریقہ بدل دیا کہ ہم سیاسی کو دھو کر نیچے سے عبارت پڑھ سکتے تھے' چنانچہ اب وہ ریزر بلیڈ سے پورے پورے پیرے مٹانے لگے۔ چونکہ اکثر خطوط میں کاغذ کے دونوں طرف عبارت لکھی ہوتی تھی' اس لیے دوسری طرف کی عبارت بھی زد میں آ جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ کٹے پھٹے خط ہمارے حوالے کر کے خوش ہوتے تھے۔ سنسر شپ کے ذریعے خطوط کی تقسیم میں تاخیر اس لیے بھی ہوتی تھی کہ وارڈروں کو' جن میں سے بعض کی انگریزی اچھی نہیں تھی' ایک خط کو سنسر کرنے میں ایک ایک مہینہ لگ جاتا تھا۔ ہم جو خطوط لکھتے تھے وہ بھی سنسر ہوتے تھے۔ وہ بھی اکثر اسی طرح کاٹ پھاڑ دیئے جاتے تھے جس طرح ہمارے نام آنے والے خطوط۔

ونی سے عجیب ملاقات

اگست کے آخر میں جب مجھے جزیرے پر آئے ہوئے تین ماہ سے کم ہی ہوئے تھے' مجھے حکام کی طرف سے اطلاع دی گئی کہ اگلے روز میرا ایک ملاقاتی آ رہا ہے۔ انہوں نے یہ نہ بتایا کہ ملاقاتی کون ہے۔ والٹر کو بھی اطلاع دی گئی کہ اس کا بھی ایک ملاقاتی آئے گا اور مجھے شک تھا' امید تھی' تمنا تھی اور یقین تھا کہ یہ ملاقات ونی اور البرٹینا ہی کی ہوگی۔

ونی کو جب سے یہ پتہ چلا کہ ہمیں جزیرہ روبن پر لے جایا گیا ہے' وہ ملاقات کا اہتمام کرنے کی کوشش کرتی آ رہی تھیں۔ ایک پابند فرد کی حیثیت سے اسے وزیر انصاف سے خصوصی اجازت لینی تھی کیونکہ فنی لحاظ سے اسے مجھ سے رابطے کی اجازت نہیں تھی۔

حکام کی مدد سے جزیرہ روبن پر ملاقات کے لیے آنا بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ ملاقات زیادہ سے زیادہ تیس منٹ کی ہوتی اور سیاسی قیدیوں سے شیشے کے پار ہی سے ملاقات ہوسکتی تھی اور انہیں آنے والوں سے کمرے کے اندر روبرو ملاقات کی سہولت حاصل نہیں تھی۔

یوں لگتا تھا حکام ملاقاتوں کا پیشگی منصوبہ نہیں بناتے تھے۔ ایک روز پہلے وہ قیدی کی بیوی سے رابطہ کر کے کہتے: ''تمہارے خاوند سے کل ملاقات کی تمہیں اجازت مل گئی ہے۔'' اس طرح بڑی وقت ہوتی تھی اور اکثر عملی طور پر ملاقاتیں ناممکن ہو جاتی تھیں۔ اگر کوئی رکن خانہ پیشگی ملاقات کا پروگرام بنالیتا تو حکام بعض اوقات اجازت نامہ جاری کرنے میں دانستہ اس قدر تاخیر کرتے کہ ہوئی جہاز نکل جاتا۔ چونکہ اکثر قیدیوں کے اہل خانہ صوبہ کیپ سے دور رہتے تھے اور ان کے پاس رقم بھی کم ہوتی تھی' اس لیے ان کی ملاقاتیں ان کی استطاعت سے باہر تھیں۔ بعض قیدی جو غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے وہ کئی کئی سال تک اپنی بیویوں کی شکل نہ دیکھ پاتے۔ میں ایسے قیدیوں کو بھی جانتا ہوں جنہوں نے جزیرہ روبن پر دس یا زیادہ سال گزار دیئے گئے مگر اس دوران کوئی ان سے ملاقات کرنے نہ آ سکا۔

شیشے کے پار سے ملاقاتوں کیلئے مخصوص کمرہ گھٹا گھٹا اور کھڑکی کے بغیر تھا۔ قیدی کی طرف کمرے میں پانچ خانے بنے تھے جن میں شیشے کے چھوٹے مربع ٹکڑے نصب تھے جن کے دوسری طرف ویسے ہی خانے ملاقاتیوں کیلئے تھے۔ ملاقاتی ایک کرسی پر بیٹھ کر موٹے دھندلے شیشے کے پار قیدی کو دیکھتا۔ مربع شیشے

میں چند چھوٹے چھوٹے سوراخ گفتگو کیلئے ہوتے۔ بولنے والے کو بلند آواز سے بولنا پڑتا تاکہ دوسری طرف آواز سنائی دے سکے۔ بعد میں حکام نے شیشے کے سامنے مائیکروفون اور سپیکر نصب کر دیئے اور یہ ایک معمولی بہتری تھی۔

والٹر کو اور مجھے صبح تاخیر سے کمرہ ملاقات میں بلایا گیا اور ہم کمرے کے انتہائی سرے پر نشستوں پر بیٹھ گئے۔ میں فکرمندی سے منتظر تھا جب دھندلے شیشے کے پار اچانک ونی کا چہرہ نمودار ہوا۔ ونی جیل کی ملاقاتوں کے لیے اکثر بن سنور کر آتی تھی اور کوشش کرتی تھی کہ نیا اور پروقار لباس پہن کر آئے۔ مجھے اس سے بڑی مایوسی ہوتی کہ میں اپنی بیوی کو چھو نہیں سکتا' اس سے محبت آمیز باتیں نہیں کر سکتا اور اس کے ساتھ خلوت کا لمحہ میسر نہیں آسکتا۔ ہمیں فاصلے پر رہ کر میاں بیوی کا تعلق نبھانا پڑتا تھا' ان لوگوں کی نظروں کے سامنے جن سے ہمیں نفرت تھی۔

میں فوراً دیکھ سکتا تھا کہ ونی بڑے تناؤ میں ہے۔ مجھے ایسے حالات میں دیکھنا اس کے لیے ضرور حوصلہ شکن ہوگا۔ جزیرے تک پہنچنا اپنی جگہ مشکل تھا اور جیل کے سخت ضابطے' محافظوں کا غیر ہمدردانہ برتاؤ اور براہ راست رابطے میں حائل رکاوٹیں اس پر مستزاد تھیں۔

مجھے بعد میں علم ہوا کہ ونی کو حال ہی میں دوسرا حکم پابندی موصول ہوا تھا اور اس کے نتیجے میں اسے چائلڈ ویلفیئر آفس کی ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ اس کی برطرفی سے عین پہلے پولیس نے اس کے دفتر کی تلاشی لی تھی۔ حکام کو یقین تھا کہ وہ مجھ سے خفیہ روابط رکھتی ہے۔ ونی سوشل ورکر کی حیثیت سے اپنے کام سے محبت کرتی تھی۔ یہ اس کی سرگرم اور نوح بہ نوح جدوجہد کا اختتام تھا...... لاوارث بچوں کو خواہش مند والدین کے سپرد کرنا' بے روزگاروں کے لیے کام تلاش کرنا اور ضرورت مندوں کو طبی امداد فراہم کرنا۔ اپنی بیوی کی پابندی اور خوف وہراس سے مجھے بڑی تکلیف پہنچی۔ میں اس کی اور بچوں کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا تھا اور حکومت

اس کے لیے مشکل بنا رہی تھی کہ وہ خود یہ کام کر سکے۔ میری بے بسی مجھے کاٹ کھاتی تھی۔

شروع میں ہماری گفتگو بے ڈھب رہی اور اس کے پیچھے کھڑے دو وارڈروں اور میرے پیچھے ایستادہ تین محافظوں کی موجودگی نے اسے مشکل بنائے رکھا۔ ان کا کردار ہماری گفتگو سننا ہی نہیں بلکہ ہمیں ہراساں کرنا بھی تھا۔ جیل کے ضابطے یہ کہتے تھے کہ گفتگو صرف انگریزی میں ہو یا افریکان میں...... افریقی زبان میں بات چیت ممنوع تھی...... اور صرف خانگی معاملات پر بات کرنے کی اجازت تھی۔ اگر گفتگو خانگی معاملات سے ہٹ جاتی اور سیاسی پہلو اختیار کر لیتی تو ملاقات فوراً ختم کر دی جاتی۔ اگر کوئی ایسا نام منہ سے نکل جاتا جو وارڈروں کے لیے شناسا نہ ہوتا تو وہ گفتگو روک دیتے اور پوچھتے کہ وہ شخص کون ہے اور اس سے تمہارا رشتہ کیا ہے۔ ایسا اکثر ہوتا کیونکہ وارڈر عموماً افریقی ناموں کی رنگا رنگی اور نوعیت سے ناآشنا ہوتے تھے۔ وارڈر کے سامنے اپنی ملاقات کے قیمتی منٹ اپنے خاندانی شجرے کی مختلف شاخوں کی وضاحت کرنے میں صرف کرنا بڑا پریشان کن تھا۔ لیکن ان لوگوں کی جہالت سے ہم فائدہ بھی اٹھاتے تھے۔ اس سے ہمیں ان لوگوں کے مخفی نام ایجاد کرنے کا موقع مل جاتا تھا جن کے متعلق ہم گفتگو کرنا چاہتے تھے اور ایسا کرتے ہوئے ہم یہ ظاہر کرتے تھے کہ ہم ارکان خانہ کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔

یہ پہلی ملاقات اہم تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ ونی میری صحت کے بارے میں فکر مند ہے۔ اس نے افواہیں سنی تھیں کہ ہمیں جسمانی اذیت دی جا رہی تھی۔ میں نے اس سے برملا کہا کہ میں بخیریت ہوں اور وہ دیکھ سکتی ہے کہ میں ٹھیک ٹھاک ہوں اگرچہ میں پہلے سے قدرے دبلا تھا۔ وہ بھی نسبتاً دبلی تھی اور یہ پہلو ایسا تھا جسے میں ہمیشہ ذہنی دباؤ سے منسوب کرتا تھا۔ اس ایک ملاقات کے بعد جس میں، میں نے ونی کے چہرے پر کشیدگی یا تناؤ کا مشاہدہ کیا، میں اس پر زور دیتا کہ وہ اپنا وزن قدرے

بڑھنے دے۔ وہ مسلسل کم خوری پر عمل پیرا تھی اور میں ہمیشہ اس سے کہتا تھا کہ ایسا نہ کرے۔ میں نے ایک ایک کر کے تمام بچوں کا حال پوچھا اور اپنی والدہ' بہنوں اور اس کے خاندان والوں کی خیریت دریافت کی۔

اچانک اپنے پیچھے میں نے وارڈر کو یہ کہتے سنا: ''وقت ختم ہو گیا! وقت ختم ہو گیا۔'' میں نے مڑ کر اسے بے یقینی سے دیکھا۔ یہ ناممکن لگتا تھا کہ نصف گھنٹہ گزر گیا ہے۔ لیکن دراصل اس کی بات ٹھیک تھی۔ ملاقاتیں ہمیشہ آنکھ جھپکنے میں گزرتی محسوس ہوتی تھیں۔ ان تمام برسوں میں جب میں جیل میں تھا' میں وارڈر کی اس پکار پر ہمیشہ حیران ہوتا تھا کہ وقت ختم ہو گیا۔ اس روز ونی اور میں دونوں تیزی سے اپنی کرسیوں سے اٹھے اور جلدی سے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ میں نے ونی کی روانگی کے بعد خود کو وہیں لٹکا محسوس کیا تاکہ اس کی موجودگی کا احساس برقرار رہے مگر میں نے اپنے ان جذبات سے وارڈروں کو آگاہ نہ ہونے دیا۔ جب میں اپنی کوٹھڑی کی طرف واپسی کے لیے قدم اٹھا رہا تھا' تو میرے دماغ میں وہ سارے مناظر گھوم رہے تھے جن کے متعلق ہم نے باتیں کی تھیں۔ اگلے دنوں' ہفتوں اور مہینوں کے دوران بار بار اس ملاقات کا منظر میری آنکھوں میں لہرا جاتا۔ میں سمجھتا تھا کہ اپنی بیوی کو دوبارہ کم از کم چھ ماہ تک نہیں دیکھ پاؤں گا۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ مزید دو سال تک مجھ سے ملنے کے لیے نہ آ سکی۔

چونے کی کان میں

اوائل جنوری کی ایک صبح ہم احاطے میں کام شروع ہونے سے پہلے گنتی کے لیے قطاریں بنا چکے تھے' مگر کام لینے کے بجائے حکام نے ہمیں بار مارچ کرنے اور پھر ایک بند ٹرک میں سوار ہونے کا حکم دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم اپنے احاطے سے باہر نکلے تھے۔ ہماری منزل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا لیکن مجھے ایک اندازہ تھا کہ ہم کہاں لے جائے جا رہے ہیں۔ چند منٹ بعد ہم ٹرک سے ایسی جگہ اترے

جسے میں نے پہلے اس وقت دیکھا تھا جب میں 1962ء میں اس جزیرے میں تھا ...... یہ تھی چونے کی پتھر کی کان۔

کان ایک بہت بڑے سفید دہانے کی شکل میں نظر آتی تھی جو ایک چٹانی پہاڑی میں کاٹا گیا تھا۔ پہاڑی کی چوٹیاں اور اس کا پیندا خیرہ کن حد تک سفید تھے۔ کان کی چوٹی پر گھاس اور پام کے درخت تھے۔ اور پیندے پر صاف جگہ تھی جس میں کچھ پرانے دھاتی شیڈ تھے۔

کمانڈنگ آفیسر کرنل ویسلز نے ہمارا استقبال کیا۔ وہ قدرے بے رنگ شخص تھا جسے بس جیل کے ضوابط کی سخت پابندی کی فکر تھی۔ ہم قطاروں میں کھڑے تھے جب اس نے ہمیں بتایا کہ ہم جو کام کرنے والے ہیں وہ چھ ماہ جاری رہے گا اور اس کے بعد ہماری میقاتوں کے دوران ہمیں ہلکے کام دیئے جائیں گے۔ اس کی بیان کردہ مدت غیر معمولی طور پر پھیلتی چلی گئی اور ہم اگلے تیرہ برسوں تک چونے کے پتھر کی اس کان میں کام کرتے رہے۔

سی او کی تقریر کے بعد ہمیں گینتیاں اور بیلچے تھما دیئے گئے اور چونے کی پتھر کی کانکنی کے بارے میں بنیادی ہدایات دی گئیں۔ چونے کے پتھر کی کھدائی کوئی آسان کام نہیں۔ اس پہلے روز اپنے نئے اوزاروں کے ساتھ ہماری ہیئت عجیب تھی اور ہم نے کم ہی پتھر کھودا۔ چونا جو سمندری گھونگوں اور مونگے کا زم تکلیس شدہ رسوب ہوتا ہے' چٹانوں کی تہوں میں دبا ہوتا ہے اور کان کن کو اسے گینتی کی مدد سے توڑنا اور پھر بیلچے سے چونے کی تہہ کو نکالنا پڑتا ہے۔ یہ کام احاطے کے کام کی نسبت کہیں زیادہ مشقت طلب تھا اور کان میں پہلے چند روز گزارنے کے بعد تو ہماری یہ حالت ہوگئی کہ ساڑھے چار بجے سہ پہر کھانا ملتے ہی ہمیں نیند نے آلیا اور اگلی صبح ہم جاگے تو جسم دکھتا تھا اور ہم ہنوز تھکے ماندے تھے۔

حکام نے اس امر کی کبھی وضاحت نہ کی کہ ہمیں احاطے سے ہٹا کر کانکنی پر کیوں

لگایا گیا تھا۔ شاید انہیں جزیرے کی سڑکوں کے لیے مزید چونے کے پتھر کی ضرورت تھی۔ لیکن بعد میں جب ہم نے اس تبادلے پر بحث کی تو نتیجہ اخذ کیا کہ یہ ہم پر نظم وضابط لاگو کرنے اور ہم پر یہ ظاہر کرنے کا ایک اور طریقہ تھا کہ ہم عام قیدیوں سے کسی طور مختلف نہیں جو جزیرے کی پتھر کی کان میں کام کرتے تھے اور یہ کہ ہمیں اپنے جرائم کی سزا اسی طرح بھگتنی ہوگی جس طرح وہ بھگت رہے تھے۔ یہ ہمارے جذبوں کو کچلنے کی ایک کوشش تھی۔

لیکن چونے کی کان میں چند ابتدائی ہفتے گزارنے کا ہم پر الٹ اثر ہوا۔ چھالے پڑے اور خون رستے ہاتھوں کے باوجود ہمارے جذبوں کی توانائی میں اضافہ ہو گیا۔ میں ویسے ہی باہر فطرت میں رہنے کو ترجیح دیتا تھا' تاکہ گھاس اور درخت دیکھ سکوں' سر پر اڑتے پرندوں کا مشاہدہ کرسکوں اور سمندر سے آنے والی ہوا کی ٹھنڈک محسوس کرسکوں۔ اپنے تمام عضلات استعمال کرنا اچھا لگتا تھا جبکہ سورج ہماری پشت پر ہوتا اور چونے اور پتھر کے ڈھیر لگاتے چلے جانے میں الگ تسکین تھی۔

چند روز بعد ہم ٹرک میں سوار ہو کر جانے کے بجائے کان کی طرف پیدل چلنے لگے اور یہ فعل ہمارے لیے اکسیر ثابت ہوا۔ اپنے بیس منٹ کے مارچ کے دوران ہمیں جزیرے کا بہتر مشاہدہ کرنے کا موقع ملتا اور ہم گھنی جھاڑیاں اور اونچے درخت دیکھتے جو ہمارے گھروں کا احاطہ کیے ہوتے تھے۔ ہم یوکلپٹس کے کھلتے پھولوں کی خوشبو سونگھتے اور کبھی کبھار فاصلے پر ''سپرنگ بوک'' یا ''کودو'' (افریقی ہرن) چرتے دکھائی دیتے۔ اگرچہ بعض ساتھی اس سفر کو بوجھل خیال کرتے مگر میں نے کبھی ایسا محسوس نہ کیا۔

سوبکوی کے لیے خصوصی قانون

اگرچہ کان میں ہم سے کام کروانے کا مقصد ہم پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہم دوسرے

قیدیوں سے کسی طرح مختلف نہیں، پھر بھی حکام ہم سے کوڑھیوں کا سا سلوک کرتے تھے جو کبھی اس جزیرے پر آباد تھے۔ بعض اوقات ہمیں عام قیدیوں کا گروہ سڑک کے کنارے کام کرتا دکھائی دیتا۔ ان کے وارڈر انہیں جھاڑیوں میں چلے جانے کا حکم دیتے تاکہ جب ہم مارچ کرتے ہوئے گزریں تو وہ ہمیں دیکھ نہ سکیں۔ گویا یہ اس لیے تھا کہ ہمیں دیکھتے ہی کسی طرح ان کا نظم وضبط خطرے میں پڑ جائے گا۔ بعض اوقات آنکھ کے گوشے سے ہمیں کوئی قیدی اے این سی سیلوٹ کے انداز میں مکا لہراتے دکھائی دیتا۔

کان کے قریب کچی سڑک مڑ جاتی تھی اور دائیں طرف عام قیدی پتھر کی کان کی طرف مارچ کرتے نظر آتے۔ سڑک پر ٹا کرا بعد میں ان سے رابطے کا اہم مقام بن گیا۔ جہاں سڑک کی ایک شاخ نکلتی تھی وہاں جھاڑیوں میں ایک چھوٹی سفید کٹیا نظر آتی تھی جس میں رابرٹ سوبکوی رہتے تھے۔ یہ ''مکان'' برسوں پہلے ایک سیاہ فام وارڈر کے لیے بنایا گیا تھا اور اب سوبکوی اس میں تنہا مقیم تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا پلاٹ تھا جس کی دیکھ بھال نہیں ہوتی تھی اور اس میں جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا اور دیکھنے والا نہیں جان سکتا تھا کہ اس میں کوئی رہتا ہے سوائے اس گارڈ کے جو کٹیا کے سامنے کھڑا رہتا۔

سوبکوی کی سزا 1963ء میں ختم ہو گئی تھی لیکن جنرل لاء امنڈمنٹ ایکٹ 1963ء کی سوبکوی کلاز کے تحت وزیر انصاف سیاسی قیدیوں کو الزام کے بغیر غیر معینہ مدت کے لیے نظر بند کر سکتا تھا اور سوبکوی کے ساتھ یہی کیا گیا۔ چھ سال تک انہوں نے اس جزیرے پر ایک طرح کی نصف زندگی گزاری۔ وہ ''آزاد آدمی'' تھے جنہیں آزادی سے محروم کر دیا گیا تھا۔ کبھی کبھار ہمیں کٹیاں کے باغیچے میں ان کی جھلک نظر آتی مگر اس سے زیادہ نہیں۔

پیلے بھوتوں کا گروہ

صبح کان پر پہنچ کر ہم اس کی چوٹی پر بنے جستی شیڈ سے اپنی گینتیاں ' بیلچے' ہتھوڑیاں اور ہتھ گاڑیاں لے آتے۔ پھر ہم کان کے سامنے جمع ہوتے' عموماً تین یا چار کی ٹولیوں میں۔ خود کار اسلحہ لیے وارڈر ایک اونچے چبوترے پر کھڑے ہماری نگرانی کرتے۔ غیر مسلح وارڈر ہمارے درمیان چلتے ہوئے ہمیں کام کرنے کا شوق دلاتے۔ ''گان آن! گان آن!'' (جاری رکھو! جاری رکھو!) وہ اس طرح پکارتے جیسے ہم کوئی بیل ہوں۔

گیارہ بجے تک جب سورج آسمان پر بلند ہوتا' ہم تھکاوٹ سے چور ہو جاتے۔ اس وقت تک میں پہلے ہی پسینے میں ڈوبا ہوتا اور وارڈر مزید سختی سے ہمیں ہانکنے لگتے۔ ''نی مین! کوم آن! کوم آن!'' (نہیں' جوانو! چلے آؤ!) وہ پکارتے۔ دوپہر سے عین پہلے جب ہم لنچ کے لیے وقفہ کرتے ہم ہتھ گاڑیوں میں چونے کے ڈھیر لگا کر انہیں دھکیلتے ہوئے ٹرک کے پاس لے جاتے جو چونا لاد کر روانہ ہو جاتا۔

دوپہر کی سیٹی بجتی تو ہم پہاڑی کے دامن کا رخ کرتے۔ ہم ایک سادہ جستی شیڈ کے نیچے اپنی تہہ ہونے والی نشستوں پر بیٹھ جاتے۔ شیڈ ہمیں دھوپ سے بچاتا۔ وارڈر ایک بڑے شیڈ میں میزوں اور بنچوں پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ مکئی کے ابلے ہوئے دلیے کے ڈرم ہمارے پاس پہنچ جاتے۔ جب ہم دلیہ کھا رہے ہوتے تو سینکڑوں سمندر مرغابیاں چیختی اور جھومتی ہوئی ہمارے اوپر چکر لگاتی رہتیں اور کبھی کبھی ان کا ایک چھچھوا قیدی کا لنچ خراب کر ڈالتا۔

ہم چار بجے تک کام کرتے۔ اس وقت پھر ہم چونا ہتھ گاڑیوں پر ٹرک تک لے جاتے۔ دن کے اختتام تک ہمارے چہرے اور جسم سفید گرد سے اٹ جاتے۔ ہم پیلے بھوت دکھائی دیتے سوائے ان مقامات کے جہاں پسینے کی دھاروں سے چونا بہہ گیا ہوتا۔ جب ہم اپنی کوٹھڑیوں کی طرف لوٹتے تو ٹھنڈے پانی سے اپنے آپ کو رگڑتے مگر اس سے جمی ہوئی گرد پوری طرح کبھی نہ اترتی۔

بھینگے پن کے تین سال

کان میں گرمی سے بدتر روشنی تھی۔ ہماری قمیضیں ہماری پشتوں کو تو دھوپ سے بچا لیتی تھیں مگر سورج کی شعاعیں خود چونے سے منعکس ہو کر ہماری آنکھوں میں پڑتی تھیں۔ ان کی چمک سے ہماری آنکھیں دکھتیں اور اس کے ساتھ گرد ملنے سے دیکھنا مشکل ہو جاتا۔ آنکھیں بہہ رہی ہوتیں اور ہمارے چہرے ایک مستقل بھینگے پن کا تاثر دیتے۔ ہر روز کام ختم ہونے کے بعد ہماری آنکھوں کے لیے کم روشنی کا عادی ہونے میں خاصا وقت لگتا۔

کان میں اپنے پہلے چند روز کے بعد ہم نے حکام سے درخواست کی کہ ہمیں دھوپ چشمے فراہم کیے جائیں۔ حکام نے انکار کر دیا۔ یہ رویہ غیر متوقع نہیں تھا کیونکہ اس وقت وہ ہمیں پڑھنے کی چشمے کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس سے پہلے میں نے کمانڈنگ آفیسر پر واضح کر دیا تھا کہ یہ بات عقل وفہم سے بالاتر ہے کہ ہمیں کتابیں پڑھنے کی اجازت تو ہو مگر پڑھنے کے لیے عینکیں استعمال کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

اگلے ہفتوں اور مہینوں کے دوران ہم نے بار بار دھوپ چشموں کی درخواست کی۔ لیکن تقریباً تین سال گزر گئے' تب کہیں ایسے چشمے رکھنے کی اجازت دی گئی اور وہ بھی ایک ہمدرد معالج کی اس رپورٹ کے بعد کہ دھوپ چشمے ہماری نگاہ کی حفاظت کے لیے ضروری ہیں۔ پھر بھی چشمے ہمیں اپنی جیب سے خریدنے پڑے۔

ہمارے نزدیک دھوپ چشمے' پاجامے' مطالعے کی سہولت اور مساوی خوراک کے لیے جدوجہد اس وسیع تر جدوجہد کا حصہ تھی جو ہم نے جیل سے باہر کی تھی۔ جیل میں حالات بہتر بنانے کی مہم نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد ہی کا جز تھی۔ الغرض ہم نے جہاں کہیں ناانصافی پائی' اس کے خلاف جنگ کی' خواہ وہ ناانصافی کتنی ہی چھوٹی یا بڑی تھی۔ ہم اپنی انسانیت کی حفاظت کے لیے ناانصافی کے خلاف لڑتے تھے۔

بدمعاشوں کے دو جتھے

کان میں کام شروع کرنے کے کچھ عرصہ بعد سیکشن بی میں بہت سے دوسرے نمایاں سیاسی قیدی ہم سے آملے۔ کئی ''ایم کے'' کے رکن تھے جنہیں جولائی 1964ء میں گرفتار کرکے سبوتاژ کی پچاس سے زائد کارروائیوں کا ملزم ٹھہرایا گیا تھا اور یہ مقدمہ ''لٹل رائیوونیا ٹرائل'' کے نام سے مشہور رہا۔ان میں میک مہاراج تھا' جنوبی افریقہ کانگریس پارٹی کا رکن اور تحریک آزادی کا ایک تر دماغ۔للو چے با تھا' یہ بھی ایم کے ہائی کمان کا رکن تھا اور ایک ثابت قدم ساتھی جو جیل میں ایک عظیم سرمایہ ثابت ہوا۔ اور ولٹن ملکموائی تھا' مقدمہ بغاوت کا ملزم جسے افراتفری کی حالت میں غلطی سے اس وقت رہا کردیا گیا تھا جب 1960ء میں ہنگامی حالت کا اعلان ہوا تھا۔وہ خفیہ طور پر جنوبی افریقہ سے باہر نکل گیا تھا' اس نے فوجی تربیت حاصل کی تھی اور مقدمہ رائیوونیا کے بعد ''ایم کے'' کا کمانڈر انچیف بن گیا تھا۔لبرل پارٹی کا ایک رنگ دار ایڈی ڈینیلز بھی ہم سے آملا تھا جسے افریقن مزاحمتی تحریک (اے آر ایم) کے سبوتاژ آپریشنز کا ملزم ٹھہرایا گیا تھا۔اے آر ایم لبرل پارٹی کے ارکان پر مشتمل ایک چھوٹا سبوتاژ گروپ تھا۔

ان نئے سیاسی ساتھیوں کی آمد کے اثرات کم کرنے کے لیے حکام نے ہماری سیکشن میں چند عام قانون کے قیدی بھی ٹھونس دیئے۔ یہ لوگ عادی مجرم تھے اور ان کے جرائم میں قتل' آبرو ریزی اور مسلح ڈکیتی جیسی کارروائیاں شامل تھیں۔ وہ جزیرے کے بدنام مجرموں کے دو جتھوں کے رکن تھے جو بگ فائیوز (Big Fives) اور ٹوینٹی ایٹس (Twenty Eights) کہلاتے تھے۔ یہ جتھے دوسرے قیدیوں کو ہراساں کیے رکھتے تھے۔ یہ لوگ مسٹنڈے' ترش رو اور بے مروت تھے اور ان کے چہروں پر چاقوؤں کی جنگ کے نشانات تھے جو جتھوں کے ارکان میں اکثر چھڑتی رہتی تھیں۔ان کا کردار مشتعل ایجنٹوں کا تھا اور وہ ہمیں ادھر ادھر

دھکیلنے کی کوشش کرتے' ہماری خوراک چھین لیتے اور ہم کوئی سیاسی گفتگو کرنے کی کوشش کرتے تو وہ ہمیں اس سے روک دیتے۔ ان میں سے ایک شخص امریکی فلم ایکٹر کے نام پر بوگارٹ کہلاتا تھا۔ اس کی کوٹھڑی والٹر کی کوٹھڑی کے بالمقابل تھی اور والٹر شکایت کرتا تھا کہ وہ ہر صبح مجھ سے کھانا مانگتا ہے اور میں اتنا خوفزدہ ہوتا ہوں کہ انکار نہیں کر سکتا۔

کان کے اندر جتھے کے ارکان اپنے گروپ میں ہم سے الگ تھلگ کام کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے گانا شروع کر دیا جو کام کے اوقات کا گانا لگتا تھا۔ دراصل یہ ایک مشہور کام کا گیت تھا جس کا اپنا ہی تغزل تھا۔ ''بنی فونانی ای رائیو نیا؟'' (تم رائیو نیا میں کیا چاہتے تھے؟) دوسرا مصرع تھا: ''کیا تم سمجھتے تھے کہ تم حکومت بن جاؤ گے؟'' وہ تمسخرانہ انداز میں بار بار گاتے رہے۔ ظاہر ہے انہیں وارڈروں نے اکسایا تھا جنہیں امید تھی کہ اس گیٹ سے ہم مشتعل ہوں گے۔

اگرچہ ہم میں زیادہ سر پھرے انہیں منہ تھوڑ جواب دینا چاہتے تھے' مگر ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنا ردعمل اسی انداز سے ظاہر کریں۔ ہمارے اندر ان کی نسبت زیادہ اور بہتر موسیقار تھے۔ ہم جڑ کر بیٹھ گئے اور منصوبہ بندی سے اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ چند منٹ کے اندر ہم سب ''سٹملو'' نامی گیت گا رہے تھے۔ یہ ایک پرجوش ترانہ تھا جو جنوبی رہوڈیشیا (موجودہ زمبابوے) میں بل کھاتی' دوڑتی ریل گاڑی سے متعلق تھا۔ سٹملا کوئی سیاسی گیت نہیں لیکن سیاق وسباق میں وہ سیاسی بن گیا کیونکہ منظر یہ تھا کہ ریل گاڑی میں گوریلے سوار ہیں جو جنوبی افریقی فوج سے لڑنے آ رہے ہیں۔

ہفتوں کام کے دوران ہمارے یہ دونوں گروہ کام کرتے اور گاتے رہے۔ ہماری اس موسیقی میں گیتوں کا اضافہ ہوتا رہا اور مصرعے بدلتے رہے۔ ہمارے ذخیرہ خانے میں اضافہ ہوتا رہا اور جلد ہی ہم علانیہ سیاسی گیت گانے لگے' جیسے ''اماجونی'' جو گوریلا سپاہیوں کے متعلق ایک گیت ہے اور جس کا عنوان سپاہی کے

لئے استعمال ہونے والے عامیانہ انگریزی لفظ جونی کی بگڑی ہوئی شکل تھا.....اور ''شوشولوزا''......ایک ایسا گیت جو آزادی کی جدوجہد کو آگے بڑھتی ریل گاڑی سے تشبیہ دیتا ہے۔(اگر آپ اس کے عنوان کو بار بار دہرائیں تو گاڑی کے چھک چھک کرنے کا تاثر پیدا ہوتا ہے) ہم منشور آزادی کے بارے میں بھی ایک گیت گاتے اور ایک اور گیت ٹرانسکائی کے بارے میں تھا جس کے مصرعے اس مفہوم کے تھے:

دو سڑکیں ہیں

ایک سڑک ماتن زیما روڈ ہے

اور ایک سڑک منڈیلا روڈ ہے

تم کون سی سڑک پر جاؤ گے؟

ان گیتوں نے ہمارا کام خفیف تر کر دیا۔چند ساتھیوں کی آوازیں غیر معمولی تھیں اور میں اکثر گینتی ایک طرف رکھ کر سننے پر اکتفا کرتا۔بدمعاشوں کے جتھے کا ہم سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔جلد ہی ان کی بولتی بند ہوگئی جبکہ ہمارے گیت جاری رہے۔لیکن ایک وارڈرژ ہوسا زبان پر عبور رکھتا تھا اور ہمارے گیتوں کا مفہوم سمجھتا تھا' چنانچہ جلد ہی ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم گیتوں کا سلسلہ بند کر دیں۔یہی نہیں' سیٹی بجانے پر بھی پابندی لگا دی گئی۔اس دن کے بعد سے ہم خاموشی سے کام کرنے لگے۔

جیل کمانڈر کے ہاتھوں ایک شکست

میں جتھے کے ارکان کو اپنے حریف نہیں بلکہ خام مواد سمجھتا تھا جنہیں تحریک آزادی کے حق میں ہموار کیا جا سکتا تھا۔ہمارے درمیان ایک غیر سیاسی قیدی تھا جس کا عرفی نام ''جو مائی بے بی'' (Joe My Baby) تھا۔وہ بعد میں اے این سی میں شامل ہوگیا اور ہمارے لیے مواد جیل میں منگوانے اور باہر بھجوانے میں بڑا کارآمد ثابت ہوا۔

ایک روز ہم نے سنا کہ ایک وارڈر نے کان میں بوگارٹ کو بری طرح مارا ہے۔ میں نے اس کی پٹائی ہوتے نہیں دیکھی تھی' تاہم اس کے زخم دیکھے تھے۔اس کا چہرہ زخمی اور بری طرح مجروح تھا۔بوگارٹ ہماری راہداری میں مجھ سے ملا اور مدد مانگی۔ میں اس کا معاملہ اٹھانے پر فوراً رضامند ہوگیا۔

ہم ہمیشہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے تھے جو ہمیں حکام کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا عذر مہیا کرتے اور بوگارٹ کی پٹائی ایک ایسا واقعہ تھا جسے ہم ہیڈ آفس کے سامنے پیش کرسکتے تھے۔اس سے کچھ پہلے ہمیں علم ہوا تھا کہ ایک وارڈر نے پی اے سی کے گانیا نامی آدمی کو مارا تھا۔ایک وکیل کی حیثیت سے میں نے کمشنر آف پرزنز کو خط لکھ کر گانیا کی طرف سے احتجاج کیا۔مجھے ہیڈ آفس میں پیش کیا گیا جہاں جیل حکام نے مجھے ڈرایا دھمکایا۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے کوئی ایسا واقعہ پیش آنے کی تردید کی اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ تمہیں اس کا علم کیسے ہوا۔میں نے اصرار کیا کہ وہ وارڈر جس نے گانیا کو پیٹا تھا' جزیرے سے باہر بھیج دیا جائے۔انہوں نے انکار کردیا اور کہا کہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد اس محافظ کا جزیرے سے تبادلہ کردیا گیا۔

اس واقعہ سے میں جری ہوگیا تھا' چنانچہ جب بوگارٹ نے مدد مانگی تو میں نے فوراً سی او صاحب سے ملاقات کا مطالبہ داغ دیا۔اگلے دن مجھے ہیڈ آفس طلب کیا گیا جہاں کمانڈر نے درشتی سے مجھے اطلاع دی کہ اس معاملے کی تفتیش کے بعد اسے بے بنیاد پایا گیا ہے۔ میں نے کہا: ''یہ ضابطوں کی خلاف ورزی ہے' اس پر عدالت میں مقدمہ چلنا چاہیے تھے۔''

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔''ہم نے نام نہاد مدعی کا بیان لینے کی کوشش کی تھی مگر اس نے اس امر سے انکار کیا کہ کبھی اس پر حملہ ہوا تھا۔''

''یہ ناممکن ہے۔'' میں نے کہا۔''ابھی کل ہی تو میں نے اس سے بات کی تھی۔

''

کمانڈر نے ایک لیفٹیننٹ کو اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''پھر تم خود دیکھ لو۔'' لیفٹیننٹ بوگارٹ کو کمرے میں لے آیا۔ اس کا چہرہ پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کمانڈر نے اس سے پوچھا کہ کیا اس کی پٹائی ہوئی تھی یا نہیں؟ ''نہیں باس! مجھ پر کبھی حملہ نہیں ہوا۔'' بوگارٹ نے مجھ سے آنکھیں چراتے ہوئے خاموشی سے کہا۔

کمانڈر بولا: ''اچھا تو منڈیلا! یہ کیس بند کر دیا گیا ہے۔'' یوں وہ میری توہین کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس نے بظاہر بوگارٹ کو رشوت میں زائد خوراک اور تمباکو پیش کر کے اپنے الزامات واپس لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے بعد جب کبھی کسی قیدی نے کوئی شکایت کی تو اس کا معاملہ اٹھانے کی ہامی بھرنے سے پہلے اس سے مطالبہ کرتا تھا کہ وہ اپنا تحریری اور دستخط شدہ بیان مجھے دے۔

ریڈ کراس کے نمائندے سے ملاقات

1965ء کی گرمیوں کے ایک دن ہمیں اپنے ناشتے میں دلیے پر کچھ چکنائی چمکتی نظر آئی اور رات کے کھانے میں کھچڑی کے ساتھ تازہ گوشت کے ٹکڑے دکھائی دیئے۔ اگلے دن بعض افراد کو نئی قمیصیں مل گئیں۔ کان کے گارڈ اور ہمارے سیکشن کے وارڈر قدرے مزید احترام سے پیش آتے محسوس ہوئے۔ اس پر ہم سب کے کان کھڑے ہوئے کیونکہ جیل میں کوئی بہتری کسی وجہ کے بغیر نہیں ہوتی۔ اگلے روز ہمیں اطلاع دی گئی کہ کل انٹرنیشنل ریڈ کراس کا نمائندہ آ رہا ہے۔

یہ ایک فیصلہ کن مرحلہ تھا' ہمارے پہلے ملاقاتیوں کی نسبت کہیں زیادہ اہم۔ انٹرنیشنل ریڈ کراس ایک ذمے دار اور آزاد بین الاقوامی ادارہ تھا جس پر مغربی طاقتیں اور اقوام متحدہ توجہ دیتے تھے۔ جیل حکام انٹرنیشنل ریڈ کراس کا احترام کرتے تھے اور احترام کرنے سے میرا مطلب ڈرنا ہے کیونکہ حکام صرف اس کا احترام کرتے تھے جس سے ڈرتے تھے۔ جیل حکام کو ان سب تنظیموں پر اعتبار نہیں تھا جو

عالمی رائے عامہ پر اثر انداز ہو سکتی تھیں اور وہ انہیں حق بجانب تفتیش کنندگان خیال نہیں کرتے تھے کہ ان سے دیانتداری سے پیش آتے بلکہ وہ انہیں بے جا مداخلت کار گردانتے تھے جنہیں ممکنہ طور پر چکمہ دینا ضروری تھا۔ بین الاقوامی مذمت سے بچنا حکام کا سب سے بڑا مقصد تھا۔

ان ابتدائی برسوں میں انٹرنیشنل ریڈ کراس واحد ادارہ تھا جو ہماری شکایات کو سنتا بھی تھا اور ان پر ردعمل بھی ظاہر کرتا تھا۔ یہ ضرورت تھا کیونکہ حکام ہمیں نظر انداز کرتے تھے۔ قواعد وضوابط کا تقاضا تھا کہ حکام ہماری شکایت کے ازالے کے لیے کسی سرکاری طریقہ کار کا اہتمام کریں۔ انہوں نے ایسا مگر صرف آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے۔ ہر ہفتے کی صبح چیف وارڈر ہمارے سیکشن میں آتا اور پکارتا: ''شکایت اور درخواستیں! شکایات اور درخواستیں!'' ہم میں سے جنہیں شکایات ہوتیں یا درخواستیں دینا ہوتیں' اور یہ تقریباً ہر ایک کا مسئلہ تھا' وہ چیف وارڈر سے ملنے کے لیے قطار بنا لیتے۔ باری باری ہم غذا' ملبوسات اور ملاقاتوں کے متعلق رسمی شکایات کرتے۔ چیف وارڈر سر ہلا کر ہر ایک سے کہتا: ''جا' جا'' اور پھر پکارتا: ''اگلا!'' ہم جو کچھ کہتے اسے وہ تحریر کرنے کی بھی زحمت نہ کرتا۔ اگر ہم اپنی تنظیم کی طرف سے بات کرنے کی کوشش کرتے تو وارڈر پھنکارتا: ''یہاں اے این سی یا پی اے سی کا ذکر نہ کریں..... سمجھے؟''

ریڈ کراس کے نمائندے کی آمد سے کچھ پہلے ہم نے کمشنر جیل خانہ جات کو ایک رسمی فہرست شکایت پیش کی تھی۔ اس وقت ہمیں کاغذ پنسل صرف خط لکھنے کیلئے دیئے جاتے تھے۔ ہم نے کان اور بیت الخلا میں ایک دوسرے سے مشورہ کر کے ایک فہرست مرتب کی تھی' وہ چیف وارڈر کو پیش کر دی جو اسے لینا نہیں چاہتا تھا' چنانچہ اس نے الزام لگایا کہ ہم ایسی فہرست مرتب کر کے قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اب انٹرنیشنل ریڈ کراس کے سامنے ہماری ایک شکایت تھی کہ حکام نے ہماری

شکایات سننے سے انکار کر دیا تھا۔

ریڈ کراس کے نمائندے کی آمد کے دن مجھے بلایا گیا تا کہ میں اس سے ملوں۔ اس سال اور اگلے چند برسوں میں ان کا نمائندہ مسٹر سین تھا جو اپنے مادر وطن سویڈن میں ڈائریکٹر جیل خانہ جات رہ چکا تھا اور پھر ترک وطن کر کے رہوڈیشیا آ گیا تھ۔ سین ایک خاموش طبع اور قدرے اعصابی کمزوری کا شکار تھا اور پچاس پچپن کے پیٹے میں وہ اپنے ماحول سے لگا نہ کھاتا تھا۔

اس ملاقات کی نگرانی نہ کی گئی اور یہ پچھلی تقریباً تمام ملاقاتوں سے ایک بین فرق تھا۔ مسٹر سین نے ہم سے کہا کہ اپنی تمام شکایات اور مشکلات بیان کریں اور اس نے ہمیں بڑی توجہ سے سنا اور تفصیلی نوٹس لیے۔ وہ بہت ملنسار تھا اور اس نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے اسے تفصیلی باتیں بتائی ہیں۔ پھر بھی یہ پہلی ملاقات قدرے کشیدگی کے ماحول میں ہوئی۔ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ دوسرے سے کیا توقع کرے۔

میں نے کھل کر اپنے کپڑوں کے متعلق شکایت کی اور اسے بتایا کہ ہم نیکریں نہیں پہننا چاہتے اور ہمیں جرابوں اور انڈرویئر سمیت مناسب کپڑے درکار ہیں جو ہمیں نہیں دیئے جا رہے۔ میں نے غذا' ملاقاتوں' خطوط' مطالعے' ورزش' سخت مشقت اور وارڈروں کے رویئے کی بھی شکایات کیں۔ میں نے ایسی درخواستیں بھی داغ دیں جن کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ حکام کبھی قبول نہیں کریں گے' جیسے کہ ہماری یہ خواہش کہ ہمیں ہمارے گھروں کے قریب تر جیل میں منتقل کیا جائے۔

ہم سے ملاقات کے بعد سین کمشنر جیل خانہ جات اور اس کے عملے سے ملا جبکہ میں باہر انتظار کرتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے ہماری شکایات حکام کو پہنچا دی ہیں اور جن کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ معقول ہیں ان کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ سین سے ملاقات کے کچھ عرصہ بعد ہمارے کپڑے بہتر ہو گئے اور ہمیں لمبے

پاجامے دیئے گئے۔ لیکن سین کسی لحاظ سے ایک ترقی پسند شخص نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے رہوڈیشیا میں آ کر نسل پرستی سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ اپنی کوٹھڑی کی طرف واپس جانے سے پہلے میں نے اس کے سامنے اپنی یہ شکایت دہرائی تھی کہ افریقی قیدیوں کو ڈبل روٹی نہیں ملتی۔ مسٹر سین نے بظاہر برانگیختہ ہو کر جیل کے سربراہ کرنل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''ڈبل روٹی تمہارے دانتوں کے لیے بہت بری ہے' منڈیلا' تم جانتے ہو۔ مکئی کا دلیہ تمہارے لیے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ اس سے تمہارے دانت مضبوط ہوتے ہیں۔''

بعد کے سالوں میں انٹرنیشنل ریڈ کراس نے زیادہ آزاد خیال آدمی بھیجے جنہوں نے ہمارے حالات بہتر بنانے کے لیے تہہ دل سے کوششیں کیں۔ اس تنظیم نے اس شعبے میں بھی اہم کردار ادا کیا جو اس قدر سامنے نہیں تھا لیکن ہمارے لیے وہ کم اہم نہیں تھا۔ وہ سیاسی قیدیوں کی بیویوں اور رشتے داروں کو اکثر رقم فراہم کرتے تا کہ وہ جزیرے پر ملاقات کے لیے آ سکیں جو بصورت دیگر ملاقات کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔

مطالعے کی رعایت

ہمیں جزیرہ روبن پر بھیجے جانے سے پہلے ہمارے حامیوں کو تشویش تھی کہ ہمیں مطالعے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ہماری آمد کے چند ماہ بعد حکام نے اعلان کیا کہ جو مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ اجازت کی درخواست دے سکتے ہیں۔ اکثر آدمیوں نے ایسا کیا اور ان میں ڈی گروپ کے آدمی بھی شامل تھے۔ انہیں مطالعے کی اجازت مل گئی۔ حکومت مقدمہ رائیونیا کے بعد پر اعتماد ہو کر یہ سمجھتی تھی کہ ہمیں مطالعے کی رعایت دینا بے ضرر ہو گا۔ بعد میں انہیں اس پر افسوس ہوا۔ کورس گریجوایٹ مطالعے کی اجازت نہیں دی گئی تھی لیکن میرے معاملے میں انہوں نے استثنا سے کام لیا کیونکہ جب میں پریٹوریا میں تھا تو میں نے وہاں ایک مثال قائم کی

تھی۔

ہمارے سیکشن میں بہت کم افراد کے پاس بی اے کی ڈگری تھی مگر کئی ایک نے یونیورسٹی لیول کے کورس کیے ہوئے تھے۔ بعض کے پاس ہائی سکول سرٹیفکیٹ بھی نہیں تھا اور انہوں نے کورس کرنے کے لیے درخواستیں دی تھیں۔ بعض آدمی پہلے ہی اچھے تعلیم یافتہ تھے جیسے کہ گووان امبیکی اور نیول الیگزینڈر، لیکن دوسرے پانچویں یا چھٹی جماعت سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ چند ماہ کے اندر اندر تقریباً ہم سب کسی نہ کسی کورس یا ڈگری کے لیے مطالعہ کر رہے تھے۔ رات کو ہماری کوٹھڑیوں کا بلاک ایک جیل سے زیادہ ایک سٹڈی ہال لگتا تھا۔

لیکن مطالعے کی رعایت کیساتھ کئی شرائط وابستہ تھیں۔ بعض موضوعات، جیسا کہ سیاست یا فوجی تاریخ ممنوع تھے۔ برسوں تک ہمیں اپنے خاندانوں سے منگوانے کے سوا رقوم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی یہاں تک کہ غریب قیدیوں کو کتابوں یا ٹیوشن کے لیے شاذونادر ہی رقم ملتی تھی۔ اس طرح مطالعے کا موقع ملنا اس امر پر منحصر تھا کہ قیدی کے پاس کتنی رقم ہے۔ ہمیں کتابیں دوسرے قیدیوں کو دینے کی بھی اجازت نہیں تھی حالانکہ اس سے ہمارے غریب تر ساتھی مطالعہ کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔

اس امر پر ہمیشہ بحث چلتی رہی کہ ہمیں مطالعے کی رعایت قبول کرنی چاہیے یا نہیں۔ یونٹی موومنٹ کے بعض ارکان نے پہلے محسوس کیا کہ ہم حکومت کے ایک ایسے اعلامیہ کو قبول کر رہے ہیں جس میں ہم نے اپنی راست بازی پر سمجھوتہ کیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ مطالعہ ایک مشروط رعایت نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ ایسا حق ہے جس پر کوئی پابندی گوارا نہیں۔ مجھے اس سے اتفاق تھا لیکن میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ ہمیں اس بنا پر مطالعے سے انکار کر دینا چاہیے۔ مجاہدین آزادی اور سیاسی قیدیوں کی حیثیت سے ہم پر فرض تھا کہ ہم اپنے آپ کو بہتر اور مضبوط تر بنائیں اور ایسا کرنے

کے لیے مطالعہ چند مواقع میں سے ایک تھا۔

قیدیوں کو اکانومسٹ ملنے لگا

اولین خواہش مندوں کو یونیورسٹی آف ساؤتھ افریقہ (USISA) یا ریڈ ریزلٹس کالج میں داخلہ لینے کی اجازت دی گئی جوان طالب علموں کے لیے تھا جو ہائی سکول سرٹیفکیٹ کے لیے مطالعہ کرتے تھے۔ میرے معاملے میں یونیورسٹی آف لندن کی نگرانی میں مطالعہ ایک ملی جلی کرم فرمائی تھی۔ ایک طرف مجھے اس طرح کی شوق دلانے والی کتابیں لگی تھیں جو جنوبی افریقہ میں درسی فہرست میں شامل نہیں تھیں اور دوسری طرف حکام نے ان میں سے اکثر کو غیر موزوں قرار دے کر ان پر پابندی عائد کردی۔

کتابیں منگوانا اپنی جگہ اکثر ایک چیلنج تھا۔ آپ کسی ساؤتھ افریقن لائبریری سے کنٹریکٹ لا ء پر ایک کتاب بھیجنے کی درخوست کر سکتے تھے۔ وہ آپ کی درخواست پر عمل کرتے ہوئے مطلوبہ کتاب ڈاک سے بھیج دیتے۔ لیکن ڈاک کے نظام کی من موجیوں' جزیرے کے دور دراز ہونے اور سنسر کے دیدہ دانستہ ست عمل کے نتیجے میں کتاب اس تاریخ کے بعد آپ تک پہنچتی جس تاریخ تک اسے واپس کرنا ہوتا تھا۔ اگر تاریخ گزر جاتی تو جیل کے وارڈر اسے آپ کو دکھائے بغیر از خود واپس بھیج دیتے تھے۔ اس نظام کے اسیر ہوکر آپ کو ایک کتاب وصول کیے بغیر اس پر تاخیر کا جرمانہ ادا کرنا پڑ جاتا تھا۔ کتابوں کے علاوہ ہمیں اپنے مطالعے کے لیے ضرورت مطبوعات منگوانے کی بھی اجازت تھی۔ حکام اس سلسلے میں بہت سخت تھے اور مطبوعہ مواد جسے وہ پاس کرتے وہ اکاؤنٹنگ پڑھنے والے قیدی کے لیے صرف حسابی سائنس کا سہ ماہی جریدہ ہو سکتا تھا۔ لیکن ایک روز میک مہاراج نے اپنے اکنامکس پڑھنے والے ایک ساتھی کو بتایا کہ وہ اکانومسٹ کی درخوست کرے۔ ہم اس پر ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ ہم تو پھر رسالہ ٹائم منگوائیں گے کیونکہ اکانومسٹ بھی ایک ہفتہ وار

رسالہ ہے۔ لیکن میک نے مسکراتے ہوئے صرف یہ کہا کہ حکام کو اس کا پتہ نہیں چلے گا۔ کیونکہ وہ ایک کتاب کو اس کے عنوان ہی سے جانچتے تھے۔ ایک مہینے کے اندر ہمیں اکانومسٹ ملنے لگا اور ہم خبریں پڑھنے لگے جن کے ہم اس قدر بھوکے تھے۔ لیکن حکام کو جلد ہی اپنی غلطی کا پتہ چل گیا اور انہوں نے اس طرح رسالہ منگوانے کا سلسلہ روک دیا۔

یہ وہ چیز نہیں تھی جس کی ہم نے خواہش کی تھی۔ کان پر تھکا دینے والا دن گزارنے کے بعد قیدی کی یہ خواہش نہیں ہوتی تھی کہ وہ ایک سٹینڈ اپ ڈیسک پر کام کرے۔ ہم میں سے بہت سوں نے ان ڈیسکوں کی شکایت کی اور کیتھی کی ششکایت سب سے بلند آہنگ تھی۔ اس نے کمانڈنگ افسر سے کہا کہ سٹینڈ اپ ڈیسکوں پر کھڑے ہو کر مطالعہ کرنا کس طرح موزوں نہیں بلکہ وہ اتنے ڈھلوان ہیں کہ ان پر سے کتابیں گر جاتی ہیں۔ کمانڈنگ افسر نے کیتھی کی کوٹھڑی کا اچانک معاینہ کیا' ایک کتاب مانگی اور اس کے ڈیسک پر لڑھکا دی۔ پھر وہ شرمسار کیتھی کی طرف مڑ کر بولا: ''ان ڈیسکوں میں کوئی خرابی نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ لیکن تقریباً چھ ماہ بعد حکام جھک گئے اور ہمیں تین ٹانگوں والے چوبی سٹول دیئے گئے اور سٹینڈ اپ ڈیسک بھی نیچے کر دیئے گئے۔

اخبار ہیرے سے زیادہ قیمتی تھا

ایک شکایت جو میں نے انٹرنیشنل ریڈ کراس سے کی' وہ یکطرفہ طور پر ہمیں ملزم ٹھہرائے جانے کے بارے میں تھی۔ ''ملزم ٹھہرنے'' کا مطلب تھا کہ ایک وارڈر دعویٰ کرتا کہ ایک قیدی نے کسی خاص ضابطے کی خلاف ورزی کی ہے جس کی سزا قید تنہائی یا کھانوں اور سہولتوں کا روک لینا ہو سکتی تھی وارڈر عموماً ضابطے کی خلاف ورزی کو معمولی نہیں گردانتے تھے کیونکہ جب کسی قیدی کو ملزم ٹھہرایا جاتا تو اسے عدالتی سماعت کی اجازت تھی اور جرم کی سنگینی کے حساب سے کیپ ٹاؤن سے ایک

مجسٹریٹ جزیرے میں لایا جاتا۔ اس وقت حکام سماعت کی اجازت دینے سے انکار کررہے تھے۔ جب میں نے انٹرنیشنل ریڈکراس سے اس بارےمیں شکایت کی' اس وقت تک مجھے ذاتی طور پر اس مسئلے کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن جلد ہی صورتحال بدل گئی۔

ویک اینڈ پر جزیرے پر ہمارے پہلے سال کے دوران ہمیں نصف گھنٹے کی ورزش کے سوا سارا دن ہماری کوٹھڑیوں کے اندر رکھا جاتا تھا۔ ایک ہفتے کو صحن میں ورزش کرکے واپس آتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک وارڈر راہ داری کے سرے پر بینچ پر ایک اخبار چھوڑ گیا ہے۔ وہ ہم سے قدرے دوستانہ برتاؤ کرتا تھا' لہذا میں نے سمجھا کہ اس نے اخبار اتفاقاً نہیں بلکہ جان بوجھ کر چھوڑا ہے۔

اخبارات ایک سیاسی قیدی کے لیے سونے اور ہیروں سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں اور خوراک اور تمباکو سے زیادہ ان کی بھوک محسوس ہوتی ہے۔ لیکن جزیرہ روبن پر اخبارات ہم تک پہنچنے نہیں دی جاتی تھی اور ہم ان کی شدت سے خواہش کرتے تھے۔ والٹر خبروں کے بغیر مجھ سے بھی زیادہ محرومی کا شکار لگتا تھا۔ حکام ایک مکمل بلیک آوٹ نافذ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہم کوئی ایسی بات سیکھیں جس سے ہمارا مورال بلند ہو یا ہمیں یہ تسلی ہو کہ باہر کیلوگ اب بھی ہمارے بارے میں سوچتے ہیں۔

ہم اسے اپنا فرض خیال کرتے تھے کہ ملک کی سیاست کے بارے میں تازہ ترین حالات سے باخبر رہیں اور ہم نے اخبارات کے حصول کے لیے طویل اور سخت جدوجہد کی۔ اگلے برسوں میں ہم نے اخبارات حاصل کرنے کے لیے کئی طریقے اختیار کیے لیکن اس وقت ہم اس کام میں زیادہ ماہر نہیں تھے۔ کان پر جانے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ وارڈروں کے سینڈوچ اخبارات میں لپیٹے جاتے تھے اور وہ اکثر ان اخباری ٹکڑوں کو کوڑے میں پھینک دیتے جہاں سے انہیں خفیہ طور پر ہم اٹھا لیتے۔

ہم وارڈروں کی توجہ کسی اور طرف مبذول کراتے اور کوڑے کے ڈبے میں سے ردی کاغذات نکال کر انہیں اپنی جیبوں میں ٹھونس لیتے۔

اخبارات حاصل کرنے کا ایک قابل اعتماد ذریعہ رشوت تھا اور خبریں حاصل کرنے کے غیر اخلاقی ذرائع میں سے ایک یہ اخباری رشوت ہی تھی جسے میں گوارا کرتا تھا۔ وارڈروں کے پاس بظاہر ہمیشہ رقم کی کمی رہتی اور ان کا یہ افلاس ہمارے لیے سنہری موقع فراہم کرتا۔

جب ہم کوئی اخباری کاغذ حاصل کر لیتے تو اسے ایک دوسرے تک پہنچانا بہت خطرناک ہوتا تھا۔ کسی سے اخبار برآمد ہونا سنگین الزام تھا۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ اخبار صرف ایک آدمی پڑھتا اور وہ عموماً کیتھی یا بعد میں میک مہاراج ہوتا۔ کیتھی ہمارا افسر اطلاعات تھی اور اس نے ہمیں اطلاعات بہم پہنچانے کے انوکھے طریقے اختیار کر رکھے تھے۔ وہ اخبار پڑھتا اور متعلقہ حصوں کے تراشے کاٹ لیتا جو بعد میں خفیہ طور پر ہم باقیوں میں بانٹ دیئے جاتے۔ ہر ایک کو جو اخباری کہانی دی جاتی' وہ اس کا خلاصہ تیار کرتا۔ یہ خلاصے پھر ہم سب کو پہنچائے جاتے اور بعد میں جنرل کہانی دی جاتی' وہ اس کا خلاصہ تیار کرتا۔ یہ خلاصے پھر ہم سب کو پہنچائے جاتے اور بعد میں جنرل سیکشن میں اسمگل کر دیئے جاتے۔ جب حکام خاص طور پر چوکنے ہوتے' کیتھی یا میک خبر کا خلاصہ تیار کر کے اخبار ضائع کر دیتے۔ عموماً وہ اسے پرزے پرزے کر کیا جابت کے برتن ''بیلی'' (ballie) میں رکھ لیتے جس کا وارڈر کبھی معاینہ نہیں کرتے تھے۔

اخبار پڑھنے پر تین دن کے کھانے سے محرومی

ایک روز مجھے بینچ پر ایک اخبار پڑا نظر آیا۔ میں جلدی سے کوٹھڑی سے نکلا' راہداری کے سرے تک چل کر گیا' دونوں سمتوں میں دیکھا اور پھر بینچ سے اخبار اٹھا لیا۔ عموماً میں اخبار کو اپنی کوٹھڑی میں کہیں چھپا دیتا اور رات کو سوتے وقت ہی نکالتا تھا

لیکن اب ایک ایسے بچے کی طرح جو اپنی پڈنگ اصل کھانے سے پہلے چٹ کر جاتا ہے، میں خبروں کا اس قدر بھوکا تھا کہ فوراً ہی اخبار کھول کر ندیدوں کی طرح پڑھنے لگا۔

مجھے یاد نہیں میں کتنی دیر پڑھتا رہا۔ میں اخبار میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے قدموں کی آہٹ سنائی نہ دی۔ اچانک ایک افسر اور دوسرے وارڈر نمودار ہوئے اور مجھے اخبار اپنے بستر کے نیچے چھپانے کا بھی موقع نہ ملا۔ مجھے رنگے ہاتھوں بلکہ یوں کہیے کہ کالے اور سفید ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ افسر نے مجھے مخاطب کیا: ''منڈیلا! ہم تم پر ممنوعہ شے قبضے میں رکھنے کا الزام لگا رہے ہیں اور تمہیں اس کا نتیجہ بھگتنا ہوگا۔'' پھر دونوں نے یہ دیکھنے کے لیے کوٹھڑی کی بھرپور تلاشی لی کہ میں نے کوئی اور ممنوعہ چیز تو نہیں چھپا رکھی۔

ایک دو روز کے اندر کیپ ٹاؤن سے ایک مجسٹریٹ بلایا گیا اور مجھے ہیڈ کوارٹر کے اس کمرے میں لے گئے جو جزیرے کی عدالت کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اسمعاملے میں حکام باہر سے مجسٹریٹ بلانے پر آمادہ ہو گئے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے پاس ''کھولو اور بند کرو'' (Open and Shut) کیس ہے۔ میں نے کوئی گواہی پیش نہ کی، چنانچہ مجھے تین دن قید تنہائی اور کھانوں سے محرومی کی سزا سنا دی گئی۔

میں یہ خیال نہیں کرتا کہ اس وارڈر نے مجھے پھانسا تھا جو اخبار بینچ پر چھوڑ گیا تھا اگرچہ بعض کا خیال تھا کہ مجھے پھانسا گیا تھا۔ سماعت کے دوران حکام نے مجھ پر جرح کی کہ میں نے کس طرح اخبار حاصل کیا تھا، مگر میں نے جواب دینے سے انکار کر دیا۔ اگر وہ مجھ پر نا روا اور دباؤ ڈالتے تو انہیں علم ہو جاتا کہ میں نے اخبار کس طرح حاصل کیا تھا۔

روح کی توانائی کا راز

تنہائی کی کوٹھڑیاں ہمارے ہی کمپلیکس میں لیکن ایک اور ونگ میں واقع تھیں۔ اگرچہ وہ احاطے کے دوسری طرف تھیں مگر یوں لگتا تھا وہ بہت دور واقع ہیں۔ سزائے تنہائی میں قیدی کو ساتھیوں کی صحبت' ورزش اور خوراک سے محروم رکھا جاتا تھا۔ اسے تین دن تک صرف چاولوں کا پانی دن میں تین بار دیا جاتا۔ یہ صرف پانی ہوتا جس میں چاول ابالے جاتے تھے۔ اس کے مقابلے میں ہمارا کھچڑی کا معمول کا راشن ایک ضیافت سے کم نہ تھا۔

تنہائی کا پہلا دن بہت تکلیف دہ ہوتا۔ آدمی باقاعدگی سے کھانے کا عادی ہوتا ہے اور جسم کو کھانے سے محرومی کی عادت نہیں ہوتی۔ میں نے محسوس کیا کہ دوسرے دن میں نے غذا سے محرومی سے کموبیش موافقت اختیار کر لی تھی اور تیسرا دن تو اسطرح گزرا کہ مجھے غذا سے زیادہ رغبت نہ تھی۔ غذا سے محرومی افریقیوں کی روز مرہ کی زندگی میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ خود میں نے جوہانسبرگ میں اپنے ابتدائی برسوں میں کئی روز کھانے کے بغیر گزارے تھے۔

جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا میں نے قید تنہائی کو جیل کی زندگی کا ممنوع ترین پہلو پایا۔ اس کا کوئی اختتام تھا نہ آغاز۔ اس کیفیت میں قیدی کا ذہن علتوں میں کھو جاتا ہے۔ کیا یہ خواب تھا یا حقیقت میں ایسا پیش آیا تھا؟ وہ ہر بات میں اس طرح کے سوال اٹھانے لگتا ہے۔ کیا میں نے صحیح فیصلہ کیا تھا؟ کیا میری جدوجہد کسی قابل تھی؟ تنہائی میں وہ ایسے بار بار اٹھنے والے سوالات سے پیچھا نہیں چھڑا نہیں سکتا۔

لیکن انسانی جسم صبر آزما حالات میں سازگار ہونے کی بے حد صلاحیت رکھتا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ انسان ناقابل برداشت کو بھی برداشت کر سکتا ہے۔ اگر وہ اپنے جذبوں کو اس وقت بھی جواں رکھ سکے جب اس کا جسم آزمائش سے دوچار ہو۔ مضبوط اعتقادات محرومیوں میں بقا کا راز ہیں۔ آپ کی روح اس وقت بھی توانا ہو سکتی ہے جب آپ کا معدہ خالی ہو۔

شکایت پر 4 دن قید تنہائی

ان ابتدائی برسوں میں تنہائی ایک عادت بن گئی تھی۔ ہمیں معمولی معمولی باتوں پر ملزم ٹھہرا کر قید تنہائی میں ڈال دیا جاتا تھا۔ قیدی کو کسی ایک طرف نگاہ ڈالنے پر کھانے سے محروم ہونا پڑتا تھا یا جب وارڈر کمرے میں داخل ہوتا تو اس کے اعزاز میں کھڑے نہ ہونے پر سزا ملتی تھی۔ بعض پی اے سی قیدیوں نے جو اکثر مشغلے کے طور پر قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کرتے تھے' خاصا وقت تنہائی میں گزارا۔ حکام کا خیال تھا کہ قید تنہائی ہمارے باغیانہ رویوں کا علاج ہے۔

پہلی قید تنہائی کے کچھ عرصہ بعد مجھ پر پھر الزام لگا اور مجھے دوسری تنہائی میں وقت گزارنا پڑا۔ جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے' ہمیں اپنی شکایت پر حکام کی توجہ مبذول کرانے میں بڑی مشکل پیش آتی تھی۔ جیل کے باقی ملک سے الگ تھلگ ہونے کے باعث حکام یہ باور کرتے تھے کہ وہ ہمیں نظر انداز کر کے سزا سے بچے رہیں گے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ ہماری شکایات پر کان نہیں دھرتے تو ہم مایوس ہو کر شکایات کرنا چھوڑ دیں گے اور بیرونی دنیا کے لوگ ہمارے بارے میں بھول جائیں گے۔

ایک روز ہم چونے کی کان میں کام کر رہے تھے جب کمانڈنگ آفیسر ہمارا مشاہدہ کرنے آیا۔ اس کے ساتھ ایک معزز آدمی تھا جسے پہلے ہم پہچان نہ پائے۔ میرا ایک ساتھی نے میرے کان میں بتایا کہ یہ ہیڈ آفس سے بریگیڈیئر آیکمپ ہے جو ہمارے کمانڈنگ آفیسر کا کمانڈنگ آفیسر ہے۔ وہ دونوں فاصلے پر کھڑے ہمیں دیکھتے رہے۔ یاد رہے یہ آیکمپ وہ نہیں تھا جو پریٹوریا لوکل میں ہمارا افسر تھا۔

یہ آیکمپ ایک پست قامت بھاری بھرکم شخص تھا اور اس نے فوجی وردی کے بجائے ایک سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ عموماً ہر دو سال بعد جزیرے کے دورے پر آتا تھا۔ ان مواقع پر ہمیں ہدایت کی جاتی تھی کہ ہم کوٹھڑی کی گرل کے پاس چاق چوبند

کھڑے رہیں اور جب وہ معاینہ کرتا گزرے تو اپنے جیل کارڈ ہاتھوں میں تھامے رکھیں۔

میں نے فیصلہ کیا کہ آکیمپ کی غیر متوقع آمد واحد موقع ہے کہ ہم اپنی مشکلات اس شخص کے سامنے پیش کریں جو ان کا ازالہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ میں اپنی گیتنی رکھ کر ان کی طرف بڑھنے لگا۔ وراڈر فوراً ہی چوکنے ہو گئے اور میری طرف لپکے۔ میں جانتا تھا کہ میں قواعد کی خلاف ورزی کر رہا ہوں لیکن مجھے امید تھی کہ وارڈر میرے اس فعل پر اس قدر حیرت زدہ ہوں گے کہ وہ مجھے روکنے کے لیے کچھ نہیں کر پائیں گے۔

جب میں ان دونوں تک پہنچا تو کمانڈنگ آفیسر نے سختی سے کہا: ''منڈیلا! اپنی جگہ واپس جاؤ۔ کسی نے تمھیں نہیں بلایا۔'' میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے آکیمپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''میں نے یہ غیر معمولی اقدام اس لیے کیا ہے کہ ہماری شکایات کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔'' اس پر کمانڈنگ آفیسر نے مداخلت کی: ''منڈیلا! میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ واپس اپنی جگہ چلے جاؤ۔'' میں نے اس کی طرف مڑتے ہوئے نپی تلی آواز میں کہا: ''میں اس وقت یہاں ہوں' میں واپس نہیں جاؤں گا۔'' میں امید کر رہا تھا کہ آکیمپ میری بات سننے کے مطالبے سے اتفاق کرے گا لیکن اس نے سرد مہری سے میری طرف دیکھا' پھر وارڈروں کی طرف مڑتے ہوئے دھیرے سے کہا: ''اسے ملزم ٹھہرا دو۔''

میں مسلسل اپنی بات کہتا رہا جبکہ گارڈ مجھے وہاں سے لے چلے۔ سی او بولا: ''اسے واپس کوٹھڑی میں لے جاؤ۔'' مجھ پر قواعد کی خلاف ورزی کا الزام لگایا گیا اور ایک بار پھر میرے پاس صفائی میں کہنے کو کچھ نہ تھا۔ اس بار سزا چار دن قید تنہائی تھی۔ میں جو کچھ کر چکا تھا' اس میں ایک سبق تھا اور اسے میں خوب جانتا تھا لیکن میں نے مایوسی کا شکار ہو کر نافرمانی کی تھی۔ کوئی شخص' خصوصاً جیل کا افسر' کبھی نہیں چاہتا کہ

اس کے اختیار کو چیلنج کیا جائے۔ میری گزارش پر کان دھرنے کے لیے کیمپ کو اپنے ماتحت کو لتاڑنا پڑتا تھا اور یہ اسے گوارا نہ تھا۔ جیل حکام نجی گزارشات پر بہتر ردعمل ظاہر کرتے تھے۔ جزیرہ روبن پر تبدیلی لانے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ افسروں سے عوامی نہیں بلکہ نجی سطح پر رابطہ قائم کیا جائے۔ بعض اوقات مجھ پر تنقید ہوتی تھی کہ میں جیل افسروں سے بہت نرمی سے پیش آتا ہوں لیکن قید کے حالات بہتر بنانے کے عوض میں اس تنقید کو بخوشی برداشت کر لیتا تھا۔

وارڈر نے جیکٹ مانگ لی

ایک قیدی کی زندگی میں اہم ترین شخص وزیر انصاف نہیں، کمشنر جیل خانہ جات نہیں، سپرنٹنڈنٹ جیل بھی نہیں بلکہ اس کے سیکشن کا وارڈر ہوتا ہے۔ اگر آپ کا سردی لگتی ہو اور ایک زائد کمبل درکار ہو تو آپ وزیر انصاف سے التجا کر سکتے ہیں لیکن اس کا جواب نہیں ملے گا۔ اگر آپ کمشنر جیل خانہ جات کے پاس جائیں تو وہ کہے گا: ''مجھے افسوس ہے، یہ قواعد کے خلاف ہے'، جیل کا سربراہ کہے گا: ''اگر میں تمہیں ایک زائد کمبل دے دوں تو مجھے ہر ایک کو ایک کمبل دینا ہوگا۔'' لیکن اگر آپ اپنے کوریڈور کے وارڈر سے رجوع کریں اور اس سے آپ کے اچھے مراسم ہوں تو وہ محض سٹاک روم میں جائے گا اور آپ کو ایک کمبل لا دے گا۔

میں ہمیشہ کوشش کرتا تھا کہ اپنے سیکشن میں وارڈروں سے خوش اخلاقی سے پیش آؤں۔ عناد عام طور پر خودشکنی کے مترادف تھا اور وارڈروں میں اپنے مستقل دشمن بنا لینا قرین مصلحت نہیں تھا۔ اے این سی کی پالیسی یہ تھی کہ تمام لوگوں کی تربیت کرنے کی کوشش کی جائے حتیٰ کہ اپنے دشمنوں کی بھی۔ ہمیں یقین تھا کہ سب لوگ، حتیٰ کہ جیل کے سروس وارڈر بھی، تبدیل ہونے کے قابل ہیں' لہٰذا ہم ان کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا کرنے کی اپنی سی کوشش کرتے تھے۔

بالعموم ہم وارڈروں سے ویسا ہی برتاؤ کرتے تھے جیسا برتاؤ وہ ہم سے کرتے

تھے۔ اگر ایک شخص ہمدردانہ رویہ رکھتا تو عوض میں ہم بھی ہمدردانہ سلوک کرتے۔ ہمارے سب محافظ عفریت نہیں تھے۔ ہم نے اول روز سے یہ مشاہدہ کیا کہ ان میں سے بعض ایسے تھے جو انصاف پر یقین رکھتے تھے' تاہم محافظوں سے دوستانہ برتاؤ کوئی آسان کام نہیں تھا کیونکہ وہ عموماً ایک کالے آدمی سے دوستانہ کرنے کے تصور ہی سے گھبراتے تھے۔ چونکہ وارڈروں کا ہمارے حق میں ہونا مفید تھا' اس لیے میں بعض ساتھیوں سے کہتا رہتا تھا کہ منتخب واڈروں کے دل میں نرم گوشہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہیں' مگر کوئی اس کا ذمہ لینے کی ہامی نہیں بھرتا تھا۔

کان میں ہمارے ساتھ ایک محافظ تھا جو خاص طور پر لگتا تھا کہ ہم سے عناد رکھتا ہے۔ وہ ہمارے لیے تکلیف دہ بنا ہوا تھا کیونکہ ہم کان میں کام کے دوران باتیں کرنے کے عادی تھے اور ایک وارڈر جو ہمیں باتیں کرنے کی اجازت نہ دیتا ایک بڑی رکاوٹ تھا۔ میں نے ایک خاص ساتھی سے کہا کہ وہ اس شخص سے دوستی کرے تاکہ وہ ہماری گفتگو میں رکاوٹ نہ بنے۔ وارڈر خاصا بدمزاج تھا مگر جلد ہی وہ اس قیدی کے آس پاس وقت گزارنے میں سکون محسوس کرنے لگا۔ ایک روز وارڈر نے اس ساتھی سے اس کی جیکٹ مانگی تاکہ وہ اسے گھاس پر بچھا کر اس پر بیٹھ سکے۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ ایسا کرنا اس ساتھی کے مزاج کے خلاف ہے مگر میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ جیکٹ دے دے۔

چند روز بعد ہم شیڈ کے نیچے لنچ کر رہے تھے جب وہ وارڈر گھومتا پھرتا آ گیا۔ اس کے پاس اخبار میں لپٹا ہوا ایک فالتو سینڈوچ تھا جو اس نے گھاس پر ہمارے قریب پھینک دیا اور بولا۔ ''یہ لو۔'' یہ تھا اس کا دوستی کے اظہار کا طریقہ!

اس سے ہم ایک الجھن میں پھنس گئے۔ ایک طرف تو وہ ہم سے جانوروں کا سا برتاؤ کر رہا تھا جن کے سامنے وہ سینڈوچ پھینک سکتا تھا اور مجھے محسوس ہوا کہ اس طرح سینڈوچ لینے سے ہماری آن جاتی رہے گی۔ دوسری طرف ہم بھوکے تھے

اوراس کی یہ پیشکش یکسر مسترد کرنے سے اس کی انا مجروح ہوتی' حالانکہ ہم اس سے دوستانہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ہمارا وہ ساتھی جو اس سے دوستی نبھا رہا تھا' سینڈوچ کا خواہاں تھا' چنانچہ میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ سینڈوچ اٹھا لے۔

ہماری اس اسٹراٹیجی نے کام دکھایا اور وہ وارڈر ہماری نگرانی مس کم چوکس ہو گیا۔ وہ اے این سی کے بارے میں سوالات بھی پوچھنے لگا۔ اصولاً اگر ایک شخص جیل سروس میں کام کرتا تھا تو اس کے سرکاری پروپیگنڈے سے متاثر ہونے کا امکان ہوتا تھا۔ اسے یقین ہوتا کہ ہم دہشت گردی اور کمیونسٹ ہیں جو سفید آدمی کو سفید میں دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ لیکن جب ہم نے خاموشی سے اس کے سامنے اپنی غیر نسل پرستی' اپنی مساوی حقوق کی خواہش اور اپنے دولت کی تقسیم نو کے منصوبوں کی وضاحت کی تو وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے کہنے لگا: ''یہ تو نیشنلسٹوں کی نسبت کہیں زیادہ جائز اور اصولی بات ہے۔''

ماچس کی ڈبیاں پیغام بر بن گئیں

ہمدرد وارڈروں سے دوستانے کے نتیجے میں روبن آئی لینڈ پر ہمارا سب سے اہم مسئلہ حل ہو گیا...... اور یہ تھا باہمی روابط کا مسئلہ۔ ہم اسے اپنا فرض سمجھتے تھے کہ گروپ ایف اور جی کے آدمیوں سے رابطہ رکھیں جو عام قیدیوں کے احاطے میں تھے۔ سیاستدانوں کی حیثیت سے ہم جیل میں اپنی تنظیم کو مضبوط بنانے کے اتنے ہی شائق تھے جتنے جیل سے باہر تھے۔ اگر ہمیں اپنے احتجاجوں اور شکایات کو مربوط بنانا تھا تو باہمی رابطہ لازم تھا۔ چونکہ جنرل سیکشن میں زیادہ تعداد میں قیدی آ جاتے تھے' ایف اور جی کے آدمی نہ صرف تحریک کے اندرونی معاملات بلکہ ہمارے دوستوں اور خاندانوں کے بارے میں بھی تازہ ترین معلومات رکھتے تھے۔

سیکشنوں کے مابین روابط قواعد کی سنگین خلاف ورزی تھی۔ اس پابندی میں بھی

ہم نے کئی موثر طریقے ڈھونڈ لیے۔ جو آدمی ہمارے خوراک کے ڈول لے کر آتے تھے ان کا تعلق جنرل سیکشن سے تھا اور ابتدائی مہینوں میں ہم ان سے سرگوشیوں میں بات چیت کرتے تھے جس میں ہم اپنے مختصر پیغامات شامل کر دیتے۔ ہم نے ایک خفیہ رابطہ کمیٹی قائم کی تھی جو کیتھی، میک مہاراج، لالو چیبا اور دوسروں پر مشتمل تھی اور ان کا کام رابطہ لائنیں منظم کرنا تھا۔

پہلی تیکنیک کیتھی اور میک نے وضع کی جنھوں نے کان کی طرف آتے جاتے مشاہدہ کیا کہ وارڈر ماچس کی خالی ڈبیاں اکثر ادھر ادھر پھینک دیتے ہیں۔ وہ دونوں ڈبیاں خفیہ طور پر اکٹھی کرنے لگے۔ میک کے دماغ میں یہ خیال تھا کہ ڈبیا کا مصنوعی پیندا لگا کر اس میں ایک مہین تحریری پیغام رکھا جا سکتا ہے۔ لالو چیبا نے کبھی درزی کی تربیت حاصل کی تھی۔ اس نے مرموز پیغامات لکھے جو تبدیل شدہ ڈبیا میں رکھ دیئے جاتے تھے۔ ''ایم کے'' کا ایک اور سپاہی جو گابی ہمارے ساتھ تھا وہ ہماری کان کی طرف روانگی کے دوران ڈبیاں ایک اہم کراسنگ پر پھینک دیتا جہاں سے ہمیں عام قیدیوں کے گزرنے کا علم ہوتا تھا۔ غذا کی تقسیم کے دوران سرگوشیوں کی بات چیت کے ذریعے ہم نے پورا منصوبہ اوروں کو سمجھا دیا۔ ایف اور جے کے مقرر کردہ قیدی آتے جاتے ان ڈبیوں کو اٹھا لیتے اور اسی طریقہ سے ہمیں واپسی پیغام مل جاتے۔ یہ ترکیب ہر طرح سے مکمل نہیں تھی اور بارش وغیرہ ہمارے کیے کرائے پر پانی پھیر سکتی تھی، چنانچہ جلد ہی ہم نے زیادہ موثر طریقے ڈھونڈ لیے۔

ہم ان لمحات کی تلاش میں رہتے جب وارڈروں کی توجہ کسی اور طرف مبذول ہوتی۔ ایک ایسا وقت کھانے کے دوران اور اس کے بعد آتا تھا۔ ہم نے ایک اسکیم وضع کی کہ جنرل سیکشن کے وہ ساتھی جو کچن میں کام کرتے تھے پلاسٹک میں لپٹے خطوط اور نوٹس کھانے کے ڈولوں کی تہہ میں رکھ دیا کریں۔ اسی طریقے سے ہم واپسی پیغامات بھیجتے اور اسی پلاسٹک میں نوٹس لپیٹ کر ان دھلی پلیٹوں کے ڈھیر کے

نیچے رکھ دیتے جو واپس کچن لے جائی جا رہی ہوتیں۔ ہم پلیٹوں کو درہم برہم کرنے اور ان میں غذا بکھیرنے کی پوری پوری کوشش کرتے۔ وارڈر ہماری اس کج ادائی کی شکایت تو کرتے مگر انہوں نے کبھی تفتیش کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

ہمارے بیت الخلا اور غسل خانے تنہائی سیکشن سے متصل تھے۔ عام سیکشن کے قیدیوں کو اکثر سزائے تنہائی کے لیے وہاں رکھا جاتا تھا اور وہ بھی وہی بیت الخلا استعمال کرتے جنہیں ہم استعمال کرتے تھے اگرچہ مختلف اوقات میں۔ میک نے تحریریں پلاسٹک میں لپیٹ کر انہیں ٹائلٹ باؤل کے اندرونی حاشیے میں پیوست کر دینے کا ایک طریقہ وضع کیا۔ ہم جنرل سیکشن کے اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے کہ ان پر الزام لگے اور انہیں قید تنہائی میں رکھا جائے تاکہ وہ ان نوٹس کو نکال کر ان کے جوابات بھیج سکیں۔ وارڈروں نے کبھی بیت الخلاؤں کی تلاشی لینے کی زحمت گوارا نہ کی۔

اس مقصد کے لیے کہ ہمارے نوٹس اگر پکڑے جائیں تو ان کو حکام پڑھ یا سمجھ نہ سکیں، ہم نے تحریر کے ایسے طریقے ایجاد کیے جو آسانی سے پڑھے یا سمجھے نہیں جا سکتے تھے۔ ایک طریقہ تھا دودھ سے پیغام لکھنا۔ دودھ فوراً ہی خشک ہو جاتا اور کاغذ خالی ہی لگتا تھا لیکن جو جراثیم کش ہمیں اپنی کوٹھڑیوں کی صفائی کے لیے دیا جاتا تھا، جب وہ خشک شدہ دودھ پر چھڑکا جاتا تو تحریر دوبارہ نمایاں ہو جاتی۔ بدقسمتی یہ تھی کہ دودھ ہمیں باقاعدگی سے نہیں ملتا تھا۔ جب ہمارے ایک ساتھی کے مرض السر کی تشخیص ہوئی اور اسے دودھ ملنے لگا تو ہم وہ استعمال کرنے لگے۔

ایک اور تکنیک ٹائلٹ پیپر پر باریک مرموز تحریر تھی۔ یہ کاغذ اتنا چھوٹا اور آسانی سے چھپایا جا سکتا تھا کہ یہ پیغامات اسمگل کرنے کا مقبول طریقہ ٹھہرا۔ جب حکام نے بہت سے ایسے پیغامات پکڑ لیے تو انہوں نے ٹائلٹ پیپر کی راشن بندی کا غیر معمولی اقدام کیا۔ ان دنوں گووان بیمار تھا اور کان میں نہیں جاتا تھا لہٰذا اسے یہ کام

تفویض ہوا کہ ہر قیدی کے لیے روزانہ آٹھ مربع ٹائلٹ پیپر کا حساب رکھے۔

لیکن ان سب فنکارنہ طریقوں کے باوجود ایک اور طریقہ بہترین اور آسان تھا اور وہ تھا جیل ہسپتال میں داخل ہو جانا۔ جزیرے میں ایک ہی ہسپتال تھا لہذا ہمیں عام قیدیوں سے الگ کرنا مشکل تھا جب ہم وہاں داخل ہوتے۔ بعض اوقات مختلف سیکشنوں کے قیدی ایک ہی وارڈ میں ہوتے۔ یوں سیکشن بی اور ایف اور جی کے قیدی گھل مل جاتے اور سیاسی تنظیموں، ہڑتالوں، کام کی ستیوں اور جیل کے پیش آمدہ مسائل کے بارے میں معلومات کا باہمی تبادلہ کرتے۔

بیرونی دنیا سے رابطہ دو طریقوں سے عمل میں آتا تھا...... ان قیدیوں کے ذریعے جن کی سزا مکمل ہو جاتی اور وہ جزیرے سے رخصت ہو رہے ہوتے اور ملاقاتیوں سے رابطے کے ذریعے۔ قیدی جو رخصت ہو رہے ہوتے وہ اپنے کپڑوں یا سامان میں خطوط چھپا کر لے جاتے۔ بیرونی ملاقاتیوں کا معاملہ زیادہ خطرناک تھا کیونکہ ملاقاتی کو بھی خطرات سے دو چار ہونا پڑتا تھا۔ جب وکلا ہم سے ملنے آتے تو وارڈروں کو کمرے میں آنے کی اجازت نہ تھی لہذا کبھی کبھار ہم کوئی خط وکیل کے سپرد کر دیتے کہ باہر لے جائے۔ وکلا کی تلاشی بھی نہیں لی جاتی تھی۔ ان ملاقاتوں میں ہم لکھ کر بھی اظہار مدعا کر سکتے تھے جیسا کہ ہم نے مقدمہ رائیوونیا کے دوران کیا تھا۔ چونکہ کمرے میں جاسوس کے آلات نصب ہوتے تھے ہم اس طرح کہتے "براہ کرم بتا دیجیے......" پھر ہم توقف کر کے کاغذ پر لکھتے "اوٹی" جس کا مطلب ہوتا آلیورٹیمبو کو...... " کہ ہمیں اس کے منصوبے سے اتفاق ہے کہ تخفیف کر دی جائے......" پھر کاغذ پر لکھتے: "نیشنل ایگزیکٹو میں۔" اس طرح زبانی اور تحریری الفاظ مل کر پیغام مکمل ہو جاتا۔

ہم نے بھوک ہڑتال کر دی

جولائی 1966ء میں خوراک کے ڈول میں چھپے پلاسٹک میں لپٹے نوٹ سے

ہمیں معلوم ہوا کہ جنرل سیکشن کے آدمیوں نے بھوک ہڑتال کر دی ہے تا کہ ابتر حالات کے خلاف احتجاج کریں۔ نوٹ ادھورا تھا اور ہمیں ٹھیک علم نہ ہو سکا کہ ہڑتال کب شروع ہوئی تھی اور یہ کس کے متعلق ہے۔ لیکن ہم قیدیوں کی کسی بھی سٹرائیک کی حمایت کرتے تھے خواہ وہ کسی بھی وجہ سے کی گئی ہو۔ اب اس ہڑتال کی خبر سب تک پہنچ گئی اور ہم نے ہمدردانہ ہڑتال شروع کرنے کا فیصلہ کیا جس کا آغاز اگلے کھانے سے ہونا تھا۔ ایک بھول ہڑتال ایک ہی امر پر مشتمل ہوتی ہے یہ کہ کھانا چھوڑ دیا جائے۔

رابطے میں وقت کی تاخیر کے باعث جنرل سیکشن کو ایک آدھ دن تک پتہ ہی نہ چلا کہ ہم بھی بھوک ہڑتال میں شریک ہو گئے ہیں۔ لیکن ہم جانتے تھے کہ اس خبر سے ان کا دل بڑھے گا۔ ادھر حکام انہیں بتاتے تھے کہ ہم ہڑتال میں شرکت نہیں کر رہے اور یہ کہ ہم پر تکلف کھانے اڑا رہے ہیں۔ یہ ان کا معمول کا طریقہ کار تھا۔ بحران کے وقت حکام لازماً ڈس انفارمیشن کی مہم چلا دیتے تھے تا کہ ایک سیکشن کو دوسرے کے خلاف بھڑ کا سکیں۔ اس کیس میں جبکہ اے این سی متفقہ طور پر ہڑتال کی حمایت کر رہی تھی جنرل سیکشن میں پی اے سی ک بعض افراد اس میں شامل نہیں تھے۔

ہماری ہڑتال کے پہلے دن ہمیں معمول کا راشن دیا گیا لیکن ہم نے لینے سے انکار کر دیا۔ دوسرے دن ہم نے دیکھا کہ ہماری خوراک زیادہ کر دی گئی ہے اور کھچڑی کے ساتھ بعض اور سبزیاں بھی شامل ہیں۔ تیسرے دن رات کے کھانے کے ساتھ گوشت کے پیس پیش کیے گئے۔ چوتھے دن دلیے پر چکنائی چمک رہی تھی اور چوٹی پر گوشت اور رنگ برنگ سبزیوں کے ٹکڑے سجے تھے۔ اس غذا کو دیکھ کر منہ میں پانی آتا تھا۔ جب ہم نے اسے لینے سے انکار کیا تو وارڈر مسکرا دیئے۔ کھانے کی اشتہا بہت زیادہ تھی مگر ہم نے اس پر قابو پا لیا اگر چہ ہم سے کان پر خاص طور پر سخت کام لیا جا رہا تھا۔ ہم نے سنا کہ جنرل سیکشن میں قیدی ہمت ہار رہے تھے اور

انہیں ہتھ گاڑیوں میں لے جایا جا رہا تھا۔

مجھے کرنسل ویسلز سے ملاقات کے لیے ہیڈ آفس بلایا گیا ایسے مراحل بڑے نازک ہوتے تھے کیونکہ میرے ساتھی قیدی یہ سمجھتے کہ حکام ہڑتال ختم کرانے کے لیے مجھ پر دباؤ ڈالیں گے۔ ویسلز اکل کھرا آدمی تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ہم ہڑتال کیوں کیے ہوئے ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ سیاسی قیدیوں کی حیثیت سے ہم جیل کے حالات تبدیل کرانے کے لیے احتجاج کو نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد کا حصہ سمجھتے ہیں۔ ''لیکن تم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ایف اور جی والے ہڑتال کیوں کیے ہوئے ہیں۔'' اس نے کہا۔ میں نے کہا کہ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا اور یہ کہ ایف اور جی والے ہمارے بھائی ہیں اور ہماری جدوجہد ناقابل تقسیم ہے۔ اس نے نتھنے پھلائے اور ملاقات ختم ہونے کا اشارہ کر دیا۔

اگلے دن ہمیں غیر معمولی سلسلہ واقعات کی خبر ملی۔ خود وارڈروں نے خوراک کا بائیکاٹ کر دیا تھا اور وہ اپنے کیفے ٹیریا میں جانے سے انکاری تھے۔ وہ ہماری حمایت میں ہڑتال نہیں کر رہے تھے بلکہ انہوں نے یہ فیصلہ صرف اس لیے کیا تھا کہ ہم ہڑتال کر سکتے تھے تو وہ کیوں نہیں کر سکتے؟ وہ بہتر خوراک اور بہتر رہائشی سہولتوں کا مطالبہ کر رہے تھے۔ دو ہڑتالوں کا اجتماع حکام کے لیے بڑا دردسر تھا۔ انہوں نے وارڈروں سے مفاہمت کر لی اور ایک دو دن بعد ہم نے سنا کہ حکام جنرل سیکشن میں گئے تھے اور انہوں نے حالات کی تبدیلی پر بات چیت کے لیے تین نمائندوں کا تقاضا کیا تھا۔ اس پر عام قیدیوں نے فتح کا اعلان کر دیا اور بھوک ہڑتال ختم کر دی۔ ایک دن بعد ہم نے بھی ان کی پیروی کی۔

قیدیوں کی انٹیلی جنس سروس

یہ جزیرے پر پہلی اور سب سے موثر بھوک ہڑتال تھی۔ احتجاج کی ایک شکل کے طور پر ان ہڑتالوں کی کامیابی کی شرح زیادہ اونچی نہ تھی اور ان کا جواز ہمیشہ مجھے

بے تکا لگتا تھا۔ جیل میں بھوک ہڑتال کی کامیابی کے لیے بیرونی دنیا کو اس کا علم ہونا چاہیے۔ بصورت دیگر قیدی محض بھوکوں مریں گے اور کسی کو اس کا علم نہیں ہوگا۔ اگر باہر اسمگل شدہ اس نوع کی خبریں کہ ہم بھوک ہڑتال کیے ہوئے ہیں اخبارات میں نمایاں جگہ پاتیں تو اس کے نتیجے میں ہمارے حامی گروپوں کی طرف سے حکومت پر دباؤ پڑ سکتا تھا۔ ابتدائی برسوں میں خاص طور پر یہ مسئلہ تھا کہ جزیرے سے باہر لوگوں کو آگاہ کرنا تقریباً ناممکن تھا کہ ہم نے جزیرے کے اندر بھوک ہڑتال کر رکھی ہے۔

میرے نزدیک بھوک ہڑتالیں یکسر بے ثمر تھیں۔ ہم جو پہلے ہی مصائب برداشت کر رہے تھے بھوک ہڑتال سے اپنی صحت برباد کر رہے تھے حتیٰ کہ موت کو گلے سے لگا رہے تھے۔ میں نے ہمیشہ احتجاج کے ایک زیادہ مستعد اور جنگجویانہ انداز کی حمایت کی جیسے کہ روک سٹرائیک، گوسلو سٹرائیک یا صفائی کرنے سے انکار …… یہ ایسے افعال ہیں جن سے حکام کو سزا ملتی تھی نہ کہ ہمیں۔ انہیں بجری کی ضرورت ہوتی تو ہم بجری بنانے سے انکار کر دیتے۔ وہ چاہتے کہ جیل کا صحن صاف رہے مگر ہم اسے گندا رہنے دیتے۔ اس قسم کے رویئے سے وہ پریشان ہوتے اور ان کے قوی جواب دے جاتے جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے بھوکا رہنے سے وہ دل میں لطف اندوز ہوتے تھے۔

لیکن جب فیصلے کا وقت آتا تو اکثر ووٹ میرے خلاف ہوتے حتیٰ کہ میرے ساتھی مذاق مذاق میں کہتے کہ میں کوئی کھانا چھوٹنے کی تاب نہیں لاسکتا۔ بھوک ہڑتال کے حامی کہتے تھے۔ کہ یہ روایتی طور پر احتجاج کی ایک مسلمہ شکل ہے جس پر دنیا بھر میں مہاتما گاندھی جیسے سرکردہ رہنما عمل پیرا رہے ہیں۔ ایک بار جب بھوک ہڑتال کا فیصلہ ہو جاتا تو میں تہہ دل سے اس کی ویسی ہی حمایت کرتا تھا جیسی اسکا کوئی حامی نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ہڑتالوں کے دوران اگر ہمارا کوئی من موجی

ساتھی ہڑتال کے فیصلے کی پابندی نہ کرنا چاہتا تو میں اکثر اسے ملامت کر کے پابند رہنے پر مجبور کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ایک ساتھی نے کہا تھا: ''ماد یبا! مجھے کھانا درکار ہے۔ مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ میں کھانا چھوڑ دوں۔ میں نے برسوں جہاد آزادی میں خدمات انجام دی ہیں۔''

ہمارے ساتھی بعض اوقات چپکے سے کھا لیتے تھے۔ ہمیں آسانی سے اس کا پتہ لگ جاتا تھا۔ بھوک ہڑتال کے دوسرے دن کسی کو بیت الخلا جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ لیکن کوئی نہ کوئی ساتھی صبح بیت الخلاء جاتا نظر آ جاتا۔ ہماری اپنی داخلی انٹیلی جنس سروس بھی تھی اور ہمیں علم ہوتا تھا کہ بعض آدمی اس معاملے میں کمزور ہیں۔

ونی سے دوسری ملاقات:

جولائی 1966ء کی بھوک ہڑتال کے دوران میری بیوی دوسری بار ملنے آئی۔ یہ ملاقات پہلی ملاقات کے عین دو برس بعد عمل میں آئی اور یہ نہ ہوتے ہوتے ہو گئی۔ 1964ء میں پہلی ملاقات کے بعد سے ونی مستقل طور پر ہراساں تھی۔ اس کی بہنوں اور بھائی کو پولیس کے ہاتھوں اذیت سہنی پڑی تھی اور حکام اس کے خاندان کے ہر فرد کو اس کے ساتھ رہنے سے روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ پولیس کی ایسی بعض حرکتیں تو انہی دنوں میرے علم میں آ گئیں اور بیشتر کا بعد میں پتہ چلا۔ بعض ناگوار ترین واقعات کا مجھے علم ہو گیا تھا کیونکہ جب میں کان سے واپس آتا تو اکثر مجھے ونی کے بارے میں اخباری تراشے بستر پر پڑے ملتے جنہیں واڈر میری غیر موجودگی میں وہاں رکھ جاتے تھے۔

حکام گھٹیا اور نفرت انگیز طریقوں سے پوری پوری کوشش کرتے تھے کہ ونی کا سفر ممکنہ طور پر زیادہ سے زیادہ ناخوشگوار ہو۔ پہلے دو برسوں میں اس کی ملاقاتوں میں لوکل مجسٹریٹوں اور بار بار کی بندوشوں نے رکاوٹ ڈالی تھی جو اسے سفر کرنے سے روکتی تھیں۔ مجھے وکیل کے ذریعے حال ہی میں پتہ چلا تھا کہ ونی کو پولیس نے

اطلاع دی تھی کہ اسے صرف اس صورت میں ملاقات کی اجازت مل سکتی ہے اگر وہ اپنے ساتھ پاس رکھنے پر رضامند ہو۔اور ونی جو 1950ء سے خواتین کے پاسوں کے متعلق سرکاری پالیسی کے خلاف احتجاج کرتی آ رہی تھی اس نے بجاطور پر اس نفرت انگیز دستاویز کو اپنے پاس رکھنے سے انکار کر دیا۔صاف ظاہر تھا کہ حکام اسے اور مجھے رسوا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔لیکن میں سمجھتا تھا کہ حکام کے گھٹیا ہتھکنڈوں کی مزاحمت کرتے رہنے کے بجائے ہمارا ایک دوسرے سے ملنا زیادہ اہم تھا' چنانچہ ونی پاس اسے اپنے ساتھ رکھنے پر رضامند ہو گئی۔میں اس کی کمی شدت سے محسوس کرتا تھا اور مجھے اس سے مل کر عزم نو سے ہمکنار ہونے کی ضرورت تھی اور ہمیں اہم خاندانی معاملات پر بھی بات چیت کرنی تھی۔

ونی کی ہر ملاقات کے ضمن میں ضابطے طویل اور پیچیدہ تھے۔اسے ریل گاڑی یا کار کے ذریعے سفر سے منع کر دیا گیا تھا' لہذا اسے ہوائی سفر کرنا پڑا جس سے اس کا سفر کہیں مہنگا ہو گیا تھا۔اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ہوائی اڈے سے کلیڈن سکوائر پولیس اسٹیشن تک مختصر ترین راستے سے آئے جہاں اسے مختلف کاغذات پر دستخط کرنے تھے۔واپسی پر اسے اسی اسٹیشن پر آ کر مزید کاغذات پر دستخط کرنے تھے۔

مجھے ایک اخباری تراشے سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ ایک سپیشل برانچ آفیسر ہمارے آرلینڈو کے گھر میں زبردستی داخل ہو گیا تھا جبکہ ونی ڈریسنگ کر رہی تھی اور اس نے اس کی اس حرکت پر سخت ردعمل ظاہر کیا تھا اور افسر کو کمرے سے باہر دھکیل دیا تھا۔گورے لیفٹیننٹ نے ونی کے خلاف حملہ کرنے کا الزام لگایا۔چنانچہ میں نے اپنے دوست اور شریک کار جارج بیزوس سے گزارش تھی کہ وہ ونی کا دفاع کرے اور اس نے یہ کام بخوبی انجام دیا۔ہم نے اس واقعے کے بارے میں اخباروں میں رپورٹیں دیکھی تھیں اور بعض ساتھی ونی کی اس جھڑپ کے حوالے سے مذاق کیا کرتے تھے۔وہ کہتے ''مادیبا! تم اپنے خاندان میں واحد ملہ باز نہیں ہو۔''

دوسری ملاقات صرف نصف گھنٹہ جاری رہی جبکہ ہمیں بہت سے امور پر گفتگو کرنی تھی۔ ونی پہلے ہی کیپ ٹاؤن میں خود سے روا رکھے جانے والے سلوک اور اس حقیقت پر کبیدہ خاطر تھی کہ ہمیشہ کی طرح اسے فیری کے تہہ خانے میں سفر کرنا پڑا تھا جہاں انجن کے دھویں نے اسے علیل کر دیا تھا۔ اس نے میری خاطر اپنا حلیہ سنوار لیا تھا مگر وہ دبلی اور تناؤ کا شکار نظر آتی تھی۔

ہم نے ملاقات کے دوران بچوں کی تعلیم، میری ماں کی صحت جو اچھی نہیں تھی اور اپنے مالی معاملات پر بات چیت کی۔ ایک نازک مسئلہ زینی اور زندزی کی تعلیم کا تھا۔ ونی نے لڑکیوں کو ایک ایسے سکول میں ڈال دیا تھا جو ہندوستانیوں کے لیے مخصوص تھا اور حکام اس کے پرنسپل کو اس بنا پر ہراساں کر رہے تھے کہ افریقی شاگردوں کو اس اسکول میں داخل کرنا قانون کی خلاف ورزی ہے۔ اس کے پیش نظر ہم نے زینی اور زندزی کو سوازی لینڈ کے ایک بورڈنگ سکول میں بھیجنے کا مشکل فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ ونی کے لیے سخت تھا جسے سب سے زیادہ سہارا ان دو بچیوں ہی کا تھا۔ مجھے اس امر کی تسلی تھی کہ وہاں ان کی تعلیم بہتر ہو گی مگر ونی کے متعلق میں پریشان تھا۔ وہ تنہا رہ جاتی اور ان لوگوں کے رحم و کرم پر ہوتی جو دوستوں کے بھیس میں اسے غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ جیسے بھی تھا ونی دوسروں پر بہت اعتبار کرنے لگی تھی۔

غیر خانگی معاملات زیر بحث لانے پر عائد پابندیوں سے بچنے کے لیے ہم ایسے نام استعمال کرتے جن کا مطلب ہم پر واضح ہوتا مگر دوسرے اس سے ناآشنا ہوتے۔ اگر میں جاننا چاہتا کہ ونی پر کیا گزر رہی ہے تو میں کہتا ''کیا تم نے ان دنوں انگوتیانا کے متعلق کچھ سنا ہے؟ کیا وہ ٹھیک ہے؟'' انگوتیانا ونی کا خیلی نام ہے لیکن حکام اس سے واقف نہیں تھے۔ یوں ونی بتا سکتی تھی کہ انگوتیانا پر کیا گزر رہی ہے۔ اگر وارڈر پوچھتا کہ انگوتیانا کون ہے تو ہم کہتے کہ وہ ہماری غم زاد ہے۔ اگر میں

جاننا چاہتا کہ اے این سی کا بیرونی مشن کیسے چل رہا ہے تو میں کہتا: ''چرچ کا کیا حال ہے؟'' ونی مناسب لفظوں میں ''چرچ'' پر گفتگو کرتی۔ پھر میں پوچھتا: ''پادری کیسے ہیں؟ کیا نئی عبادات ہوتی ہیں؟'' اس طرح ہم خاصی معلومات کا تبادلہ کر لیتے۔

ہمیشہ کی طرح جب وارڈر پکارا: ''وقت ختم ہو گیا!'' تو میں نے خیال کیا کہ چند ہی منٹ گزرے ہیں۔ میں نے شیشے کی آڑ کو چوم کر ونی کو الوداع کرنا چاہا مگر اس سے باز رہا۔ میں ہمیشہ اس امر کو ترجیح دیتا کہ پہلے ونی رخصت ہوتا کہ وہ مجھے وارڈروں کے جلو میں جاتے نہ دیکھنے پائے' چنانچہ میں اسے دیکھتا رہا جب اس نے وارڈروں سے اپنا اندرونی کرب چھپاتے ہوئے آہستگی سے الوداع کہا۔

ملاقات ختم ہو گئی تو میں نے تمام تفصیلات اپنے ذہن میں تازہ کیں۔ ونی کیا پہنے ہوئے تھی' اس نے کیا کہا اور میں نے کیا کہا۔ پھر میں نے اسے ایک خط لکھا جس میں کچھ باتیں یاد دلائیں جن پر ہم نے بات چیت کی تھی۔ میں نے یاد دلایا کہ میں اس کا کس قدر خیال رکھتا تھا' ہمارا رشتہ کس قدر اٹوٹ تھا' وہ کتنی حوصلہ بند تھی۔ اس کے نام میرے خطوط محبت نامے بھی تھے اور اسے جذباتی سہارا بھی فراہم کرتے تھے جس کی اسے اشد ضرورت تھی۔

ونی کی ملاقات کے فوراً بعد مجھے پتہ چلا کہ اس پر الزام لگا ہے کہ وہ کیپ ٹاؤن میں اپنی آمد پر پولیس کو رپورٹ نہیں کر سکی اور اس نے روانہ ہوتے وقت پولیس کو اپنا پتہ بھی فراہم نہیں کیا۔ وہ پہلے ہی فیری میں اپنا پتہ دے چکی تھی اور واپسی پر جب اس سے دوبارہ پتہ دینے کا تقاضا کیا گیا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اس سے پہلے پتہ دے چکی ہے۔ اس الزام میں اسے گرفتار کر لیا گیا مگر ضمانت پر رہائی ہو گئی۔ اس پر مقدمہ چلا اور اسے ایک سال کی سزا سنا دی گئی جو معطل کر دی گئی سوائے چار دنوں کے۔ اس واقعے کے نتیجے میں اس کی سوشل ورکر کی دوسری ملازمت بھی جاتی رہی اور یوں آمدنی کا بڑا ذریعہ ختم ہو گیا۔

میں نے حکام کوناک آؤٹ کردیا

حکومت نے مجھے ایسے طریقوں سے ہراساں کرنے کی پوری پوری کوشش کی جن کے متعلق اس کا خیال تھا کہ میں ان کی مزاحمت نہیں کرسکوں گا۔ 1966ء کے اواخر میں وزیر انصاف کے اشارے پر ٹرانسوال لاءسوسائٹی نے پیشہ ور وکلاء کی فہرست سے میرا نام اس بنا پر خارج کرنے کی تحریک کی کہ میں مقدمہ رائیوونیا میں سزا یافتہ ہوں۔ اس سے پہلے ڈیفائنس کمپین میں سزا یافتہ ہونے کی بنا پر فہرست وکلاء سے میرا نام خارج کرنے کی کوشش ناکام رہی تھی۔ اس کے باوجود لاءسوسائٹی نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔

مجھے لاءسوسائٹی کی تحریک کے متعلق اس وقت پتہ چلا جب وہ پیش کردی گئی تھی۔ ٹرانسوال لاءسوسائٹی ایک انتہائی قدامت پسند ادارہ تھا اور وہ ایسے وقت مجھے سزا دینے کے لیے کوشاں تھی جب اس کا خیال تھا کہ میں اپنا دفاع نہیں کرسکوں گا۔ جزیرہ روبن پر قید ایک شخص کے لیے آسان نہیں تھا کہ وہ عدالت میں اپنا دفاع کر سکے لیکن میں نے یہی مشکل کام انجام دینے کا تہیہ کرلیا تھا۔

میں نے حکام کو اطلاع دی کہ میں لاءسوسائٹی کے اس فعل کو چیلنج کرنا چاہتا ہوں اور میں اپنی صفائی کی تیاری خود کروں گا۔ میں نے جیل کے افسروں سے کہا کہ صفائی کی کماحقہ تیاری کے لیے مجھے کان پر جانے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور ایک مناسب میز کرسی اور مطالعے کے لیے لیمپ فراہم کیا جائے تا کہ ایک مناسب میز کرسی اور مطالعے کے لیے لیمپ فراہم کیا جائے تا کہ میں اپنے مقدمے پر کام کر سکوں۔ میں نے کہا کہ مجھے ایک لاءلائبریری تک رسائی درکار ہے لہذا مجھے پریٹوریا لے جایا جائے۔

میری اسٹراٹیجی یہ تھی کہ قانونی طور پر جائز درخواستوں کے ذریعے میں جیل کے حکام اور عدالتوں پر یلغار کردوں جن کی تعمیل میرے خیال میں ان کے لیے مشکل

تھی۔ جب میں عدالت میں اپنا دفاع کرنے کی خواہش کرتا تھا تو حکام ہمیشہ پریشانی کا شکار ہو جاتے تھے کیونکہ اس طرح ہونے والی پبلسٹی سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ میں انہی قدروں کے لیے ہنوز لڑ رہا تھا جن کے لیے ہمیشہ لڑتا رہا تھا۔

جیل حکام کا پہلا ردعمل تھا: ''منڈیلا! تم ایک وکیل کی خدمات حاصل کیوں نہیں کرتے جو تمہارا دفاع کرے؟ وہ مقدمے کو مناسب طور پر نپٹا سکے گا۔ آخر تم کیوں پریشان ہوتے پھرو؟'' میں نے پیش رفت کی اور سپریم کورٹ کے رجسٹرار کو ریکارڈ' دستاویزات اور کتابوں کی فراہمی کے لیے درخواست دی جن کی مجھے ضرورت تھی۔ میں نے سرکار کے گواہوں کی فہرست اور ان کی پیش آمدہ سمری کی فراہمی کا بھی تقاضا کیا۔

مجھے رجسٹرار کی طرف سے ایک خط موصول ہوا کہ اس سے پہلے کہ وہ میری درخواستیں منظور کر سکیں وہ میری صفائی کی نوعیت جاننا چاہتے ہیں۔ یہ غیر معمولی بات تھی کہ مقدمے سے پہلے ایک وکیل سے اس کی صفائی کی نوعیت پوچھی جائے۔ کسی وکیل صفائی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بالفعل عدالت میں جانے سے پہلے اپنی صفائی کا انکشاف کر دے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ میری صفائی کی نوعیت اس وقت واضح ہو جائے گی جب میں اپنے کاغذات فائل کر دوں گا اور اس سے پہلے انکشاف نہیں کر سکتا۔

یہ میرے' رجسٹرار اور اس سٹیٹ اٹارنی کے مابین جو لاء سوسائٹی کی نمائندگی کر رہا تھا ہیجان خیز خط کتابت کا آغاز تھا۔ میں اپنی کسی درخواست سے پیچھے نہ ہٹا۔ حکام اپنی جگہ ہٹیلے تھے۔ ان کا فیصلہ تھا مجھے کان کی مشقت سے رخصت نہیں ملے گی' نہ میز کرسی مل سکے گی اور میں لاء لائبریری استعمال کرنے کے لیے کسی حالت میں پریٹوریا نہیں جا سکوں گا۔

میں نے لاء سوسائٹی اور رجسٹرار کو اپنے مطالبات سے پریشان کرنے کا سلسلہ

جاری رکھا جنہیں بجالانے سے وہ انکار کرتے رہے۔آخر کار کئی مہینوں اور کئی خطوط کے بعد انہوں نے چپکے سے اور زجر وتوبیخ کے ایک نوٹس کے ذریعے مجھے اطلاع دی کہ پورا معاملہ بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ یہ کیس ان کی خواہشات کے برعکس ثابت ہو رہا تھا۔ ان کا اندازہ تھا کہ میں اپنی صفائی خود پیش کرنے کا اقدام نہیں کروں گا۔وہ غلطی پر تھے۔

تازہ اخبار کی جیل میں اسمگلنگ

میری طرف سے لاء سوسائٹی کے اقدامات کی مخالفت پر سرکاری ردعمل کی خبریں میں نے تفصیل سے پڑھی تھیں کیونکہ ہمیں ایک روزنامہ مل رہا تھا جیسے ہمیں اپنے دروازے پر فراہم کیا جاتا ہو......اور حقیقت بھی یہی تھی۔وارڈر جورات کے وقت ہمارا نگران تھا' بڑی عمر کا خاموش آدمی تھا۔اس کا تعلق جیہواہ وٹنس نامی مسیحی فرقے سے تھا اور میک مہاراج نے اس سے دوستی گانٹھ رکھی تھی۔ایک رات وہ گشت کرتا میک کی کوٹھڑی تک آیا اور اس سے کہنے لگا کہ وہ ایک اخباری مقابلے میں شرکت کرنا چاہتا ہے جس کے لیے ایک مضمون درکار ہے۔بوڑھے وارڈر نے اشارۃً کہا کہ اگر میک اسکی مدد کرے تو انعام جیتا جا سکتا ہے۔میک رضامند ہو گیا اور اس نے حسب خواہش ایک مضمون لکھ دیا۔دو ہفتے بعد وہ میک کے پاس خوش خوش آیا۔وہ مقابلے کے آخری مرحلے میں داخل ہو گیا تھا اور اب اس کی خواہش تھی کہ میک اسے ایک اور مضمون لکھ دے۔وارڈر نے میک سے وعدہ کیا کہ وہ بدلے میں ایک بھنا چوزہ پیش کرے گا۔میک نے اس سے کہا کہ وہ اس بارے میں سوچے گا۔

اگلے روز میک' والٹر کے اور میرے پاس آیا اور ساری صورت حال بتائی۔والٹر نے اس کی حوصلہ افزائی کی کہ وارڈر کی پیشکش قبول کر لے' تاہم میں نے میک کا تامل بھانپ لیا کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا کہ اس سے خصوصی سلوک کیا جا رہا ہے۔

اس رات اس نے واڈر سے کہا کہ وہ سگریٹوں کی ایک ڈبیا کے بدلے میں مضمون لکھ دے گا۔ بوڑھا وارڈر رضامند ہو گیا اور اگلی شام اس نے سگریٹوں کی ایکنو خرید ڈبیا میک کو لا دی۔

اگلے روز میک نے ہمیں بتایا کہ اب اسے بوڑھے وارڈر پر مطلوبہ دباؤ حاصل ہو گیا ہے۔ ہم نے پوچھا ''کیسے؟'' وہ بولا: ''کیونکہ مجھے سگریٹ کی ڈبیا پر اس کے فن گر پرنٹس حاصل ہو گئے ہیں اور میں اسے بلیک میل کر سکتا ہے۔'' والٹر پکار اٹھا کہ یہ تو غیر اخلاقی حرکت ہے۔ میں نے میک پر تنقید نہ کی اور اس سے پوچھا کہ وہ کس چیز کے لیے اسے بلیک میل کرے گا۔ میک نے بھویں اٹھائیں اور بولا: ''اخبارات۔'' والٹر اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ میرا خیال ہے جزیرہ روبن پر والٹر واحد آدمی تھا جو میری ہی طرح اخبارات کا دیوانہ تھا۔ میک رابطہ کمیٹی سے اس منصوبے پر پہلے ہی گفتگو کر چکا تھا اور اگرچہ ہم دونوں میک کے منصوبے کے متعلق ذہنی تحفظات رکھتے تھے ہم نے اسے منع نہ کیا۔

اس رات میک نے وارڈر سے کہا کہ سگریٹ کی ڈبیا پر اس کے فنگر پرنٹس ہیں اور یہ کہ اگر اس نے تعاون نہ کیا تو وہ اس کا کچا چٹھا کمانڈنگ افیسر کیسامنے کھول دے گا۔ معطلی اور پنشن سے محرومی کے خطرے کے پیش نظر وارڈر ہر وہ کام کرنے پر رضامند ہو گیا جو میک چاہتا تھا۔ یوں اگلے چھ ماہ تک جب تک اس کا تبادلہ نہیں ہو گیا وہ میک کو روزانہ اس روز کا اخبار لا کر دیتا رہا۔ میک خبروں کا خلاصہ تیار کرتا اور اسے چھوٹے سے کاغذ کیپرزے پر منتقل کر لیتا جو ہم سب کے درمیان گردش کرتا۔ ستم یہ کہ وہ بدقسمت وارڈر مقابلہ بھی نہ جیت سکا۔

اے این سی اور کمیونسٹ پارٹی کی علیحدگی

یہ کہنا مشکل ہے کہ ہم کان پر کیا کام زیادہ کرتے تھے۔ چونے کے پتھر کی کھدائی یا باتیں۔ 1966ء تک وارڈروں نے قدرے ستھرا رویہ اختیار کر لیا تھا۔

جب تک ہم کام کرتے جتنی چاہتے باتیں کر سکتے تھے۔ ہم چھوٹے چھوٹے گروہوں میں اکٹھے ہو جاتے اور چار پانچ کی ٹولیوں میں حلقہ بنا کر سارا دن باتیں کرتے جہاں دنیا جہان کے موضوعات زیر بحث آتے۔ ہم سنجیدہ اور ہلکے پھلکے دونوں طرح کے موضوعات پر ایک دوسرے سے جی بھر کر گفتگو کرتے۔

جیل کا کوئی پہلو خوشگوار نہیں ہوتا سوائے ایک کے' وہ یہ کہ قیدی کو سوچنے کا وقت مل جاتا ہے۔ جدوجہد کے ہنگاموں میں وہ مسلسل بدلتے حالات پر اپنا ردعمل ظاہر کرتا رہتا ہے۔ اور اس کے پاس احتیاط سے غور و فکر کرنے اور اپنے متنوع فیصلوں یا پالیسیوں کا جائزہ لینے کا وقت نہیں ہوتا۔ جیل اسے کافی وقت فراہم کرتی ہے تا کہ وہ جائزہ لے سکے کہ اس نے کیا کچھ کیا ہے اور کیا نہیں کیا۔

ہم مسلسل سیاسی مباحث میں مصروف رہتے تھے۔ بعض ایک آدھ دن نپٹ جاتے' دوسرے برسوں تک طول کھینچتے۔ مجھے بحث و تکرار میں بڑا لطف آتا لہٰذا میں اس میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتا۔ ہماری ایک ابتدائی اور طویل ترین بحث اے این سی اور کمیونسٹ پارٹی کے مابین تعلق سے متعلق تھی۔ بعض افراد خصوصاً ''ایم کے'' کے وہ لوگ جنہوں نے اشتراکی ملکوں میں تربیت پائی تھی ان کا خیال تھا کہ اے این سی اور کمیونسٹ پارٹی ایک ہی چیز ہیں حتیٰ کہ گوواں امبیکی اور ہیری گوالا جیسے اے این سی کے ساتھی بھی اسی نظریئے پر کاربند تھے۔

جزیرہ روبن پر کمیونسٹ پارٹی کا کوئی الگ وجود نہ تھا۔ جیل میں اے این سی اور پارٹی کے مابین امتیاز کرنے کا کوئی پہلو سامنے نہیں تھا۔ میرے اپنے خیالات کئی سال نہیں بدلے تھے۔ اے این سی ایک عوامی تحریک آزادی تھی جو ان سب کو خوش آمدید کہتی تھی جن کے مقاصد مشترک تھے۔

وقت کے ساتھ ساتھ اے این سی اور پارٹی سے متعلق بحث زیادہ تند و تیز ہوتی چلی گئی۔ ہم میں سے بہت سوں نے اس مسئلے کو حل کرنے کا ایک طریقہ تجویز کیا......

ہم لوسا کا میں اے این سی کے جلاوطن لیڈروں کو لکھیں گے۔ ہم نے اس موضوع پر بائیس صفحے کی ایک خفیہ دستاویز تیار کی جس پر میرے دستخط تھے تاکہ اسے لوسا کا بھیج دیں۔ ایسی دستاویز تیار کرکے باہر بھجوانا ایک خطرناک عمل تھا مگر ہم یہ کر گزرے۔ آخر کار لوسا کا سے اے این سی اور کمیونسٹ پارٹی کی علیحدگی کی توثیق ہوگئی اور اس طرح یہ بحث اختتام کو پہنچی۔

ایک اور بار بار اٹھنے والا مسئلہ یہ تھا: کیا اے این سی کی قیادت خاص طور پر ورکنگ کلاس سے آنی چاہیے یا نہیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ چونکہ اے این سی عام کارکنوں کی ایک اجتماعی تنظیم ہے قیادت بھی اسی طبقے سے ہونی چاہیے۔ میرا موقف تھا کہ یہ تخصیص کہ قیادت ورکنگ کلاس سے ہونی چاہیے اتنی غیر جمہوری ہے جتنا یہ کہنا کہ قیادت بورژوا دانشوروں پر مشتمل ہو۔ اگر تحریک نے ایسے کسی اصول پر اصرار کیا ہوتا تو چیف لوتھولی، موسز کوتانی اور ڈاکٹر دادو جیسے اکثر رہنما نا اہل ٹھہرتے۔ درحقیقت انقلابی ہر سطح سے آگے آتے ہیں۔

جیل میں ختنہ سکول

تمام مباحث سیاسی نہیں ہوتے تھے۔ ایک مسئلہ جس پر بہت بحث ہوئی ختنے کا تھا۔ ہم میں سے بعض کہتے تھے کہ ختنہ جس طرح ژہوسا اور دوسرے قبائل میں کیا جاتا ہے یہ نہ صرف جسم کی غیر ضروری کاٹ پیٹ ہے بلکہ قبائلیت کی اس قسم کی طرف مراجعت بھی ہے جس کا اے این سی خاتمہ کرنا چاہتی ہے۔ یہ کوئی نامعقول دلیل نہیں تھی لیکن زیادہ تر خیال، جس کا میں بھی حامی تھا، یہ تھا کہ ختنہ ایک ثقافتی رسم ہے جس کا نہ صرف صحت بخش فائدہ ہوتا ہے بلکہ اس کے اہم نفسیاتی اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی رسم تھی جس سے اجتماعی تشخص مضبوط ہوتا تھا اور مثبت قدروں کو بھی تقویت پہنچتی تھی۔

یہ بحث برسوں چلی اور بہت سے لوگوں نے براہ راست طریقے سے ختنے کے

حق میں رائے دی۔ ہسپتال میں کام کرنے والے ایک قیدی نے' جو پہلے ایک انگ سیبی (ingcibi) کے طور پر کام کر چکا تھا' ایک خفیہ ختنہ سکول قائم کر لیا اور ہمارے سیکشن کے بہت سے نوجوان قیدیوں کا وہاں ختنہ کیا گیا۔ ختنے کے بعد ہم ان افراد کیلئے چائے اور بسکٹوں کی ایک چھوٹی سی ضیافت ترتیب دیتے اور وہ ایک دو روز ادھر ادھر کمبل لپیٹے چلتے جیسا کہ رواج تھا۔

کیا افریقہ میں شیر ہوتے ہیں؟

ایک موضوع جس کی طرف ہم بار بار پلٹتے' یہ تھا کہ کیا افریقہ میں شیر (Tiger) ہوتے ہیں۔ بعض ساتھی کہتے کہ اگرچہ عام طور پر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ افریقہ میں شیر رہتے ہیں لیکن یہ ایک افسانوی بات ہے اور یہ کہ شیر ایشیا اور برصغیر ہی میں رہتے ہیں۔ افریقہ میں ببر شیر اور چیتے تو بکثرت تھے مگر شیر نہیں تھے۔ دوسرا فریق یہ کہتا کہ شیر افریقہ کے جانور ہیں اور بعض اب بھی یہاں رہتے ہیں۔ بعض کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے افریقہ کے جنگلوں میں یہ سب سے طاقتور اور سب سے خوبصورت درندہ دیکھا ہے۔

میرا کہنا تھا کہ اگرچہ ہم عصر افریقہ میں شیر نہیں پائے جاتے' ژہوسا زبان میں شیر کے لیے ایک لفظ موجود ہے اور اگر ہماری زبان میں اس درندے کے لیے لفظ موجود ہے تو وہ کسی زمانے میں افریقہ میں ضرور موجود ہو گا۔ بصورت دیگر ہماری زبان میں اس کا نام کیوں ہوتا؟ میری یہ دلیل بار بار زیر بحث آتی رہی۔ مجھے یاد ہے کہ اس پر میک نے برملا کہا تھا کہ سینکڑوں برس پہلے ہندی زبان میں کھٹولے کا لفظ تھا جو ہوا میں اڑتا تھا اور یہ ہوائی جہاز کی ایجاد سے بہت پہلے کی بات ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ قدیم ہندوستان میں ہوائی جہاز ہوتے تھے۔

اور وزیر اعظم مر گیا

"زیتھولیلی"' یعنی "خاموش آدمی"...... ہم اس متحمل مزاج اور اکل کھرے

وارڈرکواس نام سے پکارتے تھے جو کان میں ہمارا انچارج تھا..... وہ روٹین میں ہم سے خاصے فاصلے پر کھڑا ہوتا جبکہ ہم کام کرتے اوراس وقت تک پروانہیں کرتا تھا کہ ہم کیا کرتے تھے جب تک ہم نظم وضبط سیر ہتے۔ وہ ہمیں کدالوں پر جھکے باتیں پاتا تو کبھی زجرو توبیخ نہ کرتا۔ ہم بھی جواب میں اس کا احترام کرتے۔ 1966ء میں ایک دن اس نے ہمارے پاس آ کر کہا ''جنٹل مین! بارشوں نے سڑکوں پر چونے کے نشان مٹا دیئے ہیں۔ ہمیں بیس کلو چونا روزانہ چاہیے۔ کیا تم مدد کر سکتے ہو؟'' اگرچہ ہم ان دنوں بہت کم کام کر رہے تھے' اس نے ہم سے شرافت سے بات کی تھی لہذا ہم اس سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

اس بہار میں ہم نے حکام کی طرف سے کچھ برف پگھلتے دیکھی تھی۔ اس آہنی نظم وضبط میں قدرے نرمی آئی تھی جو اس سے پہلے جزیرے پر مسلط تھا۔ یوں قیدیوں اور وارڈروں کے مابین تناؤ قدرے کم ہو گیا تھا۔

لیکن یہ جھلک بہت مختصر ثابت ہوئی اور ستمبر کی ایک صبح یکا یک ختم ہو گئی۔ ہم نے کان کے ساتھ گینتیاں اور کدال رکھے ہی تھے اور لنچ کے لیے شیڈ کی طرف جا رہے تھے۔ جب عام قیدیوں میں سے ایک شخص کھانے کا ڈرم ہمارے پاس دھکیل کر لایا تو اس نے سرگوشی کی ''ورووَرڈ مر گیا ہے!'' اتنی سی خبر تھی' جلد ہی ہم سب میں پھیل گئی۔ ہم نے بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور وارڈروں کی طرف نگاہ اٹھائی جو بظاہر بے خبر تھے کہ کوئی انہونی بات ہوئی ہے۔

قاتل کا غصہ قیدیوں پر

ہم نہیں جانتے تھے کہ وزیراعظم کیسے فوت ہوا۔ بعد میں ہم نے سفید فام پارلیمانی قاصد کے بارے میں اڑتی اڑتی خبر سنی کہ اس نے وزیراعظم ورووَرڈ کو خنجر مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ ہمیں اس کے اس اقدام پر حیرت ہوئی۔ اگرچہ ورووَرڈ کا خیال تھا کہ افریقی باشندے جانوروں سے بھی کم تر ہیں' اس کی موت پر ہمیں کوئی

خوشی نہ ہوئی ۔ سیاسی قتل ایسی چیز نہیں جس کی میں نے یا اے این سی نے کبھی حمایت کی ہو۔ یہ اپنے مخالف سے جھگڑا چکانے کا قدیم طریقہ ہے۔

وروورڈ وسیع تر نسلی امتیاز کا بہت بڑا نظریہ ساز اور استاد معمار تھا۔ اس نے بنتو ستان اور بنتو تعلیم کو متعارف کرایا تھا۔ اپنی موت سے کچھ اس نے 1966ء کے عام انتخابات میں نیشنلسٹوں کی قیادت کی تھی جن میں نسلی امتیاز کی علمبردار پارٹی کی اکثریت میں اضافہ ہوا گیا تھا اور اسے 126 نشستیں ملی تھیں جبکہ یونائیٹڈ پارٹی کو 39 نشستیں اور پروگریسو پارٹی کو ایک نشست ملی تھی۔

جیسا کہ جزیرے پر اکثر ہوتا تھا ہم نے یہ اہم سیاسی خبر اپنے محافظوں سے پہلے سن لی تھی۔ لیکن اگلے دن یہ واضح ہوگیا کہ وارڈر بھی جان گئے ہیں کیونکہ وہ ہم پر یوں غصہ اتارنے لگے تھے جیسے وہ خنجر ہم نے تھام رکھا تھا جو وروورڈ کے سینے میں اترا تھا۔

حکام ہمیشہ خیال کرتے تھے کہ ہم نے تمام قسم کی بیرونی طاقتوں سے خفیہ رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ نمیبیا میں جنوب مغربی افریقی عوامی تنظیم SWAPO نے جو اے این سی کی اتحادی تھی، جنوبی افریقی پولیس کے خلاف پے بہ پے کامیاب حملے کیے تھے اور اس سے حکومت بہت پریشان تھی۔ میرا خیال ہے کہ ہماری تعریف کی جانی چاہیے تھی کہ حکومت ہماری نوخیز عسکری صلاحیت کو اتنی کافی جدید سمجھتی تھی جو ان کے سربراہ مملکت کو کامیابی سے اگلے جہان بھیج سکتی تھی۔ لیکن حکام کے شکوک وشبہات صرف تنگ نظر گورے افراد کے غیر محفوظ ہونے کی عکاسی کرتے تھے جو اپنی مشکلات کا الزام اپنی برخود غلط پالیسیوں پر نہیں دھرتے تھے بلکہ وہ اے این سی نام کے مخالف فریق کو ذمہ ٹھہراتے تھے۔

ہمارے خلاف تعزیری اقدامات کبھی سرکاری پالیسی کے طور پر نہیں کیے جاتے تھے بلکہ یہ سخت ناسازگار فضا کی تجدید تھی جو جزیرے پر ہماری آمد کے وقت چھائی

ہوئی تھی۔ ''خاموش آدمی'' کی جگہ ایک ایسا شخص آ گیا تھا جو بدنہاد اور سخت گیر تھا۔ اس کا نام رینس برگ تھا اور اسے وزیر اعظم کے قتل کے بعد چوبیس گھنٹے کے ذنوٹس پر طیارے میں جزیرے پر بھیجا گیا تھا۔ اس کی شہرت اس سے پہلے پہنچ گئی تھی کیونکہ قیدیوں میں اس کا نام وحشت کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔

وان رینس برگ ایک بڑا ابھدا اور وحشی آدمی تھا جو بولتا نہیں تھا بلکہ پکارتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی کے پہلے دن ہم نے مشاہدہ کیا کہ اس کی کلائی پر سواستیکا کندہ ہے لیکن اسے اپنا ظلم و جبر ثابت کرنے کے لیے اس اشتعال انگیز علامت کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا کام ہماری زندگیوں کو اتنا تلخ بنانا تھا جتنا کہ ممکن تھا اور وہ بڑے جوش و خروش سے اس مقصد پر عمل پیرا تھا۔

انتظامی عدالت میں پیشی

اگلے چند مہینوں کے دوران ہر روز وان رینس برگ ہم میں سے کسی ایک کو نافرمانی یا بہانہ سازی کا مجرم ٹھہراتا۔ ہر صبح وہ اور دوسرے وارڈر آپس میں طے کرتے کہ اس سہ پہر کس کو ملزم ٹھہرایا جائے۔ یہ چیدہ چیدہ افراد کو ڈرانے دھمکانے کی پالیسی تھی اور کسی قیدی کو ملزم ٹھہرانے کا فیصلہ اس امر سے صرف نظر کر کے کیا جاتا تھا کہ اس نے اس روز کتنا کام کیا تھا۔ جب ہم اپنی کوٹھڑیوں کی طرف واپس لڑکھڑاتے ہوئے آ رہے ہوتے تو وان رینس برگ ایک فہرست سے نام پڑھتا: ''منڈیلا (یا سیسولویا کاتھرادا) میں تم سے جلد جیل کے سربراہ کی موجودگی میں ملنا چاہتا ہوں۔''

جزیرے کی انتظامی عدالت اوور ٹائم کام کرنے لگی تھی۔ اس کے جواب میں ہم نے اپنی قانونی کمیٹی قائم کر لی جس میں خود میں' فکائل بام اور میک مہارج شامل تھے۔ میک نے قانون کا مطالعہ کیا تھا اور وہ حکام کو دفاعی لائن پر کھڑے کرنے میں طاق تھا۔ ''فکس'' (Fikile) جو لاء ڈگری حاصل کرنے کے لیے محنت کر رہا تھا' ایک طباع شخص تھا جو ہمارے سیکشن میں پرزنرز کمیٹی کا سربراہ بن گیا تھا۔ ہماری

قانونی کمیٹی کا کام یہ تھا کہ ساتھیوں کو مشورہ دے کر وہ جزیرے کی انتظامی عدالت میں کیا رویہ اختیار کریں۔

وان رینس برگ چالا آدمی نہیں تھا۔ اگرچہ وہ کان میں ہمارا آقا اور نگران تھا مگر ہم اسے عدالت میں زچ کر سکتے تھے۔ ہماری اسٹراٹیجی یہ تھی کہ عدالت کے باہر اس سے بحث و تکرار نہ کی جائے بلکہ عدالت میں الزامات کا سامنا کیا جائے جہاں ہم قدرے زیادہ روشن فکر افسروں کے سامنے اپنا کیس پیش کر سکیں گے۔ انتظامی عدالت میں پریذائڈنگ مجسٹریٹ الزامات پڑھ کر سناتا تھا۔ وہ پڑھتا: ''کان میں بیمار ہونے کا بہانہ۔'' اور اس پر رینس برگ متبسم نظر آتا۔ جب الزام پورا پڑھا جاتا تو میں ہمیشہ اپنے ساتھیوں کو ایک ہی مشورہ دیتا کہ عدالت سے ''مزید تفصیلات'' طلب کی جائیں۔ بطور مدعا علیہ یہ قیدی کا حق تھا۔ اگرچہ تفصیلات منگوانے کی درخواست بار بار کی جاتی تھیں مگر رینس برگ ہمیشہ چکرا جاتا۔ تب کورٹ ملتوی ہو جاتی جبکہ وان رینس برگ ''مزید تفصیلات'' جمع کرنے چلا جاتا۔

''سوٹ کیس'' کی موٹی گردن

وان رینس برگ ہر طرح سے ایک منتقم مزاج شخص تھا۔ کان میں جب ہمارا دوپہر کا کھانا آتا اور ہم کھانے کے لیے بیٹھ جاتے ...... کہ اب ہمیں ایک سادہ لکڑی کی میز دی گئی تھی ...... اسی لمحے وہ ہمارے کھانے کے نزدیک آ کر پیشاب کر دیتا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس کا ممنون ہونا چاہیے تھا کہ وہ براہ راست کھانے کے اوپر پیشاب نہیں کرتا تھا لیکن ہم نے بہر حال اس کی اس حرکت کے خلاف احتجاج کیا۔

قیدی جن طریقوں سے کسی وارڈر سے انتقام لے سکتے ہیں' ان میں سے ایک طنز و مزاح ہے' چنانچہ وان رینس برگ ہمارے طرح طرح کے مذاق کا نشانہ بن گیا۔ ہم اپنے طور پر اسے ''سوٹ کیس'' کہتے تھے۔ وارڈروں کے لنچ باکسز کو ''سوٹ کیس'' کہا جاتا تھا۔ عموماً وارڈر اپنے کسی پسندیدہ قیدی سے کہتا کہ اس کا ''

سوٹ کیس'' اٹھا کر لے چلے اور پھر انعام میں اسے نصف سینڈوچ دیتا تھا۔ لیکن ہم ہمیشہ رینس برگ کا ''سوٹ کیس'' اٹھانے سے انکار کر دیتے' اس طرح اس کا یہ نام پڑ گیا۔ ایک وارڈر کے لیے یہ رسوا کن بات تھی کہ وہ اپنا لنچ باکس خود اٹھا کر لے جائے۔

ایک روز ولٹن امکوائی نے بے خبری میں ''سوٹ کیس'' کا نام لیا جسے رینس برگ نے سن لیا۔ ''سوٹ کیس کون ہے؟'' رینس برگ ڈکرایا۔ ولٹن نے ایک لمحہ وقفہ کیا اور پھر برملا کہا: ''یہ تم ہو!''

''تم مجھے سوٹ کیس کیوں کہتے ہو؟'' رینس برگ نے پوچھا۔ ولٹن نے توقف کیا تو وہ بولا: ''جوان! کہونا۔'' ولٹن نے آزمائشی طور پر جواب دیا: ''کیونکہ تم اپنا سوٹ کیس خود اٹھاتے ہو۔ عام قیدی اپنے وارڈروں کے سوٹ کیس اٹھاتے ہیں جبکہ ہم تمہارا سوٹ کیس نہیں اٹھاتے' اس لیے ہم تمہیں سوٹ کیس کہہ کر پکارتے ہیں۔''

وان رینس برگ نے برا ماننے کے بجائے ایک لمحے کے لیے اس پر غور کیا اور پھر بولا: ''میرا نام سوٹ کیس نہیں' میرا نام ڈک نیک (Dik nek) ہے۔'' چند لمحے خاموشی رہی اور پھر ہم سب ہنسنے لگے۔ افریکان زبان میں ڈک نیک کا مطلب ہے ''موٹی گردن'' اور یہ اصطلاح اس شخص کے لیے استعمال ہوتی ہے جو ضدی اور ہار نہ ماننے والا ہو۔ میرا خیال ہے کہ سوٹ کیس کا دماغ اتنا موٹا تھا کہ وہ سمجھ نہ سکا کہ اس کی توہین کی گئی ہے۔

شیروں نے ہتھکڑی لگوادی

ایک دن کان پر ہم نے پھر بحث چھیڑ دی کہ کیا شیر (Tiger) افریقہ کا جانور ہے۔ وان رینس برگ کی موجودگی میں ہم اس طرح آزادانہ باتیں نہیں کر سکتے تھے جس طرح پہلے کرتے تھے لیکن کام کرتے ہوئے ہم بے معنی موضوعات زیر بحث لا

سکتے تھے۔

جو لوگ یہ کہتے تھے کہ ٹائیگر افریقہ کا جانور نہیں' ان میں پیش پیش اینڈر یو ماسوندو تھا۔ وہ کیپ ٹاؤن سے ایک اے این سی لیڈر تھا جو فورٹ ہیئر میں لیکچرز بھی رہ چکا تھا۔ ماسوندو مشتعل ہو جانے والا شخص تھا اور وہ اپنے اس نظریئے پر جما ہوا تھا کہ افریقہ میں کبھی کوئی شیر نہیں پائے گئے۔ بحث آگے پیچھے چل رہی تھی اور ساتھیوں نے بحث کی گرما گرمی میں گینتیاں اور کدالیں نیچے رکھ دی تھیں۔ اس پر وارڈروں کی توجہ ادھر مبذول ہوگئی اور وہ پکارنے لگے کہ ہم کام پر توجہ دیں لیکن ہم نے ان کی چیخ پکار پر کان نہ دھرے۔ آخر کار سوٹ کیس آگے آیا اور انگریزی میں ڈکرایا......اس زبان میں اسے مہارت نہیں تھی۔

You Talk too much, but you work few!

(تم باتیں بہت زیادہ کرتے ہو لیکن کام بہت تھوڑا کرتے ہو!)

اس پر قیدیوں نے اپنے اوزار نہ اٹھائے کیونکہ وہ ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے۔ سوٹ کیس کی گرامر کی غلطی ہر ایک کے لیے انتہائی مضحکہ خیز تھی۔ لیکن سوٹ کیس ہرگز محظوظ نہ ہوا۔ اس نے فوراً میجر کیلرمین کو بلا بھیجا جو کمانڈنگ آفیسر تھے۔

کیلرمین چند منٹ بعد موقع پر آن پہنچا۔ اس وقت بھی ہم کم و بیش اسی کیفیت میں تھے جیسے پہلے تھے۔ وہ جزیرے پر نیا نیا آیا تھا اور اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ معاملات سدھار کر رہے گا۔ اس وقت ایک وارڈر نے کیلرمین سے کہا کہ اینڈریو ماسوندو اور نیلسن منڈیلا کام نہیں کر رہے تھے اور ان پر بہانہ سازی اور نافرمانی کا الزام عائد ہوتا ہے' چنانچہ کیلرمین کے حکم پر ہمیں ہتھکڑیاں لگا کر قیدِ تنہائی میں ڈال دیا گیا۔

سوٹ کیس کا جھوٹ پکڑا گیا

اس وقت سے سوٹ کیس میرے خلاف خاص عناد رکھنے لگا۔ ایک دن جب وہ

ہماری نگرانی کر رہا تھا‘ میں فکائل بام کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ ہم از خود کان کے انتہائی سرے پر تھے۔ ہم محنت سے کام کر رہے تھے مگر چونکہ ان دنوں ہم دونوں قانون کا مطالعہ کر رہے تھے‘ ہم اس آن ان نکات پر بحث کر رہے تھے جو ہم نے پچھلی رات پڑھے تھے۔ دن ختم ہونے کو آیا تو رینس برگ ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا اور بولا: ”فکائل بام اور نیلسن منڈیلا! میں تم سے جیل کے سربراہ کے سامنے ملنا چاہتا ہوں۔“

ہمیں جیل کے سربراہ لیفٹیننٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں وان رینس برگ نے اعلان کیا۔ ”ان دونوں نے سارا دن کام نہیں کیا۔ میں انہیں احکام کی خلاف ورزی کا ملزم ٹھہراتا ہوں۔“ لیفٹیننٹ نے پوچھا کہ کیا ہمیں کچھ کہنا ہے۔ میں نے جواب دیا: ”لیفٹیننٹ! ہم اس الزام کی تردید کرتے ہیں‘ ہم کام کرتے رہے ہیں اور ہمارے پاس کام کرتے رہنے کی گواہی موجود ہے جو ہماری صفائی کے لیے ضروری ہے۔“ لیفٹیننٹ اس پر غرایا۔ ”تم لوگ ایک ہی جگہ کام کرتے ہو‘ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہارے پاس گواہی موجود ہو؟“ میں نے وضاحت کی کہ فکس اور میں دوسروں سے الگ کام کرتے رہے ہیں اور ہم دکھا سکتے ہیں کہ ہم نے کتنا کام کیا ہے۔ سوٹ کیس نے اپنی سادہ لوحی میں تصدیق کی کہ یہ دونوں دوسروں سے الگ کام کرتے رہے ہیں۔ اس پر لیفٹیننٹ نے موقع دیکھنا چاہا۔ چنانچہ سب گاڑی میں وہاں آن پہنچے۔

کان میں پہنچ کر فکس اور میں انہیں اس طرف لے گئے جہاں ہم کام کرتے رہے تھے۔ میں نے پتھر اور چونکے کے خاصے بڑے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا جو ہم نے کھود کر لگایا تھا۔ میں نے کہا: ”یہ ہے ہمارا آج کا کام!“ سوٹ کیس نے کبھی ہمارے کام پر نگاہ ڈالنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی‘ لہٰذا وہ کام کی مقدار دیکھ کر چکرا گیا۔ اس نے لیفٹیننٹ سے کہا: ”نہیں‘ یہ ایک ہفتے کے کام کا نتیجہ ہے۔“ لیفٹیننٹ کو اس

کی بات پر یقین نہ آیا۔ اس نے سوٹ کیس سے کہا: ''ٹھیک ہے' پھر وہ چھوٹا ڈھیر مجھے دکھاؤ جو منڈیلا اور ربام نے آج لگایا ہے۔'' سوٹ کیس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس پر لیفٹیننٹ نے ایک ایسا کام کای جو میں نے کسی اعلیٰ افسر کو کرتے ہوئے شاذو نادر ہی دیکھا ہے۔ اس نے قیدیوں کی موجودگی میں اپنے ماتحت کو ڈانٹ ڈپٹ کی اور کہا: ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' پھر ہم پر لگائے گئے الزامات وہیں مسترد کر دیئے۔

باتیں کرنا بھی جرم ٹھہرا

اوائل 1967ء کی ایک شام' سوٹ کیس کی نگرانی کے دوران' ہم کان پر جانے کی تیاری کر رہے تھے جب سوٹ کیس نے ہمیں اطلاع دی کہ میجر کیلرمین کا حکم آیا ہے جس کی رو سے تم لوگوں پر باتیں نہ کرنے کی پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ باتیں نہ کرنے کی بندش کام پر جاتے ہوئے راستے میں اور کان پر کام کے دوران دونوں صورتوں میں لاگو ہوتی تھی۔ ''اب کے بعد سے خاموشی رہے۔'' سوٹ کیس نے انتباہ کیا۔

اس حکم کو ہم نے بڑی نفرت اور ناپسندیدگی سے لیا۔ باتیں اور بحث' یہ دو امور ہی تو تھے جو کان پر کام کو قابل برداشت بناتے تھے۔ یقیناً ہم یہ مسئلہ کان کے راستے میں زیر بحث نہیں لا سکتے تھے کیونکہ ہمیں گفتگو نہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن لنچ کے وقفے کے دوران اے این سی لیڈر شپ اور دوسرے سیاسی گروہوں کے سربراہوں نے خفیہ طور پر ایک منصوبہ تیار کرنے کا اہتمام کر لیا۔

جب ہم خفیہ خفیہ اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کی تیاری کر رہے تھے' میجر کیلرمین ایک روز خود نمودار ہوا اور سیدھا ہمارے لنچ شیڈ میں چلا آیا۔ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی۔ اتنے اعلیٰ رتبے کا کوئی افسر کبھی ہمارے معمولی شیڈ میں نہیں آیا تھا۔ اس نے پریشانی میں کھانستے ہوئے اعلان کیا کہ اس کا حکم ایک غلطی تھا اور یہ کہ

ہم کان پر کام کرتے ہوئے باتیں کر سکتے تھے بشرطیکہ خاموشی سے کی جائیں۔ پھر اس نے کہا کہ ہم اپنا کام جاری رکھیں۔ یہ کہہ کر وہ مڑا اور وہ یہ جا وہ جا۔

دن کے بقیہ حصے میں ہمیں بہت محنت سے کام کرنے پر مجبور نہ کیا گیا۔ سوٹ کیس نے دوستانہ رویہ اپنانے کی پوری پوری کوشش کی۔ اس نے کہا کہ خیر خواہی کے جذبے سے اس نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمارے خلاف مجوزہ تمام الزامات واپس لے لیے جائیں۔ اس سہ پہر میں نے دیکھا کہ راہداری کے داخلے کے قریب نمبر 4 کے بجائے میری کوٹھڑی اب نمبر 18 ہوگئی ہے جو عقب میں تھی۔ میری ساری اشیاء نئی کوٹھڑی میں ڈال دی گئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس اقدام کی کوئی وضاحت نہ کی گئی۔

مسز سوزمین کی آمد اور سوٹ کیس کا تبادلہ

ہم نے اندازہ لگایا کہ کوئی ہم سے ملنے آ رہا تھا اور مجھے اس لیے پیچھے لے جایا گیا تھا کہ حکام نہیں چاہتے تھے کہ جو کوئی بھی آ رہا تھا اس سے گفتگو کرنے میں' میں پہل کروں۔ اگر ہر قیدی اپنی باری پر شکایات پیش کرتا تو ملاقاتی کے کوٹھڑی نمبر 18 تک پہنچنے سے پہلے حکام یہ کہہ سکتے تھے کہ ''وقت ختم ہوگیا!'' ہم نے اتحاد کے مقصد سے یہ طے کیا کہ راہداری میں ہر قیدی آنے والے مہمان سے کہے گا کہ اگرچہ میری انفرادی شکایات بھی ہیں مگر ہم سب کی طرف سے کوٹھڑی نمبر 18 کا قیدی بات کرے گا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد سوٹ کیس نے ہمیں اطلاع دی کہ آج ہم کان پر نہیں جا رہے۔ تب میجر کیلر مین نے نمودار ہو کر یہ کہا کہ کچھ دیر بعد مسز ہیلن سوزمین آ رہی ہیں جو لبرل پروگریسو پارٹی کی واحد رکن پارلیمان اور نیشنلسٹوں کے خلاف واحد پارلیمانی آواز تھیں۔ پندرہ منٹ کے اندر مسز سوزمین' جو قامت میں پانچ فٹ دو انچ تھیں' جنرل سٹائن کمشنر جیل خانہ جات کی معیت میں ہماری راہداری کے دروازے سے اندر داخل ہوئیں۔ جب ہر قیدی سے ان کا تعارف کرایا جا رہا تھا تو وہ

ہر ایک سے پوچھتی تھیں کیا اسے کوئی شکایت تو نہیں۔ ہر قیدی ایک ہی جواب دیتا: ''مجھے کئی شکایات ہیں لیکن ہمارا ترجمان راہداری کے سرے پر نیلسن منڈیلا ہے۔''

جنرل سٹائن کی ناپسندیدگی کے علی الرغم مسز سوزمین جلد ہی میری کوٹھڑی پر پہنچیں۔ اس نے مضبوطی سے مجھ سے مصافحہ کیا اور بڑی الفت سے اپنا تعارف کرایا۔

ججوں اور مجسٹریٹوں کے برعکس جو از خود جیلوں میں آ سکتے تھے' ارکان پارلیمنٹ کو کسی جیل کے دورے کے لیے اجازت لینی پڑتی تھی۔ مسز سوزمین اگر واحد نہیں تو ان چند ارکان پارلیمان میں شامل ضرور تھیں جو سیاسی قیدیوں کے ابتلا میں دلچسپی لیتے تھے۔ جزیرہ روبن کے متعلق کئی کہانیاں گردش میں تھیں' لہذا مسز سوزمین خود تفتیش کرنے آئی تھیں۔

چونکہ جزیرہ روبن پر مسز سوزمین کی یہ پہلی آمد تھی' میں نے انہیں مشکل میں نہ ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بڑی پر اعتماد اور اپنے ماحول سے نہ دبنے والی تھیں' لہذا انہوں نے کہا کہ ہمیں کام کی بات ابھی کر لینی چاہیے۔ جنرل سٹائن اور کمانڈنگ افسران کے پہلو میں کھڑے تھے' اس کے باوجود میں نے کھری کھری بات کہہ دی۔ میں نے انہیں اپنی یہ خواہش بتائی کہ ہماری خوراک بہتر اور دوسروں کے مساوی کی جائے اور ہمیں بہتر کپڑے دیئے جائیں۔ میں نے مطالعے کی سہولتوں کی ضرورت' اطلاعات مثلاً اخبارات تک رسائی کے حق سے محرومی اور کئی اور باتوں سے انہیں آگاہ کیا۔ میں نے وارڈروں بالخصوص وان رینس برگ کی سختی کا ذکر کیا اور انہیں مطلع کیا کہ رینس برگ کے بازو پر سواستیکا کا نشان کندہ ہے۔ ہیلن ایک وکیل کی طرح بولیں: ''اچھا مسٹر منڈیلا! ہمیں اسے زیادہ نہیں لینا چاہیے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ یہ کب ہوا۔ شاید اس کے والدین نے یہ نشان اس کے بازو پر کندہ کیا ہو گا۔'' میں نے انہیں یقین دلایا کہ معاملہ یوں نہیں۔

عموماً میں کسی وارڈر کے متعلق انفرادی شکایت نہیں کیا کرتا تھا۔ جیل میں انسان

سیکھ جاتا ہے کہ انفرادی معاملات کی نسبت عام اصولوں کی خاطر لڑنا بہتر ہے۔ ایک وارڈر خواہ کتنا ہی سنگدل ہو، وہ محض جیل کی پالیسی پر عمل کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن وان رینس برگ اپنی جگہ ایک ادارہ تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ اگر اسے بخش دیا گیا تو ہم سب کو بے پناہ مصائب سہنا پڑیں گے۔

مسز سوزمین توجہ سے مختلی رہیں اور جو کچھ میں نے کہا کہ ایک چھوٹی نوٹ بک میں درج کرتی رہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ان معاملات کو وزیر انصاف کے سامنے اٹھائیں گی۔ پھر انہوں نے ہماری کوٹھڑیوں کا معاینہ کیا اور بعض قیدیوں سے کچھ باتیں کیں۔ اس حوصلہ مند خاتون کا ہماری کوٹھڑیوں میں جھانکنا اور ہمارے احاطے میں ادھر ادھر چلنا ہمارے لیے ایک انوکھا اور حیرت انگیز منظر تھا۔ وہ پہلی اور واحد خاتون تھیں جنہوں نے ہماری کوٹھڑیوں میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔

وان رینس برگ، مسز سوزمین کے معاینے کے دوران انتہائی پریشان تھا۔ کیتھی کے بقول جب وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھیں، رینس برگ نے اپنے تمام پچھلے افعال کی معافی مانگی۔ لیکن اس کی یہ کیفیت زیادہ عرصہ جاری نہ رہی کیونکہ اگلے روز اس نے ہمیں اطلاع دی کہ وہ ہمارے خلاف تمام الزامات دوبارہ عائد کر رہا ہے۔ بعد میں ہمیں علم ہوا کہ مسز سوزمین نے ہمارا معاملہ پارلیمنٹ میں اٹھایا تھا اور اس کے دورے کے چند ہفتے بعد سوٹ کیس کا جزیرے سے تبادلہ کر دیا گیا۔

تحریک آزادی کا اہم سنگ میل

میں نے کبھی یہ خیال نہیں کیا تھا کہ ہماری جدوجہد مختصر یا آسان ہو گی۔ جزیرے پر پہلے چند سال باہر ہماری پارٹی کے لیے اور جیل میں ہمارے لیے بڑے مشکل تھے۔ رائیوونیا کے بعد تحریک کی بیشتر زیر زمین مشینری تباہ ہو چکی تھی۔ ہماری تنظیم کا ڈھانچا دریافت کر کے اکھاڑ دیا گیا تھا۔ جو لوگ گرفتار نہیں کیے گئے تھے وہ دشمن سے ایک قدم آگے رہنے پر مجبور تھے۔ عملاً اے این سی کا ہر سینئر لیڈر یا جیل میں

بند تھا یا جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

رائیوونیا کے بعد کے برسوں میں اے این سی کے بیرونی مشن نے، جو پہلے فنڈ جمع کرنے، ڈپلومیسی اور ایک فوجی تربیتی پروگرام پر عملدرآمد کا ذمے دار تھا، مجموعی طور پر تنظیم کی باگ ڈور سنبھال لی۔ بیرونی مشن کو نہ صرف جلاوطنی میں تنظیم کھڑی کرنی تھیں بلکہ جنوبی افریقہ کے اندر زیر زمین اے این سی کو دوبارہ متحرک کرنے کا زیادہ خطرناک کام بھی انجام دینا تھا۔

حکومت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ پولیس زیادہ طاقتور ہو چکی تھی اور اس کے ہتھکنڈے زیادہ ظالمانہ اور اس کی تیکنیک زیادہ جدید ہو گئی تھی۔ جنوبی افریقی دفاعی فوج پھیل رہی تھی۔ معیشت مستحکم تھی اور سفید فام انتخابی ادارے کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ برطانیہ اور امریکہ میں جنوبی افریقی حکومت کے طاقتور اتحادی موجود تھے جو ''سٹیٹس کو'' یعنی حالت جاری برقرار رکھنے پر تلے ہوئے تھے۔

لیکن ان کے علاوہ ہر کہیں سامراج کیخلاف جدوجہد آگے بڑھ رہی تھی۔ عشرہ 1960ء کے وسط سے اواخر تک پورے جنوبی افریقہ میں آزادی کی جنگیں لڑی جا رہی تھیں۔ نمیبیا (جنوب مغربی افریقہ) میں سواپو، کیپریوی سٹرپ کے اندر پہلی مسلح کارروائیاں کر رہی تھی۔ موزمبیق اور انگولا میں گوریلا تحریک پھیل اور پیش قدمی کر رہی تھی۔ زمبابوے (رہوڈیشیا) میں سفدی فام اقلیتی حکمرانی کے خلاف جنگ میں پیشرفت جاری تھی۔ ایان سمتھ کی گوری حکومت نے جنوبی افریقی فوج کی مدد سے طاقت پکڑلی تھی اور اے این سی زمبابوے میں لڑی جانے والی جنگ کو اپنے وطن کی جنگ خیال کرتی تھی۔ 1967ء میں ہمیں علم ہوا کہ اے این سی نے زمبابوے افریقن پیپلز یونین (زیڈ اے پی یو) کے ساتھ اتحاد قائم کر لیا ہے جسے جوشو نکومو نے تشکیل دیا ہے۔

اس برس ''ایم کے'' کے سپاہیوں کا ایک گروہ جو تنزانیہ اور زمبیا میں تربیت

حاصل کر رہا تھا' دریائے زیمبزی پار کر کے اس ارادے سے رہوڈیشیا میں داخل ہوا تا کہ اپنے وطن جنوبی افریقہ میں قدم رکھ سکے۔ ''ایم کے'' کے سپاہیوں کے اس پہلے گروہ کو لوتھولی دستے کا نام دیا گیا تھا اور وہ مسلح جدوجہد کے پیشرو تھے۔ اگست میں جب لوتھولی دستے نے زیڈ اے پی یو دستوں کی معیت میں جنوب کی طرف پیش قدمی کی تو وہ رہوڈیشیا کی فوج کی نظروں میں آ گئے۔ اگلے چند ہفتوں کے دوران خوفناک لڑائیاں لڑی گئیں اور افریقیین کا جانی نقصان ہوا۔ آخر کار زیادہ تعداد میں ہونے کے باعث رہوڈیشیا کی فوج ہمارے دستوں پر غالب آ گئی۔ بعض گرفتار کر لیے گئے اور باقی بیچوانا لینڈ میں پسپا ہو گئے جواب آزاد بوٹسوانا بن چکا تھا۔ 1968ء کے آغاز تک ایک اور زیادہ بڑا اے این سی دستہ رہوڈیشیا میں داخل ہوا اور اس نے نہ صرف رہوڈیشیا آرمی کے خلاف بلکہ جنوبی افریقی پولیس والوں سے بھی لڑائی کی جو رہوڈیشیا میں تعینات تھے۔

ہم نے کئی ماہ بعد اس واقعے کے متعلق افواہیں سنیں مگر پوری کہانی اس وقت جان سکے جب اس لڑائی میں حصہ لینے والے بعض افراد ہماری جیل میں قید ہو کر آئے۔ اگرچہ ہمارے دستے فتح نہ پا سکے مگر ہم نے خاموشی سے اس حقیقت پر خوشیاں منائیں کہ ہمارے ''ایم کے'' کیڈر اپنی شرائط پر دشمن سے پنجہ آزما ہوئے تھے۔ یہ تحریک آزادی کا اہم سنگ میل تھا۔ ''جسٹس'' پانزا جو لوتھولی دستے کا ایک کمانڈر تھا' بعد میں اسے ہمارے ساتھ قید کیا گیا تو اس نے ہمیں اس دستے کی فوجی تربیت' سیاسی تعلیم اور میدان جنگ میں شجاعت کی داستانیں سنائیں۔ ''ایم کے'' کے سابق کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے مجھے اپنے سپاہیوں پر بے حد فخر تھا۔

چیف لوتھولی کی وفات

''ایم کے'' کی بیرون وطن معرکہ آرائیوں کی خبر موصول ہونے سے پہلے ہمیں جولائی 1967ء میں چیف لوتھولی کی اپنے گھر پر وفات کی خبر ملی تھی۔ ان کی موت

عجیب حالات میں واقع ہوئی تھی۔ انہیں ان کے فارم کے نزدیک ایک ایسے علاقے میں ریل گاڑی نےکچل دیا تھا جہاں وہ اکثر چہل قدمی کیا کرتے تھے۔ مجھے ان کی بیوی کو خط لکھنے کی اجازت دی گئی۔ چیف لوتھولی کی موت نے ہماری پارٹی میں ایک بڑا خلا پیدا کر دیا۔ چیف ایک نوبل انعام یافتہ' بین الاقوامی سطح پر نمایاں اور معروف شخصیت تھے جنہیں کالوں اور گوروں دونوں میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر ان کی وفات ناقابل تلافی تھی' تاہم پارٹی کو آلیور ٹیمبو کی شکل میں' جو اے این سی کا قائمقام پریذیڈنٹ جنرل تھا' چیف کی جگہ لینے والا شخص مل گیا تھا۔ لوتھولی کی طرح وہ منجھا ہوا مگر شوخ نہیں تھا' پُراعتماد مگر منکسر مزاج تھا۔ وہ بھی چیف لوتھولی کے اس نظریئے پر کاربند تھا...... خطرات سے اپنے حوصلے کی صیقل ہونے دو۔

سیکشن بی میں ہم نے چیف کی یاد میں ایک دعائیہ تقریب منعقد کی جس پر ہر اس شخص کو شرکت کی اجازت دی جو کچھ کہنا چاہتا تھا۔ یہ ایک خاموش اور احترام کی حامل تقریب تھی جس کا ایک پہلو تلخ تھا۔ جب معروف یورپین یونٹی موومنٹ کے نیول الیگزینڈر اپنی بات کہنے کے لیے کھڑے ہوئے تو یہ ظاہر تھا کہ وہ چیف کو خراج تحسین ادا کرنے نہیں بلکہ انہیں دفن کرنے آئے تھے۔ چیف کی رحلت پر رسمی تعزیتی جملوں کے بغیر انہوں نے لوتھولی پر الزام لگایا کہ وہ گوروں کے چمچے تھے' ان کے اس الزام کی بڑی وجہ چیف کا نوبل امن انعام قبول کرنا تھا۔ اپنی خردماغی سے قطع نظر نیول کی تقریر تنظیموں کے مابین اس تعاون کے سراسر برعکس تھی جو ہم جزیرے پر پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب سے میں جزیرے پر آیا تھا' میں نے اسے اپنا مشن بنا لیا تھا کہ جہد آزادی میں شامل اپنے حریفوں سے مفاہمانہ رویہ اختیار کروں۔ میں نے جزیرہ روبن پر آ کر پی اے سی اور اے این سی کے درمیان حائل طویل اور شدید اختلاف کو مٹانے کے لیے ہر موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اگرچہ ہم

جزیرے پر ان دونوں تنظیموں کو متحد کر لیتے تو اس سے مجموعی طور پر تحریک آزادی میں ان کے اتحاد کی راہ ہموار ہو سکتی تھی۔

تاہم شروع ہی سے پی اے سی کے ساتھ ہمارے تعلقات پر مبنی ہونے سے زیادہ مقابلے پر استوار تھے۔ پی اے سی کے بعض افراد پہلے ہی جزیرے پر تھے اور انہوں نے ہماری آمد کو اپنے علاقے میں مداخلت کے مترادف جانا تھا۔ ہمیں اپنے آدمیوں سے معلوم ہوا کہ پی اے سی کے اکثر سینئر افراد نے اس امر پر اظہار افسوس کیا تھا کہ ہمیں پھانسی نہیں دی گئی۔

پی اے سی کی مضحکہ خیزی

1962ء میں جزیرے پر میرے قیام کے پہلے دن پی اے سی کو اے این سی پر خاصی مددی برتری حاصل تھی۔ 1967ء میں عددی برتری کا معاملہ الٹ ہو گیا تاہم یوں لگتا تھا کہ پی اے سی والے اپنے موقف میں سخت تر ہو گئے تھے۔ وہ ڈھٹائی کی حد تک کمیونسٹ دشمن اور ہندوستانی دشمن تھے۔ ابتدائی برسوں میں میری ریف موتھوپونگ سے بات چیت رہی تھی جو پی اے سی کی نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن تھے۔ ریف کا کہنا تھا کہ پی اے سی، اے این سی سے زیادہ جنگجو تھی اور یہ کہ جزیرے پر اے این سی کو پی اے سی کی پیروی کرنی چاہیے۔ پی اے سی کا موقف تھا کہ حکام سے مذاکرات غداری کے مترادف تھے۔ لیکن مذاکرات سے حاصل ہونے والے فوائد سے استعفادہ کرنے میں انہیں کوئی عار نہ تھی۔ 1967ء میں، میں نے سلبی انگن ڈین سے اتحاد کے سوال پر بات چیت کی۔ جیل کیا ہر انگن ڈین منشور آزادی کا شدید مخالف تھا مگر جیل میں وہ، بالخصوص جب اسے ہمارے سیکشن میں بھیجا گیا، نرم پڑ گیا تھا۔ آخر کار ہم نے جنرل سیکشن میں اپنی اپنی تنظیموں کو خط لکھ کر اتحاد کے نظریئے کی وکالت کی۔ اے این سی کے قیدی کلیرنس ماکویتو کے ساتھ بھی مفاہمانہ رابطہ استوار کیے ہوئے تھے جو بعد میں پی اے سی کے صدر بنے۔ ماکو

یتو جو کبھی اے این سی یوتھ لیگ کا رکن تھا' ہمارے سیکشن میں تھا۔ وہ ایک متوازن اور باشعور آدمی تھا۔ ہم نے اپنی دونوں تنظیموں کے مابین اتحاد کے لیے کئی مرتبہ ار آور مذاکرات کیے تھے لیکن جب ما کو یتو رہا ہو گیا اور جزیرے پر پی اے سی کی قیادت جون بوکیلا کے ہاتھ آئی تو بات چیت منقطع ہو گئی۔

پی اے سی کی کمزوری بعض اوقات مضحکہ خیز صورتحال کو جنم دیتی تھی۔ ایک مرحلے میں پریٹوریا سے حکم آیا کہ کان پر مجھے باقی تمام قیدیوں سے الگ رکھا جائے۔ مجھے الگ کام کرنا اور الگ کھانا کھانا تھا اور میرے گارڈ بھی الگ تھے۔ ہم نے مشاہدہ کیا کہ اس نئے حکم نے پی اے سی میں ہلچل پیدا کر دی۔ کئی روز بعد پی اے سی نے فیصلہ کیا کہ ان کے لیڈر زموتھوپنگ کو بھی الگ رکھا جائے' چنانچہ ان کی کاوش سے اسے الگ کام دیا گیا اور الگ کھانا کھلایا گیا جب تک میں الگ کام کرتا اور الگ کھاتا رہا۔

پی اے سی اکثر ان میٹنگز میں شرکت سے انکار کر دیتی جن میں پارٹی کی وابستگی کا کھلا اظہار نہ ہوتا۔ جب ہم اپنی مشکلات پر غور کرنے کے لیے میٹنگ بلاتے اور بعد میں جب ہم اخبار پڑھنے لگے تو خبروں پر اظہار خیال کے لیے خبری نشست جمنے لگی تو پی اے سی ان اجلاسوں کا بائیکاٹ کرتی تھی۔ میں نے ان کے اس رویئے کو تکلیف دہ پایا۔ ہم سمجھتے تھے کہ پی اے سی والے اپنی تنظیم میں جزیرے سے باہر ہونے والی تبدیلیوں سے بھی بے خبر تھے۔ اس وقت جزیرے پر پی اے سی کے افراد نے ہمارے اس دعوے پر یقین کرنے سے انکار کر دیا کہ پی اے سی کی جلاوطن قیادت نے اپنے رکنیت کے دروازے گوروں اور ہندوستانیوں کے لیے بھی کھول دیئے ہیں۔ یہ منافقت تھی۔ اگرچہ ہم نے اخبار میں پڑھا تھا کہ سفید فام سرگرم سیاستدان پیٹرک ڈنکین پی اے سی کی ایگزیکٹو کا رکن بن گیا' پی اے سی کے ارکان نے اسے اے این سی کا پروپیگنڈا سمجھ کر نفرت سے رد کر دیا۔

ہائی آرگن کے چند راز

اے این سی نے جزیرہ روبن پر اپنی داخلی تنظیم تشکیل دی تھی جسے ہائی کمان یا زیادہ تر سرکاری طور پر ہائی آرگن کہا جاتا تھا۔ یہ جزیرے پر قید بیشتر سینئر اے این سی لیڈروں پر مشتمل تھی، یعنی وہ افراد جو نیشنل ایگزیکٹو کے رکن تھے۔ والٹر سیسولو، گوون امبیکی، ریمونڈ اصلابا اور میں خود۔ میں ہائی آرگن کا سربراہ تھا۔

ہائی آرگن کے آغاز ہی سے ہم نے فیصلہ کیا کہ یہ تنظیم اے این سی کی بیرونی پالیسی پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ ہمارے پاس ملک کی صورتحال کا جائزہ لینے کا کوئی قابل اعتبار ذریعہ نہ تھا، چنانچہ ہم نے طے کیا کہ یہ قرین انصاف ہے نہ عقلمندی کی بات ہے کہ ہم ایسے معاملات میں اپنی پارٹی کی رہنمائی کرنے کی کوشش کریں جن کے متعلق ہم بے خبر تھے۔ اس کیبجائے ہم قیدیوں کی شکایات، ہڑتالوں، ڈاک اور خوراک کے متعلق فیصلے کر سکتے تھے اور یہ سب جیل کی زندگی کے روزمرہ کے معاملات تھے۔ جب کبھی ممکن ہوتا، ہم ایک جنرل ممبر میٹنگ منعقد کرتے جسے ہم اپنی پارٹی کی صحت کے لیے لازم خیال کرتے تھے۔ لیکن جیسا کہ یہ میٹنگیں خطرے سے خالی نہ تھیں اور کبھی کبھار منعقد ہوتی تھیں، اکثر ہائی آرگن ہی فیصلے کرتی جو بعد میں سب ارکان کو پہنچا دیئے جاتے۔ ہائی آرگن ایک سیل سسٹم بھی چلاتی تھی جبکہ ہر سیل تین ارکان پر مشتمل تھا۔

جزیرے پر اپنے پہلے چند برسوں کے دوران ہائی آرگن ہمارے سیکشن میں تمام قیدیوں کے لیے ایک نمائندہ کمیٹی کا کام بھی کرتی تھی۔ 1967ء میں ہم نے بہتر برتاؤ کا مطالبہ کرتے ہوئے ایک درخواست دی جس پر فی الواقع پی اے سی اور یونٹی موومنٹ کے ارکان اور لبرل پارٹی کے نمائندے ایڈی ڈینیلو سمیت سب نے دستخط کیے تھے۔ یہ انتظام سب کے لیے اس وقت تک قابل قبول رہا جب نیول الیگزینڈر نے شکوہ کیا کہ ہائی آرگن نہ جمہوری ہے نہ حقیقی نمائندہ لہذا کوئی اور ادارہ تشکیل دیا

جانا چاہیے۔

نیول کی ابتدائی تجویز نے بعد میں قیدیوں کی کمیٹی کی شکیل اختیار کر لی جو تمام سیاسی جماعتوں کے افراد پر مشتمل تھی۔ دوسری تنظیموں کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ اے این سی اس پر حاوی ہونے کی کوشش کرے گی اور کمیٹی کے اصول اس طرح وضع کیے گئے ہیں کہ اس کے فیصلے خالصتاً مشاورتی نوعیت کے ہوں گے اور ان پر عملدرآمد لازم ہو گا۔ بایں ہمہ مسائل حل کرنے کے لیے کسی مشترکہ اپروچ پر متفق ہونا ہنوز مشکل تھا۔ ہم نے تجویز دی کہ فیکائل بام' جو یو پی چان کلب کا رکن تھا' ان میٹنگز کی صدارت کیا کرے۔ بعد میں کمیٹی کی قیادت باری باری سب کے ہاتھ آئے گی۔ آخر کار یہ کمیٹی الوندی کے نام سے معروف ہوئی اور تمام سیاسی قیدیوں کے لیے نظم و ضبط کمیٹی کے طور پر کام کرنے لگی۔

ہائی آرگن اپنی نسلی ساخت کے باعث بحث و نزاع کا ہدف بنی ہوئی تھی۔ اس کے چاروں مستقل ارکان ژہوسا پس منظر رکھتے تھے۔ یہ پہلو دیدہ دانستہ نہیں بلکہ محض اتفاقیہ تھا۔ جزیرے پر سینئر اے این سی قیادت' یعنی چاروں جو نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن تھے' اتفاق سے ژہوسا قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ مناسب نہیں تھا کہ کسی کم سینئر کامریڈ کو اٹھا کر محض اس لیے ہائی آرگن کا رکن بنا دیا جائے کہ وہ ژہوسا نہیں تھا۔ لیکن یہ حقیقت کہ ہائی آرگن ژہوسا اکثریت پر مشتمل تھی' مجھے پریشان کرتی تھی کیونکہ اس سے اس غلط تصور کو تقویت پہنچتی تھی کہ ہم نے ایک ژہوسا تنظیم بنا رکھی ہے۔

میں نے ہمیشہ اس تنقید کو گمراہ کن اور اے این سی کی تاریخ سے بے خبری اور بد نیتی پر مبنی پایا ہے۔ میں اس کی یوں تردید کرتا ہوں کہ اے این سی کے صدر زولو 'موسوتھو' پیڈی اور ٹسوانا رہے ہیں اور ایگزیکٹو ہمیشہ قبائلی گروہوں کا آمیختہ رہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روشن سہ پہر کو میں اپنے احاطے میں کام کر رہا تھا جبکہ

جنرل سیکشن کے بعض افراد اوپر چھت پر کام کر رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر پکارے: ''امدالا! (بزرگ آدمی!) آپ صرف ژھوسا لوگوں سے کیوں گفتگو کرتے ہیں؟'' اس الزام پر میں ششدر رہ گیا۔ میں نے اوپر دیکھا اور کہا: ''تم مجھے نسلی امتیاز برتنے کا الزام کیونکر دیتے ہو؟ ہم ایک قوم ہیں۔'' وہ اس سے مطمئن لگتے تھے لیکن ان کی یہ سوچ میرے ذہن میں اٹک گئی۔ اسکے بعد سے جب بھی میرے علم میں ہوتا کہ مجھے جنرل سیکشن کے قیدیوں کے آگے چلنا ہوگا' میں کوشش کرتا کہ کیتھی' یا ایڈی ڈینیلز یا کسی اور ایسے شخص سے بات چیت کروں جو ژھوسا نہ ہو۔

آخر کار ہم نے فیصلہ کیا کہ ہائی آرگن کا ایک پانچواں رکن بھی ہونا چاہیے جو بدل بدل کر آئے اور یہ پانچواں رکن عموماً ژھوسا نہیں ہوتا تھا جیسے کیتھی پانچ سال سے زیادہ عرصے تک ہائی آرگن کا رکن رہا۔ لالوچیبا نے بھی کچھ عرصہ کام کیا اور آخر کار ژھوسا غلبے کے حوالے سے کی جانے والی تنقید بتدریج دم توڑ گئی۔

میں کسی طرح بھی ہائی آرگن پر حاوی نہیں تھا اور حقیقت یہ ہے کہ بہت سی تجاویز' جن کا میں زبردست حامی تھا' مسترد کی گئیں۔ ایسا ہونا چاہیے تھے مگر بعض اوقات مجھے اس پر مایوسی ہوتی۔ حکام سے متعلق دو معاملات ایسے تھے جن پر میں اپنے ساتھیوں کو آمادہ نہ کر سکا۔ جیل کے ضابطے کہتے تھے کہ قیدی کو سینئر افسر کے سامنے ضرور کھڑے ہونا چاہیے۔ میں کہتا تھا کہ ہمیں بیٹھے رہنا چاہیے کیونکہ جب دشمن ہمیں سیاسی قیدی تسلیم نہیں کرتا تو دشمن کو احترام کا مستحق خیال کرنا اہانت آمیز ہے۔ میرے ساتھی سمجھتے تھے کہ یہ معمولی بات ہے اور مزاحمت کے منفی نتائج اس کے فوائد سے کہیں زیادہ ہوں گے۔

دوسری بات بھی ہائی آرگن نے ایسی ہی بنیادوں پر مسترد کر دی۔ وارڈر ہمیں ہمارے عرف یا مسیحی ناموں سے پکارتے تھے۔ اور میں سمجھتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک توہین کی نیت سے استعمال کیا جاتا ہے' لہذا ہمیں اصرار کرنا چاہیے کہ ہمیں ''

مسٹر'' کے معزز لقب سے پکارا جائے۔ میں کئی سال اس پر زور دیتا رہا۔ بعد میں میرے ساتھیوں نے اسے طنز و مزاح کا ذریعہ بنالیا اور وہ کبھی کبھی مجھے ''مسٹر منڈیلا'' کہہ کر پکارنے لگے۔

ماں سے جزیرے پر ملاقات

ہم جیل کے مکینوں کے لیے وقت یوں لگتا تھا جیسے ساکن ہو گیا ہو' لیکن وہ باہر والوں کے لیے نہیں رکا تھا۔ یہ احساس اس وقت تازہ ہوا جب موسم بہار 1968ء میں میری ماں مجھ سے ملنے آئی۔ میں نے اسے مقدمہ رائیونیا کے اختتام کے دنوں سے نہیں دیکھا تھا۔ انسانی تبدیلی بتدریج اور اضافی ہوتی ہے اور جب کوئی اپنے خاندان کے مابین رہتا ہو تو اسے ان میں ہونے والی تبدیلیوں کا شاذونادر ہی احساس ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ کئی سال تک مسلسل اپنے خاندان کو دیکھ نہ پائے تو انسانی تبدیلی چونکا دینے والی ہوتی ہے۔ میری ماں اچانک بہت بوڑھی لگتی تھی۔

وہ ٹرانسکائی سے چل کر آئی تھی۔ میرا بیٹا ماکگاتھو' میری بیٹی ماکازیوی اور میری بہن مابل اس کے ساتھ آئے تھے۔ چونکہ میرے ملاقاتی چار تھے اور وہ دور دراز سے آئے تھے' حکام نے ملاقات کا وقت نصف گھنٹے سے بڑھا کر پینتالیس منٹ کر دیا۔

میں نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو آخری بار مقدمہ رائیونیا سے پہلے دیکھا تھا۔ اس دوران وہ بالغ ہو چکے تھے اور ان کی پرورش میرے بغیر ہوئی تھی۔ میں حیرت اور فخر سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔ اگرچہ وہ بڑے ہو چکے تھے مگر میں ان سے ہنوز کم و بیش بچوں کا برتاؤ کرتا تھا کیونکہ وہ اس وقت بچے ہی تھے جب ہم جیل گئے تھے۔ وہ تو بدل گئے تھے مگر میں نہیں بدلا تھا۔

میری والدہ کا وزن بہت کم ہو گیا تھا جس پر مجھے تشویش ہوئی۔ اس کا چہرہ کمزور لگتا تھا۔ صرف میری بہن یوں لگتی تھی جیسے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اگرچہ ان سب سے مل کر خاندانی معاملات پر بات چیت کرنا میرے لیے بڑا مسرت انگیز تھا'

میں اپنی ماں کی صحت کے بارے میں بڑا فکر مند ہوا۔

میں نے ماکاگاتھو اور ماکی سے باتیں کرتے ہوئے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ دونوں سکول کی تعلیم جاری رکھیں۔ مابل سے میں نے ٹرانسکائی میں اپنے عزیزوں کے بارے میں دریافت کیا۔ وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ جیل کی ملاقاتوں کے بارے میں سب سے زیادہ خوشی بعد کی یادوں میں پوشیدہ ہوتی ہے مگر اس مرتبہ مجھے میری والدہ کی صحت کے متعلق پریشانی نے آلیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ یہ والدہ سے آخری ملاقات ہے اور اس کے بعد شاید میں انہیں کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔

کئی ہفتے بعد ایک روز میں کان سے واپس آیا تو مجھے بتایا گیا کہ میں ہیڈ آفس جا کر ایک تار وصول کر لوں۔ یہ تار ماکاگاتھو کی طرف سے تھا جس میں یہ خبر دی گئی تھی کہ میری ماں دل کے دورے سے فوت ہو گئی ہے۔ میں نے فوراً کمانڈنگ آفیسر سے درخواست کی کہ مجھے ٹرانسکائی جا کر اپنی ماں کی تدفین میں شرکت کی اجازت دی جائے۔ اس نے یہ کہہ کر درخواست مسترد کر دی: ''منڈیلا! اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تم قول کے پکے ہو اور فرار ہونے کی کوشش نہیں کرو گے، مگر میں تمہارے لوگوں پر اعتبار نہیں کرتا۔ مجھے خدشہ ہے کہ وہ تمہیں اغوا کرنے کی کوشش کریں گے۔'' یہ جان کر میرا غم دوچند ہو گیا کہ میں اپنے ہاتھوں اپنی ماں کو دفن نہیں کر سکوں گا جو کہ اس کا بڑا بچہ اور واحد بیٹا ہونے کی حیثیت سے میری ذمے داری تھی۔

اگلے چند مہینوں میں، میں والدہ کے بارے میں بار بار سوچتا رہا۔ اس کی زندگی آسائشوں سے بہت دور تھی۔ جب میں بطور وکیل کام کر رہا تھا تو والدہ کو مالی سہارا فراہم کرتا تھا لیکن جب میں جیل آ گیا تو اس کی مدد کرنے کے قابل نہ رہا۔ میں والدہ پر کبھی ویسی توجہ نہ دے سکا جیسی دینی چاہیے تھی۔

ماں کی وفات ایک شخص کے لیے نگاہ واپسیں ڈال کر اپنی زندگی کا جائزہ لینے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ ماں کی مشکلات اور اس کی غربت نے ایک بار پھر یہ سوال

اٹھایا کہ کیا میں نے صحیح راستہ اختیار کیا ہے۔ یہ امر ہمیشہ میرے لیے ایک معمہ تھا کہ کیا میں نے اپنی قوم کے مفادات کو اپنے خاندانی مفادات پر ترجیح دے کر صحیح راہ اپنائی ہے؟ ایک عرصے تک میری والدہ کو جہد آزادی سے میرا لگاؤ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میرے خاندان نے تحریک آزادی میں حصہ لینے کی درخواست کی تھی نہ خواہش کی تھی مگر اس تحریک میں میری شرکت کی قیمت انہیں ادا کرنی پڑ رہی تھی۔

لیکن وہی جواب پھر میرے سامنے آ گیا۔ جنوبی افریقہ میں ایک شخص کے لیے اپنی قوم کی ضروریات کو نظر انداز کرنا مشکل ہے خواہ اس کے خاندان کو اس کی کیسی ہی قیمت ادا کرنی پڑے۔ میں نے اپنا راستہ سوچ سمجھ کر اپنایا تھا اور آخر کار والدہ نے اس انتخاب کی حمایت کی تھی۔ لیکن اس سے میری اس اداسی میں کوئی کمی نہ ہوئی کہ میں اس کی زندگی کو آرام دہ بنانے کے لیے کچھ نہیں کر سکا اور نہ یہ درد کم ہو سکا کہ میں اسے قبر میں لٹانے کی سعادت حاصل نہیں کر سکتا۔

میری بیوی کی گرفتاری

12 مئی 1969ء کو صبح ابتدائی اوقات میں سکیورٹی پولیس آرلینڈو میں ہمارے گھر پہنچی اور ونی کو جگا کر ''1967 دہشت گردی ایکٹ'' کے تحت بغیر الزام کے حراست میں لے لیا۔ یہ ایکٹ حکومت کو مقدمہ چلائے بغیر گرفتار کرنے یا حراست میں لینے کے بے مثال اختیارات دیتا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے گھر پر چھاپہ **ملک گیر** کریک ڈاؤن کا حصہ تھا جس میں درجنوں دوسرے لوگ گرفتار کیے گئے جن میں ونی کی بہن بھی شامل تھی۔ پولیس ونی کو گھسیٹ کر لے گئے جبکہ زینی اور زندزی اس کے اسکرٹ سے چمٹ گئی تھیں۔ اسے پریٹوریا میں قید تنہائی میں رکھا گیا جہاں اسے ضمانت اور ملاقاتوں کی بھی اجازت نہ دی گئی۔ اگلے ہفتوں اور مہینوں کے دوران اس سے سنگدلانہ اور وحشیانہ طور پر تفتیش کی جاتی رہی۔

آخر کار چھ ماہ بعد جب ونی پر الزام عائد کیا گیا' میں نے اسے پیغام بھیجا کہ

جوئل کارلسن کو اپنا وکیل کر لے جو طویل عرصے سے نسلی امتیاز کے خلاف مقدمات لڑ رہے تھے۔ونی اور بائیس دوسرے افراد پر انسداد کمیونزم ایکٹ کے تحت اے این سی کے احیاء کا الزام عائد کیا گیا۔ بعد میں جارج بیزوس اور آرتھر چاسکلسن بھی، جو دونوں رائیو ونیا ٹیم کے رکن تھے،وکلائے صفائی کی ٹیم شامل ہو گئے۔اکتوبر میں اس کی گرفتاری کے سترہ ماہ بعد سرکاری نے وجہ بتائے بغیر مقدمہ واپس لے لیا اور ونی کی رہائی عمل میں آ گئی۔ دو ہفتوں کے اندر اس پر پھر بندش عائد ہوئی اور اسے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔اس نے فوراً مجھ سے ملاقات کی درخواست دی مگر وہ مسترد کر دی گئی۔

جیل میں میرے لیے اس خیال سے بڑھ کر کوئی امر تکلیف دہ نہیں تھا کہ ونی بھی جیل میں ہے۔میں نے اس صورتحال کو بظاہر حوصلے سے لیا مگر اندر سے میں انتہائی پریشان اور فکر مند تھا۔میرے اندرونی توازن کو اتنا کسی اور چیز نے درہم برہم نہیں کیا جتنا اس وقت نے جب ونی قید تنہائی میں تھی۔اگرچہ میں دوسروں پر اکثر زور دیتا تھا کہ جس چیز کو وہ کنٹرول نہ کر سکیں، اس کے بارے میں فکر مند ہونا چھوڑ دیں، مگر میں اپنی نصیحت پر خود عمل کرنے سے قاصر تھا۔کئی راتیں میں نیجاگ کر گزاریں۔حکام میری بیوی سے کیا سلوک کر رہے ہیں؟وہ کیسے برداشت کرے گی؟ہماری بیٹیوں کی دیکھ بھال کون کر رہا ہے؟ایسے سوالات کے بار بار اٹھنے سے ایک طرح کی ذہنی اذیت ہوتی ہے جبکہ ان کا جواب ملنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔

بریگیڈیئر آکیمپ نے مجھے اجازت دے دی کہ میں ونی کو خط بھیج سکتا ہوں۔ ایکدو اس کے خط بھی مجھ تک پہنچائے گئے۔عموماً مقدمے کے منتظر قیدیوں کو ڈاک کی سہولت نہیں دی جاتی، تاہم آکیمپ نے مجھ سے خاص رعایت برتتے ہوئے یہ اجازت دے دی۔ میں ان کا ممنون تھا مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ حکام نے مجھے یہ اجازت انسانیت نوازی کے جذبے سے نہیں دی۔وہ ہمارے خطوط پڑھ رہے تھے

اور انہیں ایسی اطلاعات ملنے کی امید تھی جو ونی کے خلاف مقدمہ میں ان کی مدد کر سکیں۔

سب سے بڑے بیٹے کی حادثاتی وفات

اس دوران مجھے ایک اور صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ جولائی 1969ء کی ایک سرد صبح مجھے جزیرہ روبن کے مین آفس میں طلب کیا گیا اور ایک تار حوالے کیا گیا۔ یہ میرے سب سے چھوٹے بیٹے ماگاتھو کی طرف سے تھا اور صرف ایک جملے پر مشتمل تھا۔ اس نے مجھے اطلاع دی تھی کہ اس کا بڑا بھائی، میرا پہلا اور سب سے بڑا بیٹا مادیبا تھیمبیکائل، جسے ہم عموماً تھیمبی کہتے تھے ٹرانسکائی میں ایک موٹر حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ تھیمبی اس وقت پچیس برس کا تھا اور دو چھوٹے بچوں کا باپ تھا۔

ایسے حادثے کے متعلق انسان کیا کہہ سکتا ہے؟ میں پہلے ہی اپنی بیوی کے بارے میں پریشان تھا، اپنی والدہ کی جدائی کے غم میں مبتلا تھا اور اب یہ تکلیف دہ خبر ملی تھی۔ مجھے جس حزن و غم اور محرومی سے دوچار ہونا پڑا، اسے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ اس خبر سے میرے دل میں جو سوراخ ہوا وہ کبھی مندمل نہیں ہو سکتا۔

میں اپنی کوٹھڑی میں واپس آ کر لیٹ گیا۔ جانے میں کتنی دیر بستر پر پڑا رہا اور رات کے کھانے کے لیے بھی باہر نہ نکلا۔ بعض افراد نے اندر جھانک کر دیکھا مگر میں نے ان سے کچھ نہ کہا۔ آخر میں والٹر میرے پاس آیا اور بستر کے ایک طرف گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ میں نے تار اس کے حوالے کر دیا۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولا اور اس نے بس میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے یاد نہیں وہ کتنا عرصہ میرے پاس ٹھہرا۔ ایسے مواقع پر ایک شخص کو غمزدہ آدمی سے کہنے کے لیے مناسب الفاظ نہیں ملتے۔

میں نے حکام سے درخواست کی کہ مجھے اپنے بیٹے کی تدفین میں شرکت کی اجازت دی جائے۔ ایک باپ کی حیثیت سے یہ یقین کر لینا میری ذمے داری تھی

کہ میرے بیٹے کی روح قبر میں پرسکون رہے۔ میں نے حکام سے کہا کہ وہ میرے ساتھ سکیورٹی کا دستہ بھیج سکتے ہیں اور یہ کہ میں اپنے قول کی پابندی کروں گا اور لوٹ آؤں گا۔ مجھے جانے کی اجازت نہ دی گئی۔ اجازت صرف یہ ملی کہ میں تھیمبی کی ماں ایولین کو ایک خط لکھ دوں جس میں، میں نے اس کی دلجوئی کی پوری پوری کوشش کی اور اسے بتایا کہ میں اس کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔

میرا ذہن پیچھے ایک سہ پہر میں چلا گیا جب تھیمبی کا لڑکپن تھا اور وہ سائرل ڈین کے ایک محفوظ گھر میں مجھ سے ملنے آیا تھا جسے میں خفیہ طور پر اے این سی کے کام کے لیے استعمال کرتا تھا۔ اپنے زیر زمین سیاسی کام اور قانونی مقدمات میں الجھ کر میں کچھ عرصہ اس سے نہیں مل سکا تھا اور پھر ایک روز جب میں اچانک گھر جا پہنچا تو تھیمبی کو میری پرانی جیکٹ پہنے ہوئے پایا جو اس کے گھٹنوں تک آتی تھی۔ اسے اپنے باپ کے کپڑے پہن کر ضرور سکون اور فخر محسوس ہوتا ہوگا جیسے مجھے کبھی اپنے والد کے کپڑوں میں محسوس ہوتا تھا۔ جب مجھے ان کو الوداع کہنا تھا تو وہ اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا جیسے وہ پہلے ہی بڑا ہو گیا ہو، اور بولا: ''آپ کی عدم موجودگی میں خاندان کی دیکھ بھال کروں گا۔

حصہ نہم ::

جزیرہ روبن میں امید کی شعاع

اب قیدی جیل کو چلانے لگے

جیل میں بہتر تبدیلیوں کا گراف کبھی مستقل نہ رہا۔ پیشرفت رک رک کر ہوتی اور حادثات ساتھ ساتھ چلتے۔ کسی بہتری کے حصول میں برسوں لگ جاتے اور پھر ایک ہی دن میں وہ دریا برد ہو جاتی۔ ہم چٹان کو دھکیل کر پہاڑی کی چوٹی پر لے جاتے مگر اگلے ہی لمحے وہ پھسل کر نیچے آ گرتی۔ لیکن حالات میں بہتری آئی ضرور۔ ہم نے بہت سی چھوٹی چھوٹی جنگیں جیت لی تھیں جنہوں نے جزیرے کی فضا میں تغیر پیدا کیا۔ اگر ہم جزیرے کو نہیں چلا رہے تھے تو حکام بھی ہمارے بغیر اسے نہیں چلا پاتے تھے اور وان رینس برگ کی روانگی کے بعد تو ہماری زندگی زیادہ قابل برداشت ہوگئی۔ جزیرے پر ہمارے پہلے تین سالوں کے اندر اندر ہم سب کو لمبے پاجامے دے دیئے گئے۔ 1969ء تک ہمیں اپنی مخصوص جیل کی وردیاں مل گئیں جبکہ اس سے پہلے ہمیں ہر ہفتے ایک مختلف جوڑا دیا جاتا تھا۔ نئی وردیاں ہمیں فٹ آتی تھیں اور ہمیں اجازت تھی کہ انہیں خود دھو لیں۔ ویک اینڈ کے دوران ہمیں سارا وقت باہر صحن میں گزارنے کی بھی اجازت مل گئی۔ اگرچہ ہماری خوراک میں ابھی مساوات نہیں آئی تھی مگر افریقی قیدیوں کو صبح کبھی کبھار ڈبل روٹی ملنے لگی تھی۔ ہمیں اپنی خوراک ایک جگہ جمع کرنے کی اجازت بھی مل گئی تاکہ اختلافات بڑھنے نہ پائیں۔ ہمیں بورڈ گیمز اور تاش کے پتے دیئے گئے تھے جن سے ہم اکثر ہفتے اور اتوار کو کھیلتے تھے۔ کان میں ہماری بات چیت شاذونادر روکی جاتی۔ اگر کمانڈنگ آفیسر آ رہا ہوتا تو وارڈر ہمیں انتباہ کرنے کے لیے سیٹی بجاتے کہ ہم اپنے اوزار پکڑ لیں۔ ہم نے بدترین وارڈروں کو معتدل بنالیا تھا اور زیادہ معقول افراد سے دوستی کرلی تھی اگرچہ

حکام یہ محسوس کر لیتے اور ہر چند ماہ بعد ان کا تبادلہ کر دیتے تھے۔

عملاً ہم چاہتے ایک دوسرے سے مل سکتے تھے۔ ہائی آرگن، جنرل ممبرز اور اولندن کے اجلاسوں میں عام طور پر اس وقت تک رکاوٹ نہ ڈالی جاتی جب تک وہ زیادہ نمایاں نہ ہو جاتے۔ یوں لگتا تھا جیسے جیل کو حکام نہیں بلکہ قیدی چلا رہے ہیں۔

پادریوں کو آمد اور تبلیغ

راسخ العقیدہ اور خدا ترس افریکنز اپنے مذہب کو سنجیدگی سے لیتا ہے، چنانچہ ہمارے ہفتہ وار شیڈول میں ایک مستقل تبدیلی یہ آئی کہ ہم اتوار کی صبح مذہبی دعا میں شرکت کرنے لگے۔ اس تقریب میں ہماری شرکت کو حکام ہمارا حق خیال کرتے تھے۔ گویا وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر انہوں نے ہمیں اتوار کو عبادت کا حق نہ دیا تو ان کی اپنی فانی روحیں خطرات سے دوچار ہوں گی۔

ہر اتوار کو ایک مختلف فرقے کا پادری ہمیں تبلیغ کرنے آتا۔ ایک اتوار کو اینگلی کن پادری آتا، اگلے اتوار کو ڈچ ریفارمڈ فرقے کا رہنما تبلیغ کرتا اور اس سے اگلے اتوار کو میتھوڈسٹ پادری چلا آتا۔ ان پادریوں کو جیل حکام بھرتی کرتے تھے اور وہ اس اصول پر کاربند تھے کہ وہ صرف مذہبی امور کی تبلیغ کریں گے۔ ہر دعائیہ تقریب میں وارڈر موجود ہوتے اور اگر کوئی پادری مذہب سے ہٹ کر سیاست میں جا نکلتا تو اسے دوبارہ کبھی زحمت نہ دی جاتی۔

جزیرے پر پہلے دو برسوں کے دوران ہمیں اتوار کی عبادت کے لیے بھی کوٹھڑیوں سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان دنوں پادری ہماری راہداری کے ایک سرے پر کھڑے ہو کر تبلیغ کرتے تھے۔ تیسرے سال دعائیہ تقریب صحن میں منعقد کرنے کی اجازت مل گئی جسے ہم ترجیح دیتے تھے۔ ان برسوں میں اس اتوار کی عبادت کے موقع ہی پر ہمیں صحن میں 'نصف گھنٹے کی ورزش کے علاوہ' لے جایا جاتا تھا۔ ہم میں سے چند لوگ مذہبی تھے مگر لمبی لمبی دعاؤں سے کسی کو شغف نہیں تھا، ہم تو

اپنے باہر نکلنے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ایک بار جب عبادت باہر ہونے لگے تو ہمیں اس میں شرکت کا اختیار دے دیا گیا۔بعض لوگ صرف اپنے فرقے کی عبادت میں شرکت کرتے تھے۔اگرچہ میں ایک میتھوڈسٹ ہوں‘ میں ہر فرقے کی مذہبی عبادت میں شریک ہوتا تھا۔

ہینی نے پادری کو غچہ دیا

ان مبلغین میں سے پہلا ایک اینگلی کن پادری فادر بگزنامی تھا جو ایک چڑ چڑا اور موٹا تازہ ویلش مین تھا جس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران آبدوز کور میں بطور چیپلین مذہبی خدمات انجام دی تھیں۔ جب وہ پہلے روز آیا تو بڑا پریشان ہوا کہ اسے راہداری میں کھڑے ہو کر تبلیغ کرنا ہو گی جو اس کے خیال میں تصور خدا کے متضاد بات تھی۔پہلی آمد پر اس نے ہمیں تبلیغ کرنے کے بجائے ونسٹن چرچل کے دوران جنگ کے ریڈیائی خطابات سے پیرے ان کے مخصوص آہنگ میں پڑھ کر سنانے شروع کر دیئے: ”ہم ساحلوں پر لڑیں گے۔ہم اترنے کی زمین پر لڑیں گے۔ہم کھیتوں اور بازاروں میں لڑیں گے۔ہم پہاڑیوں میں لڑیں گے۔ہم کبھی ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔“

فادر بگز جلد ہی ہمیں صحن میں تبلیغ کرنے لگا اور ہمیں اس کے وعظ میں لطف آنے لگا۔وہ اپنے وعظوں میں جابجا موقع ومحل کے مطابق خبروں کے ٹکڑے پیش کرتا اور اس کے چیز کے ہم شیدائی تھے۔مثلاً وہ کہتا: ”قدیم مصر کے فرعون کی طرح جنوبی افریقہ کا وزیر اعظم ایک فوج کھڑی کر رہا ہے۔“

عبادت کے آخر میں ہم ہمیشہ حمد گاتے اور میرے خیال میں فادر بگز زیادہ تر اس لیے آتا تھا کہ ہمیں حمد گاتے ہوئے سن سکے۔وہ ایک ہلکے وزن کا ساز ساتھ لاتا اور اسے ہمارے لیے بجاتا۔وہ ہمارے حمد گانے کی تعریف کرتا اور یہ کہتا کہ یہ واحد غنا ہے جو اس کے وطن ویلز میں گائے جانے والے مذہبی گیتوں سے لگا کھاتا ہے۔

میتھوڈسٹ پادری عزت ماب جونز تھا جو ایک زود حس اور اداس شخص تھا۔ وہ کانگو کے انقلاب کے دوران وہاں تعینات رہ چکا تھا۔ بظاہر وہاں کے تجربات اس کی اداسی کا سبب تھے۔ وہ بار بار مفاہمت کی اہمیت پر زور دیتا اور ہم سے کہتا کہ ہمیں ضرورت ہے کہ ہم گوروں سے مفاہمت کریں۔

ایک اتوار کو میتھوڈسٹ پادری کے یک رخے وعظ کے دوران میں نے محسوس کیا کہ ایڈی ڈینیلز بار بار پہلو بدل رہا ہے۔ آخر کار وہ رہ نہ سکا۔ ''آپ غلط لوگوں کو مفاہمت کی تلقین کر رہے ہیں۔'' وہ بول اٹھا۔ ''ہم پچھلے پچھتر سال سے مفاہمت تلاش کر رہے ہیں۔'' عزت ماب جونز کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس کے بعد وہ پھر کبھی دکھائی نہ دیا۔

عزت ماب جونز واحد پادری نہیں تھا جسے ایڈی نے بھگا دیا۔ برادر سپٹمبر نامی ایک رنگ دار پادری بھی ہمیں تبلیغ کرنے آیا۔ ایک اتوار کو ہینی فیرس نامی قیدی نے' جو ایک شعلہ بیان مقرر تھا' رضا کارانہ طور پر تقریب دعا کی رہنمائی کی۔ برادر سپٹمبر اس اخلاص کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ہینی نے فصیح زبان میں بولنا شروع کیا اور ایک موقع پر اس نے حاضرین سے کہا کہ اپنی آنکھیں بند کر کے دعا کریں۔ برادر سپٹمبر سمیت سب نے ایسا ہی کیا۔ اس اثنا میں ایڈی چپکے سے آگے بڑھا اور برادر سپٹمبر کا بریف کیس کھول کر اس روز کا سنڈے ٹائمز نکال لیا۔ اس وقت کسی کو شک نہ ہوا مگر اس کے بعد برادر سپٹمبر کبھی اخبار ساتھ نہ لایا۔

کالوں سے متنفر پادری

عزت ماب آندرے شیفر افریقہ میں ڈچ ریفارمڈ مشن چرچ کا پادری تھا۔ یہ ذیلی کلیسا ڈچ ریفارمڈ چرچ سے تعلق رکھتا تھا جو تقریباً تمام افریکنر لوگوں کا عقیدہ تھا جبکہ مشن چرچ افریقیوں کی ضروریات پوری کرتا تھا۔ عزت ماب شیفر ایک چڑ چڑا قدامت پرست شخص تھا جو عموماً عام قیدیوں میں تبلیغ کرتا تھا۔ ایک اتوار کو وہ گھومتا

پھرتا ہمارے سیکشن میں آ گیا تو ہم نے اس سے کہا کہ وہ ہمیں تبلیغ کیوں نہیں کرتا۔ اس نے نفرت سے کہا: ''تم سمجھتے ہو کہ تم مجاہدین آزادی ہو۔ تم ضرور بلا نوش شرابی یا دگا (بھنگ) پینے والے ہو گے تبھی تمہیں گرفتار کیا گیا۔ مجاہدین آزادی میرے جوتے کی نوک پر ہیں!'' لیکن ہم نے اسے چیلنج کیا کہ وہ ہمیں تبلیغ کرنے آئے اور آخر کار عشرہ 1960ء کے اواخر میں اس نے اس پر صاد کیا۔

عزت ماب شیفر ایک لحاظ سے غیر راسخ العقیدہ تھا۔ وہ مذہب کو سائنسی نقطۂ نظر سے لیتا تھا جو میرے دل کو بہت بھاتا تھا۔ بہت سے لوگ مذہب کی نفی کے لیے سائنس کو استعمال کرتے ہیں لیکن وہ اپنے عقائد کو بڑھاوا دینے کے لیے سائنس سے کام لیتا تھا۔ مجھے اس کا ایک وعظ یاد ہے جس میں اس نے مشرق کے تین عقل مندوں کا ذکر کیا جو ایک ستارے کی رہنمائی میں بیت اللحم پہنچ گئے تھے۔ اس کا کہنا تھا: ''یہ محض توہم یا دیومالائی بات نہیں۔'' اور پھر اس نے ماہرین فلکیات کا حوالہ پیش کیا کہ تاریخ میں اس وقت ایک دم دار ستارہ ظہور میں آیا تھا جو بائبل میں بیان کردہ راستے پر چھوٹتا چلا گیا تھا۔

جب عزت ماب شیفر ہم سے آشنا ہو گیا تو وہ زیادہ ہمدرد نکلا۔ اس کی حس مزاح خشک تھی اور وہ ہمارے متعلق فقرے کسنا پسند کرتا تھا۔ وہ کہتا: ''تم جانتے ہو کہ اس ملک میں کالے آدمی کی نسبت گورے آدمی کا کام زیادہ مشکل ہے۔ جب کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو ہم ہی اس کا حل ڈھونڈتے ہیں لیکن جب تمہیں کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو تمہارے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہوتا۔ تم صرف یہ کہہ دیتے ہو...... انگابی لونگو!'' ہم ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے' صرف اس لیے نہیں کہ اس کا تلفظ غیر ارادی طور پر مضحکہ خیز ہوتا بلکہ اس لیے بھی کہ ہمارے لیے یہ خیال ہی پر لطف تھا۔ ژہوسا زبان میں ''انگابی لونگو'' کا مطلب ہے ''یہ گوروں کا کام ہے۔'' گویا وہ کہہ رہا تھا کہ ہم ہمیشہ اپنی تمام تکالیف کا الزام گوروں پر دھرتے ہیں۔ اس کا پیغام یہ تھا کہ ہمیں اپنے

اندر بھی جھانکنا چاہیے اور اپنے اعمال کا خود ذمے دار ہونا چاہیے ...... اور اس کے یہ خیالات ایسے تھے جن سے میں کامل طور پر متفق تھا۔

سرود منڈلی کا لائٹ ویٹ

اتوار ہفتے کے بقیہ دنوں کے مقابلے میں جو حیثیت رکھتا تھا وہی حیثیت کرسمس کو بقیہ سال کے مقابلے میں حاصل تھی۔ یہ واحد دن تھا جب حکام قیدیوں سے خیر خواہی کا اظہار کرتے تھے۔ کرسمس کے دن ہمیں کان پر نہیں جانا پڑتا تھا اور تھوڑی مقدار میں مٹھائی خریدنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ ہمیں روایتی کرسمس کا کھانا تو نہیں ملتا تھا' تاہم رات کے کھانے میں کافی کا زائنگ دیا جاتا تھا۔

حکام ہمیں سرود منڈلی رچانے' مقابلے کرانے اور تمثیل پیش کرنے کی اجازت دیتے۔ سرود منڈلی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ہمارا کوئر ماسٹر یعنی سرود آقا پی اے سی سے تعلق رکھنے والا سلبی انگن ڈین تھا۔ سلبی پی اے سی میں شامل ہونے سے پہلے اے این سی یوتھ لیگ کا رکن رہ چکا تھا۔ وہ پیاری آواز اور اچھی سماعت والا ایک فطری تفریح باز تھا۔

سلبی گیت منتخب کرتا' آہنگ ترتیب دیتا' تنہا گانے والوں کا انتخاب کرتا اور سرود کی پیشکش کو نبھاتا۔ سرود منڈلی صحن میں کرسمس کی صبح برپا ہوتی۔ ہم روایتی انگلش کرسمس گیتوں میں افریقی گیتوں کی آمیزش کرسکتے تھے اور ساتھ احتجاجی گیت بھی ملا دیتے جن کا فرق حکام کے علم میں نہیں تھا یا وہ پروا نہیں کرتے تھے۔ وارڈر ہمارے سامعین تھے اور وہ بھی اتنا ہی لطف اندوز ہوتے جتنا ہم لطف اٹھاتے تھے۔

جیل آنے سے پہلے سلبی کو ایک طرح کا سیاسی لائٹ ویٹ مکا باز خیال کیا جاتا تھا۔ بعض لوگ قید و بند کے دباؤ کے تحت صحیح جذبے کا اظہار کرتے تھے' جبکہ دوسرے اس سے بھی کم ہمت دکھاتے تھے جتنی ان میں بظاہر موجود ہوتی تھی۔

ڈیوس نے مجھے فیل کر دیا

سر ووِمنڈلیوں کے علاوہ ہم شطرنج کھیلتے' ڈرافٹس ٹورنامنٹ منعقد کرتے اور سکریبل اور برج بھی کھیلتے۔ ہر سال میں ڈرافٹس کے مقابلوں میں حصہ لیتا اور کئی سال تک میں نے بڑا انعام جیتا جو ایک کینڈی بار یعنی مٹھائی کی شکل میں ملتا۔ میرے کھیل کا انداز سست اور سوچا سمجھا تھا اور میری سٹراٹیجی قدامت پسندانہ تھی۔ میں ہر چال کے سباق کا احتیاط سے جائزہ لیتا اور دو چالوں کے درمیان خاصا وقت لیتا۔ میں ایسی مشابہتوں سے بچتا ہوں لیکن یہ میرا کام کرنے کا ترجیحی انداز ہے' نہ صرف ڈرافٹس میں بلکہ سیاست میں بھی۔

میرے بیشتر حریف زیادہ تیز کھیلتے تھے اور وہ میری کھیل کے انداز پر اکثر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے۔ زیادہ تر میرا حریف ڈان ڈیوس ہوتا۔ ڈان نان یورپین یونٹی موومنٹ کا رکن تھا اور اس نے کمبرلے کے ہیرون کی کان کنی کے علاقے میں پرورش پائی تھی۔ وہ ایک اکھڑ اور بے خوف آدمی تھا جس کا مزاج انتہائی تناؤ کا حامل تھا۔ وہ ڈرافٹس کا عمدہ کھلاڑی تھا' لیکن اس کا انداز میرے انداز سے مختلف تھا۔ جب وہ کھیلتا' اس کے چہرے پر پسینہ بہتا۔ اس کا چہرہ تن جاتا اور وہ کھیلتے وقت پرجوش ہوتا اور اتنی تیز چالیں چلتا جیسے اس تیزی کے بھی نمبر ملنے تھے۔ کئی بار وہ اور میں سالانہ ٹورنامنٹ کے فائنلز میں آمنے سامنے ہوتے۔

ڈان مجھے کیپو (Qhipu) کہہ کر پکارتا تھا کیونکہ ڈرافٹس کھیلتے وقت میں نے ایک عادت اپنالی تھی۔ میں ہر امکان پر غور کرتا اور جب میں چال چلنے والا ہوتا تو پکار اٹھتا ''کیپو'' جس کا مطلب ہے ''میں مارتا ہوں'' اور پھر میں نرد کو حرکت دیتا۔ ڈان کے لیے یہ صورتحال مایوس کن ہوتی اور وہ خوشی سے زیادہ تلخی میں مجھے ''کیپو'' کہہ کر پکارتا۔

ڈان اور میں نے کئی ٹورنامنٹوں میں حصہ لیا اور اگر وہ جیت بھی جاتا تو چند منٹ بعد پھر میرے پاس چلا آتا اور ایک اور میچ کا چیلنج دیتا۔ ڈان ہمیشہ ڈرافٹس کھیلنا چاہتا

تھا اور اس وقت تک اس کی تسلی نہ ہوتی جب تک میں ردعمل ظاہر نہ کرتا۔ جلد ہی میں ڈان کے ساتھ کھیلنے میں اتنا وقت گزارنے لگا کہ میرے دوسرے معاملات پیچھے رہ گئے۔ جب میں اپنی تعلیم کا ایک امتحان پاس کرنے میں ناکام رہا اور میرے بعض ساتھیوں نے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوا تو میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا: ''ڈان ڈیوس ''!

میں نے شاہ تھیبس کا روپ دھارا

ہماری شوقیہ ڈرامہ سوسائٹی کرسمس پر اپنا سالانہ ڈرامہ پیش کرتی تھی۔ میرا تمثیلی کیریئر جو اس وقت سے دبا پڑا تھا جب میں نے فورٹ ہیئر میں ''جان ولکس بوتھ'' کھیلا تھا''جزیرہ روبن پر عود کر آیا۔ ہماری پیشکشیں کچھ ایسی تھیں جنھیں اب حقیر ترین ہی قرار دیا جا سکتا ہے......کوئی اسٹیج نہ تھا' کوئی سینری نہ تھی اور نہ ملبوسات ہوتے تھے۔ لے دے کے ہمارے پاس کھیل کا متن ہوتا تھا۔

میں نے صرف چند ڈراموں میں کام کیا لیکن میرا ایک رول یادگار تھا اور یہ تھا سوفوکلیز کے ڈرامے اینٹی گون میں کری اون' شاہ تھیبس کا کردار۔ میں نے جیل میں کچھ کلاسک یونانی ڈرامے پڑھے تھے اور انہوں نے مجھے بہت لطف دیا تھا۔ میں نے ان میں سے جو کچھ اخذ کیا وہ ایک ایسا کردار تھا جو مشکل حالات کا سامنا کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا' اور وہ ایسا ہیرو تھا جو انتہائی صبر آزما حالات میں بھی ہمت نہ ہارتا تھا۔ جب اینٹی گون کو ڈرامے کے لیے چنا گیا تو میں نے اپنی خدمات رضاکارانہ پیش کر دی۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں کری اون کا کردار پیش کروں جو ایک بوڑھا بادشاہ تھا جس نے اپنی پیاری شہری ریاست کے تخت کے لیے خانہ جنگی میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ شروع ہی سے کری اون ایک مخلص اور محب وطن ہے اور اس کی ابتدائی تقریروں میں عقلمندی جھلکتی ہے۔ بالخصوص جب وہ یہ کہتا ہے ''تجربہ قیادت کی بنیاد ہے'' اور یہ کہ ''لوگوں کی طرف سے عائد فرائض انفرادی وفاداری پر ترجیح رکھتے

ہیں۔'' پھر وہ کہتا ہے:

'' آپ ایک شخص کو مکمل طور پر جان ہی نہیں سکتے۔ اس کے کردار کو' اس کے اصولوں کو' اس کو قوت فیصلہ کو نہیں جان سکتے جب تک وہ لوگوں پر حکومت کر کے اور قانون سازی کر کے اپنا اصل رنگ نہ دکھائے۔ تجربہ انسان کی آزمائش ہے۔''

لیکن کری اون اپنے دشمنوں سے بے رحمی کا سلوک کرتا ہے۔ اس نے حکم دیا کہ اینٹی گون کے بھائی پولی نیکس کا جسم' جس نے شہری کے خلاف بغاوت کر دی تھی' مناسب تدفین کا مستحق نہیں۔ اینٹی گون کی بات پر توجہ نہیں دیتا اور کسی اور کی بات نہیں سنتا بلکہ اپنے ہی اندرونی شیطانوں کی باتوں پر کان دھرتا ہے۔ اس کی بے لچکی اور اندھے پن کی بدی اس کی رہنما بنتی ہے کیونکہ ایک رہنما کو چاہیے کہ انصاف کو رحم کے ساتھ آمیز کرے۔ یہ اینٹی گون تھی جو ہماری جدوجہد کی علامت تھی۔ وہ اپنے طور پر ایک مجاہدۂ آزادی تھی' کیونکہ اس نے اس بنا پر قانون کو چیلنج کیا تھا کہ وہ انصاف پر مبنی نہیں تھا۔

جزیرے سے میرے فرار کا منصوبہ

بعض وارڈر ہمیں بات چیت میں لگانے لگے تھے۔ میں نے از خود کبھی وارڈروں سے گفتگو شروع نہیں کی تھی۔ لیکن اگر وہ مجھ سے کوئی سوال کرتے تو میں اس کا کا جواب دینے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک شخص جب سیکھنا چاہتا ہوں تو اسے تعلیم دینا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ عموماً وہ ایک طرح کی برہمی کے ساتھ سوالات اٹھاتے تھے: ''ٹھیک ہے منڈیلا! تم آخر چاہتے کیا ہو؟'' یا ''دیکھو' تمہارے سر پر چھت ہے اور تمہیں کافی خوراک ملتی ہے' پھر تم اس قدر ہنگامہ کیوں کھڑا کرتے ہو؟'' میں بڑے سکون سے اپنی پالیسیاں ان وارڈروں کو سمجھانے کی کوشش کرتا۔ میں چاہتا تھا کہ انہوں نے اے این سی کو جو ہوا بنا رکھا ہے وہ اس تصور سے نکل آئیں اور اپنے تعصبات ترک کر دیں۔

1969ء میں ایک نوجوان وارڈر آیا جو میرے بارے میں خاص طور پر معلومات حاصل کرنے کا شائق لگتا تھا۔ میں نے افواہیں سنی تھیں کہ ہمارے باہر کے لوگ مجھے جیل سے فرار کروانے کا منصوبہ بنا رہے تھے اور انہوں نے جزیرے کے عملے میں ایک وارڈر خفیہ طریقے سے شامل کر دیا تھا' جسے میری مدد کرنا تھی۔ بتدریج اس شخص نے مجھ سے رابطہ کر کے بتایا کہ وہ میرے فرار کا منصوبہ بنا رہا ہے۔

تھوڑا تھوڑا کر کے اس نے اپنے منصوبے کی وضاحت یوں کی: ''ایک رات وہ لائٹ ہاؤس پر تعینات وارڈروں کو نشہ آور دوا پلا دے گا تا کہ ساحل پر ایک کشتی آ لگے۔ وہ مجھے ایک چابی فراہم کرے گا جس کے ذریعے میں اپنے سیکشن سے باہر نکلوں گا' تا کہ میں کشتی تک پہنچ جاؤں۔ کشتی پر مجھے زیر آب تیرنے کا سامان دیا جانا تھا جس کی مدد سے تیر کر مجھے کیپ ٹاؤن کی بندرگاہ تک پہنچنا تھا۔ کیپ ٹاؤن سے مجھے ایک مقامی ہوائی اڈے پر لے جایا جانا تھا اور وہاں سے بذریعہ طیارہ ملک سے باہر نکلنا تھا۔

میں نے اس پورے منصوبے کو توجہ سے سنا اور اسے یہ نہ بتایا کہ یہ کس قدر دور از کار اور نا قابل اعتبار لگتا ہے۔ میں نے والٹر سے مشورہ کیا اور ہم نے اس پر اتفاق کیا کہ اس شخص پر بھروسہ نہ کیا جائے۔ میں نے اسے یہ نہ بتایا کہ میں اس پر بھروسہ نہیں کروں گا۔ لیکن میں نے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے درکار کوئی اقدام کبھی نہ کیا۔ اسے ضرور میرا پیغام مل گیا ہوگا کیونکہ جلد ہی اس کا جزیرے سے تبادلہ کر دیا گیا۔

جیسا کہ بعد میں پتہ چلا' میری بے اعتمادی بجا تھی کیونکہ وہ وارڈر بیورو آف سٹیٹ سکیورٹی (BOSS) کا ایجنٹ تھا جو جنوبی افریقہ کی خفیہ انٹیلی جنس ایجنسی تھی۔ سازش یہ تھی کہ مجھے جزیرے سے ''کامیابی'' سے باہر نکالا جائے لیکن لیکن جب میں ہوائی اڈے پر ملک سے روانہ ہونے کی کوشش کروں تو سکیورٹی فورسز کے

ساتھ ڈرامائی جھڑپ میں مجھے ہلاک کردیا جائے۔اس پورے منصوبے کا تانا بانا ''باس'' نے بنا تھا اگرچہ مجھ تک افواہیں یہ پہنچی تھیں کہ اس فرار کی منصوبہ بندی اے این سی نے کی ہے۔انٹیلی جنس کی طرف سے میری جان لینے کے کوشش کرنے کا یہ آخری موقع نہیں تھا۔

نئے سی او کے آہنی ہتھکنڈے

کمانڈنگ آفیسر (CO) کی مدت عموماً تین سال سے زیادہ نہیں ہوتی تھی اور 1970ء تک ہم نے کئی کمانڈنگ آفیسر بھگتائے۔اس سال روبن آئی لینڈ کا سی او کرنل وان آرڈے تھا۔وہ ایک خوش خلق' بے ضرر شخص تھا جو ہمیں ڈھیل دیتا تھا لیکن سال کے آخر پر حکام اس نتیجے تک پہنچے کہ انہیں جزیرے پر ایک مختلف فضا کی ضرورت ہے' چنانچہ کرنل پایٹ باڈن ہورسٹ کو نیا سی او نامزد کردیا گیا۔

اس سے حکومت کے ارادے آشکار ہوتے تھے۔باڈن ہورسٹ پوری جیل سروس میں وحشی ترین اور مطلق العنان افسروں میں شمار ہوتا تھا۔اس کے تقرر سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ حکومت کے خیال میں جزیرے کا نظم وضبط بہت ڈھیلا پڑ گیا تھا اور اسے درست رکھنے کے لیے ایک آہنی ہاتھ کی ضرورت تھی۔باڈن ہورسٹ نے آتے ہی ہمیں ''سوٹ کیس'' کے دنوں کی یاد دلا دی۔

جب کبھی نیا کمانڈنگ آفیسر تعینات ہوتا تھا تو میں اس سے ملاقات کی درخواست کرتا تھا۔میں یہ اس لیے کرتا تھا کہ اسے اپنے کاز کی سنجیدگی کا احساس دلاؤں اور اس کے کردار کا جائزہ لے لوں' چنانچہ میں نے کرنل باڈن ہورسٹ سے ملاقات کی درخواست کی مگر وہ مسترد کردی گئی۔وہ پہلا سی او تھا جس نے ایسی ملاقات سے انکار کیا تھا۔

ہمیں اسے دیکھنے سے پہلے ہی اس کی حکمرانی کے اثرات کا احساس ہوگیا تھا۔ مطالعے اور فارغ وقت سے متعلق بہت سے نئے ضابطے فوراً ہی لاگو کردیے گئے

تھے۔ یہ ظاہر تھا کہ وہ ہر اس رعایت کو واپس لینے کا ارادہ کیے ہوئے تھا جو ہم نے برسوں میں حاصل کی تھی۔ ہمارے پرانے واڈروں کا جزیرے سے تبادلہ کر دیا گیا اور ان کی جگہ باڈن ہورسٹ نے اپنی مرضی کے گارڈ تعینات کیے۔ وہ زیادہ نوجوان اور زیادہ اکھڑ لوگ تھے جو ہر بیہودہ ضابطے کو قوت سے نافذ کرتے تھے اور جن کا کام ہی ہمیں ہراساں اور بے حوصلہ کرنا تھا۔ باڈن ہورسٹ کے تقرر سے چند دن کے اندر ہماری کوٹھڑیوں پر دھاوا بول کر تلاشی لی گئی' کتابیں اور کاغذات ضبط کر لیے گئے۔ کھانے بغیر انتباہ کے بند کر دیئے گئے اور قیدیوں کو دھکے مار مار کر کام پر لے جایا گیا۔

باڈن ہورسٹ نے گھڑی کی سوئیاں الٹی گھمانے کی کوشش کی تھی اور جزیرے کو عشرہ 1960ء کے اوائل میں دھکیلنا چاہا تھا۔ ہر سوال کا جواب ہمیشہ نفی میں ہوتا تھا۔ وہ قیدی جو اپنے وکلاء سے ملنے کی درخواست کرتے انہیں قید تنہائی میں ڈال دیا جاتا' شکایات مکمل طور پر نظر انداز کر دی جاتی تھی اور ملاقاتیں کسی وضاحت کے بغیر کینسل کر دی جاتیں۔ خوراک کا معیار گر گیا تھا اور سنسر شپ میں اضافہ ہو گیا تھا۔

باڈن ہورسٹ کی آمد کے تقریباً ایک ہفتہ بعد ایک صبح ہم کان پر کام کر رہے تھے جب کسی اطلاع یا شور وغل کے بغیر کمانڈر اور اس کا ڈرائیور کار میں آ دھمکے۔ اس نے باہر نکل کر فاصلے سے ہمارا جائزہ لیا۔ ہم نے اپنے نئے کمانڈر کو دیکھنے کے لیے کام سے ہاتھ روک لیے۔ باڈن ہورسٹ نے مجھ سے نظریں ملاتے ہوئے پکار کر کہا: ''منڈیلا! تمہیں اپنی انگلی اپنے سرین سے باہر نکال لینی چاہیے۔'' میں نے اس کے اس جملے کی پروا نہ کی اور کچھ سوچے بغیر باڈن ہورسٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ ابھی کچھ فاصلے پر تھا اور اس سے پہلے کہ میں اس کے قریب پہنچتا وہ کار میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

اپنی کار میں سے باڈن ہورسٹ نے اپنے عملے کو ریڈیائی پیغام دیا اور چند منٹ

کے اندر اندر ایک ٹرک آ پہنچا جس میں ہمیں واپس سیکشن بی میں پہنچانے کے لیے سوار کیا گیا۔ ٹرک میں ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور جب ہم احاطے میں پہنچے تو ہمیں اٹینشن کھڑے ہونے کا حکم ملا۔ باڈن ہورسٹ ہمارے سامنے نمودار ہوا۔ وہ ادھر سے ادھر قدم بڑھا رہا تھا۔ اس کی باتوں سے یوں لگتا تھا کہ وہ ایک بھی جملہ ادا کرنے سے قاصر ہے جس میں کوئی قسم یا قسمیہ لفظ شامل نہ ہو۔ اس کا پسندیدہ جملہ تھا: ''تمہاری ماں ایک موئر ہے۔'' موئر (Moer) ایک فحش اصطلاح تھی جو عورت کے پوشیدہ عضو کے لیے استعمال ہوتی تھی۔

اپنی غلیظ آواز میں اس نے ہمیں بتایا کہ اسے کان پر ہمارا سست کام دیکھ کر بڑی کوفت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ہماری درجہ بندی کو بیک قلم ختم کر رہا ہے۔ اگرچہ ہمیں اس درجہ بندی کے نظام سے نفرت تھی مگر ہم میں سے اکثر آدمی اس وقت تک کم ازکم سی لیول تک آ گئے تھے۔ جہاں انہیں مطالعے کی اجازت مل گئی تھی۔ ڈی لیول کے قیدیوں کو مطالعے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ حکام اس امر پر پشیمان تھے کہ انہوں نے ہمیں مطالعے کی رعایت دے دی تھی اور باڈن ہورسٹ نے اس غلطی کا ازالہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

بعد میں جب میرا غصہ کم ہوا میں نے محسوس کیا کہ کان پر میرے بارے میں باڈن ہورسٹ کے گھٹیا ریمارکس دیدہ دانستہ تھے۔ اس جزیرے روبن پر امن وامان بحال کرنے کے لیے لایا گیا تھا اور اس نے اس شخص کو ہدف بنا لیا تھا جو اس کے خیال میں گڑبڑ کا سرچشمہ تھا۔ ایک استاد کی طرح جو ایک گستاخ کلاس کی خبر لیتا ہے وہ اس ''شاگرد'' کو نظم وضبط سکھانے پر گیا جسے وہ فساد کی بڑی جڑ قرار دیتا تھا۔

اجتماعی برہنہ تلاشی کا شرمناک اقدام

مئی 1971ء کے آخر میں سواپو (ساؤتھ ویسٹ افریقن پیپلز آرگنائزیشن) کے بہت سے آدمی جیل کے شعبہ تنہائی میں لائے گئے۔ سواپو اے این سی کی ایک

اتحادی تنظیم تھی جو نمیبیا کی آزادی کے لیے لڑ رہی تھی۔ نئے آنے والوں کا رہنما این ڈمبا ٹوئیوو جا ٹوئیوو تھا جو سواپو کا بانی اور بہت بڑا مجاہد آزادی تھا۔ ہمیں پتہ چلا کہ انہوں نے قید تنہائی پر احتجاج کرنے کے لیے بھوک ہڑتال کر دی ہے' چنانچہ ہم نے فوری طور پر ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس پر باڈن ہورسٹ اور حکام کو غصہ آیا جنہوں نے ہمارے اس فعل کو نا قابل قبول نافرمانی پر محمول کیا۔

28 مئی کو رات گئے شور و شغب اور ہماری کوٹھڑیوں کے دروازوں پر کھٹکھٹاہٹ سے ہم جاگ اٹھے' وارڈر چیخ رہے تھے: ''اٹھو' اٹھو۔'' ہمیں کپڑے اتار کر احاطے کی دیوار کے ساتھ قطار بنانے کا حکم ملا۔ وارڈروں نے بظاہر شراب پی رکھی تھی اور وہ چلاتے ہوئے ہمیں ڈانٹ رہے تھے۔ ان کی قیادت فورائی نامی ایک اذیت پسند شخص کر رہا تھا جسے ہم نجی طور پر بدمعاش (Gangster) کہہ کر پکارتے تھے۔

رات شدید سرد تھی اور ہم ایک گھنٹے تک برہنہ حالت میں اٹین شن کھڑے کانپتے رہے جبکہ ہماری کوٹھڑیوں کی ایک ایک کر کے تلاشی لی گئی۔ اس پورے عرصے میں وارڈر ہم سے بدکلامی کرتے رہے۔ یہ آزمائش ختم ہونے کو آئی تو گووان کے سینے میں درد کی شدید لہر اٹھی اور وہ گر پڑا۔ اس پر فورائی نے خوفزدہ ہو کر ہمیں حکم دیا کہ اپنی کوٹھڑیوں میں واپس چلے جائیں۔

وارڈروں نے کونے کونے کی تلاشی لی مگر کچھ نہ ملا۔ یہ تلاشی بظاہر فورائی کے اذیت پسند رجحان کا شاخسانہ تھی۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ وہ جنرل سیکشن میں قیدیوں سے بدفعلی کے لیے مشہور تھا۔ اگلے دن معلوم ہوا کہ وارڈروں نے بعض جنرل قیدیوں کو وحشیانہ طور پر پیٹا تھا اور ہماری تلاشی سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے ٹوئیوو جا ٹوئیوو پر حملہ کر دیا تھا جس نے اس وارڈر کو مکا مار کر گرا دیا جو اسے پیٹ رہا تھا۔ اس پر ٹوئیوو کو سخت سزا دی گئی۔ ہم نے اپنے علاج معالجے کے متعلق

ایک رسمی شکایات کی مگر وہ نظر انداز کر دی گئی۔ یہ واقعہ میری یادداشت میں نمایاں ہے لیکن یہ واحد واقعہ نہیں تھا۔ باڈن ہورسٹ کی حکمرانی میں ایسے واقعات استثناء کی بجائے معمول تھے۔

باڈن سے پہلی ملاقات

ہم نے تہیہ کر رکھا تھا کہ باڈن ہورسٹ کے زیر انتظام حالات کو مکمل طور پر نہ بگڑنے دیا جائے۔ ہم نے باہر اپنے لوگوں کو پیغامات بھجوائے کہ وہ اس کی برطرفی کے لیے ایجی ٹیشن کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم نے یہ طے کیا کہ باڈن ہورسٹ سے ملاقات کے لیے ایک وفد تشکیل دیا جائے۔ ہم نے مہینوں اس پر غور کیا اور بتدریج وفد کی تشکیل کر لی۔ والٹر اور میں نے اے این سی کی نمائندگی کی جبکہ دوسری پارٹیوں کے بھی دو دو نمائندے لیے گئے۔

باڈن ہورسٹ ہم سے ملاقات پر آمادہ ہو گیا اور ہم نے اپنی باہمی گفتگو میں طے کیا کہ ہم کام چھوڑ دینے' سست پڑنے (Go-Slows) بھوک ہڑتال اور اپنے امکان میں ہر ہتھیار استعمال کرنے کی دھمکی دیں گے جب تک وہ اپنے طرز عمل کی اصلاح نہیں کر لیتا اور وہ بہت سی مراعات بحال نہیں کر دیتا جو اس نے واپس لے لی تھیں۔ اس نے صرف یہ کہا کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے اسے وہ زیر غور لائے گا۔ ہم نے اس دوبدو گفتگو کو اپنی فتح گردانا کیونکہ وہ ہمارے میں میں چونکہ اٹھا تھا اور جان گیا تھا کہ ہم نے باہر والوں کو اپنی شکایتوں کے بارے میں چوکس کر دیا ہے۔ ان کوششوں کا جلد ہی ایک نتیجہ بر آمد ہوا۔ ایک ہفتہ بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ کوئی اہم ملاقات ہونے والی ہے کیونکہ جب اس روز کان پر بارش ہوئی تو ہمیں کام جاری رکھنے کے بجائے پناہ لینے کی اجازت دی گئی۔ اگلے روز ہمیں اطلاع دی گئی کہ تین جج جزیرے پر آ رہے ہیں۔ حکام نے ہم سے کہا کہ اپنی شکایات بیان کرنے کے لیے اپنا ایک ترجمان نامزد کر دیں' چنانچہ اس کام کے لیے مجھے چنا گیا۔

سپریم کورٹ کے ججوں کی آمد

جب میں ججوں سے اپنی ملاقات کی تیاری کر رہا تھا مجھے ایک قابل اعتماد ذریعے سے اطلاع ملی کہ جنرل سیکشن میں ایک قیدی کو ایک گارڈ نے بڑی شدت سے پیٹا ہے۔ تینوں جج سپریم کورٹ کے کیپ پراونشل ڈویژن کے جسٹس جان سٹائن' جسٹس ایم ای تھیرون اور جسٹس مائیکل کاربٹ تھے۔ ان کے ساتھ کمشنر جیل خانہ جات جنرل سٹائن اور کرنل باڈن ہورسٹ تھے۔ اس روز میں ان سے باہر ملا جہاں ہم کام کر رہے تھے۔

جنرل سٹائن نے ججوں سے میرا تعارف کرایا اور وضاحت کی کہ مجھے دوسرے قیدیوں کی نمائندگی کے لیے چنا گیا ہے۔ پھر ججوں نے اشارہ دیا کہ اصولاً وہ مجھ سے علیحدگی میں ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے کوئی بات نہیں چھپانی اور فی الواقع میں نے جنرل سٹائن اور کرنل کی موجودگی کا خیر مقدم کیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دونوں میری اس بات پر ہکا بکا رہ گئے۔ میں نے مزید یہ کہا کہ ان کے لیے یہاں ٹھہرنا عین مناسب ہوگا کیونکہ انہیں میرے الزمات کا جواب دینے کا موقع ملے گا۔ جج بادل ناخواستہ خاموش رہے۔

میں نے جنرل سیکشن میں قیدی کی حالیہ پٹائی سے گفتگو کا آغاز کیا۔ میں نے انہیں واقعے کی تفصیلات جو مجھ تک پہنچی تھیں' پیٹنے والوں کی بدنیتی اور جرم کو چھپانے کی کوشش سے آگاہ کیا۔ میں نے گفتگو شروع کی ہی تھی جب میں نے دیکھا کہ باڈن ہورسٹ بے چینی سے پہلو بدل رہا ہے۔ جب میں واقعہ بیان کر چکا تو اس نے کھردرے اور جارحانہ لہجے میں مداخلت کی: '' کیا تم خود اس حملے کے وقت موجود تھے؟'' اس نے سکون سے جواب دیا کہ میں موجود نہیں تھا لیکن مجھے ان لوگوں پر اعتبار ہے جنہوں نے مجھے یہ واقعہ سنایا تھا۔ اس نے نتھنے پھلا کر اپنی انگلی میرے سامنے لہراتے ہوئے کہا: ''منڈیلا! احتیاط کرو۔ اگر تم ایسے واقعات بیان

کروگے جو تم نے دیکھے نہیں تو مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ تم میرا مطلب سمجھتے ہو۔'' میں نے باڈن ہورسٹ کے ریمارکس نظر انداز کر دیئے اور ججوں کی طرف مڑتے ہوئے کہا: ''حضرات! آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ ہمیں کس قسم کا آدمی بطور کمانڈنگ آفیسر ملا ہے۔ اگر وہ مجھے یہاں آپ کی موجودگی میں دھمکا سکتا ہے تو آپ تصور کر سکتے ہیں جب آپ یہاں نہیں ہوں گے تو وہ کیا کچھ نہیں کر گزرے گا۔'' تب جج کاربٹ نے اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ کر کہا: ''قیدی بالکل ٹھیک کہتا ہے۔''

میں نے ملاقات کے بقیہ وقت میں اپنی خوراک' کام اور مطالعے کے بارے میں شکایات گنوائیں۔ باڈن ہورسٹ اندر ہی اندر کھول رہا ہو گا لیکن بظاہر وہ شائستگی برقرار رکھے ہوئے تھا۔ ملاقات کے آخر میں ججوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں نے انہیں خدا حافظ کہا۔

مجھے یہ تو علم نہیں کہ اس ملاقات کے بعد ججوں نے کیا کہا یا کیا کیا تھا لیکن اگلے چند مہینوں کے دوران یوں لگتا تھا کہ باڈن ہورسٹ کے ہاتھ بندھ گئے ہیں۔ اس کی سختی کم ہو گئی تھی اور ججوں سے ملاقات کے تین مہینوں کے اندر اندر ہمیں اطلاع ملی کہ اس کا تبادلہ کر دیا گیا ہے۔

سنگدل کی نیک تمنائیں

باڈن ہورسٹ کی روانگی سے چند روز پہلے مجھے مین آفس میں بلایا گیا۔ جنرل سٹائن جزیرے کے دورے پر آ رہا تھا اور وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا ہمیں کوئی شکایت تو نہیں۔ ملاقات کے وقت باڈن ہورسٹ موجود تھا جب میں نے مطالبات کی فہرست پیش کی۔ جب میں اپنی بات ختم کر چکا تو باڈن ہورسٹ نے مجھے براہ راست مخاطب کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ جزیرے سے جا رہا ہے اور پھر کہا میں ''تم لوگوں کی خوش بختی کی دعا کرتا ہوں۔'' مجھے یاد نہیں کہ اس کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میری کیا حالت ہوئی تھی' تاہم مجھے حیرت ضرور ہوئی تھی۔ اس نے یہ الفاظ ایک

انسان کی طرح کیے تھے اور اپنے اس پہلو کا مظاہرہ کیا تھا جو پہلے ہم نے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اس کی نیک تمناؤں کا شکریہ ادا کیا اور اس کے لیے زندگی میں خوش بختی کی تمنا کی۔

اس واقعہ کے ایک عرصہ بعد تک میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ باڈن ہورسٹ شاید سب سے زیادہ سنگدل اور وحشی کمانڈنگ آفیسر تھا جس سے ہمیں جزیرہ روبن پر واسطہ پڑا تھا۔ لیکن اس روز مین آفس میں اس نے انکشاف کیا تھا کہ اس کی فطرت کا ایک اور پہلو بھی ہے...... ایک ایسا پہلو جو دھند میں چھپا ہوا تھا لیکن ابھی تک موجود تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ تمام آدمی جو بظاہر انتہائی سرد مہر ہوں ان کے اندر بھی شائستگی ہوتی ہے اور یہ کہ اگر ان کے دلوں کو چھوا جائے تو انہیں بدلا جاسکتا ہے۔ آخر باڈن ہورسٹ برا نہیں تھا' اس کا غیر انسانی رویہ ایک غیر انسانی نظام نے اس تھوپ دیا تھا۔ اس نے ایک وحشی کا سا برتاؤ کیا تھا کیونکہ اسے وحشیانہ رویے پر انعام ملتا تھا۔

نئے کمانڈنگ آفیسر کا مطالبہ

یہ اعلان کیا گیا کہ کرنل باڈن ہورسٹ کی جگہ کرنل ولمز بطور کمانڈنگ آفیسر لے گا۔ میں نے کرنل ولمز کے تقرر کے بعد اس سے ملاقات کی درخواست کی اور اس کی آمد کے چند روز بعد اس سے ملاقات ہوگئی۔ اگرچہ بظاہر وہ ترقی پسند آدمی نہیں تھا مگر نرم دل اور معقول شخص تھا اور اپنے پیشرو سے واضح طور پر مختلف تھا۔ ہمیں امید تھی کہ باڈن ہورسٹ کا دور ہمارے حالات کی بہتری کے گراف میں انتہائی پستی کا حامل رہے گا۔

باڈن ہورسٹ کے ساتھ جارحانہ مزاج کے نوجوان وارڈر بھی چلے گئے اور ہم نے کان پر اور اپنے سیکشن میں اپنے روایتی انداز میں کام شروع کر دیا۔ ولمز معقول آدمی ہوگا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ہم کان پر کام کے بجائے زیادہ وقت باتوں

میں گزارتے ہیں تو اسے صدمہ ہوا۔

اسے جزیرے پر آئے چند ہی ہفتے ہوئے تھے جب مجھے اس کے دفتر میں بلایا گیا۔ اس نے دوستانہ طور پر کہا: ''منڈیلا! تمہیں میری مدد کرنی چاہیے۔'' میں نے پوچھا: ''کیسے؟'' وہ بولا: ''تمہارے آدمی کام نہیں کررہے۔ وہ میرے احکام پر کان بھی نہیں دھرتے۔ وہ اتنا ہی کام کرتے ہی جتنا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک جیل ہے کچھ ڈسپلن ہونا چاہیے۔ اس میں نہ صرف ہماری بلکہ تمہاری بھی بہتری ہے۔ ہمیں نظم وضبط برقرار رکھنا ہوگا۔ ورنہ سابق سربراہ جیل جیسا کوئی اور شخص واپس آجائے گا۔'' کرنل نے جو بات کہی تھی وہ وزن رکھتی تھی۔ میں نے اسے غور سے سنا اور پھر کہا کہ اس کی درخواست جائز ہے لیکن اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دے سکوں مجھے اپنے تمام ساتھیوں سے ملنے کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت کوٹھڑیوں میں بند قیدیوں کی باہمی ملاقات ایک طرح سے ممنوع تھی۔ لیکن ایسی ملاقات کی اجازت طلب کرتے ہوئے میں اس سے درخواست کررہا تھا کہ قواعد میں خصوصی نرمی برتی جائے۔ وہ سمجھتا تھا اور میں بھی جان گیا کہ اسے اس پر غور کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔

چند روز کے اندر ولمز کی طرف سے مجھے پیغام ملا کہ وہ قیدیوں کے اجتماع کی اجازت دینے کو تیار ہے۔ ہم سب ایک سہ پہر احاطے میں جمع ہوئے جبکہ کوئی گارڈ ہماری نگرانی نہیں کررہا تھا۔ میں نے ساتھیوں کو بتایا کہ ولمز کیا کہتا ہے اور ان سے کہا کہ ہم اس وقت تھوڑی سی مفاہمت کرکے اپنے حالات طویل عرصے کے لیے بہتر بنا سکتے ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ کم از کم کام کرتے نظر آئیں گے لیکن جو کام ہم کریں گے وہ ایک ایسی رفتار سے ہوگا جو ہمارے لیے موزوں ہوگی۔ اس کے بعد سے ہم نے ایسا ہی کیا اور پھر کمانڈنگ آفیسر کی طرف سے کوئی شکایت نہ ملی۔

جمی کے انکشافات

ولمز کے دور کے ابتدائی حصے میں 72-1971ء میں گرفتار شدہ ''ایم کے'' کے سپاہی آتے چلے گئے۔ یہ لوگ میدان کارزار میں رہے تھے اور جلاوطنی میں تحریک کی حالت کے بارے میں خوب آگاہ تھے۔ میں اے این سی کے افراد کو جیل میں دیکھ کر کبھی خوش نہیں ہوا تھا مگر مجھے ان سے مل کر حالات جاننے کا بڑا اشتیاق تھا۔ میں آلیور تربیتی کیمپوں اور ایم کے کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے متعلق جاننا چاہتا تھا۔

''ایم کے'' کے لوگ انتہائی جنگجو تھے اور وہ جیل کی زندگی سے بہ آسانی مفاہمت نہیں کرتے تھے۔ اولیں آنے والوں میں ''ایم کے'' کا ایک افسر جمی اپریل تھا جس نے جوسلاوو سے تربیت پائی تھی اور رہوڈیشیا میں دشمن سے لڑ چکا تھا۔ ''ایم کے'' آہستہ آہستہ اپنے افراد کو جعلی شناختی دستاویزات کے ساتھ واپس جنوبی افریقہ میں داخل کر رہی تھی۔ جمی ان میں سے ایک تھا اور اب اسے جنوبی افریقہ گرفتار کر لیا گیا تھا۔

جمی نے ہمیں جنگ کی شاندار داستانیں سنائیں لیکن میں نے اس کو ایک طرف لے جا کر ''ایم کے'' کے مسائل کے متعلق پوچھا۔ چونکہ میں ''ایم کے'' کا بانی اور اس کا پہلا کمانڈر انچیف تھا، جمی اور دوسرے نووارد دوسروں کے بجائے مجھ سے جلد کھل جاتے تھے۔ اس نے مجھے کیمپس میں بے اطمینانیوں اور ''ایم کے'' کے افسروں کے کرتوتوں سے آگاہ کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ باتیں اپنے تک رکھے اور ایک خط خفیہ طور پر آلیور کو بھجوایا جس میں اسے مشورہ دیا کہ کیمپس میں بعض اصلاحات ضرور کی جانی چاہئیں۔

ایک روز میں ہیڈ آفس میں کرنل ولمز سے ملاقات کر رہا تھا جب میں نے جمی کو ایک اور افسر کے دفتر کے باہر کھڑے دیکھا۔ اس نے میری طرف مڑ کر تلخ لہجے میں کہا: ''وہ مجھے میرا خط دینے سے انکار کر رہے ہیں۔''

''کس بنا پر؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کہتے ہیں کہ اس میں ایسا مواد ہے جسے دیکھنے کی مجھے اجازت نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ میں افسر کے کمرے میں داخل ہوا تاکہ اس مسئلے پر بات کروں مگر اس سے پہلے کہ میں اپنا منہ کھولتا جمی نے بھڑک کر بلند آواز میں اس سے کہا: ''میرا خط مجھے دے دو۔'' وہ آفیسر کے ڈیسک تک پہنچنے کے لیے مجھے ایک طرف ہٹانے لگا تاکہ اپنا خط خود لے سکے۔ اس افسر نے خط پکڑ کر میرے پیچھے لہرایا جیسے وہ جمی سے تحفظ چاہتا ہو۔ یہ کسی فلم کا مزاحیہ منظر ہو سکتا تھا مگر اس وقت یہ اعصاب شکن تھا۔ میں نے جمی کی طرف مڑ کر خاموشی مگر سختی سے کہا: ''براہ کرم ایسا نہ کریں۔ پر کون رہیں۔ میں اس مسئلے کو نپٹا دوں گا اور یہ بندوست کروں گا کہ خط آپ کو مل جائے۔ اب براہ کرم چلے جائیں۔''

میری اس فہمائش کا مطلوبہ اثر ہوا اور جمی کمرے سے چلا گیا۔ پھر میں آفیسر کی طرف مڑا جو نہایت پریشان تھا۔ میں اس وقت عجیب پوزیشن میں تھا۔ میں حکام کی مخالفت نہیں کر رہا تھا بلکہ اپنے ساتھیوں اور ان آدمیوں کے مابین ثالثی کا فریضہ انجام دے رہا تھا جن کے خلاف میں اتنے عرصے سے لڑتا آیا تھا۔ ان لوگوں کی جنگجوئی جو جزیرے پر اب آ رہے تھے' مجھے اس پوزیشن میں بار بار لاتی رہی۔ اگرچہ ان کی انتہائی پسندی سے ہمیں حوصلہ ملتا تھا مگر بعض اوقات یہ لوگ ہماری روزمرہ کی زندگی کے بوجھ میں اضافہ کر دیتے تھے۔

ایک ہفتے کے اندر افسر نے جمی کا خط میرے حوالے کر دیا۔

جاپان کے لیے سمندر سے کھاد

ایک صبح کان کی صرف گامزن ہونے کے بجائے ہمیں حکم دیا گیا کہ ٹرک میں سوار ہو جائیں۔ ٹرک ایک نئی سمیت میں چل دیا اور پندرہ منٹ بعد ہمیں حکم ملا کہ باہر کود آئیں۔ ہم نے اپنے سامنے صبح کی روشنی میں چمکتے سمندر اور چٹانی ساحل کو دیکھا اور اس کے پاس کیپ ٹاؤن کے شیشے کے ٹاور دھوپ میں چمکتے نظر آ رہے تھے۔

اگر چہ یہ ایک فریب نظر تھا مگر شہر کیپ ٹاؤن جس کے پیچھے کوہ مائدہ (Table Mountain) متعلق تھا' حیرت انگیز طور پر قریب تر لگتا تھا جیسے آدمی اسے آگے بڑھ کر گرفت میں لے سکتا ہو۔

سینئر آفیسر نے وضاحت کی کہ ہمیں ساحل پر سمندری کائی اکٹھی کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ ہم سے کہا گیا کہ ہم کائی کے بڑے بڑے ٹکڑے چنتے جائیں جو مدوجزر سے ساحل پر آپڑے تھے اور اتھلے پانی میں چل کر اس کائی کو جمع کریں جو چٹانوں یا مونگوں سے چمٹی ہوئی تھی۔ کائی لمبی لمبی' پتلی اور بھورے سبز رنگ کی تھی۔ بعض ٹکڑے تو آٹھ آٹھ فٹ لمبے اور تیس تیس پونڈ وزنی تھے۔ اتھلے پانی سے کائی جمع کرنے کے بعد ہم اسے ساحل پر قطاروں میں پھیلا دیتے۔ جب وہ خشک ہو جاتی ہم اسے ٹرک میں لاد دیتے۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ بحری جہاز سے جاپان بھیجی جائے گی جہاں اس سے کھاد کا کام لیا جاتا ہے۔

اس روز ہمیں یہ کام کچھ زیادہ بوجھل نہ لگا مگر آنے والے ہفتوں اور مہینوں میں ہم نے اسے خاصا صبر آزما پایا۔ لیکن اس کی چنداں اہمیت نہ تھی کیونکہ ہمیں نوع بہ نوع مناظر اور خوشیاں دیکھنے کو مل جاتی تھیں۔ ہم جہازوں کو سمندر میں لڑھکتے اور بڑے بڑے آئل ٹینکروں کو افق کے پار آہستہ آہستہ حرکت کرتے دیکھتے رہتے۔ ہم مرغابیوں کو تیر کی طرح آ کر سمندر سے مچھلیاں پکڑتے کو لہروں سے نبرد آزما ہوتے دیکھتے۔ ہم پینگوئنوں کے جمگھٹے پر ہنستے جو بے ڈھب چوڑے پاؤں والے سپاہیوں کے بریگیڈر سے مشابہ تھے اور ہم کوہ مائدہ پر روزانہ پیش آنے والے ڈرامے پر حیران ہوتے جہاں باری باری بادلوں کا چھتر اور دھوپ ایک دوسرے کی جگہ لیتے تھے۔

ہم نے شاہی ظہرانے کے کھانے کھائے

سمندر خزانے کی ایک کان ثابت ہوا۔ مجھے مونگے کے خوبصورت اور چوڑے

سیپ ملتے جنہیں میں بعض اوقات کوٹھڑی میں لے آتا۔ ایک بار کسی کو ریت میں دبی شراب کی ایک بوتل ملی جو ابھی تک مہر بند تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ اس کا ذائقہ سر کے جیسا ہے۔ جیف ماسمولا پی اے سی کا آدمی ایک انتہائی باصلاحیت دے دیتے تھے، جنہیں وہ گھڑ کر عجیب وغریب شکلوں میں ڈھال دیتا تھا جن میں سے بعض کو ارڈر خریدنے کی پیشکش کرتے۔ اس نے میرے لیے ایک بک شیلف بنایا جسے میں کئی سال استعمال کرتا رہا۔ حکام ملاقاتیوں سے کہتے تھے کہ یہ شیلف ہم نے اسے فراہم کیا ہے۔

ساحل کی فضا کان کی نسبت زیادہ آرام دہ تھی۔ ہم ساحل پر آنا پسند کرتے تھے کیونکہ وہاں خوب کھانے کو ملتا تھا۔ ہر صبح جب ہم ساحل پر آتے تو ہم تازہ پانی کا ایک بڑا ڈرم ساتھ لاتے۔ بعد میں ہم ایک اور ڈرم لانے لگے جسے ہم ایک طرح کا جزیرہ روبن کا سمندری کھانا دم پخت کرنے کے لیے استعمال کرتے۔ اس دم پخت کھانے (Stew) کے لیے ہم شیل فش اکٹھی کرتے تھے۔ ہم کرے فش بھی پکڑ لیتے تھے جو چٹانوں کی درزوں میں چھپی ہوتی تھی۔ ایک کرے فش کو پکڑنا مہارت کا کام تھا۔ اسے اس کے سر اور دم کے درمیان سے مضبوطی سے پکڑنا پڑتا تھا، ورنہ وہ پھسل کر چھوٹ جاتی تھی۔

ایبالون، یا جنہیں ہم پرل موئن کہتے تھے، میری پسندیدہ غذا تھی۔ ایبالون گھونگے ہوتے ہیں جو چٹانوں سے سختی سے چمٹے ہوتے ہیں اور انہیں زور لگا کہ علیحدہ کرنا پڑتا۔ وہ بے ڈھب مخلوق تھے جنہیں کھولنا مشکل تھا اور اگر وہ کچھ زیادہ پک جاتے تو انہیں کھانا مشکل ہو جاتا۔

ہم اپنا شکار دوسرے ڈرم میں جمع کرتے رہتے۔ ولٹن امکوائی اس معاملے میں ہمارا اگرو تھا جو سٹیو تیار کرتا۔ جب وہ تیار ہو جاتا تو وارڈر ہمارے ساتھ آ ملتے اور ہم ساحل پر بیٹھ کر ایک طرح کے پکنک لنچ سے لطف اندوز ہوتے۔ 1973ء میں ایک

اسمگل شدہ اخبار میں ہم نے شہزادی این اور مارک فلپس کی شادی کے بارے میں پڑھا اور اس کہانی میں عروسی ظہرانے کے نادرونفیس کھانوں کا تذکرہ تھا۔ اس شاہی مینو میں شیل فش، کریفش اور ابالون بھی شامل تھے۔ اس پر ہمیں بڑی ہنسی آئی کہ ہم تو یہ نادر چیزیں روزانہ کھارہے تھے۔

ایک سہ پہر ہم ساحل پر اپنا سٹیو کھارہے تھے جب لیفٹیننٹ ٹربلانک' جو اس وقت سربراہ جیل تھا' اچانک معائنے کے لیے آنکلا۔ ہم نے جلدی سے کام میں مشغولیت کا بہانہ کیا لیکن ہم اسے بے وقوف نہ بنا سکے۔ جلد ہی اس نے دوسرا ڈرم دریافت کرلیا جس میں آگ پر شیل فش ڈالی' اسے چکھا اور پھر اعلان کیا۔''

Smaakik''............افرکان میں اس کا مطلب تھا''مزیدار۔''

قیدیوں کی یونیورسٹی

تحریک آزادی میں جزیرہ روبن ''یونیورسٹی'' کے نام سے معروف تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی تھی کہ ہم یہاں کتابیں پڑھتے تھے یا یہاں قیدی انگریزی' افرکان' آرٹ' جغرافیہ اور ریاضی پڑھتے تھے یا ہم میں سے بلی نائر' احمد کاتھرادا' مائیک ڈینگلیک اور ایڈی ڈینیلز جیسے افراد کئی ڈگریاں لے چکے تھے۔ جزیرہ روبن کے یونیورسٹی کہلانے کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہم یہاں ایک دوسرے سے سیکھتے تھے۔ ہم خود ہی اپنا ادارہ تھے' خود ہی اپنے پروفیسر تھے' خود ہی اپنا نصاب تھے' خود ہی اپنا کورس تھے۔ ہم نے نصابی مطالعے' جو سرکاری تھا' اور سیاسی مطالعے کے مابین' جو سرکاری نہیں تھا' ایک امتیاز قائم کردیا۔

ہماری یونیورسٹی نے جزوی طور پر ضرورت سے جنم لیا تھا۔ نوجوان آدمی جزیرے پر آتے تھے اور ہم سمجھتے تھے کہ انہیں اے این سی کی تاریخ کے متعلق بہت کم علم ہے۔ والٹر جو شاید اے این سی کا سب سے بڑا زندہ مورخ تھا وہ انہیں پارٹی کی تشکیل اور اس کے ابتدائی ایام کے متعلق بتانے لگا۔ اس کی تعلیم معقول اور پر تفہیم

ہوتی تھی۔ بتدریج یہ غیر رسمی تاریخ مطالعے کا کورس بن گئی جسے ہائی آرگن نے وضع کیا تھا اور جو سیلبس اے کہلانے لگا اور اس میں اے این سی جہد آزادی کے بارے میں دو سال کے لیکچر شامل تھے۔ سلیبس اے میں ایک کورس کیتھی پڑھاتا تھا جو ہندوستانی جدوجہد کی تاریخ پر مشتمل تھا۔ ایک اور کامریڈ رنگ دار لوگوں کی تاریخ پر لیکچر دیتا۔ میک' جو مشرقی جرمنی میں پڑھتا رہا تھا' مارکسزم پر لیکچر دیتا تھا۔

تعلیمی حالات مثالی نہیں تھے۔ سٹڈی گروپ کان پر اکٹھے کام کرتے اور سیمینار کے لیڈر کے اردگرد دائرہ بنا لیتے۔ طرز تعلیم اپنی نوعیت میں سقراطی تھا۔ لیڈر تصورات اور نظریات کی سوالات اور جوابات کے ذریعے وضاحت کرتے تھے۔

یہ والٹر کا کورس تھا جو ہماری تمام تعلیم کی روح رواں تھا۔ کئی نوجوان اے این سی ارکان جو جزیرے پر چلے آئے تھے' انہیں کوئی تصور نہیں تھا کہ پارٹی 1920ء اور 1930ء کے عشروں میں وجود میں آ چکی تھی۔ والٹر نہیں 1912ء میں اے این سی کے قیام سے لے کر زمانہ حال تک اس کی تاریخ سے آگاہ کرتا۔ کئی نوجوانوں کے لیے یہ واحد سیاسی تعلیم تھی جو انہوں نے کبھی حاصل کی۔

جب ان کورسوں کا جنرل سیکشن میں شہرہ ہوا تو ہمیں اس طرف کے آدمیوں سے بھی سوالات ملنے لگے۔ یہ ایک طرح سے جنرل سیکشن کے قیدیوں کی طرف سے خط و کتابت کورس کا آغاز تھا۔ استاد اپنے لیکچر ان تک اسمگل کر دیتے اور وہ جوابی طور پر اپنے سوالات اور تبصرے بھجوا دیتے۔

اس کا فائدہ ہمیں بھی ہوا اور انہیں بھی۔ ان لوگوں نے رسمی تعلیم تھوڑی ہی پائی تھی' لیکن انہیں دنیا کی سختیوں اور مشکلات کا خاصا علم تھا۔ ان کے خیالات فلسفیانہ ہونے کی بجائے زیادہ تر عملی نوعیت کے تھے۔ اگر کسی لیکچر میں یہ کہا جاتا کہ سوشلزم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ "ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے۔" اس کے جواب میں جو سوال ہمیں ملتا

وہ کچھ اس طرح کا ہوتا: ''ہاں! لیکن عملی زندگی میں اس کا کیا مطلب ہے؟ اگر میرے پاس زمین ہو اور رقم نہ ہو اور میرے دوست کے پاس رقم ہو مگر زمین نہ ہو تو ہم میں سے کس کی ضرورت زیادہ ہوگی؟'' ایسے سوالات بہت قابل قدر رہتے اور ان سے ہمیں اپنے نظریات کے بارے میں غور و فکر کا موقع ملتا تھا۔

کئی سال تک میں سیاسی اقتصادیات کا کورس پڑھاتا رہا۔ اس میں' میں انسان کے ابتدائی ایام سے حال تک اس کے اقتصادی ارتقاء کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا اور قدیم معاشروں سے جاگیرداری' سرمایہ داری اور سوشلزم تک کے انسانی سفر کا خاکہ پیش کرتا۔ میں کسی طرح ایک عالم فاضل نہیں ہوں اور نہ کوئی استاد ہوں' اس لیے میں عام طور پر لیکچر دینے کی بجائے سوالات پوچھنے کو ترجیح دیتا تھا۔ میری اپروچ نظریاتی نہیں تھی بلکہ یہ سوشلزم کے حق میں استوار تھی۔ جسے میں انسان کی اقصادی زندگی کا سب سے ترقی یافتہ مرحلہ خیال کرتا تھا۔

میں نے جیل میں ''وکالت'' جاری رکھی

میرے غیر رسمی مطالعے کے علاوہ میرا قانونی کام بھی جاری تھا۔ بعض اوقات میں اپنی کوٹھڑی کے باہر اپنے نام کی تختی لگانے کی سوچتا کیونکہ میں ہر ہفتے کئی کئی گھنٹے دوسرے قیدیوں کی عدالتی اپیلیں تیار کرنے پر صرف کرتا تھا اگرچہ جیل کے ضابطوں کی رو سے یہ ممنوع تھا۔ بہت مختلف سیاسی نظریات والے قیدی بھی میری مدد کے خواہاں ہوتے تھے۔

جنوبی افریقہ کا قانون ایک مدعا علیہ کو قانونی نماہندگی کے حق کی ضمانت نہیں دیتا، لہذا ایسی نماہندگی نہ ہونے کی وجہ سے ہر سال ہزاروں لاکھوں مقامی مرد اور عورتیں جیل جاتے تھے۔ چند ہی افریقی وکیل کرنے کی سکت رکھتے تھے۔ اور اکثر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ عدالت جو بھی فیصلہ صادر کرے اسے قبول کر لیں۔ جنرل سیکشن مین کئی آدمیوں کو وکیل کی سہولت کے بغیر سزا سنائی گئی تھی اور

ان میں سے بہت سوں نے اپیل تیار کرنے کے لیے میری خدمات حاصل کی تھیں۔ ان افراد میں سے اکثر کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ انہیں ایک وکیل سے واسطہ پڑا تھا۔

ایف یا جے سیکشن میں بند کسی قیدی کی طرف سے مجھ تک ایک نوٹ اسمگل کیا جاتا جس میں مدد کی درخواست کی گئی ہوتی۔ میں اس کیس کی تفصیلات، الزام، شہادت اور بیان حلفی طلب کرتا۔ ان تبادلات کی خفیہ نوعیت کے باعث معلومات آہستہ اور ٹکڑوں میں مجھ تک پہنچتیں۔ میرے پرانے منڈیلا اینڈ ٹیمبو دفتر میں اگر ایک مشاورت کو نصف گھنٹہ سے زیادہ جاری رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی تو جزیرے پر اس کے لیے ایک سال یا اس سے زیادہ عرصہ لگ سکتا تھا۔

میں اپنے موکلان کو ہدایت کرتا کہ وہ سپریم کورٹ کے رجسٹرار کے نام ایک خط لکھ کر مقدمے کا ریکارڈ منگوائیں۔ میں قیدی سے کہتا کہ وہ رجسٹرار کو آگاہ کر دے کہ اس کے پاس رقم محدود ہے لہذا اسے ریکارڈ سرکاری خرچ پر فراہم کیا جائے۔ بعض اوقات رجسٹرار اتنے مہربان ہوتے کہ وہ ریکارڈ سرکاری خرچ پر فراہم کر دیتے تھے۔

ایک دفعہ مقدمے کا ریکارڈ میرے پاس آجاتا تو میں ایک اپیل تیار کرتا جو عموماً کسی عدالتی بے قاعدگی پر مبنی ہوتی جیسا کہ تعصب، غلط طریقہ کار یا ناکافی شہادت۔ میں اپنے ہاتھ سے جج یا مجسٹریٹ کے نام ایک خط لکھتا اور پھر اسے دوسرے سیکشن مین بھجوا دیتا۔ چونکہ میرے لیے کسی آدمی کے مقدمے کی تیاری ضوابط کی خلاف ورزی تھی، میں قیدی کو ہدایت کرتا تھا کہ وہ اس خط کی نقل اپنے ہاتھ سے لکھے۔ اگر وہ لکھ نہ سکتا اور بہت سے قیدی نہیں لکھ سکتے تھے تو میں اس سے کہتا کہ وہ کسی اور کو ڈھونڈے جو اس کے لیے لکھ سکے۔

اس طرح میں اپنی قانونی مہارت کو تازہ رکھنے میں کامیاب رہا اور چند مقدمات

میں فیصلے الٹ گئے اور سزائیں کم ہوگئیں۔ یہ فتوحات اطمینان بخش تھیں۔ جیل قیدی کو بے بس ہونے کا احساس دلانے کے لیے ہوتی ہے اور میری کوششیں اس جمے جمائے نظام کو حرکت دینے کا ایک طریقہ تھیں۔ اکثر میں ان آدمیوں سے نہیں ملتا تھا جن کے لیے کام کرتا تھا اور بعض اوقات اچانک ایک شخص جو مجھے لنچ کے لیے دلیہ پیش کر رہا ہوتا وہ سرگوشی میں میرے اس کام کا شکریہ ادا کرتا۔

ونی کی دوسری قید

میری بیوی کا ابتلا ختم نہیں ہوا تھا۔ 1972ء میں سیکورٹی پولیس نے 8115 آرلینڈ وویسٹ کا دروازہ گرا دیا۔ کھڑکیوں میں سے اینٹیں اندر پھینکی گئیں۔ اگلے دروازے پر گولیاں داغی گئیں۔ 1974ء میں ونی پر بندش کے احکام کی خلاف ورزی کا الزام لگایا گیا جو اسے اپنے بچوں اور اپنے ڈاکٹر کے سوا کسی اور سے ملنے سے روکتے تھے۔ تب وہ ایک وکیل کے دفتر میں کام کر رہی تھی اور اس کے لنچ کے وقفے کے دوران ایک دوست زینی اور زندزی کو اس سے ملانے کے لیے لایا۔ اس پر ونی کو ملزم ٹھہرا کر چھ ماہ کی قید کی سزا سنا دی گئی۔ اسے اورنج فری سٹیٹ میں کرون سٹاڈ جیل میں رکھا گیا مگر یہاں اس کی قید پریٹوریا جیل کی قید جیسی خوفناک نہیں تھی۔ ونی نے مجھے خط لکھا کہ وہ اس مرتبہ جیل میں آزادی محسوس کرتی ہے اور اس سے جدوجہد آزادی سے اس کا اخلاص اور پختہ ہوگیا ہے۔ حکام اتوار کو زندزی اور زینی کو اس سے ملاقات کی اجازت دے دیتے تھے۔

جب ونی 1975ء میں رہا ہوئی تو ہم نے خطوط اور اپنے وکلاء سے رابطے کے ذریعے یہ اہتمام کیا کہ زندزی کی مجھ سے ملاقات کا منصوبہ تیار کیا جائے۔ جیل کے ضوابط یہ کہتے تھے کہ دو اور سولہ سال کے درمیان عمر کا کوئی بچہ کسی قیدی سے نہیں مل سکتا۔ جب میں جزیرہ روبن پر گیا تھا تو میرے تمام بچے عمر کی پابندیوں کے اس قانونی دائرے میں آتے تھے۔ اس پابندی کے پیچھے کوئی مضر مقصد کارفرما نہیں تھا۔

قانون سازوں کا مفروضہ یہ تھا کہ بچوں کی جیل میں آمد ان کی حساس نفسیات پر منفی اثر ڈالے گی۔ لیکن دوسری صورت میں قیدیوں پر بھی شاید اتنا ہی مضر اثر پڑتا ہے۔ اپنے بچوں کو دیکھنے کے قابل نہ ہونا انہیں گہرے صدمے سے دوچار کر دیتا ہے۔

1975ء میں زندزی پندرہ سال کی ہو گئی۔ منصوبہ یہ تھا کہ اس کی ماں کاغذات میں اس کی عمر تبدیل کر دے جس سے ظاہر ہو کہ وہ سولہ سال کی ہو گئی ہے، لہذا وہ مجھ سے ملاقات کر سکتی ہے۔ افریقیوں کے لیے پیدائش کے ریکارڈ یکساں یا منظم طریقے سے نہیں رکھے جاتے اور ونی نے اندازہ لگایا کہ اس کے لیے کاغذات میں ایسی تبدیلی کرنا کوئی مشکل نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ زندزی نسبتاً ایک سال پہلے پیدا ہوئی تھی۔ یوں اس نے اجازت نامے کے لیے درخواست دے دی اور وہ منظور ہو گیا۔

دسمبر میں زندزی کی طے شدہ ملاقات سے چند ہفتے پہلے ونی کی ماں مجھ سے ملنے آئیں جن کی ملاقات پہلے سے طے تھی۔ جب میں کمرۂ ملاقات میں آڑ کے پار نشست پر بیٹھ گیا تو میں نے ان سے کہا: ''اچھا، ما! میں بہت خوش ہوں کیونکہ میری زندزی سے ملاقات ہو رہی ہے۔'' میری ساس، جو سابق استانی تھیں، حیرت سے میری طرف دیکھنے لگیں اور پھر قدرے تلخ لہجے میں بولیں: ''نہیں، زندزی نہیں آ سکتی کیونکہ وہ ابھی سولہ سال کی نہیں ہوئی۔''

مجھے فوراً احساس ہوا کہ انہیں ہمارے حیلے کے بارے میں کسی نے بتایا ہی نہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے پیچھے ایک وارڈر تھا، لہذا میں نے فیصلہ کیا کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے، میں اسے سنی ان سنی کر دوں، چنانچہ میں نے کہا: ''ما! ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

میری آنکھیں چونکنے کے انداز میں کھل گئیں جس سے میرا پیغام انہیں مل گیا ہو گا کیونکہ اس کے بعد انہوں نے زندزی کا ذکر نہیں کیا۔

بیٹی سے بارہ سال بعد ملاقات

میں نے زندزی کو تین سال کی عمر کے بعد سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک ایسی بیٹی تھی جو اپنے والد کو یادداشت کی نسبت پرانی تصویروں سے پہچانتی تھی۔ اس صبح میں نے نئی قمیض پہنی تھی اور اپنا حلیہ درست کرنے میں معمول سے زیادہ وقت لیا۔ یہ میری خودنمائی تھی مگر میں اپنی نوجوان ترین بیٹی کے لیے بوڑھا آدمی دکھائی دینا پسند نہیں کرتا تھا۔

شروع میں زندزی شرمیلی اور محتاط دکھائی دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لیے یہ آسان نہیں تھا کہ آخر کار وہ اپنے باپ سے مل رہی تھی جس کو وہ کبھی نہیں جان پائی تھی، وہ باپ جو اس سے صرف دور سے پیار کرسکتا تھا، جو بظاہر اس سے تعلق نہیں رکھتا تھا بلکہ قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے دل کی گہرائی میں کہیں ایک ایسے باپ کے لیے ناراضی اور غصے کا جذبہ پروان جڑھا ہوگا جو اس کے بچپن اور جوانی کے دوران گھر سے غائب رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک مضبوط اور آتش مزاج نوجوان عورت ہے جیسے اس کی ماں تھی جب وہ زندزی کی عمر کی تھی۔

میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے قید میں مل کرنا آسودگی محسوس کرے گی، لہذا میں نے ماحول کو پرلطف بنانے کی کوشش کی۔ جب وہ وارد ہوئی تو میں نے کہا: ''کیا تم میرے گارڈ آف آنر سے ملی ہو؟'' یہ کہتے ہوئے میں نے ان وارڈروں کی طرف اشارہ کیا جو ادھر ادھر موجود تھے۔ میں نے اس کی زندگی کے بارے میں سوالات کیے، اس کے سکول اور اس کے دوستوں کے بارے میں پوچھا اور پھر اسے ان پرانے دنوں میں لے جانے کی کوشش کی جو اسے بمشکل یاد تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح اتوار کی صبحیں اکثر مجھے یاد آتی ہیں جب میں اسے اپنے گھٹنوں پر نچایا کرتا تھا جبکہ اس کی ماں باورچی خانے میں ''روسٹ'' تیار کررہی ہوتی۔ میں نے آرلینڈو میں پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات اور مہمات کی یادیں

تازہ کس جب وہ بچی تھی اور اسے بتایا کہ کس طرح وہ شاذونادر ہی چیختی تھی جب وہ چھوٹی تھی۔ شیشے میں سے میں دیکھ رہا تھا کہ وہ میری باتیں سنتے ہوئے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کررہی تھی۔

برام فشر کی المناک رحلت

اس ملاقات کا ایک المناک لمحہ وہ تھا جب ونی نے مجھے بتایا کہ برام فشر جیل سے رہا ہونے کے فوراً بعد سرطان سے مرگیا ہے۔ برام کی موت نے مجھے بےحد متاثر کیا۔ اگرچہ بظاہر حکومت براہ راست برام کی موت کی ذمے دار نہیں تھی، یہ حکومت کی اسے مسلسل ہراساں کرنے کی پالیسی ہی تھی جس کے نتیجے میں آخرکار اسے بیماری نے آگھیرا جو اتنی جلد اس کی جان لے گئی۔ انہوں نے اس کی موت کے بعد بھی معاف نہ کیا۔ حکومت نے اس کے کریا کرم کے بعد اس کی راکھ اپنی تحویل میں لے لی۔

برام ایک فصیح البیان شخص تھا اور مقدمہ رائیو دنیا کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ زیرزمین رہ کر اور ایک مفرور کی زندگی گزار کر تحریک آزادی کی بہترین خدمت کر سکتا ہے۔ یہ امر اس کے ضمیر پر بڑا بوجھ تھا کہ وہ عدالت میں جن لوگوں کی نمائندگی کررہا تھا وہ تو جیل جارہے تھے جبکہ وہ آزاد تھا۔ مقدمے کے دوران میں نے برام کو مشورہ دیا کہ وہ یہ راستہ اختیار نہ کرے۔ میں نے برملا کہا کہ اس نے عدالت میں تحریک کی بہترین نمائندگی کی تھی جہاں لوگوں نے ایک جج پریذیڈنٹ کے اس افریکنز بیٹے کو بےکس عوام کے حقوق کیلئے لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن وہ طبعی طور پر دوسروں کو مصائب میں مبتلا ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا جبکہ وہ خود آزاد تھا ایک جنرل کی طرح جو محاذ پر اپنے سپاہیوں کے ساتھ شانہ بشانہ لڑتا ہے۔ برام نہیں چاہتا تھا کہ وہ دوسروں سے قربانی دینے کو کہے جبکہ وہ خود قربانی دینے کو تیار نہ ہو۔

برام ضمانت کے دوران زیرزمین چلا گیا تھا۔ 1965ء میں اسے گرفتار کرلیا گیا

اور سبوتاژ کے ارتکاب کی سازش کے جرم میں عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔ میں نے جیل میں اسے خط لکھنے کی کوششیں کی تھی مگر ضوابط قیدیوں کو ایک دوسرے سے خط و کتابت کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ جب اس کے سرطان کی تشخیص ہو گئی تو اخبارات میں مطالبہ کیا جانے لگا کہ اسے انسانی بنیادوں پر رہا کر دیا جائے اور حکومت اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی۔ حکام نے اسے رہا کر کے بلوم فونٹین میں اس کے بھائی کے گھر پہنچا دیا اور اس کے چند ہفتے بعد نظر بندی ہی کی حالت میں وہ اگلے جہان سدھار گیا۔

برام فشر، اورنج ریور کالونی کے وزیر اعظم کا پوتا تھا۔ کئی لحاظ سے اس نے عظیم ترین قربانی پیش کی۔ میں نے آزادی کی راہ میں خواہ کتنے ہی مصائب اٹھائے مجھے اس حقیقت سے قوت ملتی تھی کہ میں اپنی قوم کے لیے اس کے ہمدوش لڑ رہا ہوں۔ اس کے برعکس برام ایک آزاد آدمی تھا جو دوسروں کو آزادی دلانے کے لیے اپنے ہی قوم کے خلاف لڑتا رہا۔

سربراہ جیل سے دوبدو جھڑپ

اس ملاقات کے ایک ماہ بعد مجھے ونی کا پیغام ملا کہ اس کی ملاقات کے لیے حالیہ درخواست حکام کی طرف سے اس بنا پر رد کر دی گئی ہے کہ میں اس سے ملنا نہیں چاہتا۔ میں نے فوراً لیفٹینینٹ پرنس سے وقت طے کر کے ملاقات کی جو اس وقت سربراہ جیل تھا اور شدید احتجاج کیا۔

پرنس کوئی ایسا شخص نہیں تھا جسے شائستہ کہا جا سکے۔ جب میں اس سے ملنے اس کے دفتر میں گیا تو میں نے ساری صورت حال صاف صاف اور کسی دلی عناد کے بغیر بیان کی۔ لیکن میں نے کہا کہ صورت حال جو بن گئی ہے نا قابل قبول ہے اور یہ کہ میری بیوی کو مجھ سے ملاقات کی اجازت ملنی چاہیے۔

یوں لگتا تھا پرنس میری بات پر کان نہیں دھر رہا اور جب میں نے اپنی بات ختم کی

تو اس نے کہا: ''آ، منڈ یلا! تمہاری بیوی صرف پبلسٹی کی خواہاں ہے۔'' میں نے اسے بتایا کہ مجھے اس ریمارک پر صدمہ پہنچا ہے اور میری بات ختم ہونے سے پہلے جب اس نے میری بیوی کے متعلق ایک انتہائی اشتعال انگیز اور ناشائستہ بات کہی تو میرے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔

میں کرسی سے اٹھا اور میز کے گرد ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ پرنس پیچھے ہٹنے لگا مگر جلد ہی میں نے اپنے آپ کو روک لیا۔ اس پر مکے برسانے کے بجائے جیسا کہ میں کرنے والا تھا، میں نے اس پر الفاظ کی بوچھاڑ کر دی۔ میں ایسا شخص نہیں جو قسمیں کھائے یا لعنتیں بھیجے مگر اس روز میں نے اپنے ہی اصول کی خلاف ورزی کی۔ میں نے آخر میں اس سے کہا کہ وہ قابل نفرت آدمی ہے جس کی کوڑی کی عزت نہیں اور یہ کہ اگر اس نے پھر کبھی ویسے الفاظ کہے تو میں اس روز کی طرح اپنے آپ کو نہیں روک سکوں گا۔

میں اپنی بات کہہ کر مڑا اور اس کے دفتر سے نکل آیا۔ جب میں باہر آ رہا تھا میں نے باہر کیتھی اور ایڈی کو دیکھا مگر انہیں سلام تک نہ کیا اور واپس اپنی کوٹھڑی میں چلا آیا۔ اگرچہ میں نے پرنس کو خاموش کر دیا تھا اس نے مجھے اپنے ضبط نفس کی خلاف ورزی پر مجبور کیا تھا اور میں اسے اپنے مخالف کے ہاتھوں اپنی شکست پر محمول کرتا تھا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد دو وارڈر میری کوٹھڑی میں داخل ہوئے اور مجھے اطلاع دی کہ مجھے ہیڈ آفس میں طلب کیا گیا ہے۔ جب میں دفتر پہنچا تو نصف درجن مسلح وارڈروں نے مجھے گھیر لیا۔ پرے ایک طرف لیفٹیننٹ پرنس موجود تھا اور اس حلقے کے اندر ایک وارنٹ آفیسر تھا جو جیل پراسیکیوٹر تھا۔ ماحول کیشدہ تھا۔

''اچھا، منڈ یلا!'' پراسیکیوٹر بولا۔ ''مجھے پتہ چلا ہے کہ کل تمہارے ساتھ خیریت گزری مگر آج کا دن اتنا خوشگوار نہیں ہوگا۔ میں تمہیں جیل کے سربراہ کی توہین

کرنے اور اسے دھمکانے کا ملزم ٹھہراتا ہوں۔ یہ سنگین الزام ہے۔" پھر اس نے سمن میرے حوالے کیے۔

"کیا تمہیں کچھ کہنا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ میرے وکیل سے بات کر سکتے ہیں۔" پھر میں نے کہا کہ مجھے کوٹھڑی میں واپس پہنچا دیا جائے۔ پرنس ایک بھی لفظ نہ بولا۔

جیل کے حکام پر جوابی مقدمہ

میں جانتا تھا مجھے کیا کرنا ہے۔ یہ کہ ایک جوابی مقدمہ تیار کروں اور لیفٹیننٹ پرنس سے لے کر وزیر انصاف تک ہر کسی کو بدعملی کا ملزم ٹھہرا دوں۔ مجھے پورے جیل سسٹم کو نسل پرست ادارہ ثابت کرنا تھا جو گوروں کے غلبے کا تسلسل جاری رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے اس مقدمے کو Cause celebre بنانا تھا اور حکام کو پچھتاوے میں ڈالنا تھا کہ انہوں نے مجھ پر الزام لگایا ہی کیوں۔

میں نے جارج بیزوس سے کہا کہ وہ میری نمائندگی کرے چنانچہ ایک ملاقات جلد طے پا گئی۔ جارج کی آمد سے پہلے میں نے حکام کو مطلع کیا کہ میں اسے تحریری ہدایات دوں گا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کیوں؟ تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے شبہ ہے کمرہ ملاقات میں جاسوسی کے آلات نصب ہیں۔ اب حکام نے مجھے ایک تحریری بیان دینے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں صرف زبانی بیان دوں۔ میں نے کہا کہ انہیں اجازت روکنے کا کوئی حق نہیں اور یہ کہ ان کی اس حرکت سے میرے شبہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ حکام کو خدشہ تھا کہ جارج میرے تحریری بیان کو پریس تک پہنچا دے گا۔ یہی ہماری سٹراٹیجی کا حصہ تھا۔ انہیں یہ بھی تشویش تھی کہ میں لوسا کا میں آلیور ٹیمبو سے رابطے کے لیے جارج کو وسیلہ بنا رہا تھا اور ان کے خیال میں میرے تحریری بیان میں حساس معلومات شامل ہوں گی۔ میں نے پہلے جارج کو ان مقاصد

کے لیے استعمال کیا تھا لیکن زیر بحث تحریری بیان میں کوئی ایسا مواد شامل نہیں تھا۔

جزیرے کی تعزیری عدالت کے لیے ایک تاریخ طے پا گئی اور کیپ ٹاؤن سے ایک مجسٹریٹ کا تقرر رہوا اور مجھے بتایا گیا کہ میرا وکیل اگلے روز آئے گا اور میں اسے اپنا تحریری بیان دینے کے لیے آزاد ہوں گا۔ میں صبح ہیڈ آفس میں جارج سے ملا اور ہم نے عدالت کے اجلاس سے پہلے مختصر مشاورت کی لیکن جیسے ہی ساعت کا آغاز ہوا پراسیکیوٹر نے اعلان کیا کہ جیل اس مقدمے کو واپس لے رہی ہے۔ جج نے موگری بجا کر اجلاس کے خاتمے کا اعلان کیا اور فوراً ہی کمرے سے چلا گیا۔ جارج اور میں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہم نے اس مبینہ فتح پر ایک دوسرے کو مبارک دی۔ میں اپنے کاغذات الگ رکھ رہا تھا جب ایک اور وارنٹ آفیسر میرے پاس آیا اور اس نے میرے تحریری بیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''یہ فائل مجھے دے دو۔''

میں نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ یہ میرے اور میرے وکیل کے درمیان ایک خفیہ معاملہ ہے۔ میں نے پراسیکیوٹر کو بلایا اور اس سے کہا: ''اس شخص کو بتا دو کہ ان کاغذات کو وکیل کا تحفظ حاصل ہے اور یہ کہ میں انہیں اس کے سپرد نہیں کروں گا۔''

پراسیکیوٹر نے جواب دیا کہ بات درست ہے لیکن اب مقدمہ ختم ہو چکا ہے، عدالت برسر اجلاس نہیں اور کمرے میں واحد مجاز حاکم وارنٹ آفیسر ہے۔ تب آفیسر نے میز پر سے کاغذات اٹھا لیے اور میں اسے روکنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حکام نے صرف میرے کاغذات پر قبضہ کرنے کے لیے مقدمہ واپس لیا تھا جن میں جیسا کہ انہیں پتہ چلا کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے وہ پہلے سے نہ جانتے ہوں۔

جزیرے سے فرار کا نیا منصوبہ

جیسا کہ فرار ایک ناممکن بات لگتی تھی، میں نے اس پورے عرصے کے دوران فرار ہونے کا کبھی نہ سوچا جو میں نے جزیرے پر گزارا۔ میک مہاراج اور ایڈی ڈینیلز دونوں بہادر اور زرخیز دماغ رکھتے تھے۔ وہ ہمیشہ منصوبے گھڑتے اور امکانات پر بحث کرتے رہتے تھے۔ ان کے بیشتر منصوبے بہت خطرناک تھے لیکن اس کے باوجود وہ ان پر غور کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔

ہم نے بعض پیشرفتیں کی تھیں۔ جیف مازی مولا جو ہمارا ماسٹر دستکار تھا، اس نے ایک ایسی چابی تیار کی جو ہمارے سیکشن اور اس کے اردگرد کے بیشتر دروازوں کو کھول سکتی تھی۔ ایک دن ایک وارڈر ہماری راہداری کے سرے پر دفتر میں ڈیسک پر چابی چھوڑ گیا تھا۔ جیف نے صابن کا ایک ٹکڑا لیا اور اس پر چابی کا نشان بنا لیا۔ اس خاکے سے کام لے کر اس نے ایک دھاتی ٹکڑا لیا اور اسے ایک چابی کی شکل دے دی۔ اس سے ہمیں اپنی کوٹھڑیوں کے پیچھے بعض سٹور روموں اور تنہائی سیکشن تک رسائی حاصل ہوگئی۔ لیکن ہم نے اسے اپنے سیکشن سے نکلنے کے لیے کبھی استعمال نہ کیا۔ آخر ہمارے سامنے سمندر تھا جو جزیرہ روجن سے نکلنے کے لیے ناقابل عبور تھا۔

1974ء میں میک نے اس رکاوٹ کو پار کرنے کی ایک ترکیب سوچی۔ اسے حال ہی میں کیپ ٹاؤن میں ایک ماہر دندان ساز کے پاس لے جایا گیا تھا اور اسے معلوم ہوا تھا کہ خود دندان ساز ایک معروف سیاسی قیدی کا شادی کے حوالے سے رشتے دار ہے۔ دندان ساز ہمدرد تھا۔ اس نے میک کا اس وقت تک علاج کرنے سے انکار کر دیا تھا جب تک اس کی بیڑیاں نہ اتاری جائیں۔ میک نے یہ بھی مشاہدہ کیا تھا کہ دندان ساز کے دوسری منزل پر واقع ویٹنگ روم کی کھڑکی ایک چھوٹی گلی میں کھلتی تھی جہاں سے ہم فرار ہو سکتے تھے۔

جب میک واپس آیا، وہ ہم میں سے بعض ساتھیوں سے ملا اور اس نے زور دیا

کہ ہم دندان ساز سے وقت طے کرلیں۔ہم نے ایسا ہی کیا اور پھر ہمیں بتایا گیا کہ میک، ولٹن امکوائی میرے اور ایک اور قیدی کے لیے کیپ ٹاؤن جانے کا دن طے پا گیا ہے۔ہم تینوں کوشش کرنے پر رضامند تھے لیکن جب میک نے چوتھے آدمی سے رابطہ کیا تو اس نے ہمارے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ہمیں اس آدمی کی وفاداری کے بارے میں شبہات تھے اور مجھے تشویش تھی کہ وہ جانتا ہے کہ ہم کیا منصوبہ بندی کرر ہے تھے۔

ہم تینوں کو کشتی میں کیپ ٹاؤن اور پھر سخت پہرے میں ڈینٹسٹ کے کلینک پر لے جایا گیا۔ہم تینوں فوجی تربیت حاصل کر چکے تھے اور ہمارے پاس فرار کو عملی جامہ پہنانے کا بہترین موقع تھا۔میک کے پاس ایک چاقو بھی تھا اور ہمارے پاس فرار کو عملی جامہ پہنانے کا بہترین موقع تھا۔میک کے پاس ایک چاقو بھی تھا اور وہ اسے استعمال کرنے کو تیار تھا۔دندان ساز کے کلینک پر سپاہیوں نے دیگر تمام مریضوں کو پہلے ہی فارغ کر دیا تھا۔ہم نے مطالبہ کیا کہ ہمارے پاؤں کی بیڑیاں ہٹائی جائیں اور دندان ساز کی تائید پر ہمارے محافظوں نے بیڑیاں اتار دیں۔میک ہمیں اوپر کھڑکی تک لے گیا اور اس نے اشارے سے وہ گلی دکھائی جہاں سے ہمارے فرار کا راستہ نکلتا تھا۔لیکن جیسے ہی اس نے گلی پر نگاہ ڈالی، کسی بات نے اسے پریشان کر دیا۔ہم دوپہر کے وقت کیپ ٹاؤن کے وسط میں تھے، پھر بھی گلی خالی تھی، جب وہ پہلے یہاں آیا تھا اس وقت گلی ٹریفک سے بھری ہوئی تھی۔''یہ ہمارے لیے پھندا ہے۔'' میک نے سرگوشی کی۔مجھے بھی احساس تھا کہ کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ہے۔ولٹن جس کا بلڈ پریشر بڑھ رہا تھا، کہنے لگا: ''میک احمقانہ بات کر رہا ہے۔'' پھر مجھ سے بولا: ''مادیبا! تمہارے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ رہے ہیں۔'' لیکن میں، میک سے متفق تھا چنانچہ ہم تینوں نے فرار کا منصوبہ ترک کر دیا اور اپنے دانتوں کا معائنہ کرانے ہی پر اکتفا کیا۔دندان ساز کو حیرت تھی کہ جب میرے دانت ٹھیک تھے تو میں ان کے

ساتھ کیوں آیا تھا۔

جبکہ میک فرار کے عملی منصوبوں پر غور کرتا تھا، ایڈی ڈینیلز، ہمیشہ تصوراتی منصوبوں کے بارے میں سوچ بچار کرتا رہتا۔ ابتدائی برسوں کے دوران طیاروں کو جزیرے پر سے پرواز کرنے کی اجازت نہیں تھی لیکن عشرہ 1970ء کے وسط تک ہم نے دیکھا کہ نہ صرف طیارے ہمارے سروں پر پرواز کرنے لگے تھے بلکہ ان ٹینکروں تک ہیلی کاپٹر بھی آنے جانے لگے تھے جو ساحل سے پرے سمندر میں رواں ہوتے تھے۔ ایک روز ایڈی ایک منصوبہ لے کر میرے پاس آیا جس کے مطابق ہماری تنظیم کو ایک ہیلی کاپٹر استعمال کرنا تھا، جس پر جنوبی افریقی فوج کے رنگ کیے ہوتے۔ یہ ہیلی کاپٹر مجھے جزیرے سے اٹھاتا اور پھر کیپ ٹاؤن میں ہمارے ہمدرد ایک غیر ملکی سفارت خانے کی چھت پر اتار دیتا جہاں میں پناہ لے لیتا۔ بظاہر یہ منصوبہ کچھ غلط نہیں لگتا تھا، چنانچہ میں نے ایڈی سے کہا کہ وہ اس تجویز کو لوساکا میں آلیور تک پہنچا دے۔ ایڈی نے اپنا منصوبہ لوساکا پہنچا دیا لیکن ہمیں کبھی اس کی طرف سے جواب نہ ملا۔

جیل میں خودنوشت

جزیرہ روبن پر سالگرہ کی تقریبات بس نام کی ہوتی تھیں۔ کیک اور تحفوں کی بجائے ہم اپنی خوارک ایک جگہ جمع کر لیتے اور جس کی سالگرہ ہوتی اسے زائد ڈبل روٹی یا کافی کی پیالی دی جاتی۔ فیکا کل بام اور میں ایک ہی تاریخ یعنی 18 جولائی کو پیدا ہوئے تھے۔ میں کرسمس پر خریدی ہوئی مٹھائی بچا رکھتا تھا اور اپنی مشترکہ سالگرہ پر ہم مل کر کھاتے۔ 1968ء میں میری پچاسویں سالگرہ کسی ہنگامے کے بغیر گزر گئی تھی لیکن 1975ء میں جب میں 57 سال کا ہوا تو والٹر اور کیتھی میرے پاس ایک لمبا چوڑا منصوبہ لے کر آئے جس کے مطابق میری ساٹھویں سالگرہ یادگار طریقے سے منائی جانی تھی۔

ایک مسئلہ جو ہمیشہ مجھے تشویش میں مبتلا رکھتا تھا، یہ تھا کہ جہادِ آزادی کا تصور عوام کے سامنے کیسے رکھا جا ہے۔ گزشتہ دہائیوں میں حکومت نے بیشتر ترقی پسند پریس کو خاموش کر دیا تھا اور نظر بند یا قید افراد کے بارے میں تحریری یا تصویری مواد شائع کرنے پر قانونی ممانعت لاگو تھی۔ ایک ایڈیٹر جیل جا سکتا تھا اور اس کا اخبار بند ہو سکتا تھا اگر وہ میرا یا میرے ساتھیوں کا فوٹو شائع کر دیتا۔

ایک روز کیتھی، والٹر اور میں صحن میں باتیں کر رہے تھے جب انہوں نے تجویز پیش کی کہ مجھے اپنی یادداشتیں لکھنی چاہئیں۔ کیتھی کا کہنا تھا کہ ایسی کتاب کی اشاعت کا بہترین وقت میری ساٹھویں سالگرہ کا ہوگا۔ والٹر نے کہا کہ اگر یہ داستان ٹھیک ٹھیک بیان کر دی گئی تو یہ لوگوں کو یاد دلائے گی کہ ہم کس مقصد کے لیے لڑتے رہے ہیں اور ابھی تک لڑ رہے ہیں۔ اس نے مزید کہا کہ نوجوان مجاہدین آزادی کے لیے یہ جوشِ عمل کا سرچشمہ ثابت ہوگی۔ اس تصور نے مجھے اپیل کیا اور ایک اور گفتگو کے دوران میں اس کام کو شروع کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

جب میں کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہوں تو فوراً ہی آغاز کرنا پسند کرتا ہوں، چنانچہ میں اس منصوبے میں پوری طرح کھو گیا۔ میں نے کام کا ایک نیا طریقہ اپنایا۔ میں رات کے بیشتر حصے میں لکھتا اور دن کے دوران سوتا۔ پہلے ایک دو ہفتوں کے دوران میں رات کے کھانے کے بعد قیلولہ کر لیتا تھا، پھر دس بجے اٹھتا اور ناشتے کے وقت تک لکھتا رہتا۔ کان پر کام کرنے کے بعد رات کے کھانے تک سوتا رہتا اور پھر وہی وظیفہ شروع ہو جاتا۔ چند ہفتے گزرنے پر میں نے حکام کو اطلاع دی کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں، لہذا میں کام پر نہیں جا سکوں گا۔ انہیں بظاہر کوئی اعتراض نہ تھا، لہذا اس وقت سے میں دن کے بیشتر حصے میں سونے لگا۔

مسودے کو سنوارنے کے لیے ہم نے ایک اجتماعی لائن اختیار کی۔ ہر روز میں جو کچھ لکھتا اسے کیتھی تک پہنچا دیتا جو اس پر نظر ثانی کرتا اور پھر پڑھ کر والٹر کو سناتا۔ پھر

کیتھی اپنے تاثرات حاشیہ پر لکھ دیتا۔ والٹر اور کیتھی نے مجھ پر تنقید کرنے میں کبھی تامل نہیں کیا اور میں نے ان کی تجاویز کو ہمیشہ دل میں جگہ دی اور اکثر ان کی مجوزہ تبدیلیاں متن میں شامل کیں۔ یہ نشان زدہ مسودہ لالو چیبا کے سپرد کیا جاتا جو اگلی رات میری تحریر کو اپنی خردبینی تحریر میں منتقل کرتا۔ وہ فل سکیپ دس صفحات کو ایک چھوٹے صفحے میں سمو دیتا۔ اب یہ میک کا کام ہوتا کہ اس مسودہ کو بیرونی دنیا تک اسمگل کردے۔

وارڈروں کو شک ہو گیا۔ وہ میک کے پاس گیے اور اس سے پوچھا: ''یہ منڈیلا کیا کر رہا ہے؟ وہ رات دیر تک بیٹھا رہتا ہے؟'' لیکن میک نے صرف کندھے اچکا دیئے اور کہا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ میں تیزی سے لکھتا رہا اور چار ماہ میں ایک مسودہ مکمل کرلیا۔ میں کسی لفظ یا جملے کے انتخاب میں تامل نہیں کرتا تھا۔ میں نے اپنی پیدائش سے لے کر مقدمہ رائیونیا تک کا عرصہ سمیٹ لیا اور جزیرہ روبن کے بارے مین کچھ نوٹس پر اختتام کیا۔

میں جب اپنے تجربات لکھتا تھا تو وہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتے تھے۔ ان راتوں میں جب میں خاموشی سے لکھتا تھا، مجھے ایک بار پھر قونو اور اتی کیزونی میں گزرے اپنی جوانی کے مناظر اور آوازوں کا تجربہ ہوتا تھا، جوہانسبرگ آنے کی خوشی اور خوف، یوتھ لیگ کے طوفانی ایام، مقدمہ بغاوت کی نہ ختم ہونے والی تاخیریں اور رائیونیا کا ڈرامہ۔ یہ ایک جاگتے کا خواب تھا اور میں اسے اتنی سادگی اور سچائی سے الفاظ میں منتقل کرنے کی کوشش کرتا تھا جتنا کہ ممکن تھا۔

ہم نے مسودہ دفن کردیا

میک بڑی مہارت سے مسودے کی نقل کو اپنی بہت سی کاپیوں کی جلدوں میں چھپا دیتا تھا جنہیں وہ اپنے مطالعے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ اس طرح وہ پورے متن کو حکام سے چھپانے میں کامیاب رہا اور جب 1976ء میں وہ رہا ہوا تو اسے

اپنے ساتھ اسمگل کر کے لے گیا۔ انتظام یہ تھا کہ جب مسودہ باحفاظت ملک سے باہر چلا جائے گا تو وہ خفیہ طور پر مجھے اطلاع دے گا اور پھر ہم اصل مسودہ ضائع کر دیں گے۔ اس دوران ہمیں پانچ سو صفحات کے مسودے کو ٹھکانے لگانا تھا۔ ہم نے وہی کام کیا جسے ہم سمجھتے تھے کہ ہم کر سکتے ہیں۔ ہم نے اسے احاطے کے باغیچے میں زمین میں دبا دیا۔ ان دنوں احاطے کی دیکھ بھال اور نگرانی کم ہی ہوتی تھی۔ وارڈر عموماً احاطے کے شمالی سرے پر دفتر میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ اس دفتر سے انہیں جنوبی سرا اور وہ علاقہ تنہائی نظر آتا تھا، جہاں چھوٹا باغیچہ واقع تھا۔ میں اپنی ابتدائی صبح کی سیروں کے دوران کبھی کبھی اس علاقے کا جائزہ لیتا رہا تھا، چنانچہ میں نے مسودے کو یہیں دفن کرنے کا فیصلہ کیا۔

بڑا گڑھا کھودنے سے بچنے کے لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ اسے تین مختلف جگہوں پر دفن کیا جائے۔ ہم نے اسے دو چھوٹے حصوں اور ایک بڑے حصے میں تقسیم کیا اور ہر ایک کو پلاسٹک میں لپیٹ کر کوکو کے خالی ڈبے میں رکھ دیا۔ یہ کام تیزی سے کیا جانا تھا اور میں نے جیف مازی مولا سے کہا کہ وہ کھدائی کے اوزاروں کا بندوبست کرے۔ چند روز کے اندر اندر میرے پاس کئی تیز آہنی سلاخیں جمع ہو گئیں۔

ایک صبح ناشتے کے بعد کیتھی، والٹر، ایڈی ڈینیلز اور میں احاطے کے جنوب میں باغیچے تک پہنچے اور بظاہر ہم سیاسی گفتگو میں مصروف نظر آتے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس مسودے کے حصے قمیضوں میں چھپے ہوئے تھے۔ میری طرف سے اشارہ پا کر سب جھک کر کھدائی کرنے لگے۔ میں وسط میں کھدائی کرنے لگا جہاں ایک مین ہول کا ڈھکن تھا جو گٹر کے پائپ تک جاتا تھا۔ جب میں پائپ تک پہنچا، میں نے اس کے نیچے زمین کھودی اور وہاں تینوں میں سے سب سے بڑا ڈبہ رکھ دیا۔ دوسروں نے اپنے حصے کے دو اتھلے گڑھے کھودے تھے۔ ہم نے یہ کام وقت پر ختم کر لیا تاکہ کان کی طرف جانے کے لیے قطار میں شامل ہو جائیں۔ جب میں اس

صبح چل رہا تھا تو مجھے اطمینان کا احساس ہو رہا تھا کہ مسودہ حفاظت سے دفن کر دیا گیا ہے۔اس کے بعد میں نے اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔

ہماری چال الٹی پڑی

چند ہفتے بعد جب ہمارے جاگنے کی پکار گونجی، اس کے فوراً بعد مجھے احاطے میں ایک آواز سنائی دی جس نے مجھے پریشان کر دیا۔ یہ بیلچوں اور کدالوں سے زمین کھودنے کی آواز تھی۔ جب ہمیں کوٹھڑیوں سے باہر نکل کر نہانے کی اجازت ملی، میں راہداری کے سرے تک گیا اور دروازے کے باہر ادھر ادھر جھانک کر دیکھا۔ وہاں احاطے میں جنرل سیکشن کے آدمی کھدائی کر رہے تھے۔ میں چونک پڑا۔ وہ اس جگہ کی کھدائی کر رہے تھے جہاں مسودہ دفن کیا گیا تھا۔

حکام نے قید تنہائی کے سیکشن کے سامنے ایک دیوار بنانے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ انہیں معلوم ہوا تھا کہ تنہائی کے قیدی احاطے میں ہم سے رابطہ قائم کر لیتے تھے۔کام کرنے والا عملہ دیوار کی کنکریٹ بھری بنیادوں کے لیے ایک اتھلی کھائی کھود رہا تھا۔

غسل کرنے کے دوران میں نے والٹر اور کیتھی کو اطلاع دی کہ باہر کھدائی ہو رہی ہے۔کیتھی کا خیال تھا کہ مسودے کا بڑا حصہ جو پائپ کے نیچے دفن ہے، غالباً محفوظ رہے گا۔لیکن دوسرے دو حصے برآمد ہو سکتے ہیں۔ جب ناشتے کے دلیے کے ڈرم پہیوں پر لائے گئے تو کام کے انچارج وارڈروں نے کھدائی کرنے والے قیدیوں کو احاطے سے باہر بھیج دیا۔ یہ اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ سیاسی قیدیوں کے ساتھ گھل مل نہ سکیں۔

اپنے دلیے کے برتن ہاتھوں میں لیے میں والٹر اور کیتھی کو احاطے کے جنوبی گوشے کی طرف لے گیا، جیسے میں ان سے کوئی نجی گفتگو کرنا چاہتا تھا۔کھودی جانے والی کھائی پہلے ہی خطرناک حد تک دو چھوٹے ڈبوں کے نزدیک پہنچ گئی تھی۔ اسی وقت ایڈی ڈینیلز ہم سے آملا جس نے فوراً ہی معاملہ بھانپ لیا۔

ہمیں اب مسودے کی فکر تھی۔ ہم چاروں ممکنہ طور پر مشکوک نظر آئے بغیر اس جگہ کھدائی کرنے لگے، جہاں مسودے کے دو چھوٹے حصے مدفون تھے۔ ہم ان ڈبوں کو جلد ہی کھود نکالنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر اس جگہ کو دوبارہ مٹی سے ڈھانپ دیا۔ پائپ کے نیچے دفن مسودے کا بڑا حصہ نکالنے کے لیے زیادہ وقت درکار تھا لیکن ہمیں یقین تھا کہ وہ اسے نہیں ڈھونڈ سکیں گے کیونکہ دیوار تعمیر کرنے کے لیے انہیں پائپ اکھاڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔

ہم نے مسودے کے دونوں حصے اپنی قمیضوں میں چھپا لیے اور اپنی کوٹھڑیوں میں واپس چلے آئے۔ ایڈی اس روز کان پر نہیں جا رہا تھا، چنانچہ ہم نے دونوں ڈبے اس کے سپرد کر دیئے تاکہ وہ جتنی جلد ہو سکے ان دونوں حصوں کو ضائع کر دے۔ ذاتی خطرہ مول لیتے ہوئے ایڈی ایسا کرنے پر رضامند ہو گیا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا کہ ہم نے دونوں ڈبے نکال لیے تھے اور اس روز جب میں کان پر کام کر رہا تھا، مسودے کے باقی حصے کے بارے میں بے فکر رہا۔

کمانڈر کے سامنے طلبی

اس سہ پہر جب ہم کان سے واپس آئے، تو میں حسب معمول نہانے کے بجائے ٹہلتے ٹہلتے احاطے کے انتہائی سرے تک چلا گیا۔ جس قدر ممکن تھا، میں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ میری یہ چہل قدمی کسی مقصد کے بغیر تھی مگر جو کچھ وہاں دیکھا اس نے مجھے چونکا دیا۔ قیدیوں نے ایک کھائی کھود ڈالی تھی جو تنہائی سیکشن کی دیوار کے متوازی گزرتی تھی اور اس نے پائپ وہا سے یکسر ہٹوا دیا تھا۔ انہوں نے یقیناً مسودہ ڈھونڈ نکالا ہو گا۔

میں ضرور دباؤ کا شکار رہا ہوں گا یا اپنا ردعمل اس طریقے سے ظاہر کیا ہو گا کہ وہ نوٹس میں آ گیا۔ میں اس سے آگاہ نہیں تھا مگر بہت سے وارڈر میری نگرانی کر رہے تھے جنہوں نے بعد میں بتایا کہ میرے ردعمل سے تصدیق ہو گئی تھی کہ کوئی چیز وہاں

چھپائی گئی تھی۔ میں نہانے کیلئے راہداری میں واپس آیا اور والٹر اور کیتھی کو بتایا کہ مجھے شک ہے کہ مسودہ دریافت کرلیا گیا ہے۔ ایڈی نے اس دوران دوسرے دو حصے کامیابی سے ٹھکانے لگادیئے تھے۔

اگلی صبح سویرے مجھے دفتر میں کمانڈنگ افسر نے طلب کیا۔ اس کے پاس جیل کا ایک افسر اعلیٰ کھڑا تھا جو ابھی پریٹوریا سے آیا تھا۔ سلام کے بغیر کمانڈنگ افسر نے کہا: ''منڈیا! ہم نے تمہارا مسودہ ڈھونڈ لیا ہے۔''

میں نے جواب دیا: ''اچھا، تمہیں اس کا ثبوت پیش کرنا چاہیے۔''

اس پر انہوں نے تمسخر سے کام لیا اور کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ حاشیہ پر تحریریں والٹر سیسولو اور احمد کاتھرادا کی ہیں۔ میں نے پھر کہا کہ انہیں ثبوت دینا چاہیے اگر وہ کوئی تعزیر عائد کرنا چاہتے ہیں۔

''ہمیں کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔'' کمانڈر نے کہا۔ ''ہمارے پاس شہادت موجود ہے۔''

اگرچہ اس روز اس نے کوئی سزا نہ سنائی مگر کچھ عرصہ بعد والٹر، کیتھی اور مجھے ڈپٹی کمشنر جیل خانہ جات جنرل ریو کے سامنے طلب کیا گیا جس نے ہمیں بتایا کہ ہم نے اپنی مطالعے کی رعایت کا غلط استعمال کرتے ہوئے غیر قانونی طور پر مسودہ لکھا تھا۔ اس جرم میں ہماری مطالعے کی رعایت غیر معینہ عرصے کے لیے معطل کر دی گئی۔ جیسا کہ بعد میں تجربہ ہوا، ہم مطالعے کی رعایت سے چار سال محروم رہے۔

میک دسمبر میں رہا ہو گیا تو اس نے مسودے کی نقل والی کاپیاں انگلستان پہنچا دیں۔ اسے اگلے چھ ماہ تک جنوبی افریقہ اس کے گھر میں نظر بند رکھا گیا۔ اس کے بعد ہو ملک سے کھسک گیا اور پہلے آلیور ٹیمبو سے ملنے لوساکا پہنچا اور پھر وہاں سے لندن چلا گیا۔ وہاں وہ چھ ماہ رہا اور ایک ٹائپسٹ کی مدد سے مسودے کی نقل ٹائپ کی۔ اس کے بعد وہ لوساکا واپس آیا اور ایک نقل آلیور ٹیمبو کو پیش کی۔

اس کے بعد سے مسودے کی کہانی پر دھند چھا گئی۔ لوسا کا سے مسودے کے متعلق مجھے کوئی اطلاع نہ ملی اور اب بھی میں نہیں جانتا کہ آلیور نے اس کا کیا کیا تھا؟ اگر چہ میری قید کے دوران وہ شائع نہ ہوا۔ لیکن میری اس خودنوشت کی بنیاد اسی پر استوار ہے۔

وزیر جیل خانہ جات نے مجھے لالچ دیا

1976ء میں ایک غیر معمولی شخصیت مجھ سے ملنے آ ہی۔ یہ وزیر جیل خانہ جات جمی کروگل تھا جو وزیر اعظم کی کابینہ کا ایک نمایاں رکن تھا۔ کروگل نہ صرف جیل پالیسی پر اثر انداز ہوتا تھا بلکہ وہ جدوجہد آزادی سے نپٹنے کے انداز پر کڑی تنقید کرتا تھا۔

مجھے پریشانی ہوئی کہ وہ کیوں آیا ہے۔ حکومت اس وقت اپنی جداگانہ ترقیاتی پالیسی اور نام نہاد آزاد ہوم لینڈ کو کامیاب بنانے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔ جداگانہ ترقی کا شوپیس ٹرانسکائی تھا جس پر میرا بھتیجا اور کسی زمانے میں میرا مہربان کے ڈی ماتن زیما حکمران تھا جس نے کامیابی سے اپنی حکومت کے خلاف تمام تر قانونی مخالفت دبا دی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ کمانڈنگ آفیسر نے حال ہی میں مجھ سے دل لگی کرتے ہوئے کہا تھا: ''منڈیلا! تمہیں ریٹائر ہو کر ٹرانسکائی چلے جانا چاہیے اور وہاں خوب کام کرنا چاہیے۔''

جیسا کہ بعد میں انکشاف ہوا، جمی کروگل یہی تجویز لے کر میرے پاس آیا تھا۔ وہ ایک تنومند اور اکھڑ آدمی تھا اور اس قدر غیر مہذب تھا کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کابینہ میں ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے اس ملاقات کو اپنی شکایات پیش کرنے کا ایک اور موقع جانا۔ شروع میں وہ اطمینان سے سنتا رہا۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ ہم نے 1969ء میں اسے ایک خط بھیجا تھا جس کا آج تک جواب نہیں ملا۔ وہ صرف کندھے اچکا کر رہ گیا۔ پھر میں نے جزیرے کے ابتر حالات کی تفصیل

بیان کی اور ایک بار پھر اس پر زور دیا کہ ہم سیاسی قیدی ہیں اور مجرم نہیں اور ہم سے سیاسی قیدیوں کا سا سلوک کیا جائے۔لیکن کروگل نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا: ''نہیں،تم سب متشدد کمیونسٹ ہو۔''

وزیر کی بے خبری

پھر میں اسے اپنی پارٹی کی تاریخ کے بارے میں کچھ بتانے لگا اور یہ بھی واضح کیا کہ ہم تشدد کی طرف مائل کیوں ہوئے۔یہ واضح تھا کہ وہ اے این سی کے بارے میں تقریباً کچھ نہیں جانتا تھا اور جو کچھ وہ جانتا تھا وہ دائیں بازو کے پریس کے پروپیگنڈے کا عکس تھا۔جب میں نے اسے بتایا کہ ہماری پارٹی نیشنل پارٹی سے کہیں زیادہ پرانی ہے تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔میں نے کہا کہ اگر وہ ہمیں کمیونسٹ خیال کرتا ہے تو اسے ہمارا فریڈم چارٹر پڑھنا چاہیے۔وہ مجھے خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔اس نے کبھی ''فریڈم چارٹر'' کے بارے میں نہیں سنا تھا۔میرے نزدیک یہ بات غیر معمولی تھی کہ کابینہ کا ایک وزیر اتنا بے خبر بھی ہوسکتا ہے،تاہم مجھے حیران نہیں ہونا چاہیے تھا۔نیشنلسٹ سیاستدان عادتاً ہر اس بات کی مذمت کرتے تھے جسے وہ سمجھ نہیں پاتے تھے۔

میں نے اس کے سامنے رہائی کا سوال اٹھایا اور اسے 1914ء کے افریکنر باغیوں کا مقدمہ یاد دلایا جو تشدد پر اتر آئے تھے اگرچہ انہیں پارلیمنٹ میں نمائندگی حاصل تھی،وہ اجلاس منعقد کر سکتے تھے اور ووٹ بھی دے سکتے تھے۔پھر جنرل ڈی ویٹ اور میجر کیمپ نے 12 ہزار کی باغی فوج کی قیادت کی تھی۔انہوں نے کئی شہروں پر قبضہ کرلیا تھا اور بہت سی اموات کا سبب بنے تھے مگر ان دونوں کو غداری کے مجرم ٹھہرائے جانے کے بعد جلد ہی رہا کر دیا گیا تھا۔میں نے روبی لائیو برانٹ کا مقدمہ بھی یاد دلایا جس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران ایک زیر زمین تنظیم قائم کر لی تھی تاکہ جنوبی افریقہ کے اتحادیوں سے تعاون کی مخالفت کرے۔اسے عمر قید کی

سزا سنائی گئی تھی مگر جلد ہی اسے معافی مل گئی۔ یوں لگتا تھا کہ کروگل اپنی قوم کی تاریخ کے ان واقعات سے اتنا ہی بے خبر تھا جتنا ''فریڈم چارٹر'' سے۔ ایسے لوگوں سے بات چیت کرنا جو آپ کی طرح واقعات سے باخبر نہ ہوں، بہت مشکل ہوتا ہے۔

کروگل نے یہ تمام باتیں بلا بے طاق رکھ دیں۔ وہ بولا: ''یہ قدیم تاریخ ہے۔'' وہ ایک خاص پیشکش لے کر آیا تھا۔ اپنے اجڈپن کی شہرت کے باوجود اس نے اپنی تجویز پاس ادب سے پیش کی۔ اس نے سادگی سے کہا: ''اگر تم ٹرانسکائی حکومت کا قانونی جواز تسلیم کر لو اور وہاں منتقل ہونے پر رضامند ہو جاؤ تو تمہاری سزا میں ڈرامائی کمی ہو سکتی ہے۔''

میں ادب سے سنتا رہا حتیٰ کہ اس کی بات ختم ہو گئی۔ پھر میں نے کہا: ''اول، میں نے پوری بنتوستان پالیسی مسترد کر دی تھی اور اب میں کسی طرح اس کی حمایت نہیں کروں گا۔ دوم، میں جوہانسبرگ سے تعلق رکھتا ہوں اور میں جوہانسبرگ ہی واپس جاؤں گا۔ کروگل نے مجھ سے بحث و تکرار کی مگر بے سود۔ ایک ماہ بعد پھر وہ وہی تجویز لے آیا اور میں نے اسے پھر مسترد کر دیا۔ اس تجویز کو کوئی غدار ہی تسلیم کر سکتا تھا۔''

سویٹو میں احتجاجی بچوں کا قتل

اگرچہ ہم خبریں اور اطلاعات جمع کرنے میں بڑے سرگرم تھے، تازہ واقعات کے بارے میں ہمارا علم ہمیشہ مختصر ہوتا تھا۔ بیرونی دنیا میں ہونے والے واقعات اس حقیقت میں لپٹے ہوتے تھے کہ ہم انہیں پہلے افواہ کے طور پر سنتے تھے اور بعد میں کسی اخباری تفصیل یا بیرونی ملاقاتی کے ذریعے ان کی تصدیق ہو سکتی تھی۔

جون 1976ء میں ہمیں مبہم سی اطلاعات ملیں کہ ملک میں بڑے ہنگامے ہوئے ہیں۔ سرگوشیاں بڑی پُرتخیل اور خلاف قیاس تھیں...... سویٹو کے نوجوانوں نے فوج پر غلبہ پا لیا تھا اور فوجی اپنی بندوقیں چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ پھر اگست میں پہلے نوجوان قیدی جنہوں نے 16 جون کے ہنگاموں میں حصہ لیا تھا، جزیرہ روبن

پر پہنچنے لگے تب ہی ہمیں علم ہوا کہ درحقیقت کیا واقعات پیش آئے تھے۔

16 جون 1976ء کو اسکولوں کے 15 ہزار بچے سوویٹو مین جمع ہوئے تھے تا کہ حکومت کے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کریں کہ ثانوی اسکولوں میں تمام جماعتوں کے نصف کو افریکان زبان میں تعلیم دی جائے گی۔ طلبہ افریکان سیکھنا نہیں چاہتے تھے اور اساتذہ انہیں ظالم حکمرانوں کی زبان میں تعلیم دینا نہیں چاہتے تھے۔ حکومت نے والدین اور اساتذہ کی التجاؤں اور درخواستوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ پولیس کے ایک دستے کا اسکول کے پرجوش بچوں سے ٹکراؤ ہوا اور سپاہیوں نے وارننگ کے بغیر فائر کھول دیا۔ اس فائرنگ میں ایک تیرہ سالہ بچہ ہیکٹر پیٹرسن اور بہت سے دوسرے مارے گئے۔ بچے چھڑیوں اور پتھروں سے پولیس کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک عام شورش پھیل گئی جس میں سینکڑوں بچے زخمی اور ہلاک ہوئے اور دو گوروں کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

اس روز کے واقعات کا ردعمل جنوبی افریقہ کے ہر قصبے اور ہر بستی میں ہوا۔ ملک بھر میں فسادات اور تشدد کی کارروائیاں ہونے لگیں۔ سرکاری تشدد میں مرنے والوں کے جنازے احتجاجی جلوسوں میں تبدیل ہو گئے۔ جنوبی افریقہ کے نوجوانوں پر یہ فرض کر کے فائرنگ کی جا رہی تھی کہ وہ باغی ہیں۔ ملک بھر میں طلبہ نے سکولوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ اے این سی کے کارکن احتجاج کی حمایت کرتے ہوئے طلبہ سے مل گئے۔ بنٹو تعلیم اس کے خالقوں کو خواب میں ڈرا رہی تھی کیونکہ یہ ناراض اور گستاخ طالبعلم اسی نظام کی پیداوار تھے۔

ناراض انقلابی روح کا مشاہدہ

ستمبر میں تنہائی سیکشن نوجوان آدمیوں سے بھر گیا جنہیں ان ہنگاموں کے بعد گرفتار کیا گیا تھا۔ ایک ملحقہ راہداری میں ہونے والی سرگوشیوں سے ہمیں ان واقعات کی اصل تفصیلات معلوم ہوئیں۔

میرے ساتھیوں اور میں نے نوجوانوں کے جذبے کو بہت سراہا۔عوامی احتجاج کی لہر جو 1960ء کی دہائی کے دوران دب گئی تھی، 1970ء کی دہآئی میں پھر ابھر رہی تھی۔ان میں سے بہت سے نوجوان ہماری عسکری تحریک میں شامل ہونے کے لیے ملک چھوڑ گئے تھے اور تربیت پا کر واپس آئے تھے۔ان میں سے ہزاروں نے تنزانیہ، انگولا اور مرزمبیق میں ہمارے کیمپوں میں تربیت پائی تھی۔جیل میں اس سے زیادہ حصہ افزا بات کوئی نہیں تھی کہ باہر کے لوگ اس کاز کی حمایت کر رہے تھے جس کے لیے ہم پس دیوارزنداں تھے۔

یہ نوجوان ان لوگوں سے مختلف قسم کے قیدی تھے جو ہم نے پہلے دیکھے تھے۔یہ بہادر، سرکار کے دشمن اور جارحیت پسند تھے۔وہ حکوم کے منتظر نہیں رہتے تھے بلکہ ہر موقع پر''اماندلا'' کے نعرے لگاتے تھے۔ان کی جبلت تعاون کے بجائے محاذ آرائی تھی۔حکام نہیں جانتے تھے کہ ان سے کیسے نپٹا جاہے اور ان نوجوانوں نے جزیرے کا ماحول زیروزبر کر دیا۔

مقدمہ رائیونیا کے دوران میں نے ایک سیکورٹی پولیس والے سے کہا تھا کہ اگر حکومت نے اپنی اصلاح نہ کی تو مجاہدین آزادی جو ہماری جگہ لیں گے وہ کسی روز حکومت کو ہمیں یاد کرنے پر مجبور کر دیں گے۔وہ دن فی الواقع جزیرہ روبن پر آ گیا تھا۔

ان نوجوانوں میں ہم نے زمانے کی ناراض انقلابی روح کا مشاہدہ کیا۔مجھے ان کے بارے میں وارننگ مل چکی تھی۔چند ماہ پہلے ونی نے ایک ملاقات کے دوران خفیہ گفتگو کے ذریعے یہ بتایا تھا کہ غیر مطمئن نوجوانوں کا ایک طبقہ اٹھ رہا ہے جو رجحان کے لحاظ سے عسکریت پسند اور افریقہ نواز ہیں۔اس نے کہا تھا کہ جہد آزادی کی نوعیت کو تبدیل کر رہے ہیں اور یہ کہ مجھے ان کے بارے میں آگاہ رہنا چاہیے۔

نئے قیدی جزیرے کے حالات دیکھ کر، جنہیں وہ وحشیانہ خیال کرتے تھے،

کانپ اٹھے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم وہاں کس طرح رہ رہے تھے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ انہیں 1964ء میں جزیرہ دیکھنا چاہیے تھا جب یہاں کے حالت بدترین تھے۔ لیکن انہیں ہماری باتیں بھی ویسی مشکوک لگتی تھیں جیسی حکام کی۔ انہوں نے ہماری نظم وضبط کی فہمائش نظر انداز کر دی کیونکہ ان کے خیال میں یہ کمزوری اور بے یقینی پر دلالت کرتی تھی۔

یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ ہم رائیوونیا والوں کو اعتدال پسند خیال کرتے تھے۔ اتنے برسوں تک ترقی پسند انقلابی ہونے کا ٹھپہ لگنے کے بعد اب ہمیں اعتدال پسند خیال کیا جا رہا تھا اور ہمارے لیے یہ احساس انوکھا مگر کسی طرح خوشگوار نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں اپنا ردعمل دو طرح سے ظاہر کر سکتا تھا۔ میں انہیں ان کی نامعقولیت پر ڈانٹ پلا سکتا تھا یا میں ان کی بات پر کان دھر سکتا تھا۔ میں نے آخری طریقہ اختیار کیا۔

جب ان میں سے بعض افراد، جیسے ساؤتھ افریقن سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے سٹرینی موڈلے اور بلیک پیپلز کنونشن کے ساتھس کوپر، ہمارے سیکشن میں آئے، میں نے ان سے کہا کہ اپنی تحریک اور فلسفے پر تحریری مواد مجھے دیں۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ کون سا محرک انہیں تحریک آزادی میں لایا ہے اور مستقبل کے بارے میں ان کے خیالات کیا ہیں۔

جزیرے پر ان کی آمد کے کچھ دن بعد کمانڈنگ آفیسر میرے پاس آیا اور مجھ سے کہا کہ میں اس کی خاطر ان نوجوانوں سے خطاب کروں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں انہیں بتا دوں کہ وہ حد سے نہ بڑھیں اور یہ حقیقت تسلیم کر لیں کہ وہ جیل میں ہیں اور انہیں جیل کا نظم وضبط قبول کرنا ہوگا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ایسی کرنے کو تیار نہیں کیونکہ جاری حالات میں وہ مجھے ظالموں سے تعاون کرنے والا خیال کرتے۔

ایک نوجوان کی کمانڈر سے جھڑپ

ان لوگوں نے جیل کے بنیادی ضابطے بھی تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ایک دن ہیڈ آفس میں کمانڈنگ آفیسر کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا۔ جب میں میجر کے ساتھ باہر نکل رہا تھا تو ہمیں ایک کمرے میں ایک نوجوان قیدی دکھائی دیا جس سے جیل کا ایک افسر پوچھ گچھ کر رہا تھا۔نوجوان جو اٹھارہ سال سے زیادہ عمر کا نہیں تھا، سینئر افسروں کی موجودگی میں جیل کی ٹوپی پہنے ہوئے تھا اور یہ قواعد کی خلاف ورزی تھی۔ جب میجر اس کمرے میں داخل ہوا تو اس قیدی نے کھڑے ہونے کی زحمت بھی نہ کی اور یہ ایک اور خلاف ورزی تھی۔

میجر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''برائے مہربانی! اپنی ٹوپی اتار دو۔'' قیدی نے اس کی بات نظر انداز کردی۔تب میجر نے تلخ لہجے میں کہا: ''اپنی ٹوپی اتار دو۔'' قیدی نے مڑ کر میجر کی طرف دیکھا اور بولا: ''کس لیے؟''

میں نے جو کچھ سنا اس پر مجھے بمشکل ہی یقین آیا۔ یہ ایک انقلابی سوال تھا ''کس لیے؟''

میجر بھی بظاہر ہکا بکا لگتا تھا، تاہم اس نے جواب دیا: ''یہ ضابطے کی خلاف ورزی ہے۔''

نوجوان قیدی نے جواب میں کہا: ''تم نے یہ ضابطہ بنایا کیوں ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟'' ایک قیدی کی طرف سے یہ سوال میجر کے لیے ناقابل برداشت تھا، چنانچہ وہ بھنا کر یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا: ''منڈیلا! تم اس سے بات کرو۔'' لیکن میں نے میجر کی طرف سے کوئی مداخلت نہ کی اور صرف قیدی کی طرف تھوڑا سا سر جھکا دیا تاکہ جان لے کہ میں اس کا طرف دار ہوں۔

جیل میں سیاہ شعور تحریک کا نیا عنصر

سیاہ شعور تحریک (Black Consicousness Movement) سے یہ ہمارا پہلا تعارف تھا۔ اے این سی، پی اے سی اور کمیونسٹ پارٹی پر پابندی

لگنے کے ساتھ ہی سیاہ شعور تحریک نے نوجوان لوگوں میں موجود خلا پر کر دیا تھا۔ سیاہ شعور تحریک ایک تحریک سے زیادہ ایک فلسفہ تھی اور اس نے اس نظریے سے جنم لیا تھا کہ سیاہ فاموں کو پہلے اپنے آپ کو اس نفسیاتی احساس سے آزاد کرانا چاہیے کہ وہ کمتر مخلوق ہیں اور یہ احساس گوروں کی حکمرانی کی تین صدیوں کے دوران پروان چڑھا تھا۔ اسی صورت میں لوگوں میں اعتماد پیدا ہو سکتا تھا اور وہ اپنے آپ کو ظلم سے حقیقی نجات دلا سکتے تھے۔ سیاہ شعور تحریک جب غیر نسلی معاشرے کی وکالت کرتی تھی تو وہ اس معاشرے کے حصول میں گوروں کے لیے کوئی کردار نہیں چھوڑتی تھی۔

یہ تصورات میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہ انہی خیالات کا عکس تھے جنہیں میں نے ایک چوتھائی صدی پہلے اے این سی یوتھ لیگ کی تشکیل کے وقت اپنے ذہن میں جگہ دی تھی۔ ہم بھی افریقہ نواز تھے۔ ہم بھی نسلی فخر اور نسلی خود اعتمادی پر زور دیتے تھے۔ ہم بھی جہد آزادی میں گوروں سے مدد لینے کو مسترد کرتے تھے۔ کئی طرح سے سیاہ شعور تحریک اس مسئلے کا وہی حل پیش کرتی تھی جو کبھی محو نہیں ہوا تھا۔ لیکن جس طرح ہم اپنے یوتھ لیگ کے نقطۂ نظر کو پھاند نکلے تھے، مجھے یقین تھا کہ یہ نوجوان سیاہ شعور تحریک کے بعض ضابطوں کی حد سے گزر جائیں گے۔ اگرچہ ان کی جنگجوئی سے مجھے حوصلہ ملا تھا مگر میرا خیال تھا کہ ان کا فلسفہ، سیاہ نسل پر اتنا زور دینے کے باعث فرقہ وارانہ تھا اور ایک درمیانی نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتا تھا جو پوری طرح پختہ نہیں تھا۔ میں نے ایک بزرگ سیاستدان کی حیثیت سے اپنے لیے یہ کردار موزوں پایا کہ انہیں کانگریس موومنٹ کے زیادہ جامع نظریات کی طرف لے چلوں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ نوجوان آخر کار مایوس ہوں گے کیونکہ سیاہ شعور تحریک ان کے لیے کوئی عملی پروگرام یا احتجاج کا کوئی راستہ پیش نہیں کرتی تھی۔

اگرچہ ہم سیاہ شعور تحریک (BCM) کو اے این سی کے لیے ایک زرخیز زمین سمجھتے تھے، ہم نے ان لوگوں کو اپنی تنظیم میں شامل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم

جانتے تھے کہ اس طرح ان کا اور جزیرے کی دوسری جماعتوں کا تشخص ختم ہو جائے گا۔ ہماری پالیسی یہ تھی کہ ہم ان سے دوستانہ کریں، ان میں دلچسپی لیں اور ان کی کامیابیوں میں ان کا ساتھ دیں لیکن ان کا تشخص ختم نہ کریں۔ اگر وہ ہمارے پاس آ کر سوالات پوچھتے: ''بنتوستان پر اے این سی کی پالیسی کیا ہے؟ فریڈم چارٹر قومیانے کے بارے میں کیا کہتا ہے؟'' تو ہم ان کا جواب دے سکتے تھے اور ان میں سے بہت سے ایسے سوالات کے ساتھ ہمارے پاس آتے بھی تھے۔

فٹ بال کی دہشت

میں نے از خود خفیہ نوٹس کے ذریعے ان میں سے بعض افراد سے رابطہ کیا۔ میں نے بعض نوجوانوں سے گفتگو کی جو ٹرانسکائی سے تعلق رکھتے تھے اور ان سے اپنے پرانے گھر کے بارے میں سوالات پوچھے۔ آنے والوں میں سے بعض پہلے ہی جہد آزادی میں مصروف تھے۔ میں نے پیٹرک ٹیرر لیکوٹا کی بہادری کی خبریں سنی تھیں جو ساؤتھ افریقن سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کا ایک رہنما تھا۔ میں نے اسے جزیرہ روبن پر خوش آمدید کا نوٹ بھیجا۔

ٹیرر کا یہ عرف فٹ بال کے میدان مین اس کی دلیری سے منسوب تھا لیکن وہ بات چیت میں بھی اتنا ہی دلیر تھا۔ اسے گوری نسل کے اخراج کے مسئلے پر اپنے بعض ساتھیوں سے اتفاق نہیں تھا اور وہ اے این سی کے خیالات کے قریب تھا۔ جزیرے پر آ کر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ہمارے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہے لیکن ہم نے اس کی حوصلہ شکنی کی...... اس وجہ سے نہیں کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں تھی بلکہ وجہ یہ تھی کہ ہم سمجھتے تھے کہ ایسی حرکت سے جنرل سیکشن میں کشدگی پیدا ہوگی۔

لیکن ٹیرر جواب میں ''نہیں'' سننے کا عادی نہیں تھا، چنانچہ اس نے علانیہ طور پر اپنے آپ کو اے این سی سے وابستہ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک روز بی سی ایم کے ناراض ارکان نے باغیچے کے ایک اوزار سے اس پر حملہ کر دیا۔ اس کا علاج ہونے

کے بعد حکام نے حملہ آوروں کو ملزم ٹھہرایا اور ان پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا لیکن مفاہمت کے خیال سے ہم نے ٹیر کو مشورہ دیا کہ وہ شکایت داخل نہ کرے۔ وہ رضا مند ہو گیا اور اس نے ان لوگوں کے خلاف بیان دینے سے انکار کر دیا جنہوں نے اسے نقصان پہنچایا تھا۔ اس پر مقدمہ ختم کر دیا گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ ایسا مقدمہ حکام کے ہاتھوں میں کھیلنے کے مترادف ہوگا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ نوجوان جان لیں کہ اے این سی ایک بڑا خیمہ ہے جو کئی مختلف نظریات اور وابستگیوں کو اپنے نیچے جگہ دے سکتا ہے۔

اس واقعے کے بعد راستہ کھل گیا اور بی سی ایم کے درجنوں افراد نے اے این سی میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ ان میں بعض وہ نوجوان بھی تھے جنہوں نے ٹیر پر حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ ٹیر جنرل سیکشن میں اے این سی کی قیادت میں شامل ہو گیا اور جلد ہی وہ دوسرے قیدیوں کو اے این سی کی پالیسیوں کا درس دے رہا تھا۔ اس جیسے آدمیوں کے حوصلے اور دور اندیشی نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ ہمارے نظریات توانا ہیں اور ان سے ہنوز جہد آزادی کو اجتماعی طور پر متحد کرنے کی امیدیں وابستہ ہیں۔

میں نے ثالث کا کردار اپنا لیا

سیکشن ایف اور سیکشن جے میں سیاسی جھگڑے جاری رہے۔ ہمیں اے این سی، پی اے سی اور بی سی ایم کے مابین جھڑپوں کی اطلاعات ملیں۔ اے این سی کے بہت سے افراد کی پٹائی کی گئی تھی۔ اے این سی کے ارکان پر بڑی تعداد میں حکام کی طرف سے الزامات لگائے گئے اور جزیرے کی انتظامی عدالت کے لیے ایک مقدمہ گھڑ اگیا۔ اے این سی والے اس مقدمے سے نپٹنے کے لیے باہر سے ایک وکیل کو لے آئے۔ اگرچہ میں نے لڑائی ہوتے نہیں دیکھی تھی، مجھ سے کہا گیا کہ گواہ بن جاؤ۔ یہ تکلیف دہ صورتحال تھی۔ اگرچہ میں اپنے ساتھیوں کے لیے گواہی دینے پر

آمادہ تھا مگر یہ نہیں چاہتا تھا کہ اے این سی، پی اے سی اور بی سی ایم کے مابین تلخیوں میں اضافہ کروں۔

جیل میں میرا رول صرف اے این سی کے لیڈر ہی کا نہیں تھا، بلکہ اتحاد کے ایک موید ایک دیانت دار ثالث اور امن کے ایک علمبردار کا بھی تھا، لہذا میں اس جھگڑے میں کسی کی حمایت کرنے میں متامل تھا، خواہ وہ میری اپنی پارٹی کی حمایت کیوں نہ ہو۔ اگر میں اے این سی کی طرف سے گواہی دیتا تو مختلف گروہوں کے مابین مفاہمت پیدا کرنے کے امکانات تتر بتر ہو جاتے۔ اگر میں اتحاد کا پرچار کرتا تھا تو مجھے ایک اتحاد کنندہ کا کردار کرنا تھا خواہ اس سے میرے بعض اپنے ساتھی ہی ناراض ہو جاتے۔

میں نے فیصلہ کیا کہ میں گواہی نہیں دوں گا۔ اس سے میرے بعض ساتھی مایوس ہوئے لیکن میں سمجھتا تھا کہ یہ معاملہ اتنا نازک ہے کہ ان کی ناراضگی مول لینے میں کوئی حرج نہیں۔ نوجوان سیاہ شعور لوگوں پر یہ ظاہر کرنا زیادہ اہم تھا کہ تحریک آزادی ناقابل تقسیم ہے اور ہم سب کا دشمن ایک ہی ہے۔

مشقت کے خاتمے کا اعلان

حکام نے ان نوجوان شیروں سے نپٹنے میں اپنی فکر مندی کی بنا پر ہمیں کم و بیش کھلا چھوڑ دیا کہ اپنی حفاظت خود کریں۔ ہم کان پر ''گوسلو'' (Go Slow) کے دوسرے سال میں تھے کیونکہ ہمارا مطالبہ تھا کہ ہم سے ہر قسم کی مشقت لینے کا سلسلہ یکسر بند کیا جائے۔ ہم اپنے اس حق کا تقاضا کرتے تھے کہ ہم اپنے ایام اسیری میں کوئی مفید کام کریں جیسا کہ مطالعہ یا کوئی ہنر سیکھنا۔ ہم کان پر ایک دوسرے کو تحریک دلاتے ہوئے کام نہیں کرتے تھے بلکہ تحریک دلانے کے بجائے ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ 1977ء کے اوائل میں حکام نے مشقت کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بجائے اب ہم اپنے دن اپنے سیکشن میں گزار سکتے تھے۔

حکام نے ہمارے لیے احاطے میں ایک طرح کے کام کا بندوبست کر دیا لیکن یہ صرف انگریزی محاورے میں اپنی پسپائی کو چھپانے کے لیے اس پر انجیر کا پتہ ڈالنے والی بات تھی۔

یہ فتح ہمارے اپنے نہ ختم ہونے والے احتجاجات اور سادہ ہتھکنڈوں کا مشترکہ نتیجہ تھی۔ حکام عموماً ہر تین قیدیوں کے لیے ایک وارڈر کا تناسب برقرار رکھتے تھے۔ سوویٹو کے قیدیوں کی آمد سے پہلے بھی وارڈروں کی کمی تھی اور باغی مزاج نوجوانوں کے لیے کہیں زیادہ نگرانی درکار تھی۔ وہ اتنے دلیر تھے کہ لگتا تھا کہ ہر ایک نوجوان کی نگرانی کے لیے ایک وارڈر درکار ہوگا۔ اگر ہم اپنے سیکشن میں رہتے تو ہمیں کم نگرانی کی ضرورت تھی۔

انسانیں مشقت کے خاتمے سے آزادی کا ماحول پیدا ہوا۔ اب میں دن کو مطالعے، خطوط نویسی اپنے ساتھیوں سے معاملات پر بحث وتمحیص یا قانونی مقدمات کی تیاری میں گزار سکتا تھا۔ فارغ وقت سے مجھے موقع ملا تھا کہ میں جزیرہ روبن پر اپنے دو پسندیدہ مشاغل پر توجہ دوں اور وہ تھے باغبانی اور ٹینس۔

جیل میں اپنی بقا کے لیے قیدی کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں تسکین کے طریقے ڈھونڈنے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کپڑے دھو کر تسکین محسوس کر سکتا ہے تاکہ وہ خاص طور پر صاف ہوں۔ وہ راہداری کی صفائی کر سکتا ہے تاکہ وہ گرد سے پاک ہو۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں ترتیب بدل سکتا ہے تاکہ جتنی زیادہ ممکن ہو، گنجائش پیدا ہو۔ وہ جیل سے باہر کے زیادہ نتیجہ خیز کاموں میں بھی ویسا ہی فخر محسوس کر سکتا ہے جیسا جیل کے اندر چھوٹے چھوٹے کام کرنے میں محسوس کرتا ہے۔

میں نے اچھی سبزیاں اگائیں

جزیرہ روبن پر اپنی سزا کے آغاز ہی سے میں نے حکام سے کہا تھا کہ مجھے احاطے میں ایک باغیچہ لگانے کی اجازت دی جائے۔ برسوں وہ کوئی وجہ بتائے بغیر

انکار کرتے رہے۔ لیکن آخر کار انہوں نے ہار مان لی اور ہم پر لی دیوار کے سامنے زمین کی ایک تنگ پٹی پر ایک چھوٹا سا باغیچہ بنانے کے قابل ہو گئے۔

احاطے کی زمین خشک اور پتھریلی تھی۔ احاطہ بھرتی ڈال کر بنایا گیا تھا، چنانچہ باغیچے پر کام شروع کرنے سے پہلے مجھے بہت سے کنکر اور پتھر کھود کر نکالنے پڑے تا کہ پودے زمین میں جڑیں پکڑ سکیں۔ اس وقت میرے بعض ساتھیوں نے تمسخر کیا کہ میں بنیادی طور پر ایک کان کن ہوں اس لیے کان پر دن بھر کام کرنے کے بعد اپنا فارغ وقت احاطے میں کھدائی کرتا رہتا ہوں۔

حکام نے مجھے بیج فراہم کر دیئے۔ پہلے میں ٹماٹر، سرخ مرچ اور پیاز کاشت کیے، یعنی سخت جان پودے جنہیں زیادہ زرخیز مٹی یا مستقل نگہداشت درکار نہیں ہوتی۔ ابتدائی فصلیں زیادہ اچھی نہ تھیں مگر جلد ہی بہتر فصل ہونے لگی۔ حکام کو باغیچے کی اجازت دینے پر افسوس نہیں تھا کیونکہ ایک مرتبہ جب باغیچہ پھولنے پھلنے لگا تو میں اکثر اپنے بہترین پیاز اور ٹماٹر وارڈروں کو پیش کر دیتا تھا۔

اگرچہ میں ہمیشہ سے باغبانی کا شوقین تھا مگر میری یہ خواہش جیل میں آ کر ہی پوری ہوئی جہاں میں اپنے پلاٹ کی دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ باغیچے میں کام کرنے کا پہلا تجربہ مجھے فورٹ ہیئر میں ہوا تھا جہاں یونیورسٹی کی طرف سے دستی کام کرنا پڑتا تھا۔ میں وہاں اپنے پروفیسروں کے باغیچے میں کام کرتا تھا اور زمین سے رابطہ کر کے مجھے خوشی ہوتی تھی جو میری پڑھائی کی مشقت کے لیے تریاق کی حیثیت رکھتی تھی۔ پھر جب میں جوہانسبرگ آ کر پڑھائی اور پھر کام کرنے لگا تو نہ میرے پاس اتنا وقت ہوتا تھا اور نہ باغیچہ۔

ونی منڈیلا اور ٹماٹر کا حسین پودا

میں باغبانی اور زراعت پر کتابیں منگوانے لگا تھا۔ میں نے باغبانی کے مختلف طریقوں اور کھاد کی قسموں کا مطالعہ کیا۔ میرے پاس زیادہ مواد نہیں ہوتے تھے جن

کا ان کتابوں میں ذکر تھا لیکن میں نے بار بار کی کوشش سے کافی کچھ سیکھ لیا۔ ایک موقع پر میں نے مونگ پھلی اگانے کی کوشش کی اور مختلف قسم کی مٹی اور کھادوں کا استعمال کیا لیکن اخر کار اسے ترک کرنا پڑا۔ یہ میری ایک ناکامی تھی۔

باغیچہ جیل کی ان چند چیزوں میں شامل تھا جن پر کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔ بیج بونے، پودوں کی دیکھ بھال کرنے اور پھر فصل حاصل کرنے سے ایک سادہ مگر دیرپا تسکین ہوتی تھی۔ ایک چھوٹے قطعہ زمین کے نگران ہونے کے احساس سے مجھے ایک طرح کی آزادی محسوس ہوتی تھی۔

کئی لحاظ سے میں باغیچے کو اپنی زندگی کے بعض پہلوؤں سے تشبیہ دیتا تھا۔ ایک رہنما کو بھی اپنے باغیچے کی دیکھ بھال کرنی چاہیے۔ وہ بھی بیج بوتا ہے۔ فصل کی دیکھ بھال کرتا ہے اور پھر اسے کاٹتا ہے۔ باغبان کی طرح ایک رہنما کو بھی اپنی کاشت شدہ فصل کی ذمہ داری لینی چاہیے۔ اسے اپنے کام پر توجہ دینی چاہیے۔ دشمنوں کو دور بھگانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جو کچھ محفوظ رکھا جا سکے، محفوظ رکھنا چاہیے اور جس میں کامیابی کا امکان نہ ہو اسے چھوڑ دینا چاہیے۔

میں نے ونی کو ایک بہت ہی خوبصورت ٹماٹر کے پودے کے بارے میں دو خط لکھے کہ کس طرح میں نے ایک ننھی سی کونپل کی دیکھ بھال کر کے اسے ایک شاندار پودا بنا دیا جو گہرے سرخ رنگ کا پھل دینے لگا تھا۔ لیکن پھر کسی غلطی یا نگہداشت کی کمی سے ٹماٹر کا وہ پودا مرجھانے لگا اور پھر تمام تر کاوش کے باوجود وہ دوبارہ صحت مند نہ ہو سکا۔ جب آخر کار وہ مردہ ہو گیا تو میں نے مٹی سے اس کی جڑیں نکالیں اور انہیں دھو کر باغیچے کے ایک گوشے میں دفن کر دیا۔

میں نے یہ چھوٹی سی کہانی بڑی تفصیل سے بیان کی تھی۔ مجھے علم نہیں کہ اس نے خط پڑھ کر کیا تاثر لیا تھا لیکن جب میں خط لکھ رہا تھا تو میرے احساسات ملے جلے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے تعلقات کا حشر اس پودے جیسا ہو اور مجھے یہ بھی

احساس تھا کہ میں اپنی زندگی میں کئی اہم رشتے نہیں نبھا سکا۔ بعض اوقات انسان ایک ایسی چیز کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا جس کی قسمت میں موت لکھی ہو۔

ورزش نے مجھے تنومند رکھا

دستی مشقت ختم ہونے کا ایک غیر متوقع نتیجہ یہ ہوا کہ میرا وزن بڑھنے لگا۔ اگرچہ ہم کان پر بمشکل اتنا کام کرتے تھے جس سے پسینہ آئے لیکن وہاں تک جانے آنے میں جو سیر ہو جاتی تھی اس سے میرا جسم فٹ رہتا تھا۔

میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا ہوں کہ ورزش نہ صرف جسمانی صحت بلکہ ذہنی سکون کے لیے بھی ضروری ہے۔ گزرے دنوں میں کئی بار میں اپنے غصے اور مایوسی کو کسی ساتھی یا پولیس کے سپاہی پر نکالنے کے بجائے پنچ بیگ پر نکالتا تھا۔ ورزش تناؤ کو کم کر دیتی ہے جو سکون و اطمینان کا دشمن ہے۔ تجربے سے مجھے پتہ چلا کہ جب میں اچھی جسمانی حالت میں ہوتا ہوں تو میں بہتر کام کرتا ہوں اور زیادہ واضح طور پر سوچتا ہوں۔ اس طرح تربیت میری زندگی کا ایک لازمی ضابطہ بن گئی۔ جیل میں اپنی مایوسیوں کے نکاس کا بندوبست ہونا انتہائی لازمی تھا۔

جزیرے پر بھی میں سوموار سے جمعرات تک سڑک پر آتے جاتے اپنی پرانی باکسنگ روٹین اور تن سازی برقرار رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور پھر اگلے تین دن ناغہ کرتا تھا۔ سوموار سے جمعرات تک کے دنوں میں، میں صبح پینتالیس منٹ تک ایک ہی جگہ دوڑتا تھا۔ میں ایک سو فنگر ٹپ پش اپ، دو سو بیٹھکیں، پچاس گھٹنوں کی ورزشیں اور مختلف دیگر کسرتیں کرتا تھا۔

اپنے بچوں کے نام اپنے خطوط میں، میں ان پر باقاعدگی سے زور دیتا تھا کہ وہ ورزش کریں، باسکٹ بال، فٹ بال یا ٹینس جیسے متحرک کھیل کھیلیں تاکہ ان کا ذہن ان باتوں سے ہٹا رہے جو انہیں پریشان کر سکتی ہوں۔ اگرچہ مجھے اپنے بچوں کے سلسلے میں ہمیشہ کامیابی نہ ہوئی مگر میں اپنے بعض زیادہ کاہل ساتھیوں کو متاثر کرنے

میں ضرور کامیاب رہا۔ ورزش میری عمر اور نسل کے افریقی آدمیوں کے لیے غیر معمولی بات تھی۔ کچھ عرصے بعد والٹر بھی صبح کو احاطے کے اندر چند چکر لگانے لگا۔ مجھے علم ہے کہ میرے بعض نوجوان ساتھی میری طرف دیکھ کر خود سے کہتے تھے: ''اگر وہ بوڑھا آدمی ورزش کر سکتا ہے تو میں کیوں نہیں کر سکتا۔'' پھر وہ بھی ورزش کرنے لگے۔

جیل کے احاطے میں ومبلڈن کا منظر

بیرونی ملاقاتیوں اور بین الاقوامی ریڈ کراس کے ساتھ اپنی پہلی ملاقاتوں ہی سے میں مناسب ورزش کے لیے وقت اور سہولتوں کی فراہمی کی اہمیت پر زور دیتا تھا۔ عشرہ 1970ء کے وسط میں کہیں جا کر بین الاقوامی ریڈ کراس کے زیر اہتمام ہمیں والی بال کا سامان اور پنگ پانگ ٹیبل جیسی چیزیں ملنے لگیں۔

جب ہم نے کان پر کام کرنا چھوڑ دیا تھا، لگ بھگ اسی زمانے میں ایک وارڈر کو خیال سوجھا کہ ہمارے احاطے کو ٹینس کورٹ میں بدل دیا جائے۔ اس کے طول و عرض تقریباً ٹھیک تھے۔ جنرل سیکشن کے قیدیوں نے سیمنٹ کے فرش کو سبز رنگ میں رنگ دیا اور پھر اس پر روایتی سبز لائنیں کھینچ دیں۔ چند دن بعد ایک نیٹ نصب کیا گیا اور پھر ہم اپنے صحن میں اپنے ہی ومبلڈن میچ کھیلنے لگے۔

جب میں فورٹ ہیئر میں تھا وہاں کچھ ٹینس کھیلی تھی لیکن میں کسی طرح اس کا ماہر نہیں تھا۔ میرا اگلا ہاتھ نسبتاً مضبوط تھا جبکہ پچھلا ہاتھ افسوسناک حد تک کمزور تھا لیکن میں یہ کھیل ورزش کے لیے کھیلتا تھا، سٹائل کے لیے نہیں۔ کان تک آنے جانے کی سیر کا یہ بہترین اور واحد متبادل تھا۔ میں اپنے سیکشن میں اولیں کھلاڑیوں میں شامل تھا جو باقاعدگی سے کھیلتے تھے۔ میں ایک بیک کورٹ کھلاڑی تھا اور اسی وقت نیٹ کی طرف بڑھتا تھا جب میں صاف ضرب لگانے کے قابل ہوتا۔

میں نے قہر کے انگور چکھے

ایک بار دستی مشقت ختم ہو گئی تو میں مطالعے پر زیادہ وقت صرف کرنے لگا، لیکن جو کتابیں میں استعمال کر رہا تھا وہ اب لامحدود تھیں۔ جب میرا مطالعہ منقطع کر دیا گیا تھا اس وقت یں ابھی یونیورسٹی آف لندن کے ایل ایل بی کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے اس ڈگری کے لیے مقدمہ رایوونیا کے دوران مطالعہ شروع کیا تھا اور چار سال تک مطالعے کی معطلی سے مجھے یقین ہو چلا تھا کہ ڈگری کے حصول کے لیے یونیورسٹی میں ایک طالب علم کا یہ طویل ترین ریکارڈ ہے۔

لیکن مطالعے کی سہولتوں کی معطلی سے ایک غیر متوقع فائدہ بھی ہوا اور وہ یہ تھا کہ میں کئی اور کتابیں پڑھنے لگا جن سے بصورت دیگر میرا واسطہ نہ پڑتا۔ کنٹریکٹ لاء کی کتابوں کے صفحات کھنگالنے کے بجائے اب میں ناول پڑھنے میں دلچسپی لینے لگا۔

جزیرہ روبن پر کوئی لامحدود لائبریری نہیں تھی جس سے میں کتابوں کا انتخاب کر سکتا۔ کئی پراسرار کہانیوں اور سراغ رسانی کے ناولوں اور ڈافنی ڈموریئر کی تمام کتابوں تک ہماری رسائی تھی لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ سیاسی کتابیں ممنوع تھیں۔ سوشلزم یا کمیونزم کے بارے میں کوئی کتاب ہرگز میسر نہ تھی۔ سنسر حکام ہر اس کتاب کے اجرا کی درخواست مسترد کر دیتے جس کے ٹائٹل میں لفظ سرخ (Red) موجود ہوتا حتیٰ کہ Little Red Riding Hood بھی نہ ملتی۔ ایچ جی ویلز کی تصنیف The War of the Worlds اگرچہ سائنس فکشن کی کتاب تھی مگر اس کے اجراء کی درخواست بھی مسترد کر دی گئی کیونکہ اس کے سرورق میں لفظ ''جنگ'' آتا تھا۔

شروع ہی سے میں نے جنوبی افریقہ کے متعلق یا جنوبی افریقی مصنفین کی کتابیں پڑھنے کی کوشش کی۔ میں نے نادین گوارڈائمر کے غیر ممنوعہ سارے ناول پڑھے اور گوروں کے شعور آزادی کے بارے میں بہت کچھ جانا۔ میں نے کئی

امریکی ناول پڑھے جن میں سے جان شٹائن بیک کا ناول The Grapes of Warth (قہر کے انگور) مجھے خاص طور پر یاد ہے جس میں ترک وطن کرنے والے کارکنوں کے ابتلاء اور ہمارے اپنے مزدوروں اور فارم ورکروں کے ابتلاء میں بڑی مشابہت تھی۔

ایک کتاب جسے میں نے بار بار پڑھا، ٹالسٹائی کا عظیم ناول War and Peace (جنگ اور امن) تھا اگرچہ اس کتاب کے سرورق میں لفظ ''جنگ'' موجود تھا مگر اس کی اجازت مل گئی۔ مجھے جنرل کوٹازوف کے کردار سے خاصا لگاؤ محسوس ہوا جس کی صلاحیتوں کا ٹھیک اندازہ روسی دربار میں کسی نے نہیں لگایا تھا۔ کوٹازوف نپولین کو صرف اس وجہ سے شکست دینے میں کامیاب رہا کیونکہ وہ دربار کی سطحی اور نمائشی قدروں کا غلام نہیں تھا اور اس سے اپنے ایک بار پھر مجھ پر یہ آشکار کر دیا کہ کسی قوم کی ٹھیک ٹھیک قیادت کرنے کے لیے اس قوم کے متعلق ٹھیک ٹھیک جاننا بھی ضروری ہے۔

ونی کی تیسری قید اور داخلی جلاوطنی

سوویٹو میں طلبہ کی شورش کے دنوں میں مجھے پتہ چلا کہ ونی میرے پرانے دوست اور معالج ڈاکٹر انتھاتھو موٹلانا کے ساتھ بلیک پیرنٹس ایسوسی ایشن میں سرگرم ہے۔ یہ تنظیم مقامی پروفیشنل افراد اور چرچ لیڈروں پر مشتمل تھی جو طلبہ کے لیے رہنمائی اور مصالحانہ خدمات فراہم کرتی تھی۔ حکام پیرنٹس ایسوسی ایشن اور نوجوان باغیوں دونوں پر یکساں نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ طلبہ بغاوت کے دو ماہ کے اندر اندر اگست میں ونی کو انٹرنل سیکورٹی ایکٹ کے تحت حراست میں لے کر بغیر کسی الزام کے جوہانسبرگ کے قلعے میں قید کر دیا گیا جہاں وہ پانچ ماہ رہی۔ اس دوران میں نے اسے اور اپنی بچیوں کو خطوط لکھے جو سوازی لینڈ میں بورڈنگ سکول میں تھیں۔ میں نے اپنے خطوط میں ان کے لیے حمایت و تعاون کے جذبات کا اظہار کیا۔ مجھے

ونی کی قید پر شدید تشویش تھی اگر چہ بظاہر اس مرتبہ اس سے برا سلوک نہیں کیا گیا تھا اور جب دسمبر میں وہ جیل سے باہر آئی تو تحریک آزادی سے اس کی لگن اور مضبوط ہو چکی تھی۔

اگر چہ ونی پر پابندی عائد تھی۔ اس نے اپنا کام جہاں چھوڑا تھا وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ حکام سوویٹو کے نوجوان ترقی پسندوں میں اس کی مقبولیت پر پریشان ہو گئے۔ انہوں نے اس کا اثر ورسوخ کم کرنے کا تہیہ کرلیا اور یہ کام انتہائی ڈھٹائی اور بے شرمی سے کیا۔ انہوں نے اسے داخلی جلاوطنی مین بھیج دیا۔ 16 مئی 1977ء کی رات پولیس کاریں اور ایک ٹرک آرلینڈ وویسٹ میں گھر کے باہر رکے۔ پولیس والے گھر کا فرنیچر اور کپڑے اٹھا اٹھا کر ٹرک میں ڈالنے لگے۔ اس بار ونی کو گرفتار نہیں کیا جا رہا تھا، نہ حراست میں لیا جا رہا تھا اور نہ تفتیش مطلوب تھی۔ اسے اورنج فری سٹیٹ میں برانڈ فورٹ نامی دور دراز ٹاؤن شپ میں پابند کیا جا رہا تھا۔ اس کی تفصیلات مجھے کیتھی سے معلوم ہوئیں جسے ملاقات کے لیے آنے والے ایک ہندو پروہت نے خبر دی تھی۔

برانڈ فورٹ، جوہانسبرگ کے تقریباً دوسو پچاس میل جنوبی مغرب میں اور بلوم فونٹائن کے عین شمال میں واقع ہے۔ طویل اور مشکل سفر کے بعد ونی، زندزی اور ان کا سازو سامان برانڈ فورٹ کی بے رنگ ٹاؤن شپ میں ٹن کی چھت والے تین کمروں کے جھونپڑے کے باہر ڈھیر کر دیا گیا۔ یہ ایک انتہائی غریب اور پسماندہ لوگوں کی بستی تھی جہاں لوگ مقامی سفید فام کاشتکاروں کے انگوٹھے تلے زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہاں ونی کو اجتناب اور خوف کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مقامی زبان سیسوتھو تھی جو ونی بول نہیں سکتی تھی۔

ونی کے نئے حالات نے مجھے دکھ اور غصے سے دوچار کر دیا۔ کم از کم جب وہ سوویٹو مین اپنے گھر میں تھی، میں اپنے تصور میں اسے باورچی خانے میں کام کرتے

یا لاؤنج میں اخبار پڑھتے دیکھ سکتا تھا۔ میں اسے اس مکان میں صبح جاگتے ہوئے اپنے تصور میں لا سکتا تھا جو میرا دیکھا بھالا تھا۔ یہ پہلو میرے لیے سکون کا سرچشمہ تھا۔ سوویٹو میں اگر چہ وہ پابند تھی، آس پاس دوست اور خاندان کے لوگ بھی تھے، اب برانڈ فورٹ میں وہ اور زندزی تنہا تھیں۔

میں ایک بار بلوم فونٹائن جاتے ہوئے اس ٹاؤن شپ سے گزرا تھا اور اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس کی انتہائی غربت اور ویرانی مین کو ہی یاد رکھنے کی بات نہیں تھی۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ ایک روز مکان نمبر 802 برانڈ فورٹ کا پتہ میرے لیے کس قدر شناسا ہو جائے گا۔ ایک بار پھر میں نے محسوس کیا گویا ونی اور میں دونوں بیک وقت جیل میں ہیں۔

زندزی کو ہراساں کرنے کے ہتھکنڈے

برانڈ فورٹ میں زندگی دشوار تھی جیسا کہ مجھے ونی کے خطوط سے معلوم ہوا۔ وہاں گرمائش کا اہتمام نہ تھا۔ نہ ٹائلٹ تھا اور نہ بہتا پانی۔ بستی میں کوئی دکان نہ تھی اور قصبے کے اسٹور افریقی گاہکوں سے معاندانہ برتاؤ کرتے تھے۔ سفید فام زیادہ تر افریکان بولتے تھے اور وہ شدید قدامت پسند تھے۔

ونی اور زندزی مسلسل پولیس کی نگرانی اور وقتاً فوقتاً ہراس کی زد میں تھیں۔ چند مہینوں کے اندر زندزی جس پر پابندی عائد نہ تھی، سیکورٹی پولیس کی دھمکیوں سے پریشان ہوگئی۔ ستمبر میں ونی کے وکیلوں کی مدد سے میں نے حکم امتناعی کے لیے ایک فوری درخواست دائر کی کہ مقامی برانڈ فورٹ سیکورٹی پولیس کو میری بیٹی کو ہراساں کرنے سے روکا جائے۔ جج کے سامنے پیش کیے گئے حلفیہ بیان میں کہا گیا تھا کہ پولیس والے گھر میں داخل ہو کر زندزی کو دھمکاتے ہیں۔ جج نے حکم دیا کہ زندزی ملاقاتیوں سے سکون کے ساتھ مل سکتی ہے۔

ونی ایک لچکدار کردار کی مالک ہے، چنانچہ تھوڑے ہی عرصے کے اندر اس نے

بستی کے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرلیں جن میں گردونواح کے بعض ہمدرد گورے بھی تھے۔ وہ آپریشن ہنگر نامی تنظیم کی مدد سے بستی میں لوگوں کو خوراک فراہم کرتی، بستی کے بچوں کے لیے اس نے ایک نرسری شروع کی اور اس مقام پر ایک میڈیکل کلینک قائم کرنے کے لیے فنڈز اکٹھے کیے جہاں کسی نے کبھی کوئی ڈاکٹر نہیں دیکھا تھا۔

میری چھوٹی بیٹی شہزادی بن گئی

1978ء میں میری دوسری سب سے چھوٹی بیٹی اور ونی سے میری پہلی اولاد زینی نے سوازی لینڈ کے شاہ سوبھوزا کے ایک بیٹے شہزادہ تھمبوموزی سے شادی کر لی۔ ان کی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب زینی سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں تھی۔ جیل میں ہونے کے باعث میں ایک باپ کے روایتی فرائض ادا کرنے کے قابل نہیں تھا۔ ہماری ثقافت میں دلہن کے باپ کو ہونے والے دولہا سے مل کر اس کی حیثیت کا جائزہ لینا ہوتا ہے، اسے ''لوبولا'' یا دلہن کی قیمت کا بھی تعین کرنا ہوتا ہے جو دولہا، دلہن کے خاندان کو ادا کرتا ہے۔ خود شادی کے دن باپ اپنی بیٹی کا ہاتھ اپنے داماد کے ہاتھ میں دیتا ہے۔ اگرچہ مجھے اس نوجوان کے بارے میں کوئی شبہات نہ تھے، میں نے اپنے دوست اور قانونی مشیر جارج بیزوس سے کہا کہ وہ اس تقریب میں میری نمائندگی کرے۔ میں نے جارج کو ہدایت کی کہ وہ شہزادے سے ملاقات کرکے معلوم کرے کہ وہ میری بیٹی کی کس طرح دیکھ بھال کرے گا۔

جارج شہزادے سے اس کے دفتر میں ملا اور پھر اس نے جزیرہ روبن پر مجھ سے مشورے کا اہتمام کیا چونکہ زینی کی عمر اکیس سال سے کم تھی، میرے لیے یہ ضروری تھا کہ میں اپنی قانونی منظوری دوں تاکہ وہ شادی کرسکے۔ میں مشاورت کے کمرے میں جارج سے ملا تو وہ یہ جان کر حیران رہ گیا کہ کمرے میں ہمارے ساتھ ایک وارڈر بھی موجود ہے۔ میں نے وضاحت کی کہ یہ ضابطے کے مطابق ہے کیونکہ یہ

ایک خاندانی ملاقات ہے نہ کہ قانونی۔ میں نے مسکراتے ہوئے یہ کہہ کہ جارج کو یقین دلایا کہ مجھے اپنے وارڈروں سے کوئی بات نہیں چھپائی۔

جارج نے بتایا کہ دونوں بچے ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں اور میرے ہونے والے داماد کا مستقبل روشن ہے۔ اس کا والد شاہ سوبھوزا ایک روشن دماغ روایتی رہنما تھا اور اے این سی کا ایک رکن بھی تھا۔ جب جارج نوجوان کے خاندان کی طرف سے کیے گئے تقاضے بیان کر رہا تھا، اس نے تکلیف کے ساتھ بتایا کہ لڑکا ایک سوازی شہزادہ ہے۔ میں نے جارج سے کہا کہ وہ نوجوان کو بتا دے کہ وہ ایک تھمبو شہزادی حاصل کر رہا ہے۔

سوازی لینڈ کے شہزادے سے ملاقات

زینی کے سوازی شاہی خاندان کی رکن بننے میں ایک بہت بڑا فائدہ تھا۔ اسے فوراً ہی سفارتی مراعات مل گئیں اور وہ فی الواقع اپنی مرضی سے مجھ سے مل سکتی تھی۔ جب اس کی تھمبوموزی سے شادی ہوگئی، اس کے بعد اگلی سردیوں میں وہ مجھ سے ملنے آئے جبکہ نومولود بچی اس کی گود میں تھی۔ شہزادے کے مرتبے کے باعث ہمیں کمرۂ مشاورت میں ملنے کی اجازت دی گئی جبکہ عام ملاقات کی جگہ قیدی اور اس کے خاندان کے مابین موٹی دیوار اور شیشہ حائل ہوتا ہے۔ میں کمرۂ مشاورت میں قدرے بے چینی سے ان کا انتظار کرنے لگا۔

وہ لمحہ حیرت آمیز تھا جب وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ میں کھڑا ہوگیا اور جب زینی نے مجھے دیکھا تو اس نے اپنی ننھی بچی اپنے شوہر کو تھما دی اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اپنی اس جوان بیٹی سے اس وقت سے نہیں ملا تھا جب وہ خود کم و بیش اپنی بچی کی عمر کی تھی۔ یہ ایک آنکھیں چندھیا دینے والا تجربہ تھا اگرچہ وقت ایک سائنس فکشن ناول کے انداز میں آگے بڑھ چکا تھا اور اب اچانک میری جوان بچی میرے سامنے تھی۔ پھر میں نے اپنے نئے بیٹے کو سینے سے لگایا اور اس نے میری

ننھی نواسی میرے ہاتھوں میں دے دی جو میرے کھردرے ہاتھوں میں بڑی نازک سی لگتی تھی، وہ ہاتھ جو اتنے لمبے عرصے سے صرف گینتیاں اور بیلچے پکڑتے آئے تھے۔میرے لیے یہ بڑی خوشی کا لمحہ تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص ایک بچے کو تھام کر میری اس روز کی خوشی سے زیادہ خوشی حاصل کرسکتا ہے۔

اس ملاقات کا ایک باضابطہ مقصد بھی تھا اور وہ یہ تھا کہ میں بچی کا باقاعدہ نام تجویز کروں۔رسم یہ ہے کہ دادا یا نانا نام تجویز کرتا ہے اور میں نے ''زازیوی'' نام چنا جس کے معنی ہیں۔ ''امید'' اس نام کے میرے لیے خاص معنی تھے کیونکہ جیل میں اتنے سال گزارنے کے دوران میں نے کبھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا اور میں یقین رکھتا تھا کہ اب امید کبھی مجھ سے الگ نہیں ہوگی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ بچی جنوبی افریقیوں کی ایک نئی نسل کا حصہ ہوگی جن کے لیے نسلی امتیاز ماضی کا حصہ ہوگا اور یہی میرا خواب تھا۔

میرے خوابوں کی دنیا

میں نہیں جانتا کہ یہ سوویٹو کی شورش کے بعد جیل کے اندر رونما ہونے والے تغیر کے باعث تھا یا جیل کے باہر میرے خاندان میں آنے والی تبدیلیوں کا نتیجہ تھا،لیکن 1976ء کے اگلے ایک دو برسوں میں میری ذہنی کیفیت خواب آگیں اور یادوطن کے عارضے کا شکار رہی۔جیل میں قیدی کے پاس ماضی کا جائزہ لینے کا وقت ہوتا ہے اور اس کی یادداشت ایک دوست اور ایک دشمن کے دونوں روپ اپنا لیتی ہے۔میرا حافظہ مجھے بیک وقت خوشی اور غم دونوں کیفیتوں میں لے جاتا تھا۔میری خوابوں کی زندگی بہت زرخیز ہوگئی اور میں ساری ساری رات گزرے دنوں کے بلند اور پست لمحات میں کھویا رہتا تھا۔

ایک خواب مجھے بار بار آتا تھا۔ میں خواب میں دیکھتا کہ میں جیل سے ابھی رہا ہوا ہوں۔ یہ جیل جزیرہ روبن کی نہیں بلکہ جوہانسبرگ کی ہوتی۔ میں جیل کے

صدر دروازے سے نکل کر شہر میں داخل ہو جاتا مگر وہاں مجھے کوئی شخص نہ ملتا۔ دراصل وہاں کوئی نہ تھا۔ انسان نہیں تھے، کاریں نہیں تھیں اور نہ ٹیکسیاں تھیں۔ پھر میں پیدل سوویٹو کی طرف چل پڑتا۔ میں کئی گھنٹے چلتا رہتا حتیٰ کہ آرلینڈو ویسٹ میں جا نکلتا اور نمبر 8115 پر پہنچ گیا ہوں اور گھر والوں کو جوانی کے عالم میں ناچتے پایا۔ میں نے ان سب کو اچانک آ لیا جب میں غیر متوقع طور پر گھر میں داخل ہوا۔ بعض نے مجھے گرمجوشی سے سلام کیا جبکہ دوسرے شرماتے ہوئے ادھر ادھر کھسک گئے۔ خوابگاہ میں بھی گھر کے افراد اور قریبی دوست بھرے ہوئے تھے۔ تم بستر پر آرام کر رہی تھیں۔ بیٹے ماکگاتھو کے ساتھ، نوجوان نظر آ رہی تھیں اور سامنے کی دیوار کی جانب سو رہی تھیں۔

''شاید اس خواب میں، میں دسمبر 1956ء کے ان دو ہفتوں کو یاد کر رہا تھا جب ماکگاتھو چھ سال کا تھا اور جب میں ماخولو (ایولین کی ماں) کو گھر میں تنہا چھوڑ گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ آرلینڈو شرقی میں رہتا تھا۔ لیکن میرے آنے سے چند روز پہلے وہ ماخولو سے آ ملا تھا اور میرے بستر پر سو رہا تھا۔ وہ مجھے بہت یاد کرتا تھا اور میرے بستر پر لیٹ کر اس کا میری کمی کا احساس قدرکم ہو گیا ہوگا۔''

جہاں میں نے مسرت انگیز لمحات کا ذکر کر کے لطف اٹھایا وہیں ان مصائب پر تاسف بھی ظاہر کیا جو میری غیر موجودگی کے باعث میرے اہل خانہ کو اکثر اٹھانے پڑتے تھے۔ 1976ء کا ایک اور خط اس طرح ہے:

''جب میں 25 فروری کی صبح جاگا تو مجھے ہمیشہ کی طرح تم اور بچے بہت یاد آئے۔ ان دنوں میں تمہارے بارے میں سوچنے پر خاصا وقت صرف کرتا ہوں اور تمہیں بیک وقت اپنی ڈاڈی ویتھو (بہن)، ممی، رفیق اور اتالیق گردانتا ہوں۔ شاید تم نہیں جانتیں کہ کس طرح میں اکثر تمہارے بارے میں سوچتا اور تمہاری تصویر ذہن میں لاتا ہوں جو تمہاری جسمانی اور روحانی شخصیت کی نمائندگی کرتی ہے...... اور

تمہارے وہ من موہنے ریمارکس یاد آتے ہیں جو روزانہ سننے میں آتے تھے اور بار بار میرے تلخ رویئے پر ناراض ہونے کے مواقع بھی جو تم نے ہمیشہ نظر انداز کر دیئے اور جو کسی بھی اور عورت کو شدید مایوسی سے دوچار کر سکتے تھے...... مجھے وہ دن بھی یاد آتا ہے جب تمہارے پیٹ میں زندزی پرورش پا رہی تھی اور تم اپنے ناخن کاٹنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مجھے یہ تمام وقاعات اب شرمساری کے احساس کے ساتھ یاد آتے ہیں۔ تمہارے یہ چھوٹے چھوٹے کام میں بھی کر سکتا تھا۔ میں اس سے آگاہ تھا یا نہیں، تاہم میرا رویہ کچھ یوں تھا کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے دوسرا بچہ ہونے والا ہے اور تمہاری جسمانی حالت کے نتیجے میں تمہیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، وہ سب تمہاری ہیں۔ میرے لیے واحد تشفی اس احساس میں ہے کہ میں اس وقت ایسی زندگی گزار رہا تھا جہاں مجھے سوچنے کا بھی بمشکل وقت ملتا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جب میں لوٹوں گا تو گھر کا ماحول کیا ہوگا......''

''تمہاری خوبصورت تصویر میرے بائیں کندھے سے تقریباً دو فٹ اوپر اب بھی آویزاں ہے جب کہ میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میں ہر صبح احتیاط سے اس کی گرد جھاڑتا ہوں کیونکہ اس طرح مجھے یہ خوشگوار احساس ہوتا ہے کہ میں تم سے اسی طرح پیار کر رہا ہوں جس طرح پرانے دنوں میں کرتا تھا۔ اس برقی رو سے آشنا ہونے کے لیے اپنی ناک تک تمہاری ناک سے رگڑتا ہوں جو میرے خون میں جاری ہو جاتی تھی جب کبھی میں ایسا کرتا تھا۔ نولیتھا میرے عین سامنے میز پر کھڑی ہے۔ میری روح کیسے پژمردہ ہو سکتی ہے جب میں ایسی حیرت انگیز خواتین کی پرشوق توجہ سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔'' نولیتھا وہ ہستی تھی جو ہمارے خاندان کی رکن نہیں تھی مگر میں نے اس کی تصویر سجا رکھی تھی۔ اس کی شخصیت کا انکشاف میں نے اپنی بیٹی زندزی کے نام 1976ء کے ایک خط میں یوں کیا:

''ویسے کیا تمہارے ممی نے تمہیں نولیتھا کے بارے میں بتایا ہے؟ یہ میری

کوٹھڑی میں ایک اور خاتون ہے جس کا تعلق جزائر انڈیمان سے ہے۔ وہ تمہیں، زینی، انداندی اور ناندنی، مانڈلا (آخری تینوں میرے نواسے، نواسیاں ہیں) ما کی اور ممی کو صحبت فراہم کرتی ہے۔ یہ ایک بات ہے جس پر تمہاری امی کا تبصرہ حیرت انگیز طور پر اقتصادی ہے۔ وہ انڈیمان کے اس بونے حسن کو ایک طرح کا رقیب خیال کرتی ہے اور بمشکل یقین کرتی ہے کہ میں نے نولیتھا کی تصویر نیشنل جیوگرافک سے لی تھی۔''

خواب میں میاں بیوی کی سیر

میں مسلسل اس دن کے بارے میں سوچتا تھا جب میں آزاد ہو کر جیل سے باہر نکلوں گا۔ بار بار میں اپنے تصور میں لاتا کہ میں رہا ہو کر کیا کرنا چاہوں گا۔ یہ وقت گزارنے کا ایک خوشگوار ترین طریقہ تھا۔ میں نے 1976ء ہی میں ایک اور خط میں اپنے ان دنوں کے خوابوں کا ذکر یوں کیا:

''میری خواہش ہے کہ میں تمہیں گاڑی میں ایک طویل سیر کراؤں جیسا کہ میں نے 12 جون 1958ء کو کرائی تھی، لیکن ایک فرق کے ساتھ، وہ یہ کہ اس بار میں تمہیں تنہا لے جانے کو ترجیح دوں گا۔ میں اتنے عرصے سے تم سے دور رہوں کہ اپنی واپسی پر پہلا کام جو کرنا چاہوں کا وہ یہ ہوگا کہ تمہیں دم گھونٹنے والی فضا سے دور لے جاؤں، تمہیں ساتھ بٹھا کر احتیاط سے گاڑی چلاؤں تاکہ تمہیں تازہ اور صاف ہوا میں سانس لینے اور جنوبی افریقہ کے مقامات حسن دیکھنے کا موقع مل سکے جہاں سرسبز گھاس اور درخت اور رنگ رنگ کے جنگلی پھول ہیں، جہاں چمکتی ندیاں بہتی ہیں، میدانوں میں جانور چرتے ہیں اور اس طرح ہم ان سادہ لوگوں سے باتیں کر سکیں جو ہمیں راستے میں ملیں۔ ہمارا پہلا پڑاؤ وہ جگہ ہوگی جہاں ماں رادیبی اور سی کے (ونی کے ماں باپ) محو خواب ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ پہلو بہ پہلو آسودہ خواب ہیں۔ پھر میں ان ہستیوں کو آداب بجالانے کے قابل ہوں گا جنہوں نے میرے

لیے یہ ممکن بنایا کہ میں ایک مسرور اور آزاد انسان بنوں جیسا کہ اب میں ہوں۔ شاید وہ کہانیاں جو میں ان تمام برسوں میں تمہیں سنانے کے لیے بے چین رہا ہوں، اس سیر کے دوران شروع ہوں گی، فضا تمہارے کانوں کو غالباً تیز کر دے گی اور مجھے روک کر ان پہلوؤں پر توجہ مبذول کرائے گی جو پُر لطف، روحانیت سے آشنا کرنے والے اور تعمیری ہیں۔ اس کے بعد ہم وہاں سے رخصت ہو کر اگلے مرحلے میں امفاکانسو اور نوسی کینی (میرے والدین) کی قبروں پر پہنچیں گے جہاں کا ماحول بھی ویسا ہی ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب ہم گاڑی میں نمبر 8115 کی طرف لوٹیں گے تو ہم تازہ دم اور پُر عزم ہوں گے۔"

نوجوان قیدی کا عجیب مطالبہ

جب عشرہ 1970ء کے اوائل میں حکام نے ہمیں خاندان کے قریبی افراد کی تصویریں وصول کرنے کی اجازت دے دی تو ونی نے مجھے ایک البم بھیجا۔ جب کبھی میں ونی، بچوں یا نواسے نواسیوں کی تصویریں وصول کرتا تو میں انہیں احتیاط سے البم میں چسپاں کر دیتا۔ مجھے اس البم سے بڑی رغبت تھی۔ یہ ایک طریقہ تھا جس سے میں حسب خواہش ان لوگوں کو دیکھ سکتا تھا جن سے مجھے محبت تھی۔

لیکن جیل میں کوئی رعایت ساتھ آنے والے دکھ سے خالی نہیں ہوتی۔ اگرچہ مجھے تصویر وصول کرنے اور البم میں لگانے کی اجازت تھی مگر وارڈر اکثر کوٹھڑی کی تلاشی لیتے اور ونی کی تصویریں ضبط کر لیتے۔ آخر کار تصویریں ضبط کرنے کی کارروائی رک گئی اور میرا البم میرے خاندان کی تصویروں سے موٹا ہو گیا۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ پہلے کس نے میرا فوٹو البم مستعار مانگا تھا لیکن وہ کوئی میرے سیکشن ہی کا آدمی تھا۔ میں نے خوشی خوشی اسے دے دیا۔ پھر کسی اور نے مانگا اور اس کے بعد کسی اور نے۔ جلد ہی اس بات کی بہت شہرت ہو گئی کہ میرے پاس فوٹو البم ہے اور ایف اور جے سیکشنوں سے بھی البم دیکھنے کی درخواستیں موصول

ہونے لگیں۔

ایف اور جے سیکشنوں کے ملاقاتی اور خط شاذونادر ہی آتے تھے اور اگر میں انہیں البم کی اس کھڑکی سے دنیا دکھانے سے انکار کرتا تو یہ بخیلی ہوتی۔ لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہوا کہ میرا قیمتی فوٹو البم ابتر ہو گیا ہے اور اس میں سے کئی نایاب تصویریں غائب ہو چکی ہیں۔ یہ لوگ بے چین تھے کہ ان کی کوٹھڑیوں میں کوئی ذاتی چیز ہو لہٰذا وہ اس میں سے تصویریں نکالے بغیر نہ رہ سکے۔ ہر بار جب ایسا ہوا تو میں نے البم کو ایک بار پھر مکمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

بعض اوقات لوگ مجھ سے البم کے بجائے کوئی تصویر ہی مانگ لیتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن جب جنرل سیکشن کا ایک نوجوان بی سی ایم ساتھی جو ہمارے لیے کھانا لاتا تھا، مجھے ایک طرف جا کر کہنے لگا ''مادیبا! مجھے ایک تصویر چاہیے۔'' میں نے کہا ٹھیک ہے، میں تمہیں ایک تصویر بھیج دوں گا۔ ''کب؟'' اس نے تیزی سے کہا۔ میں نے جواب دیا کہ میں اس ہفتے کے آخر تک بھیجنے کوشش کروں گا۔ بظاہر وہ اس سے مطمئن ہو گیا اور جانے لگا مگر پھر وہ اچانک مڑ کر بولا: ''دیکھو' مجھے بوڑھی خاتون کی تصویر مت بھیجنا۔ نوجوان لڑکیوں زندزی یا زینانی کی تصویر بھیجنا۔ یاد رکھنا' بوڑھی خاتون کی نہیں۔''

خبروں تک رسائی کی اجازت

1978ء میں جب ہمیں خبروں تک رسائی کے حق کے لیے احتجاج کرتے ہوئے تقریباً پندرہ برس ہو گئے تھے' حکام نے ہمیں مفاہمت کا ایک راستہ پیش کیا۔ ہمیں اخبارات منگوانے یا ریڈیو سننے کی سہولت دینے کے بجائے انہوں نے اپنی ریڈیو نیوز سروس شروع کر دی جو جیل کے انٹر کام سسٹم پر پڑھی جانے والی خبروں کا روزانہ تیار کردہ خلاصہ ہوتی۔ یہ نشریات معروضی یا جامع ہونے سے کہیں دور تھیں۔ جزیرے کے کئی سنسر حکام دوسرے روز ریڈیو بلیٹن سن کر خبروں کا خلاصہ تیار کرتے

تھے۔ ان نشریات میں تمام اچھی خبریں حکومت کے لیے ہوتی تھیں اور تمام بری خبریں اس کے مخالفین کے لیے۔

پہلا نشریہ رابرٹ سوبکوی کی موت کے متعلق ایک رپورٹ سے شروع ہوا۔ دوسری ابتدائی پورٹیں رہوڈیشیا میں ایان سمتھ کی فوجوں کی فتوحات اور جنوبی افریقہ میں حکومت کے مخالفین کے حراست سے متعلق تھیں۔ خبروں کی یک رخی نوعیت کے باوجود ہم خوش تھے کہ خبریں سننے کو تو ملیں۔ ہم انہیں سن کر بین السطور معنی تلاش کرتے تھے اور محذوف حصوں کے بارے میں اپنے اپنے اندازے لگاتے تھے۔ اس سال ہمیں انٹر کام کے ذریعے پتہ چلا کہ پی ڈبلیو بوتھا' جان ورسٹر کی جگہ وزیراعظم بن گئے ہیں۔ وارڈروں نے جو ہمیں نہیں بتایا تھا وہ یہ تھا کہ ورسٹر نے محکمہ اطلاعات کے سرکاری فنڈز کے غلط استعمال کی خبریں اخبارات میں شائع ہونے پر استعفا دیا تھا۔ میں بوتھا کے بارے میں بہت کم جانتا تھا' تاہم اس حقیقت سے آشنا تھا کہ وزیر دفاع کے طور پر وہ جارحیت پسند تھا اور اس نے 1975ء میں انگولا کے اندر ایک فوجی حملے کی حمایت کی تھی۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کس طرح ایک مصلح ثابت ہوسکتا تھا۔

میں نے حال ہی میں ورسٹر کی ایک مصدقہ سوانح عمری پڑھی تھی (یہ جیل کی لائبریری میں سے مجھے ملی تھی) اس سے پتہ چلا تھا کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جو اپنے نظریات کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنی کی حمایت کرنے پر جیل گیا تھا۔ ہمیں ورسٹر کے جانے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ اس نے آزادی کے خلاف جنگ کو تشدد کی نئی بلندیوں سے آشنا کیا تھا۔

لیکن ہم نے بگاڑی ہوئی ریڈیائی نشریات کے بغیر بھی وہ کچھ جان لیا تھا جو حکام ہمیں نہیں بتانا چاہتے تھے۔ ہم نے 1975ء میں موزمبیق اور انگولا میں کامیاب تحاریک آزادی اور آزاد ملکوں کے قیام کی خبریں سنی تھیں جہاں اب انقلابی حکومتیں

قائم تھیں۔ یوں آزادی کی لہر ہماری طرف آرہی تھی۔

فلمیں جو دیکھنے کو ملیں

جزیرے پر بڑھتے ہوئے کھلے پن کے ساتھ ساتھ اب ہمیں سینما کی سہولت بھی حاصل ہوگئی تھی۔ تقریباً ہر ہفتے ہم اپنی راہداری سے ملحق ایک بڑے کمرے میں ایک چادر پر فلمیں دیکھتے تھے۔ بعد میں ہم ایک باقاعدہ سکرین پر دیکھنے لگے۔ یہ فلمیں ہمارے لیے ایک حیرت انگیز تفریح اور جیل کی بوجھل زندگی سے فرار کا ایک ذریعہ تھیں۔ پہلی فلمیں جو ہم نے دیکھیں وہ ہالی وڈ کی خاموش بلیک اینڈ وائٹ ایکشن فلمیں اور دیگر مغربی فلمیں تھیں جو میرے زمانے سے بھی پہلے بنی تھیں۔ مجھے ان میں سے پہلی فلم یاد ہے جس کا نام ''دی مارک آف زورو'' تھا جس میں ڈگلس فیئر بینکس کا کرائے کے فوجی کا کردار تھا۔ یہ فلم 1920ء میں بنی تھی۔ یوں لگتا تھا تاریخی فلمیں حکام کی کمزوری ہیں، خصوصاً وہ فلمیں جن میں کوئی پرزور اخلاقی پیغام ہوتا۔ ابتدائی فلموں میں جو ہم نے دیکھیں ''دی ٹین کمانڈمنٹس'' بھی تھی (جواب رنگین بولتی فلم ہے) جس میں چارلٹن ہیسٹن نے موسیٰ کا کردار ادا کیا تھا۔ پھر ''دی کنگ اینڈ آئی'' تھی جس میں یول برائنر نے اداکاری کی تھی اور ''قلوپطرہ'' تھی جس میں رچرڈ برٹن اور ایلزبتھ ٹیلر نے اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔

''دی کنگ اینڈ آئی'' نے ہمیں مسحور کیا کیونکہ ہمارے نزدیک یہ مشرق اور مغرب کی قدروں کے مابین تصادم کو ظاہر کرتی تھی اور یہ پیغام دیتی نظر آتی تھی کہ مغرب کو مشرق سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ ''قلوپطرہ'' متنازع ثابت ہوئی۔ میرے کئی ساتھیوں نے اس حقیقت پر ذہنی تحفظ سے کام لیا کہ ملکہ مصر کا کردار سیاہ بالوں اور بنفشی آنکھوں والی ایک امریکی اداکارہ نے ادا کیا تھا۔ کچھ عیب گیروں نے کہا کہ یہ فلم مغربی پروپیگنڈے کا ایک نمونہ ہے جس کا مقصد اس حقیقت کو محو کرنا ہے کہ قلوپطرہ ایک افریقی عورت تھی۔ میں نے بیان کیا کہ کس مقصد اس حقیقت کو محو کرنا ہے

کہ قلوپطرہ ایک افریقی عورت تھی۔ میں نے بیان کیا کہ کس طرح میں نے اپنے دورۂ مصر کے دوران ایک جوان آبنوسی جلدوالی قلوپطرہ کا شاندار مجسمہ دیکھا تھا۔

صوفیہ لورین کا شیدائی

بعد میں ہم نے مقامی جنوبی افریقی فلمیں بھی دیکھیں جن میں سیاہ فام اداکار تھے جنہیں ہم پرانے دنوں سے جانتے تھے۔ ان راتوں میں ہمارا چھوٹا سا منقولہ نعروں، سیٹیوں اور تالیوں سے گونج اٹھتا تھا جو سکرین پر کسی پرانے دوست کے دکھائی دینے پر بجتی تھیں۔ بعد میں ہمیں دستاویزی فلمیں منتخب کرنے کی اجازمل گئی، جنہیں میں ترجیح دیتا تھا، چنانچہ میں رسمی فلمیں چھوڑ کر اپنی منتخب فلمیں دیکھنے لگا اگر چہ میں نے وہ فلم کبھی نہ چھوڑی جس میں صوفیہ لورین ہو۔ دستاویزی فلمیں سٹیٹ لائبریری سے منگوائی جاتی تھیں اور ان کا انتخاب عموماً احمد کاتھرادا کرتا تھا جو ہمارے سیکشن کا لائبریرین تھا۔ میں ایک دستاویزی فلم سے بہت متاثر ہوا جو ہم نے دوسری جنگ عظیم کی بڑی بحری جنگوں کے بارے میں دیکھی جس میں جاپانیوں کے ذریعے ایچ ایم ایس پرنس آف ویلز کی غرقابی کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس برطانوی جہاز کے نقصان کی خبر سننے پر ونسٹن چرچل کا روتا ہوا چہرہ تھا۔ یہ چہرہ عرصے تک میری یادوں میں جاگزین رہا، جو یہ ظاہر کرتا تھا کہ ایسا وقت بھی آتا ہے جب ایک رہنما عوام کے سامنے اپنا دکھ ظاہر کرسکتا ہے اور اس سے اس کے عوام کی نظروں میں اس کی قدر و قیمت کم نہیں ہوتی۔

دوزخ کے فرشتوں پر بحث

ایک دستاویزی فلم جو ہم نے دیکھی، ایک متنازع امریکی موٹر سائیکل گروپ ہیلز اینجلز کے متعلق تھی۔ یہ فلم انہیں بے وقوف، متشدد اور سماج دشمن ظاہر کرتی تھی اور پولیس کو خوش اطوار، ڈٹ جانے والی اور قابل اعتماد ظاہر کرتی تھی۔ جب فلم ختم ہوئی، ہم نے فوراً اس کے معنی پر غور کرنا شروع کیا۔ تقریباً بلا استثنا ساتھیوں نے ''دو

زخ کے فرشتوں'' کے غیر قانونی طریقوں کے باعث ان پر نکتہ چینی کی۔لیکن پھر سٹینی مو دلے' جو ایک روشن خیال نوجوان' سیاہ شعور تنظیم کا رکن تھا' کھڑا ہوا اور اس نے حاضرین کو مورد الزام ٹھہرایا کہ وہ وقت کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں کیونکہ موٹر سائیکل گروپ 1976ء کے سوویٹو کے طلبہ ہی کی طرح ہے جنہوں نے حکام کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔اس نے ہمیں ملامت کی کہ ہم بڑی عمر کے متوسط طبقے کے دانش ور ہیں جو موٹر سائیکل سواروں کا ساتھ دینے کے بجائے فلم کے دائیں بازو کے حکام کے ساتھ دے رہے ہیں۔سٹرینی کے الزامات پر بڑا شوروغوغا ہوا اور کئی آدمی اس کے خلاف بات کرنے کے لیے یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ دوزخ کے فرشتوں کا دفاع نہیں کیا جا سکتا اور نفس پرست سماج دشمن گروہ سے اپنی تحریک آزادی کا موازنہ کرنا اس کی توہین ہے۔لیکن میں نے سٹرینی کے موقف پر غور کیا اور اگر چہ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا تھا' میں اس کی مدافعت پر اتر آیا۔اگر چہ دوزخ کے فرشتے کسی ہمدردی کے مستحق نہ تھے مگر وہ حکام کے بغی تھے خواہ وہ بے ڈھب باغی ہی تھے۔

دنیا ہماری طرف آ رہی تھی

مجھے دوزخ کے فرشتوں میں دلچسپی نہیں تھی لیکن بڑا سوال جو مجھے تشویش میں ڈال رہا تھا' یہ تھا کہ کہیں ہم سٹرینی کے بقول وقت کے لحاظ سے ذہنی پسماندگی کا شکار تو نہیں ہو گئے اور اب انقلابی نہیں رہے۔ہم پندرہ سال سے زیادہ عرصے سے جیل میں تھے اور مجھے جیل میں رہتے کم و بیش اٹھارہ سال ہو گئے تھے۔جو دنیا ہم چھوڑ کر آئے تھے وہ بہت پیچھے رہ گئی تھی۔خطرہ یہ تھا کہ ہمارے خیالات وقت میں منجمد ہو گئے تھے۔جیل بدلتی دنیا میں ایک ساکت نقطہ ہے اور جیل میں ایک ہی جگہ رہنا بہت آسان ہے جبکہ دنیا آگے بڑھتی رہتی ہے۔

میں نے ہمیشہ کوشش کی تھی کہ نئے خیالات کے لیے اپنا ذہن کھلا رکھوں اور ایک

پوزیشن کو صرف اس وجہ سے مسترد نہ کروں کہ وہ نئی یا مختلف ہے۔ جزیرے پر ہمارے ان برسوں کے دوران اپنے نظریات اور خیالات کے بارے میں ہمارا مکالمہ جاری رہا۔ ہم ان پر بحث کرتے‘ ان پر اعتراض اٹھاتے اور یوں ان کی اصلاح کرے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ ہم ایک ہی جگہ ٹھہرے رہے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ ہم نے ارتقاء کیا ہے۔

اگرچہ جزیرہ روطن زیادہ کھلا ہو رہا تھا لیکن ابھی تک ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی تھی کہ حکومت اپنے خیالات کی اصلاح کر رہی ہے۔ پھر بھی مجھے اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں ایک روز آزاد انسان ہوں گا۔ ہو سکتا تھا کہ ہم ایک جگہ اٹک گئے ہوں مگر مجھے یقین تھا کہ دنیا ہماری پوزیشن کی طرف آ رہی ہے‘ اس سے پرے نہیں جا رہی۔ اس فلم نے مجھے ایک بار پھر اس روز کی یاد دلائی جب میں جیل سے باہر ہوں گا‘ میں یہ نہیں چاہوں گا کہ میں قدیم ماضی کا ایک سیاسی متحجرہ (Fossil) بن کے رہ جاؤں۔

چینی برابر کرنے کی چال

اس میں پندرہ برس لگے مگر 1979ء میں انٹر کام سسٹم پر اعلان کیا گیا کہ آئندہ افریقیوں‘ رنگ داروں اور ہندوستانی قیدیوں کے لیے خوراک یکساں ہو گی لیکن جیسا کہ انصاف میں تاخیر انصاف کے انکار کے مترادف ہوتی ہے‘ یہ اصلاح ملتوی ہوتی رہی اور اسے نہ چاہتے ہوئے اس طرح قانونی شکل دی گئی کہ اب اس پر خوش ہونے والی کوئی بات نہیں رہ گئی تھی۔

صبح سب قیدیوں کو یکساں مقدار میں چینی ملتی تھی‘ یعنی ڈیڑھ چمچہ۔ لیکن حکام نے افریقیوں کے کوٹے میں اضافہ کرنے کے بجائے رنگ دار اور ہندوستانی قیدیوں کو ملنے والی چینی کو مقدار نصف چمچہ کم کر دی اور اتنی ہی مقدار افریقی قیدیوں کے لیے بڑھا دی۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے افریقی قیدیوں کو صبح ڈبل روٹی ملنے لگی تھی‘ مگر اس

سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہم برسوں سے مل کر ڈبل روٹی کھا رہے تھے۔

پچھلے دو برسوں میں ہماری خوراک پہلے سے بہتر ہوگئی تھی لیکن یہ حکام کی مہربانی کا نتیجہ نہیں تھا۔ سوویٹو شورش کے پیش نظر حکام نے فیصلہ کیا تھا کہ جزیرہ روبن کو جنوبی افریقہ کے سکیورٹی قیدیوں کا خصوصی ٹھکانہ بنا دیا جائے۔ عام قیدیوں کی تعداد میں شدید کمی آ گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں باورچی خانے میں کام کرنے کے لیے پہلی بار سیاسی قیدی بھرتی کیے گئے۔ ایک بار جب سیاسی قیدی مطبخ میں پہنچ گئے تو ہماری خوراک ڈرامائی طور پر بہتر ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بہتر باورچی تھے بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ خوراک کی اسمگلنگ فوراً رک گئی تھی۔ خوراک خود اپنے لیے الگ کرنے یا وارڈروں کو رشوت میں دینے کے بجائے' نئے باورچی ہمارے لیے مخصوص کی گئی تمام خوراک ہمارے پہنچانے لگے۔ سبزیاں بکثرت ملنے لگیں اور ہمارے سوپ اور دم پخت کھانوں میں گوشت کے قتلے دکھائی دینے لگے۔ یوں ہمیں احساس ہوا کہ ہم ایسی خوراک برسوں سے کھا رہے ہیں۔

میری ایڑی کی جراحی

1979ء کی گرمیوں میں' میں احاطے میں ٹینس کھیل رہا تھا جب میرے حریف نے بال کو کراس کورٹ ضرب لگائی جس تک پہنچنے کے لیے مجھے کاوش کرنی پڑی۔ جب میں احاطے میں دوڑ رہا تھا' مجھے اپنی دائیں ایڑی میں اتنا شدید درد محسوس ہوا کہ مجھے کھیل چھوڑنا پڑا۔ اگلے چند روز میں بری طرح لنگڑا کر چلتا رہا۔

جزیرے پر ایک ڈاکٹر نے میرا معاینہ کیا جس نے صلاح دی کہ مجھے سپیشلسٹ کو دکھانے کے لیے کیپ ٹاؤن جانا چاہیے۔ حکام ہماری صحت کے متعلق زیادہ فکرمند ہو گئے تھے اور خوفزدہ تھے کہ اگر ہم جیل میں مر گئے تو بین الاقوامی برادری انہیں ملزم ٹھہرائے گی۔

اگرچہ عام حالات میں' میں اور دوسرے ساتھی کیپ ٹاؤن جانے پر بڑی خوشی کا

اظہار کرتے لیکن قیدی کی حیثیت سے جانا یکسر مختلف تھا۔ مجھے ہتھکڑی لگا کر دخانی کشتی کے پرلے گوشے میں بٹھایا گیا تھا۔ کشتی پانچ مسلح وارڈروں کی نگرانی میں چل رہی تھی۔ سمندر اس روز طوفانی تھا اور ہر لہر کشتی کو الٹانے پر آمادہ نظر آتی تھی۔ جزیرے اور کیپ کے تقریباً وسط میں، میں نے سوچا کہ ہم غرقاب ہو جانے کے خطرے سے دوچار ہیں۔ میں نے دو وارڈروں کے پیچھے ایک لائف جیکٹ دیکھی جو میرے پوتوں اور نواسوں کی عمر کے تھے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا: ''اگر یہ کشتی ڈوب گئی تو میں زمین پر اپنے آخری گناہ کا ارتکاب کروں گا اور دوڑ کر ان لڑکوں سے وہ لائف جیکٹ چھین لوں گا۔'' لیکن آخر کار اس کی ضرورت پیش نہ آئی۔

گودیوں پر مزید مسلح سپاہی اور ایک چھوٹا سا ہجوم مرہم سے آ ملے۔ عام شہری جب ایک سزا یاب قیدی کو جاتے دیکھیں] تو ان کے چہروں پر خوف اور نفرت کے آثار دیکھنا ایک اہانت آمیز تجربہ ہوتا ہے۔ میرا رجحان یہ تھا کہ میں نیچے دبک کر چھپ جاؤں مگر میں ایسا کر نہیں سکتا تھا۔

ایک نوجوان سرجن نے میرا معاینہ کیا۔ اس نے پوچھا کیا پہلے کبھی میری ایڑی زخمی ہوئی تھی۔ دراصل جب میں فورٹ ہیئر میں تھا تو ایک بار وہ زخمی ہوئی تھی۔ ایک سہ پہر میں فٹ بال کھیل رہا تھا جب میں نے گیند چھیننے کی کوشش کی تو مجھے اپنی ایڑی میں درد کی شدید لہر محسوس ہوئی۔ مجھے مقامی ہسپتال میں لے جایا گیا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے ہسپتال لے جایا گیا میں نے کوئی ڈاکٹر دیکھا۔ جہاں میں نے پرورش پائی تھی وہاں افریقی ڈاکٹر نام کی کوئی چیز نہ تھی اور گورے ڈاکٹر کے پاس جانا کبھی سنا نہ گیا تھا۔

فورٹ ہیئر کے ڈاکٹر نے میری ایڑی کا معاینہ کیا تھا اور کہا تھا کہ ایڑی کا آپریشن کرنا پڑے گا۔ اس تشخیص نے مجھے چونکا دیا اور میں نے چھوٹتے ہی کہہ دیا کہ میں نہیں چاہتا وہ مجھے چھوئے۔ زندگی کے اس مرحلے پر میں ڈاکٹر کے پاس جانے کو

مردانگی کے خلاف خیال کرتا تھا اور کوئی طبی آپریشن کرانا مجھے اور بھی برا لگتا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا: ''جیسے تم مناسب جانو'لیکن جب تم بڑے ہوگے تو یہ چیز تمہیں پریشان کرے گی۔''

کیپ ٹاؤن کے سرجن نے میری ایڑی کا آپریشن کیا اور ہڈی کے ریزے دریافت کیے جو غالباً فورٹ ہیئر کے زمانے سے وہاں رہ گئے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ مقامی طور پر پاؤں کو سن کرکے ہڈی کے ریزے نکال سکتا ہے۔ میں فوراً رضا مند ہوگیا۔

جراحی ٹھیک رہی اور جب وہ مکمل ہوگئی تو ڈاکٹر سمجھانے لگا کہ کس طرح اپنی ایڑی کی حفاظت کرنی ہے۔ ہیڈ وارڈر نے اسے ٹوک دیا کہ قیدی کو جلد جزیرہ روبن پر لوٹ جانا ہے۔ اس پر سرجن نے تاؤ کھا کر حاکمانہ انداز میں کہا کہ مسٹر منڈیلا کا رات ہسپتال میں رہنا ضروری ہے اور وہ کسی حالت میں مجھے فارغ نہیں کرے گا۔ وارڈر باؤ میں آکر خاموش رہا۔

ایک باقاعدہ ہسپتال میں میری پہلی رات بہت خوشگوار رہی۔ نرسوں نے مجھ پر خاصی رائے زنی کی۔ میں خوب سویا۔ صبح نرسوں کا ایک گروہ آیا اور کہنے لگیں کہ مجھے جو پاجامہ اور ڈریسنگ گاؤن دیئے گئے ہیں وہ پہنے رہوں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ مجھے ملنے والی اس رعایت پر تمام قیدی رشک کریں گے۔

میں نے اس سفر کو ایک اور پہلو سے تعمیری پایا کیونکہ اس ہسپتال میں مجھے گوروں اور کالوں کے مابین برف پگھلتی نظر آئی تھی۔ ڈاکٹروں اور نرسوں نے فطری طور پر میرا علاج کیا تھا جیسے وہ زندگی بھر کالوں سے مساوات پر مبنی برتاؤ کرتے رہے ہوں۔ یہ بات میرے لیے نئی اور مختلف تھی اور ایک حوصلہ افزا علامت تھی۔ اس سے میرا یہ دیرینہ عقیدہ اور پختہ ہوگیا کہ تعلیم تعصب کی دشمن ہے۔ یہ مرد اور عورتیں سائنس کے تھے اور سائنس میں نسلی امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں۔

واحد افسوس یہ تھا کہ مجھے ہسپتال آنے سے پہلے ونی سے رابطہ قائم کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اخبارات میں افواہیں شائع ہوئی تھیں کہ میں موت کی دہلیز پر ہوں اور بہت تشویش میں مبتلا ہوئی تھی لیکن جب میں کیپ ٹاؤن سے واپس پہنچا تو میں نے اسے خط لکھا کہ وہ تمام خدشات ذہن سے نکال دے۔

اب ہمیں اخبار ملنے لگے

1980ء میں ہمیں اخبارات خریدنے کا حق دیا گیا۔ یہ ایک فتح تھی لیکن ہمیشہ کی طرح ہر نئی رعایت میں ایک مغالطہ بھی شامل ہوتا تھا۔ نیا ضابطہ یہ کہتا تھا کہ اے گروپ قیدیوں کو ایک انگریزی زبان کا اخبار اور ایک افریکان اخبار روزانہ خریدنے کا حق دیا گیا ہے۔ لیکن تکلیف وہ بات یہ تھی کہ اگر کوئی اے گروپ قیدی اپنا اخبار کسی نان اے گروپ قیدی کو دیتا ہوا پکڑا جاتا تو اس سے اکٹھ ارکی سہولت واپس لے لی جاتی۔ ہم نے اس پابندی کے خلاف احتجاج کیا لیکن بے سود۔

ہمیں روزانہ دو اخبار ملتے تھے۔ کیپ ٹائمز اور دائی برگر۔ دونوں قدامت پرست اخبار تھے، خصوصاً آخر الذکر۔ پھر بھی جیل کے سنسر حکام روزانہ ان میں ہر اخبار کو اچھی طرح دیکھتے اور ان کے خیال میں جس خبر یا مضمون کا پڑھنا ہمارے لیے غیر محفوظ ہوتا اسے قینچی سے کاٹ ڈالتے۔ جب اخبارات ہمیں موصول ہوتے تو ان میں چھید پڑے ہوتے۔

جلد ہی ان اخبارات کے ساتھ ہمیں دی سٹار، دی راند ڈیلی میل اور دی سنڈے ٹائمز ملنے لگے لیکن ان اخبارات کی اور زیادہ کانٹ چھانٹ کی جاتی تھی۔

''فری منڈیلا'' پوسٹر لندن میں

ایک کہانی جو مارچ 1980ء میں جوہانسبرگ سنڈے پوسٹ میں چھپی وہ میں یقیناً نہیں پڑھ سکا تھا۔ اس کا عنوان تھا: ''منڈیلا کو رہا کرو!'' اس کے اندر ایک درخواست چھپی تھی جس پر دستخط کر کے لوگ میری اور میرے ساتھی سیاسی قیدیوں کی

رہائی کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ اگر چہ اخبارات کو میری تصویر یا میرے الفاظ شائع کرنے کی ابھی تک ممانعت تھی؛ جو میں نے کبھی کہے یا لکھے تھے، پوسٹ کی مہم نے ہماری رہائی کے لیے عوامی بحث و تمحیص کو ہوا دی۔

یہ تصور لوسا کا میں آلو ٹیمبو اور اے این سی کی اختراع تھا اور یہ مہم ایک نئی سٹراٹیجی کا حصہ تھی۔ اس کا مقصد ہمارے کاز کو لوگوں کے ذہنوں میں تازہ رکھنا تھا۔ اے این سی نے فیصلہ کیا تھا کہ اس مہم کو ایک ہی شخصیت پر مرکوز کر کے ہماری رہائی کی درخواست کو شخصی رنگ دیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لاکھوں لوگ جو اس کے بعد اس مہم کے حامی بن گئے انہیں کوئی ٹھیک اندازہ نہیں تھا کہ نیلسن منڈیلا کون ہے۔ مجھے بایا جاتا ہے کہ جب ''فری منڈیلا'' پوسٹر لندن میں لگائے گئے تو اکثر نوجوان لوگوں کا خیال تھا کہ میرا مسیحی نام ''فری'' ہے۔ جزیرے پر کچھ مخالف آوازیں بھی اٹھیں جن کا خیال تھا کہ مہم کو شخصی رنگ دینا پارٹی اجتماعیت سے غداری ہے لیکن اکثر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ لوگوں کو ابھارنے کی ایک ٹیکنیک ہے۔ پچھلے سال مجھے بھارت میں جواہر لال نہرو ہیومن رائٹس ایوارڈ دیا گیا تھا جو جدوجہد آزادی کے ابھرنے کا ایک اور ثبوت تھا۔ مجھے اس تقریب میں شرکت کی اجازت دینے سے انکار کر دیا گیا تھا اور ونی کو بھی اجازت نہیں ملی تھی، تاہم آلیور نے میری غیر موجودگی میں انعام وصول کیا تھا۔ ہمیں اے این سی کے نئے سرے سے ابھرنے کا احساس ہوا تھا۔ امخونتو وی سزوی کی سبوتاژ مہم آگے بڑھ رہی تھی اور اس نے زیادہ جدید طریقے اپنا لیے تھے جون میں ''ایم کے'' کے آدمیوں نے جوہانسبرگ کے عین جنوب میں ساسول برگ ریفائنری میں بم رکھ دیئے تھے۔ ایم کے ہر ہفتے کسی نہ کسی اہم مقام پر دھماکہ کر رہی تھی۔ مشرقی ٹرانسوال میں پاور اسٹیشنوں اور پریٹوریا کے باہر وورٹریکر ہوٹ کے فوجی اڈے پر بم پھٹے تھے۔ یہ سب اہم مقامات پر تھے جو توجہ کا مرکز بنے اور حکومت کو پریشانی اٹھانا پڑی۔ وزیر دفاع جنرل میگنس مالان نے پی ڈبلیو بوتھا کی حمایت

ے ایک پالیسی متعارف کرائی جسے ٹوٹل اون سلاٹ یعنی کلی یلغار کہا گیا اور یہ جدوجہد آزادی کا مقابلہ کرنے کے لیے ملک کو عسکری رنگ دینے کی پالیسی تھی۔

شہزادی این کا مقابلہ

''فری منڈیلا'' مہم کے لطیف تر پہلو بھی تھے۔ 1981ء میں مجھے پتہ چلا کہ یونیورسٹی آف لندن کے طلبہ نے مجھے یونیورسٹی چانسلر کے معزز عہدے کے لیے نامزد کیا ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز اعزاز تھا اور میری حریف شہزادی این اور ٹریڈ یونین لیڈر جیک جونز جیسی ہستیاں تھیں۔ آخر کار میں نے سات ہزار ایک سو نانوے ووٹ حاصل کیے اور ملکہ کی بیٹی سے ہار گیا۔ میں نے برانڈ فورٹ میں ونی کو لکھا کہ مجھے امید ہے۔ اس ووٹنگ نے ایک لمحے کے لیے اس کے معمولی جھونپڑے کو قلعے میں بدل دیا ہوگا اور اس کے ننھے ننھے کمرے قصر ونڈسر کے بال روم جتنے شاندار ہو گئے ہوں گے۔

ہماری رہائی کی مہم نے ہماری امیدوں کو از سر نو روشن کر دیا۔ عشرہ 1970ء کے اوائل کے سخت دنوں کے دوران جب لگتا تھا کہ این سی سایوں میں ڈوب جائے گی' ہمیں اپنے آپ کو مجبور کرنا تھا کہ مایوسی میں ہار نہ مان لیں۔ کئی لحاظ سے ہم نے غلط اندازے لگائے تھے۔ ہم نے سوچا تھا کہ 1970ء کی دہائی آنے تک ہم ایک جمہوری غیر نسلی جنوبی افریقہ میں رہ رہے ہوں گے' تاہم جب ہم نئے عشرے میں داخل ہوئے' جنوبی افریقہ کے لیے میری امیدیں ایک بار پھر ابھریں۔ میں بعض صبحوں کو احاطے میں نکلتا اور وہاں ہر زندہ چیز' سمندری مرغابیاں اور دیگ ٹیلر' چھوٹے درخت حتیٰ کہ گھاس کی ادھ ادھر پڑی پتیاں مسکراتی اور دھوپ میں چمکتی محسوس ہوتیں۔ ان اوقات میں جب مجھے دنیا کے اس چھوٹے سے بند گوشے میں بھی حسن کی جھلک نظر آتی تو میں جان لیتا کہ کسی روز میری قوم اور میں آزاد ہوں گے۔

میرے بھتیجے نے شاہ سابا تا کو معزول کر دیا

اپنے باپ کی طرح میری پرورش اور تربیت شاہ تھیمبو کا مشیر بننے کے لیے ہوئی تھی۔ اگرچہ میں نے مختلف راستہ اپنایا تھا' میں اپنے طریقے پر اس کردار کی ذمہ داریوں کو نبھانے کی کوشش کرتا تھا جن کے لیے لڑکپن میں میری تربیت ہوئی تھی۔ جیل سے میں شاہ سے رابطہ رکھنے اور اسے ممکنہ طور پر بہترین مشورہ دینے کی پوری پوری کوشش کرتا۔ جب میں بڑا ہوا تو میرے خیالات اکثر و بیشتر ٹرانسکائی کی سرسبز پہاڑیوں کے گرد گھومتے۔ اگرچہ حکومت کے اہتمام کے تحت میں وہاں کبھی نہ جا سکا تھا' میں خواب دیکھتا تھا کہ ایک روز آزاد ٹرانسکائی میں واپس جاؤں گا۔ یوں 1980ء میں یہ خبر سن کر مجھے بڑی تشویش ہوئی کے تھیمبو کے پیراماؤنٹ چیف شاہ سابا تا دالن دیبو کو میرے بھتیجے وزیر اعظم ٹرانسکائی کے دی ماتن زیما نے معزول کر دیا ہے۔

تھیمبو سرداروں کے ایک گروہ نے مجھ سے فوری ملاقات کی درخواست کی جو حکام نے منظور کر لی کیونکہ وہ روایتی لیڈروں کی ملاقاتوں کو عموماً اس لیے برداشت کر لیتے تھے کہ ان کے خیال میں' میں جس قدر قبائلی اور ٹرانکسائی کے معاملات میں ملوث ہوں گا' جدوجہد آزادی سے میرا لگاؤ اسی قدر کم ہو گا۔

حکومت اے این سی کا روڑ کرنے کے لیے روایتی لیڈروں کے اقتدار کو فروغ دیتی تھی۔ اگرچہ میرے کئی ساتھی یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں ان لیڈروں سے بری الذمہ ہو جانا چاہیئے' میرا رجحان یہ تھا کہ ان کے ذہنوں تک پہچا جائے۔ ایک روایتی لیدر ہونے اور اے این سی کا ایک رکن ہونے کے مابین کوئی تضاد نہیں تھا۔ اس طرح جزیرے پر ایک طویل ترین اور نازک ترین بحث چھڑ گئی کہ کیا اے این سی کو حکومت کے قائم کردہ اداروں میں حصہ لینے چاہیئے یا نہیں۔ کئی لوگ اسے دشمن سے تعاون کرنا خیال کرتے تھے۔ ایک بار پھر میں نے ضروری جانا کہ اسولوں اور ہتھکنڈوں

کے مابین خط امتیاز کھینچا جائے۔ میرے نزدیک نازک سوال ہتھکنڈوں کا تھا۔ کیا ہماری پارٹی ان اداروں میں حصہ لے کر مضبوط تر ہوگی یا ان کا بائیکاٹ کر کے؟ اس معاملے میں میرا خیال تھا کہ ہم اداروں میں حصہ لے کر مضبوط تر ہوں گے۔

قبائلی سردار روبن جیل میں

میں ملاقات کے حصے میں ایک بڑے کمرے میں سرداروں سے ملا اور انہوں نے اپنی مشکل کی وضاحت کی۔ اگرچہ ان کے دل ساباتا کے ساتھ تھے انہیں ماتن زیما کا خوف تھا۔ ان کی عرضداشت سننے کے بعد میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ ماتن زیما کے خلاف ساباتا کی حمایت کریں کیونکہ ماتن زیما نے غیر قانونی طور پر اور روحانی سے شاہ کے اختیارات غصب کر لیے ہیں۔ مجھے ان کی صورتحال سے ہمدردی تھی مگر میں ماتن زیما کے اقدامات سے چشم پوشی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ ساباتا کو میری حمایت اور ماتن زیما کو میری ناپسندیدگی سے آگاہ کر دیں۔

ماتن زیما نے بھی ساباتا اور خاندانی معاملات پر بات چیت کے لیے ملاقات کی درخواست کر رہا تھا۔ اگرچہ ماتن زیما خاندانی معاملات پر بات چیت کا خواہاں ہونے کا دعویٰ کرتا تھا مگر ایسی ملاقات کے سیاسی نتائج نکلتے۔ ماتن زیما کی پہلی درخواست پہنچتے ہی میں نے یہ معاملہ اپنے سیکشن میں ہائی آرگن اور اے این سی کے آدمیوں کے سامنے پیش کیا۔ بعض نے صرف کندھے اچکا کر کہا: ''وہ تمہارا بھتیجا ہے۔ اسے ملاقات کا حق ہے۔'' تاہم ریمونڈ' گوان اور کیتھی نے اصرار کیا کہ اگرچہ ایسی ملاقات کو خاندانی معاملہ قرار دیا جا سکتا ہے مگر کئی لوگ ملک کے اندر اور باہر اسے ماتن زمیا اور اس کی پالیسیوں کی حمایت کے معنی پہنائیں گے۔ ان کے نزدیک ماتن زیما کا خود ملاقات کی خواہش ظاہر کرنا ایسی ملاقات کی خواہش ظاہر کرنا ایسی ملاقات کے ہمارے لیے ناقابل قبول ہونے کی معقول وجہ تھا۔

میں اس نکتے کو سمجھ گیا اور بڑی حد تک ان کے دلائل سے متفق ہو گیا لیکن میں

اپنے بھتیجے سے ملنا چاہتا تھا۔ میں ہمیشہ سے روبرو ملاقاتوں کی اہمیت کو شاید بہت اونچا مقام دیتا اور یہ سمجھتا تھا کہ مجھ میں ایسی ملاقات کے دوران آنے والے کو اپنے خیالات بدلنے کی ترغیب دینے کی صلاحیت ہے۔ مجھے امید تھی کہ میں ماتن زیما کو اپنی پالیسیوں پر نظرثانی کرنے کے لیے قائل کرلوں گا۔

آخرکار ہمارے سیکشن میں اے این سی کے آدمیوں نے فیصلہ کیا کہ ماتن زیما کی آمد پر اعتراض نہ کیا جائے۔ اب جمہوریت کے مفاد میں ہم نے ایف اور جی سیکشنوں میں اپنے آدمیوں سے اس معاملے پر مشورہ کیا اور انہوں نے شدید مخالفت کی۔ سٹیو شوبٹی نے جو جنرل سیکشن میں اے این سی کی ایک نمایاں شخصیت تھا، کہا کہ ایسی ملاقات ماتن زیما کو سیاسی فائدہ پہنچائے گی، اس لیے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان میں سے کئی ایک نے کہا کہ ماتن زیما نے پہلے ہی اپنی حکومت میں ونی کے باپ کولمبس مادی کیزیلا کو وزیر زراعت مقرر کرکے میری رضامندی لینے کی کوشش کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ جو کچھ ہوا بہت برا ہوا اور ماد یبا اس شخص سے ملاقات پر راضی ہوگیا تو یہ اور برا ہوگا۔ میں نے جنرل سیکشن کے ساتھیوں کے خیالات کے آگے سر جھکا دیا اور بڑے افسوس کے ساتھ حکام کو اطلاع دی کہ میں اپنے بھتیجے سے ملاقات پسند نہیں کروں گا۔

ونی کا پراسرار کار حادثہ

مارچ 1982ء میں جیل حکام نے مجھے بتایا کہ میری بیوی کا ایک کار حادثہ ہوا ہے اور وہ ہسپتال میں ہے۔ ان کے پاس تفصیلات بہت کم تھیں اور مجھے اس کی حالت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میں نے حکام کو الزام دیا کہ انہوں نے یہ خبر روکے رکھی اور اپنے وکیل سے فوری ملاقات کے لیے درخواست دے دی۔ حکام نے اس خبر کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور وہ کارگر ثابت ہوا۔ میں اپنی ناکامی کا احساس ہو رہا تھا۔

مجھے کوٹھڑی میں گئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا جب کمانڈنگ آفیسر اور جیل کے بہت سے دوسرے افسر مجھ سے ملنے آئے۔ یہ انتہائی غیر معمولی بات تھی۔ سی او عام طور پر کوٹھڑیوں میں بند قیدیوں سے ملنے نہیں آتا تھا۔ جب وہ آیا تو میں کھڑا ہو گیا اور کمانڈر بالفعل میری کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ وہاں ہم دونوں کے لیے بمشکل گنجائش تھی۔

اس نے کہا: ''منڈیلا! میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی چیزیں پیک کر لو۔''

میں نے پوچھا: ''کیوں؟''

''ہم تمہارا تبادلہ کر رہے ہیں۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کہہ نہیں سکتا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے جاننا چاہا کہ کیوں۔ اس نے صرف اتنا بتایا کہ پریٹوریا سے اسے ہدایات موصول ہوئی ہیں کہ جزیرے سے میرا فوراً تبادلہ کر دیا جائے۔ یہ کہہ کر کمانڈنگ آفیسر باہر نکل گیا اور اس نے والٹر، ریمونڈ ملابا اور اینڈریو ملانگینی کی کوٹھڑیوں کا رخ کیا اور انہیں بھی وہی احکام پہنچائے۔

پولیس مور جیل کی طرف

میں پریشان ہو گیا اور کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ جیل میں ایک شخص صرف سوال کر سکتا ہے اور ایک حد تک ہی کسی حکم کی مزاحمت کر سکتا ہے۔ پھر اسے حکم ماننا ہی پڑتا ہے۔ ہمیں کوئی وارننگ نہیں دی گئی تھی اور تیاری کا وقت نہیں ملا تھا۔ میں اٹھارہ سال سے زیادہ عرصہ جزیرے پر رہا تھا اور اب مجھے آناً فاناً روانگی کا حکم مل گیا تھا۔

ہم میں سے ہر ایک کو بڑے بڑے گتے کے کئی ڈبے دیئے گئے جن میں اپنی چیزیں پیک کرنی تھیں۔ میں نے تقریباً دو عشروں میں جو کچھ جمع کیا تھا وہ ان چند

ڈبوں میں سما سکتا تھا۔ ہم نے کم و بیش آدھ گھنٹے میں سامان پیک کر لیا۔

راہداری میں اس وقت ایک ہلچل مچ گئی جب دوسرے لوگوں کو معوم ہوا کہ ہم رخصت ہو رہے ہیں۔ لیکن ہمارے پاس تو اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ کئی برسوں کے اپنے ساتھیوں کو باقاعدہ خدا حافظ کہہ سکیں۔ یہ جیل کی ذلتوں میں سے ایک ذلت تھی۔ دوسرے قیدیوں سے دوستی اور وفا کے رشتے حکام کی نظروں میں کچھ اہمیت نہ رکھتے تھے۔

منٹوں کے اندر ہم فیری میں سوار ہو کر کیپ ٹاؤن کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے مڑ کر جزیرے کی طرف دیکھا جب روشنی ماند پڑ رہی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں جزیرے کو کبھی دوبارہ دیکھوں گا یا نہیں۔ انسان کسی بھی چیز کا عادی ہو سکتا ہے اور میں جزیرہ روبن کا عادی ہو گیا تھا۔ میں وہاں تقریباً دو عشروں سے رہ رہا تھا اور اگرچہ یہ کبھی میرا گھر نہیں تھا' میرا گھر جوہانسبرگ میں تھا' مگر یہ میرے لیے ایک ایسی جگہ بن چکا تھا جہاں میں آرام محسوس کرتا تھا۔ میں نے ہمیشہ تبدیلی کو مشکل پایا ہے اور جزیرہ روبن سے رخصت ہونا' خواہ یہ جزیرہ بعض اوقات کتنا ہی سخت رہا تھا' اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کیا پیش آنے والا ہے۔

گودیوں پر مسلح گارڈوں کے پہرے میں ہمیں بے کھڑکی ٹرکوں میں سوار کیا گیا۔ ہم چار ساتھی اندھیرے میں کھڑے تھے جبکہ ٹرک ایک گھنٹے سے کافی زیادہ عرصہ چلتا رہا۔ ہم مختلف چیک پوائنٹوں سے گزرے اور آخر کار ٹرک رک گیا۔ اس کا عقبی دروازہ کھلا اور ہم مارچ کرتے ہوئے کنکریٹ کی کچھ سیڑھیاں چڑھے اور آہنی دروازے سے گزر کر ایک سیکورٹی والی عمارت میں داخل ہو گئے۔ میں نے ایک گارد سے ہوچھا کہ ہم کہاں ہیں۔

''پولیس مور جیل۔'' اس نے کہا۔

حصہ دہم :: دشمن سے مذاکرت

ہاتھی کی آنکھ کا نظارہ

پولس مور میکسی مم سکیورٹی جیل کیپ ٹاؤن کے چند میل جنوب مشرق میں خوشحال گوروں کی مضافاتی بستی کے سرے پر واقع ہے جہاں سر سبز لان اور صاف ستھرے مکانات ہیں جو ٹوکائی کہلاتے ہیں۔ جیل بذات خود کیپ کے غیر معمولی طور پر خوبصورت مناظر کے درمیان واقع ہے۔ جس کے شمال میں کونسٹین ٹیا برگ کے پہاڑ ہیں اور جنوب میں سینکڑوں ایکڑوں پر انگور کی بیلیں ہیں۔ لیکن یہ قدرتی حسن پولس مور کی اونچی کنکریٹ کی دیواروں کے باعث ہمیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پولس مور میں مجھے آسکر وائلڈ کے نیلے سائبان کے بارے میں بار بار آنے والے مصرع کی سچائی پہلی بار سمجھ میں آئی جسے قیدی آسمان کہہ کر پکارتے ہیں۔

پولس مور کا چہرہ جدید تھا لیکن اس کا دل پرانا۔ عمارتیں، خاص طور پر جیل کے عملے کی عمارتیں، صاف ستھری اور جدید تھیں۔ لیکن قیدیوں کی کوٹھڑیاں پرانے طرز کی اور گندی تھیں۔ ہمارے سوا پولس مور کے سب آدمی عام قانون کے قیدی تھے اور ان سے بڑا ظالمانہ سلوک ہوتا تھا۔ ہمیں ان سے الگ رکھ کر مختلف سلوک کیا گیا۔

اگلی صبح ہمیں اپنے ماحول کا حقیقی احساس ہوا۔ ہم چاروں کو جو رہائش دی گئی تھی وہ دراصل جیل کا سائبان تھا۔ یہ تیسیر اور آخری منزل پر ایک کھلا کمرہ تھا۔ اس منزل پر ہم واحد قیدی تھے۔ بڑا کمرہ صاف، جدید اور مستطیل نما تھا جس کا طول و عرض پچاس ضرب تیس تھا اور اس کے ایک الگ حصے میں غسل خانہ، پیشاب گاہ، دو بیسن اور دو شاور تھے۔ اس میں چار مناسب بستر تھے جن پر چادریں پڑی تھیں اور تولیے تھے جو ہم لوگوں کے لیے بڑے عیش کا سامان تھے جنہوں نے پچھلے اٹھارہ سال پتھر کے فرش پر پتلی چٹائیوں پر سو کر گزارے تھے۔ جزیرہ روبن کے مقابلے میں ہم ایک فائیو سٹار ہوٹل میں تھے۔

سائبان کے ساتھ ایک ایل شکل کا چھجا اور کھلا حصہ تھا جو فٹ بال کے نصف میدان جتنا لمبا تھا۔ جہاں ہمیں دن کو باہر نکلنے کی اجازت تھی۔ اس کی سفید کنکریٹ کی دیواریں تقریباً بارہ فٹ اونچی تھیں تاکہ ہم صرف آسمان دیکھ سکیں، سوائے ایک گوشے کے جہاں سے ہمیں کونسٹین ٹیابرگ کے پہاڑ نظر آتے تھے خصوصاً کا وہ حصہ جسے ہاتھی کی آنکھ کہا جاتا تھا۔ بعض اوقات میں پہاڑ کے اس حصے کو باقی دنیا کے آئس برگ کی چوٹی خیال کرتا۔

اتنا اچانک اور وجہ معلوم ہوئے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا بڑی نرالی بات تھی۔ آدمی کو جیل میں ایک ہی جگہ رہنے کے لیے تیار رہنا چاہیے لیکن اسے کبھی اس جگہ کا عادی نہیں ہونا چاہیے۔ اگرچہ ہم اب مین لینڈ پر تھے مگر زیادہ تنہائی محسوس کرتے تھے۔ ہمارے لیے جزیرہ روبن جدوجہد کا مرکز بن چکا تھا۔ ہم ایک دوسرے کی صحبت میں اطمینان پاتے تھے، چنانچہ ہم ان ابتدائی ہفتوں میں اسی پر سوچ بچار کرتے رہے کہ ہمیں یہاں کیوں بھیجا گیا ہے۔ ہم جانتے تھے کہ حکام اس اثر ورسوخ پر عرصے سے غضبناک اور خوفزدہ تھے جو ہمیں نوجوان قیدیوں پر حاصل تھا۔ لیکن وجہ کہیں زیادہ سوچی سمجھی محسوس ہوتی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ حکام جزیرے سے اے این سی کی قیادت کو ہٹا کر اے این سی کا سر کاٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جزیرہ روبن بذات خود آزادی کی جدوجہد میں ایک دیرپا داستان بنتا جا رہا تھا اور وہ ہمیں وہاں سے دور رکھ کر اس داستان کا علامتی رنگ ختم کر دینا چاہتے تھے۔ والٹر، ریمونڈ اور میں ہائی آرگن کے رکن تھے لیکن اینڈریو ملانگینی اس کا رکن نہیں تھا اور وہ جزیرے کی اے این سی قیادت کی صف اول میں نہیں رہا تھا، اس لیے داستان کے علامتی چوکھٹے میں نہیں کھپتا تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ ممکن ہے حکام کو یہ بات معلوم نہ ہو۔ ہماری پارٹی کے بارے میں ان کی انٹیلی جنس اکثر غیر صحیح اندازے لگاتی تھی۔

ہمارا ایک مفروضہ چند ماہ بعد ثابت ہوتا دکھائی دیا جب کیتھی ہم سے آملا جو واقعی

ہائی آرگن کارکن تھا۔ مزید اہم بات یہ تھی کہ کیتھی ہمارا آفیسر اطلاعات تھا اور یہ اسی کا کارنامہ تھا کہ ہم نئے نوجوان قیدیوں سے رابطہ کر لیتے تھے۔

کیتھی کی آمد کے چند ہفتے بعد ہمارے ساتھ ایک ایسا شخص آملا جسے ہم نہیں جانتے تھے اور جو جزیرہ روبن سے بھی نہیں آیا تھا۔ اس کا نام پیٹرک ماقو بیلا تھا اور وہ ایک نوجوان وکیل اور مشرقی کیپ کی اے این سی کا رکن تھا۔ اس نے گرفتھس مینجی نامی ایک بلند مرتبہ وکیل کے چیمبر میں تربیت پائی تھی جو اے این سی کے کئی گرفتار شدہ افراد کے وکیل کے طور پر پیش ہوا تھا اور جسے ایک سال پہلے ڈربن کے قریب قتل کر دیا گیا تھا۔ ماقو بیلا غداری کے الزام میں بیس سال کی سزا کاٹ رہا تھا اور اسے جوہانسبرگ کی ڈائیک لوف جیل سے پولس مو جیل بھیجا گیا تھا کیونکہ وہاں اس نے قیدیوں کو منظم کر کے آزادی کی لہر پیدا کر دی تھی۔

پہلے تو ہم اس نئے فرد کی آمد کے متعلق شک میں رہے۔ ہمیں حیرت تھی کہ یہ سیکورٹی حکام کی طرف سے بھیجا ہوا ہوسکتا ہے۔ لیکن جلد ہی پتہ چل گیا کہ یہ صورت نہیں تھی۔ پیٹرک ایک روشن خیال' ملنسار اور دلیر آدمی تھا جس کے ساتھ ہمارا خوب نباہ ہوا اگرچہ اس کے لیے بوڑھے آدمیوں کے گروہ کے ساتھ گھل مل جانا آسان نہیں ہوسکتا تھا جو گزشتہ دو دہائیوں سے اکٹھے رہے تھے اور ان کے طور اطوار طے پا چکے تھے۔

قیدیوں سے ملاقات کے مہذب طریقے

ہم اب کنکریٹ کی دنیا میں تھے۔ مجھے جزیرہ روبن کی قدرتی شان یاد آتی تھی۔ لیکن ہمارے نئے گھر کے کئی پہلو باعث اطمینان تھے۔ ایک بات یہ تھی کہ پولس مور میں خوراک بہت اعلیٰ تھی۔ برسوں تک دن میں تین بار مکئی کا دلیا کھانے کے بعد پولس مور میں رات کے کھانے میں گوشت اور سبزیاں شامل ہونا ایک ضیافت سے کم نہ تھا۔ یہاں ہمیں زیادہ تعداد میں مختلف اخبارات اور جرائد دیے فراہم کیے جاتے تھے

جو پہلے ہمارے لیے ممنوع تھے۔ اس سے ہمیں وسیع دنیا کی ایک کھڑکی دیکھنے کو مل گئی۔ ہمارے پاس ریڈیو بھی تھا لیکن وہ صرف مقامی اسٹیشن کو وصول کرتا تھا' اور اسے نہیں جو دراصل ہم چاہتے تھے یعنی بی بی سی ورلڈ سروس۔ ہمیں دن بھر اپنے ٹیرس پر نکلنے کی اجازت تھی' سوائے بارہ اور دو بجے کے درمیان جب وارڈر لنچ کرتے تھے۔ وہاں یہ بہانہ بھی نہیں تھا کہ ہمیں کام کرنا ہے۔ ہمارے بڑے کمرے کے پاس ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جو مطالعے کا کام آتی اور جس میں ایک کرسی' ڈیسک اور کتابوں کا ایک شیلف تھا' جہاں میں دن کے دوران پڑھ اور لکھ سکتا تھا۔

جزیرہ روبن پر میں اپنی خستہ حال کوٹھڑی میں ورزش کیا کرتا تھا لیکن اب ورزش کرنے کے لیے کھلی جگہ میسر تھی۔ میں پانچ بجے جاگتا اور اپنی اجتماعی کوٹھڑی میں ڈیڑھ گھنٹے تک ورزش کرتا۔ میں ایک ہی جگہ دوڑنے' کودنے' بیٹھکیں لگانے اور فنگر ٹپ پر لیس آپس کے معمول پر عمل کرتا۔ میرے ساتھ جلد اٹھنے والے نہیں تھے اور میرے اس پروگرام نے جلد ہی مجھے کوٹھڑی کے ساتھیوں میں نامقبول بنا دیا۔

پولیس مور میں آمد کے کچھ عرصہ بعد ونی مجھ سے ملنے آیہ اور یہ جان کر خوش ہوئی کہ ملاقات کی جگہ جزیرہ روبن کے مقابلے میں کہیں بہتر اور جدید تر ہے۔ یہاں ایک بڑے شیشے کی آڑ تھی جس میں سے ہم ملاقاتی کو کمرے او پر دیکھ سکتے تھے اور جدید تر مائیکروفون تھے جن کی وجہ سے اب ہمیں مخاطب کی بات سننے کے لیے زور نہیں لگانا پڑتا تھا۔ شیشے والی یہ کھڑکی ہمیں ملاقاتیوں سے زیادہ قربت کا مصنوعی احساس دلاتی تھی اور جیل میں ایسا احساس باعث سکون ہوتا ہے۔

جزیرہ روبن کی نسبت پولس مور آنا میری بیوی اور خاندان والوں کے لیے زیادہ آسان تھا اور اس سے بڑا فرق پڑا۔ اب ملاقات کی نگرانی بھی زیادہ مہذب ہو گئی تھی۔ ونی سے ملاقات کی نگرانی وارنٹ آفیسر جیمز گریگری کرتا جو جزیرہ روبن پر سنسر افسر رہ چکا تھا۔ میں اسے اچھی طرح نہیں جانتا تھا لیکن وہ ہمیں جانتا تھا کیونکہ وہ

ہماری آنے جانے والی ڈاک سنسر کرنے پر مامور رہا تھا۔

پولس مور میں، میں گریگری کو بہتر جاننے لگا اور اسے ایک عام وارڈر سے مختلف پایا جسے خوش آمدید کہا جا سکتا تھا۔ وہ مہذب اور صاف بات کہنے والا تھا اور رونی سے عزو احترام کا برتاؤ کرتا۔ وہ یہ پکارنے کے بجائے کہ وقت ختم ہو گیا' کہتا: "مسز منڈیلا! تمہارے پاس پانچ منٹ اور ہیں۔"

میں نے چھت پر باغیچہ لگایا

بائبل ہمیں بتاتی ہے کہ باغبانوں سے پہلے باغ موجود تھے لیکن پولس مور میں یہ صورتحال نہیں تھی جہاں میں نے ایک باغ لگایا جو میری سب سے زیادہ پرمسرت تفریح بن گیا۔ یہ ارد گرد پھیلی ہوئی کنکریٹ کی ایک جیسی دنیا سے فرار حاصل کرنے کا میرا انداز تھا۔ کئی دن تک تمام خالی جگہ کا جائزہ لینے کے بعد جو ہمیں عمارت کی چھت پر میسر تھی اور جو سارا دن دھوپ میں نہائی رہتی تھی، میں نے ایک باغ شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور کمانڈنگ آفیسر سے ایسا کرنے کی اجازت مانگی۔ میں نے حکام سے درخواست کی کہ جیل کی طرف سے مجھے چوالیس گیلن والے سولہ آئل ڈرم فراہم کیے جائیں جو انہوں نے میرے لیے آدھے آدھے کاٹ دیئے۔ پھر حکام نے وہ آدھے آدھے ڈرم زرخیز گیلی مٹی سے بھروائے اور اس طرح بتیس بڑے بڑے پھول گملے بن گئے۔

میں نے پیاز، بند گوبھی، پھول گوبھی، لوبیا، پالک، گاجر، کھیرا، چقندر، سلاد، ٹماٹر، کالی مرچ، سٹرابری، بروکولی، آبرجین اور کئی اور پودے اگائے۔ اپنے عروج پر یہ ایک چھوٹا سا فارم بن گیا جس میں نوسو پودے تھے۔ یہ اس باغ سے کہیں زیادہ شاندار تھا جو میں نے جزیرہ روبن پر لگایا تھا۔

کئی بیج میں نے خریدے تھے اور بعض مثلاً بروکولی اور گاجر مجھے کمانڈنگ آفیسر بریگیڈیئر منرو نے دیئے جو ان سبزیوں کا خاص طور پر شوقین تھا۔ وارڈروں نے بھی

اپنی پسند کی سبزیوں کے بیج دیئے۔ مجھے اچھی قسم کی بناتاتی اور حیوانی کھاد بھی فراہم کی گئی۔

ہر صبح میں تنکوں کا ہیٹ اپنے سر پر رکھتا' کھردرے دستانے پہنتا اور دو گھنٹے باغ میں کام کرتا۔ ہر اتوار کو میں کچن کو سبزیاں فراہم کرتا تاکہ وہ کامن لاء قیدیوں کے لیے خصوصی کھانا پکا سکیں۔ میں اپنی فصل کی خاصی مقدار وارڈروں کو دیتا جو تازہ سبزیاں گھر لے جانے کے لیے تھیلے استعمال کرتے تھے۔

ونی سے حیرت انگیز ملاقات

پولس مور میں ہمارے مسائل جزیرہ روبن کے تجربات کی نسبت کم نتیجہ خیز ہوتے تھے۔ بریگیڈیئر منرو ایک شائستہ اور تعاون کرنے والا آدمی تھا۔ وہ یہ یقین کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرتا کہ ہم جو کچھ چاہیں ہمیں مل جائے' تاہم چھوٹے چھوٹے مسائل کبھی کبھی تناسب سے باہر ہو جاتے۔ 1983ء میں ونی اور زندزی سے ملاقات کے دوران میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ مجھے جو جوتے دیئے گئے ہیں وہ چھوٹے سائز کے ہیں اور میرے پاؤں کے انگوٹھے درد کرتے ہیں۔ ونی کو تشویش ہوئی اور جلد ہی میں نے اخبار میں پڑھا کہ میرے ایک پاؤں کا انگوٹھا کاٹا جا رہا ہے۔ رابطے کی مشکل کی وجہ سے خبر جیل سے باہر جا کر اکثر مبالغہ آمیز ہو جاتی۔ اگر میں اپنی بیوی کو ٹیلی فون کرنے کے قابل ہوتا اور اسے بتا سکتا اور اس سے کہتا کہ میرا پاؤں ٹھیک ہے تو یہ غلط فہمی پیدا نہ ہوتی۔ کچھ عرصہ بعد ہیلن سوزمین کو ملاقات کی اجازت ملی اور اس نے میرے انگوٹھے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے بہتر جانا کہ اسے انگوٹھا دکھا دیا جائے' چنانچہ میں نے جراب اتاری اور اپنا ننگا پاؤں شیشے کے آگے کر دیا اور اپنا انگوٹھا ہلا جلا کر دکھایا۔

ہم نے کوٹھڑی میں سیلن ہونے کی شکایت کی جس سے ہمیں زکام ہو جاتا تھا۔ بعد میں' میں نے ایسی رپورٹیں سنیں کہ کیپ جنوبی افریقہ کے اخبارات لکھ رہے تھے کہ

ہماری کوٹھڑی میں سیلاب آجاتا ہے۔ ہم نے دوسرے قیدیوں سے رابطے کا مطالبہ کیا اور اپنی وہی بنیادی شکایت کی جو ہم ہمیشہ کرتے آئے تھے' یہ کہ ہم سے سیاسی قیدیوں کا سا سلوک کیا جائے۔

مئی 1984ء میں مجھے کچھ سکون ملا جو لگتا تھا کہ تمام بے آرامیوں کی تلافی کر گیا ہے۔ ونی' زینی اور اس کی سب سے چھوٹی بیٹی کی ملاقات طے پائی تھی اور اس روز وارنٹ آفیسر گریگری مجھے عام ملاقات کے حصے میں لے جانے کے بجائے ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا جس میں صرف ایک چھوٹی میز تھی اور کسی قسم کی آڑ نہیں تھی۔ اس نے مجھ سے بڑی نرمی سے کہا کہ حکام ایک تبدیلی لائے ہیں۔ وہ دن ان ملاقاتوں کا آغاز تھا جنہیں "رابطہ ملاقاتیں" کہا گیا۔ پھر وہ باہر میری بیوی اور بیٹی کو دیکھنے گیا اور ونی سے علیحدگی میں بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ گریگری اسے ایک طرف لے گیا تو وہ یہ سوچ کر واقعی ڈر گئی کہ شاید میں بیمار تھا۔ لیکن گریگری اسے دروازے کی طرف سے کمرے میں لے آیا اور اس سے پہلے کہ ہم دونوں کو صورتحال کا اندازہ ہوتا' ہم دونوں ایک ہی کمرے میں تھے اور ایک دوسرے سے ہم آغوش تھے۔ میں نے اپنی بیوی اتنے برسوں بعد چوما اور تھاما تھا۔ یہ ایک ایسا لمحہ تھا جس کا خواب میں نے ہزاروں مرتبہ دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا میں ابھی تک خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اسے اتنی دیر تھامے رکھا کہ لگتا تھا وقت ابدیت میں ڈھل گیا ہے۔ ہم بے حس و حرکت اور خاموش تھے' سوائے دلوں کی دھڑکن کے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اسے جانے دوں' مگر پھر میں اس سے الگ ہو گیا۔ میں نے اندر آجانے والی اپنی بیٹی کو گلے سے لگایا اور پھر اس کی بچی کو اپنی گود میں لیا۔ پچیس برس بعد آج میں نے اپنی بیوی کا ہاتھ چھوا تھا۔

نسل پرست حکومت کے خلاف مسلح کاروائیاں

پولس مور میں ہم بیرونی واقعات سے زیادہ مربوط تھے۔ ہم جانتے تھے کہ جہد

آزادی شدت پکڑ رہی ہے اور یہ کہ دشمن کی کوششیں بھی تیز ہو رہی تھیں۔ 1981ء میں جنوبی افریقہ کی فوج نے مپوتو، موزمبیق میں اے این سی کے دفاتر پر یلغار کی اور عورتوں اور بچوں سمیت ہمارے تیرہ افراد ہلاک کر دیئے۔ دسمبر 1982ء میں ایم کے نے کیپ ٹاؤن کے باہر نامکمل کوبرگ نیوکلر پاور پلانٹ میں دھماکے کیے اور ملک بھر میں کئی اور فوجی اور نسلی امتیاز کے حامل اہداف پر بم رکھے۔ اسی ماہ جنوبی افریقی فوج نے پھر ماسیرو، لیسوتھو میں ایک اے این سی آؤٹ پوسٹ پر حملہ کیا اور بیالیس افراد ہلاک کر دیئے جن میں درجن بھر عورتیں اور بچے شامل تھے۔

اگست 1982ء میں اے این سی کی مستعد کارکن روتھ فرسٹ مپوتو میں اپنی ڈاک کھول رہی تھی جہاں وہ جلاوطنی میں رہ رہی تھی، جب اسے ایک لیٹر بم کے ذریعے ہلاک کر دیا گیا۔ روتھ، جو سلاوو کی بیوی، ایک بہادر عورت اور نسلی امتیاز کی مخالف تھی جس نے کئی ماہ جیل میں گزارے تھے۔ وہ ایک قوی اور وفادار عورت تھی جس سے میں پہلی بار اس وقت ملا تھا جب میں وٹس میں پڑھ رہا تھا۔ اس کی موت سے حکومت کے اس ظلم کا اندازہ ہوا جو وہ تحریک آزادی کو کچلنے میں روا رکھے ہوئے تھی۔

''ایم کے'' کا پہلا کار بم حملہ مئی 1983ء میں ہوا اور اس کا ہدف پریٹوریا کے وسط میں ایک ائیر فورس وملٹری انٹیلی جنس آفس تھا۔ یہ ان بلا اشتعال حملوں کا جواب دینے کی ایک کوشش تھی جو فوج نے ماسیرو اور دوسری جگہوں پر کیے تھے اور اس سے مسلح جدوجہد کے تیز ہونے کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس کاروائی میں 19 افراد ہلاک اور 200 سے زیادہ زخمی ہوئے۔

شہریوں کی ہلاکت ایک المناک حادثہ تھا اور مجھے اتنی ساری اموات سے بہت خوف محسوس ہوا۔ ان ہلاکتوں پر میں اگرچہ پریشان تھا مگر یہ بھی جانتا تھا کہ یہ عسکری جدوجہد سے کام لینے کے فیصلے کا ناگزیر نتیجہ تھا۔ انسانی خطا کاری ہمیشہ جنگ کا

ایک حصہ ہوتی ہے اوراس کی قیمت ہمیشہ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ہم جانتے تھے کے ایسے حادثات ہوں گے کیونکہ ہتھیار اٹھانے کا ہمارا فیصلہ بہت سنجیدہ اور تامل کے بعد کیا گیا تھا۔لیکن جیسا کہ آلیور نے بم دھماکوں کے وقت کہا تھا' مسلح جدوجہد نسلی امتیاز پر عمل پیرا حکومت کے تشدد کے ذریعے ہم پر تھوپی گئی تھی۔حکومت اوراے این سی دوخطوط پر کام کررہی تھیں۔۔۔عسکری اور سیاسی۔سیاسی محاذ پر حکومت اپنی لگی بندھی "تفرقہ ڈالواور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل پیرا تھی جس کا مقصد افریقیوں کو رنگ داروں اور ہندوستانیوں سے الگ رکھنا تھا۔نومبر 1983ء کے ریفرنڈم میں نام نہاد سہ ایوانی پارلیمنٹ تشکیل دینے کے پی ڈبلیو بوتھا کے منصوبے کی سفید فام ووٹروں نے تائید کی۔ اس منصوبے کے تحت سفید فام پارلیمنٹ کے علاوہ ہندوستانیوں اور رنگ داروں کے چیمبر قائم ہونے تھے۔اس کا مقصد ہندوستانیوں اور رنگ داروں کوست میں الجھا کرانہیں افریقیوں سے الگ کرنا تھا۔لیکن یہ پیشکش محض ایک کھلونا ٹیلی فون تھا کیونکہ ہندوستانیوں اور رنگ داروں کے تمام اقدامات گوروں کے ویٹو سے مشروط تھے۔یہ بیرونی دنیا کو بھی بیوقوف بنانے کا ایک انداز تھا تاکہ وہ یہ سمجھے کہ حکومت نسلی امتیاز کی اصلاح کررہی ہے۔بوتھا کے حیلے سے لوگوں نے دھوکا نہ کھایا جیسا کہ اسی فیصد اہل ہندوستانی اور رنگ دار ووٹروں نے 1984ء میں پارلیمنٹ کے نئے ایوانوں کے الیکشن کا بائیکاٹ کیا۔

ملک کے اندر نچلی سطح پر طاقتور سیاسی تحریکیں تشکیل پہپارہی تھیں جن کے اے این سی سے مضبوط روابط تھے۔ان میں بڑی تحریک یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ تھا جس کے سرپرست کے طور پر میرا نام دیا گیا۔یوڈی ایف 1983ء میں نئے نسلی امتیاز پر مبنی دستور اور 1984ء میں جداگانہ سہ ایوانی پارلیمنٹ کے الیکشن کے خلاف احتجاج منظم کرنے کے لیے قائم ہوا تھا۔یودی ایف جلدی ہی ایک طاقتور تنظیم میں ڈھل گیا جس میں نسلی امتیاز کی مخالف چھ سو سے زائد تنظیمیں متحد ہوگئیں۔ان میں

مزدور تنظیمیں کمیونٹی گروپ چرچ گروپ اور طلبہ ایسوسی ایشنیں شامل تھیں۔

اے این سی مقبولیت کی نئی پیدائش کے تجربے سے گزر رہی تھی۔ رائے عامہ کے جائزوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ کانگریس افریقی عوام کے مابین سب سے مقبول جماعت تھی اگرچہ اس پر ایک چوتھائی صدی سے پابندی عائد تھی۔ نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد نے اجتماعی طور پر دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی تھی۔ 1984ء میں بشپ ڈیسمنڈ ٹوٹو کو نوبل امن انعام دیا گیا (حکام نے بشپ ٹوٹو کے نام میرا پیغام تہنیت بھیجنے سے انکار کر دیا۔) جنوبی افریقی حکومت پر بین الاقوامی دباؤ بڑھ رہا تھا جیسا کہ پورے کرۂ ارض کی اقوام پریٹوریا پر اقتصادی پابندیاں عائد کرنے لگی تھیں۔

چرچل کے ''رشتے دار'' سے ٹاکرا

حکومت نے برسوں میرے لیے فیلرز (Feelers) یعنی ٹوہ لگانے والے پیغامات بھیجے تھے اور ان کا آغاز وزیر کروگر کی طرف سے مجھے ٹرانسکائی منتقل ہو جانے کی ترغیب دینے کی کوششوں سے ہوا تھا۔ یہ کوششیں مذاکرات کے لیے نہیں تھیں بلکہ ان کا مقصد مجھے پارٹی سے الگ کر دینا تھا۔ کئی اور مواقع پر کروگر نے مجھ سے کہا تھا: ''منڈیلا! ہم تمہارے ساتھ کام کر سکتے ہیں' لیکن تمہارے ساتھیوں کے ساتھ نہیں۔ تم معقولیت کا راستہ اختیار کرو۔'' اگرچہ میں نے ان کی ان کوششوں کا جواب نہیں دیا تھا' صرف یہ حقیقت کہ وہ حملہ کرنے کے بجائے گفتگو کر رہے تھے' با قاعدہ مذاکرات کا پیش خیمہ گردانی جا سکتی تھی۔

حکومت پانیوں کو جانچ رہی تھی۔ 1984ء اواخر اور 1985ء کے اوائل میں نمایاں مغربی سیاستدانوں نے مجھ سے ملاقاتیں کی تھیں۔ برطانوی دارالامرا اور یورپی پارلیمنٹ کے رکن لارڈ نکولس بیتھل اور جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے لاء پروفیسر اور امریکی سینیٹ واٹر گیٹ کمیٹی کے سابق مشیر سیموئل ڈیش۔ ان دونوں ملاقاتوں

کی منظوری نئے وزیر انصاف کوبائی کوپٹسی نے دی تھی جو ایک نئی قسم کے افریکنر لیڈر لگتے تھے۔

میں جیل کمانڈر کے دفتر میں لارڈ بیتھل سے ملا جس میں صدر بوتھا کی ایک بڑی چمکتی دمکتی تصویر آویزاں تھی۔ بیتھل ایک خوش مزاج گول مٹول شخص تھا اور جب میں اس سے پہلی بار ملا تو اس کی سختی کے حوالے سے اسے چھیڑا: ''آپ یوں نظر آتے ہیں جیسے آپ ونسٹن چرچل کے رشتے دار ہوں۔'' میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور وہ ہنس دیا۔

لارڈ بیتھل پولس مور میں ہمارے حالات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا' چنانچہ میں نے وہ بیان کیے۔ ہم نے مسلح جدوجہد پر بحث کی اور میں نے وضاحت کی کہ یہ ہمارا کام نہیں کہ ہم تشدد سے براءت ظاہر کریں بلکہ یہ حکومت کا کام ہے۔ میں نے وثوق سے کہا کہ ہمارا ہدف فوجی نشانے ہیں' عوام نہیں۔ ''مثلاً میں نہیں چاہوں گا کہ میرے آدمی یہاں میجر کو ہلاک کر دیں۔'' میں نے فرٹز وان سٹرٹ کی طرف اشقارہ کرتے ہوئے کہا جو گفتگو کو مانیٹر کر رہا تھا۔ وان سٹریٹ نیک طبع انسان تھا جس نے زیادہ بات نہ کی تھی مگر میرے ریمارکس پر چونک پڑا۔

پروفیسر ڈیش سے ملاقات میں جو لارڈ بیتھل کی ملاقات کے تھوڑا عرصہ بعد ہوئی' میں نے غیر نسلی جنوبی افریقہ کے مستقبل کے لیے اپنے کم از کم مطالبات پیش کیے۔ ایک وحدانی مملکت ہوم لینڈز کے بغیر' مرکزی پارلیمنٹ کے لیے غیر نسلی انتخابات اور ون پرسن ون ووٹ۔ پروفیسر ڈیش نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے حکومت کے بیان کردہ اس ارادے سے حوصلہ پایا ہے کہ مخلوط شادیوں کا قانون اور نسلی امتیاز پر مبنی بعض دوسرے ضابطے واپس لے لیے جائیں گے۔ میں نے کہا: ''یہ صرف سوئی چبھونے والی بات ہے۔ میری خواہش نہیں کہ میں کسی گوری سے شادی کروں یا گوروں کے تالاب میں تیراکی کروں۔ میں تو سیاسی مساوات چاہتا

ہوں۔''میں نے ڈیلش کو صاف صاف بتایا کہ فی الحال ہم حکومت کو میدان جنگ میں شکست نہیں دے سکتے لیکن ان کے لیے حکومت کرنا مشکل بنا سکتے ہیں۔

دو امریکیوں سے میری ملاقات اتنی خوشگوار نہ تھی۔ یہ قدامت پرست اخبار واشنگٹن پوسٹ کے مدیر تھے۔وہ میرے خیالات جاننے سے زیادہ یہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے کہ میں ایک کمیونسٹ اور دہشت گرد ہوں۔ان کے تمام سوالات اس رخ پر مرکوز تھے اور جب میں نے بہ تکرار کہا کہ میں نہ کمیونسٹ اور دہشت گرد ہوں۔ ان کے تمام سوالات اس رخ پر مرکوز تھے اور جب میں نے بہ تکرار کہا کہ میں نہ کمیونسٹ ہوں اور نہ دہشت گرد تو انہوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ میں تو مسیحی بھی نہیں کیونکہ عزت ماب مارٹن لوتھر کنگ نے کبھی تشدد کی راہ اختیار نہیں کی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ جن حالات میں مارٹن لوتھر کنگ نے جدوجہد کی تھی وہ میری جدوجہد سے یکسر مختلف تھی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ ایک جمہوریت تھا جہاں مساوی حقوق کی دستوری ضمانت موجود تھی جو غیر متشدد احتجاج کو تحفظ دیتی تھی (اگرچہ کالوں کے خلاف تعصب ہنوز موجود تھا۔) اس کے برعکس جنوبی افریقہ ایک پولیس اسٹیٹ تھا جس کے دستور میں غیر مساوات کو تقدس حاصل تھا اور جہاں فوج عدم تشدد کا جواب قوت سے دیتی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں ایک مسیحی ہوں اور ہمیشہ مسیحی رہا ہوں۔ میں نے کہا مسیح علیہ السلام نے بھی' جب ان کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا' کلیسا سے سود خوروں کو باہر نکالنے کے لیے قوت استعمال کی تھی۔

میں نے اپنی رہائی کی مشروط پیشکش مسترد کردی

داخلی مشکلات اور بیرونی دباؤ کے پیش نظر پی ڈبلیو بوتھا نے نیم دلی سے ایک آدھا قدم اٹھایا۔ 31 جنوری 1985ء کو پارلیمنٹ کے ایک اجلاس میں صدر مملکت نے مجھے آزادی دینے کی پیشکش کی اگر میں ''تشدد بطور ہتھیار کو غیر مشروط طور پر مسترد کر دوں۔'' یہ پیشکش تمام سیاسی قیدیوں کے لیے وسیع کر دی گئی۔ پھر جیسے وہ مجھے عوامی

چیلنج کر رہا ہوں‘ اس نے مزید کہا: ’’لہٰذا یہ جنوبی افریقی حکومت نہیں جو اب مسٹر منڈیلا کی آزادی کی راہ میں حائل ہے بلکہ وہ خود ایسا کر رہا ہے۔‘‘

حکام نے مجھے آگاہ کر دیا تھا کہ حکومت میر آزادی کے متعلق ایک تجویز پیش کرنے والی ہے‘ لیکن میں اس حقیقت کے لیے تیار نہیں تھا کہ یہ اعلان پارلیمنٹ میں خود صدر مملکت کرے گا۔ میرے اندازے سے پچھلے دس برس کے دوران میری رہائی کے لیے یہ چھٹی مشروط پیشکش تھی جو حکومت کی طرف سے آئی تھی۔ ریڈیو پر تقریر سننے کے بعد میں نے جیل کمانڈر سے درخواست کی کہ میری بیوی اور میرے وکیل اسماعیل ایوب سے فوری ملاقات کرائی جائے تاکہ میں صدر مملکت کی پیشکش کے بارے میں اپنا ردعمل ظاہر کر سکوں۔

ونی اور اسماعیل کو ایک ہفتے تک ملاقات کی اجازت نہ ملی اور اس دوران میں نے وزیر خارجہ پک بوتھا کو ایک خط لکھا جس میں اپنی رہائی کے لیے عائد شدہ شرط مسترد کر دی۔ جبکہ میں عوامی سطح پہ اپنے ردعمل کی تیاری بھی کرتا رہا۔ میں اس ردعمل میں بہت سے کام کرنے کا اشتیاق رکھتا تھا کیونکہ صدر بوتھا کی پیشکش مجھے وہ پالیسی قبول کرنے کی ترغیب دے رہی تھی جسے اے این سی مسترد کرتی تھی اور اس کا مقصد میرے اور میرے ساتھیوں کے مابین اختلاف کے بیج بونا تھا۔ میں اے این سی کو بالعموم اور آلیور ٹیمبو کو بالخصوص یقین دلانا چاہتا تھا کہ پارٹی سے میری وفاداری شک وشبہ سے بالا ہے۔ میں حکومت کو بھی یہ پیغام دینا چاہتا تھا کہ اگرچہ میں نے اس کی پیشکش مشروط ہونے کے باعث مسترد کر دی ہے مگر میں جنگ کو نہیں بلکہ مذاکرات کو مسئلے کا حل گردانتا ہوں۔

بوتھا تشدد کی ذمے داری میرے کندھوں پر ڈالنا چاہتا تھا اور میں دنیا کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ ہم پر جو تشدد کی جا رہا ہے‘ ہم صرف اس کا جواب دے رہے ہیں۔ میں یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ اگر میں جیل سے نکل کر انہی حالات میں داخل ہوا جن کے

تحت مجھے گرفتار کیا گیا تھا تو میں وہی سرگرمیاں پھر شروع کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا جن کے لیے مجھے گرفتار کیا گیا تھا۔

میں ونی اور اسماعیل سے جیل کو ملا۔ اتوار کو سوویٹو کے جبولانی سٹیڈیم میں یو ڈی ایف کی ایک ریلی منعقد ہونا تھی جہاں میرا جواب عوام کے سامنے پڑھ کر سنایا جانا تھا۔ بعض گارڈ جن سے میں آشنا نہیں تھا' اس ملاقات کی نگرانی کر رہے تھے اور جب میں نے صدر مملکت کی تقریر پر اپنے ردعمل کی بات شروع کی تو ایک بسیتا نوجوان وارڈر نے یہ کہہ کر مداخلت کی کہ صرف خاندانی معاملات زیر بحث لانے کی اجازت ہے۔ میں نے اسے نظر انداز کر دیا اور وہ چند منٹ بعد ایک سینئر وارڈر کے ساتھ لوٹ آیا جسے میں خوب جانتا تھا۔ اس وارڈر نے کہا کہ مجھے سیاست پر بات کرنے سے رک جانا چاہیے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں قومی اہمیت کے ایک معاملے پر بات کر رہا تھا جس کا تعلق صدر مملکت کی پیشکش سے ہے۔ میں نے اسے انتباہ کیا کہ اگر وہ میری بات چیت رکوانا چاہتا ہے تو اسے براہ راست صدر مملکت کے احکام حاصل کرنے چاہئیں۔ میں نے سرد مہری سے کہا: ''اگر تم صدر مملکت کو ٹیلیفون کر کے وہ احکام حاصل کرنے پر آمادہ نہیں تو براہ کرم دوبارہ ہماری گفتگو میں دخل نہ دینا۔'' اور اس نے واقعی دخل نہ دیا۔

میری ایک تاریخ ساز تقریر

میں نے اسماعیل اور ونی کو وہ تقریر دی جو میں نے تیار کی تھی۔ حکومت کو جواب دینے کے علاوہ میں یو ڈی ایف کے عمدہ کام کے لیے اس کا عوامی سطح پر شکریہ ادا کرنا اور آرچ بشپ ٹوٹو کو نوبل انعام کی مبارک باد دینا چاہتا تھا اور یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس کا انعام پوری قوم کے لیے انعام ہے۔ اتوار 10 فروری 1985ء کو میری بیٹی زندزی نے لوگوں کے نعرے لگاتے ہجوم کے سامنے میرا جواب پڑھ کر سنایا جو بیس سال سے زیادہ عرصے سے جنوبی افریقہ میں کہیں قانونی طور پر میرے الفاظ نہیں سن سکے

تھے۔

زندزی اپنی ماں کی طرح ایک پر جوش مقرر تھی۔ اس نے کہا کہ اس کے والد کو اپنے الفاظ خود کہنے کے لیے سٹیڈیم میں ہونا چاہیئے۔ مجھے یہ جان کر فخر ہوا کہ یہ میری بیٹی تھی جس نے میرے یہ الفاظ پڑھ کر سنائے:

''میں افریقین نیشنل کانگریس کا ایک رکن ہوں۔ میں ہمیشہ افریقن نیشنل کانگریس کا رکن رہا ہوں اور میں اپنے آخری دم تک افریقن نیشنل کانگریس کا رکن رہوں گا۔ آلیور ٹیمبو مجھے ایک بھائی سے بڑھ کر عزیز ہے۔ وہ میرا عظیم ترین دوست اور قریباً پچاس سال سے میرا ساتھی ہے۔ اگر تم لوگوں میں سے کوئی میری آزادی کا خواہشمند ہے تو آلیور ٹیمبو تم سے زیادہ خواہشمند ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے آزاد دیکھنے کے لیے اپنی زندگی قربان کر دے گا۔

''مجھے ان شرائط پر حیرت ہوئی ہے جو حکومت مجھ پر عائد کرنا چاہتی ہے۔ میں ایک متشدد آدمی نہیں ہوں۔ سرف اس وقت جب مزاحمت کے تمام ذرائع ہمارے لیے کھلے نہیں ہر گئے تھے' ہم نے مسلح جدوجہد کی راہ اختیار کی۔ بوتھا کہ یہ ثابت کرنے دیں کے وہ ما لان' سٹر جدم اور وروورد سے مختلف ہے۔ اسے تشدد سے برائت ظاہر کرنے دیں۔ اسے یہ کہنے دیں کہ وہ نسلی امتیاز کا خاتمہ کر دے گا۔ اسے عوام کی جماعت افریقن نیشنل کانگریس پر سے پابندی ہٹانے دیں۔ اسے ان سب کو آزاد کرنے دیں جو نسلی امتیاز کی مخالفت کی بناء پر قید کیے گئے ہیں۔ اسے آزادانہ سیاسی سرگرمیوں کی ضمانت دینے دیں تاکہ لوگ فیصلہ کر سکیں کہ کون ان پر حکومت کرے گا۔

''میں اپنی آزادی سے بے پناہ محبت کرتا ہوں لیکن مجھے آپ کی آزادی کا اس سے بھی زیادہ خیال ہے۔ جب میں جیل گیا ہوں بہت سارے لوگ مارے جا چکے ہیں۔ بہت سارے لوگوں نے آزادی سے محبت کے لیے تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ میں

اس کے لیے ان کی بیواؤں‘ان کے یتیم بچوں‘ان کی ماؤں اوران کے باپوں کا احساس مند ہوں جنہوں نے غم اٹھائے ہیں اوراپنے پیاروں کے لیے آنسو بہائے ہیں۔صرف میں نے ان طویل‘تنہا اورضائع شدہ برسوں کے دوران تکلیفیں نہیں اٹھائیں۔میں آپ لوگوں سے کم زندگی سے محبت کرنے والانہیں ہوں۔لیکن میں اپناپیدائشی حق فروخت نہیں کرسکتا‘نہ میں لوگوں کے اس پیدائشی حق کوفروخت کرنے کے لیے تیارہوں کہ وہ آزادہوجائیں۔

’’مجھے کس قسم کی آزادی دینے کی پیشکش کی جارہی ہے جبکہ عوام کی جماعت پر بدستور پابندی عائد ہے؟مجھے کس قسم کی آزادی کی پیشکش کی جارہی ہے جبکہ مجھے ایک پاس نہ رکھنے کے جرم میں گرفتارکیا جاسکتا ہے۔مجھے کس قسم کی آزادی دینے کی پیشکش کی جارہی ہے کہ میں اپنی زندگی ایک خاندان کی حیثیت سے اپنی پیاری بیوی کے ساتھ گزاروں جو برانڈ فورٹ میں پابندی کے تحت رہ رہی ہے؟مجھے کس قسم کی آزادی دینے کی کوشش کی جارہی ہے جبکہ مجھے کسی شہرعلاقے میں رہنے کے لیے اجازت لینی پڑتی ہے؟۔۔۔۔مجھے کس قسم کی آزادی دینے کی پیشکش کی جارہی ہے جبکہ میری جنوبی افریقی شہریت ہی کا احترام نہیں کیا جاتا؟

’’صرف آزاد آدمی مذاکرات کر سکتے ہیں۔قیدی کسی معاہدے میں نہیں آسکتے۔۔۔۔۔میں ایسے وقت کوئی وعدہ نہیں کرسکتا اور نہ کروں گا جبکہ میں اورآپ عوام‘آزادنہیں ہیں۔تمہاری آزادی اورمیری آزادی الگ الگ نہیں کی جاسکتی۔میں ضرورلوٹ کرآؤں گا۔‘‘

وزیرانصاف زیتون کی شاخ لایا

1985ء میں جیل ڈاکٹر سے معمول کے طبی معاینہ کے بعد مجھے ایک یورالوجسٹ کے پاس بھیجا گیاجس نے تشخیص کی کہ میراپراسٹیٹ گلینڈ بڑھ گیا ہے‘چنانچہ اس نے جراحی تجویز کی۔اس نے کہا کہ یہ آپریشن معمول کا ہوگا۔میں نے اپنے

خاندان سے مشورہ کر کے آپریشن کروانے کا فیصلہ کیا۔

مجھے بھاری سکیورٹی کے تحت کیپ ٹاؤن کے فوکس ہسپتال لے جایا گیا۔ ونی طیارے کے ذریعے وہاں آئی اور جراحی سے پہلے اس نے میری دیکھ بھال کی۔ لیکن ایک اور ملاقاتی بھی مجھ سے ملنے آیا جس کی آمد حیرت انگیز/غیر متوقع تھی۔ یہ تھا کوبائی کوئٹسی، وزیر انصاف کچھ۔ عرصہ پہلے میں نے کوئٹسی کو خط لکھ کر ایک ملاقات کے لیے زور دیا تھا تا کہ اے این سی اور حکومت کے دوران بات چیت کا جائزہ لیا جائے۔ اس نے جواب نہیں دیا تھا لیکن اس روز وہ بغیر کسی اطلاع کے ہسپتال آ پڑکا جیسے اسے کسی پرانے دوست سے ملاقات کرنی ہو جو چند روز سے ہسپتال میں داخل ہو۔ وہ سراسر مہربان اور نرم دل تھا اور گفتگو کا زیادہ حصہ ہم نے ادھر ادھر کی خوشگوار باتوں میں گزارا۔ اگر چہ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے خوشگوار گفتگو دنیا کی سب سے نارمل چیز ہے، مجھے اس کی آمد پر حیرت تھی۔ حکومت بڑے دھیمے آزمائشی طریقے سے جائزہ لے رہی تھی کہ اسے اے این سی سے کوئی مفاہمت کرنی ہی پڑے گی۔ کوئٹسی کی آمد ایک زیتون کی شاخ تھی۔

اگر چہ ہم نے سیاست پر بات نہ کی، میں نے ایک حساس معاملہ ضرور اٹھایا اور وہ تھا میری بیوی کا سٹیٹس۔ اگست میں میرے ہسپتال میں داخل ہونے سے کچھ پہلے ونی اپنا علاج کرانے جوہانسبرگ گئی تھی۔ برانڈ فورٹ سے واحد دو سفر جن کی اسے اجازت دی گئی تھی وہ مجھ سے یا اس کے ڈاکٹر سے ملاقات کے لیے کیے گئے۔ جب وہ جوہانسبرگ میں تھی، برانڈ فورٹ میں اس کا مکان اور اس کے پیچھے کلینک دونوں فائر بموں سے تباہ کر دیئے گئے تھے۔ ونی کے پاس اب کوئی جگہ نہیں تھی جہاں وہ رہائش رکھ سکے، چنانچہ اس نے اس حقیقت کے باوجود جوہانسبرگ میں رہنے کا فیصلہ کیا کہ یہ شہر اس کی پابندی کی حدود سے باہر تھا۔ چند ہفتوں تک کچھ نہ ہوا اور پھر سیکورٹی پولیس نے اسے تحریری اطلاع دی کہ برانڈ فورٹ میں مکان کی مرمت کر دی

گئی ہے اور اسے واپس آنا چاہیے لیکن اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے کوئٹسی سے درخواست کی کہ اسے جوہانس برگ میں رہنے کی اجازت دی جائے اور برانڈ فورٹ واپس جانے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اس نے کہا کہ وہ کوئی وعدہ نہیں کر سکتا لیکن وہ اس معاملے کو ضرور دیکھے گا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

تنہائی میں ایک تاریخی فیصلہ

میں نے جراحی سے صحت یاب ہونے کے لیے ہسپتال میں کئی دن گزارے۔ جب مجھے فارغ کیا گیا تو بریگیڈیئر منرو نے مجھے ہسپتال سے ہمراہ لیا۔ کمانڈنگ افسر عموماً قیدیوں کو ہسپتال سے ہمراہ نہیں لیتے لہٰذا میرے ذہن میں شبہات رینگنے لگے۔

گاڑی میں بیٹھے بریگیڈیئر منرو نے اچانک ہی مجھ سے کہا جیسے وہ معمول بات کر رہا ہو: ''منڈیلا! ہم اب تمہیں واپس تمہارے دوستوں کے پاس نہیں لے جا رہے۔ ''میں نے پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس نے کہا: ''اب کے بعد تم اکیلے رہو گے۔''میں نے پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس نے کہا: ''میں نہیں جانتا۔ مجھے تو ہیڈ کوارٹر سے یہ ہدایات ملی ہیں۔''اس بار پھر مجھے انتباہ کیا گیا تھا نہ کوئی وضاحت پیش کی گئی تھی۔

پولس مور میں میری واپسی پر مجھے جیل کے گراؤنڈ فلور پر ایک نئی کوٹھڑی میں لے جایا گیا۔ یہ پہلی کوٹھڑی سے تین منزل نیچے اور ایک مختلف ونگ میں تھی۔ مجھے تین کمرے اور ایک الگ ٹائلٹ دیئے گئے۔ ایک کمرہ سونے کے لیے، ہال کے پار ایک کمرہ مطالعے کے لیے اور ایک اور کمرہ ورزش کے لیے تھا۔ جیل کے معیار سے یہ تما گوارا تھا لیکن کمرے گیلے اور بوسیدہ تھے اور ان میں قدرتی روشنی کی آمد نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں نے بریگیڈیئر سے کچھ نہ کہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ فیصلہ اس کا نہیں۔ میں اس اقدام کے مضمرات پر غور کرنے کے لیے وقت چاہتا تھا۔ حکومت

نے یہ قدم کیوں اٹھایا تھا؟

میرا یہ احساس اتنا مضبوط تھا کہ اسے الہام نہیں کہا جا سکتا مگر اگلے چند دنوں اور ہفتوں کے دوران میں اپنے نئے حالات کے متعلق اس احساس تک پہنچ گیا۔ میں اس نتیجے تک پہنچا کہ یہ تبدیلی مواخذے کے لیے نہیں بلکہ ایک موقع دینے کے لیے ہے۔ میں اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر خوش نہیں تھا اور مجھے اپنا باغیچہ اور تیسی منزل پر ٹیرس یاد آتے تھے مگر میری تنہائی نے مجھے کچھ آزادی بخشی اور میں نے اسے ایک ایسا کام کرنے کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا جس پر میں عرصے سے غور وخوض کر رہا تھا' یعنی حکومت سے مذاکرات کے ذریعے جہد آزادی کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اگر ہم جلد بات چیت شروع نہیں کرتے تو فریقین ظلم وستم' تشدد اور جنگ کی تاریک رات میں ڈوب جائیں گے۔ میری تنہائی نے مجھے اس سمت میں پہلا قدم اٹھانے کا موقع دیا' اس قسم کی تنقید کے بغیر جو ایسے اقدام کو تباہ کر سکتی تھی۔

ہم تین چوتھائی صدی سے سفید فام اقلیتی حکمرانی کے خالف لڑ رہے تھے۔ ہم دو دہائیوں سے زیادہ عرصے سے مسلح جدوجہد میں مصروف تھے۔ دونوں طرف بہت سے لوگ پہلے ہی مارے جا چکے تھے۔ دشمن مضبوط اور پرعزم تھا۔ پھر بھی اپنے تمام تر بمبار طیاروں اور ٹینکوں کے ساتھ انہیں احساس ہو گیا ہو گا کہ وہ تاریخ کی غلط جانب ہیں۔ حق ہماری طرف تھا' لیکن ابھی طاقت ہمارے پاس نہیں تھی۔ مجھ پر یہ واضح تھا کہ ایک فوجی فتح اگر ایک ناممکن خواب نہیں تو دور از کار ضرورت ہے۔ فریقین کے لیے ایک ایسے تنازع میں اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں جانیں ضائع کر دینے میں کوئی عقل کی بات نہیں تھی جو غیر ضروری تھا۔ انہیں بھی یہ احساس ہو گیا ہو گا۔ اب مذاکرات کا وقت آ گیا تھا۔ مذکرات ایک انتہائی حساس مسئلہ تھے۔ فریقین مذاکرات کو کمزوری اور غداری کی علامت سمجھتے تھے۔ کوئی فریق مذاکرات کی میز پر آنے کو تیار نہیں تھا جب تک دوسرا نمایاں مراعات نہ دیتا۔ حکومت بار بار اس پر زور

دے رہی تھی کہ ہم کمیونسٹوں کی ایک دہشت گرد تنظیم ہیں اور یہ کہ وہ دہشت گردوں اور کمیونسٹوں سے کبھی مذاکرات نہیں کرے گی۔ اے این سی بار بار زور دے رہی تھی کہ حکومت فاشٹ اور نسل پرست ہے اور یہ کہ اس وقت تک مذاکرات کرنے کی کوئی بات ہی نہیں جب تک وہ اے این سی سے پابندی نہیں ہٹاتی، غیر مشروط طور پر تمام قیدی رہا نہیں کرتی اور ٹاؤن شپوں سے فوجی دستے واپس نہیں بلاتی۔

حکومت سے بات چیت کرنے کا فیصلہ اس قدر اہمیت کا حامل تھا کہ یہ صرف لوسا کا میں کیا جانا چاہیے تھا۔ لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ بات چیت کا عمل شروع ہونا چاہیے جبکہ آلیور سے رابطہ قائم کرنے کے لیے میرے پاس وقت تھا نہ اس کے ذرائع۔ ہماری طرف سے کسی کو تو پہلا قدم اٹھانا تھا اور میری نئی تنہائی نے مجھے ایسا کرنے کی آزادی اور، کم از کم کچھ عرصے کے لیے، میری کوششوں کے خفیہ رہنے کی ضمانت دونوں فراہم کردیں۔

والٹر، رے اور کیتھی کا مجھ سے احتجاج

اب میں ایک طرح کی شاندار تنہائی میں تھا۔ اگرچہ میرے ساتھی مجھ سے صرف تین منزلیں اوپر تھے، مگر میرے لیے جیسے وہ جوہانس برگ میں تھے۔ ان سے ملنے کے لیے مجھے رسمی درخواست دینی تھی جس کی منظوری پریٹوریا ہیڈ آفس سے ملنی تھی۔ جواب موصول ہونے میں اکثر کئی ہفتے لگ جاتے تھے۔ اگر وہ منظور ہو جاتی تو پھر ملاقات کے حصے میں میری ان سے ملاقات ہو جاتی۔ یہ ایک نرالا تجربہ تھا۔ میرے رفقاء اور ساتھی قیدی اب سرکاری ملاقاتی تھے۔ برسوں ہم دن میں کئی کئی گھنٹے باتیں کرتے رہے تھے مگر اب ہمیں سرکار کو درخواست دے کر وقت لینا پڑتا تھا اور ہماری گفتگو مانیٹر کی جاتی تھی۔

جب اپنی نئی کوٹھڑی میں مجھے چند روز ہو گئے تو میں نے کمانڈنگ افسر سے کہا کہ ایک ایسی ملاقات کا اہتمام کیا جائے۔ اس نے ایسا کر دیا اور ہم چاروں میرے

تبادلے کے مسئلے پر گفتگو کرتے رہے۔ والٹر' رے اور کیتھی غصے میں تھے کہ انہیں الگ کر دیا گیا ہے۔ ہو شدید احتجاج کرنا چاہتے تھے اور ان کا مطالبہ تھا کہ ہمیں پھر اکٹھے کیا جائے۔ میں نے کہا: ''دیکھو ساتھیو! میرے خیال میں ہمیں اس کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔'' میں نے انہیں بتایا کہ میری نئی رہائش گاہ پہلے سے بڑھیا ہے اور ممکن ہے یہ تمام سیاسی قیدیوں کے لیے مثال بن جائے۔ میں نے قدرے ابہام سے مزید کہا: ''شاید اس کا کوئی اچھا نتیجہ نکلے گا۔ میں اب اس پوزیشن میں ہوں کہ حکومت ہم سے رابطہ قائم کر سکتی ہے۔'' انہوں نے میرے آخر جملے پر زیادہ توجہ نہ دی جیسا کہ میرا خیال تھا وہ نہیں دیں گے۔

میں نے کسی کو بتانا پسند نہ کیا کہ کرنے والا تھا۔۔۔۔ نہ بالائی منزل والے اپنے ساتھیوں کو اور نہ لوساکا والوں کو۔ اے این سی کی قیادت اجتماعی تھی مگر حکومت نے اس معاملے میں اجتماعیت ناممکن بنا دی تھی۔ اپنے جماعتی ساتھیوں سے ان معاملات پر گفتگو کے لیے میرے پاس سیکورٹی تھی نہ وقت میں جانتا تھا کہ بالائی منزل والے ساتھی میری تجویز کی مذکت کریں گے اور اس طرح میرا اقدام شروع ہونے سے پہلے ختم ہو جائے گا۔ ایسے اوقات آتے ہیں جب ایک لیڈر کو اپنے پیرو کاروں سے آگے نکل کر ایک نئی سمت میں گامزن ہونا پڑتا ہے' اس اعتماد کے ساتھ کہ وہ اپنے عوام کی صحیح راستے رہنمائی کر رہا ہے۔ پھر معاملات اگر بگڑ جاتے تو میری تنہائی میری پارٹی میری پارٹی کو معقول بہانہ فراہم کرتی تھی کہ بوڑھا آدمی تنہا اور دوسروں سے مکمل طور پر کٹا ہوا تھا اور اس نے جو اقدامات کیے وہ اے این سی کے نما ئندے کی حیثیت سے نہیں بلکہ انفرادی طور پر کیے ہیں۔

اپنے حرکت میں آنے کے چند ہفتوں کے اندر میں نے کوبائی کوٹسی کو لکھا کہ با قاعدہ مذاکرات کے لیے بات چیت شروع کی جائے۔ پہلے کی طرح مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے ایک بار پھر لکھا اور پھر کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے حکومت کے

اس رویئے کو نرالا اور حوصلہ شکن پایا' چنانچہ مجھے احساس ہوا کہ مجھے ایک اور موقع تلاش کرنا ہے جب میری بات سنی جائے گی۔ یہ موقع اوائل 1986ء میں آیا۔

''نمایاں افراد'' کے وفد سے ملاقات

اکتوبر 1985ء میں نساؤ' بہاماز میں برطانوی دولت مشترکہ کے اجلاس میں رہنما اس مسئلے پر متفق نہ ہو سکے کہ جنوبی افریقہ کے خلاف بین الاقوامی پابندیوں میں حصہ لیا جائے یا نہیں۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ برطانوی وزیراعظم مارگریٹ تھیچر ان پابندیوں میں شرکت کے سخت خلاف تھیں۔ ڈیڈ لاک ختم کرنے کے لیے شرکائے اجلاس نے اتفاق کیا کہ ''نمایاں افراد'' پر مشتمل ایک وفد جنوبی افریقہ کا دورہ کر کے واپس رپورٹ دے کہ کیا پابندیاں نسلی امتیاز کے خاتمے میں مدد دینے کے لیے مناسب ہتھیار ہیں۔ اوائل 1986ء میں نمایاں افراد کا سات رکنی گروہ جس کی قیادت نائیجیریا کے سابق فوجی رہنما جنرل الوسیگن اباسنجو اور سابق آسٹریلوی وزیراعظم مالم فریزر کر رہے تھے' اپنے حقیقت جو مشن پر جنوبی افریقہ پہنچا۔

فروری میں جنرل اباسنجو نے وفد کے مطالعے کی نوعیت پر بات چیت کے لیے مجھ سے ملاقات کی۔ وہ میرے اور پورے گروہ کے مابین ایک ملاقات ممکن بنانے کے شائق تھے۔ حکومت کی اجازت سے ایک ایسی ملاقات مئی میں طے پا گئی۔ مجھ سے ملاقات کے بعد انہیں کابینہ سے بات چیت کرنا تھی لہٰذا میں نے مذاکرات کا موضوع اٹھانے کے لیے اس موقع کو غنیمت جانا۔

حکومت نے دولت مشترکہ کے گروہ سے میری ملاقات کو غیر معمولی اہمیت دی۔ ملاقات سے دو دن پہلے بریگیڈیئر منرو مجھ سے ملا جو ایک درزی کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ کمانڈر نے کہا: ''منڈیلا! ہم چاہتے ہیں کہ تم ان لوگوں سے مساوی سطح پر ملو۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم وہ پرانے جیل کے کپڑے پہنے رہو لہٰذا یہ درزی تمہارا ناپ لے گا اور تمہارے لیے ایک مناسب سوٹ تیار کر دے گا۔ درزی ایک طرح کا جادوگر ہو گا

کیونکہ اگلے ہی دن وہ ایک نفیس سوٹ تیار کر کے لے آئیں جو مجھے دستانے کی طرح فٹ آتا تھا۔ مجھے ایک قمیص' ٹائی' جوتے' جرابیں اور زیر جامہ بھی دیئے گئے' کمانڈر نے میرے نئے لباس کی تعریف کی۔ ''منڈیلا! اب تم ایک قیدی نہیں بلکہ ایک وزیر اعظم لگتے ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نمایاں افراد کے گروہ'' اور میرے مابین ملاقات کے موقع پر دو اہم مبصر بھی شریک تھے۔ کوئی بائی کوٹسی اور کمشنر جیل خانہ جات لیفٹیننٹ ڈبلیو ایچ ولمز۔ درزی کی طرح یہ دونوں میرا ''ناپ'' لینے کو وہاں موجود تھے۔ لیکن حیرت انگیز طور پر ملاقات شروع ہونے کے کچھ دیر بعد وہ کمرے سے چلے گئے۔ میں نے یہ کہتے ہوئے ان کے موجود رہنے پر اصرار کیا کہ مجھے کوئی بات نہیں چھپانی مگر وہ چلے ہی گئے۔ ان کے جانے سے پہلے میں نے انہیں بتایا کہ مذاکرات کا وقت آ گیا ہے' جنگ کا نہیں' اور یہ کہ حکومت اور اے این سی کو بیٹھ کر گفت وشنید کرنی چاہیے۔

نمایاں افراد کا گروہ تشدد' مذاکرات اور بین الاقوامی پابندیوں کے معاملات سے متعلق کئی سوالات کے ساتھ آیا تھا۔ شروع ہی میں' میں نے بات چیت کے بنیادی اصول طے کر دیئے۔ میں نے انہیں بتایا: ''میں تحریک کا سربراہ نہیں' تحریک کا سربراہ لوسا کا میں آلیور ٹیمبو ہے۔ آپ کو جا کر اس سے ملنا چاہیے۔ آپ اسے بتا سکتے ہیں کہ میرے خیالات کیا ہیں لیکن یہ صرف میرے ذاتی خیالات ہیں۔ یہ یہاں جیل میں میرے ساتھیوں کے خیالات کی بھی نمائندگی نہیں کرتے۔ مختصر یہ کہ میں اے این سی کے حکومت سے مذاکرات شروع کرنے کے حق میں ہوں۔''

گروہ کے مختلف ارکان کو میرے سیاسی نظریہ کے متعلق اور اس بارے میں شبہات تھے کہ اے این سی کے زیر قیادت جنوبی افریقہ کیسا لگے گا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں جنوبی افریقی نیشنلسٹ ہوں' کمیونسٹ نہیں' یہ کہ ہماری قوم پرستی کے چوکھٹے میں ہر رنگ و نسل کے لوگ آتے ہیں اور یہ کہ میں ایک غیر نسلی معاشرے پر پختہ یقین رکھتا

ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں فریڈم چارٹر پر یقین رکھتا ہوں‘ یہ کہ چارٹر جمہوریت کے اصولوں اور انسانی حقوق کا آئینہ دار ہے اور یہ کہ یہ سوشلزم کا بلیو پرنٹ نہیں۔

میں نے انہیں آگاہ کیا کہ میں سمجھتا ہوں گوری اقلیت کو کسی بھی نئے جنوبی افریقہ میں تحفظ کا احساس ہونا چاہیے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے خیال میں ہمارے کئی مسائل حکومت اور اے این سی کے مابین رابطے کے فقدان کا نتیجہ ہیں اور یہ کہ ان میں سے بعض عملی بات چیت سے حل کیے جا سکتے ہیں۔

مذاکرات کے لیے میری شرط

انہوں نے تشدد کے مسئلے پر مجھ سے پے بہ پے سوال کیے اور اگرچہ میں ابھی تک تشدد کی مذمت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا‘ میں نے وثوق کے ساتھ کہا کہ تشدد جنوبی افریقہ کی صورتحال کا حتمی حل کبھی نہیں ہو سکتا اور یہ کہ مردوں اور عورتوں کو ان کی اپنی ہی فطرت کی بنا پر کسی طرح کی مذاکراتی افہام و تفہیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے ایک بار پھر زور دے کر کہا کہ یہ میرے ذاتی خیالات ہیں اور اے ان سی کے نہیں۔ میں نے تجویز دی کہ اگر حکومت ٹاؤن شپوں سے پولیس اور فوج ہٹا لے تو اے این سی مذاکرات کے پیش خیمہ کے طور پر مسلح جدوجہد کے التوا پر رضامند ہو سکتی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ صرف میری رہائی سے ملک میں تشدد رک سکے گا نہ مذاکرات کی راہ ہموار ہو گی۔

مجھ سے ملاقات کے بعد دولت مشترکہ کے گروہ نے لوساکا میں آلیور اور پریٹوریا میں سرکاری حکام دونوں سے ملنے کا منصوبہ بنایا۔ اپنے ریمارکس میں‘ میں نے ان دونوں جگہوں پر پیغامات بھیج دیئے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ حکومت دیکھ لے کہ موزوں حالت میں ہم بات چیت کر سکتے ہیں اور میں آلیور کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ میری اور اس کی پوزیشن ایک ہی ہے۔

مئی میں نمایاں افراد کا گروہ آخری بار مجھ سے ملنے آیا۔ میں پرامید تھا کیونکہ

وہ لوسا کا اور پریٹوریا دونوں جگہ ہو آئے تھے اور مجھے توقع تھی کہ مذاکرات کے بیج بو دیئے گئے ہیں۔ لیکن ہماری ملاقات سے ایک دن پہلے جنوبی افریقی حکومت نے ایک ایسا قدم اٹھایا جس نے وہ تمام خیر سگالی سبوتاژ کر دی جو دولت مشترکہ کے گروہ کی آمد سے پیدا ہوئی تھی۔ جس روز نمایاں افراد کے گروہ کی کابینہ کے وزراء سے ملاقات طے شدہ تھی، جنوبی افریقی دفاعی فوج نے صدر بوتھا کے احکام کے تحت بوٹسوانا، زمبیا اور زمبابوے میں اے این سی کے اڈوں پر فضائی حملہ اور کمانڈو حملے کیے۔ اس سے بات چیت کی فضا میں زہر بھر گیا اور ''نمایاں افراد کا گروہ'' فوری طور پر جنوبی افریقہ سے چلا گیا۔ ایک بار پھر میں نے محسوس کیا کہ مذاکرات کو آگے بڑھانے کی میری کوششیں روک دی گئی ہیں۔

آلیور ٹیمبو اور اے این سی نے جنوبی افریقہ کے عوام سے اپیل کی تھی کہ وہ ملک کو حکومت کے لیے ناقابل حکمرانی بنا دیں اور عوام اس پر عمل کر رہے تھے۔ بے چینی کی حالت اور سیاسی تشدد نئی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔ عوام غصے میں آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ ٹاؤن شپوں میں زبردست اضطراب تھا۔ بین الاقوامی دباؤ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ 12 جون 1986ء کو حکومت نے اس کوشش میں ہنگامی حالت نافذ کر دی کہ احتجاج کی لہر کو دبا دیا جا سکے۔ ہر لحاظ سے وقت مذاکرات کے لیے سازگار نہ لگتا تھا۔ لیکن اکثر انتہائی حوصلہ شکن لمحات ہی کسی اقدام کا ٹھیک وقت ہوتے ہیں۔ ایسے مواقع پر لوگ اپنی الجھن سے نکلنے کے راستے کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ اس ماہ میں نے جنرل ولمز کمشنر جیل خانہ جات کو ایک بہت سادہ سا خط لکھا جس میں صرف یہ کہا ''میں قومی اہمیت کے ایک مسئلے پر آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے یہ خط بدھ کو بریگیڈیئر منرو کے سپرد کر دیا۔ اس ہفتے کے آخر میں کمانڈنگ آفیسر نے مجھ سے کہا کہ جنرل ولمز سے ملاقات کے لیے تیار رہوں جو پریٹوریا سے آ رہے ہیں۔ یہ ملاقات معمول سے ہٹ کر ہوئی۔ جنرل سے ملاقات کے احاطے میں بات

چیت کرانے کے بجائے مجھے پولس مور جیل کے باہر اس کی رہائش گاہ پر لے جایا گیا۔

وزیر انصاف سے پہلی بامقصد ملاقات

ولمز ایک سیدھا آدمی ہے' چنانچہ ہم فوراً ہی کام کی بات کرنے لگے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں وزیر انصاف کو بائی کوٹسی سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھ سے پوچھا: ''کیوں؟'' میں نے ایک لمحہ تامل کیا کیونکہ میں ایک جیل آفیسر سے سیاسی معاملات پر گفتگو کرنے سے گریزاں تھا لیکن پھر میں نے اپنا یت: ''میں وزیر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں تاکہ حکومت اور اے این سی کے مابین بات چیت کا سوال اٹھاؤں۔''

اس نے ایک لمحہ اس پر غور کیا اور پھر کہا: ''منڈیلا! جیسا کہ تم جانتے ہو' میں ایک سیاستدان نہیں۔ میں ایسے معاملات پر از خود بات نہیں کر سکتا کیونکہ یہ میرے اختیار سے باہر ہیں۔'' پھر اس نے توقف کیا جیسے کوئی بات اس کے ذہن میں آئی ہو۔ اس نے کہا: ''اتفاق یہ ہے کہ وزیر انصاف کیپ ٹاؤن میں ہیں۔ شاید تم ان سے مل سکتے ہو۔ میں پتہ کروں گا۔'' پھر جنرل نے وزیر کو فون کی اور وہ دونوں چند لمحوں کے لیے گفتگو کرتے رہے۔ ٹیلی فون رکھنے کے بعد جنرل نے میری طرف مڑتے ہوئے کہا: ''وزیر صاحب کہتے ہیں اسے لے آؤ۔'' چند منٹ بعد ہم جنرل کی رہائش گاہ سے اس کی کار میں کیپ ٹاؤن میں وزیر انصاف کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ سیکورٹی معمولی تھی۔ صرف ایک اور کار جنرل کی گاڑی کے ساتھ آ رہی تھی۔ جس آسانی اور سرعت سے اس ملاقات کا اہتمام ہو گیا اس سے مجھے شبہ ہوا کہ حکومت نے اس ملاقات کا منصوبہ پیشگی بنالیا ہوگا۔ انہوں نے واقعی ایسا منصوبہ بنایا تھا یا نہیں' یہ غیر ضروری بات ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مذاکرات کے طرف پہلا قدم اٹھانے کا موقع آ گیا تھا۔

شہر میں اپنی سرکاری رہائش گاہ پر کوئٹسی نے میرا پر جوش استقبال کیا اور ہم اس کے لاؤنج میں آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس نے معذرت کی کہ مجھے اپنے جیل کے کپڑے بدلنے کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ میں اس سے تین گھنٹے گفت وشنید کرتا رہا اور اس کی شائستگی اور بات سننے پر آمادگی نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس نے پرمغز اور متعلقہ سوالات کیے جن سے ان مسائل سے اس کی واقفیت آشکار ہوتی تھی جنھوں نے حکومت اور اے این سی کے مابین خلیج حائل کر رکھی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ ہم کن حالات میں مسلح جدوجہد ملتوی کر سکتے ہیں؛ میں اجتماعی طور پر اے این سی کی طرف سے بات کر سکتا ہوں یا نہیں اور میرے ذہن میں نئے جنوبی افریقہ کے اندر اقلیتوں کے لیے دستوری تحفظات کی کیا شکل ہے۔ اس کے سوالات ان مسائل کا لب لباب تھے جو حکومت اور اے این سی کو تقسیم کیے ہوئے تھے۔

جس طرح میں نے نمایاں افراد کے گروہ کو جواب دیا تھا اسی طرح وزیر انصاف کو جواب دینے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ کوئٹسی مسئلے کا کوئی حل چاہتا ہے۔ اس نے پوچھا: "اگلا قدم کیا ہے؟" میں نے اسے بتایا کہ میں صدر مملکت اور وزیر خارجہ پک بوتھا سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ کوئٹسی نے یہ بات ایک چھوٹے سے پیڈ پر نوٹ کر لی جو اس کے پہلو میں پڑا تھا اور پھر مجھ سے کہا کہ وہ میری درخواست مناسب ذرائع سے آگے بھیج دے گا۔ پھر ہم نے ہاتھ ملائے اور مجھے واپس پولس مور جیل کی فرشی منزل پر میری تنہا کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا۔

میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ حکومت ملک کو بحران سے نکالنے کے لیے بے چین ہے اور یہ کہ اب وہ اس امر کے قائل ہو چکے ہیں کہ انہیں اپنی پرانی پوزیشنوں سے ہٹنا ہوگا۔ ایک ہیولے کی شکل میں؛ میں نے مفاہمت کا آغاز دیکھ لیا تھا۔

میں نے اپنی اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہ کیا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے پہلے کہ

میں کسی اور کو اطلاع دوں' مفاہمت کا عمل راستے پر چل نکلے۔ بعض اوقات یہ ضروری ہوتا ہے کہ اپنے ساتھیوں کو ایک ایسی پالیسی پیش کی جائے جو پہلے ہی عملی شکل اختیار کر چکی ہو۔ میں جانتا تھا کہ ایک بار جب انہوں نے احتیاط سے صورتحال کا جائزہ لیا تو پولس مور اور لوسا کا میں میرے ساتھی میری حمایت کریں گے۔ لیکن ایک بار پھر پر امید آغاز کے بعد کچھ نہ ہوا۔ ہفتے اور پھر مہینے گزر گئے اور کوئٹسی کی طرف سے ایک لفظ بھی سننے میں نہ آیا۔ قدرے مایوسی میں' میں نے اسے ایک اور خط لکھا۔

منڈیلا سیاح کیپ ٹاؤن شہر میں

اگرچہ مجھے کوبائی کوئٹسی سے براہ راست جواب نہیں ملا تھا' دیگر آثار ایسے تھے کہ حکومت مجھے مختلف قسم کے قیام کے لیے تیار کر رہی تھی۔ کرسمس سے پہلے روز پولس مور کا ڈپٹی کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل گاوائی مارکس ناشتے کے بعد ٹہلتے ٹہلتے میری کوٹھڑی کے پاس آیا اور اچانک ہی بولا: ''ٹھیک ہے' چلے آؤ۔'' میں اپنی کوٹھڑی اور صدر دروازے کے مابین کرنل کے ہمراہ پندرہ بند دروازوں سے گزرا اور جب ہم باہر نکلے تو میں نے اس کی کار کو ہمارے لیے منتظر پایا۔

ہم اس خوبصورت سڑک سے ہو کر شہر میں داخل ہوئے جو ساحل کے متوازی گزرتی ہے۔ اس کے ذہن میں کوئی منزل نہ تھی اور ہم فراغت کے انداز میں شہر میں ادھر ادھر بس گھومتے پھرے۔ جیل سے باہر کی دنیا میں لوگوں کو عام سرگرمیوں میں مصروف دیکھنا میرے لیے مسرت انگیز تھا۔ بوڑھے آدمی دھوپ میں بیٹھے تھے۔ عورتیں خریداری کر رہی تھیں۔ لوگ اپنے کتوں کو ٹہلا رہے تھے۔ یہی روزمرہ زندگی کی دنیاوی سرگرمیاں ہیں جو جیل میں سب سے زیادہ یاد آتی ہیں۔ میں اپنے آپ کو ایک اجنبی اور شاندار سرزمین میں ایک متجسس سیاح کی مانند محسوس کر رہا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد کرنل مارکس نے ایک خاموش بازار میں ایک چھوٹی سی دکان کے سامنے کار روک دی۔ ''کیا تم ٹھنڈا مشروب پیو گے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے سر ہلا دیا اور وہ دکان کے اندر غائب ہو گیا۔ میں وہاں اکیلا بیٹھا رہا۔ پہلے چند لمحے میں نے اپنی صورت حال کے بارے میں غور نہ کیا مگر جب سیکنڈ پہ سیکنڈ گزرتے گئے تو مجھے اشتعال نے آلیا۔ بائیس برس میں پہلی مرتبہ میں باہر کی دنیا میں اور پہرے کے بغیر تھا۔ میرے ذہن میں آیا کہ میں دروازہ کھول کر چھلانگ لگا دوں اور پھر دوڑتا جاؤں حتیٰ کہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاؤں۔ میرے اندر سے کوئی شے مجھ پر زور دے رہی تھی کہ میں ایسا کر گزروں۔ مجھے سڑک کے نزدیک گھنے درختوں والا علاقہ نظر آیا جہاں میں چھپ سکتا تھا۔ میں شدید تناؤ میں تھا اور مجھے پسینہ آنے لگا۔ کرنل کہاں تھا؟ لیکن پھر میں نے اپنے آپ پر قابو لیا۔ ایسا اقدام احمقانہ اور غیر ذمے دارانہ ہوگا اور اس پر خطرناک بھی۔ یہ ممکن تھا کہ پوری صورت حال گھڑی گئی ہوتا کہ مجھے فرار کروانے کی کوشش کی جائے اگرچہ سمجھتا ہوں کہ یہ صورت نہیں تھی۔ چند لمحے بعد میں نے بڑا سکون محسوس کیا جب میں نے کرنل کو کوکا کولا کے دو ڈبے پکڑے کار کی طرف واپس آتے دیکھا۔

جیسا کہ بعد میں پتہ چلا اس روز کیپ ٹاؤن میں یہ تفریح میری کئی تفریحات میں سے پہلی تفریح تھی۔ پھر اگلے چند ماہ کے دوران میں کرنل کے ہمراہ کئی بار گیا' صرف کیپ ٹاؤن ہی میں نہیں بلکہ شہر کے باہر بعض مناظر بھی دیکھے۔ اس کے خوبصورت ساحل اور پیارے خنک پہاڑ۔ جلد ہی زیادہ جونیئر افسروں کے ساتھ جو مقامات میں نے بار بار دیکھے وہ ''باغات'' تھے۔ یہ جیل کی زمین کے ایک سرے پر زمینی قطعات تھے جہاں جیل کے باورچی خانے کے لیے فصلیں اگائی جاتی تھیں۔ میں نے باہر فطرت میں نکل کر' افق دیکھنے کے قابل ہو کر اور اپنے شانوں پر دھوپ محسوس کر کے لطف اٹھایا۔

گورے قیدی کا نفرنگی تعصب

ایک دن میں کیپٹن کے ساتھ باغات کو گیا اور کھیتوں میں چلتے اور ٹہلتے ہوئے

ہم اصطبل پہنچ گئے۔ وہاں کل دو گورے آدمی گھوڑوں کی سیوا کر رہے تھے۔ میں چل کر اُن کے پاس پہنچا اور ایک گھوڑے کی تعریف کی اور آدمی سے کہا: ''اس گھوڑے کا نام کیا ہے؟'' نوجوان آدمی بظاہر قدرے گھبرا گیا اور اس نے میری طرف نہ دیکھا۔ پھر اس نے منمناتے ہوئے گھوڑے کا نام تو بتایا مگر کیپٹن کو' مجھے نہیں۔ تب میں نے دوسرے آدمی سے پوچھا کہ اس کے گھوڑے کا نام کیا ہے اور اس کا ردعمل بھی ٹھیک وہی تھا۔

جب میں کیپٹن کے ساتھ واپس جیل کی طرف آرہا تھا میں نے ان دونوں نوجوانوں کے عجب رویئے پر تبصرہ کیا۔ کیپٹن ہنستے ہوئے بولا: ''منڈیلا! کیا تم نہیں جانتے وہ دونوں آدمی کون تھے؟'' میں نے کہا مجھے تو علم نہیں۔ وہ گورے قیدی تھے۔ اس سے پہلے کبھی کسی مقامی قیدی نے ایک گورے افسر کی موجودگی میں ان سے سوال نہیں کیا تھا۔''

کچھ نوجوان وارڈر مجھے کھیتوں سے خاصا دور لے جاتے اور ہم ساحل پر چلتے یا کسی کیفے پر رک کر چائے پیتے۔ ایسے مقامات پر میں اکثر یہ دیکھنے کی کوشش کرتا کہ کیا لوگ مجھے پہچانتے ہیں مگر کبھی کسی نے نہ پہچانا۔ میری آخری شائع شدہ تصویر 1962ء میں لی گئی تھی۔

یہ سیریں کئی سطح پر تعمیری تھیں۔ میں یہ دیکھتا کہ کس طرح اس عرصے میں جو میں نے جیل میں گزارا ہے' زندگی بدل گئی ہے۔ چونکہ ہم زیادہ تر گوروں کے علاقے میں جاتے تھے' مجھے وہ دولت اور سہولتیں دیکھنے کا موقع ملا جن سے وہ لطف اندوز ہوتے تھے۔ اگرچہ ملک میں بڑی تبدیلیاں آرہی تھیں اور ٹاؤن شپوں میں خانہ جنگی کے سے آثار تھے۔ گوروں کی زندگی پرسکون اور کسی پریشانی سے دوچار نہ تھی۔ ان کے معمولات متاثر نہیں ہوئے تھے۔ ایک بار ایک خوش مزاج نوجوان وارنٹ آفیسر برانڈ مجھے اپنے خانگی فلیٹ پر لے گیا اور اپنی بیوی اور بچوں سے میرا تعارف کرایا۔

اس کے بعد میں ہر سال اس کے بچوں کو کرسمس کارڈ بھیجتا رہا۔

ان چھوٹی مہمات سے میں نے بہت لطف اٹھایا مگر میں خوب جانتا تھا کہ مجھے تفریح میں مصروف رکھنے سے ہٹ کر بھی حکام کا ایک مقصد ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے جنوبی افریقہ کی زندگی کا عادی بنانا چاہتے ہیں اور شاید اس کے ساتھ ساتھ مجھے چھوٹی چھوٹی آزادیوں کی خوشیوں سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں تاکہ میں مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیے مفاہمت پر آمادہ ہو جاؤں۔

ملٹری انٹیلی جنس افسر سے رابطہ

1987ء میں کوباٹی کوئٹسی سے میرے رابطے پھر شروع ہو گئے۔ اس کی رہائش گاہ پر میری اس سے کئی نجی ملاقاتیں ہوئیں اور اس سال کے آخر میں حکوت نے اپنی پہلی ٹھوس تجویز پیش کی۔ کوئٹسی نے کہا کہ حکومت میرے ساتھ نجی گفت وشنید کے لیے سینئر افسروں کی ایک کمیٹی مقرر کرنا چاہتی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ صدر مملکت کے علم میں ہے اور ان کی تائید سے کیا جا رہا ہے۔ کوئٹسی نے کہا کہ وہ اس کمیٹی کا سربراہ ہوگا اور اس میں کمشنر جیل خانہ جات جنرل ولمز، ڈائریکٹر جنرل جیل خانہ جات فینی وان ڈرمروی اور ایک سابق پروفیسر ڈاکٹر نیل برنارڈ شامل ہوں گے۔ آخر الذکر اس وقت نیشنل انٹیلی جنس سروس کے سربراہ تھے۔ پہلے تینوں جیل کے نظام سے وابستہ تھے، چنانچہ اگر مذاکرات ناکام رہتے یا اخبارات میں ان کی خبر چھپ جاتی تو دونوں فریق اس معاملے کو بخوبی سمیٹ سکتے تھے اور یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم جیلوں کے حالات کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

تاہم ڈاکٹر برنارد کی موجودگی نے مجھے پریشان کیا۔ وہ اس وقت جنوبی افریقہ کے سی آئی اے جیسے ادارے کا سربراہ تھا اور فوجی انٹیلی جنس سے بھی اس کا تعلق تھا۔ میں اپنی پارٹی کے سامنے دوسرے افسروں سے مذاکرات کا جواز پیش کر سکتا تھا مگر برنارڈ کا نہیں۔ اس کی موجودگی مذاکرات کو زیادہ مشکل بنا سکتی تھی اور ایک بڑے

ایجنڈے کا تقاضا کرتی تھی۔ میں نے کوئٹسی کو بتایا کہ میں اس تجویز پر غور کر کے کل بتاؤں گا۔

اس رات میں نے تمام پیچیدگیوں پر غور کیا۔ میں جانتا تھا کہ پی ڈبلیو بوتھا نے سٹیٹ سیکورٹی کونسل نامی ایک ادارہ تشکیل دیا ہے جس میں سیکورٹی کے ماہرین اور انٹیلیجنس افسران شامل ہیں اور اس کا ایک سیکرٹیریٹ ہے۔ اخباری اطلاع کے مطابق اس نے یہ کام کابینہ کے اکتیار کو بالائے طاق رکھنے اور اپنے اختیار میں اضافے کے لیے کیا تھا۔ واکٹر برنارد اس اندرونی کونسل میں ایک کلیدی کھلاڑی تھا اور کہا جاتا تھا کہ وہ صدر کا منظورِ نظر ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر میں برنارد کو شریک کرنے سے انکار کر دوں تو بوتھا الگ تھلگ رہ جائے گا' چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ ایسا کرنا بہت خطرناک ہوگا۔ اگر صدر مملکت کو مذاکرات سے وابستہ نہ رکھا گیا تو یہ نتیجہ خیز نہیں ہوں گے۔ صبح کو میں نے کوئٹسی کو پیغام بھیجا کہ مجھے اس کی پیشکش قبول ہے۔

میں جانتا تھا کہ مجھے تین نازک معاملات نپٹانے کی ضرورت ہے۔ اول' میں مزید آگے بڑھنے سے پہلے تیسری منزل پر اپنے ساتھیوں کو بتانا چاہتا تھا۔ دوم' لوساکا میں آلیور سے رابطہ کرنا ضروری تھا جس میں ملک کو درپیش بنیادی مسائل پر اپنے اور اے این سی کے خیالات منعکس ہوں۔ یہ یادداشت مستقبل کی کسی گفت وشنید کے لیے گفتگو کے نکات پیش کرتی۔

خفیہ مذاکرات پر تین دوستوں سے گفتگو

میں نے اپنے ساتھیوں سے ایک ملاقات کی درخواست دی اور مجھے حیرت ہوئی کہ حکام نے صاف انکار کر دیا۔ یہ اہم بات تھی اور میرا خیال تھا کہ اس سے اس بے پایاں اضطراب کا اظہار ہوتا ہے جو میرے اور حکومت کے مابین خفیہ مذاکرات کے حوالے سے پایا جاتا ہے۔ میں اپنی شکایات کو زیادہ سینئر افسروں کے پاس لے گیا۔ آخر کار درخواست مان لی گئی' اس شرط کے ساتھ کہ میں اپنے ساتھیوں سے ایک

ایک کر کے ملوں' اکٹھے نہیں۔

میں ان سے احاطہ ملاقات میں ملا۔ میں نے طے کیا تھا کہ میں بعض تفصیلات نظر انداز کر دوں گا۔ میں ان سے حکومت سے مذاکرات کرنے خیال کے متعلق رائے لوں گا اور یہ ذکر نہیں کروں گا کہ عملاً ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ پہلے والٹر سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اے کمشنر جیل خانہ جات کے نام اپنے خط اور کوئٹسی سے اپنی ملاقات کا بتایا۔ میں نے کہا کہ میں نے حکومت سے مذاکرات شروع کرنے کے تصور پر کوئٹسی سے بات چیت کی ہے اور یہ کہ حکومت اس میں دلچسپی رکھتی محسوس ہوتی ہے۔ اس مسئلے پر اس کی رائے کیا ہے؟

میں اچھے برے حالات میں والٹر کے ساتھ رہا ہوں۔ وہ دلیل اور فہم کا آدمی تھا اور کوئی اور شخص مجھے اتنا نہیں جانتا تھا جتنا وہ جانتا تھا۔ کوئی اور نہیں تھا جس کی رائے پر میں زیادہ اعتبار کرتا یا اسے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ والٹر سے میں نے جو کچھ کہا' اس نے غور سے سنا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے چہرے پر بے چینی کے آثار ابھرے مگر اس نے تحمل سے کام لیا۔ اس نے کہا: ''اصولی طور پر میں مذاکرات کے خلاف نہیں ہوں لیکن میری خواہش تھی کہ بجائے اس کے کہ ہم حکومت سے بات چیت شروع کریں' حکومت ہم سے بات چیت شروع کرے۔''

میں نے جواب دیا کہ اگر وہ اصولی طور پر مذاکرات کے خلاف نہیں تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آغاز کس نے کیا؟ اہمیت اس بات کی ہے کہ حاصل کیا ہوا' یہ بات اہم نہیں کہ آغاز کس نے کیا۔ میں نے والٹر کو بتایا کہ میرا خیال ہے کہ ہمیں مذاکرات کی طرف قدم بڑھانا چاہیے اور اس بات کی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ کس نے پہلے دروازہ کھٹکھٹایا۔ والٹر نے دیکھا کہ میں ایک ذہن بنا چکا ہوں' چنانچہ اس نے کہا کہ وہ مجھے نہیں روکے گا مگر اسے امید ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس کے مضمرات سے آگاہ ہوں۔

دوسری ملاقات ریمونڈ امبلا با سے ہوئی۔ میں نے اسے والٹر ہی کی طرح تمام صورتحال سے آگاہ کیا۔ رے ہمیشہ سے کم گو آدمی تھا۔ میں نے جو کچھ کہا اس پر وہ کئی لمحے خاموش رہا۔ پھر اس نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور کہا: ''ماڈیبا! تم کس بات کا انتظار کر رہے ہو؟ ہمیں یہ کام برسوں پہلے شروع کر دینا چاہیے تھا۔'' اینڈریو ملانگینی کا ردعمل بھی رے جیسا تھا۔ آخری آدمی کیتھی تھا۔ اس کا جواب نفی میں تھا۔ وہ میرے موقف کے اتنا ہی شدید خلاف تھا جتنا ریمونڈ اور اینڈریو حامی تھے۔ اس نے والٹر سے بھی زیادہ شدت سے کہا کہ اس کے خیال میں مذاکرات کا ہماری طرف سے آغاز اس امر کو ظاہر کرے گا کہ ہم سر تسلیم خم کر رہے ہیں۔ والٹر کی طرح اس نے کہا کہ وہ اصولی طور پر مذاکرات کے خلاف نہیں اور میں نے اسے بھی وہی جواب دیا جو والٹر کو دیا تھا۔ لیکن کیتھی اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ اس کا خیال تھا میں غلط راستے پر جا رہا ہوں۔ لیکن اپنی غلط فہمیوں کے باوجود اس نے کہا کہ وہ میرے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔

آلیو ٹیمبو کا ردعمل

اس کے تھوڑا ہی عرصہ بعد آلیور کی طرف سے ایک نوٹ میرے ایک وکیل کے ذریعے اسمگل ہو کر مجھ تک پہنچا۔ اس کو اطلاعات ملی تھیں کہ میں حکومت سے خفیہ مذاکرات کر رہا تھا اور اسے اس پر تشویش تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ جانتا ہے میں کچھ عرصے سے تنہا اور اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ ہوں۔ وہ حیران ہو رہا ہوگا دیا پر کیا گزر رہی ہے؟ آلیور کا نوٹ مختصر اور کام کی بات تک محدود تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا میں حکومت سے مذاکرات کر رہا ہوں؟ آلیو اس پر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ میں بک رہا ہوں مگر اس نے یہ سوچا ہوگا کہ میں فیصلے کی غلطی کر رہا ہوں۔ دراصل اس کے نوٹ کا لہجہ اس کے اس خیال کی غمازی کرتا تھا۔

میں نے آلیور کو ایک بہت مختصر خط میں جواب دیا کہ میں حکومت سے صرف اور

صرف اس نکتے پر بات چیت کر رہا ہوں کہ اے این سی کی نیشنل ایگزیکٹو اور جنوبی افریقی حکومت کے مابین ایک ملاقات ہو۔ میں اس کی تفصیلات بیان نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے رابطے کے خفیہ رہنے پر اعتبار نہیں۔ میں نے صرف یہ کہا کہ ایسی گفت و شنید کا وقت آ گیا ہے اور میں کسی صورت میں پارٹی کے مفادات کی قیمت پر مفاہمت نہیں کروں گا۔

اگر چہ اے این سی کئی دہائیوں سے حکومت سے مذاکرات کا مطالبہ کر رہی تھی، ایسی بات چیت کے حقیقی امکانات کبھی سامنے نہیں آئے تھے۔ نظریاتی طور پر مذاکرات پر غور کرنا اور بات ہے اور ان میں شرکت کرنا بالکل اور بات۔ جب میں آلیور کے نام اپنا جواب لکھ رہا تھا، میں پی ڈبلیو بوتھا کے نام اپنی یادداشت کا مسودہ تیار کرنے کا آغاز بھی کر رہا تھا۔ میں اس امر کو یقینی بنانا چاہتا تھا کہ آلیور یہ بھی جان لے۔ میں جانتا تھا کہ جب آلیور اور نیشنل ایگزیکٹو میری یادداشت پڑھیں گے تو ان کے یہ خدشات کہ میں راہ راست سے ہٹ گیا ہوں، دور ہو جائیں گے۔

"دشمن"۔۔۔ مذاکرات کی میز پر

خفیہ ورکنگ گروپ کی پہلی رسمی ملاقات مئی 1988ء میں پولس مور کے نفیس آفیسرز کلب میں ہوئی۔ میں کوٹسی اور ولمز کو جانتا تھا مگر وان ڈر مروی اور ڈاکٹر برنارڈ سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ وان ڈر مروی ایک خاموش طبع اور منصف مزاج شخص تھا جو صرف اس وقت لب کشائی کرتا جب اسے کوئی اہم بات کہنی ہوتی۔ ڈاکٹر برنارڈ پینتیس چھتیس کے پیٹے میں تھا اور منضبط ذہانت اور ضبط نفس والا روشن فکر آدمی تھا۔

ابتدائی ملاقات خاصی کشیدہ رہی مگر بعد کی ملاقاتوں میں ہم زیادہ کھل کر اور براہ راست گفتگو کرتے رہے۔ چند ماہ میں ان سے تقریباً ہر ہفتے ملتا رہا۔ پھر ملاقاتیں بے قاعدہ وقفوں سے ہونے لگیں، بعض اوقات مہینوں ملاقات نہ ہوتی اور پھر

اچانک ہر ہفتے ہم مل بیٹھتے۔ ملاقاتوں کا شیڈول عموماً حکومت کی طرف سے بنتا مگر کبھی کبھار میں ایک ملاقات کی درخواست کرتا۔

ہماری ابتدائی ملاقاتوں کے دوران مجھے پتہ چلا کہ ڈاکٹر برنارڈ کے استثناء کے سوا میرے نئے ساتھی اے این سی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ وہ سب شائستہ افریکنر تھے اور اپنی ساری گوری برادری سے کہیں زیادہ فراخ دل تھے۔ لیکن وہ پروپیگنڈے کا اس قدر شکار تھے کہ بعض حقائق کے متعلق ان کا ذہن صاف کرنا ضروری تھا حتیٰ کہ ڈاکٹر برنارڈ جنہوں نے اے این سی کا مطالعہ کیا تھا' ان کی بیشتر معلومات بھی پولیس اور انٹیلی جنس کی فائلوں پر مبنی تھیں جو بڑی حد تک غیر صحیح اور ان افراد کے تعصبات سے آلودہ تھیں جنہوں نے انہیں تیار کیا تھا۔ ظاہر ہے وہ ان فائلوں کو پڑھ کر ان تعصّبات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

میں نے کچھ وقت اے این سی کی تاریخ کا خاکہ پیش کرنے میں صرف کیا۔ پھر ان بنیادی معاملات پر اپنی پوزیشن کی وضاحت کی جنہوں نے حکومت اور اے این سی میں خلیج پیدا کر رکھی تھی۔ ان شروعات کے بعد ہم نے نازک مسائل پر اپنی توجہ مبذول کی۔ مسلح جدوجہد' اے این سی کا کمیونسٹ پارٹی سے اتحاد' اکثریتی حکمرانی کا ہدف اور نسلی مفاہمت کا تصور۔

پہلا مسئلہ جو اٹھایا گیا وہ کئی لحاظ سے پیچیدہ تھا اور وہ تھا مسلح جدوجہد۔ ہم نے اس پر گفتگو میں کئی ماہ صرف کیے۔ ان کا اصرار تھا کہ اے این سی کو تشدد سے دست بردار ہونا چاہیے اور حکومت کے مذاکرات سے متفق ہونے سے پہلے مسلح جدوجہد ترک کر دینی چاہیے اور اس کے بعد ہی صدر بوتھا سے میری ملاقات ہو سکتی ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ تشدد مجرمانہ رویئے کے سوا کچھ نہیں اور حکومت اسے برداشت نہیں کر سکتی۔

میں نے جواب دیا کہ تشدد کی ذمے دار حکومت ہے اور یہ کہ وہ ہمیشہ ظالم ہوتی ہے' مظلوم نہیں اور وہی جدوجہد کا رخ متعین کرتی ہے۔ اگر ظالم تشدد بروئے کار لائے تو

مظلوم کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ شدت سے جواب دے۔ ہمارے معاملے میں یہ صرف ذاتی دفاع کی ایک شکل ہے۔ میں نے برملا کہا کہ اگر حکومت پر امن ذرائع استعمال کرنے کا فیصلہ کر لے تو اے این سی بھی پر امن ذرائع اپنا لے گی۔ میں نے کہا: ''اب یہ آپ کا کام ہے' ہمارا نہیں کہ تشدد سے دست برداری کا اعلان کریں۔''

میرا خیال ہے میں نے اس نکتے پر ان کی تفہیم کو آگے بڑھایا تھا مگر جلد ہی معاملہ فلسفیانہ سوال سے اس کی عملی شکل تک پہنچ گیا۔ جیسا کہ وزیر کوئٹسی اور ڈاکٹر برنارڈ نے توجہ دلائی' نیشنل پارٹی نے بار بار کہا تھا کہ وہ کسی ایسی تنظیم سے مذاکرات نہیں کرے گی جو تشدد کی علمبردار ہو لہذا اب وہ اپنا اعتبار کھوئے بغیر اچانک کس طرح اے این سی سے مذاکرات کا اعلان کر سکتی ہے؟ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے مذاکرات شروع کرنے سے پہلے اے این سی کو کوئی مفاہمت کر لینی چاہیے تاکہ حکومت کا اپنے عوام کے سامنے بھرم رہ جائے۔

میں گوروں کی شکل کیوں حل کروں؟

یہ نکتہ قابل غور تھا اور اسے میں بخوبی سمجھتا تھا مگر میں نے انہیں اس مشکل سے نکالنے کی کوئی پیشکش نہ کی۔ میں نے کہا: ''جنٹل مین! یہ میرا کام نہیں کہ آپ کی اس مشکل کو حل کروں۔'' میں نے ان سے صرف یہ کہا کہ انہیں اپنے عوام کو بتانا چاہیے کہ اے این سی کے ساتھ مذاکرات کی میز پر بیٹھے بغیر جنوبی افریقہ میں امن ہو سکتا ہے نہ ملکی صورتحال کا کوئی اور حل ممکن ہے۔ ''لوگ سمجھ جائیں گے۔'' میں نے کہا۔

اے این سی کا کمیونسٹ پارٹی سے اتحاد بھی ان کے لیے اتنا ہی تکلیف دہ محسوس ہوتا تھا جتنی کے مسلح جدوجہد۔ نیشنل پارٹی عشرہ 1950ء کے سرد جنگ کے نظریئے سے سختی سے چمٹی ہوئی تھی اور وہ سوویت یونین کو شیطانی سلطنت اور کمیونزم کو شیطانی کام قرار دیتی تھی۔ کوئی چیز ایسی نہ تھی جو انہیں اس تصور سے ہٹا سکے۔ وہ کہتے تھے کہ

کمیونسٹ پارٹی اے این سی پر حاوی اور اسے کنٹرول کرتی ہے اور یہ کہ مذاکرات شروع کرنے کے لیے ہمیں کمیونسٹ پارٹی سے الگ ہو جانا چاہیے۔

میں نے کہا سب سے پہلی بات یہ ہے کہ کوئی عزت نفس سے بہرہ ور مجاہد آزادی حکومت کے احکام پر نہیں چلے گا جس کے خلاف وہ لڑ رہا ہے اور نہ وہ اپنے دشمن کو خوش کرنے کے لیے اپنے دیرینہ اتحادی کو دھتکار سکتا ہے۔ پھر میں نے واضح کیا کہ کمیونسٹ پارٹی اور اے این سی جداگانہ اور ایک دوسری سے ممیز تنظیمیں ہیں جو یکساں مختصر مدت کے مشترک مقاصد رکھتی ہیں یعنی نسلی ظلم و ستم کا خاتمہ اور غیر نسلی جنوبی افریقہ کا قیام' مگر ہمارے طویل مدت کے مفادات یکساں نہیں۔

گفت و شنید مہینوں چلتی رہی۔ بیشتر افریکروں کی طرح وہ سمجھتے تھے کہ چونکہ اے این سی میں کئی کمیونسٹ گورے یا ہندوستانی تھے' اس لیے وہ اس تنظیم کے کالوں کو کنٹرول کر رہے تھے۔ میں نے کئی مواقع کا حوالہ دیا جب اے این سی اور سی پی میں پالیسی پر اختلاف ہوا تھا اور اے این سی غالب رہی تھی لیکن اس بات نے بظاہر انہیں متاثر نہ کیا۔ آخر کار میں نے برانگیختہ ہو کر کہا: ''تم جنٹل مین خود کو ذہین خیال کرتے ہو' کیا نہیں؟ تم خود قوی اور دوسروں کو ترغیب دینے والے خیال کرتے ہو' کیا نہیں؟ اچھا' تو تم چار ہو اور میں اکیلا اگر تم مجھ پر کنٹرول کر سکتے ہو نہ میرا ذہن تبدیل کر سکتے ہو۔ پھر تم کس لیے یہ سوچتے ہو کہ جہاں تم ناکام ہو گئے ہو' وہاں کمیونسٹ کامیاب ہو سکتے ہیں۔''

ہم تمہیں سمندر میں نہیں دھکیلیں گے

انہیں قومیانے کے تصور کے متعلق بھی تشویش تھی اور ان کا اصرار تھا کہ اے این سی اور فریڈم چارٹر جنوبی افریقہ میں اجتماعی طور پر قومیانے کی حمایت کرتے ہیں۔ میں نے واضح کیا کہ ہم بعض صنعتوں کے منافع کی زیادہ یکساں تقسیم کے حق میں ہیں' وہ صنعتیں جہاں پہلے ہی اجارہ داریاں ہیں اور یہ کہ قومیانے کا کام صنعتوں کے بعض

شعبوں میں عمل میں آئے گا۔ لیکن میں نے انہیں اپنے ایک مضمون کی طرف توجہ دلائی جو 1956 ء میں ''لبریشن'' کے لیے لکھا تھا اور جس میں' میں نے کہا تھا کہ فریڈم چارٹر سوشلزم کا بلیو پرنٹ نہیں بلکہ افریقی انداز کی سرمایہ کاری کا خاکہ ہے۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں نے اس وقت سے اپنا ذہن تبدیل نہیں کیا

گفت وشنید کا دوسرا بڑا مسئلہ اکثریتی حکمرانی کا مسئلہ تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اکثریت کی حکومت قائم ہوگئی تو اقلیتوں کے حقوق غصب کر لیے جائیں گے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ گوری اکثریت کے حقوق کا تحفظ کیسے کیا جائے گا؟ میں نے کہا کہ جنوبی افریقہ کی تاریخ میں اے این سی سے بڑھ کر کوئی تنظیم نہیں جس نے جنوبی افریقہ کے سارے عوام اور نسلوں کو متحد کرنے کی کوشش کی ہو۔ میں نے انہیں فریڈم چارٹر کے دیباچے کی طرف توجہ دلائی: ''جنوبی افریقہ ان سب کی ملکیت ہے جو اس میں رہتے ہیں' کالے اور گورے۔'' میں نے انہیں بتایا کہ گورے بھی افریقی ہیں اور یہ کہ مستقبل کے کسی بھی سانچے میں اکثریت کو اقلیت کی ضرورت رہے گی۔ ''ہم تمہیں سمندر میں دھکیلنا نہیں چاہتے۔'' میں نے کہا۔

آلیور کا دوٹوک اعلان

ان ملاقاتوں کا مثبت نتیجہ نکلا۔ 1988 ء کی سردیوں میں مجھے بتایا گیا کہ صدر بوتھا اگست کے آخری میں مجھ سے ملنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ ملک ہنوز افراتفری میں تھا۔ حکومت نے 1987 ء اور پھر 1988 ء میں ہنگامی حالت دوبارہ نافذ کر دی تھی۔ بین الاقوامی دباؤ بڑھ گیا تھا۔ کئی اور کمپنیاں جنوبی افریقہ سے چلی گئی تھیں۔ امریکی کانگریس نے وسیع پابندیوں کا ایک بل منظور کرلیا تھا۔

1987 ء میں اے این سی نے اپنی پچھترویں سالگرہ منائی اور سال کے آخر میں تنزانیہ میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں پچاس سے زیادہ اقوام کے مندوبین شریک ہوئے۔ آلیور نے اعلان کیا کہ جب تک حکومت نسلی امتیاز کے خاتمے پر

مذاکرات کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی، مسلح جدوجہد شدید تر ہوتی جائے گی۔ دو سال پہلے فریڈم چارٹر کی تیسویں سالگرہ کے موقع پر زیمبیا میں اے این سی کی کابومے کانفرنس میں دوسری نسلوں کے افراد پہلی بار نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن چنے گئے تھے اور این ای سی (نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی) نے اس عزم کا اعلان کیا تھا کہ حکومت سے اس وقت تک کوئی مذاکرات نہیں کیے جا سکتے جب تک اے این سی کے تمام رہنما جیلوں سے رہا نہیں کیے جاتے۔

اگرچہ تشدد کا سلسلہ ابھی جاری تھا، نیشنل پارٹی کبھی مضبوط تر نہیں ہوئی تھی۔ مئی 1987ء کے گوروں کے عام انتخابات میں نیشنل سٹوں کو غالب اکثریت حاصل ہوگئی۔ بدتر یہ کہ آزاد خیال پروگیسو فیڈرل پارٹی کی جگہ کنزرویٹو پارٹی نے سرکاری اپوزیشن کی حیثیت اختیار کر لی تھی جو نیشنل سٹوں کا دایاں بازو تھی اور اس نے انتخابی مہم ہی اس تصور پر چلائی تھی کہ حکومت کالی اپوزیشن سے بہت نرمی کا برتاؤ کر رہی ہے۔

خفیہ بات چیت کے متعلق میری پرامیدی کے باوجود یہ ایک مشکل وقت تھا۔ ونی نے حال ہی میں ایک ملاقات میں مجھے بتایا تھا کہ نمبر 8115 آرلینڈو ویسٹ، یعنی وہ مکان جہاں ہماری شادی ہوئی تھی اور جسے میں اپنا گھر سمجھتا تھا، جلا دیا گیا ہے۔ ہمارا قیمتی خاندانی ریکارڈ، تصویریں، محفوظ کاغذات حتیٰ کہ ہماری شادی کے کیک کا ٹکڑا جو ونی میری رہائی کے لیے سنبھالے ہوئے تھی، سب ضائع ہوگیا۔ میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ کسی دن جب میں جیل سے باہر ہوں گا، ان تصویروں اور خطوط کو دیکھ کر ماضی کی یادیں تازہ کر دکوں گا مگر اب وہ سب کچھ کھو گیا تھا۔ جیل نے مجھے میری آزادی سے محروم کیا تھا، میری یادوں سے نہیں، مگر اب میں محسوس کرتا تھا کہ تحریک آزادی کے بعض دشمنوں نے مجھے ان سے بھی محروم کرنے کی کوشش کی تھی۔

نرس دہشت زدہ ہوگئی

میں ان دنوں کھانسی میں بھی مبتلا تھا جس سے چھٹکارا ملتا نظر نہیں آتا تھا، چنانچہ

میں اکثر اتنی کمزوری محسوس کرتا کہ ورزش نہ کر سکتا۔ میں نے اپنی کوٹھڑی کو سیلن کے بارے میں بار بار شکایت کی تھی مگر اس کے بارے میں کچھ نہیں کیا گیا تھا۔ ایک روز احاطہ ملاقات میں اپنے وکیل اسماعیل ایوب سے ملاقات کے دوران میں نے متلی محسوس کی اور مجھے قے آ گئی۔ مجھے واپس کوٹھڑی میں لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے میرا معاینہ کیا اور میں جلد ٹھیک ہو گیا۔ تاہم چند روز گزرے ڈنر کے بعد میں اپنی کوٹھڑی میں تھا جب بہت سے وارڈر اور ایک ڈاکٹر آ پہنچے۔ ڈاکٹر نے میرا سرسری معاینہ کیا اور پھر ایک وارڈر نے مجھ سے کہا کہ کپڑے پہن لوں۔ ''ہم تمھیں کیپ ٹاؤن میں ہسپتال لے جا رہے ہیں۔'' مجھے بتایا گیا سیکورٹی سخت تھی۔ میں کاروں اور فوجی گاڑیوں کے ایک کانوائے میں گیا اور کم از کم ایک درجن وارڈر ہمراہ تھے۔

کمرۂ معاینہ میں ایک میز پر بیٹھے ہوئے میرا ایک نوجوان اور خوش مزاج داکٹر نے معاینہ کیا جو یونیورسٹی میڈیکل سکول میں فرو فیسر بھی تھا۔ اس نے میرا گلہ دیکھا میری چھاتی بجا کر دیکھی، خون کے نمونے کے لیے اور پھر جلد ہی مجھے تندرست قرار دے دیا۔ ''آپ کو کوئی عارضہ نہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''ہم آپ کو کل فارغ کر دیں گے۔'' میں فکرمند تھا کہیں حکومت سے میری گفت وشنید متاثر نہ ہو جائے، لہٰذا اس کی تشخیص پر مجھے خوشی ہوئی۔

معاینہ کے بعد داکٹر نے مجھ سے پوچھا کیا میں چائے پیوں گا۔ میں نے کہا پیوں گا اور پھر چند منٹ بعد ایک رنگ دار نرس ایک ٹرے لیے آئی۔ وہاں مسلح فوجیوں اور وارڈروں کی موجودگی سے وہ اس قدر خوفزدہ ہوئی کہ اس نے ٹرے میرے بستر پر الٹا دی، چائے گر گئی اور وہ تیزی سے باہر چلی گئی۔

میرے پھیپھڑوں میں پانی؟

میں نے رات خالی وارڈ میں سخت پہرے کے تحت گزاری۔ اگلی صبح میرے ناشتہ کرنے سے بھی پہلے ایک بڑی عمر کا داکٹر آ دھمکا جو ہسپتال میں انٹرنل میڈیسن کا ہیڈ

تھا۔ وہ ایک بے تکا شخص تھا اور پچھلی رات والے خوش مزاج ڈاکٹر کی نسبت تیمارداری کے آداب سے کہیں کم آگاہ تھا۔ اس نے ابتدائی پوچھ تاچھ کے بغیر ہی میری چھاتی کھردرے پن سے ٹھونک بجا کر دیکھی اور پھر ترش روئی سے بولا: ''تمہارے پھیپھڑوں میں پانی ہے۔'' میں نے اسے بتایا کہ گزشتہ روز ڈاکٹر نے ٹیسٹ کیے تھے اور کہا تھا کہ میں تندرست ہوں۔ اس نے قدرے غضبناک ہو کر کہا: ''منڈیلا! اپنی چھاتی پر نگاہ ڈالو۔'' اس کا کہنا تھا کہ میری ایک طرف چھاتی دوسری طرف سے بالفعل بڑی ہے اور غالباً یہ پانی سے بھری ہوئی ہے۔

اس نے ایک نرس سے کہا کہ ایک سرنج لائے۔ سرنج آئی تو وہ اس نے فوراً ہی میری چھاتی میں گھسیڑ دی اور کچھ بھورا سا مواد باہر نکالا۔ ''کیا تم نے ناشتہ کیا ہے؟'' میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس نے کہا: ''اچھا' ہم تمہیں ابھی آپریشن تھیٹر میں لے جا رہے ہیں۔'' اس نے مجھے بتایا کہ میرے پھیپھڑوں پر بہت سا سیال جمع ہو گیا ہے اور وہ اسے باہر نکالنا چاہتا ہے۔

آپریٹنگ روم میں مجھے بے ہوش کیا گیا اور اگلی بات جو مجھے یاد ہے وہ بس اتنی ہے کہ ایک کمرے میں میری آنکھ کھلی جہاں قریب ڈاکٹر موجود تھا۔ میں غنودگی کی حالت میں تھا مگر میں نے ڈاکٹر کو یہ کہتے سنا کہ اس نے میری چھاتی سے دو لٹر سیال نکال دیا ہے جب اس مائع کا تجزیہ کیا گیا تو تپ دق کی تشخیص ہوئی۔ اس کا کہنا تھا کہ مرض بہت ابتدائی مرحلے میں تھا اور اس سے پھیپھڑے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس نے کہا اگرچہ بھرپور تپ دق کا علاج ہونے میں عموماً چھ ماہ لگتے ہیں مگر میں دو ماہ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ ڈاکٹر نے اس سے اتفاق کیا کہ غالباً یہ کوٹھڑی کی سیلن تھی جس نے بیماری کو جڑ پکڑنے میں مدد دی تھی۔

''آج میں مرنے کو تیار ہوں''

میں نے اگلے چھ ماہ ٹائیگر برگ میں علاج کرانے اور تندرست ہونے میں

گزارے۔ دسمبر میں مجھے کانسٹین ٹیابرگ کلینک منتقل کر دیا گیا جو پولس مور کے نزدیک ایک پر تکلف شفاخانہ تھا اور جہاں پہلے کبھی کوئی سیاہ فام مریض داخل نہیں کیا گیا تھا۔ وہاں صبح سویرے ہی کوبائی کوئٹسی ملنے آ گیا جس کے ہمراہ میجر ماریاس ڈپٹی کمانڈر تھا جو میری دیکھ بھال کا ذمے دار تھا۔ ہم نے سلام کا تبادلہ کیا ہی تھا کہ اردلی میرا ناشتا لے کر آ گیا۔

میری حالیہ بیماری اور میری ہائی بلڈ پریشر کی ہسٹری کے باعث مجھے کم کولسٹرول والی غذا دی جا رہی تھی۔ یہ حکم بظاہر ابھی کلینک کے کچن تک نہیں پہنچا تھا کیونکہ ناشتے کی ٹرے میں تلے ہوئے انڈے، نمکین لحم خنزیر کے تین تلے اور مکھن لگے توس کے کئی ٹکڑے موجود تھے۔ مجھے یاد نہ آ سکا کہ میں نے آخری مرتبہ کب لحم خنزیر اور انڈے چکھے تھے اور مجھے ان سے رغبت تھی۔ جب میں انڈے کا ایک لذیذ لقمہ لینے والا تھا، عین اس وقت میجر ماریاس بول اٹھا: ''نہیں منڈیلا! یہ تمہارے معالج کے حکم کی خلاف ورزی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹرے اٹھانی چاہی مگر میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا اور کہا: ''میجر! مجھے افسوس ہے اگر یہ ناشتا مجھے مار دالے گا تو آج میں مرنے کو تیار ہوں۔''

ایک بار جب میں کانسٹین ٹیابرگ میں سکون پذیر ہو گیا تو کوبائی کوئٹسی اور خفیہ کمیٹی سے پھر ملاقاتیں کرنے لگا۔ ابھی میں اسی کلینک میں تھا جب کوئٹسی نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھا ایک ایسی حالت میں رکھنا چاہتا ہے جو قید و بند اور آزادی کے بین بین ہو۔ اگرچہ اس نے وضاحت نہ کی کہ اس سے اس کا مطلب کیا ہے مگر اس نے جو کچھ کہا تھا اس کے متعلق میرے ذہن میں ایک خیال کرتا مگر میں جانتا تھا کہ یہ اس سمت میں ایک قدم ہوگا۔

اس دوران میں کلینک بہت آرام دہ تھا اور یہاں پہلی مرتبہ میں نے اسپتال میں صحت یابی سے لطف اٹھایا۔ نرسیں گوری یا رنگ دار تھیں؛ کالی نرسیں یہاں ممنوع

تھیں۔ان نرسوں نے میری عادتیں خراب کر دیں۔وہ زائد سویٹ ڈشیں اور تکیے لاتی رہتیں اور اپنے اوقات ختم ہونے کے بعد بھی مجھے دیکھنے چلی آتیں۔

ایک دن ایک نرس نے آ کر مجھ سے کہا: ''منڈیلا! آج ہم ایک پارٹی کر رہے ہیں اور ہم چاہتی ہیں کہ آپ بھی اس میں شریک ہوں۔''میں نے کہا کہ مجھے اس میں شرکت کر کے اعزاز حاصل ہوگا مگر بلا شبہ حکام اس کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے۔جیل حکام نے مجھے شرکت کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔نرسوں نے اس کا برا مانا اور اپنی پارٹی میرے کمرے میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ان کا اصرار تھا کہ وہ میرے بغیر پارٹی منعقد نہیں کریں گی۔

اس رات درجن کے لگ بھگ نوجوان خواتین پارٹی فراکس پہنے کیک لذیذ مشروب ''پنچ''اور تحفوں کے ساتھ میرے کمرے کے باہر آن وارد ہوئیں۔گارڈ بظاہر پریشان تھے مگر یہ شگفتہ خاطر نوجوان خواتین ان کے نزدیک کوئی سیکورٹی رسک نہ تھیں۔درحقیقت جب ایک سپاہی نے کچھ نرسوں کو میرے کمرے میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کی تو میں نے مذاق کرتے ہوئے اسے الزام دیا کہ وہ حسد کرنے لگا ہے کیونکہ اتنی خوبصورت نوجوان خواتین سے ایک بوڑھے کو اس قدر توجہ مل رہی ہے۔

وکٹر ورسٹر کے سنہری پنجرے میں

دسمبر 1988ء کے اوائل میں میری کوٹھڑی پر سیکورٹی سخت کر دی گئی اور ڈیوٹی پر موجود افسران پہلے سے زیادہ چوکس ہو گئے۔کوئی تبدیلی ناگزیر تھی۔9 دسمبر کی شام کو میجر ماریاس میرے کمرے میں آئے اور مجھے روانگی کے لیے تیاری کرنے کو کہا''کہاں جانا ہے؟''میں نے پوچھا۔اس نے کچھ نہ کہا۔میں نے اپنی چیزیں پیک کیں اور باوفا نرسوں کو ادھر ادھر دیکھا مگر ان میں سے کوئی نہ تھی۔مجھے یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ میں ان کا شکریہ ادا کرنے اور انہیں الوداع کہنے کے قابل بھی نہیں۔

ہم جلدی میں روانہ ہوئے اور سڑک پر ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ایک جیل میں داخل ہوئے جس کا نام میں نے پہچان لیا: وکٹر ورسٹر۔ پارل کے خوبصورت پرانے کیپ ڈچ ٹاؤن میں یہ جیل کیپ ٹاؤن کے پینتیس میل شمال مشرق صوبے کے تاکستانی علاقے میں واقع ہے۔ اس جیل کی شہرت ایک ماڈل جیل کی سی تھی۔ ہماری گاڑی اس کے اندر چلتی گئی اور پھر ایک بل کھاتی کچی سڑک پر قدرے جنگلی، درختوں سے اٹے علاقے میں سے گزر کر عقبی حصے میں سفید کیے ہوئے ایک تنہا ایک منزلہ ''کوٹھڑے'' کے سامنے جارکی۔ کوٹھڑے کے گرد کنکریٹ کی دیوار تھی اور وہ صنوبر کے اونچے اونچے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔

بندر اور مکڑیوں کے ساتھ ساتھ

میجر مار یاس مجھے مکان کے اندر لے گیا۔ اس میں ایک کھلا لاؤنج اور ایک بڑا باورچی خانہ تھا اور عقب میں اسے بھی بڑا ایک بیڈروم، فرنیچر کم اور آرام دہ تھا۔ میری آمد سے پہلے اس کی صفائی کی گئی تھی نہ جھاڑو پھیری گئی تھی اور بیڈروم اور بیٹھک ہر قسم کے اجنبی کیڑوں، حشرات، بندر، مکڑیوں اور دیگر جانوروں سے بھرے پڑے تھے جن میں بعض میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اس رات میں نے کیڑوں کو بستر اور کھڑکی کی دہلیز سے پرے ہٹایا اور اپنے اس نئے گھر میں ڈٹ کر سویا۔

اگلی صبح میں نے اپنی نئی رہائش گاہ کا جائزہ لیا تو عقبی صحن میں ایک سوئمنگ پول اور دو چھوٹے بیڈروم دریافت ہوئے۔ میں نے باہر چل پھر کر دیکھا اور ان درختوں کی تعریف کی جو مکان پر سایہ کیے ہوئے اور اسے ٹھنڈا رکھتے تھے۔ یہ ساری جگہ ہٹ کر اور الگ تھلگ محسوس ہوتی تھی۔ واحد شے جو دیہی فضا کو خراب کر رہی تھی، یہ تھی کہ دیواروں پر خاردار تار لگے تھے اور مکان کے صدر دروازے پر گارڈ پہرہ دے رہے تھے۔ پھر بھی یہ جگہ اور ماحول پیارا تھا، ایک ایسا مکان جو قید اور آزادی کے بین

بین تھا۔

اس سہ پہر کو بائی کوٹسی نے مجھ سے ملاقات کو جو تحفے کے طور پر میرے لیے کیپ کی شراب کا ایک ڈبہ لایا۔ ایک جیلر اپنے قیدی کے لیے ایسا تحفہ لائے، اس کی ستم ظریفی ہم دونوں پر عیاں تھی۔ وہ بہت خیر خواہ تھا اور یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ میں اپنے نئے گھر کو پسند کرتا ہوں۔ اس نے مکان کا خود جائزہ لیا اور واحد سفارش یہ کی کہ مکان کی بیرونی دیواریں اونچی کر دی جائیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا مقصد میری نجی زندگی کا تحفظ تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وکٹر ورسٹر کا یہ مکان میرے آزاد ہونے سے پہلے قید میں میرا آخری ٹھکانہ ہوگا۔ اس کے بقول اس اقدام کا سبب یہ تھا کہ میرے پاس ایسا مسکن ہونا چاہیے جہاں میں نجی سطح پر اور آرام سے مذاکرات کر سکوں۔

اس کوٹھڑے نے واقع آزادی کا تاثر دیا۔ میں حسب خواہش سو اور جاگ سکتا تھا، جب چاہتا تیر سکتا تھا، اور جب بھوک لگتی کھا سکتا تھا یہ سب احساسات پر لطف تھے۔ حسب خواہش باہر نکلنے اور سیر کرنے میں نجی شان ہویدا تھی۔ کھڑکیوں میں سلاخیں نہیں تھیں، چھنچھناتی چابیاں نہیں تھیں اور مقفل ہوتے اور کھلتے دروازے نہیں تھے۔ یہ سب کچھ خوشگوار تھا مگر میں کبھی نہیں بھولا کہ یہ ایک سنہری پنجرہ تھا۔

میرا خوش طبع گورا باورچی

جیل والوں نے مجھے ایک باورچی فراہم کر دیا، وارنٹ آفیسر سوارٹ، یہ ایک بالا قد خاموش افریکنز تھا جو کبھی جزیرہ روبن پر وارڈر رہ چکا تھا۔ مجھے وہ یاد نہیں تھا مگر اس نے بتایا کہ وہ کبھی کبھی ہمیں ٹرک پر کان تک لے جاتا تھا اور دانستہ ٹرک کو اونچی اونیچی زمین پر سے گزارتا تھا تاکہ ہمیں پہاڑی جھٹکوں کا احساس ہو۔ اس نے جھینپتے ہوئے کہا: ''میں نے تم سے یہ سلوک کیا تھا'' اور میں ہنس دیا۔ وہ ایک نفیس خوش مزاج شخص تھا جس میں تعصب نام کو نہ تھا اور وہ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح

لگنے لگا۔

وہ صبح 7 بجے آ پہنچا اور 4 بجے رخصت ہو جاتا۔ وہ میرے لیے ناشتا ظہرانہ اور عشائیہ تیار کرتا۔ میرے معالج نے میرے لیے غذا متعین کر دی تھی اور وہ میرا کھانا تیار کرتے ہوئے اس کی پابندی کرتا تھا۔ وہ ایک من موہنا باورچی تھا اور جب وہ گھر جاتا' میرا رات کا کھانا مائیکرو اوون میں گرم رہنے کے لیے رکھ جاتا اور یہ ایجاد میرے لیے ایک نئی شے تھی۔

وارنٹ آفیسر سٹارٹ ڈبل روٹی پکاتا' خانہ ساز ادرک ملی جو کی شراب تیار کرتا اور دیگر مزے مزے کے کھانے بناتا۔ جب میرے ملاقاتی آتے' جن کی تعداد روز افزوں تھی' وہ چیدہ کھانے تیار کرتا۔ وہ ہمیشہ کھانوں کی تعریف کرتے اور میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ میرے باورچی ہر میرے سب ملاقاتی رشک کرتے تھے جب حکومت نے میرے اے این سی کے بعض ساتھیوں اور ایم ڈی ایم اور یو ڈی ایف کے ارکان کو مجھ سے ملاقات کی اجازت دینی شروع کی تو میں انہیں ''الزام'' دینے لگا کہ وہ صرف مزے مزے کے کھانے کھانے آتے ہیں۔

ایک روز مسٹر سوارٹ کا تیار کردہ مزیدار کھانا کھانے کے بعد میں باورچی خنے برتن دھونے گیا۔ ''نہیں'' اس نے کہا۔ ''یہ میری ذمے داری ہے۔ آپ واپس نشست گاہ میں چلے جائیں۔'' میں نے اصرار کیا کہ مجھے بھی کچھ نہ کچھ کرنا ہے اور جب وہ کھانا پکاتا ہے تو میرے لیے عین منصفانہ بات ہے کہ میں برتن صاف کر دالوں۔ مسٹر سوارٹ نے اس پر احتجاج کیا مگر آخر کار اس نے ہار مان لی۔ اس نے اس امر پر بھی اعتراض کیا کہ میں صبح کو اپنا بستر تہہ کروں۔ اس کا کہنا تھا کہ ایسا کرنا اس کی ذمے داری ہے۔ لیکن میں اتنے عرصے سے اپنا بستر بچھاتا اور تہہ کرتا آ رہا تھا کہ یہ میری عادت ثانیہ بن گئی تھی۔

ہم نے ایک اور انداز سے بھی حمایت ادل بدل کی۔ کئی افریکان بولنے والے

وارڈروں کی طرح وہ اپنی انگریزی بہتر بنانا چاہتا تھا اور میں ہمیشہ اپنی افریکان بہتر بنانے کی تلاش میں رہتا تھا۔ ہم نے باہم سمجھوتہ کرلیا وہ مجھ سے انگریزی میں بات کرے گا اور میں افریکان میں جواب دوں گا اور اس طرح ہم دونوں اس زبان کی مشق کرنے لگے جس میں ہم کمزور ترین تھے۔

میں کبھی کبھی اس سے کہتا کہ کوئی خاص کھانا تیار کرے۔ بعض اوقات میں مکئی کے دلیے اور لوبیا کی فرمائش کرتا جو میں لڑکپن میں کھایا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے پوچھا: ''تم جانتے ہو کہ میری خواہش ہے کہ تم مجھے کچھ بھورے چاول پکا دو۔'' میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے پوچھا ''بھورے چاول کیا ہوتے ہیں؟'' سوارٹ ایک نوجوان آدمی تھا۔ میں نے وضاحت کی کہ بھورے چاول غیر مصطفیٰ ہوتے ہیں جو ہم جنگ کے دوران کھایا کرتے تھے جب سفید چاول دستیاب نہیں تھے۔ میں نے کہا کہ یہ سفید چاولوں سے کہیں زیادہ غذائیت بخش ہوتے ہیں۔ وہ شک میں رہا مگر میرے لیے اس نے کچھ چاول ڈھونڈ لیے۔ وہ اس نے پکائے اور میں نے مزے سے کھائے۔ لیکن مسٹر سوارٹ کو ان کا ذائقہ پسند نہ آیا اور اس نے طے کرلیا کہ اگر میں نے دوبارہ ان کی خواہش کی تو وہ مجھے خود پکانے پڑیں گے۔

میزبانی تین مہمانوں کی

اگرچہ میں مے نوش نہیں تھا مگر میں ایک اچھا میزبان بننا اور اپنے مہمانوں کو شراب پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنے مہمانوں کو یہ احساس دلانے کے لیے کہ وہ اجنبیت محسوس نہ کریں ایک آدھ چسکی لے لیتا مگر واحد شراب جسے میرا معدہ قبول کر سکتا ہے' جنوبی افریقہ کی ''نیم شیریں'' شراب ہے جو دراصل بہت میٹھی ہوتی ہے۔

ایک مہمانوں کی آمد سے پہلے میں نے مسٹر سوارٹ سے کہا کہ وہ نیڈربرگ وائن کی ایک خاص قسم فراہم کرے جسے میں پہلے چکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ یہ نیم شیریں ہے۔ ایک روز میرے دوست اور وکیل عبداللہ عمر' جارج بیزوس اور اسماعیل ایوب

میرے ہاں ظہرانے پر متوقع تھے۔ میں نے مسٹر سوارٹ۔ کہا کہ وہ کچھ شراب خرید لائے کیونکہ جارج بیزوس کو جو ایک مسلمان نہیں' کھانے کے ساتھ اس کی طلب ہو گی۔ میں نے دیکھا کہ میری اس بات پر اس نے برا سا منہ بنایا۔ میں نے پوچھا کے اس میں خرابی کیا ہے۔

''مسٹر منڈیلا! میں ہمیشہ یہ شراب تمہارے لیے خریدتا ہوں کیونکہ یہ تمہاری طلب ہے لیکن یہ سستی شراب ہے اور بہت نفیس نہیں۔'' میں نے سے یاد دلایا کہ میں خشک شرابیں پسند نہیں کرتا اور مجھے یقین ہے کہ جارج یہ فرق بیان نہیں کر سکتا۔ مسٹر سوارٹ اس پر مسکرایا اور اس نے ایک درمیانی راہ تجویز کی۔ وہ باہر جا کر دو بوتلیں خرید لائے گا' ایک خشک شراب اور دوسری میری نیڈر برگ' اور پھر میرے مہمان سے پوچھے گا کہ اس کی پسند کون سی ہے۔ میں نے کہا: ''ٹھیک ہے' تمہارا تجربہ آزما لیتے ہیں۔''

جب ہم چاروں ظہرانے کے لیے بیٹھے' سوارے دونوں بوتلیں لیے آیا اور مہمانوں سے مخاطب ہو کر کہا: ''معزز حضرات! آپ کون سی شراب پسند کریں گے؟'' میری طرف دیکھے بغیر ہی جارج نے خشک شراب کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس پر وارنٹ آفیسر سوارٹ مسکرا دیا۔

صدر بوتھا کے نام اہم خط

کمیٹی کی ملاقاتیں جاری رہیں مگر ہم انہی مسائل میں الجھے رہے جنہوں نے ہمیشہ ہمیں آگے بڑھنے سے روکا تھا اور یہ مسائل تھے: مسلح جدوجہد' کمیونسٹ پارٹی اور اکثریتی حکمرانی۔ میں ہنوز کوشش پر زور دے رہا تھا کہ وہ پی ڈبلیو بوتھا سے میری ملاقات کا اہتمام کرے اس وقت حکام نے مجھے اجازت دے دی تھی کہ میں پولس مور اور جزیرہ روبن کے اپنے ساتھیوں اور لوساکا میں اے این سی کی قیادت سے بھی ابتدائی رابطے قائم کر سکتا ہوں۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ میں اپنے ساتھیوں سے

آگے جا رہا ہوں مگر میں اتنا زیادہ آگے نہیں جانا چاہتا تھا کہ مڑ کر پیچھے دیکھوں تو اپنے آپ کو تنہا پاؤں۔

جنوری 1989ء میں پولس مور کے میرے چار ساتھی مجھ سے ملنے آئے۔ ہم نے اس یادداشت پر گفتگو کی جو میں صدر مملکت کو بھیجنا چاہتا تھا۔ اس میں وہ اکثر نکات دہرائے گئے تھے جو میں نے اپنی خفیہ میٹنگز میں پیش کیے تھے مگر میں اس امر کو یقینی بنانا چاہتا تھا کہ صدر مملکت انہیں براہ راست مجھ سے سنے۔ اس طرح وہ دیکھ سکے گا کہ ہم خونخوار دہشت گرد نہیں بلکہ معقول لوگ ہیں۔

میں نے مارچ میں مسٹر بوتھا کو جو یادداشت بھیجی اس میں لکھا: ''میں پریشان ہوں، جیسا کہ کئی اور جنوبی افریقی بلا شبہ پریشان ہیں، کیونکہ جنوبی افریقہ دو دشمن کیمپوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ کالے ایک طرف اور گورے دوسری طرف اور وہ ایک دوسرے کو ہلاک کر رہے ہیں۔'' استشدد کو روکنے اور گفت وشنید کی بنیاد تیار کرنے کے لیے میں نے تجویز پیش کی کہ حکومت مذاکرات کی پیشگی شرط کے طور پر اے این سی سے کئے جانے والے تین مطالبات ترک کر دے، یعنی تشدد سے براءت، کمیونسٹ پارٹی سے علیحدگی اور اکثریتی حکمرانی کی کال کی واپسی۔

تشدد کے مسئلے پر میں نے لکھا کہ ''تشدد ترک کرنے سے اے این سی کا انکار کوئی مسئلہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کالوں کے ساتھ سیاسی اقتدار میں شرکت کے لیے ابھی تیار نہیں۔'' میں نے واضح کیا کہ ہم کمیونسٹ پارٹی کو الگ کرنے کے لیے تیار نہیں اور یہ کہ ہم کسی طرح کنٹرول میں نہیں۔ میں نے لکھا: ''کون سا آبرومند آدمی ہو گا جو ایک مشترک مخالف کے اصرار پر اپنے عمر بھر کے ساتھی کو چھوڑ دے اور پھر بھی اس کی قوم میں اس کا اعتبار قائم رہے؟'' میں نے کہا کہ حکومت کا اکثریتی حکمرانی اور داخلی امن ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اور گورے افریقہ کو بس یہ تسلیم کرنا ہے کہ اس ملک میں کبھی امن اور استحکام قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس اصول کو پوری

طرح لاگو نہ کیا جائے۔‘‘

خط کے آخر میں میں نے گفت وشنید کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا۔

’’ہمیں دو سیاسی معاملات زیر بحث لانے ہوں گے۔ اول‘ ایک وحدانی مملکت میں اکثریتی حکمرانی کا مطالبہ۔ دوم‘ اس مطالبے پر گورے جنوبی افریقہ کی تشویش اور ایسی آئینی ساخت کی ضمانتوں پر گوروں کا اصرار کہ اکثریتی حکومت کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ گوری اقلیت پر کالوں کا غلبہ ہو جائے۔ حکومت اور اے این سی کو جو نازک ترین کام درپیش ہوگا وہ یہ ہوگا کہ ان دونوں معاملات پر کسی مفاہمت تک پہنچ جائیں۔‘‘

میں نے تجویز کیا کہ یہ کام دو مرحلوں میں کیا جائے۔ پہلا یہ کہ مذاکرات کے لیے مناسب حالات پیدا کرنے کی خاطر بحث و تمحیص ہو‘ اور دوسرا مرحلہ خود اصل مذاکرات کا ہوگا۔ ’’مجھے یہ جتا دینا چاہیے کہ میں نے جو قدم اٹھایا ہے اس سے آپ کو حالیہ ڈیڈلاک پر قابو پانے اور ملک کی سیاسی صورت حال کو معمول پر لانے کا موقع ملا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کسی تاخیر کے بغیر اس موقع سے فائدہ اٹھائیں گے۔‘‘

بھرپور مسرت کا پہلا موقع

لیکن تاخیر ہوئی۔ جنوری میں پی ڈبلیو بوتھا کو دل دورہ پڑا۔ اس سے صدر مملکت معذور تو نہ ہوئے مگر کمزور ہو گئے اور ان کے وزراء کے بقول اس دورے نے انہیں کہیں زیادہ زودرنج بنا دیا۔ فروری میں بوتھا نے غیر متوقع طور پر نیشنل پارٹی کی صدارت سے استعفا دے دیا لیکن صدر مملکت کا عہدہ اپنے پاس رکھا۔ یہ ملک کی تاریخ میں ایک بے مثال صورت حال تھی۔ جنوبی افریقی پارلیمانی نظام میں اکثریتی پارٹی کا رہنما سربراہ مملکت بنتا ہے۔ صدر بوتھا اب سربراہ مملکت تو تھے مگر اپنی پارٹی کے سربراہ نہیں تھے۔ بعض لوگ اسے مثبت تبدیلی کے طور پر لے رہے تھے۔ یہ کہ بوتھا‘ جنوبی افریقہ میں حقیقی تبدیلی عمل میں لانے کے لیے پارٹی پالیٹکس سے بالاتر

ہونا چاہتے ہیں۔

سیاسی تشدد اور بین الاقوامی دباؤ دونوں بڑھتے رہے۔ ملک بھر میں سیاسی قیدیوں نے کامیاب بھوک ہڑتال کی تھی۔ اس کے نتیجے میں امن وامان کے وزیر نوسو سے زائد قیدیوں کو رہا کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ 1989ء میں یو ڈی ایف نے کانگریس آف ساؤتھ افریقن ٹریڈ یونینز (Cosatu) کے ساتھ مل کر عوامی جمہوری تحریک (M.D.M) تشکیل دی جس نے نسلی امتیاز کے اداروں کو چیلنج کرنے کے لیے سول نافرمانی کی ملک گیر ڈیفائنس کمپین منظم کرنا شروع کر دی۔ بین الاقوامی محاذ پر آلیور ٹیمبو نے برطانیہ عظمیٰ اور سوویت یونین کی حکومتوں سے مذاکرات کیے اور جنوری 87ء میں واشنگٹن میں امریکی وزیر خارجہ جارج شلز سے ملاقات کی۔ امریکیوں نے اے این سی کو جنوبی افریقہ کے کسی بھی حل کے لیے ایک ناگزیر عنصر تسلیم کر لیا۔ جنوبی افریقہ کے خلاف پابندیاں لاگو رہیں حتیٰ کہ ان میں اضافہ ہو گیا۔

سیاسی تشدد کے المناک واقعات بھی وقوع پذیر ہوئے ہوئے۔ جب سوویٹو میں تشدد کے واقعات بڑھ گئے تو میری بیوی نے ٹاؤن شپ میں اپنی نقل وحرکت کے دوران نوجوانوں کے ایک گروہ کو اپنے باڈی گارڈز کے طور پر کام کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ نوجوان غیر تربیت یافتہ اور غیر منظم تھے اور ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہو گئے جو تحریک آزادی کے شایان شان نہ تھیں۔ آخر کار ونی اپنے ایک باڈی گارڈ پر چلنے والے مقدمے میں قانونی طور پر الجھ گئی جو اپنے ایک نوجوان ساتھی کو قتل کرنے کا مجرم تھا۔ یہ صورت حال مجھے انتہائی پریشان کر رہی تھی کیونکہ ایسے اسکینڈل سے ایک ایسے وقت میں تحریک آزادی میں تفریق پیدا ہو سکتی تھی جب اتحاد کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنی بیوی کی پوری پوری حمایت کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ اگرچہ فیصلے میں اس کے متعلق سخت الفاظ آئے تھے مگر وہ کسی سنگین الزام سے مبرا تھی۔

اس جولائی میں میری پچھترویں برسی پر میرے تقریباً پورے خاندان نے وکٹر ور

سڑ کے ''جھونپڑے''میں مجھ سے ملاقات کی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میری بیوی اور بچے اور ان کے بچے سب ایک جگہ اکٹھے مجھ سے ملے تھے، اور یہ ایک پرشکوہ اور پر مسرت موقع تھا۔ وارنٹ آفیسر سوارٹ نے ضیافت کا اہتمام کرنے میں کمال کر دیا اور اس وقت بھی کوئی پریشانی نہ ہوئی جب میں نے اپنے بعض نواسوں نواسیوں کو بڑے کورس پہلے پڈنگ کھانے کی اجازت دے دی۔ کھانے کے بعد نواسے نواسیاں ایک پر دہشت فلم کی ویڈیو دیکھنے کے لیے میرے کمرہ خواب میں چلے گئے جبکہ بالغ افراد لاؤنج میں گپ شپ لگاتے رہے۔ اپنے پورے خاندان کو اپنے ارد گرد پا کر میں گہری مسرت سے آشنا ہوا اور بس یہ احساس تکلیف دہ تھا کہ میں اتنے زیادہ برس ایسے مواقع سے محروم رہا ہوں۔

صدر بوتھا سے ملاقات کی تیاری

4 جولائی کو جنرل ولمز مجھ سے ملنے آئے۔ انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ اگلے روز مجھے صدر بوتھا سے ملاقات کے لیے لے جایا جائے گا۔ انہوں نے اس ملاقات کو ''کرٹسی کال'' قرار دیا اور مجھے بتایا گیا کہ میں صبح ساڑھے پانچ بجے روانہ ہونے کے لیے تیار رہوں۔ میں نے جنرل سے کہا کہ اب جبکہ میں صدر سے ملاقات کا منتظر ہوں میرا خیال ہے میرے پاس ایک سوٹ اور ٹائی ہونی چاہیے جنہیں پہن کر میں ان سے مل سکوں۔ ''وہ سوٹ جو نمایاں افراد کے گروہ سے ملاقات کے وقت میں نے پہنا تھا' کب کا غائب ہو چکا تھا۔' جنرل رضامند ہو گیا اور کچھ دیر بعد ایک درزی میرا ناپ لینے آ گیا۔ اس سہ پہر مجھے ایک نیا سوٹ ٹائی' قمیص اور جوتے مل گئے۔ رخصت ہونے سے پہلے جنرل نے مجھ سے میرے خون کے گروپ کا پوچھا کہ اگلے روز سفر کے دوران کوئی انہونی پیش آ جائے تو خون کی فراہمی میں وقت نہ ہو۔

میں نے ملاقات کے لیے اتنی اچھی طرح تیاری کی جتنی میں کر سکتا تھا۔ میں نے

اپنی یادداشت اور ان تفصیلی نوٹس پر نظر ثانی کی جو اس کے لیے تیار کیے تھے۔ میں نے اتنے سارے اخبارات اور مطبوعات کا جائزہ لیا تا کہ میری معلومات یقینی طور پر اپ ٹو ڈیٹ ہوں۔ صدر بوتھا کہ نیشنل پارٹی کی صدارت سے مستعفی ہونے کے بعد ' ایف ڈبلیو ڈی کلارک ان کی جگہ منتخب ہوئے تھے اور کہا جاتا تھا کہ ان دونوں میں خاصی رسہ کشی ہے۔ بعض کہہ سکتے تھے کہ بوتھا کا مجھ سے ملاقات کے لیے تیار ہو جانا اپنے حریف کے خلاف اسی کا داؤ استعمال کرنے کے مانند ہے مگر مجھے اس پر کوئی تشویش نہیں تھی۔ میں نے ان دلائل کے ریہرسل کی جو صدر مملکت پیش کر سکتے تھے اور جو میں جواب میں پیش کر سکتا تھا۔ اپنے مخالف سے ہر ملاقات میں آپ کو یقین ہونا چاہیے کہ آپ نے اس پر وہ تاثر ٹھیک ٹھیک قائم کیا ہے جو آپ قائم کرنا چاہتے تھے۔

میں مسٹر بوتھا سے ملنے کے بارے میں ایک کشاکش میں تھا۔ وہ "عظیم مگر مچھ" (die groot krokodi) کے نام سے جانے جاتے تھے اور میں نے ان کی تند خوئی کے کئی قصے سن رکھے تھے۔ وہ مجھ قدیم وضع اور اکڑی گردن کے اکھڑ افریکنر لگتے تھے جو سیاہ فام لیڈروں سے معاملات پر بات چیت کرنے کے بجائے ان پر حکم چلانے کے عادی تھے۔ ان کے حالیہ دورہ دل نے بظاہر ان کے اس رجحان میں اضافہ ہی کیا تھا۔ میں نے تہیہ کیا کہ اگر انہوں نے انگلی اٹھا کر اپنی بات منوانے کا مظاہرہ کیا تو میں ان سے برملا کہہ دوں گا کہ ان کا یہ رویہ میرے لیے نا قابل قبول ہے اور پھر میں اٹھ کھڑا ہوں گا اور ملاقات ملتوی کر دوں گا۔

مجھے ایوان صدارت میں اسمگل کیا گیا

صبح کے ٹھیک ساڑھے پانچ بجے وکٹر ورسٹر کے کمانڈر میجر ماریاس میرے جھونپڑے پر وارد ہوئے۔ وہ لاؤنج میں چلے آئے جہاں میں معائنے کے لیے اپنے نئے سوٹ میں ان کے سامنے کھڑا تھا۔ انہوں نے میرے اردگرد گھوم پھر کر دیکھا اور

پھر اپنا سر دائیں بائیں ہلاتے ہوئے بولے: ''نہیں' منڈیلا! تمہاری ٹائی۔''

جیل میں' میں نے زیادہ ٹائیاں نہیں باندھی تھیں اور اب مجھے احساس ہوا کہ ٹائی لگاتے وقت میں بھول گیا تھا کہ اسے ٹھیک طرح کیسے باندھتے ہیں۔ میں نے ممکنہ حد تک گانٹھ ٹھیک ہی لگائی تھی اور مجھے امید تھی کہ کوئی اس کا نوٹس نہیں لے گا۔ میجر مار یاس نے میرے کالر کا بٹن کھولا' اسے ڈھیلا کیا اور ٹائی اتاری اور پھر میرے پیچھے کھڑے ہو کر اپنی اس کارگزاری کی تعریف کرنے لگے۔ ''اب ٹھیک ہے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم گاڑی میں وکٹر ورسٹر سے جنرل ولمز کے گھر پولس مور پہنچے جہاں جنرل کی بیوی نے ناشتہ دیا۔ ناشتے کے بعد ہمارا مختصر کانوائے صدر کی سرکاری رہائش گاہ ٹائن ہوئس روانہ ہوا جہاں ہماری گاڑیاں زیر زمین گیراج میں داخل ہو گئیں جہاں کوئی ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ٹائن ہوئس کیپ ڈچ سٹائل کی انیسویں صدی کی شاندار عمارت ہے مگر اس روز میں اس پر اچھی طرح نگاہ ڈال سکا۔ مجھے ایک طرح سے ایوان صدارت میں سمگل کیا گیا تھا۔

ہم لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر چوبی تختوں سے آراستہ لابی میں پہنچے جو دفتر صدر کے سامنے تھی۔ وہاں ہمارا استقبال کوبائی کوئٹسی' نائل برنارڈ اور جیل کے حکام نے کیا۔ نائل برنارڈ اور جیل کے حکام نے کیا۔ اس ملاقات کے بارے میں' کوئٹسی اور برنارڈ دونوں سے خاصی گفتگو کر چکا تھا اور انہوں نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں صدر کے سامنے متنازع مسائل اٹھانے سے احتراز کروں۔ جب ہم انتظارہ گاہ میں بیٹھے تھے' ڈاکٹر برنارڈ نے دیکھا کہ میرے جوتوں کے تسمے ٹھیک طرح نہیں بندھے ہوئے' چنانچہ وہ جھک کر میرے تسمے باندھنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کس قدر گھبرائے ہوئے تھے اور اس سے مجھے بھی گھبراہٹ نے آ لیا۔ پھر دروازہ کھلا اور میں بدترین صورتحال کی توقع کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گیا۔

دشمن کے رو برو

پی ڈبلیو بوتھا اپنے شاندار دفتر میں مخالف جانب سے چل کر میری طرف آئے۔ انہوں نے خاصی منصوبہ بندی سے یہ پیش قدمی کی تھی' چنانچہ ہم کمرے کے ٹھیک وسط میں ملے۔ انہوں نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا اور اس وقت وہ مسکرا رہے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اس پہلے لمحے ہی سے انہوں نے مجھے مکمل طور پر غیر مسلح کر دیا۔ انہوں نے پوری طرح تپاک' احترام اور ملنساری کا مظاہرہ کیا۔

ہم دونوں نے مصافحہ کرتے ہوئے جلد جلد تصویریں کھنچوائیں اور پھر ایک طویل میز کے گرد کوبائی کوٹسی' جنرل ولمز اور ڈاکٹر برنارڈ کی معیت میں بیٹھ گئے۔ چائے پیش کی گئی اور ہم باتیں کرنے لگے۔ آغاز سے گفتگو شگفتگی اور دلچسپ ماحول میں ہو رہی تھی۔ ہم نے بنیادی مسائل پر اتنی گفتگو نہ کی جتنی تاریخ اور جنوبی افریقی ثقافت پر کی۔ میں نے کہا کہ میں نے حال ہی میں ایک افریکان جریدے میں 1914ء کی افریکنز بغاوت کے متعلق ایک مضمون پڑھا ہے کہ کس طرح انہوں نے فری اسٹیٹ میں قصبوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ میں نے کہا کہ میرے نزدیک ہماری جدوجہد اس مشہور بغاوت کے متماثل ہے اور کچھ دیر ہم اس تاریخی واقعے پر رکھتی ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ وہ بغاوت بھائیوں کے مابین ایک جھگڑا تھا جبکہ میری جدوجہد انقلابی نوعیت کی ہے۔ میں نے کہا کہ اسے بھائیوں کے مابین ایک ایسی جدوجہد کے طور پر بھی لیا جا سکتا ہے جو مختلف رنگوں سے تعلق رکھتے ہوں۔

ملاقات کا آغاز نصف گھنٹے سے بھی کم طویل تھا اور اس کے آخر تک بات چیت دوستانہ اور کھلے ماحول میں ہوئی۔ پھر میں نے ایک سنگین مسئلہ اٹھایا۔ میں نے مسٹر بوتھا سے کہا کہ مجھ سمیت تمام سیاسی قیدی غیر مشروط طور پر رہا کر دیئے جائیں۔ ملاقات میں یہ واحد کشیدہ لمحہ تھا۔ مسٹر بوتھا نے کہا کہ انہیں خدشہ ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

پھر مختصر گفتگو اس مسئلے پر ہوئی کہ اگر ملاقات کی خبر لیک ہوگئی تو ہمیں کیا کہنا چاہیے۔ ہم نے جلدی سے ایک سیدھے سادے بیان کا مسودہ تیار کیا جس میں یہ کہا گیا تا کہ ہم نے ملک میں امن فروغ دینے کی کوشش میں چائے پر ملاقات کی ہے۔ جب اس بیان پر اتفاق ہوگیا' مسٹر بوتھا اٹھے اور انہوں نے مجھ سے یہ کہتے ہوئے مصافحہ کیا کہ یہ کس قدر خوشی کا مقام ہے۔ واقعی یہ خوشی کا مقام تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور جس راستے میں آیا تھا' اسی راستے سے رخصت ہوگیا۔

اگر چہ یہ ملاقات مذاکرات کی اصطلاح میں یا یک کامیابی نہیں تھی مگر ایک اور لحاظ سے یہ کامیابی تھی۔ مسٹر بوتھا عرصے سے ایک فیصلہ کن قدم اٹھانے کی بات کرتے تھے مگر انہوں نے ٹائن ہوئس کی اس صبح کے سوا ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔ اب میں یہ محسوس کرتا تھا کہ یہاں سے واپسی نہیں ہوگی۔

پتوار نئے ہاتھ میں

ایک ماہ سے کچھ عرصہ اوپر ہوا تو اگست 1989ء میں پی ڈبلیو بوتھا نے قومی ٹی وی پر آکر منصب صدارت سے اپنے مستعفی ہونے کا اعلان کیا۔ اپنے حیرت انگیز طور پر غیر مربوط خطاب میں انہوں نے کابینہ کے ارکان کو اعتماد شکنی' انہیں نظر انداز کرنے اور افریقن نیشنل کانگریس کے ہاتھوں میں کھیلنے کا الزام دیا۔ اگلے روز ایف ڈبلیو ڈی کلارک نے قائم مقام صدر کا حلف اٹھایا اور تبدیلی و اصلاح سے اپنی کمٹ منٹ کی توثیق کی۔

ہمارے نزدیک مسٹر ڈی کلارک ایک سفر تھے۔ جب وہ نیشنل پارٹی کے سربراہ بنے تھے' تو وہ ایک لگے بندھے پارٹی کے آدمی نظر آئے' نہ زیادہ نہ کم۔ ان کے ماضی میں کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا کہ وہ کسی اصلاح کا جذبہ رکھتے ہیں۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے انہوں نے سیاہ فام طالب علموں کو سفید فام یونیورسٹیوں سے باہر رکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جیسے ہی انہوں نے نیشنل پارٹی کی سربراہی سنبھالی' میں قریب

سے ان کا مشاہدہ کرنے لگا۔ میں نے ان کی تمام تقریریں پڑھیں' جو کچھ انہوں نے کہا اسے سنا اور میں اس نتیجے تک پہنچا کہ وہ اپنے پیشرو کی پالیسیوں سے حقیقتاً الگ ہونا چاہتے ہیں۔ وہ ایک نظریہ پرست نہیں بلکہ ایک حقیقت پسند تھے۔ ایک ایسے شخص جس کی نگاہ میں تبدیلی لازمی اور ناگزیر تھی۔ جس روز انہوں نے حلف اٹھایا' میں نے انہیں ایک خط لکھا جس میں ایک ملاقات کی درخواست کی گئی تھی۔

اپنے افتتاحی خطاب میں مسٹر ڈی کلارک نے کہا کہ ان کی حکومت قیام امن میں مخلص ہے اور یہ کہ وہ امن سے مخلص کسی بھی اور گروہ سے بات چیت کرنے کو تیار ہیں اور نئے آرڈر سے ان کا اخلاص ان کے منصب صدارت سنبھالنے کے فوراً بعد ظاہر ہو گیا جب پولیس تشدد کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے کیپ ٹاؤن میں ایک مظاہرے کا اہتمام کیا گیا۔ اس کی قیادت بشپ ٹوٹو اور عزت ماب ایلن بوئسک کو کرنا تھی۔ صدر بوتھا کی حکومت ہوتی تو اس مظاہرے پر پابندی عائد کر دی جاتی مظاہرین اس پابندی کو چیلنج کرتے اور اس کے نتیجے میں تشدد جنم لیتا۔ نئے صدر اپنے وعدے پر قائم رہے کہ وہ سیاسی اجتماعات پر پابندیاں نرم کر دیں گے' چنانچہ انہوں نے مظاہرہ ہونے دیا اور صرف یہ کہا کہ مظاہرین پر امن رہیں۔ گویا اب چپوار پر ایک نیا اور مختلف ہاتھ تھا۔

میرے سات جرنیلوں کی رہائی

جب ڈی کلارک نئے صدر بن گئے تب بھی میں نے کمیٹی سے خفیہ بات چیت جاری رکھی۔ اب وزیر دستوری ارتقا گیرٹ ولجون بھی بات چیت میں شامل ہو گئے۔ وہ کلاسکس میں ڈاکٹریٹ کیے ہوئے ایک روشن دماغ شخص تھے جن کا رول ہمارے مذاکرات کو دستوری ڈھانچے میں لانا تھا۔ میں نے حکومت پر زور دیا کہ وہ اپنے اچھے ارادوں کا عملی ثبوت دے اور پولس مور اور جزیرہ روبن میں قید میرے ساتھی سیاسی اسیروں کو رہا کر کے اپنی نیک نیتی ظاہر کرے۔ میں نے کمیٹی کو بتایا کہ اگر

حکومت میرے ساتھیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دے تو اس کے بعد وہ ان سے پر امن رویئے کی توقع کر سکتی ہے۔ گو وان امپیکی کے رویئے سے اس کا اظہار ہو چکا تھا جسے 1987ء کے آخر میں غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا تھا۔

10 اکتوبر 1989ء کو صدر ڈی کلارک نے اعلان کیا کہ والٹر سیسولو اور جزیرہ روبن پر قید رہنے والے میرے سات ساتھیوں ریمونڈ امہلابا' احمد کاتھرادا' اینڈریو ملانگینی' الیاس موتسوالیدی' جیف مازیموا' ولٹن امکوائی اور آسکر امپیتھا کو رہا کیا جا رہا ہے۔ اس صبح والٹر' کیتھی' رے اور اینڈریو مجھ سے ملنے آئے' جو ہنوز پولس مور میں تھے اور میں نے انہیں خدا حافظ کہا۔ یہ ایک جذباتی لمحہ تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میں ان سے زیادہ پیچھے نہیں رہوں گا۔ میرے یہ ساتھی پانچ دن بعد جوہانس برگ جیل سے رہا کر دیئے گئے۔ حکومت کے اس اقدام کو اندرون ملک اور باہر کر دیئے گئے۔ حکومت کے اس اقدام کو اندرون ملک اور باہر بڑی پذیرائی ملی اور میں نے بھی تہنیت کا پیغام مسٹر ڈی کلارک کو بھیج دیا۔

لیکن میرا یہ پیغام میری اس بے پناہ مسرت کی نسبت ہلکا تھا کہ والٹر اور دوسرے ساتھی آزاد ہو چکے ہیں۔ اس دن کی ہم نے تمنا کی تھی اور اسی کے لیے اتنا عرصہ لڑتے رہے تھے۔ ڈی کلارک اپنے وعدے پر قائم رہے تھے۔ میرے ساتھی کسی بندش کے بغیر رہا کیے گئے تھے۔ وہ اے این سی کی طرف سے بیان دے سکتے تھے اور یہ واضح ہو گیا تھا کہ پارٹی پر پابندی عملاً ختم ہو چکی ہے۔ اس سے ہماری طویل جدوجہد اور اصولوں سے ہماری پرعزم وابستگی کی تائید ہوتی تھی۔

دی کلارک نے نسلی امتیاز کا تانا بانا منظم طریقے سے بکھیرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے جنوبی افریقہ کے ساحل سب رنگوں کے لیے کھول دیئے اور کہا کہ ''جداگانہ سہولتوں کی تخصیص کا قانون'' جلد واپس لے لیا جائے گا۔ 1953ء سے یہ قانون نافذ تھا اور ''گھٹیا نسلی امتیاز'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کے تحت گوروں اور کالوں اور

رنگ داروں کے لیے الگ الگ پارک، تھیٹر، ریستوران، بسیں، لائبریریاں، ٹائلٹ اور دوسری عوامی سہولتیں مخصوص تھیں۔ نومبر میں انہوں نے اعلان کیا کہ نیشنل سیکورٹی مینجمنٹ سسٹم، جسے پی ڈبلیو بوتھا نے نسلی امتیاز کی مخالف قوتوں کو کچلنے کے لیے ایک خفیہ سٹرکچر کے طور پر قائم کیا تھا، ختم کر دیا جائے گا۔

ڈی کلارک کے نام خط

اوئل دسمبر میں مجھے اطلاع دی گئی کہ ڈی کلارک سے ملاقات کے لیے اس ماہ کی بارہ تاریخ طے پائی ہے۔ اس سے پہلے میں نے اپنے نئے اور پرانے ساتھیوں سے مشاورت کی اور کالج میں اپنے پرانے ساتھیوں اور عوامی جمہوری تحریک (ایم ڈی ایم) اور یو ڈی ایف کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کر لیں۔ میں تمام علاقوں سے تعلق رکھنے والے اے این سی کے لوگوں سے ملا اور میں نے یو ڈی ایف اور جنوبی افریقی مزدور تنظیموں کے اتحاد (Cosatu) کے وفود سے ملاقاتیں کیں۔ ان نوجوان آدمیوں میں سے ایک سائرل راماپھوسا تھا جو نیشنل مائن ورکرز کا جنرل سیکریٹری اور نئی نسل کے لائق ترین رہنماؤں میں شمار ہوتا تھا۔ میں نے جزیرہ روبن کی کانگی کے ساتھیوں سے بھی ملاقاتیں کیں جن میں ٹیرر لیکوٹا اور ٹوکیو سیکس ویل بھی شامل تھے، انہوں نے میرے ساتھ لنچ کیا۔ یہ دونوں افراد بڑے پیٹو ہیں اور ان کے بارے میں وارنٹ آفیسر سوارٹ نے جو واحد شکایت کی وہ یہ تھی: ''یہ دونوں ہمارا سارا اندوختہ چٹ کر کے ہمیں اس گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیں گے۔''

بہت سے ساتھیوں سے رہنمائی پا کر میں نے دی کلارک کے نام ایک خط ڈرافٹ کیا۔ یہ اس خط سے مختلف نہیں تھا جو میں نے پی ڈبلیو بوتھا کو بھیجا تھا۔ اس کا موضوع حکومت اور اے این سی کے مابین ہونے والی گفت و شنید تھا۔ میں نے صدر کو بتایا کہ موجودہ تنازع جنوبی افریقہ کی رگوں سے خون نچوڑ رہا ہے اور اس کا واحد حل مذاکرات ہیں۔ میں نے کہا کہ اے این سی مذاکرات کے لیے پیشگی شرط قبول

نہیں کرے گی جو کہ حکومت کی خواہش ہے'یعنی مسلح جدوجہد ملتوی کر دی جائے۔ حکومت نے ''امن سے دیانتدارانہ وابستگی'' کا مطالبہ کیا اور میں نے ان پر واضح کیا کہ بات چیت کے لیے ہماری آمادگی اس وابستگی کا کھلا ثبوت ہے۔

میں نے مسٹر ڈی کلارک کو بتایا کہ میں ان کے مفاہمت پر زور دینے سے بہت متاثر ہوں جیسے کہ ان کے افتتاحی خطاب سے ہویدا ہے۔ ان کے الفاظ نے کروڑوں جنوبی افریقیوں اور دنیا بھر کے لوگوں کو یہ امید دلائی ہے کہ ایک نیا جنوبی افریقہ جنم لینے کو ہے۔ میں نے کہا کہ مفاہمت کی شاہراہ پر سب سے پہلا قدیم یہ ہو گا کہ نسلی امتیاز اور اسے لاگو کرنے والے تمام اقدامات کالعدم قرار دیئے جائیں۔

لیکن میں نے کہا کہ بعد کے اقدامات سے اس خطاب کے جذبے کی کچھ زیادہ تائید نہیں ہوتی۔ کئی لوگ سمجھتے ہیں کہ حکومت کی پالیسیاں بالواسطہ طور پر نسلی امتیاز ہی کا تسلسل ہیں۔ میں نے کہا کہ حکومت نے بلیک ہوم لینڈ لیڈروں اور ایسے ہی دیگر پسندیدہ افراد سے بات چیت کرنے میں بہت زیادہ وقت صرف کیا ہے۔ میں نے زور دے کر کہا کہ یہ لوگ ظالمانہ ماضی کے ایجنٹ ہیں اور سیاہ فام جنوبی افریقی عوام انہیں مسترد کرتے ہیں۔

میں نے اپنی اس تجویز کو دہرایا کہ مذاکرات دو مرحلوں میں ہونے چاہئیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں ان رہنما اصولوں کی پوری پوری حمایت کرتا ہوں جو اے این سی نے 1989ء کے ہرارے ڈیکلیریشن میں اختیار کیے تھے جس سے حکومت پر یہ ذمے داری آن پڑی کہ وہ مذاکرات کی راہ میں حائل ان رکاوٹوں دور کرے جو حکومت نے خود کھڑی کی تھیں۔ ان مطالبات میں تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی' تمام تنظیموں اور افراد پر سے پابندیوں کا اٹھانا' ہنگامی حالت کا خاتمہ اور افریقی بستیوں سے پولیس اور فوج کو ہٹانا شامل تھے۔ میں نے اس امر پر زور دیا کہ دشمنیاں ختم کرنے کے لیے باہمی اتفاق سے جنگ بندی مذاکرات کی پہلی شرط ہے اور اس

کے بغیر مذاکرات کی سمت میں کوئی پیشرفت نہیں ہوسکتی۔ ہماری ملاقات سے ایک دن پہلے خط مسٹر ڈی کلارک کو پہنچا دیا گیا۔

ٹوئن ہوئس کی تاریخی ملاقات

13 دسمبر کی صبح ٹوئن ہوئس لے جایا گیا۔ میں اسی کمرے میں ڈی کلارک سے ملا جس میں اس کے پیشرو کے ساتھ چائے پی تھی۔ کوبائی کوئٹسی' جنرل ولمز' ڈاکٹر برنارڈ اور اس کا ساتھی مائک لووان کے ہمراہ تھے۔ میں نے مسٹر ڈی کلارک کو صدر بننے پر مبارکباد دی اور امید ظاہر کی کہ ہم مل کر کام کرسکیں گے۔ وہ انتہائی تپاک سے پیش آئے اور انہوں نے بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا۔

شروع ہی سے میں نے نوٹ کیا کہ مجھے جو کچھ کہنا ہوتا' مسٹر ڈی کلارک اسے توجہ سے سنتے تھے۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ نیشنل پارٹی کے لیڈر سیاہ فام لیڈروں سے بات چیت کے دوران وہی کچھ سنتے تھے جو سننا چاہتے تھے۔ لیکن مسٹر ڈی کلارک سننے اور سمجھنے کی حقیقی کوشش کرتے محسوس ہوئے۔

اس روز جن معاملات پر میں نے زور دیا ان میں سے ایک پانچ سالہ منصوبہ تھا جسے نیشنل پارٹی نے حال ہی میں متعارف کرایا تھا جس میں ''گروہی حقوق'' کا تصور شامل تھا۔ گروہی حقوق کا تصور یہ تھا کہ کوئی نسلی گروہ کسی اور پر ترجیح حاصل نہیں کر سکے گا۔ اگرچہ وہ ''گروہی حقوق'' کو نئے جنوبی افریقہ میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا ایک طریقہ بتا رہے تھے' دراصل ان کی یہ تجویز سفید فاموں کو تحفظ دینے کا ایک ذریعہ تھی۔ میں نے مسٹر ڈی کلارک کو بتایا کہ یہ اے این سی کے لیے ناقابل قبول ہے۔ میں نے مزید کہا کہ اس تصور پر قائم رہنا ان کے مفاد میں نہیں کیونکہ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ حکومت نسلی امتیاز کو ترک کیے بغیر اسے جدید شکل دینا چاہتی ہے۔ اس طرح اس ملک میں اور دنیا بھر میں ترقی پسند قوتوں کی نظروں میں ان کا امیج اور نیشنل پارٹی کا امیج تباہ ہو رہا ہے۔ ایک ظالمانہ نظام کی اصلاح نہیں کی جا

سکتی' اسے پورے کا پورا اٹھا کر پھینک دینا چاہیے۔ میں نے ایک اداریئے کا ذکر کیا جو میں نے حال ہی میں کیپ میں نیشنل پارٹی کے ترجمان ڈائی برگر میں پڑھا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ گروہی حقوق کا نظریہ نسلی امتیاز کو چور دروازے سے واپس لانے کی ایک کوشش کے طور پر گھڑا گیا ہے۔ میں نے مسٹر ڈی کلارک کو بتایا کہ اگر ان کی پارٹی کا اخبار ''گروہی حقوق'' کو اس نظر سے دیکھتا ہے تو ہماری نگاہوں میں اس منصوبے کی کیا حیثیت ہوسکتی ہے؟ میں نے مزید کہا کہ اے این سی نے پچھتر سال تک نسلی امتیاز کے خلاف اس لیے جدوجہد نہیں کی کہ اس کی ایک بھیس بدل شکل کے سامنے جھک جائے اور یہ کہ اگر وہ ''گروہی حقوق'' کے کھوکھلے چوبی گھوڑے کے ذریعے نسلی امتیاز کو تحفظ دینے کا حقیقی ارادہ رکھتے ہیں تو وہ نسلی امتیاز کو ختم کرنے میں سچا یقین نہیں رکھتے۔

اس روز میں نے دیکھا کہ مسٹر ڈی کلارک نے ان باتوں پر جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا۔ یہ اس شخص کا منفرد کردار تھا کہ اس نے میری باتیں غور سے سنیں اور مجھ سے بحث و تکرار نہ کی۔ اس نے کہا: ''آپ جانتے ہیں میرا مقصد آپ کے مقصد سے مختلف نہیں۔ پی ڈبلیو بوتھا کے نام آپ کے مختصر نامے میں یہ کہا گیا تھا کہ اے این سی اور حکومت کو سیاہ فام غلبے کے سفید فام خدشات سے نپٹنے کی خاطر مل کر کام کرنا چاہیے اور ''گروہی حقوق'' کا نظریہ ہماری طرف سے ان خدشات سے نپٹنے کی ایک تجویز ہے۔'' میں ان کے اس جواب سے متاثر ہوا' تاہم میں نے کہا کہ ''گروہی حقوق'' کا تصور سفید فام خدشات کم کرنے کی نسبت سیاہ فام خدشات میں زیادہ اضافہ کرتا ہے۔ اس پر ڈی کلارک نے کہا: ''پھر ہمیں اسے بدلنا ہوگا۔''

پھر میں نے اپنی آزادی کا سوال اٹھایا اور کہا کہ اگر ان کا خیال ہے کہ میں اپنی رہائی پر گاؤں میں جا بیٹھوں گا تو یہ ان کی بھول ہے۔ میں نے پر یقین انداز میں کہا کہ اگر مجھے انہی حالات کے تحت رہائی ملی جن کے تحت مجھے گرفتار کیا گیا تھا تو میں

ٹھیک انہی سرگرمیوں میں مصروف ہو جاؤں گا جن کی بنا پر مجھے جیل میں ڈالا گیا تھا۔ میں نے ان کے سامنے اپنا موقف پیش کرتے ہوئے کہا کہ آگے بڑھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اے این سی اور دیگر تمام سیاسی تنظیموں سے پابندی ہٹالی جائے، ہنگامی حالت مکمل طور پر نہیں اٹھائی اور افریقی بستیوں سے دستے واپس بلانے کا حکم دیا ہے۔

مسٹر ڈی کلارک کی پارلیمنٹ میں افتتاحی تقریر کے سات دن بعد 9 فروری کو مجھے بتایا گیا کہ میں پھر ٹوئن ہوؤئس جا رہا ہوں۔ میں شام کے چھ بجے وہاں پہنچا۔ مسکراتے ہوئے ڈی کلارک سے ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی اور جب ہم مصافحہ کر چکے تو انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ وہ اگلے روز مجھے جیل سے رہا کر رہے ہیں۔ اگرچہ جنوبی افریقہ اور دنیا بھر کے اخبارات ہفتوں سے خیال ظاہر کر رہے تھے کہ میری رہائی ناگزیر ہے مگر مجھے یہ اعلان سن کر حیرت ہوئی۔ مجھے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ ڈی کلارک کی مجھ سے اس ملاقات کا سبب مجھے یہ اطلاع دینا ہے کہ وہ مجھے آزاد انسان بنا رہے ہیں۔

میں نے ایک ہفتے کی اور قید مانگی

میں نے اپنے دل اور دماغ میں ایک کشمکش محسوس کی۔ میں دل سے چاہتا تھا کہ جتنا جلد ممکن ہو ممکن ہو جیل سے رخصت ہو جاؤں لیکن اتنے شارٹ نوٹس پر ایسا کرنا عقل مندی نہ تھا۔ میں نے مسٹر ڈی کلارک کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ اسے ناشکر گزاری گردانا جائے گا مگر میں ایک ہفتے کا نوٹس ملنے کو ترجیح دوں گا تاکہ میرے اہل خانہ اور میری پارٹی میری رہائی کے لیے تیار ہو سکیں۔ میں نے کہا کہ اگر میں کل ہی جیل سے باہر چلا گیا تو اس سے ابتری پھیل جائے گی۔ میں نے ڈی کلارک سے کہا کہ مجھے اس دن سے ایک ہفتہ بعد رہا کیا جائے۔ ستائیس برس انتظار کرنے کے بعد میں ایک اور ہفتہ یقیناً انتظار کر سکتا تھا۔

ڈی کلارک میرے اس ردعمل پر ہکا بکا رہ گئے۔ میری بات کا جواب دینے کے بجائے وہ میری رہائی کی تفصیل بیان کرتے رہے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت مجھے بذریعہ طیارہ جوہانس برگ لے جائے گی اور سرکاری طور پر میری رہائی وہاں عمل میں آئے گی۔ ان کے مزید کچھ کہنے سے پہلے میں نے ایک سخت اعتراض کیا' یہ کہ میں وکٹر ورسٹر جیل سے رہا ہونا چاہتا تھا تا کہ میں ان لوگوں کا شکریہ ادا کرسکوں جنہوں نے میری دیکھ بھال کی تھی اور کیپ ٹاؤن کے لوگوں کو سلام کرسکوں۔ اگرچہ میرا تعلق جوہانس برگ سے تھا' مگر کیپ ٹاؤن تقریباً تین دہائیوں سے میرا ''گھر'' تھا۔ میرا موقف یہ تھا کہ میں جوہانس برگ سے نہیں بلکہ وکٹر ورسٹر سے رہا کیا جائے۔ یہ ایک کشیدگی کا لمحہ تھا اور اس وقت ہم میں سے کسی نے اس ستم ظریفی پر توجہ نہ دی کہ ایک قیدی تو رہا نہ کیے جانے کی درخواست کر رہا تھا اور اس کا جیلر اسے رہا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ڈی کلارک نے پھر معذرت کی اور کمرے سے چلا گیا۔ دس منٹ بعد وہ ایک مفاہمت کے ساتھ لوٹا۔ ہاں' مجھے وکٹر ورسٹر تو رہا کیا جا سکتا ہے لیکن' نہیں' رہائی ملتوی نہیں کی جا سکتی۔ حکومت نے غیر ملکی پریس کو پہلے ہی اطلاع دے دی تھی کہ مجھے اگلے روز رہا کیا جا رہا ہے اور وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اس بیان کو واپس نہیں لیا جا سکتا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اس مسئلے پر بحث و تکرار نہیں کر سکتا۔ آخر کار ہم اس درمیانی راستے پر متفق ہو گئے اور مسٹر ڈی کلارک نے ہم دونوں کے لیے وہسکی کا ایک ایک جام بھرا کہ ہم پی کر جشن منائیں۔ میں نے جام سے جام ٹکرایا مگر پینے کا محض بہانہ کیا کیونکہ ایسی تیز الکحل میں پی نہیں سکتا۔

نصف شب سے کچھ پہلے کا عمل تھا جب میں نے اپنی کوٹھڑی میں واپس جانے سے پہلے کیپ ٹاؤن میں اپنے ساتھیوں کو فوری پیغام بھیجا کے اگلے روز مجھے رہا کیا جا رہا ہے۔ میں نے ونی کو پیغام پہنچانے کا بھی اہتمام کیا اور جوہانس برگ میں والٹر

کوفون کیا۔ ان سب نے اگلے روز چارٹرڈ طیارے پر آنے کا بندوبست کرلیا۔ اس شام اے این سی کے بہت سے افراد جو قومی استقبالیہ کمیٹی میں شامل تھے' ایک بیان تیار کرنے کے لیے میری کوٹھڑی پر آئے جو مجھے اگلے روز جاری کرنا تھا۔ وہ صبح کی اولین گھڑیوں میں واپس گئے اور مجھے اپنے جوش وخروش کے باوجود محوخواب ہونے میں کوئی وقت پیش نہ آئی۔

☆☆☆☆☆☆

حصہ یازدہم :: آزادی مل گئی

قید کے دس ہزار دن ختم ہو گئے

اپنی رہائی کے دن چند گھنٹے کی نیند کے بعد ساڑھے چار بجے صبح میں جاگ اٹھا۔ کیپ ٹاؤن میں گیارہ فروری ایک روشن اور اخیر گرمیوں کا دن تھا۔ میں نے اپنی معمول کی ورزش مختصر کی' نہایا اور ناشتہ کیا۔ پھر میں نے کیپ ٹاؤن میں اے این سی اور یو ڈی ایف کے بہت سے لوگوں کو فون کیے کہ میری رہائی کے انتظامات اور میری تقریر پر کام کرنے میری کوٹھڑی پر آئیں۔ اتنے میں جیل ڈاکٹر میرا مختصر طبعی معائنہ کرنے آ گیا۔ میں نے اپنی رہائی کی امید پر تکیہ نہ کیا بلکہ ان بہت سے کاموں پر توجہ مبذول کیے رکھی جو مجھے رہائی سے پہلے انجام دینے تھے۔ جیسا کہ زندگی میں اکثر ہوتا ہے ایک یادگار موقع کی اہمیت سینکڑوں جزئیات کی ہماہمی میں گم ہو جاتی ہے۔

ان گنت معاملات تھے جو زیر غور لانے اور حل کرنے تھے مگر اس کے لیے وقت بہت کم تھا۔ استقبالیہ کمیٹی کے بہت سے ساتھی جن میں سائرل راما پھوسا اور ٹریور مینوئل بھی شامل تھے' صبح سویرے ہی میری قیام گاہ پر آ براجے۔ میں سب سے پہلے پارل کے لوگوں سے خطاب کرنا چاہتا تھا جو میری قید و بند کے درمیان مجھ پر بڑے مہربان رہے تھے مگر استقبالیہ کمیٹی مصر تھی کہ یہ کوئی اچھا خیال نہیں۔ اگر میں نے پارل کے خوشحال سفید فام شہریوں کے سامنے اپنی پہلی تقریر کی تو یہ عجیب بات لگے گی۔ اس کے بجائے ان کا پروگرام یہ تھا کہ پہلے میں کیپ ٹاؤن میں گرینڈ پریڈ کے مقام پر کیپ ٹاؤن کے لوگوں سے خطاب کروں۔

ایک حل طلب سوال یہ درپیش تھا کہ آزادی کی پہلی رات میں کہاں قیام کروں گا۔ میرا رجحان یہ تھا کہ میں کیپ ٹاؤن کی سیاہ اور رنگ دار لوگوں کی بستی کیپ فلیٹس میں قیام کروں تاکہ ان لوگوں سے میری وابستگی کا اظہار ہو۔ لیکن میرے ساتھیوں اور بعد میں میری بیوی نے کہا سیکورٹی کے نقطہ نظر سے مجھے آرچ بشپ ڈیسمنڈ ٹوٹو کے

ہاں بشپس کورٹ میں ٹھہرنا چاہیے جو سفید فام مضافاتی بستی میں ایک صاف ستھری رہائش گاہ تھی۔ یہ ایسا علاقہ تھا جہاں مجھے جیل جانے سے پہلے قیام کرنے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی لہٰذا میرا خیال تھا کہ ایک پوش سفید علاقے میں اپنی آزادی کی پہلی رات گزارنے سے سیاہ فام لوگوں تک غلط سگنل پہنچے گا۔لیکن کمیٹی نے یہ کہہ کر بشپس کورٹ کے حق میں رائے دی کہ یہ جگہ ٹوٹو کے عہد میں مخلوط نسل بن چکی ہے اور کھلی، کشادہ غیر نسلیت کی علامت ہے۔

جیل کے حکام نے مجھے پیکنگ کے لیے صندوق اور کریٹ فراہم کر دیئے۔ اپنی قید کے پہلے بیس بائیس برسوں کے دوران میں نے بہت کم سازوسامان جمع کیا تھا لیکن پچھلے چند برسوں میں میرے پاس خاصی اشیاء زیادہ تر کتابیں اور کاغذات ہو چکے تھے اور یوں گزشتہ عشروں کی تلافی ہو گئی تھی۔ میں نے ایک درجن سے اوپر کریٹ اور صندوق سامان سے بھر لیے۔

میری رہائی اصل وقت تین بجے سہ پہر طے پایا تھا لیکن ونی اور والٹر اور جوہانس برگ سے آنے والی چارٹرڈ پرواز کے مسافر دو بجے کے بعد ہی پہنچ پائے۔ مکان پر درجنوں افراد پہلے ہی جمع ہو چکے تھے اور پورا منظر ایک جشن کا رنگ لیے ہوئے تھا۔ وارنٹ آفیسر سوارٹ نے ہم سب کے لیے آخری کھانا تیار کیا اور میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے نہ صرف گزشتہ دو سال مجھے کھانا دیا بلکہ اچھی صحبت بھی فراہم کی۔ وارنٹ آفیسر جیمز گریگوری بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے اس سے گرمجوش معانقہ کیا۔ پولس مور سے لے کر وکٹر ورسٹر تک اس نے میری جو دیکھ بھال کی تھی، اس دوران ہم نے کبھی سیاست پر گفتگو نہ کی تھی، تاہم ہمارے درمیان ایک ایسا رشتہ استوار ہو چکا تھا جو ناقابل بیان تھا اور میں سمجھتا تھا کہ اس کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات مجھے بہت یاد آئیں گے جو ذہنی تسکین فراہم کرتے تھے۔ سوارٹ، گریگوری اور وارنٹ آفیسر برانڈ جیسے انسانوں نے لابدی انسانیت پر میرا یقین پختہ کر دیا کر دیا

تھا حتیٰ کہ ان لوگوں کی انسانیت پر بھی جنہوں نے گزشتہ ساڑھے ستائیس برس مجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے رکھا تھا۔

طویل الوداعی ملاقاتوں کے لیے اتنا وقت نہیں تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ ونی اور میں کار میں جیل کے صدر دروازے تک آئیں گے۔ میں نے حکام کو بتا دیا تھا کہ میں محافظوں اور رواردروں کو الوداع کہنا چاہوں گا جنہوں نے میری دیکھ بھال کی تھی، چنانچہ میں نے گزارش کی تھی کہ وہ اور ان کے اہل خانہ صدر دروازے پر میرا انتظار کریں جہاں میں انفرادی طور پر ان کا شکریہ ادا کرسکوں گا۔

تین بجنے کے چند منٹ بعد ایس اے بی سی کی ایک معروف شخصیت نے مجھے فون کیا کہ میں صدر دروازے سے چند سو فٹ پیچھے ہی کار سے اتر جاؤں تا کہ وہ میری آزادی کی طرف پیش رفت کی فلمبندی کرسکیں۔ یہ بات معقول لگتی تھی لہٰذا میں رضا مند ہو گیا۔ اس سے مجھے پہلا اشارہ ملا کہ ساری باتیں اسی قرینے سے وقوع پذیر نہیں ہوسکتیں جیسا کہ میں نے تصور کیا تھا۔

ساڑھے تین ہوئے تو مجھے بے چینی نے آلیا کیونکہ ہم پہلے ہی شیڈول سے پیچھے تھے۔ میں نے استقبالیہ کمیٹی کے ارکان کو بتایا کہ عوام ستائیس سال سے میرا انتظار کر رہے ہیں اور میں انہیں مزید انتظار میں نہیں رکھنا چاہتا۔ چار بجے سے کچھ پہلے ہمارا مختصر موٹر قافلہ کوٹھڑی سے روانہ ہوا۔ صدر دروازے کے ایک چوتھائی میل سامنے کار آہستہ ہو کر ٹھہر گئی۔ ونی اور میں باہر نکلے اور جیل کے دروازے کی طرف چلنے لگے۔

پہلے تو میں اندازہ نہ کرسکا کہ ہمارے سامنے کیا ہو رہا ہے مگر جب میں کم و بیش ڈیڑھ سو فٹ کے فاصلے پر پہنچا تو مجھے بے پناہ ہلچل اور لوگوں کا ایک بڑا ہجوم نظر آیا۔ وہاں سینکڑوں فوٹو گرافر، ٹی وی کمرے اور اخباری نمائندے اور کئی ہزار خیر خواہ موجود تھے۔ میں حیرت زدہ اور قدرے پریشان ہو گیا۔ دراصل مجھے ایسے منظر کی توقع نہیں تھی۔ میرا خیال یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ کئی درجن لوگ ہوں گے اور وہ بھی زیادہ تر

وارڈر اور ان کے اہل خانہ لیکن یہ تو محض آغاز ثابت ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ جو کچھ پیچ آنے والا ہے ہم نے اس کی پوری طرح تیاری نہیں کی۔

ہم دروازے سے لگ بھگ بیس فٹ دور تھے جب کیمروں کی کلک کلک شروع ہوگئی۔ اس سے پیدا ہونے والے شور نے دھاتی درندوں کے ایک بہت بڑے ریوڑ کا سا احساس دلایا۔ رپورٹر بلند آواز سے سوالوں کے بوچھاڑ کرنے اور ٹی وی کے افراد ارد گرد ہجوم کرنے لگے۔ اے این سی کے حامی چیختے ہوئے نعرے لگا رہے تھے۔ یہ پریشان کن مگر مسرت انگیز ابتری تھی۔ جب ایک ٹی وی ٹیم نے میری طرف ایک لمبی کالی پوستینی شے لڑھکائی تو میں قدرے ٹھٹک گیا۔۔ مجھے حیرت تھی کہیں یہ کوئی نوساختہ ہتھیار تو نہیں جو میری طویل قید کے دوران تیار کیا گیا ہو۔ونی نے مجھے بتایا کہ یہ ایک مائیکروفون ہے۔

جب میں ہجوم میں گھر گیا تو میں نے اپنی دائیں مٹھی لہرائی اور اس پر ہجوم سے ایک شور اٹھا۔ میں نے ستائیس سال سے ایسا نہیں کیا تھا اور اس سے میرے اندر طاقت اور خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہم ہجوم کے اندر صرف چند منٹ ٹھہرے اور پھر کود کر واپس کار میں بیٹھ گئے جو کیپ ٹاؤن کی طرف چل دی۔ اگر چہ اپنے اس استقبال پر مجھے خوشی تھی مگر اس بات پر دل گرفتہ بھی تھا کہ مجھے جیل کے عملے کو خدا حافظ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ جب میں جیل کے صدر دروازے سے چند قدم باہر آ کر گاڑی میں بیٹھا تو میں نے اکہتر برس کی عمر میں بھی یہ محسوس کیا کہ میری نئی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔ میری قید کے دس ہزار دن آخر کار ختم ہو گئے تھے!

عوام کے سمندر میں

کیپ ٹاؤن پینتیس میل جنوب مغرب میں تھا مگر گیٹ پر غیر متوقع ہجوم ہونے کے باعث ڈرائیور شہر جانے کے ایک مختلف راستے پر ہولیا۔ ہم جیل کے ساتھ گھوم کر عقب میں نکلے اور ہمارا اکانوائے چھوٹی سڑکوں اور ذیلی راستوں سے گزر کر شہر میں

داخل ہوا۔ ہماری گاڑی خوشنما سرسبز تاکستانوں اور آراستہ کھیتوں کے بیچ میں سے آگے بڑھتی گئی اور میں اردگرد کے مناظر سے بہت لطف اندوز ہوا۔

دیہی علاقہ سرسبز و شاداب تھا اور فصلوں کی سج دھج کھیتوں پر تندہی سے کام کرنے والوں کی کاوش کا نتیجہ تھی۔ لیکن جس چیز نے مجھے حیرت میں ڈال دیا وہ یہ تھی کہ سڑک کے دونوں طرف کتنے ہی گورے خاندان ہمارے موٹر قافلے کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کھڑے تھے۔ انہوں نے ریڈیو پر سنا تھا کہ ہم ایک متبادل راستے پر سے گزریں گے۔ معض، شاید درجن بھر گوروں نے تو اپنی دائیں بند مٹھیاں اسی انداز میں لہرائیں جو اے این سی کی قوت کے اظہار کا شعار بن چکا تھا۔ اس پر مجھے حیرت ہوئی۔ قدامت پسند فارمنگ ایریا سے تعلق رکھنے والی ان چند بہادر روحوں نے اپنے اخلاص کا مظاہرہ کر کے میری بڑی حوصلہ افزائی کی تھی۔ ایک جگہ میں نے گاڑی رکوائی اور باہر نکل کر ایک ایسے گورے خاندان سے علیک سلیک کی اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ میں جس جنوبی افریقہ میں لوٹ رہا ہوں وہ اس جنوبی افریقہ سے کہیں مختلف ہے جسے چھوڑ کر جیل گیا تھا۔

جب ہم شہر کے مضافات میں داخل ہوئے تو مجھے لوگوں کے ہجوم شہر کے مرکز کی طرف رواں دواں نظر آئے۔ استقبالیہ کمیٹی نے کیپ ٹاؤن میں گرینڈ پریڈ کے مقام پر ایک ریلی کا اہتمام کیا تھا۔ یہ ایک وسیع کھلا چوک ہے جو پرانے سٹی ہال کے سامنے پھیلا ہوا ہے۔ مجھے اس عمارت کی بالکنی سے ہجوم سے خطاب کرنا تھا جہاں سے پورے علاقے پر نگاہ پڑتی تھی۔ ہمیں اڑتی اڑتی خبریں ملی تھیں کہ صبح ہی سے وہاں عوام کا ایک عظیم سمندر انتظار کر رہا ہے۔ منصوبہ یہ تھا کہ ہمارے موٹر قافلہ ہجوم سے کترا کر سٹی ہال کے عقب میں جا رکے گا۔ جہاں سے میں خاموشی سے عمارت کے اندر داخل ہو جاؤں گا۔

کیپ ٹاؤن کے اس سفر میں پینتالیس منٹ لگے اور جب ہم گرینڈ پریڈ کے

نزدیک پہنچے تو ہمیں بے پایاں ہجوم دکھائی دینے لگا۔ ڈرائیور کو دائیں طرف مڑ کر ہجوم سے کترا کر نکلنا تھا مگر اس کے بجائے ناقابل توجیہ طور پر اس نے گاڑی سیدھی عوام کے سمندر میں دھکیل دی۔ فوراً ہی ہجوم امنڈ آیا اور لوگوں نے کار کو گھیرے میں لے لیا۔ ایک دو منٹ ہم انچ انچ کر کے آگے بڑھے لیکن پھر انسانی جسموں کے دباؤ سے رکنے پر مجبور ہو گئے۔ لوگ کار کی کھڑکیاں تھپتھپانے لگے اور پھر بونٹ کی باری آئی۔ ہمیں اندر بیٹھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اولوں کی بارش ہو رہی ہو۔ کچھ لوگ جوش میں آ کر کار پر کودنے لگے، دوسرے اسے ہلانے لگے اور اس لمحے مجھے تشویش لاحق ہوئی یوں لگا کہ ہجوم اپنی محبت کے جوش میں ہمیں کچل ہی ڈالے گا۔

انتظامات دھرے رہ گئے

ڈرائیور زونی اور مجھ سے بھی زیادہ فکر مند تھا اور وہ کار سے باہر نکلنے کی سعی کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ پر سکون رہے اور کار کے اندر ٹھہرے اور یہ کہ ہمارے پیچھے والی کاروں کے افراد ہماری خلاصی کو آ جائیں گے۔ اتنے میں ایلن بوئیساک اور دوسرے افراد لوگوں کو پرے ہٹا کر ہماری گاڑی کے لیے راستہ صاف کرنے لگے لیکن انہیں زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ ہم اندر بیٹھے رہے۔ اس وقت کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش بھی ناکام کیونکہ بہت سے لوگ اسے دبائے ہوئے تھے۔ یوں ہم ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ عرصے تک اپنے ہزاروں حامیوں کے اسیر بنے رہے۔ تقریر کے مجوزہ آغاز کا وقت بہت پہلے گزر گیا تھا۔

آخر کار کئی درجن فوجی ہماری نجات کو آ پہنچے اور انہوں نے آہستہ آہستہ ہمارے باہر نکلنے کا راستہ صاف کیا۔ جب ہم آزاد ہوئے تو ڈرائیور گاڑی تیزی سے سٹی ہال کی مخالف سمت میں بھگا کر لے گیا۔ ''بھلے آدمی! تم کدھر جا رہے ہو؟'' میں نے تلخ ہو کر اس سے پوچھا۔ ''میں نہیں جانتا۔'' اس نے کہا' اس کی آواز میں تشویش کی ترشی تھی۔ ''مجھے اس سے پہلے کبھی ایسا تجربہ نہیں ہوا۔'' یہ کہہ کر اس نے ذہن میں کوئی

منزل تعین کیے بغیر ڈرائیونگ جاری رکھی۔

جب وہ کچھ پر سکون ہوا تو میں نے اسے اپنے دوست اور وکیل عبداللہ عمر کے گھر کا پتہ بتایا جو شہر کے انڈین علاقے میں رہتا تھا۔ میں نے کہا کہ ہم وہاں جا کر چند منٹ آرام کر سکتے ہیں۔ یہ بات اس کے دل کو لگی۔ خوش قسمتی سے عبداللہ اور اس کے اہل خان گھر پر تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر خاصے حیران ہوئے۔ میں ستائیس برس میں پہلی بار آزاد انسان کی حیثیت سے انکے سامنے تھا' لیکن مجھے خوش آمدید کہنے کے بجائے ان لوگوں نے قدرے تشویش سے پوچھا: ''کیا آپ گرینڈ پریڈ کی تقریب میں شامل ہونے کو آئے ہیں؟''

عبداللہ کے گھر ہمیں ٹھنڈے مشروبات پینے کا موقع ملا۔ مگر ہمیں وہاں آئے صرف چند منٹ ہوئے تھے جب آرش بشپ ٹوٹو نے فون کیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ انہیں کیسے پتہ چلا کہ ہم وہاں ہیں۔ وہ خاصے پریشان تھے' چنانچہ انہوں نے کہا: ''نیلس! آپ کو فوراً گرینڈ پریڈ واپس آجانا چاہیے۔ لوگ بے چین ہو رہے ہیں۔ اگر تم سیدھے یہاں لوٹ کر نہ آئے تو میں کہہ نہیں سکتا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ میرا خیال ہے عام بلوہ ہو جائے گا۔'' میں نے کہا کہ میں ابھی واپس آتا ہوں۔

ہمارا مسئلہ ڈرائیور تھا۔ وہ گرینڈ پریڈ واپس جانے میں بہت متامل تھا۔ لیکن میں نے اس سے بحث و تکرار کر کے اسے قائل کر لیا اور جلد ہی ہم سٹی ہال کی طرف واپس آرہے تھے۔ لوگوں نے چاروں طرف عمارت کو گھیر رکھا تھا لیکن اس کے عقب میں ہجوم کا دباؤ اتنا زیادہ نہ تھا' چنانچہ ڈرائیور لوگوں کے درمیان سے گاڑی نکال کر عمارت کے عقبی دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ غروب آفتاب کا وقت ہو رہا تھا جب مجھے اس شاندار عمارت بالائی منزل پر لے جایا گیا جس کے ہالوں میں ہمیشہ گورے کارکن بھرے رہتے تھے۔ میں اس کی بالکنی میں نمودار ہوا اور وہاں میں نے لوگوں کا بے کنار سمندر دیکھا جو نعرے لگا رہے تھے' جھنڈے اور بینر لہرا رہے

تھے‘ تالیاں بجا رہے تھے اور اظہار مسرت کر رہے تھے۔

میں نے اپنی مٹھی ہجوم کی طرف لہرائی اور عوام نے پرجوش نعروں سے جواب دیا۔ ان نعروں نے میرے اندر آزادی کے جذبوں کی بجلیاں تازہ کر دیں۔ ’’اما ندلا!‘‘ میں پکار اٹھا۔ ’’انگاویتھو!‘‘ انہوں نے جواب دیا۔ ’’ایافریقہ!‘‘ میں نے نعرہ لگایا۔ ’’مایی بویی!‘‘ جوابی نعرہ گونجا۔ آخر کار جب ہجوم پرسکون ہونے لگا تو میں نے اپنی تقریر جیب سے نکالی اور اپنی عینک کے لیے سینے کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ عینک وہاں نہیں تھی‘ میں اسے وکٹر ورسٹر میں چھوڑ آیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ونی کی عینک اسی نمبر کی ہے‘ چنانچہ میں نے اس سے مستعار لے لی۔

ایک تاریخ ساز تقریر

’’دوستو! رفیقو! اور جنوبی افریقی ساتھیو! میں امن‘ جمہوریت اور سب کے لیے آزادی کے نام پر آپ سب کو تہنیت پیش کرتا ہوں۔ میں آپ کے سامنے ایک پیغمبر کے طور پر نہیں کھڑا بلکہ آپ کے‘ قوم کے ایک خادم کی حیثیت سے کھڑا ہوں۔ آپ کی انتھک اور دلیرانہ قربانیوں نے میرے لیے ممکن بنایا ہے کہ آج میں یہاں آپ کے روبرو ہوں۔ اس لیے میں اپنی زندگی کے بقایا سال آپ کے ہاتھوں میں دیتا ہوں۔‘‘

میں نے دل کی گہرائیوں سے تقریر کی۔ میں سب سے پہلے عوام کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں کوئی مسیحا نہیں بلکہ ایک عام آدمی ہوں جو غیر معمولی حالات کے باعث ایک لیڈر بن گیا ہے۔ میں جلد از جلد دنیا بھر کے لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا جنہوں نے میری رہائی کے لیے مہم چلائی تھی۔ میں نے کیپ ٹاؤن کے لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور آلیور ٹیمبو اور افریقن نیشنل کانگریس‘ ’’کوساٹو (Cosatu)‘ ماس ڈیموکریٹک موومنٹ‘ نیشنل یونین آف ساؤتھ افریقی سٹوڈنٹس اور بلیک ساش (Black sash) کو سلام پیش کیا۔ میں نے اپنی اہلیہ اور گھر والوں کو یہ کہہ کر عوامی سطح پر خراج

تحسین پیش کیا: ''مجھے یقین واثق ہے کہ ان کی تکالیف اور مصائب میرے مصائب سے کہیں زیادہ تھے۔''

میں نے ہجوم کو بتایا کہ یہ امر یقینی ہے کہ اب نسلی امتیاز کا جنوبی افریقہ میں کوئی مستقبل نہیں اور یہ کہ لوگوں کو اپنی عوامی عمل کی تحریک دھیمی نہیں پڑنے دینی چاہیے ''افق پر جھلملاتی آزادی سے حوصلہ پا کر ہمیں اپنی کوششیں دوگنی کر دینی چاہئیں۔'' میں نے محسوس کیا کہ اب یہ ضروری ہے کہ حکومت سے اپنی بات چیت کی وضاحت عوام کے سامنے کر دی جائے۔ میں نے کہا: ''آج میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حکومت سے میری گفتگوؤں کا مقصد یہ تھا کہ ملک کی سیاسی صورت حال کو معمول پر لایا جائے۔ میں اس امر پر زور دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے ملک کے مستقبل کے بارے میں کوئی ایسی گفت وشنید نہیں کی جس میں میں نے اے این سی اور حکومت کے مابین مذاکرات پر اصرار نہ کیا ہو۔''

میں نے کہا: ''مجھے امید ہے کہ ایک مذاکراتی سمجھوتے کے لیے سازگار فضا جلد پیدا کی جا سکتی ہے جس سے مسلح جدوجہد کی ضرورت نہ رہے گی۔ ایسی فضا تیار کرنے کے لیے ضروری اقدامات اے این سی کے اعلان ہرارے 1989ء میں تجویز کیے گئے ہیں۔ حقیقی مذاکرات کی شرط کے طور پر حکومت کو چاہیے کہ فوری طور پر ہنگامی حالت ختم کر دے اور تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دے۔''

میں نے لوگوں کو بتایا کہ صورت حال کے معمول پر لانے کے لیے ڈی کلارک کسی بھی دوسرے نیشنلسٹ لیڈر سے آگے چلا گیا ہے اور پھر میں نے ایسے الفاظ میں جو بعد میں میرے ذہن پر چھائے رہے ''مسٹر ڈی کلارک کو ''مرد اخلاص'' (A man of integrity) قرار دیا۔ جب مسٹر ڈی کلارک ان الفاظ پر پورے اترتے دکھائی نہ دیئے تو یہ الفاظ اخبارات میں طنزیہ طور پر مجھ سے منسوب کر کے دہرائے جاتے رہے۔

اپنی قوم اور حکومت پر یہ ظاہر کرنا ضروری تھا کہ قید میں رہ کر میں جھکا نہیں اور نہ شکستگی سے دوچار رہا ہوں اور یہ کہ میرے نزدیک جدوجہد ختم نہیں ہوئی بلکہ ایک مختلف شکل میں اس کا آغاز نو ہو رہا ہے۔ میں نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ میں ''افریقن نیشنل کانگریس کا ایک وفادار اور نظم کا پابند رکن ہوں۔'' میں نے لوگوں کو حوصلہ دلاتے ہوئے کہا کہ وہ جدوجہد میں زور پیدا کرنے کے لیے اپنے اپنے مساکن کی طرف لوٹ جائیں اور ہم عنری میل اکٹھے طے کریں گے۔

سٹاک ہولم سے فون کال

جب میری تقریر ختم ہوئی' شام ہو گئی تھی۔ تب ہمیں سرعت سے کاروں میں بشپس کورٹ کا چکر لگوانے کے لیے لے جایا گیا۔ جب ہم اس کے پاکیزہ پرانے ماحول میں داخل ہوئے' میں نے سینکڑوں سیاہ چہرے اپنے استقبال کے لیے منتظر پائے۔ جب انہوں نے ہمیں دیکھا' وہ خوشی کے گیت الاپنے لگے۔ میں نے آگے بڑھ کر آرچ بشپ ٹوٹو کو سلام کیا اور ان سے بغل گیر ہو گیا۔ یہ وہ شخصیت تھی جس نے اپنے الفاظ اور عزم سے ایک پوری قوم میں جوش و جذبہ پیدا کیا تھا اور تاریک ترین دنوں کے دوران لوگوں کے دلوں میں امید کی شمع جلائے رکھی تھی۔ ہمیں کوٹھی کے اندر لے جایا گیا جہاں خاندان کے مزید افراد اور دوستوں سے ہماری ملاقات ہوئی لیکن میرے لیے سب سے حیرت انگیز لمحہ وہ تھا جب مجھے بتایا گیا کہ میرے لیے سٹاک ہولم سے ایک ٹیلی فون کال ہے۔ میں فوراً جان گیا کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔ آلیور ٹیمبو کی آواز دھیمی مگر صاف پہچانی جا رہی تھی اور اتنے برسوں بعد یہ آواز سن کر میں خوشی سے معمور ہو گیا۔ آلیور اگست ء میں فالج کے نحیف کر دینے والے حملے میں مبتلا ہوا تھا اور اب سویڈن میں صحت یاب ہو رہا تھا۔ ہم نے اس امر پر اتفاق کیا کہ جتنا جلد ممکن ہو ملاقات کی جائے۔

جیل سے رخصت ہوتے وقت میں نے سوچا کہ میں ٹرانسکائی کی ایک پر مسرت

ڈرائیو پر نکل جاؤں گا اور اپنی جنم بھومی اور ان پہاڑیوں اور ندیوں کی زیارت کروں گا جہاں میں بچپن میں کھیلا کرتا تھا اور اپنی والدہ کی قبر پر حاضری دوں گا جس پر حاضر ہونے کی سعادت سے میں ابھی تک بہرہ ور نہیں ہوا تھا۔ لیکن مجھے اپنا یہ خواب موخر کر دینا پڑا کیونکہ اے این سی نے میرے لیے جو وسیع منصوبے بنائے تھے ان میں سے کسی میں ابھی ٹرانسکائی کے آرام دہ سفر کی گنجائش نہیں تھی۔

گوری خاتون کا اعتراض

پروگرام یہ تھا کہ اپنی رہائی کے بعد سہ پہر کو میں پریس کانفرنس سے خطاب کروں لہذا صبح کو میں نے اپنے کئی ساتھیوں سے اپنے پروگرام اور اسٹرائیجی پر گفتگو کی۔ تہنیتی پیغامات اور مبارکبادوں کا ایک چھوٹا پہاڑ جمع ہو گیا تھا اور میں نے ممکن حد تک بہت سوں پر نگاہ ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ پیغامات دنیا بھر سے صدور اور وزرائے اعظم کی طرف سے آئے تھے لیکن ایک پیغام مجھے خاص طور پر یاد ہے جو کیپ ٹاؤن کی ایک سفید فام خاتون خانہ کی طرف سے تھا اور اس نے مجھے بڑا محفوظ کیا۔ اس میں تحریر تھا: ''میں بہت خوش ہوں کہ آپ آزاد ہو گئے ہیں اور یہ کہ آپ اپنے دوستوں اور اہل خانہ میں واپس آ گئے ہیں لیکن کل آپ کی تقریر بڑی پھیکی تھی۔''

جیل جانے سے پہلے میں نے ایسی پریس کانفرنس کبھی نہیں کی تھی جیسی اس روز کی پرانے دنوں میں ٹی وی کیمرے نہیں ہوتے تھے اور بیشتر اے این سی کانفرنسیں خفیہ طور پر منعقد ہوتی تھیں۔ اس سہ پہر صحافی اتنے سارے ملکوں سے آئے ہوئے تھے اور مجھے سجھائی نہیں دے رہا تھا کس سے بات کروں۔ اس ہجوم میں سیاہ فام صحافیوں کی خاصی بڑی تعداد کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ پریس کانفرنس میں ایک بار پھر میں کئی تصورات کی توثیق کرنا چاہتا تھا۔ اول یہ کہ میں اے این سی کا وفادار اور ضابطہ پسند رکن تھا۔ میں اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ اے این سی کے بیشتر سینئر لوگ بیرون ملک سے میری رہائی کو دیکھ رہے ہوں گے اور فاصلے سے میری وفاداری کا اندازہ کرنے

کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ میں جانتا تھا کہ انہوں نے افواہیں سن رکھی ہیں کہ میں نے پارٹی سے منہ موڑ لیا ہے اور یہ کہ میں نے مفاہمت کر لی ہے' لہٰذا میں انہیں ہر پہلو سے یقین دہانی کرانا چاہتا تھا۔ جب مجھ سے پوچھا گیا کہ میں پارٹی میں کیا کردار ادا کروں گا۔ تو میں نے پریس کو بتایا کہ اے این سی مجھے جو بھی کردار سونپے گی وہ میں ادا کروں گا۔

میں نے رپورٹروں کو بتایا کہ میرے مسلح جدو جہد کی حمایت جاری رکھنے اور میرے بات چیت کی وکالت کرنے کے مابین کوئی تضاد نہیں۔ یہ مسلح جدو جہد کی حقیقت اور خطرہ ہی تھا جو حکومت کو بات چیت کی طرف لایا تھا۔ میں نے مزید کہا کہ جب حکومت اے این سی پر تشدد کرنے سے رک جائے گی تو اے این سی اسی قدر امن کی طرف بڑھے گی۔ جب پابندیوں کے بارے میں پوچھا گیا تو میں نے کہا کہ اے این سی ابھی پابندیاں نرم کرنے کا مطالبہ نہیں کر سکتی کیونکہ وہ صورت حال جو اول طور پر پابندیوں کا باعث بنی تھی۔ سیاہ فاموں کے لیے سیاسی حقوق کا فقدان وہ بدستور موجود ہے۔ میں نے کہا کہ میں جیل سے باہر ہو سکتا ہوں مگر میں ابھی آزاد نہیں ہوں۔

پریس کانفرنس کا مشکل مرحلہ

مجھ سے گوروں کے خدشات کے متعلق بھی پوچھا گیا۔ میں جانتا تھا کہ لوگ مجھ سے توقع رکھتے ہیں کہ میں گوروں سے ناراضی کا اظہار کروں۔ لیکن میں نے ایسی کوئی بات نہ کی۔ جیل میں گوروں سے میری ناراضی کم ہو گئی تھی' لیکن اس نظام سے میری نفرت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں جنوبی افریقہ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں اپنے دشمنوں سے بھی پیار کرتا ہوں جبکہ مجھے اس نظام سے نفرت ہے جس نے ہمیں ای دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا ہے۔

میں کسی بھی نئے نظام میں سفید فاموں کے اہم کردار کو رپورٹروں پر واضح کرنا

چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ حقیقت کبھی میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوئی ۔ہم ملک کی آزادی سے پہلے اسے تباہ کرنا نہیں چاہتے' اور گوروں کو نکال باہر کرنے سے قوم تباہ ہو جائے گی۔ میں نے کہا کہ گوروں کے خدشات اور کالوں کی امیدوں کے ما بین ایک درمیانی جگہ ہے اور ہم اے این سی والے اسے پالیں گے۔ ''گورے ہم وطن جنوبی افریقی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اور میں چاہتا ہوں کہ انہیں تحفظ کا احساس ہو اور وہ یہ جان لیں کہ ہم ان کے اس کردار کی نسلی امتیاز کو چھوڑ دے ہم اسے ایک جمہوری غیر نسلی جنوبی افریقہ کے لیے اپنی جدو جہد میں خوش آمدید کہیں گے۔ ہمیں اپنے گورے ہم وطنوں کو ترغیب دینے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ ایک نیا غیر نسلی جنوبی افریقہ سب کے لیے ایک بہتر مقام ہوگا۔

میں نے اپنی پہلی پریس کانفرنس کے آغاز ہی سے یہ مشاہدہ کیا کہ صحافی میرے ذاتی احساسات اور تعلقات کے بارے میں جاننے کے اتنے ہی مشتاق ہیں جتنے میرے سیاسی خیالات کے بارے میں۔ یہ میرے لیے نئی بات تھی۔ جب میں جیل گیا تھا تو کسی صحافی نے کبھی میری بیوی' میرے خاندان' میرے جذبات' میرے انتہائی داخلی لمحات کے متعلق سوالات نہیں کیے تھے۔ اگر چہ یہ امر قابل فہم تھا کہ پریس والوں کو ان باتوں میں دلچسپی ہو سکتی ہے' تاہم ان کے تجسس کو تسکین دینا میرے لیے مشکل تھا۔ میں کبھی ایسا شخص نہیں رہا جو عوام کے سامنے اپنے احساسات کو بیان کرنا آسان پاتا ہو۔ رپورٹروں نے اکثر مجھ سے پوچھا کہ مجھے آزاد ہونا کیسا محسوس ہوتا ہے اور میں نے ناقابل بیان کو بیان کرنے کی پوری پوری کوشش کی اور بالعموم اس میں ناکام رہا۔

پریس کانفرنس کے بعد آرچ بشپ ٹوٹو کی بیوی نے جوہانس برگ سے فون پر بتایا کہ ہمیں سیدھے وہاں پہنچ جانا چاہیے۔ ونی کو اور مجھے امید تھی کہ ہم چند روز کیپ ٹاؤن میں سستانے میں گزاریں گے لیکن ہمیں جو پیغام موصول ہو رہا تھا وہ یہ تھا

کہ جوہانس برگ کے لوگ بے چین ہو رہے ہیں اور اگر میں گی الفور نہ پہنچا تو وہاں ابتری پھیل جائے گی۔ چنانچہ اس شام ہم نے جاہانس برگ کی پرواز پکڑی لیکن مجھے بتایا گیا کہ لوگ آرلینڈ و ویسٹ میں ہمارے پرانے گھر نمبر 8115 کو گھیرے ہوئے ہیں جس کی تعمیر نو کی گئی ہے اور یہ کہ وہاں جانا دانشمندی نہ ہو گا۔ میں بادل نخواستہ مان گیا اگرچہ میں چاہتا تھا کہ اپنی آزادی کی دوسری رات میں اپنی چھت کے نیچے گزاروں۔ اس کے بجائے ونی اور میں شمالی مضافات میں اے این سی کے ایک حامی کے ہاں ٹھہرے۔

اگلے دن ہم نے ہیلی کاپٹر کے ذریعے سوویٹو کے فرسٹ نیشنل بنک سٹیڈیم کی طرف پرواز کی۔ ہم نے سوویٹو کا فضائی جائزہ لیا جو ماچس کے ڈبیوں جیسے مکانات ٹن کی چھتوں والے گھروندوں اور غلاظت سے اٹی سڑکوں کا بھرا پرا شہر تھا' سیاہ فام شہری جنوبی افریقہ کا مادر شہر جسے میں کبھی جیل جانے سے پہلے ایک آدمی کی حیثیت سے اپنا واحد گھر خیال کرتا تھا۔ اگرچہ سوویٹو پھیل گیا تھا اور بعض جگہوں پر اس نے خوشحالی بھی پالی تھی مگر باشندوں کی بھاری اکثریت خوفناک غربت سے دوچار تھی اور بجلی اور بہتے پانی سے محروم' ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھی جو جنوبی افریقہ جیسی دولتمند قوم کے لیے شرمناک تھی۔

سوویٹو برادری میں تقریر

ہم نے ایک لاکھ بیس ہزار لوگوں کے اوپر سے اڑتے ہوئے سٹیڈیم کا چکر لگایا اور اس کے وسط میں اتر گئے۔ سٹیڈیم اس قدر پر ہجوم تھا کہ یوں لگتا تھا یہ پھٹ جائے گا۔ میں نے اپنی تقریر میں خوشی ظاہر کی کہ میں واپس ان میں آ گیا ہوں لیکن پھر میں نے شہری سیاہ فام زندگی کے بعض ہوشربا مسائل پر لوگوں کی زجر و توبیخ کی۔ میں نے کہا کہ طلبہ کو سکولوں میں واپس جانا چاہیے۔ جرائم پر قابو پایا جانا چاہیے۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مجرم مجاہدین آزادی کے روپ میں تباہی مچا رہے ہیں

معصوم شہریوں کو ہراساں کر رہے ہیں اور گاڑیوں کو نذر آتش کر رہے ہیں' ان بدمعاشوں کے لیے تحریک میں کوئی جگہ نہیں۔ تہذیب کے بغیر آزادی اور پرامن رہنے کی اہلیت کے بغیر آزادی ہرگز حقیقی آزادی نہیں۔

میں نے کہا:

''آج میری سوویٹو واپسی پر میرا دل خوشی سے بھر آیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے افسردگی کا گہرا احساس بھی ہے۔ افسردگی یہ جان کر ہوتی ہے کہ آپ ابھی تک ایک غیر انسانی نظام کے تحت مصائب جھیل رہے ہیں۔ مکانات کی قلت' سکولوں کا بحران' بیروزگاری اور بڑھتے ہوئے جرائم ہنوز موجود ہیں۔ سوویٹو برادری کا حصہ ہونے پر مجھے فخر ہے مگر اخبارات میں جرائم کے اعداد و شمار پڑھ کر میں بے حد پریشان ہوا ہوں۔ ہمارے لوگ جن محرومیوں سے دوچار ہیں۔ میں انہیں سمجھتا ہوں لیکن مجھے یہ واضح کر دینا چاہیے کہ ٹاؤن شپ میں جرائم کی شرح غیر صحت مندانہ ہے اور اولین ترجیح کے ساتھ اس کا استیصال کرنا ہوگا۔''

میں نے تقریر کا اختتام تمام جنوبی افریقیوں کے لیے خیر خواہی اور خیر سگالی کے بازو پھیلاتے ہوئے یہ کہہ کر کیا کہ ''ایک غیر نسلی' متحدہ اور جمہوری جنوبی افریقہ کے لیے' جس کی اساس رائے دہندگان کی مشترکہ فہرست اور ایک فرد ووٹ کے اصول پر ہوگی' کسی آدمی یا عورت کو' جس نے نسلی امتیاز کو چھوڑ دیا ہے' ہماری تحریک سے باہر نہیں رکھا جائے گا۔'' یہی اے این سی کا مشن اور مقصد تھا جسے میں نے قیدی کے طویل تنہا برسوں کے دوران ہمیشہ اپنے سامنے رکھا تھا' وہ مقصد جس کے لیے میں اپنی زندگی کے بقیہ برسوں کے دوران بدستور کام کرتا رہوں گا۔ یہی وہ خواب تھا جسے میں اس وقت بھی دل سے چاہتا تھا جب میں چوالیس سال کی عمر میں جیل میں داخل ہوا تھا لیکن اب جوان آدمی نہیں ہوں بلکہ اکہتر سال کا ہوں اور اب کوئی وقت ضائع کرنے کی گنجائش نہیں پاتا۔''

میرے ذہنی جغرافیہ کا چلیپا

اس رات میں وِنی کے ہمراہ آرلینڈو ویسٹ میں نمبر 8115 پہنچ گیا۔ یہیں آ کر مجھے دلی طور پر محسوس ہوا کہ میں جیل سے باہر آ گیا ہوں۔ میرے نزدیک نمبر 8115 میری دنیا کا مرکزی نقطہ تھا' وہ جگہ جہاں میرے ذہنی جغرافیہ میں ایکس (X) کا نشان لگا ہوا تھا۔ چار کمروں کے اس مکان کو آتش زدگی کے بعد قرینے سے دوبارہ تعمیر کیا گیا تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا تو حیرت ہوئی کہ یہ میرے تصور کے مقابلے میں کس قدر چھوٹا اور سادہ تر تھا۔ وکٹر ورسٹر میں میری ''کٹیا'' کے مقابلے میں نمبر 8115 عقب کے سرونٹس کوارٹر کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن ہر وہ مکان جس میں کوئی شخص آزاد ہو' خواہ اس کا مقابلہ وسیع و عریض جیل سے کیا جائے' ایک قلعہ ہوتا ہے۔

اس رات' جیسا کہ گھر آ کر میں خوش و خرم تھا' مجھے احساس ہوا کہ جس چیز کی میں سب سے زیادہ خواہش اور تمنا رکھتا تھا' اس سے مجھے محروم رکھا جائے گا۔ میری آرزو تھی کہ میں از سر نو معمول کی زندگی شروع کروں' اپنی جوانی کی زندگی سے کچھ پرانے دھاگے پکڑوں' صبح اپنے دفتر جا سکوں اور شام کو اپنے اہل خانہ کے پاس لوٹ سکوں' باہر نکل کر فارمیسی سے کوئی ٹوتھ پیسٹ خرید سکوں اور شام کو پرانے دوستوں سے ملوں۔ ایک قیدی جیل میں ان عام سی باتوں کے لیے بہت ترستا ہے اور خواب دیکھتا ہے کہ جب وہ آزاد ہو گا تو یہ کام کرے گا۔ لیکن جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ ایسے کام اب میرے لیے ممکن نہیں رہے۔ اس رات اور اگلے ہفتوں اور مہینوں میں ہر رات میرا مکان میرے سینکڑوں چاہنے والوں سے گھرا رہتا تھا۔ لوگ گاتے' ناچتے اور پکارتے اور ان کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ میرے لوگ تھے اور مجھے کوئی حق نہ تھا اور کوئی خواہش نہ تھی کہ میں اپنے آپ کو ان سے دور رکھوں۔ لیکن اپنے آپ کو اپنے عوام کے سپرد کر کے میں دیکھ رہا تھا کہ ایک بار پھر میں خود کو اپنے

اہل خانہ سے دور لے جا رہا ہوں۔

اس رات ہم زیادہ نہ سوئے کیونکہ لوگوں کا گانا بجانا فجر تک جاری رہا تھا جب اے این سی اور یو ڈی ایف کے ارکان نے جو مکان کی حفاظت کر رہے تھے' ہجوم سے ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ وہ خاموش رہیں اور ہمیں آرام کرنے دیں۔ اے این سی میں بہت سے لوگ تھے جنہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں چند بلاک پرے وائپ کلوف ایکس ٹینشن میں اس گھر منتقل ہو جاؤں جو ونی نے تعمیر کرایا تھا جبکہ میں جیل میں تھا۔ سوویٹو کے معیار سے یہ ایک شاندار جگہ تھی لیکن یہ ایک ایسا مکان تھا جو میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا اور میری اس سے کوئی یادیں وابستہ نہ تھیں۔ مزید برآں یہ مکان اپنے سائز اور رقبے کے لحاظ سے عوام کے رہنما کے لیے قدرنا مناسب لگتا تھا' چنانچہ جہاں تک میرے لیے ممکن تھا میں نے یہ مشورہ مسترد کر دیا۔ میں نہ صرف اپنے لوگوں کے درمیان بلکہ انہی کی طرح رہنا چاہتا تھا۔

میں افریقی لیڈروں سے ملا

میری پہلی ذمے داری یہ تھی کہ اے این سی کی قیادت کو رپورٹ کروں' چنانچہ 27 فروری کو جب مجھے جیل سے باہر آئے ہوئے دو ہفتے گزر چکے تھے' میں نے نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی (این ای سی) سے ملاقات کے لیے لوساکا کا طیارہ پکڑا۔ پرانے ساتھیوں سے ملاقات ایک حیران کن تجربہ تھا جنہیں میں نے کئی دہائیوں سے نہیں دیکھا تھا۔ کئی افریقی سربراہان مملکت بھی موجود تھے' چنانچہ میں نے زمبابوے کے رابرٹ موگابے' زیمبیا کے کینتھ کاؤنڈا' بوٹسوانا کے کویٹ ماسیری' موزمبیق کے جواکویم شیسانو' انگولا کے جوزایڈورڈو ڈوس سانتوس اور یوگنڈا کے یووری موساوینی سے مختصر ملاقاتیں کیں۔

ایگزیکٹو کے ارکان جہاں خوش تھے کہ مجھے رہائی مل گئی ہے' وہ اس شخص کے ذہن میں جھانکنے کے خواہش مند بھی تھے جسے کئی دہائیوں بعد جیل سے رہا کیا گیا تھا۔

مجھے ان کی آنکھوں میں امنڈتے سوال نظر آ رہے تھے۔ کیا منڈیلا وہی آدمی ہے جو ستائیس برس پہلے جیل گیا تھا یا یہ ایک مختلف' ایک اصلاح یافتہ منڈیلا ہے؟ کیا اس کے ذہن میں بدستور شعلہ آزادی فروزاں ہے یا اس نے ہار مان لی ہے؟ انہیں حکومت سے میری گفت وشنید کی رپورٹیں ملی تھیں اور ان کی تشویش بجا تھی۔ ملک کی زمینی صورتحال سے میرا کوئی رابطہ نہیں رہا تھا کیونکہ 1984ء سے مجھے اپنے جیل کے ساتھیوں سے بھی الگ تھلگ رکھا گیا تھا۔

میں نے احتیاط اور سنجیدگی سے حکومت سے اپنی بات چیت کی وضاحت کی۔ میں نے جو مطالبات حکومت سے کیے تھے اور اس سلسلے میں جو پیشرفت ہوئی تھی' میں نے ان پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے وہ یادداشتیں دیکھی تھیں جو میں نے بوتھا اور ڈی کلارک کو لکھ بھیجی تھیں اور وہ جانتے تھے کہ یہ این سی کی پالیسی سے ہم آہنگ ہیں۔ مجھے علم تھا کہ گزشتہ برسوں میں جو لوگ رہا ہوئے تھے ان میں سے بعض نے لوساکا آ کر کہا تھا: ''مادیبا نرم پڑ گیا ہے۔ حکام نے اسے خرید لیا ہے۔ وہ تھری پیس سوٹ پہننے' شراب پینے اور عمدہ کھانا کھانے لگا ہے۔'' مجھے ان سرگوشیوں کا علم تھا اور میں ان کو تردید کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ انہیں مسترد کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ میں اپنے ہر فعل کے بارے میں براہ راست اور کھری بات بیان کروں۔

این ای سی کے اس اجلاس میں مجھے پارٹی کا ڈپٹی پریذیڈنٹ چن لیا گیا جبکہ پارٹی کے سیکرٹری جنرل الفریڈ انزو کو آلیور ٹیمبو کی صحت یابی کے دوران قائمقام صدر نامزد کیا گیا۔ ہماری ملاقات کے بعد پریس کانفرنس میں مجھ سے اس مشورے کے متعلق پوچھا گیا جو زیمبیا کے صدر اور کانگریس کے لمبے عرصے سے حامی کینتھ کاؤنڈا نے دیا تھا۔ یہ کہ ان حالات میں جبکہ مجھے رہا کر دیا گیا ہے' اے این سی کو جنوبی افریقہ کے اندر تمام مسلح کارروائیاں معطل کر دینی چاہئیں۔ میں نے جواب دیا اگرچہ ہم ڈاکٹر کاؤنڈا کی فراست اور حمایت کی قدر کرتے ہیں مگر مسلح جدوجہد کو اس مرحلے میں

ملتوی کرنا قبل از وقت ہوگا کیونکہ ہم نے ابھی وہ مقصد حاصل نہیں کیا جس کے لیے ہتھیار اٹھائے تھے۔ میں نے کہا کہ اے این سی کا کام نہیں کہ وہ مسٹر ڈی کلارک کے دائیں بازو کے حامیوں کو زمانے میں ان کی مدد کرے۔

میں نے افریقہ کا دورہ شروع کر دیا جس میں کئی ممالک شامل تھے۔ میری رہائی کے بعد پہلے چھ ماہ کے دوران میں نے زیادہ وقت گھر رہنے کے بجائے باہر گزارا۔ میں جہاں کہیں بھی گیا تقریباً ہر جگہ بڑے پر جوش ہجوم دیکھنے میں آئے حتیٰ کہ میرے تھکاوٹ محسوس کرنے کے باوجود لوگ مجھے کندھوں پر اٹھانے سے باز نہ آتے۔ دارالسلام میں تقریباً پانچ لاکھ کے ہجوم نے میرا استقبال کیا۔

میں نے اپنے ان سفروں سے بہت لطف اٹھایا۔ میں چاہتا تھا کہ پرانے اور نئے مناظر دیکھوں۔ مختلف کھانوں سے لطف اندوز ہوں اور ہر طرح کے لوگوں سے ملوں۔ مجھے بہت تیزی سے ایک ایسی دنیا سے خود کو آشنا کرنا تھا جو اس دنیا سے یکسر مختلف تھی جسے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ سفر، مواصلات اور ماس میڈیا کی تبدیلیوں سے دنیا کہیں آگے نکل گئی تھی۔ اب واقعات اتنی تیزی سے عمل میں آ رہے تھے کہ بعض اوقات ان کا ساتھ دنیا کہیں آگے نکل گئی تھی۔ اب واقعات اتنی تیزی سے عمل میں آ رہے تھے کہ بعض اوقات ان کا ساتھ دینا مشکل ہو رہا تھا۔ ونی نے مجھے آہستہ چلانے کی کوشش کی لیکن ہمارے سامنے بہت کچھ کرنے کو تھا۔ پارٹی اس امر کو یقینی بنانا چاہتی تھی کہ میری رہائی سے پیدا شدہ جوش و خروش سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔

قاہرہ میں دھکم پیل

قاہرہ میں مصری صدر حسنی مبارک سے ایک نجی ملاقات کے اگلے روز مجھے ایک مقامی ہال میں ایک بڑے ہال سے خطاب کرنا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو یوں لگتا تھا کہ عمارت ہجوم سے پھٹی پڑتی ہے مگر سیکورٹی کا انتظام ناقص تھا۔ میں نے ایک

پولیس مین سے کہا کہ میرے خیال میں اسے کمک درکار ہے لیکن اس نے محض کندھے اچکا دیئے۔ ونی اور میں ہال کے پیچھے ایک کمرے میں انتظار کر رہے تھے جب معین وقت پر ایک پولیس والے نے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ پہلے وہ میرے وفد کے باقی ارکان کو اندر لے جائے کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ جب میں اندر چلا گیا تو ہال میں ایسی ہل چل مچے گی کہ وہ مجھ سے کٹ کہ رہ جائیں گے۔ لیکن پولیس والے نے زور دیا کہ پہلے میں اندر چلوں اور واقعی جیسے ہی میں ہال کے اندر داخل ہوا ہجوم موج در موج آگے بڑھا اور پولیس والے بے بس ہو کے رہ گئے۔ لوگوں میں اس قدر جوش و خروش تھا کہ مجھے دھکے لگے اور میں ہل کے رہ گیا اور اس عوامی افراتفری کے ایک مرحلے میں تو میرا جوتا گم ہو گیا۔ چند منٹ بعد جب صورتحال سدھرنے لگی تو نہ کہیں میرا جوتا مل رہا تھا اور نہ میری بیوی کا اتہ پتہ تھا۔ آخر کار تقریباً ایک گھنٹہ بعد ونی کو میرے پاس اسٹیج پر لایا گیا۔ وہ اپنے ہجوم میں کھو جانے پر بہت کبیدہ خاطر تھی۔ میں ہجوم سے خطاب بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ ''منڈیلا منڈیلا'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ ان کی نعرہ بازی اس قدر شدید تھی کہ شور وغوغا میں کسی کو میری آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ آخر کار میں اپنے جوتے کے بغیر اور بے محل طور پر خاموش بیوی کے ساتھ اسٹیج سے اتر آیا۔

قاہرہ میں، میں نے ایک پریس کانفرنس منعقد کی جس میں کہا ''اے این سی دشمنیوں کے خاتمے پر غور کرنے کو تیار ہے۔'' یہ حکومت کے لیے ایک سگنل تھا۔ اے این سی اور حکومت دونوں ایک ایسی فضا پیدا کرنے میں مصروف تھیں جہاں مذاکرات کامیاب ہو سکتے تھے۔ جہاں اے این سی مطالبہ کر رہی تھی کہ حکومت ملکی صرتحال کو معمول پر لانے کے لیے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کرے اور نسلی امتیاز کے تمام قوانین منسوخ کرے، وہاں حکومت یہ تہیہ کیے ہوئے تھی کہ پہلے اے این سی کو مسلح جدوجہد ملتوی کرنے کی ترغیب دے۔ ادھر ہم ابھی ایسے التوا کا اعلان کرنے

کو تیار نہ تھے' تاہم مسٹر ڈی کلارک کی کافی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے تھے کہ وہ اپنی روبہ اصلاح پالیسیوں پر عمل پیرا رہیں۔ ہم جانتے تھے کہ آخر کار ہم مسلح جدوجہد ملتوی کر دیں گے' کچھ اس لیے کہ مزید سنجیدہ مذاکرات کی راہ ہموار ہو اور کچھ اس لیے کہ مسٹر ڈی کلارک کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے حلقہ انتخاب' جنوبی افریقہ کے سفید فام ووٹروں' کے پاس جا کر کہہ سکیں کہ ''دیکھیے یہ ہیں میری پالیسی کے نتائج۔''

آلیور ٹیمبو کا ایثار

افریقہ میں اپنے اس آخری سٹاک ہولم کی پرواز پکڑی۔ اپنے پرانے ساتھی اور قانونی شریک سے ملاقات کا میں سب سے زیادہ انتظار کر رہا تھا۔ آلیور کی صحت ٹھیک نہیں تھی۔ لیکن جب ملاقات ہوئی تو دیہات میں رہنے والے دو نوجوان لڑکوں کی طرح تھے جو ایک دوسرے کی محبت سے توانائی پاتے تھے' ہم نے پرانے دنوں کی باتوں سے آغاز کیا لیکن جب تنہائی میسر آئی تو اس نے جو پہلا مسئلہ اٹھایا وہ پارٹی کی قیادت کا تھا۔ اس نے کہا: ''نیلسن! تمھیں اب اے این سی کی صدارت سنبھال لینی چاہیے۔ میں محض تمہاری خاطر اب تک یہ ذمے داری نبھاتا آ رہا ہوں۔ میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جیسی میں پارٹی کی قیادت کر سکتا تھا تم نے اس سے کہیں بہتر قیادت کی ہے۔ اس انداز سے قیادت کی منتقلی منصفانہ ہے نہ جمہوری۔ میں نے کہا: ''تمھیں پارٹ نے صدر منتخب کیا ہے۔ آیئے اگلے انتخاب کا انتظار کریں' پھر پارٹی اپنا فیصلہ دے سکتی ہے۔'' آلیور نے احتجاج کیا مگر میں اپنی بات پر اڑا رہا۔ یہ اس کا انکسار اور بے غرضی تھی کہ وہ مجھے صدر مقرر کرنا چاہتا تھا مگر یہ بات اے این سی کے اصولوں کے خلاف تھی۔

اپریل 1990ء میں' میں نے لندن کو پرواز کی تاکہ ویمبلے میں ایک کنسرٹ میں شریک ہو سکو جو میرے اعزاز میں منعقد ہو رہا تھا۔ کئی بین الاقوامی فنکار جن میں سے اکثر کو میں نہیں جانتا تھا' اس میں کام کر رہے تھے اور یہ تقریب دنیا بھر میں ٹی

وی پر دکھائی جاتی تھی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دنیا کی نسلی امتیاز کی مخالف قوتوں کا اس عظیم کام کے لیے جو انہوں نے جنوبی افریقہ کی گوری حکومت پر عالمی پابندیاں لگوانے میں ادا کیا تھا، اپنی اور اپنے ساتھی سیاسی قیدیوں کی رہائی کے لیے اور ان کی اس پر خلوص امداد اور حمایت کے لیے شکریہ ادا کیا جس کا مظاہرہ انہوں نے میرے ملک کے مظلوم عوام کے لیے کیا تھا۔

چیف بوتھیلزی کا مثبت اور منفی کردار

جب میں جیل سے نکلا، انکا تھا فریڈم پارٹی کے سربراہ اور ''کوازولو'' کے وزیر اعلیٰ چیف منگوسوتھو بوتھیلزی، جنوبی افریقہ کے سیاسی اسٹیج پر ایک بڑے کھلاڑی تھے۔ لیکن اے این سی کے حلقوں میں وہ ذرا بھی مقبول نہیں تھے۔ چیف بوتھیلزی کا شجرہ نسب عظیم زولو بادشاہ سیٹی وایو سے ملتا تھا جس نے 1879ء میں اساندلوانہ کی جنگ میں انگریزوں کو شکست دی تھی۔ اپنی نوجوانی میں بوتھیلزی نے فورٹ ہیئر میں تعلیم پائی تھی اور پھر وہ اے این سی یوتھ لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ میں انہیں تحریک آزادی کے آگے بڑھتے ہوئے نوجوان رہنماؤں میں دیکھتا تھا۔ وہ اے این سی کی کھلی مدد سے کوازولو ہوم لینڈ کے وزیر اعلیٰ بن گئے تھے اور جب انہوں نے انکا تھا پارٹی کی ایک زولو ثقافتی تنظیم کے طور پر بنیاد رکھی تو اے این سی نے اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ لیکن گزشتہ برسوں کے دوران ان چیف بوتھیلزی اے این سی سے دور چلے گئے تھے۔ اگر چہ وہ نسلی امتیاز کی ڈٹ کر مخالفت کرتے تھے اور کوازولو کے حکومت کے حسب خواہش ایک ''آزاد'' ہوم لینڈ بننے کی اجازت دینے سے انکار کرتے تھے مگر وہ جمہوری تحریک کے پہلو میں ایک کانٹا بن کر چبھ رہے تھے۔ وہ مسلح جدوجہد کی مخالفت کر رہے تھے۔ انہوں نے 1976ء کی سوویٹو بغاوت پر تنقید کی۔ انہوں نے جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت پر عالمی پابندیوں کے خلاف مہم چلائی۔ انہوں نے یونیٹری سٹیٹ آف ساؤتھ افریقہ کے تصور کو چیلنج کیا۔ پھر بھی چیف بوتھیلزی

نے مسلسل میری رہائی کا مطالبہ کیا تھا اور اس وقت تک حکومت سے بات چیت سے انکار کر دیا تھا جب تک مجھے اور دیگر سیاسی قیدیوں کو رہا نہ کر دیا جائے۔

چیف بوتھیلزی ان اولین آدمیوں میں شامل تھے جنہیں میں نے اپنی رہائی کے بعد ٹیلی فون کر کے ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے طویل عرصے سے میری حمایت کی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ جتنا جلد ممکن ہو چیف سے مل کر اپنے اختلافات طے کرنے کی کوشش کروں۔ اپنے لوساکا کے ابتدائی دورے کے دوران میرے ذہن میں ایک اس نوع کی ملاقات کا خیال جاگزین تھا مگر ساتھیوں نے اسے مسترد کر دیا۔ جب میں وکٹر ورسٹر میں تھا' زولو بادشاہ گڈول زویلی تھینی نے والٹر کو دعوت دی تھی وہ ان سے کوازولو کے صدر مقام الونڈی میں آ کر ملے اور میں نے والٹر پر زور دیا تھا کہ وہ یہ دعوت قبول کر لے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ ملک کے ایک معزز ترین اور طاقتور ترین شاہی خانوادے کے سربراہ پر اثر انداز ہونے کا شاندار موقع تھا۔ اے این سی نے اس شرط پر اس مجوزہ ملاقات کی پرزور منظوری دی کہ والٹر' ئونگوما میں بادشاہ کے محل میں ملاقات کرے۔ پارٹی کا خیال یہ تھا کہ الونڈی جا کر ملنا ہوم لینڈ کی اتھارٹی کو تسلیم کرنے کے مترادف ہوگا۔

بادشاہ کا ملنے سے انکار

جب میں لوساکا سے لوٹا تو میں نے چیف بوتھیلزی اور بادشاہ دونوں کو فون کر کے بتایا کہ والٹر بادشاہ سے الونڈی میں نہیں بلکہ ئونگوما میں ملاقات کرے گا۔ بادشاہ نے کہا کہ انہیں دارالحکومت کے سوا کہیں اور والٹر کا ان سے ملاقات کو آنا منظور نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا: ''میں بادشاہ ہوں' میں نے اسے الونڈی میں آ کر ملنے کی دعوت دی ہے اور اسے کہنے کا کوئی حق نہیں کہ وہ مجھ سے کہیں اور ملے گا۔'' میں نے کہا: ''عالیجاہ! ہمیں اپنی پارٹی والوں کی طرف سے مخالفت کی ایک دیوار کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو سرے سے نہیں چاہتے تھے کہ مسٹر والٹر میسولو کوازولو جائیں۔ ہم نے

اس مفاہمت کی منظوری کا اہتمام کیا۔ اب آپ کو بھی کچھ جھکنا چاہیے۔'' لیکن وہ نہ جھکے اور انہوں نے والٹر سے ملنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد تعلقات کشیدہ ہو گئے اور پھر مئی میں، میں نے اے این سی کو ترغیب دی کے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ میں بادشاہ اور بوتھیلزی سے جا کر ملوں۔ بادشاہ نے منظوری دے دی لیکن ملاقات سے ہفتہ عشرہ پہلے مجھے ان کا خط ملا کہ میں تنہا ملاقات کو آؤں۔ یہ خط آخری تنکا ثابت ہوا اور این ای سی نے ایسا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ میں نے بادشاہ کو بتا دیا کہ میں اپنے ساتھیوں کے بغیر ملاقات نہیں آسکتا۔ بادشاہ نے اسے اپنی ایک اور توہین گردانا اور ملاقات منسوخ کر دی۔

میں چاہتا تھا کہ بادشاہ سے آزادانہ رابطہ استوار کروں جو چیف بوتھیلزی سے میرے روابط سے جداگانہ ہو۔ بادشاہ زولو قوم کے حقیقی موروثی رہنما تھے جوان سے محبت کرتی اور ان کا احترام کرتی تھی۔ ''کوازولو'' میں انکاتھا پارٹی سے تعلق کی نسبت بادشاہ سے وفاداری کا کہیں زیادہ چرچا تھا۔

موت کے کارخانے

اسی دوران نٹال میں قتل و غارت بڑھ گئی۔ انکاتھا کے پوری طرح مسلح حامیوں نے وسطی نٹال اور پیٹر مارزبرگ کے گردونواح کے علاقوں میں جو اے این سی کے گڑھ تھے، عملاً اے این سی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ پورے پورے گاؤں جلا دیئے گئے، درجنوں لوگ مارے گئے، سینکڑوں زخمی ہوئے اور ہزاروں بے گھر ہو گئے۔ صرف مارچ 1990ء میں اس گروہی تشدد میں 203 افراد کی جانیں ضائع ہوئیں۔ نٹال میں زولو، زولو کو ہلاک کر رہے تھے کیونکہ انکاتھا کے ارکان اور اے این سی کے حامی سب زولو ہیں۔ میں اپنی رہائی کے صرف دو ہفتے بعد فروری میں ڈربن گیا اور کنگز پارک میں ایک لاکھ سے اوپر کے مجمع سے خطاب کیا جو تقریباً سب زولو تھے۔ میں نے ان سے التماس کیا کہ ہتھیار پھینک دیں اور پرامن ہو کر ایک

دوسرے کے بازو تھام لیں۔ میں نے کہا: ''اپنی گنیں، اپنے چاقو اور اپنے ''پانگا'' سب اٹھا کر سمندر میں پھینک دو! موت کے کارخانے بند کردو! اب یہ جنگ ختم کرو!'' لیکن میری یہ پکار صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ لڑائی جاری رہی اور انسان مرتے رہے۔

مجھے اس خونریزی کا اتنا قلق تھا کہ میں ہر صورت میں چیف بوتھیلزی سے جا کر ملنے کو تیار تھا۔ تشدد کی ایک نہایت بھیانک لہر کے بعد مارچ میں، نے یک طرفہ طور پر اعلان کردیا کہ میں پیٹر مارزبرگ کے باہر ایک پہاڑی گاؤں میں ان سے ملوں گا۔ ذاتی سطح پر چیف سے میرے تعلقات گہرے اور احترام پر مبنی تھے اور مجھے امید تھی کہ میں اس قربت سے فائدہ اٹھا سکوں گا۔ لیکن مجھے پتہ چلا کہ ایسی ملاقات نٹال کے اے این سی لیڈروں کے نزدیک اہانت آمیز ہوگی۔ وہ اسے خطرناک خیال کرتے تھے چنانچہ انہوں نے اسے مسترد کردیا۔ میں پیٹر مارزبرگ ضرور گیا جہاں میں نے اے این سی کے حامیوں کی جلی ہوئی لاشیں دیکھیں اور ان کے غمزدہ اہل خانہ کو پرسا دینے کی کوشش کی لیکن میں نے شیف بوتھیلزی سے ملاقات نہ کی۔

ڈی کلارک سے خفیہ ملاقات

اپنی اپنی جماعتوں کے اندر خاصی گفت وشنید کے بعد ہم نے مسٹر ڈی کلارک اور حکومت سے اپنی پہلی روبرو ملاقات طے کرلی یہ ''باضابطہ مذاکرات کے بارے میں مذاکرات'' تھے اور ان کا آغاز اوائل اپریل سے ہونا تھا۔ لیکن 26 مارچ کو جوہانس برگ سے تقریباً تیس میل جنوب میں واقع سیبوکنگ ٹاؤن شپ میں پولیس نے بغیر کسی انتباہ کے اے این سی کے مظاہرین پر فائر کھول دیا۔ اس سانحے میں بارہ افراد ہلاک اور سینکڑوں زخمی ہوئے جن میں سے اکثر کو پشت پر گولیاں لگی تھیں جب وہ بھاگ رہے تھے۔ پولیس نے مظاہرین سے نپٹنے میں مہلک اسلحہ استعمال کیا تھا جو ناقابل برداشت تھا۔ پولیس نے دعویٰ کیا کہ ان کی اپنی جانیں خطرے میں تھیں لیکن

کئی مظاہرین جن کی پشت پر گولیاں لگی تھیں' ان کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھے۔ ایک غیر مسلح شخص جو بھاگ رہا ہو اس سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ ہمارا اپنے منصفانہ مطالبات کے حق میں جمع ہو کر مظاہرہ کرنے کا حق حکومت کی طرف سے کوئی ایسی نوازش نہیں تھی جو اس کی صوابدید پر منحصر ہو۔ اس طرح کے اقدام پر اوروں کی طرح مجھے بھی غصہ آیا اور میں نے پریس والوں کو بتایا کہ جنوبی افریقہ میں ہر گورا پولیس مین ہر کالے آدمی کو ایک فوجی ہدف گردانتا ہے۔ نیشنل ایگزیکٹیو کمیٹی سے مشاورت کے بعد میں نے مذاکرات کے التوا کا اعلان کیا اور مسٹر ڈی کلارک کو انتباہ کیا کہ اسے ایک طرف مذاکرات کی بات کرنے اور دوسری طرف ہمارے لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

لیکن ہمارے باضابطہ مذاکرات کے التوا کے باوجود میں پارٹی لیڈرشپ کی منظوری سے نجی طور پر کیپ ٹاؤن مین مسٹر ڈی کلارک سے ملا تا کہ مذاکرات کے لیے مومینٹم برقرار رکھا جائے۔ ہماری بات چیت ایک نئی تاریخ پر مرکوز رہی اور آخری کار ہم اوائل مئی پر متفق ہو گئے۔ میں نے سیبوکنگ میں پولیس کے خوفناک طرز عمل اور گوروں اور کالوں سے اس کے غیر مساوی برتاؤ کا مسئلہ اٹھایا اور احتجاج کیا کہ پولیس نے دائیں بازو کے گورے مظاہرین کی طرف کبھی اپنی بندوقیں سیدھی نہیں کیں۔

حکومت کو مذاکرات شروع کرنے کی کوئی جلد نہیں تھی۔ وہ اس توقع پر تکیہ کیے ہوئے تھی کہ میری رہائی سے جنم لینے والا جوش و خروش جلد ختم ہو جائے گا۔ ارباب حکومت مجھے وقت دینا چاہتے تھے کہ میں تھک ہار کر ان کے سامنے جھک جاؤں اور یہ ظاہر کروں کہ سابق قیدی جسے نجات عہندہ خیال کیا جاتا تھا' بڑا ہی بودا شخص ہے جس کا موجودہ صورتحال سے کوئی رابطہ نہیں۔

گوروں کی نئی گیم

اپنے بظاہر ترقی پسندانہ اقدامات کے باوجود مسٹر ڈی کلارک کوئی بڑے دور اندیش نہ تھے۔ وہ بتدریج پیش قدمی کرنے والے اور محتاط ضابطہ پرست تھے۔ انہوں نے اپنی کوئی اصلاحات اس ارادے سے نافذ نہیں کی تھیں کہ وہ اقتدار سے باہر ہو جائیں گے۔ ان کا مقصد اس کے برعکس تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک نئے نظام میں افریکروں کے برسر اقتدار رہنے کو یقینی بنایا جائے۔ وہ دراصل گوروں کی حکمرانی کے خاتمے کے لیے مذاکرات کرنے کو تیار نہیں تھے۔

ان کا ہدف یہ تھا کہ گروہی حقوق پر مبنی شراکت اقتدار کا ایک نظام وضع کیا جائے جو جنوبی افریقہ میں گورے اقتدار کی ایک ترمیم شدہ شکل کو تحفظ دے۔ وہ اکثریت کی حکمرانی یا Simple Majoritarianism کے' جیسا کہ وہ بعض اوقات کہا کرتے تھے' ارادتاً خلاف تھے کیونکہ اس سے بیک جنبش قلم گری حکمرانی کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ ہم شروع ہی سے جانتے تھے کہ حکومت جیتنے والے کے حق حکمرانی (Winner-takes-all) پر استوار ویسٹ منسٹر پارلیمانی نظام کی شدید مخالف ہے اور اس کے بجائے متناسب نمائندگی کے لیے ایسے نظام کی حامی ہے جس میں گوری حکمرانی کے لیے داخلی انتظامی ضمانتیں رکھی گئی ہوں۔ اگرچہ ڈی کلارک سیاہ فام اکثریت کو ووٹ ڈالنے اور قانون سازی کرنے کی اجازت دینے کو تیار تھے مگر وہ چاہتے تھے کہ اقلیت کے ویٹو کا حق برقرار رہے۔ شروع ہی سے مجھے اس منصوبے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے مسٹر ڈی کلارک سے کہا کہ یہ تو ''نئے بھیس میں نسلی امتیاز'' یا ہارنے والے کے حق حکمرانی (Loser takes all) پر استوار نظام ہو گا۔

ہماری قوت پر قابو پانے کے لیے نیشنلسٹوں کی طویل المیعاد سٹراٹیجی یہ تھی کہ انکا تھا فریڈم پارٹی کے ساتھ اے این سی دشمن اتحاد کر لیا جائے اور صوبہ کیپ کے رنگ دار افریکان بولنے والے ووٹروں کو ایک نئی نیشنل پارٹی میں شامل ہونے کی

ترغیب دی جائے۔میری رہائی کے لمحے سے وہ بوتھیلزی اور کیپ کے رنگ دار ووٹروں دونوں کو اپنی طرف مائل کرنے لگے تھے۔حکومت نے رنگ دار آبادی کو یہ کہہ کر ڈرانے کی کوشش کی تھی کہ اے این سی رنگ دار دشمن ہے۔وہ چیف بوتھیلزی کی اس خواہش کی حمایت کرتی تھی کہ نئے جنوبی افریقہ میں زولو اقتدار اور تشخص کو بر قرار رکھا جائے اور اسی لیے گروہی حقوق اور وفاقیت (فیڈرلزم) کا نظریہ ان کے ذہن میں اتارتی رہتی تھی۔

کسی کے سر پر سینگ نہیں

حکومت سے مذاکرات کا پہلا مرحلہ اوائل مئی کے تین دنوں پر محیط رہا۔ہمارے وفد میں والٹر سیسولو،جو سلاوو،الفریڈ انزو،تھابو امبیکی،احمد کاتھرادا،جو موڈیسی،روتھ مومپاتی،آرکائی گومیدی،ریورنڈ بائرز ناؤڈی،چیرل کیرولس اور میں شامل تھے۔جائے مذاکرات گروٹ شور،کیپ ڈش سٹائل کی عمارت تھی جو جنوبی افریقہ کے پہلے استعماری گورنروں کی رہائش گاہ تھی جن میں سیل رڈز بھی شامل تھے۔ہمارے وفد کے بعض ساتھی مذاق کرتے تھے کہ ہمیں دشمن کی زمین پر گھات میں دھکیلا جا رہا ہے۔

لیکن مذاکرات توقع کے برعکس سنجیدگی سے اور اچھے لطیف ماحول میں ہوئے۔تاریخی دشمن جو ایک دوسرے سے تین صدیوں سے لڑتے چلے آ رہے تھے،باہم ملے اور انہوں نے ایک دوسرے سے مصافحے کیے۔کئی ایک نے حیرت ظاہر کی کہ ایسے مذاکرات پہلے کیوں نہ منعقد ہوئے۔حکومت نے کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری جو سلاوو اور ''ایم کے'' کمانڈر جو موڈیسی کو عارضی امان دے دی تھی اور ان دونوں کا نیشنل پپارٹی کے لیڈروں سے ہاتھ ملاتے دیکھنا جنہوں نے کئی دہائیوں سے ان کو ابلیس مشہور کر رکھا تھا،ایک غیر معمولی بات تھی۔جیسا بعد میں تھابو امبیکی نے کہا،ہر فریق پر یہ انکشاف ہوا ہوا کہ دوسرے فریق کے سر پر کوئی سینگ نہیں ہیں۔

مذاکرات بذات خود ہمارے ملک کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل تھے۔ جیسا کہ میں نے واضح کیا یہ ملاقات نہ صرف اس کاز کی نمائندگی کرتی تھی جس کے لیے اے این سی اتنے برسوں سے جدوجہد کر رہی تھی بلکہ یہ آقا و غلام کے اس تعلق کا بھی خاتمہ کرتی تھی جو جنوبی افریقہ میں کالے اور گوروں کے تعلقات کا خاصہ تھا۔ ہم اب مذاکرات کے لیے درخواست گزار بن کر نہیں بلکہ ساتھ جنوبی افریقیوں کی حیثیت سے آئے تھے اور مذاکرات کی میز پر ہمیں مساوی درجہ حاصل تھا۔

پہلا دن کم و بیش تاریخ کا سبق تھا۔ میں نے اپنے ہم مرتبہ فریق پر واضح کیا کہ اے این سی 1912ء میں اپنی تشکیل سے لے کر ہمیشہ برسر اقتدار حکومت سے گفت و شنید کیلئے کوشاں کے طور پر وضع کیا گیا تھا مگر یہ عملاً موثر ثابت نہیں ہوا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس پر افسوس ہے اور امید ظاہر کی کہ مذاکرات خسارے کی تلافی کریں گے۔ یہ نسلی امتیاز پر ان کی معافی طلبی تو نہیں تھی مگر وہ نیشنل پارٹی کے کسی بھی لیڈر کے مقابلے میں بہت آگے بڑھ آئے تھے۔

راستہ نکل آیا

بنیادی مسئلہ جو زیر بحث آیا وہ سیاسی قیدیوں اور سیاسی جلاوطنوں کی تعریف تھا۔ حکومت کے نقطۂ نظر میں یہ تعریف بہت محدود تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ امان پانے کے حقدار ہمارے لوگوں کی تعداد محدود رہے۔ ہم نے وسیع ترین ممکنہ تعریف کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا کہ ہر وہ شخص جسے کسی ایسے جرم میں سزا دی گئی ہو جس کا محرک سیاسی ہو امان کا مستحق ٹھہرایا جائے۔ ہم ''سیاسی محرک'' پر مبنی جرائم کی باہم تسلی بخش تعریف پر متفق نہ ہو سکے اور یہ ایک مسئلہ تھا جو آنے والے خاصے وقت کیلئے ہمارے لیے پریشانی کا باعث بنا رہا۔

تین روزہ مذاکرات کے اختتام پر جن امور پر ہمارا اتفاق ہوا وہ گروٹ شور اصول (Groote Schuur Minutw) کہلائے۔ ان میں فریقین نے عہد کیا کہ

وہ مذاکرات کا پرامن عمل جاری رکھیں گے اور حکومت نے ہنگامی حالت اٹھانے کا وعدہ کیا جو جلد ہی اس نے تشدد کی زد میں آئے ہوئے صوبہ نٹال کے سوا ہر کہیں اٹھالی۔ ہم ایک مشترکہ ورکنگ گروپ قائم کرنے پر رضامند ہو گئے جسے وہ بہت سی مشکلات دور کرنا تھیں جو ہنوز ہماری راہ میں حائل تھیں۔

جب آئینی مسائل کی بات آئی تو ہم نے حکومت کو بتایا کہ ہم ایک منتخب آئین ساز اسمبلی کا مطالبہ کر رہے ہیں جو نیا آئین وضع کرے۔ ہم اس امر پر یقین رکھتے تھے کہ آئین تشکیل دینے والے مرد اور خواتین خود عوام کا انتخاب ہوں۔ لیکن اسمبلی کے انتخاب سے پہلے ایک عبوری حکومت کا قیام ضروری تھا جو عبوری دور کی نگرانی کرے حتیٰ کہ ایک نئی حکومت منتخب کر لی جائے۔ حکومت کھلاڑی اور ریفری دونوں کا کام نہیں کر سکتی تھی جیسا کہ اس وقت تھی۔ ہم نے ایک کثیر جماعتی مذاکراتی کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کی جو عبوری حکومت قائم کرے اور آئین ساز اسمبلی کے مصروف عمل ہونے کے لیے رہنما اصول پیش کرے۔

بچپن میں واپسی

اگرچہ میں جیل سے رہا ہونے کے فوراً بعد قونو جانا چاہتا تھا مگر یہ اپریل میں ممکن ہوا کہ میں گاؤں کا سفر کر سکوں۔ میں از کود اٹھ کر جہاں کہیں جانا چاہتا نہیں جا سکتا تھا۔ سیکورٹی کا اہتمام کرنا تھا نیز مقامی تنظیموں کے لیے تقریریں تیار کرنا تھیں۔ اپریل تک اے این سی اور ٹرانسکائی کے فوجی لیڈر اور اے این سی کے وفادار جنرل بنٹو ہولومسا نے دورے کا انتظام کر لیا۔ لیکن میرے دل و دماغ میں اولین خیال اپنی والدہ کی قبر پر حاضر ہو کر عقیدت بجالانے کا تھا۔

میں پہلے قونو اور اس جگہ گیا جہاں میری والدہ دفن تھیں۔ ان کی قبر سادہ اور آرائش سے خالی تھی اور اس پر چند پتھر اور کچھ ان گھڑ اینٹیں تھیں اور وہ قونو کی دوسری قبروں سے کسی طور مختلف نہیں تھی۔ میں اپنے اس وقت کے احساسات بیان کرنے

سے قاصر ہوں۔ مجھے افسوس تھا کہ میں اس وقت موجود نہیں تھا جب ان کا انتقال ہوا۔ مجھے ندامت تھی کہ میں ان کی زندگی میں ان کی مناسب دیکھ بھال نہیں کر سکا تھا اور مجھے حسرت تھی کہ اگر میں اپنی زندگی مختلف طریقے سے گزارنے کا انتخاب کرتا تو کیا ہوتا۔

کئی برسوں بعد اپنے گاؤں کو دیکھ کر مجھے صدمہ ہوا کہ کس حد تک بدل گیا ہے اور کس حد تک نہیں بدلا۔ جب میں نوجوان تھا' قونو کے لوگ ہرگز سیاسی نہیں تھے۔ وہ افریقی حقوق کے لیے جدوجہد سے بے خبر تھے۔ وہ لوگ زندگی کو اسی طرح قبول کر لیتے تھے جس طرح کہ وہ تھی اور اسے بدلنے کے خواب نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن جب میں لوٹ کر آیا تو میں نے سکول کے بچوں کو آلیور ٹیمبو اور انخوفتوڈی سزوی کے بارے میں گیت گاتے ہوئے سنا اور مجھے تعجب ہوا کہ کس طرح جدوجہد آزادی کا علم افریقی معاشرے کے ہر گوشے میں سرایت کر گیا ہے۔

وہ جو چیز برقرار رہی تھی وہ معاشرے کی گرمجوشی اور سادگی تھی جو مجھے واپس لڑکپن میں لے گئی۔ لیکن جس چیز نے مجھے پریشان کر دیا وہ یہ تھی کہ دیہاتی اسی طرح مفلس بلکہ مفلس تر لگتے تھے جس طرح کہ وہ پہلے تھے۔ اکثر لوگ اب بھی سادہ جھونپڑوں میں رہتے تھے جن کے فرش گندے تھے اور جن میں بجلی اور بہتے پانی کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ جب میں نوجوانت تھا' گاؤں صاف ستھرا تھا اور پانی خالص اور گھاس سبز اور غیر آلودہ تھی جہاں تک نگاہ دیکھ سکتی تھی۔ ان دونوں کرالز یعنی دیہات اجلے اجلے تھے۔ زمین کے سطح مٹی محفوظ تھی اور کھیت سلیقے سے تقسیم کیے گئے تھے۔ لیکن اب گاؤں ناصاف' پانی آلودہ اور دیہی علاقہ پلاسٹک کے تھیلوں اور ریپرز سے اٹا پڑا تھا۔ جب میں لڑکا تھا تو پلاسٹک کے متعلق ہم نے سنا بھی نہیں تھا اور اگرچہ اس نے زندگی کے بعض پہلوؤں سے یقیناً بہتر بنا دی تھی مگر قونو میں اس کی موجودگی مجھے ایک طرح کا دھبہ نظر آئی اور معاشرے پر میرا مخریوں لگا جیسے ہوا میں تحلیل ہو گیا

ہو۔

ایک بار پھر جزیرہ روبن میں

اس ماہ میری ایک اور گھر واپسی ہوئی۔ میں ''ایم کے'' کے پچیس سیاسی قیدیوں کو یہ ترغیب دینے کے لیے روبن آئی لینڈ واپس گیا کہ وہ حکومت کی امان دینے کی پیشکش قبول کر کے جزیرہ چھوڑ دیں۔ اگرچہ میں نے جزیرہ آٹھ سال پہلے چھوڑا تھا' میری قید کی یادیں ابھی تازہ اور وطن پسندی کے عارضے سے مبرا تھیں۔ جہاں برسوں اور لوگ مجھ سے ملنے آتے رہے تھے وہاں جزیرہ روبن پر خود ایک ملاقاتی بن کر جانا ایک عجیب احساس لیے ہوئے تھا۔

لیکن اس روز مجھے گردونواح کو دیکھنے کا زیادہ موقع نہ ملا کیونکہ میں فوری طور پر ان آدمیوں سے ملنے چلا گیا جو حکومت کی امان دینے کی پیشکش پر احتجاج کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ میدان جنگ میں فتح ہونے کے بعد ہی جزیرے سے نکلیں گے' مذاکرات کی میز پر کامیابی حاصل ہونے سے نہیں۔ وہ اس خاص قسم کے سمجھوتے کے شدید مخالف تھے جس میں انہیں امان ملنے سے پہلے اپنے جرائم کا حساب دینا تھا۔ وہ اے این سی پر اعلان ہرارے سے پسپائی کا الزام لگا رہے تھے جس میں سیاسی قیدیوں اور جلاوطنوں کو عام معافی دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ایک شخص نے کہا: ''مادیبا! میں ساری عمر حکومت سے لڑتا رہا ہوں اور اب مجھے ان سے معافی مانگنی ہو گی۔''

مجھے ان کے نقطۂ نظر سے ہمدردی تھی مگر وہ غیر حقیقت پسندانہ تھا۔ ہر سپاہی یہ چاہے گا کہ وہ اپنے دشمن کو میدان میں شکست دے لیکن اس صورت حال میں ایسی فتح رسائی سے باہر تھی۔ اب جدوجہد مذاکرات کی میز پر تھی۔ میں نے کہا کہ وہ جیل میں رہ کر اپنے کاز کو آگے نہیں بڑھا سکتے۔ وہ جیل سے باہر آ کر اپنی قوم کی کہیں زیادہ خدمت کر سکتے ہیں۔ آخر کار وہ حکومت کی پیشکش قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

مسز تھیچر کی دھمکی

جون کے شروع میں مجھے یورپ اور شمالی امریکہ کے چھ ہفتے کے دورے پر روزنہ ہونا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نجی طور پر مسٹر ڈی کلارک سے ملا جو پابندیوں کے مسئلے پر بات کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جنوبی افریقہ میں جو تبدیلیاں کی تھیں' ان کی بنیاد پر مجھ سے کہا کہ میں بین الاقوامی پابندیاں جاری رکھنے کے مطالبے میں ترمیم کرلوں۔ اگر چہ مسٹر ڈی کلارک نے جو کچھ کیا تھا وہ ہمارے ذہن میں تھا مگر ہم چاہتے تھے کہ پابندیاں بہترین لیور کے طور پر جاری رہنی چاہئیں جو انہیں مزید اقدامات پر مجبور کرے گا۔ میں جانتا تھا کہ یورپی برادری اور امریکہ ڈی کلارک کی اصلاحات کو بنیاد بنا کر پابندیاں نرم کرنے کا رجحان رکھتے تھے۔ میں نے مسٹر ڈی کلارک سے کہا کہ جب تک آپ نسلی امتیاز کامل طور پر ختم نہیں کر دیتے اور ایک عبوری حکومت وجود میں نہیں آجاتی ہم اپنے حامیوں سے پابندیاں نرم کرنے کو نہیں کہہ سکتے۔ اگر چہ انہیں میرے جواب پر مایوسی ہوئی مگر وہ حیرت زدہ نہ ہوئے۔

سفر کے پہلے مرحلے میں' میں اور ونی پیرس پہنچے جہاں فرانسوا متراں اور ان کی پر کشش بیوی ڈینیالی نے' جو مدت سے اے این سی کی حامی چلی آ رہی تھی' ہمارا شاہانہ استقبال کیا۔ یہ براعظمی میں لینڈ کا میرا پہلا دورہ نہیں تھا' پھر بھی ''قدیم دنیا'' کی خوبصورتیوں نے مجھے بے خود کر دیا۔ اگر چہ میں روشنیوں کے شہر کے حسن کی اہمیت کم کرنا نہیں چاہتا مگر یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میرے قیام پیرس کے دوران حکومت جنوبی افریقہ نے ہنگامی حالت ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ مجھے خوشی ہوئی مگر میں اس امر سے آگاہ تھا کہ انہوں نے میہ اقدام میری یورپ میں موجودگی کے دوران میں اس لیے کیا تھا کہ میرے پابندیوں کے مطالبے کو بے وزن کر سکیں۔

سویڈن' اٹلی اور نیدرلینڈ میں رکنے کے بعد میں انگلستان گیا جہاں میں نے آلیور اور ایڈی لیڈ سے ملنے میں دو روز گزارے۔ میرا اگلا قیام امریکہ میں تھا لیکن مجھے

جنوبی افریقہ واپس آتے ہوئے پھر انگلستان آنا تھا جہاں مسز تھیچر سے میری ملاقات طے شدہ تھی۔ تاہم روانگی سے پہلے رسمی طور پر میں نے انہیں فون کیا تو وہ مجھے ایک سخت اور بامعنی لیکچر دینے سے باز نہ رہ سکیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ میرے سفروں کا جائزہ لیتی آ رہی ہیں اور نوٹ کر رہی ہیں کہ میں ہر روز کتنی تقریبات میں حصہ لیتا ہوں۔ ان کے الفاظ تھے: ''مسٹر منڈیلا! اس سے پہلے کہ ہم مسائل پر بحث کریں میں تمہیں خبردار کرنا چاہتی ہوں کہ تمہارا شیڈول بہت بھاری ہے۔ تمہیں اسے کاٹ کر نصف کر لینا چاہیے۔ تم سے آدھی عمر والے ایک شخص کو بھی یہ مطالبات پورے کرنے میں مشکل پیش آئے گی جو تم پر لادے جا رہے ہیں۔ اگر تم نے انہیں برقرار رکھا تو تم امریکہ سے زندہ واپس نہیں آؤ گے۔ یہ ہے تمہارے لیے میری نصیحت۔''

ہارلم کے سیاہ فاموں میں

میں نے اپنی نوجوانی کے دنوں سے نیویارک شہر کے بارے میں سن رکھا تھا اور آخر کار میں نے اس کی عظیم شیشے اور کنکریٹ کی عمارتیں دیکھ لیں جو سڑکوں کے دونوں طرف آسمانی بلندیوں کو چھو رہی تھیں جبکہ کاغذی فیتے کے لاکھوں کروڑوں ٹکڑے فضا میں تیرتے نیچے آ رہے تھے اور یہ تجربہ میرے لیے سانس روک دینے والا تھا۔ اطلاع یہ تھی کہ اس روز دس لاکھ تک انسانوں نے شہر میں میرے جلوس کا مشاہدہ کیا اور نسلی امتیاز کے خلاف جو حمایت اور جوش و خروش دیکھنے میں آیا اس پر فی الواقع میرے اندر عجز عود کر آیا۔ میں نے ہمیشہ پڑھا تھا کہ نیویارک سخت دل لوگوں کا شہر ہے لیکن میں نے شہر میں پہلا بھرپور دن گزار کر محسوس کیا کہ صورت حال بہت برعکس ہے۔

اگلے روز میں ہارلم گیا۔ اس علاقے نے عشرہ 1950ء سے میرے ذہن میں افسانوی جھلک پیدا کر رکھی تھی جب میں نے سوویٹو کے نوجوانوں کو ہارلم کے بانکوں کے تیکھے فیشن اپناتے دیکھا تھا۔ میری بیوی نے کہا تھا کہ ہارلم امریکہ کا سوویٹو ہے۔

میں نے یانکی سٹیڈیم میں ایک بڑے ہجوم سے خطاب کیا اور انہیں بتایا کہ کالے جنوبی افریقی اور کالے امریکی ایک اٹوٹ رشتے میں جڑے ہوئے ہیں کیونکہ ہم باہم افریقہ کے بچے ہیں۔ میں نے کہا کہ دونوں کے مابین ایک رشتہ داری ہے جو ڈبلیو ای بی دو بوئس، مارکس گاروے اور مارٹن لوتھر کنگ جونیئر جیسے عظیم امریکیوں کو جوش دلاتی رہی ہے۔ نوجوان کی حیثیت سے میں براؤن بمبار، جولوئیس کی پرستش کرتا تھا جو نہ صرف رنگ میں اپنے حریفوں کو لتاڑتا تھا بلکہ باہر بھی نسل پرستوں کی ٹھکائی کرتا تھا۔ جیل میں، میں نسلی پرستی، نسلی امتیاز اور معاشی غیر مساوات کے خلاف سیاہ فام امریکیوں کی جدوجہد کے متعلق سنتا رہا تھا۔ ہمارے نزدیک ہارلم مزاحمت کی قوت اور سیاہ فخر کے حسن کی علامت تھا۔ یہ بات ایک نوجوان نے مجھے یاد دلائی جسے میں نے گزشتہ روز ایک ٹی شرٹ پہنے دیکھا تھا جس پر تحریر تھا:

(Black by Nature, Proud by Choice)

(ہم فطری طور پر سیاہ ہیں مگر ہمارا فخر اختیاری ہے۔)

پرمغز صدر سے ملاقات

میں نے کہا کہ ہم فطری طور پر باہم منسلک ہیں مگر ہمارا ایک دوسرے پر فخر اختیاری ہے۔ بوسٹن اور ممفس تک سفر کرنے کے بعد میں کانگریس کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرنے اور صدر بش سے ایک نجی ملاقات کرنے کے لیے واشنگٹن پہنچا۔ میں نے نسلی امتیاز کے خلاف قانون سازی پر امریکی کانگریس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ نئے جنوبی افریقہ کو امید ہے کہ وہ ان آدرشوں پر پورا اترے گا جنہوں نے ان دونوں ایوانوں کو تخلیق کیا ہے جن کے سامنے میں اظہار مدعا کر رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ مجاہدین آزادی کی حیثیت سے ہم جارج واشنگٹن، ابراہم لنکن اور تھامس جیفرسن جیسے آدمیوں سے متعارف نہیں ہو سکے تھے اور اس طرح سرگرم کار نہیں ہوئے تھے جس طرح وہ سرفرم کار ہوئے تھے۔ میں نے پابندیوں پر ایک

مظبوط موقف پیش کیا کیونکہ مجھے علم تھا کہ بش انتظامیہ محسوس کرتی تھی کہ اب پابندیاں نرم کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ میں نے کانگریس پر زور دیا کہ وہ ایسا نہ کرے۔

جارج بش سے ملاقات سے پہلے ہی میرے ذہن میں ان کے متعلق ایک مثبت تاثر موجود تھا کیونکہ وہ پہلے عالمی لیڈر تھے جنھوں نے میری جیل سے رہائی پر مجھے مبارکباد پیش کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ اس کے بعد سے انہوں نے مجھے عالمی لیڈروں کی اپنی اس مختصر فہرست میں شامل کر لیا تھا جنہیں وہ اہم مسائل پر بریف کیا کرتے تھے۔ ذاتی طور پر وہ بڑے پرجوش اور پرمغز تھے اگرچہ مسلح جدوجہد اور پابندیوں کے مسائل پر ہمارے مابین نمایاں اختلاف تھا۔ وہ ایک ایسے شخص تھے جن سے میں عدم اتفاق کرتے ہوئے ہاتھ ملا سکتا تھا۔

راج ہنسوں کی خلیج

امریکہ سے میں کینیڈا روانہ ہوا جہاں میری وزیراعظم ملرونی سے ملاقات ہوئی اور میں نے ان کی پارلیمنٹ سے خطاب بھی کیا۔ اگلے مرحلے میں ہمیں آئرلینڈ جانا تھا' اور بحراوقیانوس پار کرنے سے پہلے ہمارا چھوٹا جیٹ طیارہ تیل لینے کے لیے دائرہ قطب شمالی کے شمال میں ایک دوردراز مقام پر رکا جو ''گوز بے'' یعنی ''راج ہنسوں کی خلیج'' کہلاتا ہے۔ مجھے تیز ہوا میں سیر کرنے کی خواہش ہوئی اور جب میں تارمک پر چہل قدمی کر رہا تھا میں نے ہوائی اڈے کی باڑ کے قریب کھڑے کچھ لوگ دیکھے۔ میں نے کینیڈین افسر سے پوچھا کہ یہ کون ہیں۔ اس نے بتایا کہ یہ اسکیمو ہیں۔

زمین پر اپنی بہتر سالہ زندگی کے دوران میں کبھی کسی انیوٹ (شمالی امریکہ کے اسکیمو) سے نہیں ملا تھا اور کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ان سے ملاقات ہوگی۔ میں اس باڑ کے نزدیک گیا اور وہاں اٹھارہ بیس برس کے درجن بھر نوجوان کھڑے پائے جو یہ سن کر ہوائی اڈے کی طرف چلے آئے تھے کہ ہمارا طیارہ وہاں رکنے والا ہے۔ لڑکپن میں میں نے ''انیوٹ'' کے متعلق پڑھا تھا ''اسکیمو کا نام انہیں گورے آبادکاروں نے

دیا تھا) اور نسل پرست آباد کاروں کی تحریروں سے میں نے یہ تاثر لیا کہ وہ بہت پسماندہ لوگ ہیں۔

لیکن ان روشن جبیں نوجوانوں سے گفتگو کر کے مجھے معلوم ہوا کہ وہ ٹی وی پر میری رہائی کا منظر دیکھ چکے تھے اور جنوبی افریقہ میں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ تھے۔ ان میں سے ایک نے نعرہ لگایا: ''Viva ANC'' (اے این سی زندہ باد!) انیوٹ قدیم اصلی (Aboriginal) باشندے ہیں جن سے تاریخی طور پر سفید فام آباد کاروں نے برا سلوک کیا۔ سیاہ فام جنوبی افریقیوں اور انیوٹ باشندوں کے مصائب میں بڑی مشابہت تھی۔ جس بات نے مجھے بہت متاثر کیا وہ یہ تھی کہ میری جیل کی دہائیوں کے دوران دنیا کس قدر بدل گئی تھی۔ میرے لیے یہ امر حیران کن تھا کہ دنیا کی چھت پر رہنے والا ایک انیوٹ نوجوان افریقہ کے جنوبی سرے پر ایک سیاسی قیدی کی رہائی کا منظر دیکھ سکتا ہے۔ ٹی وی نے دنیا کو سکیڑ دیا تھا اور اس عمل میں یہ جہالت کے استیصال اور جمہوریت کے فروغ کے لیے بہت بڑا ہتھیار بن گیا تھا۔

مسز تھیچر سے ناکام ملاقات

ڈبلن کے بعد میں لندن گیا جہاں مسز تھیچر سے تین گھنٹے کی ملاقات ہوئی۔ نوجوان انیوٹوں کے ساتھ سردی میں کھڑے باتیں کرنے سے مجھے ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ جس روز مجھے مسز تھیچر سے ملنا تھا' موسم سرد تھا اور بارش ہو رہی تھی اور جب ہم روانہ ہو رہے تھے' ونی نے مجھ سے کہا کہ میں برساتی ساتھ لے لوں۔ ہم اس وقت ہوٹل کی لابی میں پہنچ گئے تھے اور اگر میں برساتی لینے واپس کمرے میں جاتا تو ہمیں دیر ہو جاتی۔ میں وقت کا بہت پابند ہوں' صرف اس وجہ سے نہیں کہ میرے خیال میں یہ اس شخص کے لیے احترام کی علامت ہے جس سے آپ ملنے جا رہے ہوں بلکہ مغرب کے اس لگے بندھے تاثر کو دور کرنے کے لیے بھی ضروری ہے جو افریقیوں کے بدنامی کی حد

تک ست ہونے کے بارے میں پھیلایا گیا ہے۔ میں نے ونی سے کہا کہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے' چنانچہ میں واپس کمرے میں جانے کے بجائے بارش میں کھڑا کچھ بچوں کو آٹوگراف دیتا رہا اور جس وقت ہم مسز تھیچر کے ہاں پہنچے تو میری طبیعت ناساز تھی اور بعد میں ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ مجھے ہلکا سا نمونیا ہو گیا تھا۔

لیکن اس سے ہماری ملاقات متاثر نہ ہوئی' سوائے اس کے مسز تھیچر نے ایک سکول کی استانی کی طرح مجھے جھڑکا کہ میں نے ان کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اپنا شیڈول کم نہیں کیا تھا۔ اگرچہ مسز تھیچر پابندیوں جیسے کئی مسائل پر اے این سی کی مخالفت کرتی تھیں مگر وہ ہمیشہ ایک ساف گو اور مسائل کو حل کرنے کی خواہاں خاتون تھیں' تاہم اس روز کی ملاقات کے دوران میں پابندیوں کے سوال پر انہیں معمولی سا بھی قائل نہ کر سکا۔

''وولا'' کا مردہ آپریشن

جولائی میں جب میں یوگنڈا' کینیا اور موزمبیق کے مختصر دوروں کے بعد جنوبی افریقہ واپس آیا تو میں نے مسٹر ڈی کلارک سے ملاقات کی درخواست کی۔ ملک میں تشدد کی صورتحال خراب تر ہو گئی تھی۔ 1990ء کی اموات پہلے ہی پندرہ سو سے بڑھ گئی تھیں جو پچھلے سال کی تمام سیاسی اموات سے زیادہ تھیں۔ اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ صورت حال کو معمول پر لانے کا عمل تیز کیا جائے۔ ہمارا ملک زخموں سے چور چور تھا اور ہمیں زیادہ تیزی سے آگے بڑھنا تھا۔

مسٹر ڈی کلارک کے جون میں ہنگامی حالت اٹھانے کے اقدام سے یہ محسوس ہوا کے مذاکرات دوبارہ شروع کرنے کے لیے اسٹیج تیار ہے لیکن جولائی میں سرکاری ایجنسیوں نے اے این سی کے تقریباً چالیس ارکان گرفتار کر لیے جن میں میک مہاراج' پراون گوردھن' سفوی انیاندا اور ربلی نائر شامل تھے' الزام یہ لگایا گیا کہ یہ لوگ ''آپریشن وولا'' نامی کمیونسٹ پارٹی کی ایک سازش کے تحت حکومت کا تختہ الٹنا

چاہتے تھے۔ڈی کلارک نے مجھ سے ایک فوری ملاقات کا اہتمام کیا اور مجھے ان دستاویزات سے عبارتیں پڑھ کر سنائیں جو ان بقول چھاپے کے دوران پکڑی گئی تھیں۔میں ہکابکا رہ گیا کیونکہ مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا۔

اس ملاقات کے بعد میں نے جو سلاوو کو بلا کر وضاحت طلب کی۔جو نے بتایا کہ مسٹر ڈی کلارک نے جو عبارتیں پڑھیں وہ سیاق وسباق سے ہٹ کر لی گئی ہیں اور یہ کہ ''وولا'' ایک مردہ آپریشن ہے۔لیکن حکومت اپنی اس دریافت کو اس کوشش کے لیے استعمال کرنے پر تلی ہوئی تھی کہ اے این سی کو کمیونسٹ پارٹی (ایس اے سی پی) سے الگ کر دے اور جو سلاوو کو مذاکرات سے الگ تھلگ رکھے۔میں مسٹر ڈی کلارک کے پاس واپس گیا اور انہیں بتایا کہ ان کی اپنی پولیس نے انہیں گمراہ کیا ہے اور یہ کہ ہم کمیونسٹ پارٹی سے الگ ہونے یا جو سلاوو کو اپنی مذاکراتی ٹیم سے باہر رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

پہلا سمجھوتہ طے پا گیا

جولائی کے وسط میں'نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی کے طے شدہ اجلاس سے کچھ پہلے' جو سلاوو ایک نجی تجویز لے کر میرے پاس آیا۔اس نے مشورہ دیا کہ مسلح جدوجہد رضا کارانہ طور پر ملتوی کر دی جائے تا کہ مذاکراتی عمل کو آگے بڑھانے کے لیے موزوں فضا پیدا کی جا سکے۔اس کا کہنا تھا کہ ڈی کلارک کو اپنے حامیوں کو یہ دکھانے کی ضرورت ہے کہ ان کی پالیسی نے ملک کو فائدے پہنچائے ہیں۔میرا پہلا ردعمل منفی تھا۔میں نہیں سمجھتا تھا کہ ایسا وقت آ گیا ہے۔

لیکن جتنا زیادہ میں نے اس بارے میں سوچا' اتنا ہی مجھے احساس ہوا کہ ہمیں ابتداء کرنی ہوگی اور اس کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ مسلح جدوجہد رضا کارانہ طور پر ملتوی کر دی جائے۔میں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ جو سلاوو' جس کے ترقی پسندانہ (ریڈیکل) خیالات شک وشبہ سے بالا ہیں' یہ تجویز پیش کرنے کے لیے عین

موزوں شخص ہے۔اس پر یہ الزام نہیں لگ سکتا تھا کہ وہ حکومت کا پٹھو ہے یا اس کے دل میں حکومت کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا ہے۔اگلے روز میں نے جو کو بتایا کہ اگر وہ این ای سی کے اجلس میں یہ تجویز پیش کرے تو میں اس کی حمایت کروں گا۔

اگلے دن جب جو نے این ای سی کے اجلاس میں یہ خیال پیش کیا تو کچھ ارکان نے شدید اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ ہم ڈی کلارک کے حامیوں کو تو انعام دے رہے ہیں مگر اپنے لوگوں کو نہیں۔لیکن میں نے تجویز کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ ہماری مسلح جدوجہد کا مقصد ہمیشہ سے یہ تھا کہ حکومت کو مذاکرات کی میز پر لایا جائے اور اب ہم اس میں کامیاب ہو چکے ہیں۔میں نے کہا کہ التوا ہر مرحلے پر واپس لیا جا سکتا ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے نیک ارادوں کا عملی اظہار کریں۔کئی گھنٹوں کی بحث کے بعد ہمارا موقف تسلیم کر لیا گیا۔

ہمارا یہ اقدام اے این سی کے اندر متنازع رہا۔اگرچہ ''ام کے'' سرگرم نہیں تھی،بہت سے لوگوں کے لیے مسلح جدوجہد کی گرما گرمی بڑے معنی رکھتی تھی۔جب مسلح جدوجہد کا صرف ایک تقریری ہتھیار کے طور پر ذکر کیا جاتا تو بھی یہ اس امر کی علامت تھی کہ ہم دشمن کے خلاف سرگرمی سے لڑ رہے ہیں۔یوں اس نعرے کی مقبولیت اس کے ذریعے حاصل شدہ کامیابی کی نسبت کہیں زیادہ تھیں۔

16 اگست کو پریٹوریا میں اے این سی اور حکومت نے اس سمجھوتے پر دستخط کیے جو پریٹوریا مینوٹ (Pretoria Minute) کہلایا جس میں ہم نے مسلح جدوجہد ملتوی کرنے پر اتفاق کیا۔جیسا کہ میں اپنے پیروکاروں سے بار بار کہتا تھا،اگرچہ ہم نے مسلح عمل ملتوی کیا تھا مگر ہم نے مسلح جدوجہد ختم نہیں کی تھی۔اس سمجھوتے نے سیاسی قیدیوں کی رہائی اور بعض قسم کی معافیوں کے لیے قطعی تاریخیں طے کر دیں۔معافی کا عمل مئی 1991 ء تک مکمل کیا جانا طے پایا اور حکومت انٹرنل سیکورٹی ایکٹ پر نظر ثانی کرنے پر بھی رضامند ہو گئی۔

سیبوکنگ کا خونیں سانحہ

ان تمام مسائل میں جو امن کے عمل کی راہ میں رکاوٹ تھے' ملک میں بڑھتے ہوئے تشدد سے زیادہ تباہ کن اور مایوس کن کوئی اور مسئلہ نہیں تھا۔ ہم سب کو امید تھی کہ جب مذاکرات آگے بڑھیں گے' تشدد کم ہو جائے گا۔ لیکن عملاً اس کے برعکس ہوا۔ پولیس اور سیکورٹی فورسز بہت کم گرفتاریاں کر رہی تھیں۔ بستیوں کے لوگ ان پر الزام لگا رہے تھے کہ وہ تشدد کے فروغ میں مدد دے رہی ہیں۔ مجھ پر زیادہ سے زیادہ یہ واضح ہوتا جا رہا تھا کہ اس میں سیکورٹی فورسز کا ہاتھ کارفرما ہے۔ کئی واقعات سے مجھے یہ تاثر ملا کہ پولیس تشدد کو دبانے کے بجائے اسے ہوا دے رہی ہے۔

اگلے چند ماہ کے دوران میں نے جوہانس برگ کے جنوب میں تشدد زدہ وال مثلث (Valltriangli) میں دور نزدیک بستیوں کا دورہ کیا اور زخمیوں اور دکھی خاندانوں کی دلجوئی کی۔ ہر کہیں بار بار ایک ہی کہانی سننے میں آئی کہ پولیس اور ڈیفنس فورس اس علاقے کو غیر مستحکم کر رہی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ پولیس ایک روز ایک علاقے میں ہتھیار ضبط کر لیتی ہے اور پھر اگلے روز ''انکا تھا'' کے جتھے انہی چرائے ہوئے ہتھیاروں کے ساتھ ہمارے لوگوں پر حملہ کر دیتے ہیں۔ ہم نے ایسی داستانیں بھی سنی ہیں کہ پولیس ''انکا تھا'' کے آدمیوں کو تحفظ فراہم کرتے ہوئے جلسوں میں لے جاتی ہے اور حملوں میں ان کا ساتھ دیتی ہے۔

ستمبر میں' میں نے ایک تقریر میں کہا کہ تشدد کے پس پشت ایک خفیہ ہاتھ ہے اور یہ عندیہ ظاہر کیا کہ ایک پراسرار تیسری قوت جو سیکورٹی فورسز کے بھگوڑوں پر مشتمل ہے' مذاکرات کو تہہ و بالا کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ تیسری قوت کے ارکان کون کون سے ہیں کیونکہ میں خود نہیں جانتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ موجود ہیں اور اے این سی اور جہاد آزادی کو نشانہ بنانے میں ان کی ہلاکت خیز کارروائیاں موثر ثابت ہو رہی ہیں۔

میں بذات خود دو مخصوص واقعات میں ملوث ہونے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا۔ جولائی 1990ء میں اے این سی کو اطلاع ملی تھی کے ہوسٹلز میں ہرنے والے ''انکاتھا'' کے آدمی 22 جولائی کو وال مثالث میں میبو کنگ ٹاؤن شپ میں اے این سی کے ارکان پر ایک بڑے حملے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ اپنے وکلاء کے ذریعے ہم نے وزیر قانون و امن، کمشنر آف پولیس اور ریجنل کمشنر کو اطلاع دی اور انہیں ہونے والے حملوں سے آگاہ رکھتے ہوئے ان پر زور دیا کہ مناسب اقدام کریں۔ ہم نے پولیس سے مطالبہ کیا کہ انکاتھا کہ مسلح ارکان کو ٹاؤن شپ میں داخل ہونے اور انکاتھا ریلی میں شرکت سے روکے۔

22 جولائی کو مسلح انکاتھا ارکان سے بھری بسیں پولیس کی گاڑیوں کے جلو میں دن دہاڑے میبو کنگ میں داخل ہوئیں۔ ریلی منعقد ہوئی جس کے بعد مسلح آدمی فساد پر اتر آئے اور انہوں نے ہولناک حملے کے دوران تقریباً تیس افراد ہلاک کر دیئے۔ اگلے روز میں نے بستی کا دورہ کیا اور ایسے مناظر دیکھے جو پہلے کبھی نہ دیکھنے میں آئے تھے اور امید ہے آئندہ کبھی نہیں دیکھوں گا۔ مردہ خانے میں لوگوں کی لاشیں پڑی تھیں جب پر حملہ آور ہو کر انہیں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ ایک عورت کی دونوں چھاتیاں چھرے سے کاٹ دی گئی تھیں۔ قاتیل جو کوئی بھی تھے، نرے حیوان تھے۔

اگلے روز میں نے مسٹر ڈی کلارک سے ملاقات کی درخواست کی۔ ملاقات ہوئی تو میں نے غصے میں اس سانحے کی وضاحت طلب کی۔ میں نے ان سے کہا: ''آپ کو پیشگی خبردار کر دیا گیا تھا پھر بھی آپ نے کچھ نہ کیا۔ ایسا کیوں؟ ایسا کیوں ہے کہ کوئی گرفتاریاں عمل میں نہیں آئیں؟ پولیس ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھی رہی۔'' پھر میں نے انہیں بتایا کہ کسی بھی اور ملک میں جہاں اس نوح کا سانحہ پیش پیش آ جائے جس میں تیس سے زیادہ افراد مارے گئے ہوں، سربراہ مملکت تعزیتی

بیان جاری کرتا ہے مگر آپ نے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ میں نے جو کچھ کہا اس کا ان کے پاس کوئی کوئی جواب نہ تھا۔ میں نے ڈی کلارک سے کہا کہ مجھے اس کی وضاحت چاہیے مگر وہ کبھی وضاحت نہ کر سکے۔

زمین نشینوں کی بپتا

دوسرا واقعہ نومبر میں پیش آیا جب انکا تھا کہ ارکان کا ایک گروہ زونگی ززوی نامی زمین نشینوں کے کیمپ میں داخل ہوا (زولو زبان میں اس کے معنی ہیں ایسی جگہ جہاں تمام اقوام کو خوش آمدید کہا جائے) جو جوہانس برگ کے مشرق میں گرمٹن شہر کے باہر واقع تھا۔ اس حملے میں انہوں نے بہت سے افراد مار ڈالے۔ انکا تھا کہ ان بلوائیوں نے ان جھونپڑوں پر قبضہ جما لیا جن کے مکین مارے جا چکے تھے اور ان کا ساز و سامان ضبط کر لیا۔ علاقے کے باسیوں نے بتایا کہ انکا تھا والوں کے ہمراہ پولیس نے کوئی ایکشن نہ لیا۔ جنوبی افریقہ میں کالوں کی جانیں کبھی اس قدر سستی نہ ہوئی تھیں۔

ایک بار پھر میں نے مسٹر ڈی کلارک اور ان کے وزیر قانون و امن ایڈریان فلوک سے ملاقات کی۔ میں نے پھر مسٹر دی کلارک سے پوچھا کہ ان جرائم کے بعد پولیس نے کوئی اقدام کیوں نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ حملہ آور آسانی سے پکڑے جا سکتے ہیں کیونکہ وہ ان لوگوں کے جھونپڑوں پر قابض ہیں جنہیں وہ قتل کر چکے ہیں۔ مسٹر ڈی کلارک نے مسٹر فلوک سے وضاحت طلب کی اور پھر مسٹر فلوک نے قدرے گستاخ لہجے میں مجھ سے پوچھا کہ وہ جھونپڑے کس کی زمین پر واقع ہیں۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ یہ لوگ زمین نشین (squatters) تھے لہٰذا کوئی حق نہیں رکھتے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ درحقیقت زمین ان لوگوں کو مقامی حکام نے فراہم کی تھی۔ ان کا رویہ کئی دیگر افریکنروں کا سا تھا جو محض یہ یقین رکھتے تھے کہ سیاہ فام قبائل تو ان گنت مدت سے ایک دوسرے کو قتل کرتے چلے آرہے ہیں۔ مسٹر ڈی کلارک نے مجھ سے پھر کہا

کہ وہ تحقیق کر کے مجھے اطلاع دیں گے مگر کبھی اطلاع نہ دے پائے۔

اس دوران حکومت نے ایک اور قدم اٹھایا جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس نے ایک ضابطہ جاری کیا جس نے نٹال میں اور ہر کہیں زولو قبائلیوں کو یہ اجازت دے دی کہ وہ سیاسی جلسوں اور ریلیوں میں نام نہاد ''روایتی ہتھیار'' لے جا سکتے ہیں۔ یہ ہتھیار تھے ''اسیگائی'' جو بھالے ہی ہیں اور ''نوبکری'' یعنی چوبی لاٹھیاں جن کے سر بھاری ہوتے ہیں' اور انہی سے انکاتھا والوں نے اے این سی کے لوگوں کو ہلاک کیا تھا۔ اس سے مجھے مسٹر ڈی کلارک کے پر امن ارادوں کے بارے میں شدید تشویش لاحق ہوئی۔

مذاکرات کے مخالف لوگوں نے تشدد کی آگ سے فائدہ اٹھایا جو ہمیشہ اس وقت بھڑک اٹھتی تھی جب حکومت اور اے این سی مذاکرات کی طرف بڑھ رہی ہوتیں۔ یہ قوتیں اے این سی اور انکاتھا کے درمیان جنگ کی آگ بھڑکانا چاہتی تھیں اور میں سمجھتا ہوں کہ انکاتھا کے کئی ارکان اس سے چشم پوشی کرتے تھے۔ مسٹر ڈی کلارک سمیت حکومت کے کئی افراد اس سے اغماض برتتے یا اسے نظر انداز کرتے تھے جو کچھ ان کی ناک تلے ہو رہا تھا۔ ہمیں اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ پولیس اور سیکورٹی فورسز کے اعلیٰ ترین سطح کے لوگ ''تیسری قوت'' کی مدد کر رہے تھے۔ ان شبہات کی بعد میں اخباری رپورٹوں سے تصدیق ہو گئی جن میں انکشاف کیا گیا کہ جنوبی افریقی پولیس نے انکاتھا کو سرمایہ فراہم کیا تھا۔

جوں جوں تشدد کا دائرہ پھیلتا گیا' میں مسلح جدوجہد کے التواء پر نظر ثانی کرنے کی سوچنے لگا۔ اے این سی کے کئی لوگ اڑیل اور حکم عدول ہو رہے تھے' چنانچہ میں نے ستمبر میں ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ تشدد جاری رہنے سے یہ ضروری ہو سکتا ہے کہ ایک بار پھر ہتھیار کی زبان استعمال کی جائے۔ صورت حال بڑی خوفناک لگتی تھی اور حکومت سے جو مفاہمت ہوئی تھی اس کے پرزے اڑتے نظر آ رہے تھے۔

ایک تقریر نے طوفان بپا کر دیا

آلیور ٹیمبو اپنے مادر وطن سے تین دہائیاں جلاوطن رہنے کے بعد دسمبر 1990ء میں جنوبی افریقہ لوٹا۔ اسے اپنے قریب پا کر حیرت ہوئی۔ وہ جوہانس برگ میں اے این سی کی ایک مشاورتی کانفرنس کے لیے واپس آیا تھا جس میں پینتالیس مختلف خطوں' اندرون ملک اور بیرون ملک سے پندرہ سو سے زیادہ نمائندگان نے شرکت کی۔

میں نے اجلاس میں آلیور کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے اے این سی کے تاریک ترین دنوں کے دوران اس کی قیادت کی اور آزادی کے شعلے کو بجھنے نہ دیا۔ اب وہ ہمیں ایک ایسے مستقبل کے کنارے لے آیا ہے جو روشن اور پرامید نظر آتا ہے۔ ستائیس برسوں کے دوران جبکہ میں جیل میں تھا' یہ آلیور ہی تھا جس نے اے این سی کو شکست و ریخت سے بچایا اور اسے بین الاقوامی سطح کی ایک طاقتور اور بارسوخ تنظیم بنا دیا۔ اس نے اس وقت پارٹی کی باگ ڈور سنبھالی جب اس کے اکثر رہنمائی جیل میں تھے یا جلاوطن۔ وہ ایک سپاہی' ایک سفارتکار' ایک سیاست دان تھا۔

اگرچہ میں نے حکومت پر تنقید کی تھی کہ اس نے انقلاب دشمن سرگرمیوں کو ہوا دینے کی مہم چلا رکھی تھی مگر یہ آلیور کی تقریر تھی جس نے طوفان بپا کر دیا۔ اس نے ایک متنازع تقریر سے اجلاس کا افتتاح کیا جس میں اس نے سفید فام حکومت پر پابندیوں کی ہماری پالیسی پر نظر ثانی کا مطالبہ کیا۔ اس نے کہا کہ اے این سی اس وقت تک بین الاقوامی سطح پر کنارے لگی رہے گی جب تک وہ پابندیوں کو نرمانے کا قدام نہیں کرے گی۔ یورپی برادری پابندیوں کو پہلے ہی نیچے لانے کا آغاز کر چکی تھی۔ مغرب کے ممالک' خصوصاً برطانیہ اور امریکہ مسٹر ڈی کلارک کو اس کی اصلاحات کا صلہ دینا چاہتے تھے' اس خیال کے تحت کہ اس طرح مزید اقدامات کے

لیے اس کی حوصلہ افزائی ہو گی۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ پالیسی غلط ہے مگر ہمیں بین الا قوامی حقائق بہر حال تسلیم کرنا تھے۔

اگر چہ آلیور کی تقریر این ای سی کی میٹنگ میں زیر بحث آئی تھی اور اس کی منظوری دے دی گئی تھی' برقرار رکھی جائے۔

میرے خلاف بھی لوگوں نے شکایات کا طومار باندھ دیا اور الزام لگایا کہ مذاکرات کرنے والوں کا پارٹی کے بنیادی کارکنوں سے کوئی رابطہ نہیں اور یہ کہ ہم اپنے لوگوں سے رابطہ رکھنے کے بجائے نیشنل پارٹی کے لیڈروں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ کانفرنس میں مجھ پر نکتہ چینی کی گئی کہ میں ''ذاتی ڈپلومیسی'' میں مصروف رہتا ہوں اور پارٹی کے عام لوگوں کو باخبر نہیں رکھتا۔ ایک عوامی تنظیم کے رہنما کی حیثیت سے قائد کو لوگوں کی بات سننی چاہیے' چنانچہ میں نے اس سے اتفاق کیا کہ ہم نے پوری پارٹی کو مذاکرات کے عمل سے باخبر نہ رکھ کر کوتاہی کی ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ حکومت سے ہمارے مذاکرات کے عمل سے باخبر نہ رکھ کر کوتاہی کی ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ حکومت سے ہمارے مذاکرات بہت نازک ہیں۔۔۔ ہم جس بھی سمجھوتے پر پہنچتے' اس کی کامیابی ایک حد تک اس کے خفیہ رہنے پر منحصر تھی۔ اگر چہ میں نے تنقید قبول کی مگر مجھے یقین تھا کہ طے شدہ راستے پر چلتے رہنے کے سوا ہمارے لوگوں کو اپنی پیشرفت سے آگاہ رکھنا ہو گا۔ اور یہ امر ذہن میں رکھ کر میں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔

انکا تھا فریڈم پارٹی کی کہہ مکرنیا

ہر روز اور ہر ہفتے اخبارات ہماری آبادیوں اور بستیوں میں نئے اور خونریز تشدد کی تازہ رپورٹوں سے بھرے ہوتے تھے۔ یہ روز روشن کی طرح واضح تھا کہ تشدد ملک کا نمبر ایک مسئلہ ہے۔ نٹال کی کئی آبادیوں اور جوہانس برگ کے اردگرد ریف کے علاقے میں جرائم' سیاسی رقابتوں' پولیس کی بہیمیت اور موت کے پراسرار جتھوں کی

وارداتیں خلط ملط ہو گئی تھیں اور ان سے عوام کی زندگی وحشت کی نذر اور اجیرن ہو گئی تھی۔ جب تک تشدد سے نہ نپٹا جاتا' نئے نظام کی طرح پیش رفت غیر ہموار اور غیر یقینی رہتی۔

تشدد کی لہر پر قابو پانے کے لیے میں نے چیف بوتھیلزی سے رابطہ کیا کہ ایک میٹنگ کا اہتمام کیا جائے۔ جنوری میں ڈربن کے رائل ہوٹل میں ہماری ملاقات ہوئی۔ چیف بوتھیلزی پہلے حاضر مندوبین اور میڈیا والوں سے ملے اور اپنی گفتگو میں انہوں نے پرانے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے انہیں اور چھیڑا۔ انہوں نے لفظی حملوں کا تذکرہ کیا جو اے این سی نے ان پر کیے تھے اور اے این سی کے مذاکراتی مطالبات پر تنقید کی۔ جب میرے بولنے کی باری آئی تو میں نے ان کی ریمارکس کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ ان کی ان کوششوں کا شکریہ ادا کیا جو انہوں نے میری قید سے رہائی کو یقینی بنانے کے لیے کی تھیں۔ میں نے ان سے اپنے طویل تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے ان معاملات کو اجاگر کیا جو ہماری دونوں تنظیموں کو تقسیم نہیں بلکہ متحد کرتے تھے۔

ہماری نجی گفتگوؤں کے دوران پیشرفت ہوئی اور چیف بوتھیلزی اور میں نے ایک سمجھوتے پر دستخط کیے جس میں ہماری دونوں تنظیموں کے رویئے سے متعلق ایک ضابطہ عمل تجویز کیا گیا تھا۔ یہ ایک منصفانہ سمجھوتہ تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس پر عمل درآمد ہو جاتا تو یہ خونریزی کو روکنے میں واقعی مددگار ہوتا۔ لیکن' جہاں تک میں کہہ سکتا ہوں' انکا تھا نے اس سمجھوتے پر عمل درآمد ہو جاتا تو یہ خونریزی کو روکنے میں واقعی مددگار ہوتا۔ لیکن' جہاں تک میں کہہ سکتا ہوں' انکا تھا نے اس سمجھوتے پر عمل درآمد کے لیے کبھی کوئی کوشش نہ کی اور ہماری طرف سے بھی خلاف ورزیاں ہوئیں۔

ہماری دونوں تنظیموں کے مابین تشدد جاری رہا۔ ہر ماہ لوگ سینکڑوں کی تعداد میں قتل کیے جا رہے تھے۔ مارچ میں انکا تھا کہ ارکان نے جوہانس برگ کے شمال میں

الیگزینڈرا بستی پر حملہ کیا جس میں تین دنوں کی لڑائی دوران پینتالیس افراد مارے گئے۔یہاں بھی کوئی گرفتاری عمل میں نہ آئی۔

جیسے جیسے تشدد جاری تھا‘میں اس پر بیکار نہیں بیٹھ سکتا تھا‘چنانچہ میں نے چیف بوتھیلزی سے ایک اور میٹنگ کی درخواست کی۔اپریل میں ڈربن گیا اور ایک بار پھر ہم نے پر عزم بیانات دیئے اور ایک اور سمجھوتے پر دستخط کیے۔لیکن ایک بار پھر سمجھوتے کی سیاہی خشک ہونے سے پہلے اسے خون آلود کر دیا گیا۔اب مجھے پہلے سے زیادہ یقین ہو گیا کہ تشدد کے بیشتر واقعات کے پیچھے حکومت کا ہاتھ کارفرما ہے اور یہ کہ تشدد مذاکرات کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔مسٹر ڈی کلارک نے وعدہ کیا تھا کہ وہ تشدد کے واقعات کی تحقیق کر کے مجھے آگاہ کریں گے مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا اور یوں ہماری باہمی تعلقات بھی سرد مہری کی نذر ہو گئے۔

اپریل میں ہماری نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی کی دو روزہ میٹنگ ہوئی جس میں میں نے ڈی کلارک کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کیا۔این ای سی کی متفقہ رائے تھی کہ تشدد کے پیچھے حکومت کا ہاتھ ہے اور یہ کہ تشدد مذاکرات کی فضا کو مسموم کیے ہوئے ہے۔حکومت کے نام ایک کھلے خط میں ہم نے وزیر دفاع میگنس مالان اور وزیر قانون و امن ایڈریان فلوک کی برطرفی‘ عوام میں روایتی ہتھیار اٹھا کر چلنے پر پابندی لگانے‘تارکین وطن کارکنوں کے ہوٹل بند کرنے جہاں جوہانس برگ کے ارد گرد بستیوں میں انکا تھا کہ بہت سے ارکان قیام پذیر تھے‘حکومت کے خفیہ بغاوت توڑ یونٹ ختم کرنے اور ایک آزاد کمیشن کے تقرر کا مطالبہ کیا جو سکیورٹی فورسز کی طرف سے کی گئی ظالمانہ کارروائیوں کی شکایات کی چھان بین کرے۔

ہم نے اپنے مطالبات پورے کروانے کے لیے حکومت کو مئی تک کی مہلت دی۔مسٹر ڈی کلارک نے اس کے جواب میں مئی میں تشدد پر ایک بین الجماعتی کانفرنس بلا لی مگر میں نے جواب دیا کہ یہ بے مقصد ہو گی کیونکہ حکومت خوب سمجھتی ہے کہ اسے

تشدد ختم کرنے کے لیے کیا کرنا ہے۔ مئی میں ہم نے حکومت سے مذاکرات ملتوی کرنے کا اعلان کردیا۔

مجھے اے این سی کا صدر چنا گیا

جولائی 91ء میں اے این سی نے تیس برس میں جنوبی افریقہ کے اندر اپنی پہلی سالانہ کانفرنس منعقد کی۔ کانفرنس میں 2244 رائے دہندہ مندوبین نے شرکت کی جنہیں اندرون ملک اور بیرون ملک سے جمہوری طور پر اے این سی کی شاخوں نے منتخب کیا تھا۔ کانفرنس میں مجھے متفقہ طور پر اے این سی کا صدر چن لیا گیا۔ سائرل راما فوسا کو سیکریٹری جنرل چنا گیا اور یہ اس امر کی علامت تھی کہ تحریک آزادی کے مشعل قیادت کی بوڑھی نسل سے نوجوان نسل کے سپرد کی جا رہی ہے۔ سائرل راما فوسا کو سیکریٹری جنرل چنا گیا اور یہ اس امر کی علامت تھی کہ تحریک آزادی کی مشعل قیادت کی بوڑھی نسل سے نوجوان نسل کے سپرد کی جا رہی ہے۔ سائرل، جس سے میں اپنی قید سے رہائی کے بعد پہلی بار ملا تھا، معروف اے این سی لیڈروں کے ایک طویل سلسلے کا باوقار جانشین تھا۔ وہ غالباً اے این سی کی صفوں میں کامیاب ترین مذاکرات کار تھا اور یہ مہارت اسے نیشنل مائن ورکرز یونین کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے حاصل ہوئی تھی۔

میں نے اپنی تقریر میں اپنے اس عظیم اعزاز پر اظہار تشکر کیا جس سے مجھے نوازا گیا تھا اور کہا کہ میرے لیے اپنے پیشرو آلیور ٹیمبو کے نقش قدم پر چلنا کس قدر مشکل ہوگا۔ اگرچہ اس وقت ہم حکومے سے نبرد آزما تھے۔ مگر میں نے کہا کہ مذاکرات بذات خود ایک بڑی کامیابی ہیں۔ یہی ایک حقیقت کے حکومت مذاکرات میں شرکت کررہی تھی، اس امر کی غماز تھی کہ اس میں اب نسلی امتیاز کو جاری رکھنے کی سکت نہیں۔ میں نے زور دے کر کہا کہ مذاکرات کا عمل ہموار نہیں ہوگا کیونکہ ہمیں ایسے سیاستدانوں سے واسطہ پڑا ہے جو اقتدار سے باہر ہونے کے لیے مذاکرات نہیں

کرنا چاہتے۔ میرے الفاظ تھے: ''یہ نکتہ واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ جدوجہد کی طرح پیش رفتوں اور پسپائیوں سے مشروط ہیں۔''

لیکن مذاکرات انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ یہ کبھی ہمارے مفاد میں نہیں تھا کہ نسلی امتیاز کا عذاب کسی بھی طور پر جاری رہے۔ میں نے کہا: ''یہ ضروری ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو ایک عبوری حکومت تشکیل دی جائے۔''

نوجوانوں کی غیر معمولی فصل

کانفرنس نے اے این سی کے سامنے ایک اہم ترین اور محنت طلب کام رکھ دیا،یعنی ایک غیر قانونی زیرزمین تحریک آزادی کو ایک قانونی عوامی سیاسی پارٹی میں تبدیل کرنے کا کام۔تیس برس تک اے این سی جنوبی افریقہ میں زیرزمین کام کرتی رہی تھی اور اس دور کی عادات اور ہتھکنڈے اس میں راسخ ہو چکے تھے۔ہمیں پوری تنظیم کو چھوٹی سے چھوٹی مقامی شاخ سے لے کر نیشنل ایگزیکٹو تک،ازسرنو تشکیل دینا تھا اور یہ کام ہمیں غیر معمولی تبدیلیوں کے عرصے میں چند ماہ کے اندر انجام دینا تھا۔

اے این سی اور کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کا بڑا حصہ جلاوطن تھا۔ان میں سے بیشتر جولائی کانفرنس کے لیے وطن واپس آ گئے تھے۔وہ آج کے جنوبی افریقہ سے ناآشنا تھے۔یہ ان کے لیے اور میرے لیے ایک نیوفاؤنڈلینڈ یونی نودریافت سرزمین تھا۔ تاہم یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ اور کوساٹو (Cosatu) کے نوجوان لیڈروں کی ایک غیر معمولی فصل تیار ہو چکی تھی جو ملک میں رہے تھے اور وہ سیاسی صورت حال کو جس طرح جانتے تھے اس سے ہم بے خبر تھے۔1980ء کے عشرے کے دوران یہ تنظیمیں جنوبی افریقہ کے اندر اے این سی کی غائبانہ نمائندگی کرتی رہی تھیں۔

ہمیں نقل وحرکت کے مسائل کے علاوہ فلسفیانہ مسائل بھی درپیش تھے۔جب آپ ایک مشترک دشمن سے نبرد آزما ہوں تو تحریک کو متحد رکھنا نسبتاً ایک سادہ مسئلہ

ہوتا ہے۔ لیکن جب دشمن مذاکرات کی میز پر ہو تو کوئی پالیسی تشکیل دینا بالکل اور مسئلہ ہوتا ہے۔ نئی اے این سی میں ہمیں نہ صرف کئی مختلف گروہوں بلکہ کئی مختلف نقطہ ہائے نظر کو بھی سمونا تھا۔ ہمیں مذاکرات کے نظریے کے اردگرد پارٹی کو متحد کرنے کی ضرورت تھی۔

قانونی سرگرمی کے پہلے سترہ ماہ کے دوران اے این سی نے ساتھ لاکھ ارکان بھرتی کر لیے تھے۔ یہ تعداد متاثر کن تھی مگر اس میں اطمینان کا کوئی پہلو نہ تھا۔ دیہی علاقوں سے ارکان کی تعداد نسبتاً کم تھی اور یہ ایسے علاقے تھے جہاں اے این سی تاریخی طور پر کمزور ترین رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ نیشنل پارٹی نے اپنے دروازے غیر سفید فاموں کے لیے کھول دیئے تھے اور وہ متحرک رنگ داروں اور ہندوستانیوں کو شدومد سے بھرتی کر رہی تھی۔

میری جیل سے رہائی کے بعد سے حکومت نے مسلسل ونی کی کردار کشی کی مہم چلا رکھی تھی۔ چار نوجوانوں کے مبینہ اغوا' جو ڈائیکلوف ہاؤس میں مقیم تھے اور ان میں سے ایک کی موت کے بعد پہلے ونی کے خلاف افواہیں پھیلائی گئیں اور پھر اس پر چاروں نوجوانوں کے اغوا اور قاتلانہ حملے کا الزام لگایا گیا۔ اس کی اس قدر کردار کشی کی جارہی تھی کہ ونی اور میں دونوں اس امر کے خواہش مند تھے کہ وہ کسی روز عدالت میں پیش ہو کر ان الزامات سے اپنی بریت ثابت کرے۔

میری بیوی کا رسمی مقدمہ فروری میں جوہانسبرگ میں ریں ڈ سپریم کورٹ میں شروع ہوا۔ پہلے روز میں اور اے این سی کے کئی سینئر ارکان عدالت میں موجود رہے اور اس کے بعد میں بھی اکثر حاضر ہوتا رہا۔ میرا مقصد اپنی بیوی کی حمایت اور یہ ظاہر کرنا تھا کہ مجھے اس کے بے گناہی کا یقین ہے۔ جارج بیزوس نے اس کی بہت اچھی وکالت کی اور یہ ثابت کرنے کی پوری پوری کوشش کی کہ نوجوانوں کے اغوا اور ان کی پٹائی میں ونی کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔

ساڑھے تین ماہ بعد عدالت نے اسے اغوا اور قاتلانہ حملے میں تعاون کی مجرم ٹھہرایا۔ تاہم جج نے تسلیم کیا کہ اس نے بذات خود کسی حملے میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اسے چھ سال قید سزا سنائی گئی لیکن اپیل کے پیش نظر اسے ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ جہاں تک مجھے علم تھا' فیصلہ اس کے حق میں ہو یا خلاف' اس کے بے گناہی شک و شبہ سے بالا تھی۔

کوڈیسا مذاکرات

ڈیڑھ سال کی پہ بہ پے گفتگوؤں کے بعد 20 دسمبر 1991ء کو مذاکرات شروع ہوئے۔ کنونشن فار اے ڈیموکریٹک ساؤتھ افریقہ (CODESA) کے نام سے یہ مذاکرات حکومت' اے این سی اور دوسری جنوبی افریقی جماعتوں کے مابین پہلا رسمی مذاکراتی فورم تھے۔ ہمارے سب سابقہ دوطرفہ مباحث ان مذاکرات کی راہ ہموار کرتے آرہے تھے۔ یہ مذاکرات جوہانس برگ میں جان سمٹس ایئر پورٹ کے نزدیک ایک جدید نمائشی مرکز ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں منعقد ہوئے۔ کوڈیسا مذاکرات میں اٹھارہ وفود نے شرکت کی جن میں جنوبی افریقی سیاست کے سرکردہ افراد اور اقوام متحدہ دولت مشترکہ' یورپی برادری اور افریقی اتحاد کی تنظیم کے مبصرین شامل تھے۔ یہ متنوع سیاسی گروہوں کا وسیع تر اجتماع تھا جو جنوبی افریقہ میں کسی ایک جگہ منعقد ہوا۔

ایسے مذاکرات کا افتتاح ایک تاریخی موقع تھا۔ یقیناً 1909ء کے بعد سے یہ اہم ترین آئینی کنونشن تھا جب کیپ اور نٹال کی سابق برطانوی کالونیوں اور ٹرانسوال اور اورنج فری سٹیٹ کی جمہوریاؤں نے ایک واحد یونین تشکیل دینے پر اتفاق کیا تھا اگرچہ 1909ء کا کنونشن جمہوریت کے حق میں نہیں بلکہ جمہوریت سے غداری کے مترادف تھا کیونکہ اس میں کسی سیاہ فام نمائندے نے شرکت نہیں کی تھی لیکن 1991ء کے کنونشن میں سیاہ فاموں کی اکثریت تھی۔

ہمارا منصوبہ بندی وفد جس کی قیادت سائرل راما پھوسا کر رہے تھے اور جس میں جو ساوو اور ولی موسیٰ شامل تھے' انتخابات' آئین' آئین ساز اسمبلی اور عبوری حکومت کے معاملات پر حکومت سے ہفتہ وار مباحث کرتا رہا تھا۔ ہوم لینڈ گورنمنٹوں سمیت بیس مختلف جماعتوں کے نمائندوں نے کنونشن کے بنیادی اصول پہلے ہی طے کر لیے تھے۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں تاریخ کا شعور

مذاکرات کے افتتاحی کے وقت پر امید فضا کو چند مخالفین خراب نہیں کر سکتے تھے۔ پی اے سی نے اے این سی اور نیشنل پارٹی پر کثیر نسلی حکومت قائم کرنے کی سازش کرنے کا الزام لگاتے ہوئے مذاکرات کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا' حالانکہ ایک ماہ پہلے پیٹریاٹک فرنٹ کا قیام عمل میں آیا تھا جو اے این سی' پی اے سی اور ازانین پیپلز آرگنائزیشن کا اتحاد تھا جس نے مشترکہ مقاصد کا اعلان کیا تھا۔ پی اے سی جمہوری انتخابات سے خوف کھاتی تھی کیونکہ انہیں علم تھا کہ ایسے انتخابات ان کی معمولی عوامی حمایت کا پول کھول دیں گے۔ چیف بوتھیلزی نے مذاکرات کا بائیکاٹ کرنے کی ایک وجہ یہ بتائی کے انہیں تین وجود بھیجنے کی اجازت نہیں دی گئی' یعنی انکا تھا' کوازولو حکومت اور شاہ زویلتھینی کے وفود۔ ہم نے کہا تھا کہ شاہ کو سیاست سے بالا رہنا چاہیے اور یہ کہ اگر اسے شامل کیا گیا تو پھر جنوبی افریقہ کے ہر قبیلے کو اپنا بالا سردار بھیجنے کا موقع دینا چاہیے۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں نہ صرف تاریخ کا شعور بلکہ انحصاری کا شعور بھی نمایاں تھا۔ اس سے پیشتر زمبابوے اور انگولا جیسے افریقی ممالک کی آزادی کے حوالے سے ہونے والے مذاکرات کے برعکس' جن میں بیرونی ثالثو کی ضرورت پڑی تھی' ہم جنوبی افریقہ میں اپنے اختلافات خود طے کر رہے تھے۔ مسٹر ڈی کلارک نے جمہوری بنیادوں پر ایک عبوری ''پاور شیئرنگ'' حکومت کی ضرورت پر گفتگو کی۔ مذاکرات

میں نیشنل پارٹی کے چیف ڈیلیگیٹ داوائی ڈی ویلر ز نے تو نسلی امتیاز پر معزرت بھی پیش کی۔

اپنے افتتاحی ریماکس میں، میں نے کہا کہ کوڈیسا کے آغاز سے جنوبی افریقہ میں شروع ہونے والی پیشرفت کو اب پلٹایا نہیں جا سکتا۔ میں نے کہا حکومتیں اپنی اتھارٹی اور قانونی جواز محکوموں کی رضامندی سے حاصل کرتی ہیں اور ہم یہاں ایسی قانونی اتھارٹی پیدا کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ میں نے کہا: ''کوڈیسا'' ایک منتخب اسمبلی کی شاہراہ کا نقطۂ آغاز ہے جو ایک نیا آئین تحریر کرے گی اور مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ایسی آئین ساز اسمبلی کے لیے 1992ء میں انتخابات منعقد نہ ہو سکیں۔ میں نے حکومت پر زور دیا کہ وہ قومی اتحاد کی ایک عبوری حکومت بنائے جو ایسے انتخابات کی نگرانی کرے، سرکاری میڈیا کو کنٹرول کرے اور ملک کو ایک نئے غیر نسلی جمہوری جنوبی افریقہ میں بدلنے کے عمل کی نگرانی کرتی رہے۔

کنونشن کے پہلے دن نیشنل پارٹی اور اے این سی سمیت بڑی جماعتوں کے وفود نے ایک ''اعلان عزم'' کی تائید کی جس میں تمام جماعتوں کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ ایک غیر تقسیم شدہ جنوبی افریقہ کی تائید کریں جس کا قانون اعلیٰ ایک آئین ہوگا جسے ایک آزاد عدلیہ کا تحفظ حاصل ہوگا۔ ملک کا قانونی نظام قانون کے سامنے مساوات کی ضمانت دے گا اور شہری آزادیوں کو تحفظ دینے کے لیے حقوق کا ایک مسودہ تیار کیا جائے گا۔ غرضیکہ مشترکہ ووٹروں کی فہرست پر عالمی بالغ رائے دہی پر مبنی کثیر جماعتی جمہوریت قائم ہوگی۔ جہاں تک ہمارا تعلق تھا یہ ایک نئے جنوبی افریقہ کے لیے کم از کم قابل قبول آئینی دستاویز تھی۔ انکا تھا نے اس پر اس عزر کے تحت دستخط کرنے سے انکار کر دیا کہ ایک ''غیر منقسم'' جنوبی افریقہ کی اصطلاح یہ ظاہر کرتی ہے کہ ایک وفاقی نظام کا قیام خارج از بحث ہے۔

کنونشن نے پانچ ورکنگ گروپ تشکیل دیئے جنہیں اوائل 1992ء میں مل کر مئی

1992ء میں مجوزہ کوڈیسا کے دوسرے راؤنڈ کے مذاکرات کی راہ ہموار کرنا تھی۔ گروپوں کو آزادانہ سیاسی فضا تخلیق کرنے کے سوال' ہوم لینڈز کے مستقبل' ساؤتھ افریقن براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کی تشکیل نو' وفاقیت جیسے مختلف آئینی اصولوں کی جانچ پڑتال اور ایک عبوری حکومت کی تشکیل و قیام پر غور و خوض کرنا تھا۔ جماعتیں اس بات پر متفق ہو گئیں کہ فیصلے ''کافی اتفاق رائے'' سے کیے جائیں گے۔ ''کافی اتفاق رائے'' کی کبھی توضیح نہ کی گئی مگر عملاً اس کا مطلب تھا حکومت اور اے این سی اور دوسری جماعتوں کی اکثریت کے مابین مفاہمت۔

ڈی کلارک کی عجیب حرکت

کوڈیسا۔ون کا پہلا دن غیر نمایاں رہا حتیٰ کہ اجلاس برخاست ہو گیا۔ کنونشن سے پہلی رات میں آٹھ بجے کے بعد تک ٹیلی فون پر مسٹر ڈی کلارک سے گفتگو کرتا رہا تھا۔ مسٹر ڈی کلارک نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں اگلے روز انہیں آخری مقرر کے طور پر بولنے کی اجازت دینے پر رضامند ہوں گا یا نہیں۔ اگرچہ اختتامی تقریر مجھے کرنا تھی مگر میں نے انہیں بتایا کہ میں اپنی نیشنل ایگزیکٹیو میں یہ معاملہ اٹھاؤں گا۔ اس شام میں نے یہ معاملہ اٹھایا اور ساتھیوں کے مخالفانہ رویئے کے باوجود میں نے انہیں مسٹر ڈی کلارک کو آخری تقریر کرنے کی اجازت دینے پر آمادہ لیا۔ میں اسے بنیادی مسئلہ نہیں سمجھتا تھا اور مسٹر ڈی کلارک کو یہ رعایت دینے میں مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آتی تھی۔

اجلاس کے آخر میں سب مطمئن نظر آتے تھے۔ میں نے مذاکرات کی اہمیت پر بات کی اور میرے بعد مسٹر ڈی کلارک نے تقریر کی۔ انہوں نے اس موقع کی تاریخی اہمیت کا تذکرہ کیا اور باہمی بے اعتمادی پر قابو پانے کی ضرورت پر زور دیا۔ لیکن پھر انہوں نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ اے این سی کو موردِ الزام ٹھہرانے لگے کہ اس نے ان سمجھوتوں کا پاس نہیں کیا جو ہم حکومت سے کیے تھے۔ وہ ہم سے ایک سکول

ماسٹر کی طرح خطاب کرنے لگے جو ایک شرارتی بچے کو ڈانٹ ڈپٹ رہا ہو۔انہوں نے اے این سی کی گوشمالی کرتے ہوئے کہا کہ وہ اسلحے کے ذخائر کا پتہ بتانے میں ناکام رہی ہے اور پھر ہماری سرزنش کی کہ ہم نے ستمبر 1991ء کے قومی امن معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئےایک ''نجی فوج'' مخونتووی سزوی برقرار رکھی ہے۔اپنی بے لگام زبان میں انہوں نے سوال کیا آیا اے این سی اس قدر وقار کی حامل ہے کہ جن معاہدوں پر وہ دستخط کرے ان کی پابندی کر سکے۔

میری غصیلی تقریر

یہ میری برداشت سے باہر تھا اور مجھے ہدف تنقید بنایا جاتا اگر میں ڈی کلارک کی تقریر کے بعد کچھ نہ کہتا۔جب انہوں نے تقریر ختم کی تو پروگرام کے مطابق اجلاس برخاست ہو جانا تھا۔لیکن کمرے میں گہری خاموشی طاری تھی' چنانچہ اجلاس ختم ہونے کا اعلان کرنے کے بجائے میں پوڈیم کی طرف چل کر گیا۔میں ان کے الزامات کا جواب دیئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔میری آواز میرے غصے کی چغلی کھاتی تھی۔

میں نے کہا:

''مجھے آج مسٹر ڈی کلارک ک رویے پر شدید تشویش ہے۔انہوں نے اے این سی پر حملہ کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے انہوں نے مفاہمت کے تمام تقاضے بلائے طاق رکھ دیئے۔ایک غیر قانونی غیر مقبول اقلیتی حکومت بھی' جیسا کہ ان کی حکومت ہے'بعض اخلاقی معیار رکھتی ہے جن کی وہ پاسداری کرتی ہے۔ان کے پاس محض اس لیے کوئی عذر نہیں کہ وہ ایک ایسی غیر مقبول حکومت کے سربراہ ہیں جو اخلاقی معیاروں کی پاسداری نہیں کرتی اگر کوئی شخص اس نوع کی کانفرنس میں شرکت کرے اور اس طرح کی سیاست کا مظاہرہ کرے جیسا کہ انہوں نے کیا ہے تو بہت کم لوگ ایسے آدمی کے ساتھ معاملہ کرنا پسند کریں گے۔

”حکومت کے ارکان نے ہمیں ترغیب دی تھی کہ ہم انہیں آخر میں بولنے کا موقع دیں۔وہ یہاں آخری الفاظ کہنے کے بہت شائق تھے۔اب یہ واضح ہو گیا ہے کہ وہ ایسا کیوں چاہتے تھے۔مسٹر ڈی کلارک نے اپنے پوزیشن کا غلط استعمال کیا ہے کیونکہ انہیں امید تھی کہ میں جواب نہیں دوں گا۔وہ غلط سمجھتے تھے۔میں اب انہیں جواب دے رہا ہوں۔“

میں نے کہا کہ میرے لیے یہ ناقابل قبول ہے کہ مسٹر ڈی کلارک ایسی زبان میں ہم سے بات کریں۔میں نے یاد دلایا کہ یہ حکومت نہیں بلکہ اے این سی تھی جس نے امن مذاکرات کی طرف پہلا قدم اٹھایا اور یہ اے این سی نہیں بلکہ حکومت تھی جس نے بار بار طے شدہ امور سے انحراف کیا۔میں نے پہلے ہی مسٹر ڈی کلارک کو بتا دیا تھا کہ عوامی سطح پر اے این سی پر حملے کرنے سے کوئی مقصد پورا نہیں ہو گا' پھر بھی انہوں نے یہ شغل جاری رکھا۔میں نے کہا کہ ہم نے امن سے اپنی وابستگی کے اظہار کے لیے مسلح جدوجہد معطل کر دی ہے' پھر بھی حکومت نے ان لوگوں سے ابھی تک ملی بھگت کر رکھی ہے جو جنگ کے شعلے بھڑکاتے ہیں۔ہم نے انہیں بتا دیا کہ ہم اپنے ہتھیار صرف اس وقت ظاہر کریں گے جب ہم ہتھیار جمع کرنے والی حکومت کا حصہ ہوں گے اور اس سے پہلے ہرگز نہیں۔

میں نے مزید کہا کہ اب یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ حکومت دوہرے ایجنڈے پر عمل کر رہی ہے۔وہ امن حاصل کرنے کے لیے مذاکرات نہیں کر رہے بلکہ انہیں اپنے گھٹیا سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔مذاکرات کرتے ہوئے بھی وہ خفیہ طور پر ان زیرزمین تنظیموں کو فنڈز فراہم کر رہے ہیں جو ہمارے خلاف تشدد کی مرتکب ہو رہی ہیں۔میں نے حال ہی میں انکاتھا کو ایک ملین رینڈ کی ادائیگی کے انکشاف کا ذکر کیا جس کے بارے میں ڈی کلارک کا دعویٰ ہے کہ انہیں اس کا علم نہیں۔میں نے کہا اگر ان کے عہدے کے ایک شخص کو ایسی باتوں کا علم نہ ہو تو وہ

سربراہ حکومت ہونے کے کسی طور اہل نہیں۔

میں جانتا تھا کہ میرے الفاظ سخت ہیں لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ مذاکرات کا پورا سفینہ الٹ جائے' چنانچہ میں نے مفاہمتی لہجہ اختیار کرتے ہوئے آخر میں کہا:

''میں ان سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اپنے کارڈز میز پر سیدھے رکھیں۔ آیئے ہم علانیہ مل کر کام کریں۔ کوئی خفیہ ایجنڈا نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں ہمیں یہ تاثر نہیں دینا چاہیے کہ وہ آخری مقرر اس لیے بنتے ہیں کیونکہ وہ اپنے اس استحقاق کا غلط استعمال کرتے ہوئے اس امید میں ہم پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں کہ ہم جواب نہیں دیں گے۔ ان کی تمام غلطیوں کے باوجود میں ان کے ساتھ کام کرنے کو تیار ہوں۔''

ڈی کلارک کا جوا

کوڈیسا ون کے افتتاح کے چھ ہفتے بعد نیشنل پارٹی نے ٹرانسوال میں ایک قدامت پرست یونیورسٹی ٹاؤن پوش سٹروم میں ایک اہم ضمنی الیکشن لڑا۔ یہ حلقہ روایتی طور پر نیشنل پارٹی کا گڑھ تھا مگر نیشنلسٹوں کو چونکا دینے والی پریشانی سے دوچار ہونا پڑا اور دائیں بازو کی کنزرویٹو پارٹی کا امیدوار جیت گیا۔ کنزرویٹو پارٹی نے اے این سی کے ساتھ مذاکرات کی سرکاری پالیسی کی مخالفت کی تھی اور یہ جماعت زیادہ تر افیکروں پر مشتمل تھی جو یہ سمجھتے تھے کہ مسٹر ڈی کلارک گھر لٹا رہے ہیں۔ الیکشن کے نتائج نے مسٹر دی کلارک کی اصلاح اور مذاکرات کی پالیسی پر شکوک وشبہات کے سائے ڈال دیئے۔ نیشنل پارٹی چونک اٹھی۔ ان کے اپنے گڑھ میں ان کے اپنے ووٹر ان کی پالیسیوں کو مسترد کر رہے تھے۔

مسٹر ڈی کلارک نے جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ پوش سٹروم کے ضمنی انتخاب کے پیش نظر وہ 17 مارش کو قومی سطح پر سفید فاموں میں رفرنڈم کرائیں گے تا کہ جنوبی افریقہ کے عوام ان کی اصلاحی پالیسی اور اے این سی کے ساتھ مذاکرات کے مسئلے پر ووٹ ڈال سکیں۔ انہوں نے کہا اگر ریفرنڈم میں انہیں شکست

ہو گئی تو وہ عہدے سے مستعفی ہو جائیں گے۔ ریفرنڈم میں اٹھارہ سال سے زیادہ عمر کے تمام سفید فام ووٹروں سے ایک سادہ اور براہ راست سوال پوچھا گیا تھا: ''کیا آپ اس اصلاح عمل کے تسلسل کی حمایت کرتے ہیں جو صدر مملکت نے 2 فروری 1990ء سے شروع کیا ہے اور جس کا مقصد مذاکرات کے ذریعے ایک نئے آئین کی تیاری ہے؟''

اے این سی نے اس اصول کی بنا پر ریفرنڈم کی مخالفت کی کہ اس عمل میں سے تمام غیر سفید فام باہر رکھے گئے ہیں۔ مزید برآں ہم حقیقت پسند تھے۔ ہم یقیناً یہ نہیں چاہتے تھے کہ سفید فام ووٹر مسٹر ڈی کلارک کی مذاکرات جاری رکھنے کی کوششوں کو ناکام بنا دیں۔ اگرچہ ہم اصولی بنا پر ریفرنڈم کے مخالف تھے' ہم نے سفید فاموں پر زور دیا کہ وہ ''ہاں'' میں ووٹ دیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ ایسا ووٹ مذاکرات کی حمایت کا اظہار ہو گا نہ محض ڈی کلارک کی حمایت کا۔

ہم مسٹر ڈی کلارک کی مہم کو دلچسپی اور حیرت سے دیکھتے رہے۔ انہوں نے اور ان جماعت نے ایک جدید' مہنگی امریکی طرز کی سیاسی مہم چلائی جس میں وسیع پیمانے پر اخباری اور ٹی وی اشتہارات دیئے گئے' بہت بڑی تعداد میں سٹکر لگائے گئے اور رنگا رنگ ریلیاں منعقد کی گئیں۔ ہمارے نزدیک یہ اس مہم کی ڈریس ریہرسل تھی جو مسٹر ڈی کلارک ہمارے خلاف چلانا چاہتے تھے۔

آخری کار 69 فیصد سفید فام ووٹروں نے مذاکرات کے حق میں ووٹ دیا اور ڈی کلارک کو بھاری فتح دلائی جس سے انہیں اپنے موقف کے درست ہونے کا احساس ہوا بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس فتح نے ان کے دماغ میں قدرے ہوا بھر دی۔ ان کے ہاتھ مضبوط ہو گئے اور اس کے نتیجے میں نیشن لسٹوں نے اپنی مذاکراتی پوزیشن مضبوط بنالی۔ یہ سٹراٹیجی ہمارے لیے خطرناک تھی۔

ونی سے علیحدگی

13 اپریل 1992ء کو جوہانس برگ میں ایک پریس کانفرنس میں میرے دو سب سے پرانے دوست اور ساتھ والٹر اور آلیور میرے دائیں بائیں براجمان تھے۔ اس پریس کانفرنس میں، میں نے اپنی بیوی سے علیحدگی کا اعلان کیا۔ صورتحال اس قدر مشکل ہوگئی تھی کہ میں نے سوچا کہ یہ بات سارے متعلقین یعنی اے این سی، خاندان اور ونی کے مفاد میں ہوگی کہ ہم میاں بیوی ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔ اگر چہ میں نے اس معاملے میں اے این سی والوں سے بھی مشورہ کیا تھا تاہم علیحدگی بذات خود ذاتی وجوہات کی بنا پر عمل میں آئی۔ میں نے پریس کانفرنس میں درج ذیل بیان پڑھا:

''میرا اور میری بیوی، کامریڈ نومزاموونی منڈیلا کا باہمی تعلق ذرائع ابلاغ میں بہت زیر بحث رہا ہے۔ میں اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لیے یہ بیان جاری کر رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ اس سے مزید خیال آرائی ختم ہو جائے گی۔

''کامریڈ نومزامو اور میں اس وقت رشتہ ازدواج میں بندھے تھے جو ملک میں جاری تحریک آزادی کے لیے بڑا نازک تھا۔ اے این سی اور نسلی امتیاز ختم کرنے کی جدوجہد سے اپنی مشترکہ وابستگی کے تقاضوں کی وجہ سے ہم معمولی کی عائلی زندگی سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔ سیاسی جدوجہد کے ان تقاضوں کے باوجود ہماری باہمی محبت اور اپنی شادی سے ہمارا اخلاص بڑھتا اور گہرا ہوتا گیا۔

''دو عشرے جو میں نے جزیرہ روبن میں گزارے، ان برسوں کے دوران ان وہ میرے لیے ذاتی طور پر ناگزیر سہارا اور سکون کا باعث بنی رہی۔ کامریڈ نومزامو نے ہمارے بچوں کی پرورش کا بھاری بوجھ اکیلے اٹھایا۔ اس نے حکومت کی طرف سے مسلط کیے جانے والے انتقام و ابتلا کی صبر و تحمل سے برداشت کیا اور آزادی کی جدوجہد سے اس کی وابستگی کبھی کمزور نہ ہوئی۔ اس کی ثابت قدمی سے میرے ذاتی احترام، محبت اور پیار میں اور اضافہ ہوا۔ اس کے اس کردار نے دنیا بھر سے بھی

داد وصول کی۔ میری اس سے محبت میں کمی نہیں آ سکتی۔

''تاہم حالیہ مہینوں میں بہت سے معاملات میں ہمارے اختلافات کے باعث جس کشیدگی نے جنم لیا ہے اس کے پیش نظر ہم نے باہمی رضامندی سے یہ طے کیا ہے کہ ہم دونوں میں علیحدگی ہر ایک کے لیے بہترین رہے گی۔ میرے اس اقدام کا سبب وہ حالیہ الزامات نہیں بنے جو اس کے خلاف میڈیا میں عائد کیے جاتے رہے ہیں۔ کامریڈ نومزامو نے اپنی زندگی کے ان جہد آشنا لمحات کے دوران میری مسلسل حمایت پر اعتماد کیا ہے اور اعتماد کر سکتی ہے۔

''مجھے ذاتی طور پر اس زندگی پر کبھی افسوس نہیں ہوگا جو کامریڈ نومزامو اور میں نے اکٹھے گزارنے کی کوشش کی، تاہم ہمارے کنٹرول سے باہر حالات نے اسے دوسرے رخ پر ڈال دیا۔ میں اپنی بیوی کو موردِ الزام ٹھہرائے بغیر اس سے علیحدہ ہو رہا ہوں۔ اس لمحے سے کلے کر جب میں اس سے پہلی بار ملا تھا، میں نے جیل کے اندر اور باہر اس کے لیے جو محبت اور پیار کے جذبے پالے تھے وہ سب اس کی نذر کرتا ہوں۔

''خواتین و حضرات! آپ اس ابتلا کی تعریف کریں گے جس سے میں گزر رہا ہوں۔''

شاید بعض باتیں اس لیے میری نگاہوں سے اوجھل تھیں کہ مجھے شدت سے یہ احساس تھا کہ میں اپنی بیوی کے خاوند اور اپنے بچوں کے باپ کی حیثیتوں سے اپنا کردار ادا نہیں کر سکا۔ لیکن جیسا کہ مجھے یقین تھا کہ میری قید کے دوران میری بیوی کی زندگی میری زندگی سے کہیں زیادہ مشکل تھی۔ اس نے ایک آدمی سے شادی کی جو جلد ہی اسے چھوڑ گیا۔ وہ آدمی ایک افسانہ بن گیا اور پھر وہ افسانہ لوٹ کر گھر آیا تو ایک آدمی ہی ثابت ہوا۔

جیسا کہ میں نے بعد میں اپنی بیٹی کی شادی پر کہا، یوں لگتا ہے مجاہدین آزادی

قسمت میں لکھا ہوتا ہے کہ ان کی ذاتی زندگی غیر مستحکم رہے گی۔ جب آپ کی زندگی جدوجہد سے عبارت ہو' جیسا کہ میری زندگی تھی' تو اس میں خاندان کے لیے کم ہی گنجائش بچتی ہے۔ مجھے اس پر سب سے زیادہ افسوس رہا ہے اور میں نے جو انتخاب کیا تھا یہ اس کا سب سے دردناک پہلو ہے۔

میں نے بیٹی کی شادی پر کہا: ''ہم اپنے بچوں کو اپنی رہنمائی دیئے بغیر انہیں بڑے ہوتے دیکھتے رہے اور جب ہم (جیل سے) باہر آئے' میرے بچوں نے کہا: ''ہم سمجھتے تھے کہ ہمارا ایک باپ ہے اور ایک دن وہ لوٹ کر آئے گا۔ لیکن جب ہمارا باپ لوٹ کر آیا تو ہمارے لیے ناخوشگوار صورتحال پیدا ہوئی۔ وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا کیونکہ وہ اب بابائے قوم بن چکا ہے۔'' بابائے قوم بننا ایک بڑا اعزاز ہے مگر بابائے خاندان بننا زیادہ خوش کن ہے۔ لیکن قدرت نے مجھے اس خوشی کا مستحق نہیں گردانا!

کوڈیسا۔2 کا انعقاد

چار ماہ کے وقفے کے بعد مئی 1992ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ملٹی پارٹی کانفرنس کا دوسرا پلینری سیشن (Plenary Session) منعقد ہوا۔ کوڈیسا 2 کے نام سے ان مذاکرات کا راستہ اے این سی اور حکومت کے مذاکرات کنندگان کے مابین خوفیہ ملاقاتوں اور اے این سی اور دوسری جماعتوں کے مابین مباحث نے ہموار کیا تھا۔ ان ملاقاتوں کے نتیجے میں مسٹر ڈی کلارک اور میرے مابین آخری بات چیت کوڈیسا 2 کے افتتاح سے ایک دن پہلے ہوئی جو کوڈیسا 1 کے بعد سے ہم دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔

حکومت کے دو اسکینڈل

کوڈیسا 2 کے آغاز سے چند روز پہلے ہی حکومت کو دو اسکینڈلوں نے آلیا۔ پہلا اسکینڈل محکمہ ترقیات میں وسیع پیمانے پر کرپشن اور رشوت کا تھا۔ یہ محکمہ ہوم لینڈز میں سیاہ فاموں کی زندگی بہتر بنانے کا ذمے دار تھا۔ دوسرا اسکینڈل اعلیٰ سرکاری

سیکورٹی افسران کا 1985ء میں یوڈی ایف کے چار افراد کے قتل میں ملوث ہونا تھا' ان میں سے میتھیو گونا ئیوی خاصا معروف تھا۔ ان انکشافات کے علاوہ انہی دنوں یہ شواہد ملے تھے کہ نٹال میں پولیس قتل کی وارداتوں میں ملوث رہی ہے اور یہ شبہات بھی سامنے آئے کہ ڈیپارٹمنٹ آف ملٹری انٹیلی جنس اے این سی کے خلاف خفیہ آپریشن انجام دے رہا ہے۔ ان دو اسکینڈلوں نے مل کر حکومت کا اعتبار گنوا دیا اور ہمارے ہاتھ مضبوط ہو گئے۔

گزشتہ مہینوں کے دوران حکومت نے کئی تجاویز پیش کی تھیں جو دور از کار تھیں۔ گردشی صدارت کے تصور کی طرح ان میں اکثر ارباب حکومت کے لیے اقتدار کو محفوظ بناتی تھیں۔ لیکن اے این سی اور حکومت کی ٹیموں کے مابین گزشتہ چند ماہ کے مذاکرات کے نتیجے میں ایک ٹھوس سمجھوتہ طے پایا گیا تھا۔ جس میں دو مرحلہ عبوری دور کے ذریعے ایک مکمل طور پر جمہوری جنوبی افریقہ کی ضمانت دی گئی تھی۔ پہلے مرحلے میں کوڈیسا کے وفود کی طرف سے ایک کثیر الجماعتی کو سیاسی عمل میں حصہ لینے کا موقع مل سکے اور ایک عبوری آئین تشکیل پائے۔ دوسرے مرحلے میں آئین ساز اور قانون ساز اسمبلی کے لیے عام انتخابات منعقد ہونے تھے جن میں پانچ فیصد یا اس سے زیادہ ووٹ لینے والی تمام سیاسی جماعتوں کو کابینہ میں شریک ہونا تھا۔ اسمبلی کے نصف ارکان قومی بنیاد پر اور نصف علاقائی بنیاد پر چنے جانے تھے اور اسمبلی کو آئین سازی اور قانون سازی دونوں کے اختیارات تضویض کیے جانے تھے۔ ایک آزاد کمیشن کو انتخابات کا اہتمام کرنا اور اس امر کو یقینی بنانا تھا کہ وہ آزادانہ اور منصفانہ ہوں۔

بایں ہمہ کئی مسائل ایسے تھے جن پر اے این سی اور حکومت میں اتفاق نہیں ہو سکا تھا جیسے اسمبلی میں ووٹنگ کا فیصد تناسب جو آئینی امور نپٹانے اور مسودہ حقوق پر اتفاق رائے کے لیے درکار تھا۔ کوڈیسا 2 کے انعقاد سے چند ہی روز پہلے حکومت نے

ایک دوسرے ادارہ سینٹ کی تجویز دی جسے علاقائی نمائندگان پر مشتمل ہونا تھا اور یہ اقلیتی ووٹ کو باوزن بنانے کا ایک طریقہ تھا۔ انہوں نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ اس پورے عمل سے پہلے کوڈیسا۔2 ایک عبوری آئین کی تشکیل پر متفق ہو جائے جسے عملی شکل دینے میں کئی ماہ لگنے تھے۔

پس منظر میں یہ ساری سودابازی جاری تھی اور جب 15 مئی 1992ء کو کوڈیسا 2 کا افتتاح ہوا' کسی سمجھوتے کے امکانات روشن نظر نہیں آتے تھے۔ جن امور پر اتفاق نہیں ہو پایا تھا وہ ان سب کو معرض خطر میں ڈال رہے تھے جن پر ہم اب تک متفق ہوئے تھے۔ بیشتر بدیہی امور پر میں اور مسٹر ڈی کلارک اتفاق نہیں کر سکے تھے۔ یوں لگتا تھا حکومت غیر معینہ عرصے کے لیے انتظار کرنے کو تیار ہے۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ جتنا زیادہ ہم انتظار میں رہیں گے اتنی ہی زیادہ عوام حمایت ہم کھو بیٹھیں گے۔

مذاکرات میں ڈیڈلاک

پہلے روز کے اختتام پر کنونشن میں ڈیڈلاک پیدا ہو گیا۔ اس وقت مذاکرات کی صدارت کرنے والے دونوں ججوں نے مجھ سے اور مسٹر ڈی کلارک سے کہا کہ ہم اس شام ایک ملاقات کر کے کسی مفاہمت تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اس رات ہم نے کافی پر ملاقات کی اور اگرچہ ہم ڈیڈلاک سے نکلنے کا راستہ تلاش نہ کر سکے' مگر اس پر ہمارا اتفاق رہا کہ مذاکرات ناکامی سے دوچار نہیں ہونے چاہئیں۔ میں نے مسٹر ڈی کلارک سے کہا:

''پورے جنوبی افریقہ اور دنیا کی نگاہیں آپ اور مجھ پر لگی ہیں۔ آیئے ہم امن کے عمل کا تحفظ کریں۔ آیئے ہم کسی قسم کی مفاہمت تک پہنچ جائیں۔ آیئے ہم کم از کم مذاکرات کے اگلے دور کی تاریخ متعین کر لیں۔''

ہم نے فیصلہ کیا کہ اگلے روز ہم میں سے ہر ایک تعمیری مفاہمت کے جذبات سے

تقریر کرے گا۔

اگلی سہ پہر ہم نے اس ترتیب کے برعکس تقریریں کیں جس پر ہمارا کوڈیسا-1 میں اتفاق ہوا تھا۔ مسٹر ڈی کلارک پہلے بولے اور میں بعد میں۔ اپنے ریمارکس میں مسٹر ڈی کلارک نے اصرار کیا کہ نیشنل پارٹی اقلیتی ویٹو کی خواہاں نہیں بلکہ یہ کہ وہ چیک اینڈ بیلنس کا ایک نظام چاہتے ہیں تاکہ اکثریت اپنے اقتدار کا غلط استعمال نہ کر سکے۔ اگرچہ مجھے اس میں اکثریتی حکومت کے تصور کی یکسر مخالفت کا پہلو نظر آتا تھا مگر جب میں نے مسٹر ڈی کلارک کے بعد تقریر کی تو اس میں محض یہ کہا کہ ہمیں تعمیری انداز میں کام کرنے اور مذاکرات کی راہ میں حائل کشیدگیاں بالائے طاق رکھنے کی ضرورت ہے۔

معاملات کو مثبت انداز میں لینے کی ہماری کوششوں کے باوجود کنونشن کا دوسرا دن تعطل پر اختتام پذیر ہوا۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ تعطل اس لیے پیدا ہوا تھا کہ نیشنل پارٹی اپنی قسمت اکثریت کی مرضی کے سپرد کرنے میں مسلسل تامل کر رہی تھی۔ ان میں اس رکاوٹ کو پار کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

آخر کار کوڈیسا-2 چار بنیادی معاملات پر منقطع ہو گئے۔

1- حکومت کو اصرار تھا کہ آئین کی منظوری کے لیے اسمبلی میں ووٹوں کا فیصد تناسب اونچا رکھا جائے جو ہمارے لیے قابل قبول نہ تھا کیونکہ اس طرح اقلیت کو ویٹو کا حق مل جاتا۔

2- علاقائی طاقتیں جو مستقبل کے آئین پر حاوی ہوتیں۔

3- ایک غیر جمہوری اور غیر منتخب سینٹ جسے قانون سازی میں منتخب اسمبلی (Mainchamber) پر ویٹو پاور حاصل ہوتی ہے۔

4- یہ عزم کہ عبوری آئین کو کنونشن میں زیر بحث لا کر مستقل آئین کی شکل دے دی جائے۔

یہ تمام مشکل معاملات تھے مگر نا قابل حل نہیں تھے اور میں نے عزم کر رکھا تھا کہ کوڈیسا-2 میں پیدا شدہ تعطل کو مذاکراتی عمل نا کام بنانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ حکومت اور اے این سی رضا مند ہو گئیں کہ کسی حل تک پہنچنے کے لیے دوطرفہ بات چیت جاری رکھی جائے۔ لیکن پھر دوسرے معاملات بیچ میں آ گئے جن سے گفت وشنید کا تسلسل جاری نہ رہ سکا۔

وآل ٹاؤن شپ میں قتل عام

مذاکرات ملتوی ہو جانے کے ساتھ اے این سی اور اس کے اتحادیوں نے ''رولنگ ماس ایکشن'' (Rolling Mass Action) پر اتفاق کیا جس سے حکومت پر یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ہمیں ملک بھر میں بے پناہ عوامی حمایت حاصل ہے اور یہ کہ جنوبی افریقہ کے لوگ آزادی کے لیے ہمیشہ انتظار کرتے رہنے پر آمادہ نہیں۔ ماس ایکشن ہڑتالوں، مظاہروں اور بائیکاٹوں پر مشتمل تھا۔ ماس ایکشن کے آغاز کی تاریخ 16 جون 1992ء رکھی گئی جو 1976ء کی سوویٹو بغاوت کی سالگرہ تھی اور اس مہم کا اختتام 3 اور 4 اگست کو دوروزہ قومی ہڑتال پر ہونا تھا۔

لیکن اس سے پہلے ایک اور واقعہ پیش آیا جس نے اے این سی اور حکومت کے مابین مزید دوریاں پیدا کر دیں۔ 17 جون 1992ء کی رات انکا تھا کہ ارکان کا پوری طرح مسلح ایک جتھا بوئے پاٹونگ کی وآل ٹاؤن شپ پر حملہ آور ہوا اور 46 افراد مار ڈالے۔ بیشتر مقتولین عورتیں اور بچے تھے۔ اس ہفتے یہ اے این سی کے لوگوں کی چوتھی اجتماعی ہلاکت تھی۔ اس تشدد سے ملک بھر میں لوگ خوفزدہ ہو گئے اور انہوں نے الزام لگایا کہ اس ہلاکت خیزی میں حکومت ملوث ہے۔ پولیس نے مجرموں کو روکنے اور ان کا سراغ لگانے کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ کوئی گرفتاریاں عمل میں نہ آئیں اور نہ تفتیش کی گئی۔ مسٹر ڈی کلارک نے اس پر کچھ نہ کہا۔ میرے لیے یہ آخری تنکا ثابت ہوا اور مجھ میں صبر کا یارا نہ رہا۔ حکومت مذاکرات کا راستہ روک

رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارے لوگوں کے خلاف پوشیدہ جنگ برپا کیے ہوئے تھی' پھر ہم ان سے گفت وشنید جاری کیوں رکھے ہوئے تھے؟

ان ہلاکتوں کے چار دن بعد میں نے اے این سی کے بیس ہزار غضبناک حامیوں پر مشتمل ہجوم سے خطاب کیا اور انہیں بتایا کہ میں نے اے این سی کے سیکرٹری جنرل سائرل راما پھوسا کو ہدایت کی ہے کہ حکومت سے براہ راست معاملات معطل کر دیئے جائیں۔ میں نے اپنے آپشنز کا جائزہ لینے کے لیے نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی کا فوری اجلاس بلانے کا اعلان کیا۔ یوں لگتا تھا کہ ہم شارپ ویل کے تاریک دنوں کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ میں نے نیشنل پارٹی کے رویے کو جرمن نازیوں کے مشابہ قرار دیا اور ڈی کلارک کو سرعام انتباہ کیا کہ اگر انہوں نے مظاہروں یا آزادانہ اظہار رائے کو محدود کرنے کے لیے نئی بندشیں عائد کرنے کی کوشش کی تو اے این سی ملک گیر خلاف ورزی مہم چلائے گی جس میں پہلا رضا کار میں خود ہوں گا۔

ریلی میں نے ایسے بینر دیکھے جن پر لکھا تھا:

(Mandela, give us guns)(منڈیلا! ہمیں بندوقیں دو)

(Vitory through battle not talk) فتح جنگ سے ہوگی' مذاکرات سے نہیں۔

میں ان جذبات کو سمجھ رہا تھا۔ لوگ مایوس تھے۔ انہیں مذاکرات کا کوئی مثبت نتیجہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگے تھے کہ نسلی امتیاز کا تختہ الٹنے کا واحد راستہ بندوق کی نالی سے نکلتا ہے۔ سانحہ بوئے پاٹونگ کے بعد اے این سی کے کئی ارکان نے کہا: ''ہم نے مسلح جدوجہد کا راستہ ترک کیوں کیا؟ اس کے بجائے ہمیں مذاکرات ترک کر دینے چاہئیں' ان سے ہم اپنی منزل تک نہیں پہنچ پائیں گے۔'' شروع میں ان سخت موقف رکھنے والوں سے مجھے ہمدردی تھی لیکن بتدریج مجھے احساس ہوا کہ مذاکراتی عمل کا کوئی متبادل نہیں۔ میں بہت برسوں سے اس پر زور دے رہا ہوں' لہٰذا

میں مذاکرات سے منہ نہیں موڑوں گا۔لیکن یہ موقع تھا کہ معاملات کو ٹھنڈا کیا جائے۔اس صورت میں عوامی ایکشن (Mass Action) مسلح جدوجہد اور مذاکرات کا درمیانی راستہ تھا۔لوگوں کو غصے اور مایوسی کے نکاس کا راستہ ملنا چاہیے تھا اور ''عوامی ایکشن مہم'' جذبات کو راہ دینے کا بہترین طریقہ تھی۔

جب ہم نے حکومت کو اطلاع دی کے ہم مذاکرات معطل کر رہے ہیں' تو مسٹر ڈی کلارک کو ایک یادداشت بھیجی جس میں ہماری مذاکرات سے علیحدگی کی وجوہ بیان کی گئی تھیں۔ہم نے مطالبہ کیا تھا کہ کوڈیسا-2 میں پیدا شدہ دستوری تعطل کو حل کرنے کے علاوہ تشدد کے ذمے دار لوگوں کا سراغ لگا کر انہیں انصاف کے حوالے کیا جائے اور یہ کہ ہوسٹلوں میں پولیس کی تعیناتی اور کڑی نگرانی کا اہتمام کیا جائے جن سے اس قدر تشدد جنم لیتا ہے۔مسٹر ڈی کلارک نے جواب میں مجھ سے روبرو ملاقات کی مانگ جو ہم نے مسترد کر دی۔میں نے محسوس کیا کہ ایسی ملاقات کا مطلب یہ نکالا جائے گا کہ ہم کوئی مذاکرات کر رہے ہیں اور فی الحال ہم ایسا نہیں چاہتے تھے۔

عوامی ایکشن مہم 3 اور 4 اگست کو عام ہڑتال پر منتج ہوئی جو اے این سی کے مذاکراتی مطالبات کی حمایت اور حکومت کی سرپرستی میں تشدد کے خلاف احتجاج کا اظہار تھی۔چالیس لاکھ سے زیادہ کارکن اپنے گھروں پر رہے اور یہ جنوبی افریقہ کی تاریخ میں سب سے بڑی سیاسی ہڑتال تھی۔ہڑتال کا سب سے نمایاں پہلو پریٹوریا میں ایک لاکھ افراد کا یونین بلڈنگز کی طرف مارچ تھا جو ساؤتھ افریقن گورنمنٹ کا پر شکوہ مرکز تھیں' ان عمارات کے سامنے بہت کشادہ لان میں ہم نے عظیم الشان آؤٹ ڈور ریلی منعقد کی۔میں نے ہجوم کو بتایا کہ ایک روز ہم ان عمارات پر قابض ہو کر جنوبی افریقہ کی پہلی جمہوری طور پر منتخب حکومت تشکیل دیں گے۔

اس عوامی ایکشن کے پیش نظر مسٹر ڈی کلارک نے کہا کہ اگر اے این سی نے حکومت کو ناقابل حکومت بنا دیا تو حکومت کچھ ناخوشگوار اقدامات پر غور کرنے پر مجبور

ہو جائے گی۔ میں نے مسٹر ڈی کلارک کو انتباہ کیا کہ کسی بھی غیر جمہوری اقدام کے نتائج سنگین ہوں گے۔ میں نے کہا کہ ایسی دھمکیوں کے باعث ہی عبوری حکومت کی تشکیل ایک انتہائی نازک مسئلہ بن گئی ہے۔

اس عوامی ایکشن مہم کی کامیابی سے حوصلہ پا کر اے این سی کے ایک گروہ نے مشرقی کیپ کے سسکائی ہوم لینڈ کے دارالحکومت بیشو پر چڑھائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ سسکائی ہوم لینڈ ایک بنٹوستان (بنٹو قبائل کا علاقہ) تھا جس کی قیادت بریگیڈیئر جنرل اوپا کوزو کر رہے تھے۔ سسکائی میں اے این سی کے افراد پر مظالم ڈھائے جاتے تھے اور 1991ء میں بریگیڈیئر کوزو نے ہوم لینڈ میں مبینہ دہشت گردی ختم کرنے کے لیے ہنگامی حالت نافذ کر دی تھی جس کی سرپرستی ان کے بقول اے این سی کر رہی تھی۔ 7 ستمبر 1992ء کی صبح ستر ہزار احتجاجی مظاہرین مارچ کرتے ہوئے بیشو کے مین سٹیڈیم کی طرف چل پڑے۔ جب مظاہرین کے ایک گروہ نے ایک باڑے کے شگاف میں سے ہو کر قصبے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو ہوم لینڈ کے نیم تربیت یافتہ دستے نے ان پر فائر کھول دیا اور 29 آدمی ہلاک اور دو سو سے اوپر زخمی کر دیئے۔ اس سانحے سے بوئے پاتونگ کے ساتھ ساتھ بیشو بھی وحشیانہ ظلم کی علامت بن گیا۔

او سمجھوتہ ہو گیا

قدیم کہاوت کے مصداق جو یہ کہتی ہے کہ ''تاریک ترین گھڑی فجر سے پہلے ہوتی ہے۔'' بیشو کے سانحے سے مذاکرات کے نئے آغاز نے جنم لیا۔ میں ڈی کلارک سے ملا تا کہ ایک مشترکہ گراؤنڈ ڈھونڈی جائے اور بیشو جیسے ایک اور المیہ کو دہرانے سے بچا جائے۔ ہمارے اپنے مذاکرات کار باقاعدگی سے ملاقاتیں کرنے لگے۔ طرفین خلوص کے ساتھ کوشش کر رہے تھے کہ مذاکرات کو دوبارہ پٹڑی پر ڈالا جائے۔ اور 26 ستمبر کو ڈی کلارک اور میں ایک ''چھوٹی ملاقات'' میں مل بیٹھے۔

اس روز ہم دونوں نے دستاویز مفاہمت (Record of Understanding) پر دستخط کیے۔ اس مفاہمت نے ان تمام مذاکراتی کی راہ ہموار کی جو بعد میں ہوئے۔ حکومت نے پولیس کے اقدامات کا جائزہ لینے کے لیے ایک آزاد ادارہ تشکیل دیا' ہوسٹلوں کی کڑی نگرانی کا ایک نظام قائم کیا اور ریلیوں میں ''روایتی اسلحے'' کا استعمال ممنوع قرار دیا۔ لیکن ریکارڈ آف انڈرسٹینڈنگ کی اصل اہمیت یہ تھی کہ اس نے کوڈیسا-2 کے آئینی تعطل کو توڑ دیا۔ حکومت بالآخر ایک واحد منتخب آئینی اسمبلی قبول کرنے پر رضامند ہوگئی جسے نئے آئین کی منظوری دینی تھی اور نئی حکومت کے لیے عبوری مقننہ کے طور پر کام کرنا تھا۔ اب مذاکرات صرف اس پر ہونے تھے کہ اسمبلی کے انتخاب کی تاریخ کون سی ہو اور فیصلوں کے لیے درکار اکثریتی فیصد تناسب کیا ہو۔ ہم اب بنیادی ڈھانچے پر متفق ہو گئے تھے جسے ملک کو جمہوری مستقبل میں لے جانا تھا۔

ریکارڈ آف انڈرسٹینڈنگ کا اعلان ہوتے ہی انکاتھا فریڈم پارٹی نے اے این سی اور حکومت کے مابین جاری مذاکرات سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ اس مفاہمت پر چیف بوتھیلزی غضبناک ہو گئے اور انہوں نے حکمران نیشنل پارٹی سے تعلقات منقطع کر لیے اور مسترد شدہ ہوم لینڈ لیڈروں کے ایک گروہ اور سفید فام دائیں بازو کی پارٹیوں سے اتحاد کا ڈول ڈالا جو فقط ایک افریکنر ہوم لینڈ کے حصول کے لیے کوشاں تھیں۔ چیف بوتھیلزی نے مطالبہ کیا کہ ریکارڈ آف انڈرسٹینڈنگ کو کالعدم قرار دیا جائے' کوڈیسا کو ختم کیا جائے اور امخونتو وی سزوی کو توڑ دیا جائے۔

خفیہ مذاکرات کا نیا دور

جو سلاوو نے جس طرح مسلح جدوجہد کو معطل کرنے کے متعلق پہلی تجویز دی تھی' اسی طرح انہوں نے ایک متنازع تجویز پیش کرنے میں بھی پہل کی اور وہ تھی ''نیشنل یونٹی قومی اتحاد) کی حکومت''۔ اکتوبر ''جو'' نے ایک دستاویز شائع کی جس

میں انہوں نے لکھا کہ حکومت کے ساتھ مذاکرات کوئی صلح کی گفت وشنید نہیں جس میں ہم ایک شکست خوردہ دشمن پر اپنی شرائط لاگو کرسکیں۔ اس میں کہا گیا تھا کہ انتخابات کے بعد بھی اے این سی کو حکومت کے مرکزی شعبوں پر قابو میں پانے میں غالباً کئی برس لگیں گے۔ اے این سی کی حکومت کو ملک چلانے کے لیے بیشتر موجودہ سول سروس ہی سے کام لینا ہوگا۔''جو نے ایک سن سیٹ کلاز (Sunset clause) کی تجویز دی جس میں قومی اتحاد کی حکومت یعنی ایک مقررہ مدت کے لیے نیشنل پارٹی کے ساتھ اقتدار میں شرکت' سیکورٹی افسروں کے لیے معافی اور سول سرونٹس کے کئے گئے معاہدوں کا احترام کرنے کی شرائط رکھی گئی تھیں۔''اقتدار میں شرکت'' اے این سی والوں کے نزدیک حقیر اصطلاح تھی اور اسے اقلیتی ویٹو کے سلسلے میں سرکاری کی تگ ودو کا خفیہ ہتھکنڈا خیال کیا جاتا تھا۔لیکن موجودہ سیاق و سباق میں اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ نیشنل پارٹی ایک عوامی منتخب حکومت کا حصہ ہو گی بشرطیکہ وہ کافی ووٹ حاصل کرلے۔

خاصی بحث تمحیص کے بعد میں نے''جو'' کی تجویز کی حمایت کی اور نیشنل ایگ یکٹو نے 18 نومبر کو اس کی تائید کردی۔ این ای سی اقتدار میں شرکت کی حمایت کرنے پر رضامند ہوگئی بشرطیکہ اقلیتی جماعتوں کو ویٹو حاصل نہ ہو۔ دسمبر میں ہم نے حکومت کے ساتھ خفیہ دوطرفہ مذاکرات کا ایک نیا راؤنڈ شروع کیا۔ یہ پانچ دنوں کے دوران علاقہ جھاڑ (The Bush) میں ایک شکار گاہ میں منعقد ہوئے۔ یہ مذاکرات بہت اہم ثابت ہوئے کیونکہ ان سے ریکارڈ آف انڈرسٹینڈنگ میں طے شدہ بنیادوں پر تعمیر کا کام لیا گیا۔ علاقہ جھاڑ کی ان ملاقاتوں میں ہم اصولی طور پر قومی اتحاد کی پانچ سالہ حکومت پر متفق ہوگئے جس میں عام انتخابات میں پانچ فیصد سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے والی تمام جماعتوں کو کابینہ میں متناسب نمائندگی دی جانی تھی۔ پانچ سال بعد قومی اتحاد کی حکومت کو سادہ اکثریتی حکومت بن جانا تھا۔ فروری

میں حکومت اور اے این سی نے قومی اتحاد کی پانچ سالہ بعد قومی اتحاد کی حکومت کو سادہ اکثریتی حکومت بن جانا تھا۔فروری میں حکومت اور اے این سی نے قومی اتحاد کی پانچ سالہ حکومت' ایک کثیر الجماعتی کابینہ اور ایک عبوری ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل پر اصولی مفاہمت کا اعلان کیا۔ انتخابات 1993ء کے آخر جلد از جلد منعقد ہونے قرار پائے۔

کرس ہانیکی موت

میرا ہمیشہ سے یقین رہا ہے کہ انسان کا گھر اس مکان کے دائرہ نگاہ میں ہونا چاہیے جہاں وہ پیدا ہوا ہو۔جیل سے رہا ہونے کے بعد میں نے منصوبہ بنایا تھا کہ میں اپنے لیے قونو میں ایک دیہی مکان تعمیر کروں گا۔1993ء کی خزاں تک مکان مکمل ہو چکا تھا۔یہ اس مکان کے نقشے پر بنا تھا جس میں 'میں وکٹر ورسٹر میں رہا تھا۔ لوگ اکثر اس پر تبصرہ کرتے تھے مگر جواب سادہ تھا۔وکٹر ورسٹر کا مکان پہلا کشادہ اور آرام دہ گھر تھا جس میں 'میں مقیم ہوا تھا اور میں اسے بہت پسند کرتا تھا۔میں اس کے طول وعرض سے آشنا تھا' لہذا قونو میں رات کے وقت باورچی خانے کی تلاش میں مجھے گھومنا نہ پڑتا۔

اپریل میں مختصر تعطیل کے لیے میں ٹرانسکائی میں اپنے گھر پہ تھا۔10 اپریل کی صبح میں ٹرانسکائی پولیس رگبی ٹیم کے بعض ارکان کو خوش آمدید کہنے باہر گیا ہی تھا جب میری خادمہ دوڑ کر باہر آئی اور مجھے ایک ضروری فون کال کی اطلاع دی۔وہ رو رہی تھی۔میں نے رگبی ٹیم کے نوجوانوں سے معذرت کی اور ایک ساتھی نے مجھے بتایا کہ ایس اے سی پی (جنوبی افریقی کمیونسٹ پارٹی) کے سیکرٹری جنرل''ایم کے'' کے سابق چیف آف سٹاف اور اے این سی میں ایک مقبول ترین شخصیت کرس ہانی کو گولی ماردی گئی ہے' اسے انتہائی قریب سے بوکس برگ' جوہانس برگ میں اس کے گھر کے سامنے گولی ماری گئی تھی جو زیادہ تر سفید فام محنت کشوں کی مضافاتی بستی

تھی جہاں کرس گھل مل کر رہ رہا تھا۔

کرس کی موت میرے لیے ذاتی طور پر اور تحریک کے لیے ایک صدمہ تھی۔ وہ ایک سپاہی اور محب وطن تھا جس کے لیے کوئی کام بہت چھوٹا نہ تھا۔ وہ جنوبی افریقہ کے نوجوانوں میں ایک عظیم ہیرو تھا۔ ایک ایسا شخص جوان کی زبان بولتا تھا اور جسے وہ سنتے تھے۔ اگر ایک مذاکراتی حل کے پیچھے کوئی شخص آشفتہ نوجوانوں کو حرکت میں لا سکتا تھا تو وہ کرس تھا۔ جنوبی افریقہ اپنے ایک عظیم ترین بیٹے سے محروم ہو گیا تھا۔ ایک ایسا شخص جو ملک کو ایک نئی قوم میں تبدیل کرنے میں بیش بہا اثاثہ ثابت ہو سکتا تھا۔

ملک نازک حالات سے گزر رہا تھا۔ لوگوں کو تشویش تھی کہ ہانی کی موت سے خانہ جنگی شروع ہو سکتی ہے اور نوجوان یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کا ہیرو شہید ہو گیا ہے اور اس کے لیے انہیں اپنی جانیں قربان کر دینی چاہئیں م۔ میں پہلے کرس کے بیاسی سالہ باپ سے اظہار تعزیت کے لیے ہیلی کاپٹر پر اڑ کر سیبالیلی پہنچا جو ٹرانسکائی میں ضلع کوفموابا میں ایک ننھا گرد آلود قصبہ ہے۔ میں اس جگہ سے خوب آشنا تھا کیونکہ یہ جگہ ماتن زیما خاندان کا آبائی علاقہ تھی۔ جب میں بہتے پانی اور بجلی سے محروم اس گاؤں میں پہنچا تو مجھے حیرت ہوئی کہ اس افلاس زدہ اور ننھے مقام نے کس طرح ہانی جیسے انسان کو پیدا کیا' ایک ایسا شخص جس نے اپنے جذبے اور قابلیت سے پوری قوم کو متحرک کر دیا تھا۔ دیہی غریبوں کے لیے اس کی ہمدردی سیبالیلی میں گزرے اس کے بچپن سے پھوٹتی تھی کیونکہ اس کی جڑیں گہری اور حقیقی تھیں اور ان جڑوں سے وہ کبھی نہیں کٹا تھا۔ کرس کا باپ اپنے بیٹے کی جدائی کے غم سے نڈھال تھا مگر اسے اطمینان تھا کہ اس کے بیٹے نے جہد آزادی میں جان دی ہے۔

گورا قاتل پکڑا گیا

جوہانس برگ واپسی پر مجھے اطلاع ملی کہ پولیس نے دائیں بازو کی جنگجو تنظیم

افریکنرویرسٹینڈ زیبوینگ (اے ڈبلیو بی) کے ایک رکن کو گرفتار کرلیا ہے۔ وہ پولینڈ سے جنوبی افریقہ آیا ہوا تارک وطن تھا اور ایک خاتون نے جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے پولیس کو فون کر کے قاتل کے لائسنس پلیٹ نمبر سے آگاہ کیا تھا' چنانچہ اسے حراست میں لے لیا گیا۔ کرس کا قتل مذاکرات کے عمل کو روکنے کی ایک مجنونانہ کوشش تھی۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں اس رات ساؤتھ افریقن براڈ کاسٹنگ کارپوریشن پر قوم سے خطاب کروں۔ اس موقع پر یہ حکومت نہیں بلکہ اے این سی تھی جس نے عوام کو پرامن رکھنے کی کوشش کی۔

میں نے ریڈیو پر کہا کہ امن اور مذاکرات کا عمل روکا نہیں جا سکتا۔ میں نے اپنا تمام تر اثر ورسوخ بروئے کار لاتے ہوئے کہا: ''میں اپنے سارے عوام سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ پرسکون رہیں اور امن کے لیے وقف ایک منظم قوت کی حیثیت سے کرس ہانی کو خراج تحسین پیش کریں۔''

میں نے مزید کہا: ''آج رات میں اپنے وجود کی گہرائیوں سے ہر جنوبی افریقی کالے اور گورے کے دل پر دستک دے رہا ہوں۔ ایک سفید فام' تعصب اور نفرت سے بھرا ہمارے ملک میں آیا اور اس نے ایک اس قدر غلط حرکت کا ارتکاب کیا کہ آج ہماری پوری قوم تباہی کے دہانے پہ کھڑی ہے۔ افریکنر نژاد ایک سفید فام خاتون نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس قاتل کے بارے میں اطلاع دی تاکہ اسے انصاف کے حوالے کیا جائے۔ اب یہ سب جنوبی افریقیوں کی ذمے داری ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے خلاف' ان کا تعلق کہیں سے بھی ہو' مل کر ڈٹ جائیں جو اس مقصد کو تباہ کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے کرس ہانی نے جان دی۔ اور وہ مقصد ہے ہم سب کی آزادی۔''

کرس ہانی کا قتل گورے نسل پرستوں کی طرف سے ناگزیر انجام سے بچنے کی ایک کوشش تھی۔ وہ پرامن ذرائع سے اکثریتی حکومت کو برداشت کرنے کے بجائے

ملک کو خانہ جنگی کے حوالے کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔

ہم نے اے این سی کے اندر اپنی صفوں کے جوشیلوں سے نپٹنے کی ایک حکمت عملی وضع کی۔ جوابی تشدد کا آغاز روکنے کے لیے ہم نے ملک بھر میں عوامی ریلیوں اور مظاہروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ اس سے عوام کو تشدد پر اترے بغیر اپنے جذبات کے اظہار کا موقع گیا۔ مسٹر ڈی کلارک اور میں نے ایک نجی ملاقات میں اس پر اتفاق کیا کہ ہم ہانی کے قتل کو مذاکرات سبوتاژ کرنے کا بہانہ نہیں بننے دیں گے۔

چند روز بعد معلوم ہوا کہ کنزرویٹو پارٹی کا ایک رکن کلائیو ڈربی لیوس ہانی کے قتل کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا ہے۔ اس سے ایک تیسری قوت کے ملوث ہونے کی مزید تصدیق ہوگئی۔ یہ کرس ہی تھا جس نے فضائیہ کے ایک اڈے سے اسلحے کی حالیہ چوری پر تنقید کی تھی اور ابتدائی تفتیش سے پتہ چلا کہ وہ گن جس سے ہانی کو قتل کیا گیا اسی مسروقہ اسلحے سے تعلق رکھتی تھی۔

آلیور ٹیمبو کی رحلت

پورے دو ہفتے بعد ایک اور اہم واقعہ پیش آیا۔ اس سے وہ ہلچل تو نہ مچی جو کرس کے قتل پر مچی تھی، تاہم اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ آلیور ٹیمبو عرصے سے تندرست نہیں تھا مگر جس دورہ دل نے اس کی جان لی وہ اچانک اور پیشگی انتباہ کے بغیر پڑا تھا۔ اس کی بیوی ایڈی لیڈ نے صبح سویرے مجھے فون کیا اور میں سرعت آلیور کے سرہانے پہنچ گیا۔ مجھے اسے مناسب الفاظ میں خدا حافظ کہنے کا موقع بھی نہ مل سکا کیونکہ وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔

فلسفی افلاطون اپنی دھاتوں کی تمثیل میں انسانوں کو سونے، چاندی اور سیسے کے گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ آلیور خالص سونا تھا۔ اس کی ذہانت و فطانت میں سونا تھا، اس کی گرمجوشی اور انسانیت میں سونا تھا، اس کی قوت برداشت اور دریا دلی میں سونا تھا، اس کی اٹل وفاداری اور ذاتی ایثار میں سونا تھا۔ میں جس قدر اس کا بطور

لیڈر احترام کرتا تھا اسی قدر مجھے اس سے بطور انسان محبت تھی۔

اگر چہ ہم میری جیل کی اسیری کے سارے عرصے میں ایک دوسرے سے جدا رہے تھے' آلیور کبھی میرے خیالات سے دور نہیں ہوا تھا۔ اگر چہ ہم الگ الگ تھے'میں طرح طرح سے اپنے ذہن میں اس سے طویل گفتگو کیا کرتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی موت پر میں اس قدر غم زدہ ہوا۔ جیسا کہ ایک ساتھی کو میں نے بتایا میں ان دنوں دنیا میں سب سے تنہا نظر آتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے مجھ سے اسی طرح چھین لیا گیا ہو جس طرح وہ ایک عرصے بعد مجھ سے دوبارہ ملا تھا۔ میں نے اس کے تابوت میں اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو یوں لگا جیسے میرے وجود کا ایک حصہ مر گیا ہو۔

اگر چہ ابھی ہم برسر اقتدار نہیں آئے تھے'میں چاہتا تھا کہ آلیور کی سرکاری تدفین کی جائے اور اے این سی نے یہی کیا۔ سوویٹو سٹیڈیم میں ایک عوامی ریلی ملکی حکومتوں کے سینکڑوں نمائندے اس شخص کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے جس نے اے این سی کو جلاوطنی کے دنوں میں زندہ رکھا تھا۔ ''ایم کے'' کے دستوں نے اس کے اعزاز میں مارش کیا اور اس کی قبر پر اسے اکیس توپوں کی سلامی دی گئی۔ آلیور قیدیوں کو رہا ہوتے اور جلاوطنوں کو واپس آتے دیکھنے کے لیے زندہ رہا تھا لیکن وہ ایک آزاد اور جمہوری جنوبی افریقہ میں ووٹ ڈالنے کے لیے زندہ نہیں رہا تھا اور یہ کام ابھی پایہء تکمیل کو پہنچنا تھا۔

تاریخ کا یادگار دن

اگر چہ چند ہی لوگ 3 جون 1993ء کو یاد رکھیں گے'یہ جنوبی افریقہ کی تاریخ میں ایک یادگار دن تھا۔ اس روز ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں کئی ماہ کے مذاکرات کے بعد ایک کثیر جماعتی فورم نے ملک کے پہلے قومی'غیر نسلی'ایک آدمی ایک ووٹ کے اصول پر مبنی انتخابات کی تاریخ طے کر دی۔ 27 اپریل 1994ء جنوبی افریقہ کی تاریخ میں پہلی

بار سیاہ فام اکثریت کو پانے رہنما چننے کے لیے ووٹ ڈالنے تھے۔ سمجھوتہ یہ ہوا تھا کہ ووٹر آئین ساز اسمبلی کے لیے چار سو نمائندے چنیں گے جو نیا آئین بھی بنائے گی اور پارلیمنٹ کا کام بھی دے گی۔ منتخب اسمبلی کے اجلاس میں اس کا پہلا کام ایک صدر کو منتخب کرنا ہوگا۔

مذاکرات دوبارہ اپریل میں منعقد ہوئے۔ اس بار انکا تھا‘پان افریقنسٹ کانگریس اور کنزرویٹو پارٹی سمیت چھبیس جماعتوں نے ان میں حصہ لیا تھا۔ ہم مہینوں سے حکومت پر زور دے رہے تھے کہ وہ انتخابات کی تاریخ مقرر کر دے مگر وہ ہچر مچر کر رہی تھی۔ لیکن اب تاریخ طے پائی گئی تھی۔

ایک ماہ بعد جولائی میں کثیر جماعتی فورم نے عبوری آئین کے پہلے مسودے پر اتفاق کیا۔ اس میں ایک دوایوانی پارلیمنٹ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ چار سو ارکان پر مشتمل قومی اسمبلی جو قومی اور علاقائی پارٹیوں کی فہرستوں سے متناسب نمائندگی کے ذریعے منتخب ہونی تھی اور ایک سینیٹ جس کا انتخاب علاقائی قانون ساز اسمبلیوں کے ذریعے بالواسطہ عمل میں آنا تھا۔

علاقائی اسمبلیوں کے انتخابات بھی قومی انتخابات کے ساتھ بیک وقت عمل میں آنے تھے اور علاقائی اسمبلیاں قومی آئین کی مطابقت میں اپنے اپنے آئین وضع کر سکتی تھیں۔

چیف بوتھیلزی چاہتے تھے کہ انتخابات سے پہلے ایک آئین وضع کر لیا جائے‘ چنانچہ انہوں نے آئین وضع ہونے سے پہلے انتخابات کی تاریخ طے کرنے کے خلاف بطور احتجاج واک آؤٹ کیا۔ اگست میں عبوری آئین کے دوسرے مسودے نے علاقائی اکائیوں کو زیادہ اختیارات دے دیئے لیکن اس سے چیف بوتھیلزی یا کنزرویٹو پارٹی رام نہ ہوئے۔ کنزرویٹو پارٹی نے قراردادوں کو افریکنر مفادات کے معاند قرار دیا۔ افریکنر فوکس فرنٹ نامی گروپ جس کی قیادت جنرل

کونسٹا ڈولجوئن کر رہا تھا جو ساؤتھ افریقن دفاعی فورس کا سابق سربراہ تھا' تشکیل دیا گیا تا کہ قدامت پسند سفید فام تنظیموں کو فوک سٹاٹ یعنی ''گورام ہوم لینڈ'' کے تصور کے گرد متحد کیا جائے۔

18 نومبر کی نصف شب کثیر جماعتی کانفرنس کے ابتدائی اجلاس میں عبوری دستور منظور کر لیا گیا۔ حکومت اور اے این سی نے دیگر رکاوٹیں دور کر لی تھیں۔ طے یہ پایا کہ نئی کابینہ 5 فیصد سے زیادہ ووٹ لینے والی جماعتوں کے ارکان پر مشتمل ہوگی اور وہ حکومت کی تجویز کردہ دوتہائی اکثریت کے بجائے اتفاق رائے سے فیصلے کرے گی۔ اگلے قومی انتخابات 1999ء تک منعقد ہوں گے' چنانچہ نیشنل یونٹ کی حکومت پانچ سال تک خدمات انجام دے گی۔ آخر کار حکومت نے انتخابات میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے الگ الگ بیلٹس کے بجائے ہمارا سنگل بیلٹ پیپر پر اصرار تسلیم کر لیا۔ دو بیلٹ پیپروں سے ووٹروں کی اکثریت پریشان ہی ہوتی جن میں اکثر اپنی زندگی میں پہلی بار ووٹ ڈال رہے تھے۔ انتخابات تک کے عرصے میں ہر جماعت کے ارکان پر مشتمل ایک عبوری ایگزیکٹو کونسل کو انتخابات کے لیے موزوں فضا کو یقینی بنانا تھا۔ ٹی ای سی (عبوری ایگزیکٹو کونسل) ہی کو 22 دسمبر سے 27 اپریل کو منعقد ہونے والے انتخابات تک ملک کی حکومت چلانی تھی۔ وسیع اختیارات کے حامل ایک آزاد انتخابی کمیشن کو انتخابات کے انتظام کے ذمے داری نبھانی تھی۔ ہم حقیقتاً ایک نئے عہد کی دہلیز پر کھڑے تھے۔

مجھے اور ڈی کلارک کو نوبل امن انعام

میں نے ذاتی اعزازات کی کبھی زیادہ پروا نہیں کی۔ انسان اعزاز جیتنے کی امید میں مجاہد آزادی نہیں بنتا۔ لیکن جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ مجھے مسٹر ڈی کلارک کے ساتھ نوبل امن انعام 1993ء دیا جا رہا ہے تو مجھ پر رقت طاری ہوگئی۔ نوبل امن انعام میرے لیے جنوبی افریقی تاریخ سے وابستگی کے باعث ایک خاص مفہوم رکھتا

تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے میں تیسرا جنوبی افریقی تھا جسے نوبل کمیٹی نے یہ اعزاز بخشا تھا۔ چیف البرٹ لوتھولی کو 1960ء میں یہ انعام دیا گیا تھا۔ دوسرے شخص آرچ بشپ ڈیسمنڈ ٹوٹو تھے جو نسلی امتیاز کے انتہائی خوفناک دنوں کے دوران نسل پرستی کی برائیوں کے خلاف لڑتے رہے تھے اور انہیں 1984ء میں امن انعام ملا تھا۔

امن انعام تمام جنوبی افریقیوں، خصوصاً ان کو خراج تحسین تھا جو آزادی کی جدو جہد میں لڑتے رہے۔ مجھے یہ انعام ان کی طرف سے قبول کرنا تھا۔ لیکن امن انعام کے بارے میں، میں نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ جزیرہ روبن پر زندگی کے تاریک ترین دنوں میں بھی ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اس بنیاد پر ہمارے حق میں مہم نہیں چلائی تھی کہ ہم نے مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کیا تھا اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کسی ایسے شخص کا مقدمہ پیش نہیں کرتی تھی جس نے تشدد کو اپنایا ہو۔ اسی وجہ سے میرا خیال یہ تھا کہ نوبل کمیٹی ایک ایسے شخص کو انعام دینے پر غور نہیں کرے گی جس نے امخونتو دی سزوی آغاز کیا تھا۔

ناروے اور سویڈن کی اقوام کے لیے میرے دل میں بڑا احترام تھا۔ 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں جب ہم اے این سی کے لیے امداد و حمایت حاصل کرنے مغربی حکومتوں کے پاس گئے تھے، تو ہمیں کورا جواب ملا تھا۔ لیکن ناروے اور سویڈن میں ہمارا گرمجوشی سے استقبال ہوا تھا اور ہمیں امداد، وظائف، قانونی دفاع کے لیے رقوم اور سیاسی قیدیوں کے لیے انسانی بنیادوں پر مدد فراہم کی گئی تھی۔

ناروے میں اپنی تقریر کے دوران میں نے نہ صرف نوبل کمیٹی کا شکریہ ادا کیا اور جنوبی افریقہ کے مستقبل کا ایک واضح خاکہ کھینچا جہاں عدل و انصاف کا دور دورہ ہوگا بلکہ اپنے ساتھی انعام جیتنے والے مسٹر ایف ڈبلیو ڈی کلارک کو خراج تحسین بھی پیش

کیا۔میرے الفاظ تھے:

''ان میں یہ اعتراف کرنے کا حوصلہ تھا کہ نسلی امتیاز کا نظام مسلط کرکے ہمارے ملک اور قوم کے ساتھ ایک خفناک زیادتی کی گئی ہے۔وہ یہ سمجھنے اور تسلیم کرنے کے لیے دور بینی سے بہرہ ور تھے کہ جنوبی افریقہ کے تمام عوام کو مذاکرات اور اس عمل میں مساوی شرکت کے ذریعے مل کر طے کرنا چاہیے کہ وہ اپنے مستقبل کو کیسا بنانا چاہتے ہیں۔''

ہمارا منشور ''سب کے لیے بہتر زندگی''

مجھ سے اکثر پوچھا گیا کہ میں مسٹر ڈی کلارک کے ساتھ اس انعام کو مشترکہ طور پر کیسے قبول کرسکتا ہوں جبکہ اس سے پہلے میں ان پر شدید تنقید کرتا رہا ہوں۔اگر چہ میں نے ان پر اپنی تنقید واپس نہیں لی تھی۔میں یہ کہہ سکتا تھا کہ انہوں نے امن مذاکرات میں حقیقی اور ناگزیر کردار ادا کیا ہے۔میں نے عملی وجوہ کی بنا پر مسٹر ڈی کلارک کو خفیف کرنے کی کبھی کوشش نہ کی کیونکہ اگر وہ کمزور ہوتے تو مذاکرات کا عمل بھی کمزور ہوتا۔دشمن کے ساتھ امن کی مفاہمت کے لیے آپ کو دشمن کے ساتھ کام کرنا ہوتا ہے اور وہ دشمن آپ کا شریک بن جاتا ہے۔

اگر چہ قومی اسمبلی کے لیے مہم سرکاری طور پر فروری 1994ء سے پہلے شروع نہیں ہوئی تھی مگر جب نئے آئین کی توثیق کردی گئی تو ہم نے انتخابی مہم کا پیشگی آغاز کر دیا۔اس سے ہمیں کوئی برتری حاصل نہیں ہوئی۔نیشنل پارٹی نے اپنی مہم اس روز سے ہی شروع کردی تھی جب مجھے جیل سے رہا کیا گیا تھا۔

اگر چہ انتخابات کے جائزوں میں اے این سی کو ٹھیک ٹھاک اکثریت ملنے کی نوید دی جارہی تھی،میں نے کبھی فتح کو نعمت غیر مترقبہ نہیں گردانا تھا۔میں نے بیش رجائیت (Over-optimism) کے خلاف ہر کسی سے مشاورت کی۔ہم نے سیاسی جماعتوں کے درجنوں اکاؤنٹس کے متعلق پڑھا تھا جو انتخابات جیتنے کیلئے

کھولے گئے تھے اگر چہ آخر میں وہ ہم سے پیچھے رہیں۔ ہمارا مقابلہ ایک تجربہ کار' خوب منظم اور خوب مال یافتہ حریف سے تھا۔

ہماری انتخابی مہم پوپو مولیفی' ٹیر ریلیکوٹا اور کیٹسو گوردہن کی مستعد قیادت میں چلائی گئی' یہ سب یوڈی ایف کے سرکردہ اور سرگرم لوگ تھے اور عوام کے متحرک کرنے کے ماہر تھے۔ کام بڑا صبر آزما تھا۔ ہمارا اندازہ تھا کہ بیس ملین سے زیادہ افراد ووٹ ڈالنے کے لیے نکلیں گے' ان میں سے اکثر پہلی بار ووٹ ڈال رہے تھے۔ ہمارے اکثر ووٹر ان پڑھ تھے اور ووٹ ڈالنے کے تصور ہی سے ان کے خوفزدہ ہو جانے کا امکان تھا۔ آزاد انتخابی کمیشن کے مطابق ملک بھر میں دس ہزار پولنگ اسٹیشن بنائے جانے تھے' چنانچہ ہم نے ووٹروں کی رہنمائی میں مدد دینے کے لیے ایک لاکھ سے زائد افراد کی تربیت کا اہتمام کیا۔

ہمارے عوامی فورم

ہماری انتخابی کوششوں کا پہلا مرحلہ عوامی فورم تھے۔ اے این سی امیدوار ملک بھر میں سفر کر کے قصبوں اور دیہات میں مجالس منعقد کرتے تاکہ عوام کے امیدوں اور خدشات' خیالات اور شکایات سے آگاہ ہو سکیں۔ عوامی فورم ان قصباتی مجالس کے مشابہ تھے جو بل کلنٹن نے امریکہ میں صدارتی مہم میں منعقد کی تھیں۔ یہ فورمز ایک طرح سے عوام کی پارلیمنٹیں تھیں' ''عظیم محل'' میں منعقدہ سرداروں کی ان مجلسوں جیسی جن کا میں نے لڑکپن میں مشاہدہ کیا تھا۔

میں نے جگہ جگہ پیپلز فورمز میں شرکت کی۔ میں نے نومبر میں نٹال سے اس کا آغاز کیا اور پھر علاقہ ''پی ڈبلیو وی'' شمالی ٹرانسوال اور اورنج فری سٹیٹ گیا۔ میں روزانہ تین چار فورمز میں شریک ہوتا تھا۔ خود لوگ بھی بڑی تعداد میں ذوق وشوق سے شرکت کرتے تھے۔ آج تک کبھی کوئی ان کی رائے لینے ان کے پاس نہیں آیا تھا کہ ان کے اپنے ملک میں کیا کچھ ہونا چاہیے۔

ان فورموں سے مشاورت کرنے کے بعد ہم نے عوام تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے ملک بھر میں دورے کیے۔ اے این سی کے کچھ لوگ اس مہم کو محض آزادی کے انتخاب کا رنگ دینا اور لوگوں کو بتانا چاہتے تھے کہ ہمیں ووٹ دیجیے کیونکہ ہم نے تمھیں آزاد کرایا ہے۔ اس کے بجائے ہم نے انھیں جنوبی افریقہ کا ایک ایسا تصور دیا جو ہم تخلیق کرنے کے آرزو مند تھے۔ ہم عوام سے صرف اس لیے اے این سی کو ووٹ دینے کی امید نہیں رکھتے تھے کہ ہم نے اسی برس تک نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد کی تھی بلکہ ہمارے مطالبے کی بنیاد یہ تھی کہ ہم اس قسم کے جنوبی افریقہ کو تخلیق کرنے کے لیے بہترین صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے جس میں رہنے کے عوام آرزو مند تھے۔ میں محسوس کرتا تھا کہ ہماری مہم مستقبل کے بارے میں ہونی چاہیے' ماضی کے بارے میں نہیں۔

اے این سی نے ڈیڑھ سو صفحات کی ایک دستاویز تیار کی جو ''تعمیر نو اور ترقی پروگرام'' کے نام سے معروف ہوئی' اس میں تعمیرات عامہ کے ذریعے ملازمتیں دینے کا منصوبہ پیش کیا گیا تھا۔ بجلی اور جدید طہارت خانوں سے آراستہ دس لاکھ نئے مکانات تعمیر کیے جائیں گے' بنیادی صحت کی سہولتوں کو وسعت دی جائے گی اور تمام جنوبی افریقیوں کو دس برس مفت تعلیم دی جائے گی۔ ''دعاوی زمین کی عدالت'' کے ذریعے زمینوں کی ازنو تقسیم کی جائے گی اور بنیادی اشیائے خوردنی پر ویلیو ایڈڈ ٹیکس ختم کر دیا جائے گا۔ ہم پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر دونوں میں وسیع پیمانے پر مثبت عملی اقدامات کرنے کے عہد کے بھی پابند تھے۔ اس دستاویز کو ایک سادہ تر منشور میں سمو دیا گیا جو ''سب کے لیے بہتر زندگی'' کہلایا اور وہی اے این سی کا انتخابی نعرہ قرار پایا۔

جب ہم نے لوگوں کو یہ بتا دیا کہ ہم کیا کریں گے تو میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ہم انھیں یہ بھی بتا دیں کہ ہم کیا نہیں کر سکتے۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ آزاد اور

جمہوری انتخابات کے بعد زندگی رات بھر میں تبدیل ہو جائے گی لیکن معاملہ اس سے کہیں مختلف تھا۔ میں اکثر مجمع سے کہتا: ''یہ توقع مت رکھیے کہ انتخابات کے اگلے روز ہی آپ مرسیڈیز چلا رہے ہوں گے یا اپنے پچھواڑے تالاب میں تیراکی کر رہے ہوں گے۔'' میں اپنے حامیوں کو بتاتا: ''زندگی ڈرامائی طور پر تبدیل نہیں ہو جائے گی' سوائے اس کے کہ آپ کی عزت نفس میں اضافہ ہوگا اور آپ اپنے ملک کے شہری بن جائیں گے۔ آپ کو صبر سے کام لینا ہوگا۔ ہوسکتا ہے نتائج ظاہر ہونے کے لیے آپ کو پانچ سال انتظار کرنا پڑے۔'' میں ان کے سامنے چیلنج پیش کرتا تھا' ان کی بے جا سر پرستی نہیں کرتا تھا۔ میں ان سے کہتا: ''اگر تم کپڑوں اور غذا کے بغیر غربت میں گزر بسر کرنا چاہتے ہو تو جاؤ' پیو پلاؤ۔ لیکن اگر تم اپنے حالات سے سدھارنا چاہتے ہو تو تمہیں محنت کرنی ہوگی۔ ہم تمہارے لیے یہ سب کچھ نہیں کر سکتے' تمہیں خود یہ کام کرنا ہوگا۔''

مین گورے سامعین سے کہتا کہ ہمیں ان کی ضرورت ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ وہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔ وہ ہماری ہی طرح جنوبی افریقی ہیں اور یہ ملک ان کا بھی ہے۔ میں نسلی امتیاز کی خوفناکیوں کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہتا تھا بلکہ میں یہ بار بار اپیل کرتا کہ ہمیں ماضی کو بھول کر سب کے لیے بہتر مستقبل کی تعمیر پر اپنی توجہ مرکوز کر دینی چاہیے۔

ان ریلیوں کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ لوگوں کو سکھایا جائے کہ انہیں ووٹ کس طرح ڈالنا ہے۔ بیلٹ پیپر ایک لمبا کاغذ کا تنگ پرزہ تھا جس کے بائیں طرف جماعتوں کے نام ترتیب سے درج تھے اور دائیں طرف جماعت کی علامت اور اس کے رہنما کی تصویر تھی۔ ووٹروں کو اپنی پسند کی جماعت کے ساتھ والے خانے میں چلیپا کا نشان لگانا تھا۔ میں سامعین کو بتاتا: ''انتخابات کے دن اپنے بیلٹ پیپر کو دیکھو اور جب تم ایک نوجوان اور وجیہہ شخص کا شہرہ دیکھو تو چلیپا کا نشان ثبت کر دو۔''

میں نے بوتھیلیزی کو رام کر لیا

آزادی کی شاہراہ اس قدر ہموار نہیں تھی۔ اگرچہ نئے سال میں عبوری ایگزیکٹو کونسل کام کرنے لگی تھی' کچھ جماعتیں اس سے باہر رہی تھیں۔ انکا تھا نے انتخابات میں حصہ لینے سے انکار کر دیا اور مزاحمت کی سیاست کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاہ زویلی تھینی نے چیف بوتھیلیزی کی حمایت سے ایک خودمختار اور آزاد کوازولو کا مطالبہ داغ دیا اور اپنے صوبے میں ہر کس کو ووٹ ڈالنے سے منع کیا۔ دائیں بازو کے گوروں نے انتخابات کو غداری قرار دیا اور ایک فوک سٹاٹ (عوامی ریاست) کا نعرہ لگایا اگرچہ ابھی انہوں نے تجویز نہیں کیا تھا کہ یہ ''ریاست'' کہاں واقع ہو گی اور کیسے کام کرے گی۔ پورے جنوبی افریقہ میں کوئی ایک انتظامی ضلع بھی ایسا نہ تھا جہاں باشندوں کی اکثریت سفید فام ہو۔

12 فروری 1994ء تمام جماعتوں کی رجسٹریشن کی آخری تاریخ تھی اور اس روز تک انکا تھا' قدامت پسند پارٹی اور افریکنر فوکس فرنٹ رجسٹریشن کرانے میں ناکام رہیں۔ بوپھوتھسواتا ہوم لینڈ کی حکومت نے بھی سیاسی عمل میں شرکت سے انکار کر دیا اور متحدہ جنوبی افریقہ میں اس کے ادغام کی مزاحمت کی۔ میں پریشان ہو گیا کہ یہ اہم گروپ انتخابی عمل میں حصہ نہ لینے کی راہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ انہیں انتخابی عمل میں لانے کے لیے ہم نے بعض اہم سمجھوتوں کی تجویز پیش کی۔ ہم صوبائی اور قومی قانون ساز اسمبلیوں کے لیے ڈبل بیلٹ کے استعمال' زیادہ صوبائی اختیارات کی ضمانتیں دینے' صوبہ نٹال کا نام کوازولو نٹال رکھنے اور یہ ضمانت دینے پر آمادہ ہو گئے کہ ان گروہوں کے لیے داخلی خودمختاری کا اصول آئین میں شامل کر لیا جائے گا جو مشترکہ ثقافتی اور لسانی ورثہ رکھتے ہوں۔

میں نے یکم مارچ کو چیف بوتھیلیزی سے نٹال میں ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس ملاقات سے پہلے میں نے ایک ریلی مین کہا: ''میں ان لوگوں کی منت سماجت کرنے گھنٹوں

کے بل چل کر جاؤں گا جو ہمارے ملک کو خونریزی کی دلدل میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔'' چیف بوتھیلیزی اس وعدے کے عوض عبوری طور پر رجسٹریشن کرانے پر آمادہ ہو گئے کہ آئینی معاملات پر ہمارے اختلافات بین الاقوامی ثالثی کے ذریعے طے کیے جائیں گے۔ میں نے بخوشی اس سے اتفاق کیا۔ رجسٹریشن کی آخری تاریخ سے پہلے جنرل ولجون نے بھی ایک نئی جماعت کی فریڈم فرنٹ کے نام سے رجسٹریشن کرالی۔

انکاتھا کی دہشت گردی

اگر لوکاس مانگوپے صدر بوپھوتھسوانا نے اپنے ہوم لینڈ کو انتخابات سے باہر رکھنے کا فیصلہ کیا تھا واقعات کی لہر نے جلد ہی صورتحال بدل ڈالی۔ میں نے کئی مواقع پر ان سے گفت وشنید کی اور ان پر زور دیا کہ وہ اپنے عوام کو انتخابات میں شرکت کرنے دیں مگر انہوں نے اس پر کان نہ دھرے۔ جو لوگ انتخابی عمل میں حصہ لینا چاہتے تھے انہوں نے عوامی مظاہرے اور ہڑتالیں کیں جو جلد ہی بوپھوتھسوانا کی سول سروس تک پھیل گئیں۔ ریڈیو اور ٹی وی کے عملے نے ہڑتال کر دی۔ مافیکنگ کی گلیوں میں ہوم لینڈ پولیس اور ہڑتالی کارکنوں اور طلبہ کے مابین جھڑپیں ہوئیں۔ مانگوپے نے اپنے گورے دائیں بازو کے اتحادیوں سے فوجی امداد طلب کر لی۔ جلد ہی اس کے اپنے حامی اس کا ساتھ چھوڑ گئے اور اوائل مارچ میں ایک انقلاب نے اس کا تختہ الٹ دیا۔ چند ہفتے بعد سسکائی میں بریگیڈیئر گقوزو نے ہار مان لی اور حکومت جنوبی افریقہ سے کہا کہ وہ ہوم لینڈ کا کنٹرول سنبھال لے۔

نٹال میں پرتشدد صورتحال اور بگڑ گئی۔ انکاتھا کے حامی نٹال میں ہماری انتخابی مہم چلانے کی کوششوں میں رکاوٹیں ڈال رہے تھے۔ اے این سی کے پوسٹر اکھاڑنے کے بعد انہوں نے پندرہ اے این سی کارکنوں کو گولی مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مارچ میں جج موہان کرایگلر نے مجھے اور ڈی کلارک کو اطلاع دی کہ کوازولو حکومت

کے عدم تعاون کے باعث وہاں براہ راست سیاسی مداخلت کے بغیر انتخابات منعقد نہیں ہو سکتے۔ نٹال میں اپنی قوت کے اظہار کے لیے اے این سی نے ڈربن کی سڑکوں پر ایک عوامی مارچ کا اہتمام کیا۔تب انکاتھا نے جوہانس برگ میں ایسا ہی کرنے کی کوشش کی جس کے خوفناک نتائج برآمد ہوئے۔

288 مارش کو انکاتھا کے ہزاروں ارکان بھالے اور بلم لہراتے ہوئے جوہانس برگ میں درآئے اور انہوں نے شہر کے وسط میں ایک ریلی منعقد کی۔عین اس وقت انکاتھا کہ ایک مسلح گروہ نے اے این سی کے صدر دفتر شیل ہاؤس میں گھسنے کی کوشش کی مگر مسلح محافظوں نے انہیں پیچھے دھکیل دیا۔شہر کے وسط میں انجانے بندوقچیوں نے فائرنگ بھی کی جس سے کل ترپین افراد ہلاک ہو گئے۔یہ خوفناک منظر تھا جس سے یوں لگتا تھا کہ جنوبی افریقہ اندرونی خانہ جنگی کے دہانے پر ہے۔انکاتھا انتخابات کو ملتوی کرانے کی کوشش کر رہی تھی مگر مسٹر ڈی کلارک نے ہار مانی نہ میں نے۔

میں بین الاقوامی ثالثی تسلیم کر چکا تھا' چنانچہ 13-اپریل کو سابق برطانوی وزیر خارجہ لارڈ کیرنگٹن اور سابق امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر کی قیادت میں ایک وفد آپہنچا۔لیکن جب انکاتھا کو معلوم ہوا کہ انتخابات کی تاریخ ثالثی سے مشروط نہیں تو انہوں نے ثالثوں سے ملنے سے انکار کر دیا' چنانچہ دونوں ثالث کسی سے بات چیت کیے بغیر ہی لوٹ گئے۔اب چیف بوتھیلزی جان گئے تھے کہ چاہے کچھ بھی ہو انتخابات منعقد ہوں گے۔

یادگار ٹی وی مباحثہ

انتخابات سے دس دن پہلے مسٹر ڈی کلارک اور میں نے ایک ٹی وی مباحثے میں حصہ لیا۔ میں فورٹ ہیر میں ایک اچھا مباحث رہا تھا اور پارٹی میں اپنے اولین دنوں میں اس کے پلیٹ فارم سے میں کئی جذبات آفریں مباحثوں میں شامل رہ شکا

تھا۔ جزیرہ روبن میں ہم نے اپنی مباحثاتی صلاحیتوں کو صیقل کیا تھا جب ہم چونے کی چٹان سے پتھر توڑتے تھے۔ مجھے خود پر اعتماد تھا' تاہم ایک دن پہلے ہم نے ایک فرضی مباحثہ رچایا جس میں صحافی ایلسٹر سپارکس نے مسٹر ڈی کلارک کا کردار خوب ادا کیا۔ بہت خوب کیونکہ میری مہم کے مشیروں کا کہنا تھا کہ میں بہت آہستہ بول رہا تھا اور میرا لہجہ کافی جارحانہ نہیں تھا۔

تاہم جب حقیقی مباحثے کا وقت آیا میں نے نیشنل پارٹی پر شدید تنقید کی۔ میں نے نیشنل پارٹی کو موردِ الزام ٹھہرایا کہ وہ کیپ میں ایک اشتعال انگیز کتاب تقسیم کر کے رنگ داروں اور افریقیوں کے مابین نفرت کو ہوا دے رہی ہے جس میں لکھا تھا کہ اے این سی کا نعرہ ہے: ''ایک رنگ دار کو مار ڈالو' ایک کسان کو مار ڈالو۔'' میں نے مباحثے میں برملا کہا: ''اس ملک میں کوئی جماعت اس قدر نفرتیں بانٹنے والی نہیں جتنی کہ نیو نیشنل پارٹی۔'' جب مسٹر ڈی کلارک نے اے این سی کے منصوبے پر تنقید کی کہ وہ ہاؤسنگ اور سماجی پروگراموں پر اربوں ڈالر خرچ کرے گی تو میں نے یہ کہہ کر انہیں آڑے ہاتھوں لیا یہ انہیں کھٹکا ہے کہ ہم اتنے سارے وسائل سیاہ فاموں کے لیے وقف کر دیں گے۔

لیکن جب مباحثہ ختم ہو رہا تھا' مجھے احساس ہوا کہ میں نے اس شخص کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا ہے جو نیشنل یونٹی کی حکومت میں میرا شریک کار ہو گا' چنانچہ نرمی لانے کے لیے میں نے آخر میں کہا: ''میرے اور مسٹر دی کلارک کے مابین جو چونچیں لڑیں ان سے ایک اہم حقیقت نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم پوری دنیا کے لیے مختلف نسلی گروہوں سے تعلق رکھنے والے عوام کی ایک روشن مثال ہیں جو ایک مشترکہ وفاداری اور ایک مشترکہ محبت اپنے مشترکہ ملک سے رکھتے ہیں۔ مسٹر ڈی کلارک پر تنقید کے باوجود' یہ کہہ کر میں نے ان کی طرف دیکھا'' جناب! آپ ان اشخاص میں سے ایک ہیں جن پر میں اعتبار کرتا ہوں' ہم

اس ملک کے مسئلے سے اکٹھے دوچار ہورہے ہیں۔'' اس مرحلے پر میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا: ''میں آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ ہم اکٹھے پیشرفت کریں۔'' مسٹر ڈی کلارک متحیر مگر مسرور نظر آرہے تھے۔

میں نے پہلی بار ووٹ ڈالا

میں نے ووٹنگ کے لیے مخصوص چار دنوں کے دوسرے روز 27 اپریل کو اپنا ووٹ ڈالا۔ (بوڑھوں' معذوروں اور بیرون ملک مقیم جنوبی افریقیوں سمیت بعض طبقوں کو 26 اپریل کو ووٹ ڈالنے کی اجازت دی گئی تھی۔) میں نے اپنا ووٹ نٹال میں ڈالنا پسند کیا کیونکہ میں اس منقسم صوبے کے لوگوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ پولنگ اسٹیشنوں پر جانے میں کسی قسم کا کوئی خدشہ نہیں۔ میں نے اپنا نڈا میں اوہلانگ ہائی سکول میں ووٹ ڈالا' جو ڈربن کے عین شمال میں ایک سرسبز پہاڑی قصبہ ہے' کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں اے این سی کے پہلے صدر جان دوبے دفن ہیں۔ اس محب وطن جنوبی افریقی نے 1912ء میں تنظیم کی بنیاد رکھی تھی اور اس کی قبر کے نزدیک ووٹ ڈالنے سے تاریخ نے ایک پوری کروٹ لی تھی کیونکہ اس نے 82 سال پہلے جو مقصد پیش نظر رکھا تھا وہ اب پورا ہونے والا تھا۔

جب میں اس کی قبر پر کھڑا تھا' میں بلندی پر تھا اور چھوٹا سا سکول نیچے تھا' میں حال کے متعلق نہیں بلکہ ماضی کے بارے مین سوچنے لگا۔ جب میں پولنگ اسٹیشن کی طرف چلا' میرا ذہن ان ہیروؤں کی طرف متوجہ ہو گیا جنھوں نے اپنی جانیں دی تھیں تاکہ میں اس مقام کو پاسکوں جس پر میں آج کھڑا تھا' مرد اور عورتیں جنھوں نے ایک مقصد کے لیے حتمی قربانی دی تھی جو بالآخر پایہء تکمیل کو پہنچنے والا تھا۔ میں نے آلیور ٹیمبو' کرس ہانی' چیف لوتھولی اور برام فشر کے بارے میں سوچا۔ میں نے اپنے عظیم افریقی ہیروؤں کے بارے میں سوچا جنھوں نے عظیم قربانیاں دی تھیں

تا کہ لاکھوں، کروڑوں جنوبی افریقی آج اس روز ووٹ ڈال سکیں۔ میں نے جوسیاہ گومیڈی، جی ایم نائکر، ڈاکٹر عبداللہ عبدالرحمٰن، لیلیان انگوئی، ہیلن جوزف، یوسف دادو اور موسز کوٹانی کے بارے میں سوچا۔ میں 27 اپریل کو اس پولنگ اسٹیشن پر تنہا نہیں گیا۔ میں اپنا ووٹ ان سب لوگوں کی معیت میں ڈال رہا تھا۔

میرے پولنگ اسٹیشن میں داخل ہونے سے پہلے ایک منہ پھٹ اخباری نمائندہ بول اٹھا: ''مسٹر منڈیلا! آپ کس کو ووٹ دے رہے ہیں؟'' میں ہنس دیا اور کہا: ''تم جانتے ہو میں صبح سے اس چناؤ کے انتظار کی شدت سے گزر رہا ہوں۔'' میں نے اے این سی کے ساتھ دیئے ہوئے خانے میں چلیپا کا نشان لگایا اور بیلٹ پیپر کو تہہ کر کے ایک سادہ چوبی صندوق میں ڈال دیا۔ میں نے یہ اپنی زندگی کا پہلا ووٹ ڈالا تھا۔

اس روز ووٹ ڈالنے کے لیے جانے والے جنوبی افریقیوں کے چہرے میری یادوں میں دمک رہے ہیں۔ صابر لوگوں کی بڑی بڑی قطاریں قصبوں اور شہروں کی غلاظت آلود سڑکوں اور گلیوں میں رواں دواں تھیں۔ بوڑھی عورتیں جنہوں نے اپنے ووٹ ڈالنے کے لیے نصف صدی تک انتظار کیا تھا، کہہ رہی تھیں کہ انہیں اپنی زندگی میں پہلی بار اپنے انسان ہونے کا احساس ہوا ہے۔ سفید فام عورتیں اور مرد کہہ رہے تھے کہ آخر کار وہ ایک آزاد ملک میں رہنے پر فخر محسوس کرنے لگے ہیں۔ ووٹنگ کے ان دنوں میں قوم کا موڈ پر جوش تھا۔ تشدد اور بم دھماکے رک گئے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے ہم ایک نوازندہ قوم ہوں۔ ووٹنگ کے لیے آمدورفت کی مشکلات، غلط جگہ پہنچنے والے بیلٹ پیپر، ووٹنگ اسٹیشنوں سے بیلٹ بکس اٹھا لے جانا اور بعض مقامات پر فراڈ کی افواہیں جمہوریت اور انصاف کے حق میں بھاری اکثریت سے فتح کو گہنا نہ سکیں۔

اے این سی کی جیت

نتائج کی گنتی میں کئی دن لگے۔ ہمیں قومی ووٹوں کے 62ء6 فیصد ووٹ حاصل ہوئے یعنی دوتہائی اکثریت سے کچھ ہی کم، جو ہمیں اس صورت میں درکار تھی اگر ہم دوسری جماعتوں کی حمایت کے بغیر ہی حتمی آئین تشکیل دینا چاہتے۔ اس تناسب ہم نے قومی اسمبلی کی 400 نشستوں میں سے 252 جیت لیں۔ اے این سی کو شمالی اور مشرقی ٹرانسوال، شمال مغرب، مشرقی کیپ اور فری اسٹیٹ میں واضح اکثریت حاصل ہوئی۔ ہم نے مغربی کیپ میں 33 فیصد ووٹ حاصل کیے جہاں نیشنل پارٹی جیتی تھی جس نے رنگ دار ووٹروں میں خاصی اچھی کارکردگی دکھائی تھی۔ ہم کو ازولو/نٹال میں 32 فیصد ووٹ حاصل کر پائے، یہاں انکاتھا جیتی تھی۔ نٹال میں تشدد اور خوف کی فضا نے ہمارے بہت سے ووٹروں کو پولنگ اسٹیشنوں سے دور رکھا تھا۔ پھر ووٹوں میں فراڈ اور دھاندلی کے الزامات بھی تھے۔ لیکن آخرکار ان باتوں کی کوئی اہمیت نہ رہی۔ ہم نے کوزاولو میں انکاتھا کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا تھا اور انہوں نے الیکشن کے دن یہ بات ثابت کردی تھی۔

اے این سی میں بعض لوگ مایوس تھے کہ ہم نے دوتہائی سے زیادہ ووٹ نہیں لیے مگر میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا۔ درحقیقت مجھے یہ نتائج اچھے لگ رہے تھے۔ اگر ہم دوتہائی اکثریت سے جیت جاتے اور ایک ایسا آئین وضع کرنے میں کامیاب رہتے جس میں دوسروں کی کاوشیں شامل نہ ہوتیں تو لوگ یہ کہتے کہ ہم نے اے این سی کا آئین تشکیل دیا ہے، جنوبی افریقہ کا آئین نہیں۔ میں نیشنل یونٹی کی ایک حقیقی حکومت چاہتا تھا۔

گوروں نے شکست تسلیم کرلی

2 مئی کی شام مسٹر ڈی کلارک نے ایک فراخدلانہ اور صلح کل تقریر کی۔ تین صدیوں سے زیادہ حکمرانی کرنے کے بعد گوری اقلیت اپنی شکست تسلیم کررہی تھی اور اقتدار کالی اکثریت کے سپرد کررہی تھی۔ اس شام اے این سی جوہانس برگ کے

مرکز میں چارلٹن ہوٹل کے بال روم میں ایک فاتحانہ جشن منعقد کر رہی تھی۔ میں شدید فلو میں مبتلا تھا اور میرے ڈاکٹروں نے مجھے حکم دیا کہ میں گھر پر رہوں مگر مجھے کوئی چیز پارٹی سے پرے نہیں رکھ سکتی تھی۔ تقریباً نو بجے میں اسٹیج پر جا پہنچا اور میرے سامنے خوش و خرم اور مسکراتے چہروں کا ہجوم نعرے لگا رہا تھا۔

میں نے ہجوم پر واضح کیا کہ زکام کے باعث میرا گلا خراب ہے اور یہ کہ میرے معالج نے مجھے اس تقریب میں شرکت نہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ میں نے کہا: ''مجھے امید ہے کہ آپ اس پر یہ انکشاف نہیں کریں گے کہ میں نے اس کی ہدایت کی خلاف ورزی کی ہے۔'' میں نے مسٹر ڈی کلارک کی ثابت قدمی پر انہیں مبارکباد دی۔ میں نے اے این سی اور جمہوری تحریک میں شامل سب لوگوں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے اتنے طویل عرصے تک اس قدر محنت کی تھی۔ عظیم مجاہد آزادی مارٹن لوتھر کنگ کی اہلیہ مسز کوریٹا سکاٹ کنگ بھی اس رات اسٹیج پر موجود تھیں اور میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے ان کے شوہر کے لافانی الفاظ دہرائے۔ پھر میں نے کہا:

''یہ ہمارے ملک کی تاریخ کے اہم ترین لمحات ہیں۔ میں آپ کے سامنے یہاں گہرے فخر و مسرت سے بھرپور کھڑا ہوں۔ مجھے اس ملک کے عام پر عجز لوگوں پر فخر ہے۔ آپ نے اپنے ملک کو واپس لینے میں اس قدر صبر و سکون اور عزم و ہمت کا مظاہرہ کیا ہے اور ہم خوش ہیں کہ اب ہم چھتوں سے بلند آہنگ نعرہ بلند کر سکتے ہیں۔ آخر کار ہم آزاد ہیں! آخر کار ہم آزاد ہیں! میں آپ کے عزم و ہمت کے سامنے عجز انہ کھڑا ہوں اور میرا دل آپ سب کے لیے محبت کے جذبے سے معمور ہے۔ اہمیت افراد کی نہیں' اجتماع کی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ پرانے زخموں پر مرہم رکھیں اور ایک نیا جنوبی افریقہ تعمیر کریں۔''

جب سے نتائج آنے شروع ہوئے تھے اور یہ واضح ہو گیا تھا کہ اے این سی

حکومت بنائے گی'میں نے مفاہمت کے پرچار'ملک کے زخم مندمل کرنے اراعتبار واعتماد پیدا کرنے کو اپنا فریضہ ٹھہرا لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ بہت سے لوگ خصوصاً اقلیتیں'سفید فام'رنگ دار اور ہندوستانی مستقبل کے بارے میں تشویش محسوس کررہے ہوں گے اور میں انہیں تحفظ کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ میں نے بار بار لوگوں کو یاد دلایا کہ جنگ آزادی کسی ایک گروپ یا رنگ کے خلاف جنگ نہیں تھی بلکہ وہ ظلم کے نظام کے خلاف جنگ تھی۔ میں نے کہا کہ اب ہر مرحلے میں جنوبی افریقیوں کو متحد ہوکر باہم تعاون کرنا چاہیے اور یہ کہنا چاہیے کہ ہم ایک ملک'ایک قوم اور ایک عوام ہیں اور مل کر مستقبل میں داخل ہورہے ہیں۔

میں نے صدارت کا حلف اٹھایا

10 مئی کی صبح روشن اور صاف تھی۔ پچھلے چند روز سے معززین اور عالمی رہنماؤں نے میرا خوشگوار محاصرہ کررکھا تھا جو انتقال اقتدار سے پہلے خراج تحسین پیش کرنے آرہے تھے۔ افتتاحی تقریب میں جنوبی افریقہ کی سرزمین پر عالمی رہنماؤں کا سب سے بڑا اجتماع ہونے والا تھا۔

تقریب پریٹوریا میں یونین بلڈنگز کے ساتھ بنے ایمفی تھیٹر کی سینڈسٹون کی خوبصورت عمارت میں منعقد ہوئی۔ عشروں تک یہ عمارت سفید فاموں کے اقتدار کی علامت بنی رہی تھی اور اب یہ جنوبی افریقہ کی پہلی جمہوری'غیر نسلی حکومت کے قیام کے لیے مختلف رنگوں اور قوموں کے دھنک جیسے اجتماع کا مرکز تھی۔

خزاں کے اس پیارے دن میری بیٹی زینانی میرے ہمراہ تھی۔ اسٹیج پر سب سے پہلے مسٹر ڈی کلارک نے نائب صدر دوم کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ پھر تھیبو امبیکی سے نائب صدر اول کی حیثیت سے حلف لیا گیا۔ جب میری باری آئی تو میں نے عہد کیا کہ میں آئین کی اطاعت کرتے ہوئے اسے سربلند رکھوں گا اور جمہوریہ اور اس کے عوام کی بہبود کے لیے دن رات کوشاں رہوں گا۔ میں نے کہا:

زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ہم قانون کے بھگوڑے تھے اور آج ہمیں یہ نادر استحقاق ملا ہے کہ ہم اپنی سرزمین پر دنیا کی قوموں کی میزبانی کر رہے ہیں۔ ہم اپنے تمام ممتاز بین الاقوامی مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ وہ یہاں آ کر ہمارے ملک کے لوگوں کے ساتھ اس میں حصہ دار بن رہے ہیں جو بہر طور ایک مشترکہ فتح ہے' انصاف کے لیے' امن کے لیے اور انسانی شرف کے لیے۔

ہم نے آخر کار اپنی سیاسی نجات حاصل کر لی ہے۔ ہم اپنے آپ سے عہد کرتے ہیں کہ اپنے سارے عوام کو غربت' محرومی' ابتلا' جنس اور دوسرے امتیازات کی جاری جکڑ بندیوں سے آزاد کرائیں گے۔

آئندہ کبھی نہیں' کبھی نہیں اور کبھی نہیں یہ ہوگا کہ یہ خوبصورت سرزمین دوبارہ کسی دوسری طرح ظلم وستم سے دوچار ہو جائے۔ اس قدر شاندار کامیابی پر سورج کبھی غروب نہیں ہوگا۔

خدا کرے آزادی حکمرانی کرے۔ اللہ تعالیٰ افریقہ کو نعمتوں سے نوازے!''

طیاروں کا آزادی کو سلام

چند منٹ بعد ہم سب نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں تو وہ پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جبکہ جنوبی افریقی جیٹ طیارے' ہیلی کاپٹر اور ٹروپ کیریئرز یونین بلڈنگز کے اوپر ایک مکمل فارمیشن بناتے اور گونجتے گرجتے ہوئے ایک مسحور کن منظر پیش کرتے چلے گئے۔ یہ ٹھیک ٹھیک نشانہ بازی اور فوجی قوت کا ٹھیک ٹھیک اظہار ہی نہیں تھا بلکہ جمہوریت اور ایک نئی حکومت سے اظہار وفاداری بھی تھا جو آزادانہ اور منصفانہ انتخابات میں برسر اقتدار آئی تھی۔ چند لمحے پہلے جنوبی افریقہ کی دفاعی افواج اور پولیس کے جرنیلوں اور اعلیٰ افسروں نے جن کے سینے گزرے دنوں کے تمغوں اور فیتوں سے سجے تھے' مجھے سلامی دی اور اپنی وفاداری کا اظہار کیا۔ یہ حقیقت نظر انداز کی جانے والی نہیں تھی کہ چند سال پہلے وہ مجھے سلامی نہ دیتے بلکہ گرفتار کر لیتے۔ آخر

میں امپلا جیٹ طیاروں نے سیاہ سرخ' سبز' نیلے اور سنہری رنگوں کی نئے جنوبی افریقہ کی جھنڈیوں کے پھریرے فضا میں بکھیر دیئے۔

میرے لیے یہ دن ایک علامت بن گیا کہ ہمارے دو قومی ترانے بجائے گئے اور منظر یہ تھا کہ سفید فام ''انکوسی سکیلیلے آیا فریقہ'' گا رہے تھے اور سیاہ فام ''ڈائی سٹیم'' گا رہے تھے جو جمہوریہ کا پرانا ترانہ تھا۔ اگرچہ اس روز ان میں سے کوئی گروہ بھی مخالفانہ ترانے کے مصرعوں کا مفہوم نہیں سمجھتا تھا جن سے کبھی انہیں نفرت تھی مگر اس وقت وہ والہانہ طور پر گا رہے تھے اور جلدی ہی وہ انہیں اپنے دلوں میں سمو لیں گے۔

نسلی امتیاز کے زخم مندمل ہوں گے

افتتاحی تقریب کے روز میں تاریخ کے احساس سے سرشار تھا۔ بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں ناخوشگوار بوئر وار کے چند سال بعد اور میری پیدائش سے بھی پہلے جنوبی افریقہ کے گورے لوگوں نے اپنے اختلافات بھلا دیئے تھے اور اسی ملک کے سیاہ فام لوگوں کے خلاف نسلی غلبے کا ایک نظام کھڑا کر لیا تھا۔ ان لوگوں نے جو نظام قائم کیا وہ دنیا کے ایک انتہائی سخت اور انتہائی غیر انسانی معاشرے کو جنم دینے کا باعث بنا۔ اب بیسویں صدی کی آخری دہائی اور بحیثیت انسان میری آٹھویں دہائی میں اس نظام کا ہمیشہ کے لیے بوریا بستر گول ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایک ایسے نظام نے لے لی جو لوگوں کی کھال کے رنگ سے قطع نظر سب کے حقوق اور آزادیوں کو تسلیم کرتا ہے۔

یہ دن میرے ہزاروں عوام کے ناقابل تصور قربانیوں کے نتیجے میں عمل میں آیا تھا' وہ لوگ جن کے ابتلا اور جراتوں کا شمار کیا جا سکتا ہے نہ ان کا معاوضہ دیا جا سکتا ہے۔ اس روز میں نے محسوس کیا جیسا کہ کئی اور دنوں میں محسوس کیا ہے کہ میں ان سب محب وطن جنوبی افریقیوں کا نچوڑ ہوں جو مجھ سے پہلے گزر گئے ہیں۔ وہ طویل اور محترم سلسلہ اختتام کو پہنچا اور مجھ سے دوبارہ شروع ہوا ہے۔ مجھ دکھ یہ تھا کہ میں اپنے

پیش روؤں کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا تھا اور وہ یہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ ان کی قربانیاں کیا رنگ لائی ہیں۔

نسلی امتیاز کی پالیسی نے میرے ملک اور میرے عوام کو گہرے اور انمٹ زخم دیئے تھے۔ اگر کئی نسلیں نہیں تو ہم سب کئی سال تو ضرور گزاریں گے تب کہیں ہمارے گہرے زخم مندمل ہوسکیں گے۔ لیکن ظلم اور وحشت کی دہائیوں کا ایک اور غیر مطلوبہ نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اس نے ہمارے دور کے بہت سے آلیور ٹیمبو' والٹر میسولو' چیف لوتھولی' یوسف داوو' برام فشر' ربراٹ سوبکوی پیدا کیے تھے۔ جو ایسے غیر معمولی حوصلے' فراست اور کشادہ دلی کے مالک تھے کہ ان جیسے ہوسکتا ہے دوبارہ دیکھنے میں نہ آئیں۔ شاید ایسے اونچے کردار کے لوگ پیدا کرنے کے لیے ظلم کی ایسی ہی گھٹاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرا ملک معدنیات اور ہیرے جواہرات سے مالا مال ہے جو اس کی مٹی تلے پوشیدہ ہیں لیکن ہمیشہ سے میرا عقیدہ رہا ہے کہ اس کی سب سے بڑی دولت اس کے عوام ہیں جو خالص ترین ہیروں سے بھی زیادہ سچے اور زیادہ خالص ہیں۔

جدوجہد میں شامل ان ساتھیوں ہی سے میں نے جرات کے معنی سیکھے ہیں۔ بار بار میں نے مرد اور عورتیں دیکھے ہیں جو ایک نظریہ کی خاطر اپنی جانیں خطرے میں ڈالتے اور نثار کر دیتے ہیں۔ میں نے انسانوں کو ابتلا و اذیت کا مقابلہ ٹوٹے بغیر کرتے اور ایسی قوت اور ثابت قدمی دکھاتے دیکھا ہے جو انسانی تصور سے بالا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ جرات خوف سے چھٹکارا پانا نہیں بلکہ اس پر غلبہ پانا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ خود میں نے کتنی بار خوف محسوس کیا تھا لیکن ہر بار میں نے اسے دلیری کے نقاب کے نیچے چھپالیا تھا۔ بہادر آدمی وہ نہیں جو خوف محسوس نہیں کرتا بلکہ بہادر وہ ہے جو اس پر فتح پالے۔

محبت کی فتح

میں نے کبھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا کہ یہ تبدیلی عمل میں آئے گی۔ صرف عظیم ہیروؤں کی وجہ سے نہیں جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے بلکہ میرے ملک کے عام مردوں اور عورتوں کے حوصلے کی وجہ سے۔ میں ہمیشہ جانتا تھا کہ ہر انسانی دل کی گہرائی میں رحم اور کشادہ دلی پنہاں ہوتی ہے۔ کوئی بھی دوسرے شخص کی کھال کے رنگ یا اس کے پس منظر یا اس کے مذہب کی وجہ سے اس سے نفرت کرتا پیدا نہیں ہوتا۔ لوگ نفرت کرنا سیکھتے ہیں اور اگر وہ نفرت کرنا سیکھتے ہیں تو انہیں محبت کرنا بھی سکھا سکتے ہیں کیونکہ محبت نفرت کے مقابلے میں زیادہ فطری طور پر آتی ہے۔ جیل کے مشکل ترین اوقات میں بھی جب مجھے اور میرے ساتھیوں کو تنہائیوں میں ڈالا گیا تھا میں ایک گارڈ میں شاید ایک سیکنڈ ہی کے لیے ہی انسانیت کی رمق دیکھ پاتا تھا لیکن وہ مجھے یقین دلانے اور زندگی کے معمولات جاری رکھنے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ انسان کی نیکی ایک شعلہ ہے جسے چھپایا جا سکتا ہے مگر بجھایا نہیں جا سکتا۔

ہم نے کھلی آنکھوں کے ساتھ جدوجہد کا راستہ اختیار کیا تھا اور ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں تھی کہ راستہ آسان ہوگا۔ ایک نوجوان کی حیثیت سے جب میں نے افریقن نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کی تھی، میں نے اپنے ساتھیوں کو اپنے نظریات کی قیمت ادا کرتے دیکھا تھا اور وہ بہت زیادہ تھی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے جہد آزادی سے اپنی وابستگی پر کبھی افسوس ظاہر نہیں کیا اور میں ہمیشہ سختیوں کا سامنا کرنے کو تیار رہا جنہوں نے ذاتی طور پر مجھے متاثر کیا۔ لیکن میرے خاندان کو میری اس وابستگی کی خوفناک قیمت ادا کرنی پڑی، یہ قیمت بہت گراں تھی۔

زندگی میں ہر انسان کے جڑواں فرائض ہوتے ہیں۔ اپنے خاندان، اپنے والدین، اپنی بیوی اور بچوں کی طرف سے اور اس پر اس کے عوام، اس کے معاشرے اور اس کے ملک کی طرف سے بھی فرض عائد ہوتا ہے۔ ایک مہذب اور ہمدرد

معاشرے میں ہر شخص اپنے رجحانات اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق ان فرائض کو ادا کر سکتا ہے۔ لیکن جنوبی افریقہ جیسے ملک میں میری پیدائش اور رنگ کے شخص کے لیے ان دونوں قسم کے فرائض کی ادائیگی تقریباً ناممکن تھی۔ جنوبی افریقہ میں رنگ دار شخص اگر انسان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا تو اسے سزا دی جاتی تھی اور تنہائی میں ڈال دیا جاتا تھا۔ جنوبی افریقہ میں کوئی شخص اپنی قوم کی طرف سے عائد شدہ فرض ادا کرنا چاہتا تو لازماً اسے اس کے خاندان اور اس کے گھر سے جدا کر دیا جاتا اور ایک الگ تھلگ زندگی گزارنے پر مجبور کیا جاتا جہاں وہ پوشیدگی اور بغاوت کے دھندلکوں میں سسکتا رہتا۔ میں نے شروع ہی میں یہ راستہ نہیں چنا تھا کہ اپنی قوم کو اپنے خاندان پر ترجیح دوں گا مگر اپنی قوم کی خدمت کرنے کی کوشش میں پتہ چلا کہ مجھے ایک بیٹے' ایک بھائی' ایک باپ اور ایک خاوند کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کرنے سے روکا جا رہا ہے۔

اس طرح اپنی قوم' لاکھوں' کروڑوں' جنوبی افریقیوں سے میری وابستگی جنہیں میں کبھی نہیں جانتا تھا یا جن سے کبھی نہیں ملا تھا' ان لوگوں کی قیمت پر استوار تھی جنہیں میں سب سے اچھی طرح جانتا تھا یا جن سے سب سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ یہ بات اسی طرح سادہ اور اسی طرح ہی ناقابل فہم تھی جس طرح کوئی چھوٹا بچہ اپنے والد سے پوچھتا ہے: ''آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتے؟'' اور باپ یہ خوفناک الفاظ کہنے پر مجبور ہوتا ہے: ''تم جیسے اور بچے بھی ہیں جو بہت سے ہیں۔'' اور پھر اس کی آواز بھرا جاتی ہے۔

طویل سفر کا اختتام

میں آزاد ہونے کی بھوک لیے پیدا نہیں ہوا تھا۔ میں بس آزاد پیدا ہوا تھا' ہر لحاظ سے آزاد جسے میں جان سکتا تھا۔ میں اپنی ماں کے جھونپڑے کے پاس بھاگنے دوڑنے میں آزاد تھا' صاف شفاف ندی میں تیرنے کے لیے آزاد تھا جو میرے

گاؤں میں بہتی تھی' ستاروں کے نیچے مکئی بھوننے میں آزاد تھا اور سست رفتار بھینسوں کی پشت پر سواری کرنے میں آزاد تھا۔ جب تک میں اپنے باپ کا مطیع تھا اور اپنے قبیلے کے رواج کی پابندی کرتا تھا' انسان یا خدا کے قوانین نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔

یہ صرف اس وقت ہوا جب میں جاننے لگا کہ میرے لڑکپن کی آزادی اب ایک سراب ہے' جب ایک نوجوان کی حیثیت سے مجھ پر انکشاف ہوا کہ میری آزادی پہلے ہی مجھ سے چھینی جا چکی ہے۔ تب میں اس کی بھوک محسوس کرنے لگا۔ پہلے پہل میں ایک طالبعلم کی حیثیت سے آزادی صرف اپنے لیے چاہتا تھا۔ رات کو باہر رہنے' اپنی پسند کا مطالعہ کرنے اور اپنی پسند کی جگہ جانے کی عبوری آزادیاں میرا منشا تھیں۔ بعد میں جوہانس برگ میں ایک نوجوان آدمی کی حیثیت سے میں اپنے توانا مقاصد حاصل کرنے' اپنی روزی کمانے' شادی کرنے اور خاندان رکھنے کی بنیادی اور باعزت آزادیوں کی خواہش کرنے لگا اور ایسی آزادی کی تمنا کرنے لگا جس میں قانون کی پابند زندگی بسر کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔

لیکن پھر بتدریج میں نے دیکھا کہ نہ صرف میں آزاد نہیں تھا بلکہ میرے بھائی اور بہنیں بھی آزاد نہیں تھے میں نے دیکھا کہ یہ سرف میری آزادی ہی نہیں تھی جس پر بندشیں عائد تھیں بلکہ ہر کسی کی آزادی پر پابندیوں میں جکڑی ہوئی تھی جو میرے جیسا نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ یہی وہ وقت تھا جب میں افریقن نیشنل کانگریس میں شامل ہوا اور یہی وہ وقت تھا جب اپنی آزادی کے لیے میری بھوک اپنی قوم کی آزادی کے لیے میری عظیم تر بھوک میں بدل گئی۔ یہ میری قوم کی آزادی کے لیے خواہش ہی تھی کہ وہ وقار اور عزتِ نفس کے ساتھ اپنی زندگی بسر کریں جس نے میری زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی جس نے ایک خوفزدہ نوجوان آدمی کو دلیر بنا دیا جس نے خاندان سے محبت کرنے والے خاوند کو بے گھر بنا دیا اور جس نے زندگی سے پیار

کرنے والے شخص کو ایک راہب کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔

اب میں کوئی دوسروں سے زیادہ نیک پاک اور ذاتی ایثار کرنیت والا تو ہوں نہیں لیکن میں نے جان لیا کہ میں ان محدود سی آزادیوں سے بھی لطف نہیں اٹھا سکتا جو مجھے اس وقت حاصل تھیں جب میں نے جانا تھا کہ میری قوم آزاد نہیں۔ آزادی نا قابل تقسیم ہے۔ میری قوم کے کسی ایک فرد کی زنجیریں میرے لیے زنجیریں تھیں۔

ان طویل اور تنہا برسوں کے دوران ہی میری اپنی قوم کی آزادی کے لیے میری بھوک گورے یا کالے سب لوگوں کی آزادی کے لیے بھوک بن گئی۔ میں کسی بھی اور چیز کی طرح یہ جانتا تھا کہ ظالم کو بھی اسی طرح آزادی دلانی چاہیے جس طرح مظلوم کو یقینی طور پر آزادی ملنی چاہیے۔ ایک آدمی جو کسی اور کی آزادی چھینتا ہے' نفرت کا قیدی ہوتا ہے' وہ تعصب اور تنگ نظری کی سلاخوں کے پیچھے قفل بند ہوتا ہے۔ میں حقیقی طور پر آزاد نہیں اگر میں کسی اور کی آزادی چھیننے لگوں جیسا کہ میں اس وقت یقیناً آزاد نہیں ہوتا جب میری آزادی مجھ سے چھینی جاتی ہے۔ ظالم اور مظلوم دونوں سے یکساں طور پر ان کی انسانیت چھین لی جاتی ہے۔

جب میں جیل سے باہر آیا تو ظالم اور مظلوم دونوں کو آزادی دلانا میرا مشن تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مقصد حاصل ہو گیا ہے۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ صورت حال یہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ابھی آزاد نہیں' ہم نے سرف آزاد ہونے کی آزادی حاصل کی ہے' خود پر ظلم نہ ڈھائے جانے کا حق حاصل کیا ہے۔ ہم نے اپنے سفر کا آخری قدم نہیں بلکہ صرف ایک طویل تر اور مشکل تر شاہراہ پر پہلا قدم اٹھایا ہے۔ کیونکہ آزاد ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں کہ اپنی زنجیروں کو اتار پھینکا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح زندگی بسر کی جائے جو دوسروں کی آزادی کا احترام کرے اور اس کو وسعت دے۔ آزادی سے ہماری وابستگی کا حقیقی امتحان بس شروع ہو رہا ہے۔

میں نے آزادی کی اس طویل شاہراہ پر سفر کیا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ لڑکھڑا نہ جاؤں اگرچہ اس راہ پر غلط قدم بھی اٹھائے ہیں۔ لیکن میں نے یہ راز پالیا ہے کہ ایک بڑی پہاڑی پر چڑھنے کے بعد ہی انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کئی اور پہاڑیاں سر کرنے والی ہیں۔ میں یہاں آرام کرنے کے لیے ایک لمحے کو رکا ہوں تاکہ اس شاندار منظر کو ایک نظر دیکھ سکوں جو میرے اردگرد پھیلا ہوا ہے اور پیچھے مڑ کر اس فاصلے پر طائرانہ نظر ڈال سکوں جو میں نے طے کیا ہے۔ لیکن میں صرف ایک لمحے کے لیے ٹھہر سکتا ہوں کیونکہ آزادی کے ساتھ ذمے داریاں آتی ہیں اور میں گھسٹتے رہنے کی جسارت نہیں کرسکتا کیونکہ میرا طویل سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔

☆☆☆☆☆☆

محسن فارانی

(ایک تعارف)

جناب محسن فارانی کا اصل نام مختار احمد ہے اور وہ فروری 1947ء میں صفدر پور کپورتھلہ (بھارت) کے ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے ایک ماہ بعد ان کا گھرانہ نہایت نا مساعد حالات میں ہجرت کر کے مملکت خداداد میں پہنچا اور یہاں حارف والا کے قریب ایک گاؤں میں سکونت پذیر ہوا۔

محسن فارانی 1964ء میں ٹاؤن کمیٹی ہائی سکول حاف والا سے میٹرک کا امتحان امتیاز نمبروں سے پاس کیا اور وظیفہ کے مستحق ٹھہرے۔ بعدازاں اسلامیہ کالج لاہور سے ایف ایس سی اور جامعہ پنجاب سے گریجوایش اور پھر ایم اے اردو کیا۔

اس دوران فارانی صاحب سکول میں تدریسی فرائض بھی انجام دیتے رہے اور فارغ اوقات میں مطالعہ ادب نے ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو بڑی جلا بخشی۔ اس عرصے میں انہوں نے انگریزی زبان میں مزید مہارت حاصل کی۔ علاوہ ازیں وہ اردو، عربی، فارسی اور پنجابی زبانوں کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔

14 ستمبر 1977ء کو وہ پاکستان کے معروف اور کثیر الاشاعت ماہنامے ''اردو ڈائجسٹ'' کے شعبہ ادارت سے وابستہ ہو گئے جہاں گزشتہ بائیس برسوں سے ان کے علمی، تاریخی، تحقیقی مضامین اور معیاری تراجم شائع ہو رہے ہیں۔ 1985ء میں انہوں نے دان ڈیل الیگزینڈر کی شہرۂ آفاق کتاب ''Arthritis'' کا رواں اور با محاورہ ترجمہ کیا جو بعدازاں ''جوڑوں کا درد'' کے زیرعنوان شائع ہوئی اور ہر خاص و عام سے دادو تحسین حاصل کی۔ ان دنوں وہ ''اردو ڈائجسٹ'' میں بطور نائب مدیر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

جنوبی افریقہ کہ صدر جناب نیلسن منڈیلا کی یہ اہم کتاب عام قارئین کے علاوہ پاکستان کے ان سیاستدانوں کے لیے بھی اپنے اندر بڑا سبق رکھتی ہے جو اپنی انا کی

خاطر قومی سلامتی کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ بڑے طریقے اور سلیقے سے اس کتاب کا ترجمہ کرنے پر مترجم ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

محمد شکور

28 اکتوبر 1998ء